

کشف المحجوب

(کلام المرغوب)

حضرت علی بن عثمان ہجویری

حضرت داتا گنج بخش ^{المنزہ} رحمۃ اللہ علیہ

مترجم

ابوالحسن اسید محمد احمد قادری ^{رحمۃ اللہ علیہ}

تحقیق و ترمیم و ترمیم

ڈاکٹر خالق داد ملک ڈاکٹر طاہر رضا بخاری

مکتبہ شمس و قمر

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نحمدہ ونصلی ونسلم علیٰ رسولہ الکریم اما بعد
آفتاب آسمان معرفت، سیاح بادیہ طریقت، سباح بحر
حقیقت، سباق میدان شریعت، سند الاتقیا، سید الاولیاء
حضرت شیخ سید علی بن عثمان ہجویری المعروف داتا گنج بخش
علیہ الرحمہ کی ذات والاصفات اخلاق و اخلاص کی پیکر اور
حکمت نظریہ و عملیہ کی علی وجہ الکمال جامع ہے۔

جماعت صوفیاء میں جو مقام و مرتبہ آپ کو حاصل ہے
کتب تصوف میں وہی مقام آپ کی شہرہ آفاق تصنیف
”کشف المحجوب“ کو حاصل ہے، ضدیوں سے یہ کتاب
ارباب نظر و فکر سے خراج تحسین وصول کرتے ہوئے عوام
و خواص کی بھرپور رہنمائی کر رہی ہے۔ افادہ عام کے لئے اس
کے متعدد تراجم اردو زبان میں ہو چکے ہیں، جن میں سے
شمس العلماء حضرت علامہ ابوالحسنات سید محمد احمد قادری علیہ الرحمۃ
کا ترجمہ بہترین قرار دیا جاتا ہے۔ اس کے متعدد ایڈیشن
مختلف اداروں کی طرف سے شائع ہو چکے ہیں مگر پیش نظر
ایڈیشن ان سب سے زیادہ حسین، دیدہ زیب اور کئی منفرد
خوبیوں کا حامل اور حتی الامکان اغلاط سے مبرا ہے۔ محترم
المقام جناب ڈاکٹر خالق داد ملک چیئرمین شعبہ عربی پنجاب
یونیورسٹی اور عزت مآب جناب صاحبزادہ ڈاکٹر سید طاہر رضا
بخاری ڈائریکٹر جنرل مذہبی امور اوقاف پنجاب ایسے عظیم
فاضل دانشوروں کی تحقیق، تخریج اور تدوین جدید نے کتاب
مذکور کی افادیت کو مزید بڑھا دیا ہے۔

اس نافع و مفید کتاب کی اشاعت جدیدہ کا اہتمام کرنے
پر میں صمیم قلب سے مکتبہ شمس و قمر (بھائی چوک لاہور) کے
ذمہ داران کو ہدیہ تبریک و تحسین پیش کرتا ہوں۔

اللہ تعالیٰ اس خدمت جلیلہ پر کتاب ہذا کے محققین
محررین، مدونین اور ناشرین کو بہترین انعام عطا فرمائے۔
آمین بجاہ سید المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ
آلہ وصحبہ اجمعین

حافظ محمد عبدالستار سعیدی

شیخ الحدیث جامعہ نظامیہ رضویہ لاہور

30 جنوری 2012ء، ۱۱ ربیع الاول ۱۴۳۳ھ

کشف المحجوب

(کلام المرغوب)

حضرت علی بن عثمان ہجویری
المرتب
حضرت تاج بخش رحمۃ اللہ علیہ

مترجم
ابوالحسن سید محمد احمد قادری رحمۃ اللہ علیہ

تحقیق، تخریج و تدوین جدید

ڈاکٹر طاہر رضا بخاری

ڈاکٹر خاقان ادملک

جامعہ صنفیہ خوشیہ، بھائی چوک، لاہور
0345-4666768, 0322-4973954

مکتبہ شمس و قمر

کتاب	:	کشف المحجوب (کلام المرغوب)
مصنف	:	حضرت سید علی بن عثمان ہجویری المعروف بہ داتا گنج بخشؒ
مترجم	:	علامہ ابوالحسنات سید محمد احمد قادری
تحقیق، تخریج و تدوین جدید:	:	ڈاکٹر خالق داد ملک، چیئر مین شعبہ عربی پنجاب یونیورسٹی ڈاکٹر طاہر رضا بخاری، ڈائریکٹر جنرل مذہبی امور و اوقاف پنجاب
باہتمام	:	قاری محمد عارف سیالوی، مہتمم جامعہ حنفیہ غوثیہ لاہور
نگران	:	صاحبزادہ محمد طاہر شہزاد سیالوی، چیئر مین مکتبہ شمس و قمر حافظ محمد کاشف جمیل، ہیڈنگ ڈائریکٹر مکتبہ شمس و قمر
کمپیوٹر ورک	:	طاہر مقصود
سال اشاعت	:	فروری ۲۰۱۲ء / ربیع الاول ۱۴۳۳ھ
تعداد	:	500
ناشر	:	مکتبہ شمس و قمر، جامعہ حنفیہ غوثیہ، بھائی چوک لاہور
		0345-4666768 0322-4973954

حرفِ آغاز !

ڈاکٹر طاہر رضا بخاری

ڈائریکٹر جنرل مذہبی امور و اوقاف پنجاب

قدوۃ السالکین، زبدۃ العارفين، سند الواصلین، مرکز تجلیات، منبع فیوض و برکات، الشیخ السید علی بن عثمان الجویری المعروف بہ حضرت داتا گنج بخشؒ کا وجود سعید خطہ پنجاب کے لیے مرکز مہر و وفا اور سرچشمہ تمنا و دعا ہے۔ آپؒ کی حیات ظاہری بھی اس خطے کے لوگوں کے لیے سراپا رحمت و رافت تھی اور آپؒ کے باطنی و روحانی فیوض و برکات۔۔۔ آج بھی اس سرزمین کے لیے محبت، ہمدردی اور خیر خواہی کا ذریعہ۔ پنجاب کی دینی ثقافت سے حضرت داتا گنج بخشؒ کی محبت کو جدا کرنا۔۔۔ ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ یہ یقیناً حضرت داتا گنج بخشؒ کی کرم گستیوں ہی کا فیضان ہے کہ لاہور برصغیر کے لیے قطب الارشاد (راہنمائی کا محور و مرکز)، قطب البلاد اور مدینۃ الاولیاء ٹھہرا اور اپنی اسی روحانی مرکزیت کے سبب ہمیشہ مرجع خلافت رہا۔

حضرت داتا گنج بخش علی ہجویریؒ نے اسی شہر لاہور میں تصوف کی معرکہ الآرا کتاب "کشف المحجوب" تصنیف فرمائی جس کے ذریعے صوفیانہ افکار و تعلیمات کو مکمل طور پر احکام شریعت کے نہ صرف تابع قرار دیا بلکہ تصوف کو شریعت کا امین اور نگہبان بنا کر پیش کیا اور یوں برصغیر میں ایک ایسے اسلامی مکتب تصوف کی بنیاد رکھی جس کی بلندیوں پر ہمیشہ شریعت و طریقت کا پرچم لہراتا رہے گا۔ ایک ہزار سال قبل ہند کی سرزمین میں حضرت داتا گنج بخش علی ہجویریؒ نے حرف حق کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، نبی صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی رسالت اور اسلام کی حقانیت کا جو بیج بویا، وہ اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت سے ایک ایسا تناور درخت بن گیا جس کی جڑیں اس سرزمین میں نہایت مضبوط ہو گئیں اور شاخیں وسیع فضاؤں میں پھیل گئیں۔ علامہ محمد اقبالؒ اسی شجر طیبہ کا حیات بخش ثمر تھے جنہوں نے کلمہ طیبہ کی بنیاد پر اس خطہ ارضی کے حصول کا راستہ مسلمانان ہند کو دکھایا۔ آج مرشد لاہور حضرت علی ہجویریؒ کے عطا کردہ اس خطہ پاک کی حفاظت و استحکام کے لیے بھی آپؒ ہی کے محبت آمیز اور ایمان افروز افکار و نظریات سے راہنمائی کی اشد ضرورت ہے۔ آج وطن عزیز پر جس انتہاء پسندی اور تشدد پرستی کے سائے منڈلا رہے ہیں، اس سے نبرد آزما ہونے کے لیے ضروری ہے کہ ہم حضرت داتا گنج بخش علی

ہجویری کے انہی اخوت و انسان دوستی پر مبنی متصوفانہ افکار و کردار اور حیات و احوال کو اپنا رہبر و رہنما بنائیں، جس کی روشنی آپ کی شہرہ آفاق تصنیف "کشف المحجوب" سے ضرور یز ہو رہی ہے۔

محکمہ اوقاف و مذہبی امور پنجاب کے قیام کی فکری اور انتظامی اساس و بنیاد یقیناً حضرت داتا گنج بخش کے آستان کی "فیض بخشوں" کی رہن منت ہے، تاہم نصف صدی سے زائد کا عرصہ گزرنے کے باوجود، کشف المحجوب کے متعلق متن کی اشاعت محکمہ کے ذمہ قرض کی صورت میں، ہنوز باقی تھی، اگرچہ اب تک 30 سے زائد اردو تراجم مارکیٹ میں دستیاب ہیں، تاہم قارئین اور بالخصوص "ہجویریات" کے طالب علم ایک معیاری نسخہ کی فراہمی کے متمنی تھے، جس میں کم از کم متن اور حوالہ جات وغیرہ کے امور جدید تحقیقی اسلوب کے مطابق ہوں۔ چنانچہ اس سلسلے میں ابوالحسنات سید محمد احمد قادری کے ترجمہ "کلام المرغوب" کا انتخاب کر کے اس میں حسب ذیل امور کا اہتمام کرتے ہوئے ایک "معیاری نسخہ" ترتیب دینے کی سعی کی گئی ہے:

○ آیات و احادیث اور اردو متن میں کتابت اور پروف ریڈنگ کی موجود اغلاط کو دور کر دیا گیا ہے۔
مزید برآں عربی عبارات و اقوال اور اشعار جن میں قبل ازیں اعراب وغیرہ کا اہتمام نہ تھا، اعراب لگا دیے ہیں تاکہ عام قاری اور طالب علم کو عربی عبارات پڑھنے میں سہولت ہو۔

○ آیات قرآنیہ اور احادیث نبویہ کی مکمل طور پر تصحیح و تخریج کرتے ہوئے، سورت کا نام اور آیت نمبر درج کر دیئے گئے ہیں۔ جبکہ ایسی احادیث جن کے عربی متن کشف المحجوب میں مرقوم تھے، ان سب کی تخریج کر کے حوالہ جات کا اہتمام کر دیا گیا ہے۔ مزید برآں لفظی و کتابی اغلاط کی بھی مکمل تصحیح کر دی گئی ہے۔

○ بے شمار مقامات پر ترجمہ قدیم طرز پر لفظی تھا، اسے با محاورہ کر دیا گیا ہے۔

○ ترجمے میں پیرا گراف اور رموز، اوقاف و ترقیم کا لحاظ نہیں رکھا گیا تھا، جس کا اہتمام کرتے ہوئے زیر نظر خصوصی ایڈیشن میں رموز و اوقاف و ترقیم کا اضافہ کر دیا گیا ہے، جس سے جملے اور عبارات واضح اور ابہام و التباس ختم ہو گیا ہے۔ مزید برآں جدید اسلوب انشاء پر دازی کے مطابق مناسب پیرا بندی کا اہتمام بھی کر دیا گیا ہے۔

مذکورہ امور کی انجام دہی کے لیے یقیناً ایک جامع حکمت عملی درکار تھی، جس کے لیے ڈاکٹر خالق داد ملک چیئرمین شعبہ عربی پنجاب یونیورسٹی کی خدمات یقیناً لائق ستائش ہیں۔

فہرست

صفحہ	عنوانات	نمبر شمار
۳	حرف آغاز	۱۔
۱۳	دیباچہ	۲۔
۳۵	○ کشف المحجوب: صوفیاء کرام اور مورخین کی نظر میں	
۳۸	○ کشف المحجوب: بحیثیت ماخذ کتب تصوف	
۴۲	○ مراجع و منابع کشف المحجوب	
۴۷	○ کشف المحجوب کے نام اور زبان کے بارے میں غلط فہمیوں کا ازالہ	
۵۰	○ کشف المحجوب فارسی کے مطبوعہ نسخے	
۵۲	○ تراجم	
۶۶	○ کچھ مترجم کے بارے میں	
۶۹	مقدمہ (کشف المحجوب)	۳۔
۸۳	پہلا باب: اثبات علم	۴۔
۱۰۰	دوسرا باب: اثبات فقر	۵۔
۱۰۵	○ فقر و غنا	
۱۱۷	تیسرا باب: تصوف	۶۔
۱۳۷	چوتھا باب: خرقہ پوشی	۷۔
۱۵۶	پانچواں باب: فقر و صفوت	۸۔
۱۶۲	چھٹا باب: ملامت	۹۔
۱۷۲	ساتواں باب: صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین	۱۰۔

صفحہ	عنوانات	نمبر شمار
۱۸۱	آٹھواں باب: اہل بیت اطہار رضی اللہ عنہم	۱۱-
۱۸۲	○ امام حسین سید الشہداء رضی اللہ عنہ	
۱۸۶	○ حضرت امام زین العابدین رضی اللہ عنہ	
۱۸۸	○ قصیدہ فرزدق ابو فارس	
۱۹۱	○ حضرت امام ابو جعفر محمد باقر رضی اللہ عنہ	
۱۹۳	○ حضرت امام جعفر رضی اللہ عنہ	
۱۹۷	نواں باب: اصحاب صفہ رضی اللہ عنہم	۱۲-
۲۰۰	دسواں باب: ائمہ تابعین رضوان اللہ علیہم اجمعین	۱۳-
۲۰۰	○ حضرت اولیٰ قرنی رضی اللہ عنہ	
۲۰۲	○ حضرت هرم بن حیان رضی اللہ عنہ	
۲۰۲	○ حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ	
۲۰۶	○ حضرت سعید بن المسیب رضی اللہ عنہ	
۲۰۸	گیارہواں باب: تبع تابعین تابعہ زمانہ حال	۱۴-
۲۰۸	○ حضرت حبیب عجمی رحمۃ اللہ علیہ	
۲۰۹	○ حضرت مالک بن دینار رحمۃ اللہ علیہ	
۲۱۰	○ حضرت ابو حبیب بن سلیم الراعی رحمۃ اللہ علیہ	
۲۱۱	○ حضرت ابو حازم مدنی رحمۃ اللہ علیہ	
۲۱۲	○ حضرت محمد بن واسع رحمۃ اللہ علیہ	
۲۱۳	○ حضرت ابو حنیفہ النعمان رضی اللہ عنہ	
۲۱۸	○ حضرت عبد اللہ بن المبارک رحمۃ اللہ علیہ	
۲۲۰	○ حضرت فضیل بن عیاض رحمۃ اللہ علیہ	
۲۲۶	○ حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ	
۲۳۰	○ حضرت ابراہیم ادھم رحمۃ اللہ علیہ	
۲۳۲	○ حضرت بشر حافی رحمۃ اللہ علیہ	

صفحہ	عنوانات	نمبر شمار
۲۳۳	○ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ	
۲۳۶	○ حضرت عبداللہ بن حارث رحمۃ اللہ علیہ	
۲۳۹	○ حضرت داؤد طائی رحمۃ اللہ علیہ	
۲۴۰	○ حضرت سزئی سقطی رحمۃ اللہ علیہ	
۲۴۱	○ حضرت ابوعلی شقیق بن ابراہیم ازدی رحمۃ اللہ علیہ	
۲۴۳	○ حضرت ابوسلیمان عبدالرحمن بن عطیہ دارانی رحمۃ اللہ علیہ	
۲۴۴	○ حضرت معروف کرخی رحمۃ اللہ علیہ	
۲۴۶	○ حضرت حاتم الاصم رحمۃ اللہ علیہ	
۲۴۷	○ حضرت امام محمد بن ادریس شافعی رضی اللہ عنہ	
۲۴۹	○ حضرت امام ابو محمد احمد بن حنبل رضی اللہ عنہ	
۲۵۰	○ حضرت ابوالحسن احمد بن حواری رضی اللہ عنہ	
۲۵۳	○ ابو حامد حضرت احمد بن خضرویہ ^{لبلیخی} رحمۃ اللہ علیہ	
۲۵۶	○ حضرت عسکری بن الحسین رضی اللہ عنہ	
۲۵۷	○ حضرت ابوزکریا یحییٰ بن معاذ رازی رحمۃ اللہ علیہ	
۲۵۸	○ حضرت عمرو بن سالم نیشاپوری حدادی رحمۃ اللہ علیہ	
۲۶۱	○ حضرت ابوصالح حمدون رحمۃ اللہ علیہ	
۲۶۲	○ حضرت منصور بن عمار رحمۃ اللہ علیہ	
۲۶۳	○ حضرت احمد بن عاصم انطاکی رحمۃ اللہ علیہ	
۲۶۴	○ حضرت ابو محمد عبداللہ خلیق رحمۃ اللہ علیہ	
۲۶۵	○ حضرت جنید بغدادی رضی اللہ عنہ	
۲۶۸	○ حضرت ابوالحسن نوری رحمۃ اللہ علیہ	
۲۷۱	○ ابو عثمان حضرت سعید بن اسماعیل حیری رحمۃ اللہ علیہ	
۲۷۲	○ ابو عبداللہ حضرت احمد بن یحییٰ بن الجلال رحمۃ اللہ علیہ	
۲۷۵	○ حضرت رومی بن احمد رحمۃ اللہ علیہ	
۲۷۶	○ حضرت ابو یعقوب یوسف رحمۃ اللہ علیہ	

صفحة	عنوانات	نمبر شمار
۲۷۷	○ حضرت ابوالحسن سمنون رحمۃ اللہ علیہ	
۲۷۹	○ ابوالقارص حضرت شاہ شجاع الکرمانی رحمۃ اللہ علیہ	
۲۷۹	○ حضرت عمرو بن عثمان مکی رحمۃ اللہ علیہ	
۲۸۱	○ حضرت اہل بن عبداللہ تستری رحمۃ اللہ علیہ	
۲۸۲	○ حضرت ابو عبداللہ محمد بن فضل بلخی رحمۃ اللہ علیہ	
۲۸۳	○ حضرت ابو عبداللہ محمد بن علی ترمذی رحمۃ اللہ علیہ	
۲۸۳	○ حضرت ابوبکر محمد بن عمرو راق رحمۃ اللہ علیہ	
۲۸۵	○ حضرت ابوسعید احمد بن خراز رحمۃ اللہ علیہ	
۲۸۷	○ حضرت ابوالحسن علی بن محمد اصفہانی رحمۃ اللہ علیہ	
۲۸۸	○ حضرت ابوالحسن محمد بن اسماعیل خیر نساج رحمۃ اللہ علیہ	
۲۹۰	○ حضرت ابو حمزہ خراسانی رحمۃ اللہ علیہ	
۲۹۱	○ حضرت ابوالعباس احمد بن مسروق رحمۃ اللہ علیہ	
۲۹۱	○ حضرت ابو عبداللہ محمد بن اسماعیل رحمۃ اللہ علیہ	
۲۹۲	○ حضرت ابوالحسن بن علی جرجانی رحمۃ اللہ علیہ	
۲۹۳	○ حضرت ابو محمد احمد بن حسین حریری رحمۃ اللہ علیہ	
۲۹۴	○ حضرت ابوالعباس احمد بن محمد بن اہل آملی رحمۃ اللہ علیہ	
۲۹۵	○ حضرت حسین بن منصور حلان رحمۃ اللہ علیہ	
۳۰۰	○ حضرت ابواسحاق ابراہیم بن احمد خواص رحمۃ اللہ علیہ	
۳۰۰	○ حضرت ابو حمزہ بغدادی رحمۃ اللہ علیہ	
۳۰۱	○ حضرت ابوبکر محمد موسیٰ واسطی رحمۃ اللہ علیہ	
۳۰۲	○ حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ	
۳۰۴	○ حضرت ابو محمد بن جعفر بن نصیر خالدي رحمۃ اللہ علیہ	
۳۰۵	○ حضرت ابو محمد بن القاسم رودباری رحمۃ اللہ علیہ	
۳۰۵	○ حضرت ابوالعباس مہدی سیاری رحمۃ اللہ علیہ	
۳۰۶	○ حضرت ابو عبداللہ محمد بن خفیف رحمۃ اللہ علیہ	
۳۰۷	○ حضرت ابو عثمان سعید بن سلام مغربی رحمۃ اللہ علیہ	

صفحہ	عنوانات	نمبر شمار
۳۰۷	○ حضرت ابراہیم محمد بن محمود نصیر آبادی رحمۃ اللہ علیہ	
۳۰۸	○ حضرت ابوالحسن علی بن ابراہیم حصری رحمۃ اللہ علیہ	
۳۱۰	بارہواں باب: صوفیائے متاخرین	۱۵۔
۳۱۲	○ حضرت ابوالعباس احمد بن قصاب رحمۃ اللہ علیہ	
۳۱۳	○ حضرت علی وفاق رحمۃ اللہ علیہ	
۳۱۳	○ حضرت ابوالحسن خرقانی رحمۃ اللہ علیہ	
۳۱۲	○ حضرت ابو عبد اللہ محمد بن معروف بسطامی رحمۃ اللہ علیہ	
۳۱۵	○ حضرت ابوسعید فضل بن محمد مہنی رحمۃ اللہ علیہ	
۳۱۶	○ حضرت شیخ ابوالفضل محمد بن حسن ختلی رحمۃ اللہ علیہ	
۳۱۷	○ ابوالقاسم حضرت عبدالکریم بن ہوازن قشیری رحمۃ اللہ علیہ	
۳۱۹	○ حضرت ابوالعباس احمد بن محمد شقانی رحمۃ اللہ علیہ	
۳۲۰	○ حضرت ابوالقاسم بن علی بن عبد اللہ گرگانی رحمۃ اللہ علیہ	
۳۲۱	○ حضرت ابواحمد مظفر بن حمدان رحمۃ اللہ علیہ	
۳۲۳	○ سماع و قوالی کے نقصانات	
۳۲۲	تیرہواں باب: مختلف ممالک کے مشائخ متاخرین	۱۶۔
۳۲۲	○ مشائخ اہل شام و عراق	
۳۲۲	○ مشائخ اہل فارس	
۳۲۵	○ مشائخ تہستان و آذربائیجان و طبرستان و قفق	
۳۲۵	○ مشائخ اہل کرمان	
۳۲۵	○ مشائخ خراسان	
۳۲۶	○ مشائخ ماوراء النہر	
۳۲۶	○ مشائخ غزنی	
۳۲۸	چودہواں باب: صوفیاء کے مختلف مکاتب و مذاہب	۱۷۔
۳۲۸	○ فرقہ محاسبیہ	
۳۲۹	○ حقیقت رضا	

صفحہ	عنوانات	نمبر شمار
۳۳۵	○ مقام و حال	
۳۳۶	○ فرقہ محاسبیہ	
۳۳۸	○ فرقہ قصاریہ	
۳۳۹	○ فرقہ طیفوریہ	
۳۴۰	○ سکر اور سحر	
۳۴۳	○ فرقہ جنیدیہ	
۳۴۵	○ فرقہ نوریہ	
۳۴۶	○ حقیقت ایثار	
۳۵۲	○ فرقہ سہیلیہ	
۳۵۲	○ حقیقت نفس و معنی ہوئی	
۳۶۲	○ مجاہدہ نفس	
۳۷۳	○ حقیقت ہوئی	
۳۷۹	○ فرقہ حکیمیہ	
۳۷۹	○ اثبات ولایت	
۳۹۰	○ اثبات کرامت	
۳۹۲	○ معجزہ اور کرامت	
۳۹۶	○ مدعی الوہیت سے ظہور معجزہ	
۴۰۲	○ کرامات اولیاء	
۴۱۳	○ انبیاء کی اولیاء کرام پر فضیلت	
۴۱۶	○ انبیاء و اولیاء کی فرشتوں پر فضیلت	
۴۲۰	○ فناء و بقاء	
۴۲۵	○ فرقہ خفییہ	
۴۲۷	○ غیبت و حضور	
۴۲۹	○ فرقہ سیاریہ	
۴۳۰	○ جمع تفرقہ	
۴۳۷	○ بیان فرقہ حلویہ	

صفحہ	عنوانات	نمبر شمار
۴۳۸	○ روح کی بحث	
۴۴۵	○ کشفِ حجابِ اوّل۔۔۔ معرفتِ الہی کی شرائط میں	
۴۵۷	○ کشفِ حجابِ دوم۔۔۔ توحید	
۴۶۵	○ کشفِ حجابِ سوم۔۔۔ ایمان	
۴۶۹	○ کشفِ حجابِ چہارم۔۔۔ طہارت	
۴۷۴	پندرہواں باب: توبہ اور متعلقاتِ توبہ	۱۸۔
۴۸۲	○ کشفِ حجابِ پنجم۔۔۔ نماز	
۴۸۸	سولہواں باب: محبت اور متعلقاتِ محبت	۱۹۔
۴۹۸	○ کشفِ حجابِ ششم۔۔۔ زکوٰۃ	
۵۰۳	سترہواں باب: جو دو سخا	۲۰۔
۵۰۸	○ کشفِ حجابِ ہفتم۔۔۔ روزہ	
۵۱۵	اٹھارہواں باب: بھوک اور اس کے احکام	۲۱۔
۵۱۸	○ کشفِ حجابِ ہشتم۔۔۔ حج	
۵۲۲	انیسواں باب: مشاہدہ	۲۲۔
۵۲۹	○ کشفِ حجابِ نہم۔۔۔ صحبت اور اس کے آداب و احکام	
۵۳۳	بیسواں باب: صحبت اور متعلقاتِ صحبت	۲۳۔
۵۳۶	ایکسواں باب: آدابِ صحبت	۲۴۔
۵۴۱	بائیسواں باب: آدابِ صحبت و اقامت	۲۵۔
۵۴۵	تیسواں باب: آدابِ صحبت و سفر	۲۶۔
۵۴۸	چوبیسواں باب: کھانے کے آداب	۲۷۔
۵۵۱	پچیسواں باب: چلنے پھرنے کے آداب	۲۸۔
۵۵۳	چھبیسواں باب: سفر و حضر میں سونے کے آداب	۲۹۔
۵۵۸	ستائیسواں باب: بولنے اور چپ رہنے کے آداب	۳۰۔
۵۶۳	اٹھائیسواں باب: آدابِ سوال و ترکِ سوال	۳۱۔

صفحہ	عنوانات	نمبر شمار
۵۶۷	آداب نکاح و تہجد	۳۲- اثنیسواں باب:
۵۷۷	○ کشف حجاب دہم۔۔۔ اصطلاحات صوفیاء	
۵۷۷	○ حال اور وقت	
۵۸۱	○ مقام اور تمکین	
۵۸۳	○ محاضرہ اور مکاشفہ اور ان کا فرق	
۵۸۳	○ قبض اور وسط اور ان میں فرق	
۵۸۶	○ محبت اور ڈر اور ان میں فرق	
۵۸۷	○ قہر اور لطف اور ان میں فرق	
۵۸۹	○ نفی اور اثبات اور ان میں فرق	
۵۹۰	○ مسامرہ اور محادثہ اور ان میں فرق	
۵۹۱	○ علم الیقین اور عین الیقین اور حق الیقین اور ان کے درمیان فرق	
۵۹۲	○ علم اور معرفت اور ان میں فرق	
۵۹۳	○ شریعت اور حقیقت اور ان میں فرق	
۶۰۱	○ کشف حجاب یازدہم۔۔۔ سماع	
۶۰۳	سماع قرآن اور اس کے متعلقات	۳۳- تیسواں باب:
۶۱۲	سماع شعر اور اس کے متعلقات	۳۴- اکتیسواں باب:
۶۱۵	سماع لحن و نغمہ	۳۵- بتیسواں باب:
۶۲۰	احکام سماع	۳۶- تینتیسواں باب:
۶۲۳	اختلاف سماع	۳۷- چونتیسواں باب:
۶۲۵	مقامات سماع	۳۸- پینتیسواں باب:
۶۳۲	وجود، تواجہ	۳۹- چھتیسواں باب:
۶۳۶	رقص اور متعلقات رقص	۴۰- سینتیسواں باب:
۶۳۷	جامہ دہری	۴۱- اڑتیسواں باب:
۶۳۹	آداب سماع	۴۲- انتالیسواں باب:

دیباچہ

از حکیم محمد موسیٰ امرتسری

حامدًا و مصلیًا مخدوم الاولیاء، سلطان الاصفیاء، حضرت شیخ علی ہجویری معروف بہ حضرت داتا گنج بخش لاہوری قدس سرہ العزیز، اُس قدسی گروہ کے سرخیل ہیں جو امام رسل، ہادی سُبُل، حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وبارک وسلم کی کمال محبت و متابعت سے ولایت کے ارفع و اعلیٰ مقام اور بلند مراتب پر فائز ہو کر خلافتِ الہیہ اور حضرت سید الانبیاء ﷺ کی نیابتِ کبریٰ کے منصبِ جلیلہ پر متمکن ہوتے ہیں اور چونکہ انہوں نے اپنے آپ کو محبوبِ خدا کی محبت میں فنا کر دیا ہوتا ہے، انہیں بھی مقامِ محبوبیت عطا ہو جاتا ہے اور وہ زمین پر خلیفۃ اللہ اور منظرِ انوارِ خدا اور نائبِ محبوبِ خدا ہوتے ہیں۔ لہذا:

- ۱۔ ان کی ظاہری زندگی میں بے پناہ فیضِ رُشد و ہدایت جاری ہوتا ہے۔
- ۲۔ برزخی زندگی میں قاسمِ فیوض و برکات ہوتے ہیں اور ان کا روحانی فیض عوام و خواص کے لیے یکساں ہوتا ہے۔
- ۳۔ ان کی تعلیمات و ارشادات طالبانِ راہِ خدا کے لیے مرشد طریق کی حیثیت رکھتے ہیں اور ہر مرتبہ و استعداد کے لوگ اپنی اپنی حیثیت اور ظرف کے مطابق ان سے مستفید و مستفیض ہوتے ہیں۔

چنانچہ بعطائے الہی و فیضِ سرورِ عالم ﷺ حضرت داتا گنج بخش ﷺ نے:

- i۔ اپنی حیاتِ مبارکہ میں کفرستانِ ہند میں اسلام کا پرچم لہرایا اور اپنی روحانی قوت اور نظرِ کیمیا اثر کے ذریعے بے شمار گم گشتگانِ بادیہ کفر و ضلالت کو صراطِ مستقیم پر گامزن کیا اور ان کے سینوں کو نورِ اسلام سے منور فرمایا۔
- ii۔ بعد وصالِ حضرت شیخ ﷺ کا مزار پُر انوارِ فیضِ رسانِ عالم اور منبعِ روحانیت و طمانیت ہے:

نام فقیر تنہاندا باہو قبر جہاندی جیوے ہو

iii- ان کے ارشادات گرامی و افاضات عالی (کشف المحجوب) بجائے خود مرہدِ کامل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

غرضیکہ ایسی محبوبیت و مقبولیت امت محمدیہ (علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کے بہت کم اولیاء کرام کو حاصل ہوئی ہے:

ایں سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشند خدائے بخشندہ

حالاتِ زندگی:

حضرت داتا گنج بخش قدس سرہ برصغیر پاک و ہند کے اولین مبلغین اسلام میں سے ہیں اور ان کا مزارِ گوہر باران کے فیضان کی وجہ سے عرصہ نو سو سال ☆ سے مرجع خواص و عوام چلا آ رہا ہے اور ان کی کشف المحجوب اطراف و اکنافِ عالم میں شہرت رکھتی ہے۔ بایں ہمہ ان کے حالاتِ بابرکات پر کوئی قدیم کتاب نہیں ملتی۔ میرے خیال میں اس کی وجوہ یہ ہیں:-

(۱)۔ جس زمانے میں حضرت داتا گنج بخش رحمہ اللہ نے لاہور میں شمعِ ہدایت روشن کی، اس وقت یہاں مسلمانوں کے نئے نئے قدم جمتے تھے اور پورے طور پر سیاسی استحکام حاصل نہیں ہوا تھا۔ ان حالات میں جن مؤرخین نے تاریخ نویسی کا آغاز کیا، انہوں نے تاریخ کو اپنے آقا یا نِ نعمت (فاتحین) کے گرد گھمانا شروع کر دیا اور بعد کے مؤرخین نے صرف ان بزرگوں کے مختصر حالات لکھے جن کے آستانوں پر ان کے ممدوحین کو شرفِ حاضری نصیب ہوا۔

(ب)۔ جن حضرات نے بادشاہوں سے ہٹ کر صرف ان نفوسِ قدسیہ، جن کی حکومت لوگوں کے دلوں پر تھی، کے حالات زندگی اور ان کی اسلامی و روحانی خدمات جلیلہ کی تفصیلات کو قلم بند کیا، ان کی تالیفات کو اس خطے کی ازلی بد نصیبی (بہ سلسلہ اتلافِ کتب) نے محفوظ نہیں رہنے دیا۔

ظاہر ہے کہ بزرگانِ دین رحمہم اللہ کے تذکرہ نویسوں میں سے اکثر فنِ تاریخ کے ماہر نہ تھے۔ لہذا وہ بزرگوں کے حالات لکھتے وقت واقعات کے سنن کا صحیح تعین نہ کر سکے جس کے باعث تاریخ دانوں کو بدظنی کا موقع مل گیا۔

بہر حال حضرت داتا گنج بخش قدس سرہ پر بھی ضرور کام ہوا ہوگا مگر وہ محفوظ نہیں رہ سکا۔ جہانگیری عہد کے مشہور تذکرہ نگار محمد غوثی بن حسن شطاری، حضرت داتا صاحب کے حالات کے

ذیل میں بسال ۱۰۲۲ھ لکھتے ہیں:

”تواریخ مشائخ کے سابقہ مصنفین کا خیال ہے کشف المحجوب کے مصنف وہ

بزرگ ہیں جن کا مزار مبارک لاہور میں ہے۔“ (۱)

محمد غوثی نے سابقہ مصنفین کا جو حوالہ دیا ہے اس سے واضح ہے کہ حضرت داتا صاحب قدس سرہ کے حالات کے بہت سے ماخذ تلف ہو چکے ہیں۔۔۔ ان ماخذ کے اتلاف کا نتیجہ ہے کہ:

ع: چون ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند

کے مصداق یہاں کے دانشور تاریخ و تحقیق کے نام پر کوئی نہ کوئی نیا افسانہ پیش کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ (۲)

بہر حال موجود معلوم تذکروں میں سے ”تذکرۃ الاولیاء“ از شیخ فرید الدین عطار قدس سرہ میں صرف دو جگہ حضرت داتا صاحب کا اسم گرامی درج ہے۔ محبوب الہی رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظات ”فوائد الفوائد“ اور ”دُررِ نظامی“ میں بھی ان کا ذکر خیر ہوا ہے۔ ان کے بعد کے ایک ایسے ماخذ میں سے ایتھے (Ethe) نے علمی دنیا کو متعارف کرایا ہے جو انڈیا آفس لائبریری لندن میں موجود ہے۔ اس کا نام ”رسالہ ابدالیہ“ ہے جو حضرت مولانا محمد یعقوب بن عثمان (۳) غزنوی کی تالیف ہے پھر مولانا جامی نے ”نجات الانس“ میں، شیخ احمد زنجانی نے ”تحفۃ الواصلین“ (غیر موجود) میں، ابوالفضل نے ”آئین اکبری“ میں عبدالصمد بن افضل محمد نے ”اخبار الاصفیاء“ (خطی) (۴) میں، لعل بیگ لعلی نے ”ثمرات القدس (خطی)“ میں، مولانا محمد غوثی نے ”گلزار ابرار“ میں، محمد دارا شکوہ نے ”سفینۃ الاولیاء“ میں، مولانا محمد بقا بقا اور بختا و ر خاں نے ”ریاض الاولیاء“ (۵) میں ذکر کیا ہے۔ حضرت داتا صاحب کے حالات کے یہی قدیم ماخذ ہیں۔

ان کے بعد لالہ سبحان رائے بٹالوی نے ”خلاصۃ التواریخ“ میں اور میر غلام علی آزاد بلگرامی نے ”مآثر الکرام“ میں ضمناً ذکر کیا ہے۔ متاخرین میں سے لالہ گنیش داس وڈیرہ نے

۱۔ اذکار ابرار، ترجمہ گلزار ابرار، تالیف محمد غوثی، طبع آگرہ ۱۳۳۶ھ، ص: ۲۵

۲۔ اس سلسلہ کی ایک کڑی ”حیات و تعلیمات حضرت داتا گنج بخش“ مولفہ پروفیسر شیخ عبدالرشید ہے، جسے مرکزی اردو بورڈ لاہور نے شائع کیا ہے۔

۳۔ رسالہ ابدالیہ، نمبر ۴۷، ۱، انڈیا آفس لائبریری لندن، ضمناً در کشف المحجوب۔

۴۔ اس کے خطی نسخے بعض لائبریریوں میں موجود ہیں۔ مفتی غلام سرور لاہوری نے داتا صاحب کے حالات کے سلسلے میں اس سے استفادہ کیا ہے۔

۵۔ کتب خانہ آصفیہ نمبر، ۱۱۵

”چار باغ پنجاب“ میں، مفتی غلام سرور لاہوری نے ”خزینۃ الاصفیاء“ اور ”حدیقۃ الاولیاء“ میں، مولوی نور احمد چشتی نے ”تحقیقات چشتی“ میں حالات لکھے ہیں اور ان کے بعد کے مؤلفین نے ان ہی کی کتابوں سے استفادہ کیا ہے۔

مگر ان سب تذکروں اور تاریخوں کے مندرجات کے پڑھنے سے مستند اور قابل اعتماد تاریخی مواد بہت کم ملتا ہے۔ حتیٰ کہ صحیح سن پیدائش بھی معلوم نہیں ہو سکتا۔ تاریخ وصال میں بھی اختلاف ہے اور حضرت کے ورور لاہور کا مسئلہ بھی خاصا پریشان کن ہے۔ غرض کہ حضرت داتا صاحب کے مستند حالات زندگی اسی قدر ملتے ہیں جتنے انہوں نے خود کشف المحجوب میں بیان کیے ہیں۔

نام و نسب:

ابوالحسن کنیت، علی اسم گرامی ہے۔۔۔ مفتی غلام سرور نے بحوالہ ”تاریخ متقدمین“ شجرہ نسب اس طرح لکھا ہے۔

حضرت مخدوم علی، بن عثمان، بن سید علی، بن عبدالرحمن، بن شاہ شجاع، بن ابوالحسن علی، بن حسین اصغر، بن سید زید شہید، بن حضرت امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ، بن علی کرم اللہ وجہہ۔ (۱)

مشہور ماہر علم انساب پیر غلام دستگیر نامی (م ۱۳۸۱ھ) نے یہی شجرہ نسب ”تاریخ جلیلہ“ (۲) اور ”بزرگان لاہور“ میں درج کیا ہے مگر پانچویں بزرگ کا نام عبداللہ اور قوسین میں شجاع شاہ (۳) تحریر کیا ہے اور درج ذیل نوٹ دیا ہے:

”مفتی غلام سرور نے زید کے ساتھ جو لفظ ”شہید“ لکھا ہے، وہ ٹھیک نہیں، کیونکہ جو زید شہید مشہور ہیں وہ امام زین العابدین بن امام حسین بن علی کے فرزند تھے۔ (رضی اللہ تعالیٰ عنہم)“

آریانا دائرۃ المعارف میں حضرت داتا صاحب پر جو مختصر اور تحقیقی مقالہ درج ہے، اس میں لکھا ہے:

”مولوی غلام سرور لاہوری در خزینۃ الاصفیاء در شرح حال او، از سیادت او ذکر می نماید، واز مآخذ خود نام نمی برد جز اینکه می گوید در تواریخ

۱۔ خزینۃ الاصفیاء، جلد دوم، ص: ۲۳۳

۲۔ تاریخ جلیلہ، طبع دوم ص: ۲۰۴

۳۔ بزرگان لاہور، ص: ۱۸۴

”حضرت، غزنی کے رہنے والے تھے۔ جلاب اور ہجویر غزنی کے محلوں میں سے دو محلے ہیں۔ پہلے جلاب میں قیام پذیر تھے پھر ہجویر میں منتقل ہو گئے تھے۔ ان کے والد ماجد کی قبر غزنی میں ہے۔۔۔ اور ان کی والدہ محترمہ کی مرقد بھی ان کے ماموں تاج الاولیاء کے مزار سے متصل ہے اور ان کے خاندان کے تمام افراد صاحب زہد و تقویٰ تھے۔ (۱)۔۔۔ میں ان کے والدین اور ماموں کے مزارات کی زیارت سے مشرف ہو چکا ہوں“۔ (۲)

ڈاکٹر مولوی محمد شفیع نے تحریر کیا ہے:

”زبیری صاحب کمشنر بہاولپور نے ۲۶ اکتوبر ۱۹۵۹ء کو مجھے بتایا کہ یہ قبریں اب بھی موجود ہیں وہ (زبیری صاحب) غزنی گئے تھے اور انہوں نے ان قبروں کو موجود پایا ہے۔“ (۳)

سال ولادت:

حضرت داتا صاحب قدس سرہ کا سال ولادت کسی قدیم کتاب میں درج نہیں۔ اس دور کے مؤلفین نے ظن و تخمین سے کام لیا ہے۔ پروفیسر نکلسن کا خیال ہے:

”ان کی پیدائش دسویں صدی کے آخری عشرہ میں یا گیارہویں صدی کے ابتدائی عشرہ میں ہوئی ہوگی۔ (۴) یعنی ۳۸۱ء یا ۴۰۱ء۔“

ڈاکٹر مولوی محمد شفیع لکھتے ہیں:

”اندازے سے کہا جاتا ہے کہ ان کی ولادت پانچویں صدی کے شروع میں ہوئی ہوگی۔“ (۵)

ڈاکٹر معین الحق کی رائے یہ ہے:

”بعض لوگوں نے ان کی پیدائش کا سال ۴۰۰ھ لکھا ہے لیکن اس کو یقینی نہیں کہا جاسکتا۔“ (۶)

۱۔ سفیہ الاولیاء (فارسی) از داراشکوہ، طبع کانپور، ۱۹۰۰ء، پار دوم: ص: ۱۶۴

۲۔ ایضاً ص: ۱۶۵

۳۔ مقالات دینی و علمی، حصہ اول، از ڈاکٹر مولوی محمد شفیع، ۱۹۷۰ء، ص: ۲۲۲

۴۔ کشف المحجوب انگریزی ترجمہ از نکلسن، ص: ۱۱ (دیباچہ)

۵۔ مقالات دینی و علمی، ص: ۲۲۲

۶۔ معاشرتی و علمی تاریخ، طبع کراچی، ص: ۲۱

مفتی محمد دین فوق رقم فرماتے ہیں:

”ان کی پیدائش کا فخر ۴۰۰ھ یا ۴۰۱ھ کو حاصل ہوتا ہے۔“ (۱)

سال ولادت کے باب میں مذکورۃ الصدر قیاس آرائیوں کی تائید ”رسالہ ابدالیہ“ سے بھی ہوتی ہے۔ یعنی رسالہ مذکورہ کے مؤلف نے لکھا ہے کہ حضرت علی جویریؒ وقتاً فوقتاً محمود غزنوی کے دربار میں جاتے تھے اور انہوں نے عنقوانِ شباب میں ایک ہندی فلسفی سے مناظرہ بھی کیا تھا۔ (۲) عنقوانِ شباب سے بیس اکیس سال عمر فرض کر سکتے ہیں۔ محمود ۴۲۱ھ میں فوت ہوا لہذا ”رسالہ ابدالیہ“ کی اس روایت کی بناء پر حضرت کا سال ولادت ۴۰۰ھ کے لگ بھگ قرار دیا جاسکتا ہے۔ بقول لین پول، محمود غزنوی ۳۸۸ھ ۹۸۸ء میں سریر آرائے سلطنت ہوا۔ گویا حضرت داتا صاحب، سلطان محمود غزنوی کے دور حکومت میں اس وقت پیدا ہوئے جب کہ وہ پاک و ہند پر متعدد بار حملہ آور ہو چکا تھا اور حضرت داتا صاحب اس غازی کے پاس اس کی زندگی کے آخری دو برسوں میں آتے جاتے رہے ہوں گے۔

اساتذہ:

حضرت داتا صاحب قدس سرہ علوم ظاہری و باطنی کے بحر ذخار تھے۔ ان کی یہ عظمت اس کی واضح دلیل ہے کہ انہوں نے متعدد علماء، وفضلاء سے اکتسابِ علوم کیا ہوگا۔ مولانا جامی نے صرف ”عارف و عالم بودہ“ لعل بیگ لعلی نے ”درفنون علم ماہر بود“ اور مفتی غلام سرور نے ”جامع بود میاں علوم ظاہر و باطن“ لکھنے پر اکتفا کیا ہے۔ مگر کشف المحجوب جہاں داتا صاحب کے مختصر حالات سے آگاہ کرتی ہے، وہاں ان کے ایک باقاعدہ اُستاد کے نام نامی کی نشاندہی بھی کرتی ہے۔۔۔ حضرت نے اپنے ایک اُستاد گرامی ابو العباس بن محمد شقانی کا ذکر نہایت ادب و احترام سے کیا ہے۔ آپ لکھتے ہیں:

مرا باوی انسی عظیم بود و وہ را بر من شفقتی صادق،

و در بعضی از علوم استاد من بود (۳)

حضرت داتا صاحب قدس سرہ جوان عمری ہی میں علوم ظاہری کی تکمیل کر چکے تھے۔ انہیں

۱۔ داتا گنج بخش از محمد دین فوق، ۱۹۲۰ء، ص: ۵

۲۔ فہرست مخطوطات فارسیہ، انڈیا آفس لائبریری، مرتبہ اتھے (Ethe)، ۱۷۷۴ء اور دیباچہ کشف المحجوب

انگریزی ترجمہ از نکلسن، ص: ۱۰

۳۔ کشف المحجوب طبع تہران۔ ص: ۲۱۰

فطرتاً ولی اللہ ہونے کا مقام و مرتبہ حاصل تھا۔ یعنی وہ بطینِ مادر ہی سے ولی کامل پیدا ہوئے تھے۔ صاحب رسالہ ابدالیہ کا بیان ہے:

”حضرت شیخ علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ نے سلطان محمود غزنوی (م ۴۲۱ھ) کی موجودگی میں بمقام غزنی ایک ہندو فلسفی سے مناظرہ کیا اور اسے اپنی روحانی قوت سے ساکت و صامت کر دیا۔“ (۱) ظاہر ہے کہ یہ مناظرہ سلطان محمود غزنوی کی زندگی کے آخری برسوں میں ہوا ہوگا اور اس وقت حضرت کی عمر بیس برس کے لگ بھگ ہوگی۔

مرشد ارشد:

حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ سلسلہ جنیدیہ میں حضرت ابوالفضل محمد بن الحسن النخعی قدس سرہ (۲) (م ۴۶۰ھ) سے بیعت تھے۔ شجرہ طریقت سلطان ولایت حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم تک اس طرح منتہی ہوتا ہے:

”حضرت شیخ علی ہجویری مرید شیخ ابوالفضل محمد بن حسن نخعی کے، وہ مرید حضرت شیخ حصری کے، وہ مرید حضرت شیخ ابوبکر شبلی کے، وہ مرید حضرت جنید بغدادی کے، وہ مرید شیخ سزوی سقطی کے، وہ مرید حضرت معروف کرخی کے، وہ مرید حضرت داؤد طائی کے، وہ مرید حضرت حبیب عجمی کے، وہ مرید حضرت حسن بصری کے اور وہ مرید حضرت علی المرتضیٰ کے (رضی اللہ تعالیٰ عنہم)“

حضرت داتا صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اپنے پیر و مرشد کے علوم مقام کے بارے میں لکھتے ہیں:

”صوفیاء متاخرین میں سے اوتاد کی زینت اور عابدوں کے شیخ ابوالفضل محمد بن الحسن النخعی ہیں، طریقت میں میری اقتداء (بیعت) انہی سے ہوئی، علم اور تفسیر و روایات (حدیث) کے عالم تھے اور تصوف میں حضرت جنیدؒ کا مذہب رکھتے تھے۔ حضرت حصریؒ کے راز دار مرید تھے۔ ابو عمر قزوینی اور ابوالحسن سالبہ کے ہم عصر تھے۔ صحیح گوشہ نشینی کے لیے ساٹھ سال تک تنہائی کی تلاش میں پھرتے رہے اور مخلوق کے ذہنوں سے اپنا نام محو کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ زیادہ تر جبل لکام (۳) میں قیام پذیر رہے، عمر طویل پائی، اپنی

۱۔ دیباچہ کشف المحجوب (انگریزی ترجمہ از نکلسن)، ص: ۱۰

۲۔ نخل یا ختلان، بدخشاں کے مغرب میں دریائے جیخوں کے دائیں کنارے پر واقع ایک مقام کا نام ہے۔

۳۔ جبل لکام سلسلہ کوہ لبنان کا وہ حصہ ہے جو انطاکیہ اور مقبیصہ سے متصل ہے۔

ولایت کی بہت سی دلیلیں اور نشانیاں رکھتے تھے لیکن صوفیاء کی رسوم و لباس کے پابند نہ تھے اور رسوم میں جکڑے ہوئے صوفیوں سے درشتی سے پیش آتے تھے۔ میں نے ان سے زیادہ کسی کو باہمت نہیں دیکھا۔“ (۱)

جس روز حضرت نختلیؒ کا وصال ہوا، حضرت داتا صاحبؒ ان کی خدمت میں حاضر تھے اور مرشد نختلیؒ نے مرید ہجویریؒ کی گود میں جان جانِ آفرین کے سپرد کی تھی۔ اس واقعہ کو یوں بیان فرماتے ہیں:

”حضرت شیخ نختلیؒ بروز وصال بیت الجن میں تھے، یہ ایک گاؤں ہے گھائی پر، جو بانیار (رود بانیاں) اور دمشق کے درمیان واقع ہے۔ دم رحلت ان کا سر میری گود میں تھا اور میرا دل انسانی فطرت کے مطابق ایک سچے دوست کی جدائی پر رنجیدہ تھا۔ اس حالت میں انہوں نے فرمایا: اے بیٹا میں تمہیں اعتقاد کا ایک مسئلہ بتاتا ہوں، اگر اس پر مضبوطی سے عامل رہو گے تو تمام تکلیفوں سے محفوظ رہو گے۔ یہ سمجھ لیجئے کہ تمام مواقع اور حالات میں نیک اور بد کو پیدا کرنے والا خدائے عزوجل ہے، لہذا اس کے کسی فعل پر کبیدہ نہ ہونا اور رنج کو اپنے دل میں جگہ نہ دینا۔۔۔ اس کے علاوہ اور کوئی لمبی وصیت نہیں کی اور جاں بحق تسلیم ہو گئے۔“ (۲)

حضرت بایزید بسطامی اور مشائخ طیفوریان (رحمہم اللہ) ”سکر“ کو ترجیح دیتے تھے اور حضرت جنیدؒ اور ان کے پیروکار ”صحو“ کو ”سکر“ پر فضیلت دیتے تھے۔ حضرت نختلیؒ اور حضرت ہجویری (رحمہما اللہ) جنیدی ہونے کی وجہ سے صحو کی فضیلت کے قائل تھے۔ کشف المحجوب میں اپنے مرشد کی رائے نقل فرماتے ہیں کہ ”سکر“ بازیچہ اطفال اور ”صحو“ مردوں کا میدان فنا ہے:

”شیخ من گفتی ووی جنیدی مذہب بود کہ سکر بازی گاہ کو دکان است و صحو فنا گاہ مردان و من کہ علی بن عثمان الجلابی ام، می گویم: بر موافقت شیخم“ (۳)

سید محمد نور رحمہ اللہ (م ۸۶۹ھ) بانی سلسلہ نور بخشیہ جن کے سلسلہ سے منتسبین اپنے شیخ کے مسلک سے ہٹ کر گمراہ اور بے دین ہو چکے ہیں، نے حضرت داتا صاحبؒ کو دو بزرگوں شیخ نختلیؒ

۱۔ کشف المحجوب، طبع تہران، ص: ۲۰۸ ۲۔ ایضاً، ص: ۱۰۹

۳۔ ایضاً، ص: ۲۳۲

اور شیخ ابوالقاسم گرگانی کا مرید و خلیفہ لکھا ہے:

”حضرت علی ہجویری ہم ازیں سلسلہ (جنیدیہ)

منسلک است کہ او مرید (و) خلیفہ دو مشائخ اند، یکے شیخ

ابو القاسم گرگانی... دوم شیخ ابو الفضل ابن ختلی“ (۱)

مگر حقیقت یہ ہے کہ شیخ گرگانی، داتا صاحب کے شیخ صحبت یا شیخ تربیت ہیں نہ کہ

پیر بیعت۔

ہم عصر مشائخ سے استفادہ:

حضرت شیخ ختلی کے علاوہ اور بھی بہت سے مشائخ کرام فیض صحبت و شرف مکالمت سے

بہرہ یاب ہوئے جن کا ذکر خیر کشف المحجوب میں مسطور ہے۔ مثلاً ابوالقاسم بن قاسم بن

عبداللہ لگرگانی قدس سرہ کے بارے میں فرماتے ہیں:

”مرا باوی اسرار بسیار بود و اگر باظہار آیات مشغول

شوم از مقصود باز مانم“۔ (۲)

ابوالقاسم امام قشیری قدس سرہ سے بھی صحبتیں رہیں اور ان کا ذکر بڑی عقیدت کے ساتھ

کیا ہے:

”استاد امام وزین اسلام عبدالکریم ابوالقاسم بن ہوازن

القشیری اندر زمانہ خود بدیع ست و قدرش رفیع ست و

منزلت و بزرگ و معلوم ست اہل زمانہ را از روزگاروی و

انواع فضلہش، اندر ہرفن ویرا لطائف بسیار است

و تصانیف نفیس جملہ باتحقیق و خداوند تعالیٰ حال

و زبان ویرا از حشو، محفوظ گردا نیدست“۔ (۳)

حضرت شیخ احمد حمادی سرخسی قدس سرہ کے ساتھ ماوراء النہر میں محبت و دوستی رہی۔ ان

کے بارے میں رقم طراز ہیں:

”خواجہ احمد حمادی سرخسی مبارز وقت و مدتی رفیق

۱۔ کتاب سلسلۃ الذهب، شجر الاولیاء از سید نور بخش، طبع لاہور ۱۹۷۲ء حصہ دوم، ص: ۲۲

۲۔ کشف المحجوب، تہران ص: ۲۱۲

۳۔ ایضاً، ص: ۲۰۹

من بود واذکار وی عجائب بسیار دیدم وی از جوان مردان
متصوفہ بود۔۔۔۔۔“ (۱)

حضرت ابو جعفر محمد بن المصباح الصید لانی قدس سرہ جو صاحب تصانیف عالم و عارف
تھے، ان کی تصانیف ان ہی کے رو برو پڑھیں:

”شیخ بزرگوار ابو جعفر محمد بن المصباح الصید لانی
از روساء متصوفہ بود و زبانی نیکو داشت اندر تحقیق و
میلی عظیم داشت بہ حسین بن منصور و بعضی
از تصانیف وی برو خواندم۔“ (۲)

حضرت ابوسعید ابوالخیر شیخ ابوالاحمد المظفر بن احمد بن حمدان رحمہم اللہ اور متعدد دیگر اولیاء اللہ
سے ملاقاتوں کا حال کشف المحجوب کے مختلف مقامات پر مذکور ہے۔ صرف خراسان میں تین سو
صوفیاء سے ملاقات کا ذکر کیا ہے۔ (۳)

حضرت خضر علیہ السلام سے استفادہ:

لعل بیگ لعلی نے لکھا ہے حضرت شیخ علی ہجویریؒ بہت سے اولیاء وقت کو ملے اور ان کے
ہم صحبت رہے۔ نیز حضرت خضر علیہ السلام سے گہری دوستی رکھتے تھے اور ان سے علم ظاہری و باطنی
حاصل کیا تھا:

”و بسیاری از اولیاء وقت را در یافتہ و با ایشان ہم صحبت
بودہ و با خضر علیہ السلام دوستی عظیم داشتہ و از
وی علم ظاہری و باطنی فرامی ستدہ۔“ (۴)

حنفی المذہب:

حضرت داتا صاحب رحمۃ اللہ علیہ حنفی المذہب تھے۔ سیدنا حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رضی
اللہ تعالیٰ عنہ سے خاص عقیدت رکھتے تھے۔ اسی سبب سے انہوں نے امام موصوف کا نام نامی و اسم
گرامی نہایت تعظیم و تکریم سے اس طرح رقم فرمایا ہے:

۲۔ ایضاً ص: ۲۱۱

۱۔ کشف المحجوب، طبع تہران، ص: ۲۱۶

۳۔ کشف المحجوب، طبع سمرقند، ص: ۲۱۶

۴۔ ثمرات القدس (خطی) (مملوکہ صاحبزادہ نصرت نوشاہی، شرفپور شریف)

”امام امامان و مقتدائے سننیاں، شرف فقہاء و عز علماء،

ابوحنیفہ بن نعمان بن ثابت الخراز رضی اللہ عنہ“ (۱)
 حضرت امام اعظم رضی اللہ عنہ کے کمالات کو تفصیل سے بیان کرتے ہوئے اپنا ایک ایمان افروز خواب بیان کیا ہے اور اس سے ایک نہایت لطیف نکتہ اخذ کیا ہے، فرماتے ہیں:

”میں ملک شام میں تھا کہ ایک دفعہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ مؤذن رسول (ﷺ) کے روضہ اطہر کے سرہانے سو گیا اور خواب میں دیکھا کہ میں مکہ معظمہ میں ہوں اور جناب پیغمبر ﷺ باب بنی شیبہ سے اندر تشریف لائے ہیں اور ایک بوڑھے شخص کو گود میں لیے ہوئے ہیں، جس طرح کہ بچے کو شفقت سے گود میں لیتے ہیں۔ میں دوڑ کر حضور انور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور سرکار ﷺ کے پائے اقدس کو بوسہ دیا۔۔۔۔ میں حیران تھا کہ یہ بزرگ کون ہیں جنہیں حضور نے اٹھایا ہوا ہے۔ حضور ﷺ بہ قوت معجزہ میرے اس باطنی خیال سے آگاہ ہو گئے اور ارشاد فرمایا: یہ شخص تیرا اور تیرے ملک والوں کا امام یعنی ابوحنیفہ ہے۔

مجھے اس خواب سے اپنے آپ اور اپنے وطن والوں سے بڑی امیدیں قائم ہو گئیں اور مجھے اس خواب سے یہ راز بھی منکشف ہوا کہ حضرت امام اعظم رضی اللہ عنہ ان لوگوں میں سے ہیں جو اپنے ذاتی اوصاف سے فانی ہو چکے ہیں اور صرف احکام شرع کے لیے باقی و قائم ہیں، اس لیے کہ ان کے حامل اور رہبر خود جناب پیغمبر خدا ﷺ ہیں اور انہیں خود چلتے دیکھتا تو یہ سمجھتا کہ وہ باقی الصفت ہیں اور جو باقی الصفت ہوتا ہے وہ اجتہادی امور میں مخطی ہوتا ہے یا مصیب۔ چونکہ انہیں اٹھا کر لے جانے والے حضور پر نور ﷺ ہیں۔ اس لیے وہ اپنی ذاتی صفات سے فانی اور رسول اللہ ﷺ کی صفات سے باقی ہیں۔ جب پیغمبر سے کسی خطا کا صدور ممکن نہیں تو جو آنحضرت ﷺ میں اپنے آپ کو فنا کر چکا ہے، اس سے بھی خطا کا صدور ممکن نہیں۔ یہ ایک لطیف رمز ہے۔“ (۲)

نکاح:

عبدالماجد دریا آبادی لکھتے ہیں:

”قید ازدواج سے، معلوم ہوتا ہے کہ ہمیشہ آزادی رہی، البتہ ایک مقام پر آپ بیتی یوں بیان کرتے ہیں کہ جیسے غائبانہ کسی سے تعلقاتِ محبت قائم ہو گئے ہوں اور ایک سال تک اس زخم

۱۔ کشف المحجوب، طبع سمرقند، ص: ۱۱۷

۲۔ ایضاً، ص: ۱۲۱

لطیف کے بسمل بنے رہے، پھر آخر اس سے نجات مل گئی۔ بیان اتنا مجمل ہے کہ تفصیلات کا کچھ پتہ نہیں چلتا، لکھا ہے: (۱)

”منکہ علی بن عثمان الجلابی ام از پس آنکہ مراحق تعالیٰ یازده سال از آفت تزویج نگاہ داشته بود ہم بتقدیر وی بفتنه اندر افتادم و ظاہر و باطنم اسیر صفتی شد کہ بامن کردند بی آنکہ رویت بودہ ویک سال مستغرق بودم، چنانکہ نزدیک بود کہ دین بر من تباہ شود تاحق تعالیٰ مرابکمال لطف و تمام فضل خود عصمت را باستقبال دل بیچاره من فرستاد و برحمت خلاصی ارزانی داشت والحمدلله علی جزیل نعمائہ۔“ (۲)

پروفیسر نکلسن نے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ:

”ازدواجی زندگی کے متعلق ان کا تجربہ بہت مختصر اور ناخوشگوار تھا۔“ (۳)

ڈاکٹر مولوی محمد شفیع نے اس سلسلے میں اپنی رائے کا اظہار یوں کیا ہے:

”شادی کے متعلق ان کو جو معاملہ پیش آیا وہ خوش آئند ثابت نہ ہوا۔“ (۴)

اور حاشیہ میں لکھا ہے کہ:

میور (۲۸۹) یہ خیال کرتا ہے کہ: ”اس کا مطلب یہ ہوا کہ حضرت بغیر شادی

کے رہے۔“

سید صباح الدین عبدالرحمن رقمطراز ہیں:

”تعلقات زناشوی سے پاک رہے۔“ (۵)

مگر اسی مجمل عبارت سے جناب محمد دین فوق مرحوم نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ حضرت نے

ایک سے زیادہ شادیاں کیں، لکھتے ہیں:

”حضرت نے اپنی پہلی شادی کا ذکر کہیں نہیں کیا کہ کب ہوئی، کہاں ہوئی؟ جہاں انہوں

۱۔ تصوف اسلام، طبع سوم، ص: ۴۷

۲۔ کشف المحجوب، طبع سمرقند، ص: ۴۷

۳۔ دیباچہ کشف المحجوب (انگریزی ترجمہ نکلسن) ص: ۱۰

۴۔ مقدمہ کشف المحجوب: نسخہ مولوی محمد شفیع، ۱۶۶۸ھ، ص: ۳

۵۔ بزم صوفیہ، از سید صباح الدین عبدالرحمن، ص: ۷

نے دوسری شادی کا ذکر کیا ہے اور یہ لکھا ہے کہ: ”گیارہ سال سے خدا تعالیٰ نے نکاح کی آفت سے بچایا ہوا تھا، آخر مقدر نے اس میں پھنسا دیا اور میں غیال کی محبت میں دل و جان سے بن دیکھے ہی گرفتار ہو گیا۔۔۔۔۔ یہ الفاظ ظاہر کرتے ہیں کہ آپ ”بچپن میں ہی مناکحت کی زنجیروں میں جکڑ دیئے گئے تھے اور پہلی بیوی کے انتقال کے بعد گیارہ سال تک دوسرا نکاح نہیں کیا تھا، معلوم ایسا ہوتا ہے کہ آپ کی پہلی شادی بھی والدین کی موجودگی میں ہی ہوئی تھی اور دوسری شادی بھی ان کی موجودگی بلکہ یقیناً ان ہی کے اصرار سے ہوئی ہوگی۔“

پھر ذرا آگے چل کر لکھتے ہیں:

”چنانچہ (داتا صاحب) لکھتے ہیں ایک سال تک اس آفت میں غرق رہا، یہاں تک کہ قریب تھا کہ میرا دین تباہ ہو جائے کہ خدا تعالیٰ نے اپنی کمال مہربانی اور بخشش اور رحمت سے مجھے خلاصی عطا کی۔ یہ الفاظ ظاہر کرتے ہیں کہ ایک سال کے بعد آپ کی دوسری بیوی کا بھی انتقال ہو گیا اور پھر آپ نے تادم وصال نکاح کا نام نہیں لیا۔۔۔۔۔“ (۱)

فوق صاحب نے اس عبارت کا ٹھیک ترجمہ نقل نہیں کیا اور اس سے جو نتیجہ اخذ کیا ہے وہ بھی درست نہیں۔ لہذا زیر بحث اقتباس کا ترجمہ یہاں پیش کرنا ضروری ہے۔
حضرت داتا صاحب قدس سرہ فرماتے ہیں:

”اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے مجھے گیارہ سال تک نکاح کی آفت سے محفوظ رکھا ہوا تھا۔۔۔۔۔ مگر بہ تقدیر الہی میں پھر اس فتنہ میں گرفتار ہو گیا اور میرا ظاہر و باطن اس (کسی عورت) کی صفات کا جو مجھ سے دوسروں نے بیان کی تھیں، اسیر ہو گیا اور اسے دیکھے بغیر ہی ایک سال تک اس کے خیال میں مستغرق رہا۔ چنانچہ قریب تھا کہ میرا دین تباہ ہو جاتا، اللہ تعالیٰ نے اپنے کمال لطف اور فضل تمام سے عصمت (گناہ سے بچنے کی قوت) کو میرے پیچارہ دل کے استقبال کے لیے بھیجا اور اپنی رحمت سے مجھے اس فتنہ سے نجات دلائی۔“ (۲)

اس عبارت پر غور کیا جائے تو حسب ذیل نتائج سامنے آتے ہیں:

(۱) حضرت نے نکاح کیا تھا مگر اہلیہ جو ان کی مزاج شناس نہ تھیں، وفات پا گئیں۔ پھر گیارہ سال تک تزویج کے تصور و خیال سے بھی نا آشنا رہے۔

(ب) گیارہ سال بعد ایک عورت جسے انہوں نے دیکھا بھی نہیں تھا، محض دوسروں سے اس کی

(۱)۔ داتا گنج بخش، مطبوعہ، ۱۹۲۰ء، ص: ۱۳-۱۲

(۲)۔ کشف المحجوب، طبع سرقد، ص: ۳۶۶

خوبیاں معلوم ہونے پر اس کی محبت میں اسیر ہو گئے اور ایک سال تک اس عشق مجازی میں مبتلا رہے۔

(ج) صوفیاء کے نزدیک عشق مجازی میں گرفتار ہونا، ابتلاء میں مبتلا رہنا ہے۔ یہ حضرات مجاز میں گرفتاری کو مصیبت و آفت سمجھتے ہیں اس لیے کہ یہ منزل نہیں ہے۔ الممجاز قنطرة الحقیقة۔ تو قدرت الہی نے انہیں مجاز سے نکال کر حقیقت کی راہ پر ڈال دیا اور جو لوگ صورت ظاہری اور مظاہر محسوسہ کے چکر میں پھنسے رہتے ہیں، وہ برباد ہو جاتے ہیں۔ شیخ عطار فرماتے ہیں:

ہر کہ شد در عشق صورت مبتلا

ہم ازاں صورت افتد در صد بلا

حاصل کلام یہ کہ حضرت نے ایک شادی کی تھی، اہلیہ کی وفات کے گیارہ سال بعد ایک ایسی عورت کی خوبیوں پر فریفتہ ہو گئے جسے انہوں نے دیکھا نہیں تھا اور ایک سال تک اس کے عشق میں مبتلا رہے۔ بالآخر اللہ تعالیٰ نے ان کے دل سے اس عورت کا خیال محو فرما دیا۔ لہذا دوسری شادی کا افسانہ محض اختراع طبع ہے۔

تصانیف:

حضرت داتا صاحب قدس سرہ کی آخری تصنیف کشف المحجوب کے مطالعہ سے ان کی نو (۹) اور تصانیف کے نام معلوم ہوتے ہیں مگر ان میں سے ایک بھی دستیاب نہیں۔ بعض کے سرقہ اور دوسروں کا اپنی طرف منسوب کر لینے کا واقعہ حضرت نے خود لکھا ہے۔ بہر حال ان نو تصانیف کے نام یہ ہیں:

۱۔ دیوان: اس دیوان کو کسی نے اپنی طرف منسوب کر لیا۔ (کشف المحجوب ص: ۲) مگر یہ نہیں بتایا کہ یہ مجموعہ اشعار فارسی میں تھا یا عربی میں اور اپنا تخلص بھی ظاہر نہیں فرمایا۔ اس کے باوجود کشف اسرار کے وضع نے ان کا ”علی“ تخلص گھڑ کر ایک غیر معیاری غزل اور چند اشعار بھی شامل کر دیئے ہیں۔

۲۔ کتاب فنا و بقا: مسئلہ فنا و بقا میں۔ (کشف المحجوب، ص: ۶۷)

۳۔ اسرار الخرق والمؤونات: ظاہری اور باطنی مرقعہ کے آداب میں۔ (کشف المحجوب، ص: ۶۳) اس کتاب کا نام فارسی کے تمام ایڈیشنوں میں یہی لکھا ہے مگر ڈوکونفسکی ایڈیشن میں ”اسرار الخرق و المملونات“ درج ہے۔

۴۔ الرعاۃ بحقوق اللہ تعالیٰ: مسائل توحید پر۔ (کشف المحجوب: ص ۳۶۰) اس نام کی ایک تصنیف شیخ احمد بن خضرو یہ متوفی ۲۴۰ھ کی بھی ہے جو کشف المحجوب کے مآخذوں میں شامل ہے اور اسی نام کی ایک کتاب ابو عبد اللہ الحارث بن اسد المحاسبی (م ۲۴۳ھ) کی تصنیف بھی ہے جو لندن سے چھپ چکی ہے۔

۵۔ کتاب البیان لاہل العیان: در معنی جمع و تفرقہ۔ (کشف، ص ۳۳۳)

۶۔ نحو القلوب: مسدّد جمع پر مفصل کتاب ہے۔ (کشف، ص ۳۳۳)

۷۔ منہاج الدین: طریقت، تصوف اور مناقب اصحاب صفہ پر مشتمل ہے اور حسین بن منصور حلاج کا حال بھی بیان کیا ہے۔ (کشف، ص: ۱۹۲، ۹۶، ۲) دیوان کی طرح اسے بھی کسی نے اپنی طرف منسوب کر لیا۔

۸۔ ایمان: ایمان اور اثبات اعتقاد مشائخ میں ایک رسالہ لکھا جس کا نام نہیں بتایا۔ (کشف، ص: ۳۶۸)

۹۔ شرح کلام منصور: حسین بن منصور حلاج کے کلام کی شرح (کشف، ص: ۱۹۲)

ژوکوفسکی کا سہو:

فاضل موصوف نے حضرت شیخ کی تصانیف میں ایک نام ”فرق فرق“ دیا ہے۔ (۱) حالانکہ یہ اُن کی کسی مستند تصنیف کا نام نہیں بلکہ یہ کشف المحجوب کے ایک باب کا نام ہے۔ تفصیل اس کی اس طرح ہے کہ حضرت داتا صاحبؒ نے بغداد شریف کے نواح میں ملاحظہ کا ایک ایسا گروہ دیکھا جو حضرت حسین بن منصور حلاج رحمۃ اللہ علیہ سے محبت کا مدعی تھا اور ان کے کلام سے اپنی زندگی کو سہارا دیتا تھا اور حلاج کے معاملہ میں مبالغہ کرتا تھا، جس طرح کہ روانض حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کی محبت میں غلو کرتے ہیں۔ اس کے بعد فرماتے ہیں:

”اندر ردّ کلمات ایشان بابی بیا ورم اندر فرق فرق انشاء

اللہ عزوجل۔“ (۲)

”بابی بیا ورم“ سے ژوکوفسکی کا ذہن ایک مستقل تصنیف کی طرف منتقل ہو گیا حالانکہ

اس کی مصحح و محشی کشف المحجوب کا تیرھواں اور مطبوعہ سمرقند کا یہ چودھواں باب ہے۔

۱۔ مقدمہ کشف المحجوب از ژوکوفسکی، طبع طهران، ص: ۵۰

۲۔ کشف المحجوب، طبع طهران، ص: ۱۹۲

”باب فی فرق فرقتهم ومذاہبهم و آیاتہم ومقاماتہم

وحکایاتہم“ (۱)

کشف الاسرار: آٹھ صفحات پر مشتمل یہ رسالہ حضرت داتا صاحبؒ کی طرف منسوب ہے جو غالباً پہلی بار مطبع محمدی لاہور میں طبع ہوا۔ (۲) پھر اس کے متعدد اردو ترجمے شائع ہوئے۔ طرفہ یہ کہ اکثر محققین نے اسے حضرت داتا صاحبؒ کی تصنیف سمجھ لیا اور اس سے استفادہ کرتے رہے۔ حالانکہ یہ رسالہ بزبان حال اپنے وضعی ہونے کی خود شہادت دے رہا ہے۔ اس سلسلے میں سیر حاصل مقالہ پھر کبھی لکھا جائے گا۔ سر دست اس کی صرف نقاب کشائی کرنا مقصود ہے:

(۱)۔ کشف الاسرار کے جعلی ہونے کا بین ثبوت یہ ہے کہ یہ سبک ہندی میں ہے اور کشف المحجوب کی نثر دویر اول یعنی دویر سامانیاں کی ہے اور ان دونوں کی زبان میں فرق کرنا کچھ مشکل نہیں ہے۔

(ب)۔ اس کا مؤلف اپنے پراگندہ خیالات کو ایک مشہور و معروف بزرگ کے نام سے مشہور دیکھنے کا خواہاں تھا یا اپنے کسی بڑے (جیسا کہ حسام الدین کا نام لیا ہے) کو داتا صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے پہلے کا بزرگ ثابت کر کے اپنی دکان چکانا چاہتا تھا۔ (۳) علمی اعتبار سے بھی بے مایہ ہے۔

(ج)۔ یہ تاریخی حقیقت ہے کہ ”پنج ہزاری“ اور ”نہفت ہزاری“ خطابات مغلیہ دور میں ایجاد

۱۔ کشف المحجوب، طبع تہران، ص: ۲۱۸

۲۔ اس رسالہ پر سن اشاعت تحریر نہیں مگر ڈاکٹر مولوی محمد شفیع کا بیان ہے کہ چھ ورق کا ایک رسالہ ”نقر نامہ“ مشہور ہے ”کشف الاسرار“ کے نام سے کشف المحجوب ہی پر مبنی کر کے شاید ۱۸۷۰ء میں لاہور ہی سے شائع ہوا (مقالات دینی و علمی حصہ اول، ص: ۲۲۸)

۳۔ حضرت داتا صاحبؒ کے مزار کی مرہمیت کے پیش نظر کئی اور مزاروں کے مجاوروں نے یہ مشہور کر دیا کہ یہ داتا صاحبؒ سے پہلے کے بزرگ ہیں اور داتا صاحبؒ یہاں حاضری دیتے رہے ہیں۔ چنانچہ سید احمد توختہ ترمذی کی صاحبزادیوں کے مزارات (قبور پیمان پاک دامن) کے مجاوروں نے دور آخر کے مؤلفوں سے یہ لکھوا دیا کہ یہ سیدزادیاں کربلا کے حادثہ فاجعہ کے بعد لاہور آگئی تھیں۔ اس طرح حضرت پیر کی ”کے مجاوروں نے عوام میں یہ مشہور کر رکھا ہے کہ داتا صاحبؒ کا فرمان ہے کہ میرے پاس آنے سے پہلے اُن کے مزار پر حاضری دیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ بعض لوگ تو حضرت پیر کی ”کو حضرت داتا صاحبؒ کا اُستاد کہنے سے بھی نہیں چوکتے وغیرہ وغیرہ۔

ہوئے۔ یعنی حضرت داتا صاحبؒ کے کئی سو سال کے بعد۔۔۔ مگر کشف الاسرار کا واضح لکھتا ہے کہ:

”بفہم اگر ہفت ہزاری گردی چہ شد مُشتِ گردِ ہستی“ (۱)
 ”ہفت ہزاری“ کی تو بات ہی کچھ ایسی ہے کہ آج کوئی صاحب اپنے آبا جان کا تذکرہ لکھنے بیٹھیں تو یہ بیان فرمائیں کہ وائسرائے ہند نے انہیں اعلیٰ خدمات کے صلے میں ”ستارہ خدمت“ کا خطاب عطا کیا تھا۔

(د)۔ لکھا ہے: پسری تولد شد امام بخش نام نہادند۔۔۔ (۲) ظاہر ہے کہ داتا صاحبؒ کے زمانہ میں ایسے نام رائج نہ تھے۔

(ہ)۔ رسالہ کے آخر میں تحریر ہے:

”از گفته من رنجی نہ کنی و غصہ نہ کنی کہ من راست گفته ام“

ع بر رسولان بلاغ باشد و بس“ (۳)

شیخ سعدیؒ کا مصرع داتا صاحبؒ کا نقل کرنا کرامت ہی سمجھا جاسکتا ہے۔
 (و) لکھا ہے:

”اے علی! ترا خلق می گوید گنج بخش دانه پیش خود نہ
 داری در دل خود جامدہ کہ پندار است گنج بخش ورنج
 بخش حق است“۔ (۴)

”کشف الاسرار“ پر اعتماد کرنے والے مؤلفین نے اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ حضرت شیخ علی ہجویریؒ اپنی زندگی ہی میں اس لقب سے ملقب ہو گئے تھے۔ مگر یہ خیال بالکل بے بنیاد ہے۔ حضرت شیخؒ اس صحیح اور جائز لقب سے تقریباً پانچ سو سال بعد ملقب ہوئے۔ مفتی غلام سرور نے جو یہ لکھا ہے کہ حضرت خواجہ معین الدین اجمیری قدس سرہ نے انہیں ”گنج بخش“ کہا، قدیم تذکروں اور ملفوظاتِ خواجگانِ چشت سے ہرگز ہرگز اس کی تائید نہیں ہوتی:

(ز)۔ اس وضاع (مؤلف کشف الاسرار) کی دین سے خبرداری ملاحظہ ہو:

”در تفسیر آمدہ است و از حسام الدین لاہوری شنیدم“

۱۔ کشف الاسرار، طبع لاہور، ص: ۴

۲۔ ایضاً، ص: ۷

۳۔ ایضاً، ص: ۵

۴۔ ایضاً، ص: ۸

اگر مردی برگور ملد و پدر سجود کند کافر نمی شود“ (۱)

اب ”کشف الاسرار“ اور ”کشف المحجوب“ کے بیانات میں تضاد ملاحظہ ہونے لگا۔
کشف الاسرار کشف المحجوب

از قبلہ خود شنیدہ بودم

زاد من ہجویر است (۲)

یعنی ہجویران کا دوسرا مسکن تھا:

”من کہ علی بن عثمان الجلابی ام

”معشوق بگزیں و جان

از بس آنکہ مرا حق تعالیٰ یازدہ سال از

خود را فدای او کن و بگو کہ اگر

آفت تزویج نگاہ داشتہ بود ہم بہ تقدیر

جان در راہ او فدا شود بہ

وی بفتنہ اندر افتادم و ظاہر و باطنم

است۔“ (۳)

اسیر صفتی شد کہ بامن کرند بی آن

کہ رویت بودہ ویک سال مستغرق

بودم چنانکہ نزدیک بود کہ دین بر من

تباہ شود تاحق تعالیٰ بہ کمال لطف

و تمام فضل خود عصمت را باستقبال

دل بیچارہ من فرستاد و برحمت

خلاصی ارزانی داشت والحمدلله

علی جزیل نعمائہ“ (۴)

حضرت داتا صاحب ”عشق مجازی سے نجات پر خدا کا شکر بجالا رہے ہیں، اس لیے کہ

اس میں دین کے تباہ ہونے کا خطرہ تھا مگر صاحب کشف الاسرار معشوق پر فدا ہونے کی تلقین کر رہا

ہے۔ اگر اس سے عشق حقیقی مراد ہو تو بھی یہ داتا صاحب ”کا انداز بیان نہیں ہے:

من اندر نیار بند در بلدہ لہا نور کہ از

چوں در بند وستان آمدم

مضافات ملتان است در میان

نواحی لاہور و اجنت مثال

ناجسناں گرفتار شدہ بودم۔ (۶)

یافتم۔ (۵)

۲۔ کشف الاسرار، ص: ۴

۱۔ کشف الاسرار، ص: ۳

۴۔ کشف المحجوب، طبع سمرقند، ص: ۴۲

۳۔ کشف الاسرار، ص: ۴

۶۔ کشف المحجوب، طبع سمرقند، ص: ۱۵۱

۵۔ کشف الاسرار، ص: ۳

”کشف المحجوب“ کی عبارت تو یہ واضح کر رہی ہے کہ حضرت داتا صاحب لاہور میں اپنے آپ کو نا جنسوں میں قید سمجھ رہے ہیں اور ”کشف الاسرار“ ان کے لیے اس ماحول کو جنت مثال قرار دے رہی ہے اور داتا صاحب کے زمانے میں لاہور کو ”لہانور“ یا ”لہاور“ وغیرہ لکھا جاتا تھا۔ لاہور اس وقت نہیں لکھا جاتا تھا۔

”بیت و اشعار بسیار گفته ام دیوانی گفتم
بسیار مطبوع و پسندیده و از نظر خود
گزینان بر آمدہ“ اے طالب من! ہر روز
برائے دیدن دیدار یار می روم، لیکن گاہی
گاہی بنظر من آن ماہ خنداں می آید
و دیوان را بدیں حالت گفته بودم و قتی
کہ روی یار دیدم غزل از بہانم بے فکر بر
آمدی دران فکری نہ کردہ ام (۲)

..... من ایں حادثہ افتاد
دوبار، یکی آنکہ دیوان شعرم
کسی بخواسست و باز گرفت
و اصل نسخه جزآن نہ بود
، آن جملہ بگردانید و نام من
از سر آن بیفگند و رنج من
ضائع گردانید تا ب اللہ
علیہ۔“ (۱)

”کشف الاسرار“ کے ان اقتباسات سے واضح ہے کہ یہ اندازِ بیاں اور طرزِ زندگی صاحبِ محمود داتا صاحب کا نہیں ہے اور انہوں نے اپنے دیوان کے سرقہ کا ذکر بڑے دکھ کے ساتھ کیا ہے۔ نیز پوری کشفِ انجوب میں اپنا کوئی شعر درج نہیں کیا۔ مگر اس وضاع نے ایک غیر معیاری غزل اور دو اشعار بھی ان کے سر منڈھ دیئے ہیں:

قارئین کرام کی تفریحِ طبع کے لیے ایک اور اقتباس نقل کر کے اس بحث کو ختم کرتا ہوں:

”پیری بود شیخ بزرگ نام او شان مرا گفتند کہ اے علی
کتابی درین عمر تصنیف بکن کہ یا دگاری تو بماند گفتم
”یا ایہا الشیخ ان لا یعلم من علم“ بسیار چسپید سن من
الحال اثنا عشر کہ بستند، در میان ہمیں عمر در بلده ہجویر
تصنیف کردہ ام، اور ادا دم او مرا گفت کہ تو بزرگ خواہی
شد.....“ (۳)

اس کی خوبیاں اور لطافتیں تو عیاں ہی ہیں مگر کشف المحجوب میں اس واقعہ کا کوئی

۲۔ کشف الاسرار، ص: ۷

۱۔ کشف المحجوب، ص: ۲

۳۔ کشف الاسرار، ص: ۴

ذکر نہیں ملتا۔۔۔ تفریح طبع کا سامان اس میں یہ ہے کہ اس کا مؤلف چونکہ لاہور کا باشندہ ہے اور یہاں بے حد اصرار کرنے والے کو کہتے ہیں کہ ”حزرا ای گیا اے“ یعنی چٹ ہی گیا ہے۔ لہذا اس نے شیخ بزرگ کے بہت زیادہ اصرار کو ”بسیار چسپید“ کے ذریعے واضح کیا ہے۔

کشف المحجوب:

حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف منیف ”کشف المحجوب“ جو انہوں نے آغوشِ رحمتِ خداوندی میں بیٹھ کر لکھی ہے، مسائلِ شریعت و طریقت اور حقیقت و معرفت کا ایک بیش بہا گنجینہ ہے اور اولیاءِ متقدمین کے حالاتِ بابرکات اور ان کی مقدس تعلیمات کا بہترین خزانہ ہے۔ نیز فارسی زبان میں تصوف و احسان پر لکھی جانے والی یہ سب سے پہلی کتاب ہے (۱) اور اسے ہر دور کے اولیاء اللہ اور صوفیاء کرام رحمہم اللہ علیہم نے تصوف کی بے مثل کتاب قرار دیا ہے۔ کشف المحجوب کا ملین کے لیے رہنما ہے تو عوام کے لیے پیر کاٹل کی حیثیت رکھتی ہے۔ چنانچہ عوام میں سے اس کا مطالعہ کرنے والوں کو دولتِ عرفان و ایقان حاصل ہوتی ہے اور شکوک و شبہات کی وادی میں بھٹکنے والے یقین کی دنیا میں آباد ہو جاتے ہیں اور اس کے بار بار کے مطالعہ سے حجابات اٹھ کر نئے نئے انکشافات ہوتے ہیں۔ اس نادر و بے مثل کتاب کو جو پذیرائی و مقبولیت حاصل ہوئی وہ اس موضوع کی کسی اور فارسی میں لکھی جانے والی کتاب کے حصے میں نہیں آئی۔ اکابر اولیاء اللہ نے خود اس سے استفادہ کیا اور طالبانِ حق کو اس سے مستفید ہونے کی تلقین فرمائی۔ اس لیے کہ اس میں ناقصوں اور کاملوں کے لیے سامانِ ہدایت موجود ہے اور اس کے برعکس بعض کتبِ تصوف، نصوصِ احکام وغیرہ میں صرف خواص بلکہ انحصارِ ان خواص کے لیے رہنمائی ہے اور ناقصین کے لیے حیرانی و سرگردانی کے سوا کچھ نہیں ہے۔

وجہ تسمیہ و کیفیت کشف المحجوب:

کشف المحجوب حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کی آخری تصنیف ہے جو انہوں نے

۱۔ اگرچہ کتاب ”التعرف لمذہب اهل التصوف“ (عربی) تالیف امام ابو بکر بخاری کلاباذی قدس سرہ (م ۳۸۵ یا ۳۹۰ھ) کی نفیس فارسی شرح بنام ”شرح تعرف“ تالیف امام ابراہیم بن اسمعیل مستملی بخاری قدس سرہ (م ۳۳۳ھ) جو ۱۳۳۰ھ/۱۹۱۲ء میں پہلی بار لکھنؤ سے طبع ہوئی، کشف المحجوب سے پہلے لکھی گئی تھی مگر یہ مستقل تصنیف نہیں بلکہ عربی متن (تعرف) کی فارسی شرح ہے۔

جناب ابوسعید جویری رحمۃ اللہ علیہ کی درخواست پر لکھی اور ان کے سوالات کی اساس پر یہ نورانی صحیفہ تیار ہوا۔ اس مبارک کتاب کی وجہ تسمیہ اور غایت تصنیف حضرت شیخؒ کے قلم اعجاز رقم نے یہ لکھی ہے:

”یہ جو میں نے کہا ہے کہ اس کتاب کو کشف المحجوب (پنہاں کو عیاں کرنے والی) کے نام سے موسوم کیا ہے، اس سے میرا مقصد یہ ہے کہ کتاب کا نام ہی اس کے موضوع اور مطالب کو عیاں کر دے اور اہل بصیرت اس کا نام سنتے ہی جان لیں کہ اس میں کیا ہے اور واضح رہے کہ اولیاء اللہ اور عزیزانِ بارگاہِ خداوندی کے سوا تمام عالم (و عالمیاں) رموز و اسرارِ خداوندی کے حقائق کو سمجھنے سے محجوب و مستور ہیں۔ چونکہ یہ کتاب سیدھی راہ بتانے اور عارفانہ کلمات کی تشریح و توضیح اور بشریت کے حجاب رفع کرنے کی غرض سے لکھی گئی ہے، لہذا اسے کسی اور نام سے منسوب کرنا مناسب نہیں سمجھا اور حقیقت یہ ہے کہ جس طرح حجاب کا اٹھنا محجوب (پوشیدہ) کی موت ہوتا ہے اس طرح حجاب کا آنا مکاشف (ظاہر شدہ) کی ہلاکت کا باعث بنتا ہے.....“ (۱)

حضرت داتا گنج بخشؒ نے یہ کتاب اپنی عمر کے آخری حصے میں تحریر فرمائی اور اس کا تین چوتھائی حصہ یقیناً لاہور میں لکھا۔ وہ ایک مقام پر رقم فرماتے ہیں:

”اس وقت اس سے زیادہ ممکن نہیں، اس لیے کہ میری کتابیں غزنی (حوسہا اللہ) میں رہ گئی ہیں اور میں ہند کے شہر لاہور میں جو مضافات ملتان میں سے ہے، نا جنسوں کے درمیان گرفتار ہوں۔“ (۲)

حضرتؒ نے اپنی کتابوں کے غزنی رہ جانے کا جو ذکر کیا ہے اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ ان کے پاس کتابیں بالکل نہیں تھیں بلکہ وہ شاکی اس بات کے ہیں کہ ایک تبحر عالم اور فاضل مصنف کو جس بہتات سے کتابوں کی ضرورت ہوتی ہے، وہ یہاں پوری نہیں ہو سکتی تھی۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں:

”امام قشیریؒ کی طرح شیخ جویریؒ نے تصوف کو اسلامی شریعت سے قریب (۳) لانے اور غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کی ہے۔ شیخ کے خیالات میں

۱۔ کشف المحجوب، طبع تہران، ص: ۳۔ ۲۔ کشف المحجوب، طبع سمرقند، ص: ۱۱۵۔

۳۔ نظامی صاحب نے یہ فیشن کے طور پر لکھ دیا ہے مگر نہ وہ جانتے ہیں کہ تصوف اور شریعت جدا جدا نہیں ہیں۔

بڑی صفائی اور اندازِ بیاں میں بڑی گہرائی ہے۔ تصوف کی کتابیں ابھی تک عربی میں تھیں، اس لیے عوام کو استفادہ کا موقع بہت کم ملتا تھا۔ یہ پہلی کتاب ہے جو فارسی زبان میں لکھی گئی۔ حقیقی تصوف کو عوام تک پہنچانے میں اس کا بڑا حصہ ہے۔“ (۱)

پھر لکھتے ہیں:

”شیخ ہجویری کی اس کتاب نے ایک طرف تصوف سے متعلق عوام کی غلط فہمیوں کو دور کیا، دوسری طرف اس کی ترقی کی راہیں کھول دیں۔“ (۲)

”شیخ ابو سعید ابوالخیر نے اپنی رباعیات، شیخ عبداللہ ہروی نے اپنی مناجات اور شیخ ہجویری نے اپنی کشف المحجوب کے ذریعے تصوف کے خیالات کو عوام تک پہنچا کر تصوف کے عوامی تحریک بننے اور سلاسل کے منظم ہونے کا سامان بہم پہنچایا ہے۔“ (۳)

کشف المحجوب

صوفیاء کرام اور موثر خین کی نظر میں

سلطان المشائخ حضرت نظام الدین محبوب الہی دہلوی قدس سرہ (م ۷۲۵ھ) کی نہایت اہم رائے ان کے ملفوظات ”دُررِ نظامی“ (خطی) (۴) مرتبہ شیخ علی محمود جاندار میں درج ہے:

”ومی فرمودند کشف المحجوب از تصنیف علی ہجویری است قدس اللہ روحہ العزیز: اگر کسی را پیری نہ باشد چون این را مطالعه کند او را پیدا شود..... من این کتاب را بہ تمام مطالعه کردہ ام۔“ (۵)

چنانچہ حلقہ بگوشان حضرت محبوب الہی رحمۃ اللہ علیہ جن کتب تصوف کے مطالعہ کے شائق تھے ان میں کشف المحجوب شامل تھی۔ ضیاء الدین برنی لکھتا ہے:

۱۔ تاریخ مشائخ چشت، طبع دہلی، بار اول ۱۹۵۳ء، ص: ۹۸

۲۔ ایضاً، ص: ۹۹

۳۔ ایضاً، ص: ۱۰۲

۴۔ دُررِ نظامی کا ترجمہ دہلی سے چھپ چکا ہے مگر اس وقت پیش نظر نہیں۔

۵۔ بحوالہ تصوف اسلام از عبدالماجد دریا آبادی طبع اعظم گڑھ، بار سوم، ص: ۵۲

”واشرف و اکابر کہ بخدمت شیخ پیوستہ بودند در مطالعہ کتب سلوک و صحائف احکام طریقت مشاہدہ می شد و کتاب قوت القلوب و احیاء العلوم و ترجمہ احیاء العلوم و عوارف و کشف المحجوب و شرح تعرف و رسالہ قشیری و مرصاد العباد و مکتوبات عین القضاة و لوائح ولوامع قاضی حمید الدین ناگوری و فوائد الفواد امیر حسن را بواسطہ ملفوظات شیخ خریداران بسیار پیدا آمدند و مردمان پیشتر از کتابیان از کتب سلوک و حقائق باز پرس کردند“ (۱)

سلطان التارکین حمید الدین حاکم (م ۷۳۷ھ) خلیفہ حضرت شیخ رکن الدین سہروردی ملتانی نے اپنے مرشد ارشد (حضرت رکن الدین) کی شان میں متعدد مدحیہ نظمیں لکھی ہیں۔ ایک نظم میں اپنے مرشد کے کمالات کو تین معتبر کتب کے اسماء سے بیان کیا ہے۔ ”کشاف“ اور ”کشف المحجوب“ کی بندش ملاحظہ ہو:

گشت کشف کشف ہم محجوب فہم تو اے فہیم ذوالا
قدار (۲)

شہزادہ محمد داراشکوہ (م ۱۰۶۹ھ) نے لکھا ہے:

”حضرت پیر علی ہجویری راتصانیف بسیار است اما کشف المحجوب مشہور و معروف است و بیچ کس را بران سخن نیست و مرشدی است کامل در کتب تصوف بخوبی، آن در زبان فارسی کتابی تصنیف نہ شدہ“ (۳)

شیخ محمد اکرم براسوی صابری علیہ الرحمۃ (م ۱۱۵۹ھ) اپنی مشہور تصنیف ”اقتباس الانوار“ جو ۱۱۳۲ھ میں لکھی گئی، میں رقم طراز ہیں:

”صوفیاء کے طبقہ اول میں علوم و اسرار مشائخ، طالبوں کو رموز و اشارات میں تعلیم کیے

۱۔ تاریخ فیروز شاہی، برنی، سرسید ایڈیشن، کلکتہ ۱۸۶۲ء، ص: ۳۳۶

۲۔ گلزار (دیوان حاکم) مرتبہ نامی، طبع لاہور، ۱۹۳۶ء، ص: ۱۴۰۔

۳۔ سفینۃ الاولیاء، طبع کانپور، ص: ۱۶۴

جاتے تھے اور ان پر عمل کرنے کی کوشش کی جاتی تھی اور چند تصانیف بھی ان کی تھیں، جنہیں عوام پر ظاہر نہیں کرتے تھے مگر طبقہ ثانی میں جب سید الطائفہ جنید بغدادی، خواجہ ابوالحسن نوری، خواجہ ابوسعید خراز اور خواجہ ابوبکر شبلی (رحمہم اللہ تعالیٰ) کا دور دورہ ہوا تو انہوں نے رموز و اشارات یعنی اخفا کے طریقہ کو ترک کر کے طالبوں کو ان علوم کا علانیہ درس دینا شروع کر دیا۔ اس وقت سے ہر سلسلہ کے مشائخ نے تصوف پر کتابیں لکھنا شروع کر دیں جن کی تفصیل طوالت کا موجب ہوگی لہذا اس موقع پر صرف ان چند معتبر کتابوں کا ذکر کیا جاتا ہے جن کا مطالعہ جمیع مشائخ کا معمول ہے۔ پہلی کتاب جو خانوادہ جنیدیہ میں لکھی گئی ”طبقات صوفیہ“ تصنیف ابو عبد الرحمن سلمی ہے اور اس کے بعد شیخ علی بن عثمان ہجویری غزنوی جنیدی نے ”کشف المحجوب“ لکھی۔ (۱) (ترجمہ ہفتخیر یسر) مفتی غلام سرور لاہوری مرحوم (م ۱۳۰۷ھ) لکھتے ہیں:

”شیخ علی ہجویری راتصانیف بسیار است اما کشف المحجوب از مشہور و معروف ترین کتب وی است و بیچ کس را بروی جائے سخن نی، بلکه پیش ازین در کتب تصوف بیچ کتابی بہ زبان فارسی تصنیف نہ شدہ بود“ (۲) محمد بن عبدالوہاب قزوینی (ایران) مقدمہ تذکرۃ الاولیاء میں رقم طراز ہیں:

”ولسی در زبان فارسی آنچه در نظر است دو کتاب است کہ قبل از تذکرۃ الاولیاء تالیف شدہ یکی کشف المحجوب لاریاب القلوب (۳)

لابی الحسن علی بن عثمان الجلابی الرجوی الغزنوی المتوفی سنۃ ۴۶۵ دیگر ترجمہ طبقات الصوفیہ للسلمی کہ آن را شیخ الاسلام ابو اسماعیل عبداللہ بن محمد الانصاری الخرجی المتوفی ۵۴۸۱ در مجالس وعظ و تذکیر املانمودہ۔“ (۴)

۱۔ اقتباس الانوار (فارسی) مطبوعہ مطبع اسلامیہ لاہور ۱۸۹۵ء، ص: ۲۹

۲۔ خزینۃ الاصفیاء، طبع لکھنؤ، جلد دوم، ص: ۲۳۲۔

۳۔ کشف المحجوب کے نام کے ساتھ ”لاریاب القلوب“ کا اضافہ غلط ہے۔ اس غلطی کا سبب آئندہ بیان ہوگا۔

۴۔ مقدمہ تذکرۃ الاولیاء، طبع تہران سوم، ص: ۸

کشف المحجوب

بحیثیت ماخذ کتب تصوف

کشف المحجوب کو صوفیاء کرام کے مشہور و مستند تذکروں اور تصوف کی معتبر کتابوں کا ماخذ ہونے کا شرف بھی حاصل ہے۔۔ حضرت خواجہ فرید الدین عطار رحمۃ اللہ علیہ (م ۶۲۷ھ) نے اپنی معروف ترین کتاب تذکرة الأولیاء میں کشف المحجوب سے صوفیاء متقدمین کے حالات اور ان کے اقوال معمولی سی تبدیلی الفاظ کے ساتھ نقل کیے ہیں۔
ملک الشعرا بہار نے لکھا ہے:

”عطار ظاہراً از کتاب کشف المحجوب استفادہ کردہ است وغالباً عبارات آن بدون ذکر خود کتاب یا مؤلف با اندک تصرفی کہ تبدیل کہنہ بہ نو باشد نقل نمودہ ست“ (۱)

ملک الشعرا بہار نے سبک شناسی (ص: ۲۰۶-۲۰۹) میں اس کی واضح مثالیں بھی پیش کی ہیں۔
روسی مستشرق ژوکوفسکی کی تحقیق یہ ہے:

”شیخ عطار در تذکرة الاولیاء، خود مکرراً از کشف المحجوب ہجویری جلابی غزنوی استفادہ کردہ و در موارد متعدد بدون ذکر ماخذ، از او اقتباساتی کردہ است و در اغلب ایس موارد فقط بذکر عبارت (نقلست) اکتفا در زیدہ۔“ (۲)

حضرت شیخ عطار رحمۃ اللہ علیہ نے ”تذکرة الاولیاء“ میں صرف دو مقام پر حضرت داتا گنج بخش قدس سرہ کا اسم گرامی تحریر کر کے ان کے اقوال نقل کیے ہیں۔ اول: سیدنا حضرت امام اعظم

۱۔ سبک شناسی یا تاریخ نظور نشر فارسی از شادروان محمد تقی بہار ”ملک الشعراء“ جلد دوم، طبع تہران، بار دوم، ص: ۳۶۰

۲۔ ترجمہ مقدمہ روسی بہ فارسی کشف المحجوب، مصحح ژوکوفسکی، طبع تہران، ص: ۶۰

ﷺ کا ذکر کیا ہے ایک مقام پر لکھتے ہیں:

”شیخ عالم، عارف، زاہد، مجاہد، شیخ الشیوخ، الطريقة، کاشف اسرار الحقیقت ابوالحسن علی بن عثمان بن ابی علی الغزنوی رحمہ اللہ کہ از اقران سلطان طریقہ و برہان حقیقت شیخ ابو سعید بن ابوالخیر فضل اللہ بن محمد بن احمد المیہنی است قدس اللہ تعالیٰ روحہ و اقتدائی ہر دو بزرگوار در طریقت بزین اوتاد و شیخ عباد ابو الفضل محمد بن الحسن السرخسی است قدس اللہ روحہ در کتاب کشف المحجوب لا رباب القلوب آورده است۔۔۔“ (۱)

التباس حضرت پارسا رحمہ اللہ:

حضرت خواجہ پارسا رحمہ اللہ نے جو یہ لکھا ہے کہ حضرت شیخ علی ہجویری اور حضرت ابوسعید بن ابی الخیر (رحمہما اللہ) حضرت ابوالفضل محمد بن الحسن سرخسی رحمہ اللہ کے مرید تھے، صحیح نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دونوں بزرگوں کے پیران طریقت کا ایک ہی نام تھا مگر مسکن علیحدہ علیحدہ۔۔۔ محض ہم نامی کی وجہ سے انہیں یہ اشتباہ ہو گیا۔ حضرت ابوسعید کے حالات کے سلسلے میں کشف المحجوب میں بتایا گیا ہے کہ ان کے مرشد سرخس میں رہتے تھے:

”دوران وقت والی سرخس شیخ ابوالفضل حسن بود“ (۲)

مولانا جامی قدس سرہ نے شیخ ابوالفضل بن حسن السرخسی قدس سرہ کے حالات کے شروع میں لکھا ہے:

شیخ ابوالفضل بن حسن السرخسی قدس سرہ نام وی محمد بن الحسن است، وی مرید ابو نصر سراج است و پیر شیخ ابوسعید ابوالخیر (۳)

۱۔ فصل الخطاب (خطی)، ص: ۶ (لاہوری حضرت علامہ ابوالبرکات سید احمد قادری رحمۃ اللہ علیہ لاہور) یہ کتاب

تاشقند سے طبع ہو چکی ہے مگر یہاں کیا ہے۔

۲۔ کشف المحجوب، طبع تہران، ص: ۲۰۶

۳۔ نجات الانس، طبع لکھنؤ، ص: ۲۶۲

پھر شیخ ابوسعید کے حالات میں رقم فرمایا ہے:

”پیروی در طریقت شیخ ابوالفضل بن حسن سرخسی

است“ (۱)

ہم نامی کی وجہ سے جو التباس و اشتباہ پیدا ہو جاتا ہے اس کے پیش نظر حضرت داتا صاحب کے مرشد ارشد کے حالات لکھتے وقت شروع ہی میں وضاحت کر دی ہے:

”ابو الفضل محمد بن الحسن الختلی قدس سرہ وی غیر

ابوالفضل بن حسن سرخسی است“ (۲)

معلوم ہوتا ہے کہ فصل الخطاب، حضرت خواجہ یعقوب چرخ غزنوی صاحب رسالہ ابدالیہ کے پیش نظر تھی۔ لہذا انہوں نے فصل الخطاب کے اس بیان پر اعتماد کرتے ہوئے لکھ دیا کہ حضرت ابوسعید ابو الخیر اور حضرت علی ہجویری دونوں بھائی (پیر بھائی) تھے (۳) اور خواجہ پارسا کے تتبع میں کشف المحجوب کے نام کے ساتھ ”لارباب القلوب“ کا اضافہ بھی روارکھا۔۔۔ کشف المحجوب کے نام کے ساتھ ”لارباب القلوب“ کے اضافے پر بحث آگے آئے گی۔ ان شاء اللہ۔

حضرت ابو فتح سید محمد حسینی گیسو دراز قدس اللہ سرہ العزیز (م ۸۲۵ھ)

حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز نے اپنی بے مثل تصانیف میں کشف المحجوب کے حوالے

دیئے ہیں۔ ان کے مکتوبات شریف کا مجموعہ پیش نظر ہے۔ ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

”آن محقق مدقق آن شیخ برحق آن صوفی معنوی

وصوری ابو علی عثمان (علی بن عثمان) ہجویری قدسی

نقل کردہ است۔“ (۴)

ان مکاتیب شریفہ کا متن اغلاط سے پر ہے۔ مصحح نے تصحیح کی امکانی کوشش کی ہے۔ مگر پھر

بھی غلطیاں رہ گئی ہیں۔ حضرت داتا صاحب کے اسم گرامی کو جو ”ابو علی عثمان“ لکھا ہے یہ بھی

کتابت کی غلطی ہے۔ شیخ محمد اکرم صابری نے ”اقتباس الانوار“ کے ماخذوں کی فہرست اس کے

صفحہ ۳۰ پر دی ہے جس میں کشف المحجوب کا نام درج ہے۔ ٹوکوسکی لکھتا ہے:

۱۔ صفحات الانس، طبع لکھنؤ، ص: ۲۷۷

۲۔ صفحات الانس، طبع لکھنؤ، ص: ۲۹۰

۳۔ فہرست مخطوطات فارسیہ، انڈیا آفس لاہور، نمبر ۱۷۷

۴۔ مکتوبات حضرت خواجہ گیسو دراز مرتبہ مولانا رکن الدین ابو فتح علاقہ قریشی، طبع حیدرآباد دکن، ۱۲۶۲ھ، ص: ۸۰

”در تالیف و تدوین سفینة الاولیاء، خزینة الاصفیاء، نامہ دانشوران (۱) و طرائق الحقائق (۲)، نیز از کشف المحجوب استفادہ ہای بسیار و اقتباسات مکرر و متعددی شدہ است“ (۳)

مراجع و منابع کشف المحجوب

کشف المحجوب سے استفادہ و استفادہ کرنے والے اولیاء کرام اور مؤرخین کے ذکر کے بعد حضرت گنج بخش قدس سرہ کی نورانی تصنیف کے مراجع و منابع کا بیان اشد ضروری ہے۔

۱۔ فیض عالم قدس۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿فَمَنْ يُرِدِ اللَّهُ أَنْ يَهْدِيَهُ يَشْرَحْ صَدْرَهُ لِلْإِسْلَامِ﴾ (۴) ”جس شخص کو اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ ہدایت کرے تو اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے۔“ ﴿أَقَمْنِ شَرَحَ اللَّهُ صَدْرَهُ لِلْإِسْلَامِ فَهُوَ عَلَى نُورٍ مِّنْ رَبِّهِ﴾ (۵) ”جس شخص کا سینہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کے لیے کھول دیا وہ اپنے پروردگار کی طرف سے نور (روشنی) پر ہوتا ہے۔“ اور جسے اللہ تعالیٰ شرح صدر کی نعمت سے سرفراز فرماتا ہے تو اسے اپنے انوار و تجلیات سے نوازتا ہے اور عالم قدس سے جو انوار اس کے قلب پر وارد ہوتے ہیں ان کی برکات سے کشف حقائق ہوتا ہے اور رموز حقیقت و اسرار معرفت منکشف ہوتے ہیں، قرآن مجید اور احادیث مقدسہ کا صحیح فہم و ادراک حاصل ہوتا ہے۔ غرض کہ حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف منیف کا منبع اول یہی فیض عالم قدس ہے۔ وَذَلِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يُّشَاءُ

(ب) قرآن مجید

(ج) احادیث نبوی ﷺ

پروفیسر ژوکوفسکی نے کشف المحجوب کے دقیق مطالعہ کے بعد اس کے منابع و ماخذ تلاش کیے ہیں اور اپنے مقدمہ کشف المحجوب میں ان کے نام درج کیے ہیں:

۱۔ عصر حاضر کی مشہور تصنیف جو ایران کے متعدد فضلاء کی کاوش کا نتیجہ ہے۔

۲۔ طرائق الحقائق تالیف نائب الصدر حاجی میرزا معصوم بن رحمت علی شاہ قزوینی نعمت اللہ شیرازی متوفی ۱۳۴۲ھ

جلد ۲، تہران (فہرست فارسی کتب ہائی چاپی جلد اول از خان بابا مشار، طبع تہران (کالم ۱۰۹۰)

۳۔ ترجمہ مقدمہ روسی بہ فارسی کشف المحجوب، طبع تہران، ص: ۶۱

۴۔ سورة الزمر: ۲۲

۵۔ سورة الانعام: ۱۲۵

۱۔ تاریخ اہل صفہ۔ تالیف حضرت ابو عبد الرحمن سلمیٰ متوفی ۴۱۲ھ (کشف، ص: ۹۹) (۱) حاجی خلیفہ نے کشف الظنون میں اس تالیف کا نام نہیں لکھا مگر تاریخ اہل الصفوۃ کا ذکر کیا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ زیر بحث کتاب ہی ہو (جلد دوم نمبر شمار: ۲۱۶۸)

۲۔ کتاب سلمیٰ۔ (کشف، ص: ۱۳۱) جو بعد میں ”طبقات الصوفیہ“ کے نام سے مشہور ہوئی۔
 ۳۔ کتاب قشیری۔ (کشف، ص: ۱۳۱) جو ”الرسالة القشیریہ“ کے نام سے معروف ہے۔
 ۴۔ کتاب محبت۔ (کشف، ص: ۳۹۹) تالیف عمر بن عثمان مکی (متوفی ۲۹۷، ۲۹۶ھ) شیخ عطار نے بھی ”تذکرۃ الاولیاء“ میں اس سے استفادہ کیا ہے۔ (تذکرہ طبع لاہور، ص: ۲۳۳)
 ۵۔ لمع (فی التصوف)۔ تالیف ابو نصر سراج (یافعی نے مرآة البھان میں لکھا ہے ہے کہ اس کا سال اتمام تصنیف ۳۷۸ھ ہے)۔

۶۔ تاریخ المشائخ۔ تالیف محمد بن علی حکیم ترمذی (کشف، ص: ۵۰)
 ۷۔ کتاب مقدسی۔ (کشف، ص: ۳۳۳) ممکن ہے کہ یہ وہی ”رسائل اخوان الصفا“ ہوں جن کے مؤلفین میں سے ایک ابو سلیمان البستی المقدسی ہے۔
 ۸۔ حکایات عراقیوں۔ (کشف، ص: ۵۶) از تصانیف شیوخ صوفیاء عراق۔
 ۹۔ حکایات۔ حضرت علی ہجویری قدس سرہ نے کشف المحجوب میں بار بار فرمایا ہے: اندر حکایات یافتہ بنا بریں یہ واضح ہے کہ یہ کتاب کشف المحجوب کے مآخذوں میں سے ہے۔

منابع درجہ دوم:

مشہور اور اہم کتابیں جو کشف المحجوب کی تصنیف کے وقت دوسرے درجہ پر حضرت داتا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پیش نظر ہیں ان کے نام یہ ہیں:
 (۱) تصانیف حسین بن منصور حلاج رحمۃ اللہ علیہ: کشف المحجوب کے بیان کے مطابق ان کی تعداد پچاس اور اقطار و کناف خوزستان، فارس اور خراسان میں منتشر ہو چکی ہیں۔ (کشف، ص: ۱۹۱)

(۲) تالیف ابو جعفر محمد بن مصباح صیدلانی: (کشف، ص: ۲۱۴، ۲۳۴)

۱۔ کشف المحجوب کے صفحات نمبر چاپ تہران سے دیئے گئے ہیں اور کشف سے مراد کشف المحجوب ہے۔

(۳) رسائل ابو العباس سیاری: حضرت داتا صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ان کے پیروؤں کو مروا اور نسا میں دیکھا، لہذا یہ رسائل بھی ان ہی شہروں میں دیکھے ہوں گے۔

(۴) رسائل حکیم ترمذی: یہ رسائل حضرت داتا صاحب قدس سرہ کی توجہ کا مرکز رہے۔ (کشف، ص: ۱۷۸، ۲۳۹) اور ان کے نام یہ ہیں: بیان آداب المریدین، ختم الولايت، کتاب النہج، نوادر الاصول (فی معرفت اخبار الرسول)۔

(۵) کتاب سماع: از ابو عبد الرحمن سلمی (کشف، ص: ۵۲۳)

(۶) روایات: از ابو الفضل نھکی، مرشد جویری رجمہ اللہ (کشف، ص: ۱۱۰)

(۷) غلط الواجدین: از تصانیف ابو محمد روی۔ (کشف، ص: ۱۷۰)

اب ان کتابوں کا ذکر کیا جاتا ہے جو مستقلاً حضرت جویری قدس سرہ کا مرجع نہیں رہیں بلکہ کبھی کبھی ان کی طرف رجوع کیا گیا:

(۱) تصحیح الارادہ: از تصانیف حضرت جنید بغدادی قدس سرہ (کشف، ص: ۲۳۹)

(۲) الرعاۃ بحقوق اللہ: از تالیف احمد بن خسرو یہ۔ (کشف، ص: ۲۳۹)

(۳) کتاب اندر ابحاث سماع: مؤلف نامعلوم (کشف، ص: ۵۲۳)

(۴) کتاب اندر مرقعہ: از تصانیف ابو معمار اصفہانی (کشف، ص: ۶۲)

(۵) کتاب رعایب: از تصانیف ابو عبد اللہ الحارث بن اسد المجاسبی، در اصول تصوف (کشف، ص: ۱۳۴) حاجی خلیفہ نے کشف الظنون میں اس کا ذکر کیا ہے۔

(۶) مرآة الحکماء: از تصانیف شاہ شجاع کرمانی (کشف، ص: ۱۷۴)

آخر میں یہ ذکر کرنا بھی ضروری ہے کہ مذکورہ الصدر کتب و رسائل کے علاوہ اور تصانیف و تالیفات بھی صاحب کشف المحجوب کے زیر نظر رہی ہیں جن کے مصنفین و مؤلفین کے صرف اسماء گرامی تحریر کرنے پر اکتفا کیا گیا ہے۔ مثلاً تصانیف یحییٰ رازی (کشف، ص: ۱۵۳) تالیف ابو بکر وراق (کشف، ص: ۲۳۹-۱۷۹) آثار سہل بن عبد اللہ (کشف، ص: ۲۳۹) کتب مشائخ (کشف، ص: ۳۳۴) اور ابو حمدون قصار و صوفیہ قصاریان کے اقوال مکرر نقل کیے ہیں۔ (کشف، ص: ۳۲۸)۔ (۱)

رسالہ قشیریہ اور کشف المحجوب:

حضرت امام ابو القاسم قشیری قدس سرہ (م ۴۶۵ھ) حضرت شیخ علی ہجویری قدس سرہ کے معاصر ہیں اور حضرت مخدوم ہجویری نے ان سے ملاقات بھی کی ہے اور کشف المحجوب میں ان کی جلالت شان کے معترف ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ حضرت داتا صاحب کے اُستاد بھی ہیں۔ مگر کشف المحجوب سے اس خیال کی تائید و تصدیق نہیں ہوتی۔ امام قشیری نے "الرسالة القشیریہ" ۱۳۳۷ھ میں لکھنا شروع کیا اور اوائل ۱۳۳۸ھ میں مکمل کر لیا تھا اور رسالہ قشیریہ، کشف المحجوب کی تصنیف کے وقت حضرت داتا صاحب کے پیش نظر تھا۔ یہ دونوں کتابیں جو ایک ہی موضوع سے متعلق ہیں اور ہم عصر بزرگوں کی تصانیف ہیں، ان دونوں میں جو نمایاں فرق ہے، اسے سمجھنے کے لیے درج ذیل آراء مفید ثابت ہوں گی:

ڈاکٹر پیر محمد حسن مترجم و محشی رسالہ قشیریہ فرماتے ہیں:

”ہجویری نے اس کتاب (کشف المحجوب) میں قشیری کے رسالہ کا تتبع کیا ہے اور بعض ایسے امور سے بحث کی ہے، جن کا رسالہ میں کوئی ذکر نہیں۔“ (۱)

مخدومی پیر صاحب نے حضرت داتا صاحب کو امام قشیری کا تتبع لکھنے کے ساتھ یہ بھی تسلیم کیا ہے کہ شیخ ہجویری نے ”بعض ایسے امور سے بحث کی ہے، جن کا رسالہ میں کوئی ذکر نہیں۔“ مگر کشف المحجوب کے مُصحح اور مقدمہ نگار ڈوگوسکی، امام قشیری کو حضرت داتا صاحب کے شیوخ صحبت میں شمار کرنے کے باوجود یہ تسلیم نہیں کرتا کہ ہجویری نے اپنی تصنیف میں قشیری کا تتبع کیا ہے۔ لکھتا ہے:

”الرسالة القشیریہ فی علم التصوف للامام العالم ابی القاسم عبدالکریم ہوازن القشیری و کشف المحجوب ہجویری جلابی، غزنوی، اولی بتازی ددومی بیپارسی ہردواز کتب طراز اول تصوف، و ہردودر حدودا واسط قرن پنجم ہجری تالیف شدہ است، باوجود وحدت کامل موضوع، ہر بحث، نہ در کیفیت و کمیت مسائل مورد

نظر، ونہ در تعبیر و تفسیر مطالب مطروحه پیچ گوئہ وجہ
اشتراکی بین این دو اثر نفیس و اصیل مشاہدہ نمی شود،
فقط گاہ گاہی در بعضی اصطلاحات فنی اندک مشابہتی
بین آن دو ملاحظہ می گردد (فی المثل قشیری گوید:
المحو والاثبات) (ص: ۴۶ رسالہ) و ہجویری می نویسد:
النفی والاثبات (ص: ۴۹۴ کشف) لا غیر (۱)

عبدالماجد دریا بادی، جو رسالہ قشیریہ اور کشف المحجوب میں سے کسی کے بھی
دیباچہ نگار نہیں ہیں، ان کی رائے یہ ہے:

”اس کتاب کے تقریباً ہم عمر امام ابو القاسم قشیری کا عربی ”رسالہ القشیریہ
” ہے۔ موضوع اس کا بھی تصوف ہے۔ دونوں کے طرز تصنیف میں فرق یہ
ہے کہ امام موصوف نے زیادہ تر متقدمین کے اقوال و حکایات کے نقل کر دینے
پر اکتفا کیا ہے، بہ خلاف اس کے مخدوم ہجویری ایک محققانہ، مجتہدانہ انداز سے
اپنے ذاتی تجربات، مکاشفات، واردات، مجاہدات وغیرہ بھی قلم بند کرتے
جاتے ہیں اور مباحث سلوک پر رد و قدح کرنے میں تامل نہیں کرتے، اس
لیے ان کی کتاب کی حیثیت محض ایک مجموعہ روایات و حکایات کی نہیں بلکہ
ایک مستند محققانہ تصنیف کی ہے۔“ (۲)

سبک کشف المحجوب:

ملک الشعراء بہار نے کشف المحجوب کی نشر کو دورِ اوّل یعنی دورِ سامانیوں میں شامل کیا ہے،
لکھتے ہیں:

”ایں کتاب از حیث سبک بالاتر و اصیل تر و بدورہ اوّل
نزدیک تر است، تا سائر کتب صوفیہ، دمی تو ان آں رایکی
از کتب طراز اوّل شمرد کہ ہر چند در قرن پنجم تالیف شدہ
و بیش از کتب قدیم راز دست خوش تازی ولغت ہای آن

۱۔ ترجمہ مقدمہ کشف المحجوب، روسی بفارسی، طبع تہران، ص: ۵۷

۲۔ تصوف اسلام از عبدالماجد دریا آبادی، طبع سوم، ص: ۵۳، ۵۴

زمان است، اما باز نمونه سبک قدیم را از دست نداده و روی
ہمرفتنہ دارای سبک کہنہ است۔ افعال ولغات کہنہ وغریب
واستعمالات دورہ اول بتما مہا دریں کتاب دیدہ می شود
وازیں گزشتہ اصطلاحات خاصی نیز از خود دارد کہ
غالب آن ہا بعد ازین درکتب تصوف مصطلح گردیدہ
است۔“ (۱)

اس کے بعد ملک الشعراء نے ذیل کے عنوانات کے تحت داد تحقیق دی ہے:
”لغات فارسی۔۔۔ اصطلاحات و کلمات تازہ عربی۔۔۔ موازنہ و جمع۔۔۔ حذف افعال

بقریہ“ (۲)

کشف المحجوب کے نام اور زبان کے بارے میں غلط فہمیوں کا ازالہ

کشف المحجوب کے تمام قدیم خطی نسخوں میں اس کا پورا نام ”کشف المحجوب“ ہی لکھا ہے
اور قدیم ترین مصنفین نے بھی اس کا یہی نام تحریر کیا ہے۔ مگر بعض مصنفین نے اس کا پورا نام
”کشف المحجوب لاریاب القلوب“ سمجھا ہے۔ اس اشتباہ کا سبب یہ ہے کہ حضرت خواجہ محمد
پارسی نے ”فصل الخطاب“ میں یوں لکھا ہے:

”درکشف المحجوب لاریاب القلوب آورده است“ (۳)
چونکہ کشف المحجوب حاجی خلیفہ کے پیش نظر نہ تھی، اس لیے انہوں نے ”کشف
الظنون“ میں اس کا نام اور کیفیت ”فصل الخطاب“ سے نقل کی۔
ژوکوفسکی لکھتا ہے:

”دریں مورد می توان گفت کہ مشاراً الیہ (حاجی
خلیفہ) اصلاً خود متن کتاب کشف المحجوب را نہ دیدہ
بودہ است، زیرا معمولاً حاجی خلیفہ ہنگام بحث از

۱۔ سبک شناسی یا تاریخ تطور فارسی، ص: ۱۸۷

۲۔ ایضاً، ص: ۱۹۷-۱۸۷

۳۔ فصل الخطاب خطی، ص: ۶۰ (مملوکہ حضرت مولانا ابوالبرکات سید احمد قادری لاہور)

کتابہای کہ شخصاً برای العین دیدہ ، آغاز وانجام نسخہ
نیز نقل می کند ولی در مورد کشف المحجوب چنین چیزی
نیاورده است " (۱)

لہذا "کشف الظنون" پر اعتماد کرتے ہوئے متاخرین نے اس کا نام "کشف
المحجوب لاریاب القلوب" لکھنا شروع کر دیا۔
پھر لکھا ہے:

"خواجہ محمد پارسا از عرفای طریقہ نقشبندیہ متوفی
ہشت صد و بیست و دو ہجری قمری ، کہ در حدود دو قرن
قبل از حاجی خلیفہ می زیستہ ، درتالیف خود بنام فصل
الخطاب لوصل الاحباب داشتہ کہ کشف المحجوب
عنوان اختصاری کتاب ہجویری است و نام کامل آن چنین
می باشد کشف الحجب المحجوب لاریاب القلوب" (۲)
اور حاشیہ میں لکھا ہے:

"در فہرست آغاز نسخہ بدین عنوان آمدہ: کتاب کشف
سر المحجوب لاریاب القلوب باضافة کلمہ "سر"۔ (۳) اس اقتباس میں ژوکوفسکی
کی دو باتیں محل نظر ہیں: اول یہ کہ "فصل الخطاب" کے نام کے ساتھ "لوصل الاحباب" کا اضافہ
غلط ہے۔ اس کتاب کا جو قلمی نسخہ راقم السطور کے پیش نظر ہے، اس سے بھی اس کی تائید نہیں
ہوتی۔ دوم: حاجی خلیفہ نے اس کا نام "فصل الخطاب فی المحاضرات" لکھا ہے۔ (۴) پھر آگے چل
کر ایک اور کتاب کا تعارف کرایا ہے جس کا نام "فصل الخطاب لوصل الاحباب" ہے۔ "کشف
الظنون" کی عبارت ملاحظہ ہو:

"فصل الخطاب لوصل الاحباب. منظومہ فی اثنی عشرۃ الف
بیت للشیخ بدرالدین محمد بن محمد المعروف بابن رضی
الدین الغزی م ۹۸۲"۔ (۵)

۱۔ مقدمہ ژوکوفسکی، کشف المحجوب، طبع تہران، ص: ۵۲۔

۲۔ مقدمہ ژوکوفسکی کشف المحجوب (نسخہ خطی، دانش گاہ لینن گراڈ)، طبع تہران، ص: ۵۲۔

۳۔ ایضاً، حاشیہ، ص: ۵۲۔

۴۔ کشف الظنون (فلوکل ایڈیشن) نمبر ۹۰۵۸ جلد چہارم، ص: ۲۲۲۔ ۵۔ ایضاً، نمبر ۹۰۶۔

معلوم ہوتا ہے کہ ژو کوفسکی کو کشف الظنون دیکھتے وقت غلطی لگی ہے۔ دوسرے جو یہ لکھا ہے کہ:

”فصل الخطاب میں اس امر کا اظہار کیا گیا ہے کہ کشف المحجوب اختصاری نام

ہے اور پورا نام ”کشف الحجب المحجوب لارباب القلوب“ ہے۔“

عجیب بات ہے! ۱۱۷ صفحات پر مشتمل ”فصل الخطاب“ پیش نظر ہے، اس میں ہمیں تو کوئی ایسا اشارہ بھی نہیں ملا۔ اس کتاب میں ساٹھ ستر جگہ ”کشف المحجوب“ کے اقتباسات صرف کشف المحجوب کے نام سے نقل ہوئے ہیں۔ بلا کسی وضاحت کے اور صرف دو مقام پر اس طرح کے نام نظر آئے ہیں:

۱۔ کشف المحجوب لارباب القلوب (۱)

۲۔ کشف حجب المحجوب لارباب القلوب (۲)

معلوم ہوتا ہے کہ حضرت خواجہ پارسا جوش عقیدت اور کتاب کے موضوع کی مزید وضاحت کی خاطر اپنی طرف سے الفاظ بڑھاتے رہے ہیں۔ جیسا کہ نسخہ مخزونہ دانش گاہ لینن گراڈ کی فہرست میں ایک تیسرا اضافہ یہ ہے: ”کشف سر المحجوب لارباب القلوب“۔

غرض یہ کہ ”فصل الخطاب“ کے مطالعہ ہی سے ”رسالہ ابدالیہ“ اور ”کشف الظنون“ کے مؤلفین کو اشتباہ ہوا ہے وگرنہ حضرت داتا صاحب کی کتاب کا نام صرف اور صرف ”کشف المحجوب“ ہی ہے۔

پروفیسر محمد حبیب (علی گڑھ یونیورسٹی) جو بھارت کے مسلمانوں کے اذہان کو کمیونزم کے زہریلے اثرات سے مسموم کرنے پر مامور تھے، اسی لیے انہیں دارا شکوہ کے دور الحاد و زندقہ کی تحریریں بہت پسند تھیں۔ یہ صاحب ۱۹۳۱ء میں کابل گئے تو بقول ان کے، حضرت نور المشائخ ملا صاحب شور بازار رحمہ اللہ علیہ نے ان سے اس خیال کا اظہار کیا کہ کشف المحجوب عربی زبان میں لکھی گئی تھی اس کا فارسی ترجمہ بعد کو ہوا، عربی اصل ضائع ہوگئی، فارسی ترجمہ باقی رہ گیا۔ پروفیسر صاحب نے اس رائے کو قبول کر لیا اور آخر تک اس پر قائم رہے۔ (۳)

خدا جانے حضرت نور المشائخ نے کیا فرمایا اور انہوں نے کیا سمجھا۔ بہر حال یہ رائے بالکل غلط ہے۔ اس کتاب کی نثر سبک قدیم میں ہے جو بعد میں نہیں لکھی جاسکتی تھی۔ نیز قدیم کتابوں میں جو اس کے اقتباسات ملتے ہیں، وہ بالکل اس کے مطابق ہیں۔

۱۔ فصل الخطاب، قلمی، ص: ۶

۲۔ ایضاً، ص: ۴۲۱

۳۔ رسالہ میڈیویل، انڈیا مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، جلد ۲، ص: ۱۲

کشف المحجوب فارسی کے مطبوعہ نسخے

اس کتاب کی افادیت کے پیش نظر اس کے خطی نسخے بہت جلد اطراف و اکناف عالم میں پھیل گئے تھے۔ جیسا کہ ”تذکرۃ الاولیاء“ میں اس کے حوالے ملتے ہیں اور اس کے قلمی نسخے دنیا کی تمام بڑی بڑی لائبریریوں میں موجود ہیں اور بعض لوگوں کے ذاتی کتب خانوں میں اس کے قلمی نسخے پائے جاتے ہیں مگر بخوف طوالت اس وقت ان کی تعداد اور ضروری کوائف بیان نہیں کیے جاسکتے۔ صرف مطبوعہ فارسی نسخوں کا مختصر تعارف درج ذیل ہے:

۱۔ کشف المحجوب: مطبوعہ مطبع پنجابی لاہور، صفحات ۲۶۷۔ راقم الحروف کے سامنے اس کا جو نسخہ (مملوکہ میاں محمد الدین کلیم) ہے، اس کا پہلا صفحہ بوسیدہ ہونے کے باعث سن طباعت پچشم خود پڑھ نہیں سکا۔ ڈیوگن نے اپنے مضمون میں اس کا سن طباعت ۱۸۷۴ء دیا ہے۔ (۱)

۲۔ مطبوعہ بہاول پریس لاہور: سن طباعت ندارد، صفحات ۳۲۸۔ اس نسخہ میں مطبع پنجابی کے نسخہ کے حواشی من وعن درج ہیں، گویا یہ اسی کی نقل ہے۔ یہ ایڈیشن میرے پیش نظر ہے۔ اس پر سن طباعت درج نہیں مگر ڈیوگن نے اس کا سن طباعت ۱۹۰۳ء دیا ہے۔ (۲) خدا جانے اس نے یہ کیسے جانا۔ بہر حال یہ نسخہ خاصہ قدیم ہے۔

۳۔ مطبوعہ مطبع نامی کرامی حرمت مند سلیمانوف (سمرقند): سن طباعت ۱۳۳۰ھ / ۱۹۱۲ء۔ یہ نسخہ بہت شوق سے چھاپا گیا ہے اور آخر میں مصنف کے سوانح دار اشکوہ کی ”سفینۃ الاولیاء“ سے نقل کر دیئے گئے ہیں۔

۴۔ مطبوعہ مطبع اسلامیہ: اسٹیم پریس لاہور، سن طباعت ۱۳۴۲ھ، ۱۹۲۳ء۔ صفحات ۳۲۹، یہ نسخہ نمبر ۱ اور ۲ کی نقل ہے اور اس کے مصحح مولانا سید احمد علی شاہ پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور ہیں۔ آخر میں مصنف کے مختصر سوانح بزبان فارسی مرقومہ منشی حبیب اللہ درج ہیں اور یہ نسخہ سنہ مذکورہ میں دوبارہ طبع ہوا۔

۵۔ مطبوعہ رفاہ عام: اسٹیم پریس لاہور، سن طباعت ۱۹۳۱ء۔ صفحات ۳۲۸۔

۶۔ نسخہ ژوکوفسکی: مطبوعہ لینن گراڈ (روس) سن اشاعت ۱۳۴۲ھ / ۱۹۲۶ء۔ صفحات مع فہارس ۶۰۷۔ یہ نسخہ اس کے مرتب پروفیسر ولنتین ژوکوفسکی (م ۱۹۱۸ء) کی تصحیح مقدمہ بزبان روسی اور ضمیمہ ہشت فہارس کے لحاظ سے سب نسخوں پر فوقیت رکھتا ہے۔ چونکہ اس کے صرف اڑھائی سو نسخے طبع

۱۔ جنرل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال، کلکتہ، جلد: ۸، ۱۹۲۲ء، مقالہ کشف المحجوب از ایل۔ ایس۔ ڈیوگن

ہوئے تھے اس لیے نایاب کے حکم میں داخل ہے۔ راقم نے بھی اس کی زیارت نہیں کی۔

۷۔ نسخہ ژوکوفسکی طبع تہران: ژوکوفسکی کا تصحیح کردہ نسخہ ادارہ انتشارات امیر کبیر تہران نے ۱۳۳۶ھ/۱۹۵۷ء میں شائع کیا۔ ژوکوفسکی کے مقدمہ کو فارسی میں منتقل کر کے شامل کیا گیا ہے۔ فاضل محمد لوی عباسی نے اس کی ابتداء میں دو مقالے ”تجلیات تصوف ایرانی“ اور ”تحقیقات نویں راجع بکشف المحجوب“ شامل کر کے اس کی افادیت میں اضافہ کر دیا ہے۔ محمد لوی عباسی کے پہلے دو مقالے اور ژوکوفسکی کا مقدمہ ۶۲ صفحات کو محیط ہیں اور متن کتاب کے ۵۴۶ صفحات ہیں۔ آخری آٹھ فہرستوں کے ۶۱ صفحے ہیں۔ غرض کہ یہ بہترین نسخہ ہے۔

۸۔ مطبوعہ نامی پریس: لاہور، سن اشاعت ندارد، صفحات ۳۲۸ کاغذ اور صحت کے لحاظ سے بہت ناقص ہے۔ اس پر سن اشاعت تحریر نہیں لیکن راقم کو معلوم ہے کہ قریباً ۱۹۶۰ء میں طبع ہوا تھا۔ اس کے آخر میں ۲۸ صفحات پر مشتمل فصول و ابواب کی وضاحتی فہرست موجود ہے۔

۹۔ نسخہ مولوی محمد شفیع: مطبوعہ نوائے وقت پرنٹرز، لاہور، سن طباعت ۱۹۶۸ء، صفحات ۴۸۱، ناشر: احمد ربانی۔ اس کے شروع میں ڈاکٹر مولوی محمد شفیع صاحب کی نشری تقریریں بطور پیش لفظ اور مقدمہ دے دی گئی ہیں، چونکہ یہ نسخہ حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی رحمۃ اللہ علیہ کے مکتوبہ نسخے کی نقل بتایا جاتا ہے، اس لیے حضرت زکریا قدس سرہ کے حالات زندگی مرقومہ مولوی صاحب موصوف بھی شامل کر دیئے گئے ہیں مگر اہل علم اس خطی نسخے کا حضرت زکریا سے انتساب صحیح نہیں سمجھتے۔ مولانا نور احمد خان فریدی، تذکرہ حضرت بہاء الدین و مولف کتب کثیرہ رقم فرماتے ہیں:

”العزیز“ بہاولپور کے شمارہ فروری ۱۹۴۵ء میں ایک مضمون شائع ہوا تھا، جس میں صاحب مضمون نے تحریر کیا تھا کہ حضرت شیخ الاسلام نے سید ہجویری کی مشہور عالم تصنیف کشف المحجوب کو بھی اپنے ہاتھ سے سپرد قلم فرمایا تھا، یہ قیمتی نسخہ جیسا کہ صاحب مضمون نے تحریر کیا، پیرزادہ مولوی محمد حسین صاحب ایم اے، مترجم ”عجائب الاسفار“ کے کتب خانہ میں موجود تھا، خاکسار نے ان کے قریبی رشتہ داروں سے ہر چند دریافت کرنے کی کوشش کی لیکن اس گنج شایگان کا پتہ نہیں چل سکا۔ حال ہی میں جناب احمد ربانی صاحب نے محکمہ اوقاف کی اعانت سے کشف المحجوب کا ایک فارسی نسخہ طبع کرایا ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ یہ وہی نسخہ ہے۔۔۔ جس کی ڈھنڈیا پڑ رہی تھی۔ انہوں نے اس نسخے کا پہلے اور آخری صفحے کا عکس بھی دیا ہے، مگر اسے حضرت شیخ الاسلام سے منسوب کرنے میں چند اشکال حائل ہیں۔ ایک یہ کہ اس پر تاریخ ارتقام ۶۶۳ھ درج ہے حالانکہ حضرت کا سن وصال بالاتفاق ۶۶۱ھ ہے۔ دوسرے یہ کہ دستخط کی عبارت

بہاء الدین زکریا پر مشتمل ہے لیکن حضرت شیخ الاسلام کا نام صرف زکریا ہے۔ "ابو محمد" کنیت اور "بہاء الدین" لقب ہے۔ کوئی شخص اپنے نام کے ساتھ اپنے قلم سے لقب نہیں لکھا کرتا، چہ جائیکہ حضرت شیخ الاسلام جیسی منکر المزاج شخصیت اپنے نام سے پہلے اپنے لیے "بہاء الدین" لکھنا پسند کرتی۔ لہذا اس قلمی نسخے کا حضرت سے انتساب صحیح نہیں۔" (۱)

مولانا فریدی صاحب نے جو یہ تحریر فرمایا ہے کہ حضرت "کاسن وصال" ۶۶۱ھ ہے، صحیح نہیں، اختلاف ہے۔ کسی نے ۶۶۱ھ تو کسی نے ۶۶۶ھ لکھا ہے۔ اگر ۶۶۶ھ ہی کو صحیح قرار دے دیا جائے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس وقت ان کی عمر ۹۵ برس سے کچھ اوپر ہوگی۔ کیا اس عمر میں وہ اتنی ضخیم کتاب کی نقل کی طرف متوجہ ہو سکتے تھے؟ مزید طرفہ یہ کہ ترقیمہ میں "بہاء الدین" کو "بہاؤ الدین" واؤ کے اضافہ کے ساتھ اور "زکریا" کو "ذکریا" ذال کے ساتھ تحریر کیا گیا ہے۔ حضرت شیخ الاسلام ہرگز ہرگز اس طرح کی غلطیاں نہیں کر سکتے تھے۔ لہذا اس نسخے کا حضرت شیخ الاسلام کی طرف انتساب کاتب کا جعل ہے۔ بہر حال یہ نسخہ صحت کے اعتبار سے سمرقندی نسخے سے بہتر ہے۔

تراجم:

پروفیسر نکلسن (م ۱۹۳۵ء) نے کشف المحجوب کا انگریزی ترجمہ کیا جو پہلی بار ۱۹۱۱ء میں گب میموریل لندن نے شائع کیا۔ ۱۹۳۶ء میں اس کا نظر ثانی شدہ ایڈیشن چھپا۔ پھر ۱۹۵۹ء اور ۱۹۶۷ء میں زیور طباعت سے آراستہ ہوا۔ یہ اس کتاب کی مقبولیت کی واضح دلیل ہے کہ اس کا انگریزی ترجمہ بھی چار بار چھپ چکا ہے۔

بیس سے زائد اردو تراجم چھپ چکے ہیں اور ان میں سے بعض ایسے ہیں جو بار بار شائع ہوئے۔ اس وقت ان سب تراجم کی تفصیل دینے کی گنجائش نہیں۔

سیاحت:

مردانِ خدا کی زیارت اور مزاراتِ اولیاء اللہ سے استفادہ و استفادہ کی غرض سے سفر کی صعوبتیں برداشت کرنا بہت بڑا مجاہدہ ہے جو مشاہدہ کی دولت سے نوازتا ہے۔ حضرت داتا صاحب نے یہ مجاہدہ بھی حد کمال کو پہنچا دیا۔ قریباً تمام عالم اسلام کی سیاحت کی اور وقت کے اعظم مشائخ و صوفیاء سے اکتسابِ فیض کیا۔ انہوں نے جن جن ملکوں اور شہروں کے بزرگوں سے ملاقات کا شرف

حاصل کیا تھا اس کا ذکر کشف المحجوب میں کیا گیا ہے ان اماکن کی نامکمل فہرست درج ذیل ہے:

ماوراءالنہر، آذربائیجان، بسطام، خراسان، کمش، مکند، نیشاپور، بخارا، سمرقند، سرخس، طوس، شام، بیت الحن، دمشق، رملہ، عراق، بغداد، فارس، نواحی خوزستان، فرغانہ، شلا تک، اوزکند، میھنہ، مرو، ترکستان، پاک و ہند۔

کشف المحجوب حضرت داتا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا سفر نامہ نہیں ہے۔ اس میں ان کے سفر و سیاحت کا ذکر ضمناً ہوتا چلا گیا ہے۔ لہذا یہ نہیں کہا جاسکتا کہ انہوں نے اتنے ہی ملکوں اور شہروں کی سیاحت کی، جن کے نام ان کی کتاب میں مذکور ہوئے ہیں اور ان کا سفر پاک و ہند بھی صرف اس حد تک محدود نہیں سمجھنا چاہئے کہ وہ غزنی سے چل کر لاہور پہنچ گئے۔

کشف المحجوب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے پاک و ہند کے اکثر شہروں کی سیاحت کی تھی، یہاں کے علماء سے ملے تھے اور یہاں کی تہذیب و تمدن و رسم و رواج اور ہندوؤں کے عقائد سے گہری واقفیت حاصل کی تھی۔ فناء و بقاء کے مسئلے پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس مسئلے پر ہندوستان میں میرا صرف ایک عالم سے مناظرہ ہوا تھا۔ آپ فرماتے ہیں:

”ہندوستان کے اندر میں نے ایک ایسا شخص دیکھا جو تفسیر و تذکیر اور علم کا مدعی تھا۔ اس نے مجھ سے فناء و بقاء کے مسئلے پر مناظرہ کیا۔ جب میں نے اس کی تقریر سنی تو معلوم ہوا کہ یہ خود فناء و بقاء کو بالکل نہیں سمجھتا اور قدیم و محدث کے فرق کو بھی نہیں جانتا۔“ (۱)

حلولیہ کے عقائد باطلہ کے بیان میں روح کے مسئلہ پر گفتگو فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

”۔۔۔۔۔ اور جملہ اہل ہندو مت اور چین و ماچین یہی عقیدہ رکھتے ہیں۔

شیعوں، قرامطیوں اور باطنیوں کا بھی اسی پر اجماع ہے۔۔۔۔۔“ (۲)

محبت کی شہرت اور تعریف کی بحث کے دوران، سلطان محمود غزنوی رحمۃ اللہ علیہ سے ہنود کی قلبی ناراضی اور ان کی بے بسی کا ذکر نہایت لطیف پیرائے میں کیا ہے:

”ہندوؤں کے نزدیک محبت کی قید محمود کی قید سے بھی زیادہ مشہور ہے اور محبت کا زخم اور

داغ ہندوؤں کے نزدیک اس زخم سے بھی زیادہ شہرت رکھتا ہے جو محمود نے انہیں لگایا تھا۔“ (۳)

”باب سماع الاصوات والا لحن“ میں رقم طراز ہیں:

”مشہور ہے کہ ہندوستان میں کچھ ایسے لوگ ہیں جو جنگل میں جا کر گاتے اور

۱۔ کشف المحجوب، طبع تہران، ص: ۳۱۳، ۳۱۴۔

۲۔ ایضاً، ص: ۳۹۹۔

۳۔ ایضاً، ص: ۳۳۷۔

سریلی آواز نکالتے ہیں۔ ہرن جب ان کے غنا اور لحن کو سنتے ہیں تو وہ ان کی طرف آجاتے ہیں اور شکاری ان کے گرد گھوم کر گاتے رہتے ہیں۔ حتیٰ کہ ہرن گانے کی لذت سے مست ہو کر آنکھیں بند کر کے سو جاتے ہیں اور وہ انہیں پکڑ لیتے ہیں۔“ (۱)

ذرا آگے چل کر فرماتے ہیں:

”میں نے ہندوستان میں دیکھا کہ زہر قاتل میں ایک کیڑا پیدا ہو گیا تھا اور اس کی زندگی اسی زہر پر موقوف تھی۔“ (۲)

غرض کہ انہوں نے بے سرو سامانی میں پاپیادہ اس قدر سفر کیے کہ آج کے ذرائع میں ایک بے سرو سامان فقیر کے لیے ان کا تصور بھی ناممکن ہے۔ چنانچہ لعل بیگ لکھتے ہیں:

”مسافرت بسیار نمودہ و ریاضت و مجاہدات شاقہ کہ از طاقت بشری بیرون بود، کشیدہ۔“ (۳)

لاہور میں ورود مسعود:

خاک پنجاب از دم او زندہ گشت
صبح ما از مهر او تابندہ گشت

داراشکوہ نے لکھا ہے کہ حضرت داتا صاحب قدس سرہ نے تجرید و توکل کی بنیاد پر بارہا طویل سفر کیے اور بہت زیادہ سیاحت کے بعد دارالسلطنت لاہور میں اقامت گزین ہوئے اور اس شہر کے تمام باشندے ان کے مرید و معتقد ہو گئے:

”بارہا بر قدم تجرید و توکل سفر بسیار کردہ اند و بعد از

سیاحی بسیار در دارالسلطنت لاہور رسیدہ اقامت و رزیدند

اہل آن دیار ہمہ مرید و معتقد او گشتند“ (۴)

لاہور شریف لا کر اسی مقام پر قیام پذیر ہوئے جہاں ان کا مزار پر انوار ہے۔ لعل بیگ

لعل لکھتا ہے:

”اکنون قبرش در خطہ لاہور در ہمان زمین است کہ روح

پاکش از جسد مطہر وی مفارقت کردہ۔“ (۵)

۲۔ ایضاً، ص: ۵۳۱

۱۔ کشف المحجوب، طبع طهران، ص: ۵۲۲

۳۔ ثمرات القدس خطی (مملوکہ صاحبزادہ نصرت نوشاہی، شہر چور شریف)

۵۔ ثمرات القدس (قلبی)

۴۔ سفیۃ الاولیاء، طبع کانپور، ص: ۱۶۳

لاہور کب تشریف لائے:

اس باب میں مختلف آراء ہونے کے سبب یہ مسئلہ نہایت پیچیدہ ہے۔ لالہ سبحان رائے بٹالوی رقم طراز ہے:

”محمود غزنوی کے ہمراہ غزنی سے لاہور تشریف لائے اور یہیں فوت ہوئے، سلطان کا عقیدہ تھا کہ لاہور کی فتح ان ہی کی توجہ سے ہوئی۔“ (۱)

یہ روایت واضح طور پر غلط ہے۔ اس لیے کہ بقول سید محمد لطیف مصنف ”تاریخ لاہور“ سلطان محمود غزنوی نے لاہور ۳۹۳ھ میں فتح کیا اور بقول لین پول سلطان محمود غزنوی ۳۹۲ھ میں پہلی بار پاک و ہند کی طرف متوجہ ہوا۔ گویا اس وقت تک حضرت داتا صاحبؒ کی اس جہان رنگ و بو میں تشریف آوری بھی نہیں ہوئی تھی۔

”فوائد الفوائد“ میں ایک ایسی روایت درج ہے جو بعض غلط فہمیوں کا باعث ہوئی۔ لہذا وہ آج تک ہدف تنقید بنتی چلی آرہی ہے۔ وَهُوَ هَذَا

”شیخ حسین زنجانی اور شیخ علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہما دونوں ایک ہی پیر کے مرید تھے اور وہ پیر اپنے عہد کے قطب وقت تھے۔ شیخ حسین زنجانی (شیخ علی ہجویری سے) پہلے ہی لاہور میں مقیم تھے۔ کچھ مدت کے بعد ان کے پیر نے خواجہ علی سے فرمایا کہ لاہور جاؤ اور وہیں مقیم ہو جاؤ۔۔۔ شیخ علی ہجویری نے عرض کی کہ وہاں حسین زنجانی مقیم ہیں۔ پیر نے فرمایا: تم جاؤ، اور جب علی ہجویری ان کے حکم کے مطابق لاہور پہنچے تو رات کا وقت تھا، صبح ہوئی تو دیکھا کہ لوگ حسین زنجانی کا جنازہ باہر لا رہے ہیں۔“ (۲)

اس روایت کی تکذیب و تردید میں راقم احقر اس قسم کی گرما گرم بحث نہیں کر سکتا، جس طرح کہ ڈاکٹر پیر محمد حسن اور پروفیسر محمد اسلم نے کی ہے، اس لیے کہ یہ ان ہی فہلاء کا حق ہے۔ (۳) مختصر یہ کہ حضرت شیخ حسین زنجانی رحمۃ اللہ علیہ جن کا مزار مبارک چاہ میراں لاہور میں مرجع خلائق ہے، ان کا سال وفات ”خزینۃ الاصفیاء“ میں ۶۰۰ھ (۴) اور ”تحقیقات چشتی“ میں

۱۔ خلاصۃ التواریخ، مترجم اردو از ڈاکٹر ناظر حسن زیدی، ص: ۱۰۶

۲۔ فوائد الفوائد، فارسی، طبع لاہور، ص: ۵۷

۳۔ ماہ نامہ فکر و نظر، اسلام آباد، ستمبر ۱۹۷۱ء، مقالہ سید علی ہجویری اور حسین زنجانی از مخدومی ڈاکٹر پیر محمد حسن اور

تاریخی مقالات طبع لاہور از پروفیسر محمد اسلم ملاحظہ ہوں۔

۴۔ خزینۃ الاصفیاء جلد دوم، ص: ۲۵۰۔

۶۰۶ھ درج ہے اور ان کی لاہور میں آمد کے متعلق لکھا ہے کہ وہ سید یعقوب زنجانی کے ہمراہ آئے اور سید یعقوب زنجانی کے حالات میں بیان کیا ہے کہ وہ ۵۳۵ھ میں وارد لاہور ہوئے۔ (۱)۔۔۔ حضرت سید محمد معصوم شاہ قادری رحمۃ اللہ علیہ ساکن چک سادہ شریف (م ۱۳۸۸ھ) نے ایک دفعہ فرمایا تھا کہ: ”میں نے شیخ زنجانی کے مزار پر وہ پتھر نصب دیکھا ہے جس پر ان کا سن وصال ۶۰۰ھ تھا جو مزار کی مرمت کے وقت اُتار دیا گیا“۔۔۔ عجیب بات یہ ہے کہ مفتی غلام سرور اور مولوی نور احمد چشتی نے ان کا سن وصال ۶۰۰ھ اور ۶۰۶ھ اپنی اپنی کتابوں میں لکھنے کے باوجود ”فوائد القواد“ کی اس روایت کو حضرت داتا صاحب کی لاہور میں آمد کے سلسلے میں درج کر کے اسے حضرت حسین زنجانی ”مدفون چاہ میراں پر منطبق کر دیا ہے۔ بہر حال یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ حضرت حسین زنجانی رحمۃ اللہ علیہ حضرت داتا صاحب قدس سرہ سے قریباً ایک سو تیس سال بعد واصل بحق ہوئے اور ان سے حضرت خواجہ خواجگان معین الدین حسن سجری (س، ج، ز، ی) چشتی اجمیری قدس سرہ (۶۳۳ھ) نے لاہور میں ملاقات کی تھی۔ ان دونوں بزرگوں کی ملاقات کا ذکر معتبر کتابوں میں موجود ہے۔ مشہور تذکرہ نویس اور صوفی بزرگ حضرت شیخ جمالی (۹۲۲ھ) نے یہ واقعہ اس طرح بیان کیا ہے:

”حضرت شیخ المشائخ حسین زنجانی جو حضرت شیخ سعد الدین حمویہ قدس روحہ کے پیر ہیں (۲) ان دنوں بقید حیات تھے، حضرت زبدة المشائخ والا اولیاء معین الحق والدین قدس سرہ اور حضرت شیخ المشائخ والا اولیاء شیخ حسین زنجانی قدس سرہ کے درمیان حد سے زیادہ ربط و محبت کا اظہار ہوا۔“ (۳)

ابوالفضل ”آئین اکبری“ میں ان دونوں بزرگوں کی ملاقات ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:

”شیخ حسن (حسین) زنجانی فراوان آگہی داشت،
خواجہ معین الدین در لاہور بہ صحبت اور سید و خواب
گاہ اودرانجاست“ (۴)

۱۔ خزینۃ الاصفیاء جلد دوم: ص: ۲۵۲۔

۲۔ آثار اکرام میں بھی لکھا ہے کہ سعد الدین حمویہ ”شیخ زنجانی“ کے مرید تھے، شیخ فخر الدین زنجانی پیر ارشاد شیخ سعد الدین حموی (ص: ۷) شیخ حمویہ ۶۵۰ھ میں فوت ہوئے جملہ تذکروں میں ان کے پیر کا نام حضرت نجم الدین کبریٰ تحریر ہے۔ حضرت زنجانی سے بھی استفادہ کیا ہوگا۔

۳۔ سیر العارفین قلمی از شیخ جمالی، مخزنہ پنجاب یونیورسٹی لاہور، بحوالہ تاریخی مقامات از پروفیسر محمد اسلم، ص: ۲۸۲

۴۔ آئین اکبری جلد سوم از ابوالفضل، سرسید ایڈیشن، ۱۲۷۲ھ، ص: ۲۰۷

مولانا محمد غوثی شطاری رقم طراز ہیں:

”جب خواجہ معین الاولیاء چشتی اجمیری ہند کو تشریف لائے تو اس وقت چند روز لاہور میں پیر زنجانی کی مصاحبت میں بھی قیام فرمایا تھا، باہم راز داری اور خدا شناسی کی باتیں ہوا کرتی تھیں۔“ (۱)

ملا محمد صالح کبوتہ بھی ان بیانات کی تائید کرتا ہے:

”بالجملہ در لاہور بہ صحبت شیخ حسین زنجانی رسیدہ

وزانجاتوجہ جانب دہلی اختیار فرمود۔ (۲)

داراشکوہ کی تائید مزید ملاحظہ ہو:

”..... شیخ حسین زنجانی را در لاہور دیدہ اند“ (۳)

اس مقام پر یہ واضح کر دینا بھی ضروری ہے کہ حضرت خواجہ اجمیری قدس سرہ لاہور کب تشریف لائے؟

مولانا سید عبدالباری اجمیری اپنی تنقیدی تالیف ”تاریخ السلف“ میں لکھتے ہیں کہ حضرت خواجہ بزرگ ۵۸۸ھ میں وارد ہند ہوئے اور لاہور میں کچھ عرصہ قیام کرنے کے بعد ۵۸۹ھ میں اجمیر شریف پہنچ گئے۔ (۴)

اندریں صورت ”نوائد الفواد“ کی اس روایت کو الحاقی سمجھ لینا کوئی گناہ نہیں۔ مگر جب یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہاں کی تاریخ نے سب بزرگوں کے حالات کو محفوظ کر لیا ہے تو عنان فکر کو اس طرف بھی موڑا جاسکتا ہے کہ حضرت داتا صاحب سے پہلے تشریف لانے والے حسین زنجانی ان سے مختلف ہوں گے اور ان کا مزار اور حالات محفوظ نہیں رہ سکے، مگر ہم نامی کی وجہ سے پہلے حسین زنجانی سے متعلق روایت کو بعد والے حسین زنجانی کی طرف منسوب کر دیا گیا۔ ہم نام بزرگوں کے حالات کے سلسلے میں اکثر ایسا ہوا ہے اور اس کی سینکڑوں مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ حضرت خواجہ پارسا قدس سرہ کے تسامح کا واقعہ مذکور ہو چکا ہے کہ انہوں نے حضرت داتا صاحب اور ابوسعید (رحمہما اللہ) دونوں کو ایک ہی پیر کا مرید قرار دے دیا یا جس طرح کہ جامی لاہوری کے قطعہ تاریخ وفات، حضرت داتا صاحب کو حضرت عبدالرحمن جامی کی طرف منسوب کر دیا گیا ہے۔ لہذا

۱۔ اذکار ابرار ترجمہ گلزار ابرار از محمد غوثی، بسال ۱۰۲۲ھ، طبع آگرہ، ص: ۶، ۲۵

۲۔ عمل صالح (شاہ جہاں نامہ) طبع لاہور، جلد اول، ص: ۵۰

۳۔ سفینۃ الاولیاء، طبع کانپور، ص: ۹۳

۴۔ تاریخ السلف، طبع آگرہ، ۱۳۲۳ھ، ص: ۸، ۹۷

اس معاملہ میں بھی التباس و اشتباہ کا قوی امکان ہے۔

اندریں حال حضرت حسین زنجانی رحمۃ اللہ علیہ سے متعلق روایت مندرجہ ”فوائد الفواد“ اس مسئلے کو سلجھانے کی بجائے مزید الجھا دیتی ہے۔

بہر حال جس طرح حضرت داتا گنج بخشؒ کی تاریخ ولادت اور دیگر حالات زندگی کے باب میں قدیم تاریخیں کوئی راہنمائی نہیں کرتیں، اسی طرح ان کے لاہور میں ورود مسعود کے سلسلے میں کوئی نشاندہی نہیں کرتیں۔ لہذا اس کے متعلق بھی صرف قیاس ہی سے کام لیا گیا ہے۔

رائے بہادر کنہیا لال نے سال ۱۸۸۴ھ کسی مآخذ کا حوالہ دیئے بغیر لکھا ہے:

”یہ بزرگ سلطان مسعود، سلطان محمود کے بیٹے کے ہمراہ لاہور میں آیا۔“ (۱)

سید محمد لطیف نے سال ۱۸۹۲ء سن ورود کا تعین بھی کر دیا:

”آپ سلطان مسعود، پسر سلطان محمود کی فوج کے پیچھے ۴۳۱ھ میں لاہور

تشریف لائے۔“ (۲)

سید محمد لطیف نے سن کا تعین کر کے اس قیاسی سن کو مزید مشکوک بنا دیا ہے اس لیے کہ ۴۳۱ھ میں سلطان مسعود دور ابتلاء میں مبتلا ہو جاتا ہے، اس سال ترکمانوں نے اس کے ملک پر حملہ کر کے اسے شکست دے دی تھی۔ اس کے بعد وہ اپنے خزانے کو لے کر لاہور آ رہا تھا کہ دریائے جہلم کے

کنارے اپنے ہی فوجیوں کے ہاتھوں گرفتار ہو کر اپنے بھائی محمد کا قیدی بن گیا۔ (ملخصاً) (۳)

اس کے باوجود ۴۳۱ھ پر اکثر مورخین مطمئن نظر آتے ہیں۔ مگر رائے بہادر کنہیا لال کی ”تاریخ لاہور“ سے ۳۲ سال قبل لکھی جانے والی کتاب ”چار باغ پنجاب“ مؤلفہ گنیش داس میں ان کی تشریف آوری کا سال ۴۵۱ھ تحریر ہے:

”در ۵۴۵ چہار صد و پنجاہ و یک ہجری در لاہور تشریف

آوردند..... بعد چہار دہ سال در سلطنت سلطان

ابراہیم غزنوی بتاریخ ۵۴۶۵ چہار صد و شصت و پنجم

ہجری در لاہور ودیعت حیات سپردند۔“ (۴)

۱۔ تاریخ لاہور از کنہیا لال، طبع لاہور ۱۸۸۴ء، ص: ۹۱

۲۔ تاریخ لاہور انگریزی، بحوالہ سوانح داتا گنج بخش از محمد الدین فوق، ص: ۲۷

۳۔ تاریخ بیہقی مجلد اول، طبع تہران، ص: ۲۸۳، ۴

۴۔ چار باغ پنجاب، فارسی از گنیش داس و ذریہ، مرتبہ پروفیسر کرپال سنگھ، شائع کردہ سکھ ہسٹری ڈیپارٹمنٹ خالصہ

کالج امرتسر، ۱۹۶۵ء، ص: ۲۷۹

جب یہ کہا جاتا ہے کہ حضرت داتا صاحبؒ نے اپنی عمر کے آخری سال لاہور میں گزارے (۱) تو پھر گنیش داس وڈیرہ نے جو سن (۲۵۱ھ) دیا ہے، اُسے ترجیح دینا چاہیے۔ ۲۵۱ھ کو قرین قیاس لے لیا جائے تو حضرت داتا صاحبؒ، سلطان ابراہیم ظہیر الدولہ بن مسعود بن محمود غزنوی کی تخت نشینی کے ساتھ ہی لاہور تشریف لائے۔ لیکن پول نے ابراہیم کے سریر آرائے سلطنت ہونے کا سال ۲۵۱ھ/۱۰۵۹ء لکھا ہے۔ مگر یہاں ایک اشکال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت داتا صاحبؒ قدس سرہ کے مرشد حضرت شیخ ابوالفضل محمد بن حسن خلی قدس سرہ کی تاریخ وصال ”خزنیۃ الاصفیاء“ میں ۲۵۳ھ درج ہے اور بقول ذہبی وہ ۲۶۰ھ میں واصل الی اللہ ہوئے اور ان کے وصال کے وقت حضرت داتا صاحبؒ بیت الجن (دمشق) میں مقیم تھے اور پیر نے مرید کی گود میں جان جان آفریں کے سپرد کی تھی۔۔۔۔۔ ڈاکٹر محمد شفیع نے اس کا حل یہ پیش کیا ہے:

”وہ یا تو لاہور ۲۶۰ھ کے بعد آئے یا ایک سے زیادہ دفعہ یہاں آئے۔“

حق زحرفِ اُوبلند آوازہ شد:

اس نائب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے قیام لاہور کے دوران ہزار ہا بت پرست کفار کو کلمہ توحید پڑھا کر ان کے سینوں کو نورِ اسلام سے منور کیا اور سینکڑوں خُداؤں کو پوجنے والوں کو صرف ایک خدا کے حضور سجدہ ریز ہونے پر مائل کیا اور لاتعداد گم گشتگانِ بادیہ ضلالت کو صراطِ مستقیم پر گامزن کیا اور کتنے ہی خوش نصیبوں کو اپنی نظرِ کیمیا اثر کی بدولت ولایت کے بلند مراتب پر فائز کیا۔

یہ درست ہے کہ محمود کی حکومت کے قیام کے ساتھ ہی یہاں مسلمان ایک حاکم قوم کی حیثیت سے رہنے لگے تھے اور یہاں کے کفار مسلم فاتحین سے بظاہر مرعوب تھے مگر ان کے قلوب مسلمان فاتحین کے ساتھ نہیں تھے اور وہ ہر وقت موقع کی تلاش میں رہتے تھے۔ مگر یہاں تشریف لانے والے صوفیاء کرام بالخصوص حضرت داتا صاحبؒ کے ورودِ مسعود کے بعد یہاں کی مقامی آبادی میں سے لاتعداد لوگ ان کی تبلیغ کے سبب حلقہٴ بگوشِ اسلام ہو گئے۔ چنانچہ یہاں کے باشندوں میں سے ایک کثیر گروہ کی دلی ہمدردیاں فاتحین کے ساتھ ہو گئیں تھیں۔ ”نظریۃ وطنیت“ خاک میں مل گیا اور دو قومی نظریہ کی بنیادیں رکھ دی گئیں اور بعد میں آنے والے صوفیاء کرام کی مساعی جہیلہ سے اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا گیا جس سے مسلمانوں کی حکومت

استحکام پکڑتی گئی۔ فاتحین نے کفار کو تیر و سنان سے زیر کیا تو ان ناہمین مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے انہیں تیر نظر سے خدائے واحد کا مطیع و منقاد بنا دیا۔

علامہ اقبال علیہ الرحمۃ نے حضرت داتا صاحب قدس سرہ کی عظیم الشان دینی خدمات اور روحانی عظمت کو چند اشعار میں جو خراج عقیدت پیش کیا ہے وہ ان ہی کا حصہ ہے۔ ذیل میں ان کے وجد آفریں اشعار ملاحظہ ہوں:

سید ہجویر مخدوم أمم	مرقد او پیر سنجر (۱) را حرم
بند ہای کوہسار آساں گسیخت	در زمین ہند تخم سجدہ ریخت
عہد فاروق از جمالش تازہ شد	حق ز حرف او بلند آوازہ شد
پاسبان عزت أم الكتاب	از نگاہش خانہ باطل خراب
خاک پنجاب از دم او زندہ گشت	صبح ما از مہر او تابندہ گشت
عاشق وہم قاصد طیار عشق	از جنبش آشکار اسرار عشق

حضرت شیخ مجدد الف ثانی سرہندی قدس سرہ نے لاہور کو جو ”قطب ارشاد“ کا درجہ دیا ہے اصل میں یہ اسی قطب الاقطاب (علی ہجویری) کو خراج تحسین ادا کیا ہے۔
حضرت شیخ مجدد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”فقیر کے نزدیک یہ شہر لاہور تمام ہندوستان کے شہروں میں ”قطب ارشاد“ کی طرح ہے اس شہر کی خیر و برکت تمام بلاد ہندوستان میں پھیلی ہوئی ہے۔“ (۲)

حضرت نے اپنی روحانی قوت سے کفرستان ہند میں جو تخم سجدہ کی کاشت کی تھی، رائے بہادر کنہیا لال نے بدیں الفاظ اس کا اعتراف کیا ہے:

”مسلمانی دین پھیلانے میں بڑی بڑی کوشش کی۔“ (۳)

اور گنیش داس و ڈیرہ رقم طراز ہے:

۱۔ اہل تحقیق کے نزدیک ”سجر“ لکھنا صحیح ہے۔ استاد سعید نفیسی صاحب نے لاہور میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا

کہ ڈاکٹر اقبال ”مرحوم کے شعر میں ”پیر سجر“ غلط چھپ گیا ہے اصل میں یہ شعریوں ہونا چاہیے: سید ہجویر مخدوم أمم، مرقد او پیر سجزی را حرم (ہلال فارسی، کراچی، بحوالہ اذکار جمیل از محمد موسی، ص: ۵۱)

۲۔ مکتوبات مجدد الف ثانی ”ارو ترجمہ مولانا محمد سعید احمد نقشبندی، طبع کراچی، دفتر اول حصہ اول، ص: ۲۳۸

۳۔ تاریخ لاہور از کنہیا لال، ص: ۹۱

”دراں عہد اکثر قوم گوجران ہندو مشرب در لاہور وطن

گاہ داشتند معتقد او شدہ اسلام قبول کردند۔“ (۱)

مولوی نور احمد چشتی نقل کرتے ہیں:

”جب حضرت یہاں تشریف لائے تو اس وقت یہاں ایک شخص رائے راجو،

نائب حاکم پنجاب حضرت ”کامرید ہو کر مسلمان ہوا اور اس کا نام ”شیخ

ہندی“ رکھا گیا۔ اس کی اولاد تاحال خادم و مجاور ہے۔“ (۲)

تعمیر مسجد اور ایک کرامت:

حضرت داتا صاحب قدس سرہ نے لاہور تشریف لاتے ہی اپنی فرودگاہ کے ساتھ ایک

چھوٹی سی مسجد تعمیر کرائی۔ اس ضمن میں داراشکوہ لکھتا ہے:

”انہوں نے ایک مسجد تعمیر کرائی تھی جس کی محراب دیگر مساجد کی بہ نسبت جنوب کی طرف

مائل ہے۔ کہتے ہیں کہ اس وقت کے علماء جو لاہور میں موجود تھے، اس محراب کی سمت کے سلسلے

میں حضرت شیخ پر معترض ہوئے۔ چنانچہ ایک روز حضرت نے سب علماء کو جمع کیا اور خود امامت کے

فرائض سرانجام دیئے اور بعد اداۓ نماز حاضرین سے مخاطب ہو کر کہا: دیکھو کعبہ شریف کس سمت

میں ہے؟ دیکھا تو حجابات اٹھ گئے اور کعبہ شریف محراب کی سیدھ میں نمودار ہو گیا۔۔۔۔۔ ان کا مزار

بھی ان کی مسجد کی سمت کے مطابق ہے۔“ (۳)

سال وصال:

حضرت داتا گنج بخش قدس سرہ کے سال وصال میں بھی خاصا اختلاف پایا جاتا ہے۔

لعل بیگ لعلی نے ”ثمرات القدس“ اور شہزادہ داراشکوہ نے ”سفینۃ الاولیاء“ میں ان کے سن وفات

۳۵۶ھ اور ۳۶۳ھ رقم کیے ہیں۔ عہد جہانگیر کے عالم و عارف مولانا جامی لاہوری (مدفون بجوار

حضرت شیخ طاہر بندگی رحمۃ اللہ علیہ) نے اپنے قطعہ تاریخ میں ۳۶۵ھ نظم کیا ہے۔ میر غلام علی آزاد

بلگرامی نے ”ماثر الکرام“ میں، گنیش داس وڈیرہ نے ”چار باغ پنجاب“ میں، سامی بیگ نے

”قاموس الأعلام“ میں ۳۶۵ھ ہی لکھا ہے اور دیگر متعدد مؤلفین نے بھی یہی سن نقل کیا ہے۔ نکلسن

نے ۳۶۵ھ تا ۳۶۹ھ کا کوئی سا سال کہا ہے۔ ڈاکٹر قاسم غنی نے ”تاریخ تصوف در اسلام“ جلد دوم

۱۔ چار باغ پنجاب، طبع امرتسر، ص: ۲۷۹

۲۔ تحقیقات چشتی، طبع لاہور ۱۳۲۳ھ، ص: ۱۳۷

۳۔ سفینۃ الاولیاء، فارسی، طبع کانپور، ص: ۱۶۴

میں در حدود ۱۹۷۰ھ تجویز کیا ہے۔

مگر ڈاکٹر مولوی محمد شفیع اور عبدالحی حبیبی قندھاری (کابل) ان سب سے آگے نکل گئے ہیں۔ مولوی صاحب نے ۱۹۷۹ھ (۱) اور حبیبی صاحب نے ۱۹۵۰ھ تک کا تعین کیا ہے۔ ان فاضلوں نے کشف المحجوب کے چند ایک مختلف ایڈیشن سامنے رکھ کر اس قسم کی داخلی شہادتیں فراہم کی ہیں کہ داتا صاحب نے فلاں فلاں بزرگ کے نام کے ساتھ رحمہ اللہ یا رضی اللہ عنہ لکھا ہے اور فلاں کا ذکر بہ صیغہ ماضی کیا ہے۔ لہذا یہ کتاب بقول مولوی محمد شفیع ۱۹۷۹ھ اور بقول حبیبی ۱۹۸۱ھ کے بعد تک لکھی جا رہی تھی۔ حبیبی صاحب نے اپنی طویل بحث کالب لباب ان الفاظ میں پیش کیا ہے:

”لازمی طور پر ۱۹۸۱ھ اور ۱۹۵۰ھ کے درمیان وفات پائی ہوگی“۔ (۲)

منفصل بحث کا یہ مقام نہیں۔ مختصر یہ کہ بیشتر مقامات پر ”رحمہ اللہ“ اور ”رضی اللہ“ عنہ کاتبوں کے خود ساختہ اضافے ہیں اور اس طرح ”ہست“ کو ”بود“ بھی بنایا ہوا ہے۔ ایسی تحقیق کی بنیاد پر مصنف کا اپنا مکتوبہ نسخہ ہونا چاہیے۔ اگر یہ ممکن نہ ہو تو قدیم ترین متعدد خطی نسخے پیش نظر ہونے چاہئیں۔ کاتبوں کی کمی بیشی تحقیق کا مدار نہیں بن سکتی۔ اس جدید تحقیق کی ایک مثال پیش کی جاتی ہے۔ فاضل حبیبی نے کشف المحجوب نسخہ سمرقند سے ذیل کا اقتباس پیش کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ کتاب زیر تسوید تھی کہ حضرت امام قشیری قدس سرہ ۱۹۶۵ھ میں وفات پا گئے تھے:

”أستاد امام زين الاسلام ابوالقاسم عبدالكريم بن

ہوازن القشیری رضی اللہ عنہ اندر زمانہ خود بدیع

بود قدش رفیع و منزلت بزرگ“۔ (۳)

مگر یہی عبارت ژرد کوفسکی ایڈیشن میں اس طرح ہے:

”أستاد و امام زين اسلام عبدالكريم ابوالقاسم بن

ہوازن القشیری اندر زمانہ خود بدیع ست و قدرش

رفیع ست و منزلت بزرگ“۔ (۴)

پنجاب پبلک لائبریری لاہور میں کشف المحجوب کا ایک خطی نسخہ مکتوبہ ۱۰۸۰ھ موجود

۱۔ مقالات دینی و علمی از ڈاکٹر مولوی محمد شفیع، حصہ اول، ص: ۲۳۱

۲۔ مقالات منتخبہ مجلہ دانشکدہ خاور شناسی، دانش گاہ پنجاب، مقالہ: تاریخ وفات داتا گنج بخش علی ہجویری غزنوی از عبدالحی حبیبی۔ فاضل موصوف کا یہ مقالہ پہلی بار اوزبیکستان میں کالج میگزین شمارہ فروری ۱۹۶۰ء میں طبع ہوا تھا۔

۳۔ مقالات منتخبہ، ص: ۲۶۳

۴۔ کشف المحجوب طبع تہران، ص: ۲۰۹

ہے۔ اس میں بھی:

”اندر زمانہ خود بدیع ست۔۔۔۔۔“ (۱)

تحریر ہے۔۔۔ گویا اس بحث برائے بحث یا تحقیق کی بنیاد محض اختلاف نسخ اور کاتبوں کے اضافات پر رکھی گئی ہے۔ اگر اس پر اصرار کیا جائے کہ ان بزرگوں کے اسماء کے ساتھ رحمہ اللہ وغیرہ حضرت نے خود ہی لکھا ہے تو پھر ان کے اپنے اسم گرامی کے ساتھ شروع کتاب ہی میں رضی اللہ عنہ بھی لکھا ہوا ہے۔ اس کے متعلق کیا کہا جائے گا اور اگر انہوں نے اپنے لیے یہ دعائیہ کلمہ خود تحریر کیا ہے تو وہ دوسرے زندہ بزرگوں کے لیے بھی کر سکتے تھے۔۔۔ بہر حال حضرت کا صحیح سن وصال کسی معاصر نے نہیں لکھا لہذا ۴۵۶ھ قطعاً غلط ہے۔ ۴۶۵ھ تا ۴۶۹ھ ہی قرین صحت سمجھا جاسکتا ہے۔ (۲)

مزار پر انوار:

یوں تو جملہ ارباب یقین کے قلوب حضرت داتا گنج بخش قدس سرہ کے مزار میں ہیں مگر جہاں وہ محو استراحت ہیں، وہ مقام بوسہ گاہ عالم، قبلہ اہل صفا اور کعبہ عشاق ہے۔ یہاں عوام کے علاوہ ہر وقت اولیائے ظاہرین و مستورین کا ہجوم رہتا ہے۔ پاکستان بھر میں یہ وہ متبرک و مقدس مقام ہے جہاں جملہ مقامات مقدسہ سے زیادہ قرآن خوانی ہوتی ہے۔ جہاں سب سے زیادہ ذکر خدا اور ذکر محبوب خدا (صلی اللہ علیہ وسلم) ہوتا ہے اور یہ تبلیغ اسلام اور روحانیت کا سب سے بڑا مرکز ہے، جہاں ہر وقت حاجت مند زائرین کا تانتا بندھا رہتا ہے اور داتا (سخی) کے دریائے فیض کو دیکھ کر بے اختیار ان کی زبان پر جاری ہو جاتا ہے:

گنج بخش فیض عالم مظہر نور خدا ناقصاں را پیر کامل کا ملاں را رہنما

حضرت کا مزار فائض الانوار زمانہ قدیم سے مرجع خواص و عوام چلا آ رہا ہے۔ بڑے بڑے عارفین اور سرخیل اولیاء یہاں سے فیض یاب ہوئے اور اس خانقاہ کی دھول کو اپنی آنکھوں کا سرمہ بنانا عین سعادت سمجھتے رہے۔ مولانا جامی لاہوری لکھتے ہیں: (۳)

۱۔ تفصیلی فہرست مخطوطات فارسیہ، پنجاب پبلک لائبریری، مرتبہ منظور احسن عباسی، ۱۹۶۳ء، نمبر ۶، ۲۹۷ ص: ۱۵۷

۲۔ عبدالحی حبیبی نے اس بحث کا اعادہ مقدمہ طبقات الصوفیہ میں بھی کیا ہے۔ اول اول میں نے ان کی یہ تحقیق اسی میں دیکھی تھی اور میں ان کی ثقاہت کے پیش نظر اس کا قائل ہو گیا تھا اور مقدمہ مکتوبات امام ربانی لکھتے وقت ان کا اتباع کیا تھا مگر اب کشف المحجوب کے متعدد نسخے دیکھنے سے اس جدید تحقیق سے اعتماد اٹھ گیا ہے۔

۳۔ مقدمہ کشف المحجوب از ڈاکٹر مولوی محمد شفیع، ص: ۸

خانقاہ علی ہجویری است خاک جاروب از درش بردار
طوطیاں کن بدیدہ حق بین تاشوی واقف در اسرار
چوں کہ سردارِ ملک معنی بود سالِ وصلش بر آید از "سردار"

۴۶۵

میر عبد العزیز زنجانی جو غالباً شاہ جہاں کے زمانہ کا شاعر ہے، نے عرفی کے مشہور قصیدے کے جواب میں لاہور پر ایک قصیدہ لکھا، اس میں حضرت داتا صاحبؒ کے روضہ انور و اطہر پر جو زائرین کا ہجوم رہتا ہے، اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے۔

مزارِ ڈرنثار شاہ ہجویری ندیدستی
کہ محل آسبابہ پیرا مونس جوش انس و جاں بینی
گدائی درگش از منزلت شاہ جہاں یابی
غلام خادمش از رتبہ مخدوم جہاں بینی (۱)
داراشکوہ لکھتا ہے:

"ہر جمعرات کو خلقت انبوہ در انبوہ روضہ منورہ کی زیارت سے مشرف ہوتی ہے اور مشہور ہے کہ جو کوئی چالیس جمعراتیں یا چالیس دن متواتر ان کے روضہ شریفہ کا طواف کرے، اس کی ہر حاجت پوری ہو جاتی ہے۔ فقیر (داراشکوہ) نے بھی ان کے روضہ منورہ کی زیارت کی ہے۔" (۲)
مفتی علی الدین رقمطراز ہیں:

"ہر شب جمعہ و روز جمعہ ہزار ہا مردم برائے زیارت
ایشان مع نذورات می روند، مرادات دلی رامستدعی می
شوند۔" (۳)

داراشکوہ مزار شریف کے محل وقوع کے بارے میں لکھتا ہے:

"قبر در میان شہر لاہور مغربی قلعہ واقع شدہ۔"
"یعنی ان کی قبر لاہور شہر میں قلعہ سے مغرب کی جانب واقع ہے۔" (۴)

اس جملے کا محمد وارث کامل نے یوں ترجمہ کیا ہے:

"مزار مبارک لاہور کے مغربی قلعہ میں واقع ہے۔" (۵)

۱۔ مقدمہ کشف المحجوب از ڈاکٹر مولوی محمد شفیع، ص ۸ ۲۔ سفینۃ الاولیاء طبع کانپور، ص ۱۶۵
۳۔ عبرت نامہ، طبع لاہور، مجلد دوم، ص ۶۳ ۴۔ سفینۃ الاولیاء، طبع کانپور، ص ۱۶۵
۵۔ ایضاً، اردو ترجمہ از وارث کامل، طبع لاہور، ص ۱۹۸

لاہور کا نقشہ تبدیل ہو جانے کے سبب داراشکوہ کی یہ تحریر مبہم ہو گئی ہے۔ پھر ترجمہ کرنے والے نے غلطی کھائی تو آج سے قریباً پندرہ سال قبل لاہور کے ایک ایسے مولوی صاحب نے جو صوفیاء کے مزارات پر حاضری بدعت و شرک سمجھتے تھے، یہ اعلان داغ دیا کہ یہ مزار داتا صاحب کا نہیں، اُن کا مزار تو قلعہ لاہور میں ہے۔ اس وقت مولوی موصوف کے اس بیان کے خلاف متعدد مضامین شائع ہوئے تھے۔۔۔۔۔ داراشکوہ کی اس تحریر کے ابہام کو ڈاکٹر مولوی محمد شفیع نے اس طرح حل کیا ہے:

”داراشکوہ نے یہ کہا ہے کہ قبر شہر لاہور کے درمیان، قلعہ کے مغرب میں واقع ہے۔“

یہ کچھ عجیب سا بیان ہے۔ اس لیے کہ قبر شہر کی فصیل کے باہر ہے۔ البتہ شہر کی بیرونی آبادی کے درمیان ہے اور قلعہ کے مغرب کی بجائے جنوب مغرب کہنا زیادہ صحیح تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ داراشکوہ کے زمانہ میں قلعہ سے مغرب کو آتے تھے تو بادشاہی مسجد جو کہ اس وقت تھی ہی نہیں، پہلا قابل ذکر مقام راوی کا گھاٹ تھا۔ دریا اس وقت قلعہ کے نیچے سے بہتا تھا۔ اس گھاٹ کو کاہل جانے والی سڑک عبور کرتی تھی اور گھاٹ کے بعد داتا صاحب کے مزار والا علاقہ ہی قابل ذکر تھا۔ چنانچہ ایک انگریز سیاح فنچ نامی نے جو ۱۶۱۱ء یعنی جہانگیر بادشاہ کے عہد میں ساڑھے چھ ماہ کے قریب لاہور میں ٹھہرا رہا، اسی ترتیب سے اس موضع کا ذکر کیا ہے۔ گو وہ مسجد شکر گنج کہتا ہے بجائے مسجد گنج بخش کے۔ (۱)

حضرت داتا صاحب رحمۃ اللہ علیہ ظہیر الدولہ سلطان ابراہیم بن مسعود بن محمود کے عہد حکومت میں واصل الی اللہ ہوئے تھے اور اسی سلطان نے حضرت ”کا مزار تعمیر کرایا تھا اور یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت کے ساتھ جو دو قبریں ہیں وہ شیخ احمد حمادی سرخسی اور شیخ ابوسعید ہجوری کی ہیں۔ (۲) واللہ اعلم بالصواب۔“



۱۔ مقدمہ کشف المحجوب از ڈاکٹر مولوی محمد شفیع، ص: ۷-۶

۲۔ تحقیقات چشتی، ص: ۶، ۱۴۵

کچھ مترجم کے بارے میں

حضرت علامہ مولانا ابوالحسنات سید محمد احمد قادری خلیف اکبر حضرت مولانا دیدار علی شاہ الوری (رحمۃ اللہ علیہما) متنوع علوم و فنون کے ماہر اور بے مثل خطیب اور قاری تھے۔ تحریک پاکستان پھر تعمیر پاکستان اور دستور اسلامی کے نفاذ کے سلسلے میں ان کی مساعی ناقابل فراموش ہیں۔ جہاد کشمیر میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، متعدد کتابیں تصنیف کیں، مولانا علیہ الرحمۃ کی خدمات جلیلہ اس امر کی متقاضی ہیں کہ ان پر ایک ضخیم کتاب لکھی جائے۔ اس وقت مولانا کے صاحبزادے مکرمی حکیم سید خلیل احمد قادری کی صرف ایک روایت نقل کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

سید خلیل احمد صاحب فرماتے ہیں:

”حضرت مولانا ابوالحسنات علیہ الرحمۃ نے جس روز کشف الحجاب کا ترجمہ جس کا تاریخی نام ”کلام المرغوب“ ہے، مکمل کیا تو اسی رات حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کی خواب میں زیارت ہوئی۔ وہ اس طرح کہ حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ ایک بلند مقام پر رونق افروز ہیں اور چاروں طرف بہت زیادہ روشنی ہے۔ لوگوں کی قطاریں بندھی ہوئی ہیں۔ حضرت داتا صاحب کچھ تقسیم فرما رہے ہیں اور لوگ لے لے کر ایک طرف ہوتے جا رہے ہیں اسی قطار میں علامہ ابوالحسنات بھی شامل ہیں تو جس وقت وہ داتا صاحب کے سامنے ہوئے تو حضرت نے مسکرا کر دیکھا اور ہاتھ پکڑ کر اپنے دائیں طرف بٹھا لیا۔ اس کے بعد علامہ ابوالحسنات بیدار ہو گئے۔“

علامہ ابوالحسنات علیہ الرحمۃ نے یہ خواب اپنے صاحبزادے سید خلیل احمد قادری کو سنایا اور اس انعام پر بے حد مسرور تھے۔ چند سال بعد مولانا بیمار ہو گئے اور علالت نے طول کھینچا اور مرض میں اضافہ ہی ہوتا چلا گیا۔ انتقال سے آٹھ روز قبل رات کے آخری حصے میں سید خلیل احمد صاحب کو آواز دی اور جب وہ حاضر ہوئے تو فرمایا میرے کندھے دباؤ اور دعائیہ الفاظ کے بعد فرمایا: مولانا غلام محمد ترنم علیہ الرحمۃ آج میانی کے قبرستان کے کسی کونے میں لیٹے ہوئے ہیں۔ عنقریب ہم بھی ان کے ساتھ کسی کونے میں لیٹے ہوں گے۔ پھر فرمایا:

”ابوالحسنات! ابوالحسنات! کیا ہے ابوالحسنات؟۔۔۔ یہ سب جھوٹی باتیں ہیں۔۔۔ ہاں!

خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو حضرت داتا صاحب کے جوار میں آسودہ ہیں۔“

۲ شعبان ۱۳۸۰ھ بروز جمعہ صبح کے وقت اپنے وظائف سے فارغ ہوئے اور یہ شعر

زبان پر لائے۔

حافظِ رند زندہ باش مرگ کجا و تو کجا

تو شدہ فنائے حمد، حمد بود بقائے تو

اس کے بعد یہ شعر کہا:

کائناتِ عشق بس اتنی مریضِ غم کی تھی

ایک ہچکی میں طلسمِ آرزو باطل ہوا

اس کے بعد حزب البحر کا ورد شروع کر دیا اور سید خلیل احمد صاحب کو فرمایا کہ مجھے خوشبو لگا دو

اور نئے کپڑے پہنا دو۔ جناب خلیل احمد صاحب نے عرض کیا، کیا بات ہے؟ فرمایا جمعہ پڑھنے جانا

ہے اور پھر ذکر میں مشغول ہو گئے اور اسی حال میں ایک ہچکی آئی اور اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملے۔

إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ا

سید خلیل احمد صاحب فرماتے ہیں کہ حضرت کی خواہش کے مطابق میں نے متعلقہ حکام

سے رابطہ قائم کیا تو بہ تصرف داتا صاحب قدس سرہ بلا دقت حضرت داتا صاحب کے احاطہ مزار

میں مولانا کو دفن کرنے کی اجازت مل گئی۔

مولانا کی وفات حسرت آیات پر راقم السطور نے چند تاریخی مادے نکالے ہیں ان میں

سے دو:

(۲) ”جلیل المراتب سید ابوالحسنات“

(۱) ”مشہور زمان مفسر قرآن“

۱۳۸۰ھ

۱۳۸۰ھ

ان کی مرقد منور پر کندہ ہیں ”لقد دخل الجنة مولانا“ بھی ان کی تاریخ راقم ہی نے کہی تھی۔

۱۳۸۰ھ

حضرت علامہ ابوالحسنات رحمۃ اللہ علیہ کا یہ ترجمہ جس طرح حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ

علیہ کی خوشنودی کا باعث ہوا اسی طرح عاصی پر معاصی کی بھی یہ نذرِ عقیدت (دیباچہ) ان کے حضور

مقبول ہو اور ان کے غلاموں کے غلاموں کے ساتھ محشور ہونا نصیب ہو۔

آمین ثم آمین بجاہ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم۔

محمد موسیٰ اعظمی عنہ

لاہور: آغا سید مظفر ۱۳۹۳ھ

قطعہ تاریخ طباعت

نتیجہ فکر سید شریف احمد شرافت قادری نوشاہی مدظلہ

بحمد لله كتاب كشف محبوب
 ز تصنيف مُقدّس قطبِ عالم
 بتوحيد و تصوف لوح عرفان
 مترجم شد دریں اردو زبانے
 چو افشائے رموزش شد بعالم
 باحوالش حکیم نیک موسیٰ
 شرافت جُست از سالِ طباعت

کہ رُشد و معرفت زان ہست مطلوب
 کہ نامش گنج بخش پاک محبوب
 برائے سالکان فیضے ست موہوب
 ز بو الحسنات احمد گشت مکتوب
 ہمہ اعدائے دین گشتند مغلوب
 بتحقیق و تفکر ہست محسوب
 شدہ مسموع ”باب علم مرغوب“
 ۱۳۹۳ھ

فقیہ عصر حضرت مفتی اعجاز ولی خان رضوی نے تاریخ طباعت کے حسب ذیل
 مادے نکالے ہیں:

”فیض امام المرسلین“

۱۳۹۳ھ

”مخزن برکات جلیل“

۱۳۹۳ھ



مقدمہ

نَحْمَدُهُ وَنُصَلِّي عَلَى رَسُولِهِ الْكَرِيمِ
بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

رَبَّنَا إِنَّا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةٌ وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةٌ وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝
رَبَّنَا إِنَّا مِنْ لَدُنْكَ رَحْمَةٌ وَهِيَ لَنَا مِنْ أَمْرِنَا رَشْدًا ۝
الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي كَشَفَ لَنَا وَوَلِيَّائِهِ بَوَاطِنَ مَلَكُوتِهِ وَقَشَعَ لِأَصْفِيَائِهِ
سَرَائِرَ جَبَرُوتِهِ وَأَرَاقَ دَمِ الْمُحِبِّينَ بِسَيْفِ جَلَالِهِ وَأَذَاقَ
سِرِّ الْعَارِفِينَ رُوحَ وَصَالِهِ. هُوَ الْمُحْيِي لِمَوَاتِ الْقُلُوبِ بِأَنْوَارِ
إِدْرَاكِ صَمَدِيَّتِهِ وَكِبْرِيَّائِهِ وَالْمُنْعِشُ لَهَا بِرَاحَةِ رُوحِ الْمَعْرِفَةِ
بِنَشْرِ أَسْمَائِهِ وَالصَّلَاةِ وَالسَّلَامِ عَلَى رَسُولِهِ مُحَمَّدٍ وَآلِهِ
وَأَصْحَابِهِ وَأَزْوَاجِهِ أَجْمَعِينَ بِرَحْمَتِكَ يَا أَرْحَمَ الرَّاحِمِينَ .

”تمام محامد اسی وجہ منیر کو ہیں جس نے اپنے مقربین خاص پر عالم ملکوتی کے امور منکشف فرمائے اور اپنی صاف باطن ہستیوں پر عالم جبروتی کے راز کھولے اور اپنی شمشیر جلالی و بے نیازی سے اپنے محبوبوں کے خون بہائے اور عارفانِ کامل کو اپنے وصلی تقرب کا ذائقہ چکھایا، وہی ذات مقدس مردہ دلوں کو اپنے صمدیت اور کبریائی کے نور سے زندہ فرمانے والی ہے اور وہی ان زندوں کو اپنے عرفان کی راحت روح حیاتِ ابدی عطا فرمانے والی ہے اور اپنے اسماء ذاتی کے اثرات ان پر طاری فرمانے والی ہے۔

اور صلوة بے غایت اور سلام بے نہایت اس کے خاص رسول پر جن کا نام محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہے اور ان کے متبعین اور اولادِ اطہار پر اور ان کے اصحاب کبار پر اور ازواجِ مطہرات پر۔۔۔ آمین!“

حضرت علی بن عثمان بن علی الجلابی غزنوی فرماتے ہیں جو محلہ ہجویر غزنی کے رہنے والے ہیں کہ میں نے استخارہ کیا اور اغراض نفسانیہ کو دے نکالا اور اپنی دلی آرزو کے مطابق ثابت قدم ہو کر اس کتاب کو لکھنا شروع کیا۔ اللہ تعالیٰ سب کی مرادیں پوری فرمائے اور اس کتاب کا نام میں نے اس لیے ”کشف المحجوب“ (۲۵۹ھ) رکھا کہ پڑھنے والا مقصود کو نام سے سمجھ لے اور سائل کا جو مقصود ہوتا ہے، مجھے معلوم ہے اس کے ذریعہ اس کی مراد پوری ہوگی۔ اللہ تعالیٰ سے مدد مانگتا ہوں اور تکمیل کتاب کی توفیق چاہتا ہوں۔ مجھے اپنے ارادہ و قوت پر بھروسہ نہیں اور اس خیال خام سے میں اظہار برأت کرتا ہوں۔

فصل:

ابتداءً کتاب میں جو میں نے اپنا نام لکھا، اس سے دو باتیں مطلوب ہیں: ایک خواص کے لیے، دوسری عوام کے لیے۔ عوام کے لیے تو یہ کہ جب جاہل بے علم کوئی نئی کتاب دیکھتا ہے اور اس پر مصنف کے نام کا پتہ نہیں ملتا، وہ اس کتاب کو اپنے نام پر شائع کر لیتا ہے اور اس رویہ سے مصنف کا جو مقصد ہوتا ہے وہ ضائع ہو جاتا ہے اور مصنف جو کتاب تالیف و تصنیف کرتا ہے، اس سے اس کا پہلا مقصد یہی ہوتا ہے کہ اس تصنیف کے ذریعہ اس کا نام زندہ رہے اور اس کتاب کے پڑھنے والے مصنف کو دعائے خیر سے یاد کرتے رہیں۔ مجھے یہ تلخ تجربہ دو بار ہوا۔ ایک بار کسی نے میرے اشعار کا دیوان عاریتہ لیا اور چونکہ صرف وہی ایک نسخہ میرے پاس تھا۔ اس نے میرے تمام دیوان میں میرے نام کی جگہ اپنا تخلص لگا کر شائع کر دیا اور میری تمام محنت ضائع کر دی۔ اللہ تعالیٰ اس کی خطا کو معاف فرمائے۔ دوسری بار ایسا اتفاق ہوا کہ میں نے ایک کتاب فن تصوف میں تالیف کر کے اس کا نام ”منہاج الدین“ رکھا۔ ایک متصوف نے اسے لے کر اپنے نام پر شائع کر دیا۔ خدا کرے وہ گنہگار ہو۔ اس نے عوام میں اس کتاب کو اپنی تالیف ظاہر کر کے شائع کیا، حالانکہ جاننے والے اس کی اس حرکت پر استہزاء کرتے تھے۔ حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی حرکت ناموزوں کی وجہ سے برکت سلب فرمائی اور اپنی بارگاہ کے طالبوں میں سے اس کا نام محو فرما دیا۔

دوسری وجہ ابتداءً میں نام لکھنے کی خواص کے لیے ہے، وہ یہ کہ جب وہ کسی کتاب کو دیکھتے ہیں تو پہلے مؤلف کا نام معلوم کرتے ہیں، تاکہ اگر مؤلف کو وہ محقق اور عالم فن جانیں تو اس کے احترام میں خاص رعایت کرتے ہیں اور اس کے مطالعہ اور اشاعت میں کوشاں ہوتے ہیں۔ اس حقیقت کے اظہار سے مؤلف کی مراد واضح ہوگئی ہے۔ وَاللّٰهُ تَعَالٰی اَعْلَمُ۔

فصل:

میں نے جو لکھا ہے میں نے استخارہ کیا، اس سے میری مراد بھی رب العزت تبارک و تعالیٰ کی بارگاہ کا ادب ملحوظ رکھنا ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب پاک ﷺ اور ان کے تابعین کو حکم فرمایا ہے: ﴿فَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ﴾ (۱) ”اے محبوب! جب آپ قرآن پڑھنا چاہیں تو اول شیطان مردود سے اللہ کے ساتھ پناہ لیں“۔ چنانچہ استعاذہ اور استخارہ اور استعانت سب کے معنی پناہ مانگنے اور اپنے کاموں میں اللہ تعالیٰ جل شانہ سے مدد لینے کے ہیں۔ جس سے انسان ہر قسم کے فتنوں سے مامون ہو جاتا ہے۔

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے بھی مروی ہے، فرماتے ہیں کہ حضور شافع یوم النشور صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے کاموں میں قرآن مجید کی تعلیم کے مطابق استخارہ تعلیم فرمایا کرتے تھے اور یہ حقیقت ہے کہ تمام امور کی بہتری، کوشش اور تدبیر پر موقوف نہیں بلکہ ہر بلندی کی بھلائی و برائی خدائے قدوس جانتا ہے اور جو تکلیف و راحت بندے کو پہنچتی ہے وہ پہلے سے اس کی قسمت میں مقدر ہوتی ہے۔

اندریں صورت ہر بندے کو اپنا معاملہ قضاء و قدر کے سپرد کرنے اور اس کی تکمیل کے لیے مؤثر حقیقی سے مدد مانگنے کے سوا چارہ ہی نہیں ہے۔ لہذا ایسا ہی کرنا بہتر ہے تاکہ رب العزت تعالیٰ شانہ اس سے اس کے نفس کے بُرے اثرات دُور فرمائے اور اس کام کی بہتریوں سے اسے متمتع کرے۔ بنا بریں ہر مسلمان کو چاہیے کہ ہر کام کے لیے پہلے استخارہ کرے تاکہ اللہ تعالیٰ اسے خطا و خلل اور ہر قسم کی آفتوں سے محفوظ رکھے۔

فصل:

میں نے جو یہ کہا کہ نفسانی اغراض سے دل کو پاک کر کے یہ کام شروع کیا ہے۔ اس کے اظہار سے غرض یہ ہے کہ جس کام میں غرض نفسانی آجاتی ہے اس سے برکت اٹھ جاتی ہے اور دل راستی و دیانت کے راستہ سے نکل کر کسی کی زنجیروں میں پھنس جاتا ہے اور یہ صورت دو حال سے خالی نہیں۔ یا تو نفس کی غرض پوری ہوگی یا نہ ہوگی، اور نفسانی غرض پوری ہوئی تو اس میں تمام ہلاکت ہی ہلاکت ہے۔ اس لیے کہ جہنم کے دروازہ کی کنجی مرادِ نفس کا حصول ہے اور اگر غرضِ نفس پوری نہ ہوئی تو ظاہر ہے کہ اس غرضِ بد کو پہلے ہی دل سے دُور کیا ہوتا، اس لیے کہ نجات اسی میں

جس کا مفہوم یہ ہے کہ کام شروع کرنے کی ابتداء میں نیت کرنا اس کام کے شروع کرنے سے بہتر ہے اور تمام معاملات میں نیت کو عمل میں بڑا دخل ہے اور اس پر یہ بدیہی دلیل ہے کہ انسان نیت کے ساتھ ایک کیفیت سے دوسری کیفیت میں آجاتا ہے۔ قطع نظر اس سے کہ ظاہر میں عمل ہو یا نہ ہو۔

مثلاً ایک شخص روزہ رکھنے کی نیت کے بغیر بھوکا رہے تو اس کو کچھ ثواب نہیں اور جب روزہ کی نیت سے بھوکا رہے تو اس بھوکے رہنے میں اسے اتنا ثواب ہوتا ہے کہ مقربین بارگاہ کی جماعت میں داخل ہو جاتا ہے۔ باوجودیکہ روزہ دار رہنے سے ظاہر میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔

(بقیہ حواشی گزشتہ صفحہ سے)

”نية المؤمن خیر من عمله، وعمل المنافق خیر من نيته وکل يعمل علی نيته فاذا عمل المؤمن عملاً نارا من قلبه نور“ امام ہاشمی کہتے ہیں: اس کے تمام راوی سوائے حاتم بن عباد بن دینار کے، ثقہ ہیں۔ کسی نے بھی اس کا ذکر نہیں کیا اور حافظ عراقی نے اپنے طریق سے اسے ضعیف قرار دیا ہے۔ امام مناوی نے اسے ”اسعاف الطلاب“ میں ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے ”نية المرء خیر من عمله ونية الكافر شر من عمله“ اور اسے امام طبرانی کی طرف اہل بن سعد کی روایت کے ساتھ منسوب کیا ہے اس کے علاوہ ابن حبان، امام بیہقی نے ”شعب الایمان“ امام مسلم، امام نسائی، اور امام ابن ماجہ نے بطریق نو اس بن سمعان سے روایت کیا ہے۔ امام مناوی اسے ”الجامع الأزهر“ بطریق اہل بن سعد ساعدی بلفظ طبرانی لائے ہیں اور اسے امام طبرانی کی طرف منسوب کیا ہے اور کہا ہے کہ اس کے راوی ثقہ ہیں۔ سوائے حاتم بن عباد بن دینار حارثی کے۔ میں نے اس کا ذکر کسی سے نہیں سنا۔ امام سیوطی اسے ”الجامع الصغیر“ میں بطریق اہل بن سعد لائے ہیں اور امام طبرانی کی طرف منسوب کیا ہے اسی طرح ثابت بنانی اسے ان الفاظ کے ساتھ لائے ہیں۔ ”نية المؤمن ابلغ من عمله“ اور اسے حکیم ترمذی اور امام عسکری کی ”جمهرة الامثال“ کی طرف منسوب کیا ہے اور ابو موسیٰ الاشعری سے بھی روایت کیا ہے جن کے الفاظ یہ ہیں ”نية المؤمن خیر من عمله وأن الله عزوجل ليعطى العبد علی نيته ما لا يعطيه علی عمله اور اسے امام دیلمی کی طرف منسوب کیا ہے اور نو اس بن سمعان سے مروی روایت کے الفاظ جسے ”الامثال“ للعسکری کی طرف منسوب کیا ہے، یہ ہیں:

”نية المؤمن خیر من عمله ونية الفاجر شر من عمله“

حوالہ کے لیے ملاحظہ کیجئے: کشف الخفاء (حدیث: ۲۸۳۶) المقاصد الحسنة (حدیث: ۱۲۶۰) حلیۃ الأولیاء ۲۵۵/۳، تاریخ بغداد ۲۳۷/۹، تمیز الطیب من الخبیث (۱۲۵۲) الغماز علی اللماز للسمهودی (حدیث: ۱۶۱۹) الجامع الأزهر للمناوی ۶۱/۳، الجامع الكبير ۸۵۸/۱، فیض القدير للمناوی، الدرر المنتثرة للسیوطی (۴۲۶) الفوائد المجموعة للشوکانی (ص: ۲۵۰)

علاوہ ازیں دوسری دلیل یہ بھی ہے کہ جب کوئی مسافر کسی غیر شہر میں جا کر رہے تو جب تک وہاں قیام شرعی کی نیت نہ کرے (جو پندرہ یوم سے زائد ہے) مقیم نہیں ہو سکتا، مسافر ہی رہے گا اور قیام شرعی کی نیت کرنے سے (جو پندرہ یوم سے زائد ہو) مقیم ہو جاتا ہے۔ اس قسم کی بہت سی مثالیں ہیں۔

تو حاصل مقصود یہ ہوا کہ کام کی ابتداء میں نیک نیت کرنا، اس کام کا حق ادا کرنے کے مترادف ہے۔ وَاللّٰهُ تَعَالٰی اَعْلَمُ ا
فصل:

اور جو ہم نے لکھا ہے اس کتاب کا نام ہم نے ”کشف المحجوب“ (۲۵۹ھ) رکھا، اس سے مراد یہ ہے کہ جو کچھ کتاب میں ہے، اس کی ترجمانی اس کتاب کا نام ظاہر کر دے۔ جس کی چشم باطن کھلی ہو وہ جب کتاب کا نام سنتا ہے تو جان لیتا ہے کہ اس میں کیا کیا مضامین درج ہیں۔

اور واضح رہے کہ مقررین بارگاہ کے سوا عوام حقیقت آشنائی سے محجوب ہیں اور محض بے خبر۔ چونکہ یہ کتاب یہاں راہ حق میں ہے اور کلمات تحقیق کی شرح اور کشف حجاب شریعت کے موجب ہیں، اس لیے اس کتاب کا نام اس کے سوا اور کوئی موزوں نہ تھا۔ اور درحقیقت کشف، محجوب کے لیے ہلاکت ہے، جیسے کشف میں حجاب یعنی جس طرح قرب متحمل بعد نہیں ہوتا اس طرح بعد، متحمل قرب نہیں یا یوں سمجھنا چاہئے: جو کٹر اسر کہ میں پیدا ہوتا ہے وہ جس چیز میں پڑے گا مرجائے گا اور جو کٹر دوسری چیزوں میں پیدا ہوا ہو وہ اگر سر کہ میں ڈالا جائے تو مرجائے گا۔

اسی طرح معانی اور تحقیق حقیقت کا راستہ اختیار کرنا اسی کا کام ہے جو اس کام کے لیے پیدا کیا گیا ہے، بخلاف اس کے جو اس کام سے نابلد ہے۔ اگر وہ اس کام میں ڈالا جائے تو اسے اس کا پورا کرنا دشوار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: كُنْ مَيْسِرًا لِّمَا خُلِقَ لَهٗ (۱)

۱۔ اسے امام مسلم نے اپنی صحیح ۸/۲۸ (باب: کل عامل ميسر لعمله) میں مصعب بن سعد کے طریق سے انہوں نے اپنے والد سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”اعملوا لكل ميسر لما خلق له“

امام سیوطی اسے ”الجامع الصغیر“ ۲/۹۳ میں، امام غزالی نے ”احیاء العلوم“ ۳/۲۳۴ میں، امام قضا عی مسند الشہاب ۳/۳۹۳۔ (۴۴۱) میں لائے ہیں۔ ابن ابی عاصم نے ”السنۃ“ (۱۷۳) میں اس کے مفہوم میں ابوحنیفہ کے طریق سے روایت کیا ہے، اگرچہ اس روایت میں نقاد محدثین کے نزدیک ضعیف راوی ہے، لیکن یہ اپنی بکثرت شاہد روایات کے باعث صحیح ہے۔ (بقیہ حواشی اگلے صفحہ پر۔۔۔۔۔)

یعنی جو انسان جس کام کے لیے بنایا گیا ہے، اسے وہی کام آسان ہے۔ اور اس پر اس کام کا راستہ آسان ہو جاتا ہے۔

لیکن حجاب دو قسم کا ہوتا ہے: ایک حجاب رینی۔ یہ وہ حجاب ہے جس سے ہم اللہ کے ساتھ پناہ مانگتے ہیں۔ اس لیے کہ یہ حجاب جس پر آیا پھر دُور نہیں ہوتا۔ دوسرا حجاب غیبی ہے، یہ جلد رفع ہو جاتا ہے۔ اس کی تصریح یوں ہے کہ ایک انسان وہ ہے کہ اس کی ذات تصدیق حق کے لیے جب حجاب ہو جاتی ہے تو اس کے نزدیک حق و باطل برابر ہو جاتا ہے۔ اور ایک انسان وہ ہوتا ہے جس کی ذات تصدیق حق کے لیے حجاب تو ہوتی ہے مگر اس کی جبلت طالب حق رہتی ہے اور باطل پرستی سے اجتناب کرتی ہے۔ تو وہ حجاب جو رینی ہے کبھی اٹھتا ہی نہیں اور رین، ختم، طبع، مترادف المعنی ہیں جیسا کہ رب العزت نے فرمایا:

﴿كَلَّا بَلْ رَانَ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ مَّا كَانُوا يَكْسِبُونَ﴾ (۱)

”ہرگز نہیں بلکہ ان کے دلوں پر زنگ چڑھا ہوا ہے ان کے کرتوت کی وجہ سے۔“

اور اس زنگ کا اثر دوسری آیت کریمہ میں فرمایا ہے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ ءَأَنذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ﴾ (۲)

”بے شک جو لوگ کافر قطعی ہیں برابر ہے اے محبوب! خواہ انہیں خوف دلا یا نہ دلا، ہرگز ایمان نہ لائیں گے۔“

اس لیے کہ:

﴿خَتَمَ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ﴾ (۳)

”اللہ نے ان کے دلوں پر مہر کر دی ہے۔“

(بقیہ حواشی گزشتہ صفحہ سے)

ایک اور حدیث جو ابو حمید الساعدی سے مروی ہے وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”اجملوا فی طلب الدنيا، فان کلامیسر لما خلق له منها“

اسے ابن ماجہ نے اپنی ”سنن“ (۲۱۴۲) میں، ابن ابی عاصم نے ”السنن“ (۴۱۸) میں ابن عیاش کے طریق سے روایت کیا ہے اور ابن عیاش اس میں ضعیف ہے کیونکہ وہ غیر شامیوں سے بھی روایت کرتا ہے لیکن امام حاکم نے ”المستدرک“ ۳/۲ میں، امام بیہقی نے ”السنن الکبریٰ“ ۲۶۴/۵ میں ایک اور سند کے ساتھ روایت کیا ہے اور امام حاکم نے کہا ہے کہ یہ صرف امام مسلم کی شرائط پر صحیح ہے، اس کی سند میں عبدالملک بن سعید الأنصاری ہے جس سے امام بخاری نے کوئی چیز روایت نہیں کی اور ابو نعیم الأصفہانی نے ”حلیۃ الأولیاء“ ۲۶۵/۳ میں ایک اور سند کے ساتھ اسے روایت کیا ہے۔

(حوالہ صفحہ ۷۱)

۱۔ سورۃ المطففین: ۱۴ ۲۔ سورۃ البقرۃ: ۶ ۳۔ سورۃ البقرۃ: ۷

اور یہ بھی فرمایا:

﴿طَبَعَ اللَّهُ عَلَى قُلُوبِهِمْ﴾ (۱)

”مہر لگائی اللہ نے اُن کے دلوں پر“۔

اور اس صفت کا حجاب جو غیننی ہے، وہ کسی وقت دُور بھی ہو سکتا ہے اور رَیْنِ وَغَیْنِ کے معنی میں مشائخ نے ایک لطیف خیال بھی ظاہر فرمایا ہے۔ چنانچہ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

الرَّيْنُ مِنْ جُمْلَةِ الْمُؤَطَّنَاتِ وَالْغَيْنُ مِنْ جُمْلَةِ الْخَطَرَاتِ .

”رین ذاتیاتِ موطن سے ہے اور غین وساوس و خطراتِ وطن سے ہے“۔

اور یہ امر ظاہر ہے کہ ذاتِ موطن پائیدار ہے اور خطراتِ وطن ناپائیدار۔ مثلاً خالص پتھر کبھی شیشہ نہیں ہو سکتا خواہ کتنی ہی جلا دیتے رہو اور اگر شیشہ مکدر ہو جائے تو چونکہ جلا اس کی ذات میں ہے، اسی وجہ سے وہ روئی جلا دینے سے مجلا ہو جائے گا۔ اس کی وجہ ظاہر ہے کہ پتھر کی ذات میں ظلمت و تاریکی ہے اور شیشہ کی ذات میں جلا و روشنی۔ تو چونکہ اصل پائیدار ہوتی ہے، بنا بریں بوجہ اصلیت پتھر کسی جلا سے مجلا نہیں ہوگا اور شیشہ ادنیٰ جلا دینے سے جلا پا جائے گا۔ تو میں نے یہ کتاب اس لیے تالیف کی ہے کہ اس کے ذریعہ ان کے حجاب کا کشف ہو جائے۔ جو حجاب غین میں محجب ہیں اور درحقیقت مایہ نور حق ان میں موجود ہے۔ تاکہ اس کتاب کے پڑھنے سے ان کا حجاب کھل جائے اور حقیقت کا راستہ انہیں مل جائے اور جو انکارِ حق اور احقاقِ باطل سے محبت رکھنے والے ہیں وہ ہرگز مشاہدہٴ حق کی راہ نہیں پاتے۔ انہیں اس کتاب سے بھی کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا۔ وَالْحَمْدُ لِلَّهِ عَلَى نِعْمَةِ الْعَرَفَانِ .

فصل:

ہم نے جو یہ لکھا ہے کہ مقصودِ مسائل ہمیں معلوم ہو گیا اور مسائل کی جو غرض و غایت ہے وہ اس کتاب میں مفصل مذکور ہے۔ اس سے میری مراد یہ ہے کہ جب تک مسئول مقصودِ مسائل نہ سمجھے، مراد جواب پورا کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔

اور مسائل عموماً مسئول سے امورِ مشککہ کا حل چاہتے ہیں۔ پھر جب مقصودِ مسائل سمجھے بغیر جواب دیا جائے تو مقصودِ مسائل حل نہیں ہوتا اور اس جواب سے کوئی فائدہ بھی نتیجہ خیز حاصل نہیں ہوتا اور یہ امر واضح ہے کہ جب تک سوالِ مشکل کا عرفانِ مسئول کونہ ہو، اس کا حل کرنا محال ہے۔

اور یہ جو ہم نے کہا کہ اس کتاب کے ذریعہ سائل کی مراد پوری ہوگی، اس سے یہ مطلب ہے کہ جو سوال جامع ہوگا اس کا جواب بھی اس کتاب میں جامع ملے گا بشرطیکہ سائل اپنے سوال کے صغیر و کبیر درجات اور پہلوؤں کا عالم ہو اور اگر مبتدی سائل ہے تو اسے تفصیل کی احتیاج نہیں۔ اس کے لیے حدود اور درجات کے بیان کی ضرورت ہی نہیں۔

الحاصل، خدا ہر سائل کی غرض نیک کرے۔ میرا مقصد اس کتاب کی تالیف سے یہی ہے کہ سوال سائل کی تفصیل پر ایک کتاب مرتب ہو جائے۔

فصل:

اور میں نے جو یہ کہا ہے کہ میں اللہ تعالیٰ سے اتمام کتاب کی توفیق اور مدد طلب کرتا ہوں، اس سے جو مراد ہے وہ یہ ہے کہ انسان کے لیے سوائے اس معین حقیقی کے، کوئی ایسا ناصر نہیں جو اعمال صالحہ پر اس کی اعانت کرے اور اس کی تکمیل کی توفیق بخشنے۔

اب یہ سمجھنا بھی ضروری ہے کہ توفیق کیا ہے؟

توفیق کہتے ہیں امور خیر میں انسان کے ہر فعل کے اندر فعال حقیقی جل مجدہ کی اعانت۔ اور امور خیر وہ ہیں جن کے نیک ہونے پر کتاب و سنت ناطق ہو اور ان کے استحسان پر اجتماع امت پایا جائے اور لفظ ”توفیق“ کو سوائے جماعت معزلہ اور گروہ قدریہ، سب اسی معنی میں لائے ہیں۔ برخلاف معزلہ و قدریہ کے کہ وہ اس لفظ توفیق کو تمام معانی سے خالی سمجھتے ہیں اور ایک جماعت مشائخ طریقت کے نزدیک توفیق کے معنی یہ ہیں:

التَّوْفِيقُ هُوَ الْقُدْرَةُ عَلَى الطَّاعَةِ عِنْدَ الْإِسْتِعْمَالِ.

”توفیق کیا ہے، یہ کہ انسان بوقت عمل اپنے میں قدرت اطاعت پائے۔“

اس لیے کہ جب بندہ اپنے رب جل مجدہ کی اطاعت کرتا ہے تو وہ اپنے میں منجانب اللہ بہ نسبت سابق بہت زیادہ استعداد پاتا ہے، کیونکہ وقتاً فوقتاً جو حرکات و سکنات اس سے سرزد ہوتی ہیں وہ منجانب اللہ اس کی پیدائش سے قبل اس کے لیے مقدر ہوتی ہیں تو اس فن کو جس سے انسان مطیع و فرمانبردار حکم الہی ہوتا ہے، توفیق کہتے ہیں۔

اور اس کتاب میں اس مسئلہ کی تفصیل کے لیے گنجائش نہیں۔ اس لیے کہ یہ بحث جداگانہ ہے۔ بنا بریں میں اپنے بیان کو اصل مطلب کی طرف لے جاتا ہوں اور اصل مدعا پر جانے سے قبل میں اس سوال کو بعینہ بیان کرتا ہوں۔ حقیقتاً کتاب ہذا کا شروع ہی اسی سوال سے ہے۔

وَبِاللَّهِ التَّوْفِيقُ ا

استفسار:

فرماتے ہیں کہ ابو سعید جہوریؓ (۱) نے مجھ علی جہوریؓ سے سوال کیا کہ:
 ”اہل طریقت و تصوف کی کیفیت اور ان کے مقامات و مذاہب بیان کر اور
 ارباب تصوف کے رموز و اشارات ظاہر کر اور یہ بھی واضح کر کہ اللہ جل مجدہ
 کی ذات و صفات کے ساتھ ربطِ محبت کیوں کرتا ہے اور اس کا لطف
 بے کیف قلوبِ صوفیاء پر کس طرح تکلیف ہوتا ہے اور اس کی ماہیت معلوم
 ہونے سے عقول کا حجاب اور اس کی حقیقتِ آشنائی سے نفس کی منافرت اور
 اس کی ضیاء و صفا سے روح کو آرام کیوں کر ہے!“

مسئول علی بن عثمان جلابی نے کہا: اللہ اس کے اس جواب دینے میں اعانت فرمائے۔
 ہمارے اس زمانہ میں علمِ حقیقت و معرفت مندرج اور معدوم جیسا ہو گیا ہے۔ خاص کر
 ان ممالک میں جہاں کے عوام خواہشاتِ نفسانیہ کے پیرو بن گئے ہیں اور راہِ رضا (۲) و استقامت
 سے منحرف!

اور عام طور پر علماء نے صورتِ طریقت کو اس کی اصلیت کے برخلاف ظاہر کر کے عوام کی
 بینات بدل دی ہیں۔ لہذا آؤ اور کمر ہمت چست کرو، اس لیے کہ اس سوال کی حقیقت تک خواص
 کے سوا عوام کا ہاتھ نہیں پہنچ سکتا اور عوام اہل ارادہ کی اُمیدیں اس کے حصول کی امید سے
 مایوس ہیں!

اور درحقیقت حضرت جل مجدہ تعالیٰ شانہ کے خواص کے علاوہ تمام مدعیانِ عرفان کی
 معرفت بے کار ہے۔ اس لیے عوام نے معرفت سے مراد محض اس کے لغوی معنی لیے ہیں اور بہ دل و
 جان اس کے حجاب کے خریدار ہو چکے ہیں اور یہ کام تحقیق کا تھا مگر اب محض تقلید میں رہ گیا ہے۔ حتیٰ
 کہ درجہ تحقیق ان سے مخفی ہو گیا۔ یہی وجہ ہے کہ عوام بھی کہنے لگ گئے کہ ہم حق شناس عارف ہیں!
 اور خواص ان سے اس لیے خوش ہیں کہ ان کے دلوں میں عرفان کی تمنا چاہتے ہیں اور سوزِ محبت ان
 میں دیکھتے ہیں اور مدعی تصوف و عرفان اپنے اپنے دعوے میں اس قدر محو ہو گئے کہ معانی حقیقی حل
 کرنے میں عاجز ہیں۔ پیرو مرید دونوں نے مجاہدہ چھوڑ دیا اور محض اپنے وہم و ظن کا نام مشاہدہ رکھ
 لیا۔ میں نے اس فن میں کئی کتابیں لکھیں مگر سب ضائع ہو گئیں۔

۱۔ ابو سعید جہوریؓ مشائخ غزنی میں سے ہیں۔

۲۔ رضا اصطلاحِ صوفیاء میں قائلِ حقیقی کے خیر و شر پر خوش رہنے کو کہتے ہیں۔ منہ ۱۲

مدعیانِ کاذب نے لوگوں کو دامِ تذویر میں پھانسنے کے لیے صوفیاء کے چند الفاظ یاد کر لیے ہیں اور اصل مفہوم نسیا منسیا کر ڈالا اور دل میں انکار کے سوا کچھ نہیں اور اسے وہ نعمت جانتے ہیں۔
 ایک گروہ اس علم کے حاصل کرنے کو آمادہ ہو کر بیٹھا مگر کچھ حاصل نہ کر سکا۔ دوسرے گروہ نے فن پڑھا مگر اس کے معنی پر عبور حاصل نہ کر سکا اور عبارت یاد کر کے ظاہر کرتا پھر کہ ہم فنِ تصوف اور علمِ عرفان جانتے ہیں اور حقیقتاً یہ انکارِ خالص ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ معانی حقیقی کا جاننا ایسا ہے جیسے کبریتِ احمر پا کر اس کی ایک دانگ (۸ رتی) کی نسبت سے تانبا، کانسی کو سونا بنا دے۔

مختصر یہ کہ ہر شخص وہ دوا چاہتا ہے جو اس کے درد کے لیے دافع ہو اور اس کے سوا اُسے اور کسی چیز کی طلب نہیں۔ بزرگوں میں سے کسی نے خوب کہا ہے:

فَكُلُّ مَنْ فِي فُؤَادِهِ وَجَعٌ
 وَيَطْلُبُ شَيْئًا يُوَافِقُ الْوَجْعَا

”ہر وہ شخص جس کے کلیجہ میں درد ہے اور وہ اسی چیز کا طالب ہے جو اس کے درد کو مفید ہو۔“

پھر جس مریض کی بیماری معمولی ہے اسے موتی اور مرجان کی کیوں تلاش ہو کہ وہ اسے خمیرہ مروارید اور دواء المسک میں ڈالے۔

درحقیقت آشنائی اس وجہ میں بھی عزیز الوجود ہے کہ ہر کس و ناکس کے حصہ میں یہ دولت نہیں۔ (جس طرح میری تصانیف جامع ہوئیں ایسے ہی)۔

علمِ تصوف سے جاہل لوگوں نے بزرگانِ سلف کی کتابوں کو لے کر بغیر سمجھے ان کی یہ عزت کی، اس اسرارِ الہیہ کے خزانہ کو کلاہ فروشوں اور جلد سازوں کے ہاتھ بیچ کر ضائع کر دیا۔ انہوں نے ان کے اوراق پھاڑ پھاڑ کر ٹوپوں کے استروں میں لگا دیئے اور جلد سازوں نے ابونواس کے دیوان اور جاحظ کی ہزلیات کی جلدوں میں چپکا دیئے۔

گویا یہ ایسے ہوا جیسے باز شاہی کسی بڑھیا کے مکان پر چلا گیا اور اُس نے اس کے پردے، بازو کاٹ کر گھر میں ڈال دیا۔ رب العزت جل مجدہ نے ہمیں بھی ایسے زمانہ میں پیدا فرمایا کہ اہالیانِ زمانہ حظوظِ حرص و ہوا کو شریعت بنا بیٹھے اور طلبِ جاہ اور ریاست و تکبر کو عزت و علم سمجھ لیا اور ریا کاری و نمائش کو خوفِ الہی قرار دے دیا اور بغض، حسد و کینہ کو حلم و بردباری بنا لیا۔ مجادلہ کا نام مناظرہ دین رکھ لیا۔ لڑائی جھگڑا، کینہ پن کا نام غیرت رکھ لیا۔ نفاق کے معنی زُہد کر لیے اور غناءِ باطل کو ارادت

بتانے لگ گئے۔ ہڈیاں و بکواس کا نام معرفت رکھ لیا۔ حرکتِ دل بڑھ جانے کو قلب جاری ہونا کہہ دیا۔ دل میں جو خطرات پیدا ہوتے ہیں اس کا نام الہام و حدیثِ نفس بنا لیا۔ الحادِ خالص کو فقر کہہ دیا۔ جو حق سے سہل انگاری کو صفوت کہہ ڈالا۔ زندقہ کا نام فانی اللہ ہونا رکھ لیا۔ ترکِ احکامِ شریعتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰت و السلام کو عینِ طریقت بنا بیٹھے اور خس و خاشاک، فکر دنیا و آفتِ زمانہ کا نام معاملہ فہم بنا لیا۔

آخرش اربابِ معنی و اہلِ سلوک ان دیدہ دلیروں سے الگ ہو گئے اور اغیار نے عوام پر غلبہ پالیا۔ جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اہلِ بیت اطہار (رضوان اللہ علیہم اجمعین) کی ابتدائی زمانہ کی پریشانی اور ضعف پر حضرت ابو بکر واسطی رحمۃ اللہ علیہ نے جو حقیقت آشنا اور بے نظیر دلائل پیش کرنے والے محقق، نکتہ سنج، اربابِ کمال کے تاجور ہیں، آلِ مروان کو کیا خوب فرمایا ہے:

”أُبْتَلِينَا بِزَمَانٍ لَيْسَ فِيهِ آدَابُ الْإِسْلَامِ وَلَا أَخْلَاقُ الْجَاهِلِيَّةِ وَلَا أَحْكَامُ ذَوِي الْمَرْوَةِ.“

”ہم ایسے زمانہ کے ساتھ ابتلا میں ہیں جس کے اندر نہ آدابِ اسلامی ہیں، نہ زمانہ جہالت جیسے اخلاق اور نہ اہلِ مروّت کے طور طریقے باقی ہیں۔“

اس کے مطابق متنبی کا ایک شعر ہے:

لَحَا اللَّهُ ذِي الدُّنْيَا مُنَاخَا لِرَاكِبٍ

فَكُلُّ بَعِيدِ الْهَمِّ فِيهَا مُعَذَّبٌ (۱)

”اللہ اس دنیا پر لعنت کرے جو سوار کے اترنے کی جگہ ہے، پس اس میں ہر بلند ہمت عذاب میں ہے۔“

فصل:

اے طالبِ حق! اللہ تجھے نیک کاموں میں قوی ایمان کرے۔ یقین جان کہ میں نے اس علم دنیا کو اسرارِ الہی کا مقام اور مخلوقات کو اس کی امانت خاص پایا اور موجودات و اعیانِ ثابتہ کو اس کی صنعتِ لطیف کا منظر دیکھا اور جو ہر عرض، عنصر، جرم، بدن، طبائع ان سب کو اسرارِ مکتوبہ کا پردہ پایا اور مقامِ توحید میں مذکورہ اشیاء کے اثبات کو شرک سمجھا جاتا ہے۔

اللہ رب العزت جل مجدہ نے اس جہان فانی کو بمنزلہ حجاب رکھ کر اپنے حکم سے ہر اک دل کو تسلی بخشی ہے اور انسان اپنے وجود کے سبب حقیقتِ آشنائے توحید ہونے سے محجوب ہے اور

۱۔ دیوانِ متنبی، بقشیدہ از استاذ امیر ادروی (قدیمی کتب خانہ کراچی)، ص: ۲۶۹

ارواح بھی رفاقتِ وجودِ انسانی کی بدولت مغرور ہو کر اپنے ربِّ مجید کی تقریب اور اس جسم سے نجات پانے میں محروم ہو گئی ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ اسرارِ الہیہ بذریعہ عقل سمجھنا مشکل، بلکہ محال ہیں۔ اسی وجہ سے لطائفِ حق سے روحِ انسانی محجوب ہو گئی اور مجسمہٴ انسانی اپنے برزخی وجود سے دُور ہو گیا۔ جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد ہے:

﴿وَالْعَصْرِ ۝ إِنَّ الْإِنْسَانَ لَفِي خُسْرٍ ۝﴾ (۱)

”قسم ہے محبوب تیرے عصرِ پاک کی! بیشک انسان اپنے عنصرِ وجودی کے حجاب میں آ کر معرضِ زیاں میں ہے۔“

اور یہ بھی فرمایا:

﴿إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا ۝﴾ (۲)

”بے شک وہ بڑا نادان و ناعاقبت اندیش اور جاہل ہے۔“

پھر حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

خَلَقَ اللَّهُ الْخَلْقَ فِي ظُلْمَةٍ ثُمَّ أَلْقَى عَلَيْهِ نُورًا. (۳)

”اللہ تعالیٰ نے مخلوقات کو حجاباتِ عنصر پر پیدا فرمایا، پھر ان پر تزکیہ و تصفیہ قلب کے ذریعے اپنے نورِ خاص کی جھلک ڈالی۔“

پھر وہ حجابِ علمِ دنیا میں فریضہٴ انسانی کے اندر مل گیا اور بتصرفِ عقل طبائعِ انسانی پر غالب آ گیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جس پر قناعت کر کے روح کی صفائی کی بجائے خریدارِ حجابات ہو گیا۔ یہی وجہ ہے کہ انسان من حیث الانسان اسرارِ حقیقی اور انوارِ کشف سے بے خبر رہ کر ان افعال سے گریز کرتا ہے جو اس کی نجات کے سبب ہیں۔ گویا وہ مثل بہائم و انعام ہو گیا جو بوئے توحید سے نا آشنا، جمالِ احدیت سے بے بہرہ، ذوقِ وحدانیت سے بے خبر ہے۔ اس کی ترکیبِ حجابی مشاہدہ اور تحقیق سے عاجز ہے۔ اسی وجہ سے مرضیاتِ الہیہ کو چھوڑ کر حرص و ہوائے دنیاوی کی طرف رجوع ہے۔ اپنی لطمِ حیوانی کے ساتھ حیاتِ ربانی کو مقہور کر کے خواہشاتِ نفسانیہ کی حرکتوں پر چلنے لگ گئے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ مجسمہٴ خواہشاتِ نفسانیہ بن گئے۔ سونے، کھانے اور شہوانی کیفیتوں کی

۱۔ سورۃ العصر: ۱

۲۔ سورۃ الاحزاب: ۷۲

۳۔ سنن ترمذی ۲/۹۸ اور امام سیوطی نے اسے ”الجامع الصغیر“ ۱/۹۶ میں اور امام ابن عربی نے

”الفتوحات المکیة“ ۲/۸۱ میں ان الفاظ کے ساتھ ذکر کیا ہے: ان اللہ تعالیٰ خلق خلقه فی ظلمة

فاللقى علیہم من نورہ فمن اصابہ من ذلک النور اہتدی، ومن اخطاه ضل

پیروی کرنے کے سوا اور کچھ خبر ہی نہیں۔

رب جل مجدہ و عزاسمہ نے اپنے خاص دوستوں کو مذکورہ امور سے مجتنب رہنے کے لیے اس طرح ہدایت فرمائی:

﴿ذَرُّهُمْ يَأْكُلُوا وَيَتَمَتَّعُوا وَيُلْهِمُ الْأَمَلُ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ﴾ (۱)

”اے میرے محبوب! چھوڑ ان کو تاکہ کھائیں، زندگی کے عیش اڑائیں اور دنیاوی حرص و آرزو انہیں غافل رکھے، پھر عنقریب جان لیں گے (کہ اس غفلت کا نتیجہ کیا ملا)۔“

چونکہ عوام الناس کی طبیعتوں کے غلبہ نے ان سے اسرار الہیہ پوشیدہ کر دیئے تو ان پر عنایات الہی کی بجائے خواری و ذلت چھا گئی۔ اسی وجہ سے تمام نفس امارہ کے پیرو ہو گئے اور یہ سب میں بڑا حجاب ہے اور برائی کا منبع۔ اس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوءِ﴾ (۲)

”بے شک نفس برائیوں کا حکم کرنے والا ہے۔“

اب میں اصل کتاب شروع کرتا ہوں اور مقصود طالب کو مقامات خاص اور حجاب ہائے گونا گوں میں ظاہر کروں گا اور بیان لطیف کے ساتھ حکایات فن سناؤں گا، فرامین مشائخ کرام کو اس سے تطبیق دوں گا اور ارباب فن کی عبارات کو نہایت موزوں صورت میں چسپاں کروں گا۔ احوال بزرگان دین اور حالات مقربین سے مفہوم سمجھانے میں امداد لوں گا، تاکہ طالب مفہوم کی مراد فہم پوری ہو، تاکہ علماء ظاہر امداد دیں۔ علاوہ ازیں جو بھی اسے دیکھے، جان لے کہ طریق تصوف کتنا ہموار ہے، اور شجرہ طریقت کی جڑیں کس قدر مضبوط ہیں اور اس کی شاخیں کیسی بار آور ہیں اور ہر کوئی سمجھ سکے کہ تصوف تمام علوم کی اصل ہے اور اس سے علماء تصوف ہمیشہ اپنے مریدوں کو تحصیل علم کی ہدایت کرتے رہے اور لہو و لعب و ہزلیات کی پیروی سے روکتے رہے، اور اس فن کی ترویج و ترغیب سے ان کی تصانیف بھری ہوئی ہیں، جن میں وہ مضامین ہیں جو انہیں منجانب اللہ وارد و صادر ہوئے۔ وَ بِاللّٰهِ التَّوْفِیْقُ۔



اثباتِ علم

علماءِ حقہ کی صفت میں حضرت ربُّ العزت جل شانہ فرماتا ہے:

﴿ إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ ﴾ (۱)

”اللہ کے بندوں میں خشیتِ الہی رکھنے والے علماء ہی ہیں۔“

حضور سید یوم النور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيضَةٌ عَلَى كُلِّ مُسْلِمٍ وَ مُسْلِمَةٍ. (۲)

”ہر مسلمان مرد و عورت پر علم دین حاصل کرنا فرض ہے۔“

۱۔ سورۃ فاطر: ۲۸

۲۔ یہ حدیث حضرت علی المرتضیٰ، ابن مسعود، انس، ابن عمر، ابن عباس، جابر اور ابوسعید رضی اللہ عنہم اجمعین سے مروی ہے لیکن اس کے صحیح اور ضعیف ہونے کے بارے میں، اقوال و آراء کا اختلاف ہے، امام عراقی نے ”تخریج الاحیاء“ میں کہا کہ بعض ائمہ کرام نے اس کی بعض اسناد کو صحیح قرار دیا ہے، امام بیہقی فرماتے ہیں اس کا متن مشہور ہے لیکن سند ضعیف ہے اور تمام ضعیف طرق سے مروی ہے۔ امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں کہ اس ضمن میں ہمارے نزدیک کوئی چیز ثابت نہیں اسی طرح امام ابن راہویہ کہتے ہیں کہ جہاں تک اس کے معنی و مفہوم کا تعلق ہے، تو وہ صحیح ہے۔

ابوعلی نیشاپوری کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ سے اس کی صحیح اسناد مروی نہیں ہیں اور اسی طرح ابن جوزی نے ”الموضوعات“ میں کہا ہے اور ابن حیان کہتے ہیں کہ یہ باطل ہے اس کی کوئی اصل نہیں۔ امام ابن قنطار کہتے ہیں کہ اس طرح کی کوئی چیز صحیح نہیں۔ امام نووی نے ایک سوال کے جواب میں کہا ہے کہ یہ ضعیف ہے لیکن اس کا معنی صحیح ہے۔ امام ذہبی نے ”میزان الاعتدال“ میں اسے باطل کہا ہے۔ امام زرکشی نے ”التذکرۃ“ میں کہا ہے کہ اس کے تمام طرق محل نظر ہیں۔ اور سب سے عمدہ سند قتادہ و ثابت عن انس اور مجاہد عن ابن عمر کی ہے اور ابن عبدالبر ”جامع بیان العلم والعلماء“ میں کہتے ہیں کہ یہ کئی اسناد کے ساتھ مروی ہے لیکن وہ ساری معلول ہیں۔ حافظ جمال الدین مزنی کہتے ہیں کہ یہ حدیث کئی طرق سے مروی ہے جو حسن رتبے تک پہنچ جاتے ہیں۔ امام سیوطی نے ”الجامع الصغیر“ میں ابن جوزی نے ”العلل المتناہیة“ ۶۲/۱ اور ابن عراق نے ”تنزیہ الشریعة“ ۶/۲۵۸ میں اس کے بارے بڑی طویل بحث کی ہے۔

امام ابن ماجہ نے اپنی ”سنن“ میں کثیر بن شطیر کے طریق سے، انہوں نے محمد بن سیرین سے، انہوں نے انس بن مالک سے ان الفاظ کے ساتھ مرفوعاً روایت کیا ہے: طلب العلم فريضة على كل مسلم وواضع العلم عند غير أهله كمقلد الخنزير الجواهر واللؤلؤ والنهب (بقیہ حواشی اگلے صفحہ پر۔۔۔)

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

أَطْلُبُوا الْعِلْمَ وَلَوْ كَانَ بِالصَّيْنِ. (۱)

”علم حاصل کرو اگر چہ چین سے دستیاب ہو۔“

اور واضح رہے کہ اقسامِ علم بے حد ہیں اور عمر انسانی نہایت ناقص۔۔۔ بنا بریں واضح ہو گیا کہ تمام علوم حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض نہیں مثلاً علم نجوم، علم حساب، علم صنائع و بدائع وغیرہ وغیرہ۔ مگر ان علوم میں سے اتنا حاصل کرنا لازمی ہے جس کی شریعتِ مطہرہ کے اندر ضرورت

(بقیہ حواشی گزشتہ صفحہ سے)

سنن ابن ماجہ ۸۱/۱ (باب فضل العلماء والبحث علی طلب العلم) مجمع الزوائد
للہیثمی ۱۱۹/۱، ۱۲۰، ۹۱/۳، جامع بیان العلم للقرطبی ۷/۱، تاریخ بغداد
للخطیب: ۲۰/۱، ۳۰۷، ۱۵۶/۳، ۶۰۳/۵، ۳۸۶/۶، المعجم الكبير للطبرانی ۱۰/۱۰، ۲۲۰
، المعجم الصغير ۹۲/۱، الجامع الكبير للسيوطی ۲۹۲۵/۲ (حدیث: ۵۶۶۳،
۵۶۶۴، ۵۶۶۵) تاریخ دمشق لابن عساکر ۲۲۸/۱، المقاصد الحسنة للسخاوی (۶۶۰)
کشف الخفا للعجلونی (۱۶۶۵) اسنی المطالب (۸۵۹) تمیز الطیب من الخبیث (حدیث:
۸۲۳) الموضوعات لابن الجوزی ۲۱۵/۱، الفوائد المجموعة للشوکانی (ص: ۲۷۲)
الجامع الأزهر للمناوی ۱۰/۲ الغماز علی اللماز للسمهودی، الدرر المنشرة للسيوطی
(حدیث ۲۸۳)، التذکرة للزرکشی (ص: ۲۳) فیض القدير للمناوی ۲۶۷/۳، تذکرة
الموضوعات لحافظ محمد بن طاهر المقدسی. (حدیث: ۵۰۸) الفقیہ والمتفقہ للخطیب
۵۲/۱، المطالب العالیة ۱۳۰/۲، میزان الاعتدال ۹۵/۳ تنزیہ الشریعة لابن عراقی ۲۵۸/۱،
لسان المیزان للعسقلانی ۲۵/۳ کتاب المجروحین لابن حبان ۱۲۱/۱، اللآلی المصنوعة
للسیوطی ۱۹۳/۱، العلل المتناهية لابن الجوزی (حدیث: ۷۰ تا ۷۴) احیاء العلوم للغزالی
۱۶/۱، مسند الشهاب للقضاعی ۱۳۵/۱ (حدیث: ۱۳۰)

(حاشیہ صفحہ ہذا)

۱۔ اسے امام بیہقی نے ”شعب الایمان“ میں، امام سخاوی نے ”المقاصد الحسنة“ میں خطیب نے ”الرحلة“ میں،
ابن عبدالبر نے ”جامع العلم“ میں اور دیلمی نے بھی روایت کیا ہے، اور ان تمام نے ابوعاتکہ طریف بن سلمان
کے طریق سے روایت کیا ہے، اور تنہا ابن عبدالبر نے اسے عبید بن محمد کے طریق سے، انہوں نے ابن عیینہ
سے، انہوں نے زہری سے اور ان دونوں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے۔ ابن
جوزی نے اسے ”الموضوعات“ میں ذکر کیا ہے۔ ابن حبان نے کہا ہے کہ اس حدیث کا متن مشہور ہے۔ لیکن
اسانید ضعیف ہیں۔ حوالہ کے لیے ملاحظہ فرمائیں: المقاصد الحسنة (۱۲۵) الفوائد المجموعة
(ص: ۲۷۲) احیاء علوم الدین ۱۶/۱، ۲۳۔

ہے، جیسے علم نجوم۔ اس کا اتنا جاننا ضروری ہے جس سے رات دن کے اوقات، صوم و صلوٰۃ کے وقت جانے جا سکیں۔ علم طب اس قدر ضرور پڑھا جائے جس سے انسان صحت کی حفاظت، عوارضات مرض سے کر سکے۔ اسی طرح ریاضی اس قدر پڑھنی ضروری ہے جس سے علم فرائض آسانی سے سمجھ سکے۔

غرضیکہ علم اس قدر حاصل کرنا ضروری ہے جس سے حوائج شرعیہ پورے ہو سکیں اور وہ علم جس سے منافع اخروی کے ساتھ کچھ تعلق نہ ہو، اس کی مذمت رب العزت جل مجدہ نے فرمائی اور ارشاد ہوا:

﴿وَيَتَعَلَّمُونَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ﴾ (۱)

”سیکھتے ہیں ان علوم کو جو انہیں (اعتقادات و مذہبیات میں) نقصان پہنچاتے اور نفع رساں نہیں ہوتے۔“

اور سرکارِ مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ایسے علم سے پناہ مانگی اور فرمایا:

أَعُوذُ بِكَ مِنْ عِلْمٍ لَا يَنْفَعُ. (۲)

”یعنی اے اللہ میں تیری پناہ مانگتا ہوں علم بے منفعت سے۔“

بہر حال تھوڑے علم سے بہت عمل کیا جاسکتا ہے اور طالب علم کو لازم ہے کہ علم باعمل حاصل کرے اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

۱۔ سورۃ البقرۃ: ۱۰۲

۲۔ یہ حضرت حفص سے مروی روایت کا حصہ ہے جسے انہوں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ (حضرت حفص، عمرو کے بیٹے ہیں اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کے بھتیجے ہیں) آپ فرماتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ کی دعا اس طرح ہوتی تھی:

اللَّهُمَّ اني أعوذ بك من علم لا ينفع، وقلب لا يخشع و دُعَاءٍ لا يسمع، و نفسٍ لا تشبع أعوذ بك من شرِّ هؤلاء الأربع.

اسے امام احمد بن حنبل نے اپنی ”مسند“ ۳/۲۸۳، امام نسائی نے ”السنن الکبریٰ“ ۸/۲۶۳، حاکم نے المستدرک ۱/۱۰۲ میں حفص کے طریق سے، ابن حبان نے اپنی ”صحیح“ (۸۳) میں ابونصر کے طریق سے، ابن ابی شیبہ نے اپنی ”مصنف“ ۱۰/۱۸۷ میں امام طیالسی نے اپنی ”مسند“ (۱۲۸۲) میں، امام بیہقی نے ”الدعوات الکبیر“ (ص: ۵۵) میں امام بغوی نے ”شرح السنۃ“ (۱۳۵۹) میں متعدد سندوں سے، امام مسلم نے اپنی ”صحیح“ ۳/۲۰۸۸ میں، ابن ماجہ نے اپنی ”سنن“ (۲۵۰) میں امام منذری نے ”الترغیب والترہیب“ ۱/۱۲۲، ۲/۵۳۱ میں امام قضاوی نے ”مسند الشہاب“ ۲/۳۳۲ (حدیث نمبر: ۱۲۶۶) میں روایت کیا ہے۔

الْمُتَعَبِّدُ بِلَا فِقْهِ كَالْحِمَارِ فِي الطَّاحُونَةِ . (۱)

”عبادت کرنے والا بغیر جانے علم فقہ کے، اس گدھے کی مانند ہے جو خراسان میں دن بھر بجاتا اور شام کو جہاں تھا، وہیں رہا۔“

گو یا بے قاعدہ شرعی عبادت کا نتیجہ یہی ہے جو خراسان کے گدھے کا کہ دن بھر پھرا، مگر حصول کچھ بھی نہ کر سکا۔

میں نے عوام میں ایک گروہ دیکھا کہ وہ علم پر عمل کو فضیلت دیتا ہے اور ایک جماعت دیکھی ہے جو عمل پر علم کو مقدم رکھتی تھی اور درحقیقت یہ دونوں باطل پر تھے۔ اس لیے کہ عمل بغیر علم، عمل نہیں کیونکہ عمل، عمل جب مانا جاتا ہے جب کہ اس کا علم ہو۔ عمل کنندہ جانے کہ اس عمل سے ہمیں یہ ثواب یا درجہ ملے گا۔ جیسے نماز اور اس کی صحت اس وقت تک ناممکن ہے جب تک کہ نماز پڑھنے والا احکام طہارت کا علم حاصل نہ کر لے اور جب تک پانی کے پاک ہونے کا علم نہ ہو جائے وضو صحیح نہیں ہو سکتا۔

قبلہ کی سمت کا اگر علم نہیں، نماز درست نہیں۔ اسی طرح جب تک نیت کے معنی اور اس کی حقیقت کا علم نہ ہو، نماز بے کار ہے۔ اسی طرح اگر ارکان نماز نہیں جانتا تو پھر نماز کہاں درست ہو سکتی ہے!!

تو ثابت ہوا کہ عمل، علم سے قریب ہوتا ہے۔ تو وہ جاہل جو علم کو عمل سے علیحدہ کر رہا ہے اور علم کو عمل پر فضیلت دے رہا ہے محض لغو اور بناء علی الباطل ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ علم کا وجود بغیر عمل نہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

نَبَذَ فَرِيقٌ مِّنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ كِتَابَ اللَّهِ وَرَاءَ ظُهُورِهِمْ كَأَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ۝ (۲)

”ایک جماعت انہیں میں سے وہ ہے جنہیں اللہ کی کتاب عطا ہوئی ہے مگر انہوں نے اللہ کی کتاب کو ایسا پس پشت ڈال دیا گویا کہ وہ اس کتاب سے جاہل ہیں۔“

گویا رب جل جلالہ نے عالموں کا نام علماء کی جماعت سے بے عمل ہونے کی وجہ سے نکال دیا۔ اگرچہ پڑھنا، یاد کرنا، یاد رکھنا، اس یاد کیے ہوئے کی محافظت کرنا یہ بھی ایک عمل ہے کہ اس سے بھی بندہ کو اجر کا مستحق مانا جاتا ہے۔ مگر جبکہ علم کا حکم اس کے اعمال کے خلاف ہو تو اسے

اس کو یاد کرنے وغیرہ کا کچھ ثواب نہیں ملتا ہے۔

اس مسئلہ میں دو فرقے ہیں: ایک وہ کہ وجاہت خلق علم کے چہرے میں دیکھ کر اس کے مقابلے کی تاب نہیں رکھتا اور علم کی حقیقت تک خود پہنچ کر عمل کو علم سے جدا کرتا ہے۔ یہ وہ فرقہ ہے جو نہ علم کو سمجھانے عمل کو، حتیٰ کہ جاہلوں کو کہتا پھرتا ہے قال نہیں چاہیے کار چاہیے۔ دوسرا فرقہ کہتا ہے کہ عمل کچھ نہیں علم چاہئے۔

حضرت ابراہیم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے راستہ میں ایک پتھر پڑا دیکھا، اس پر لکھا ہوا تھا: ”مجھے پلٹ اور پڑھ۔“ میں نے پلٹا تو اس پر یہ لکھا دیکھا:

اَنْتَ لَا تَعْمَلُ بِمَا تَعْلَمُ فَكَيْفَ تَطْلُبُ عَمَلًا مَا لَا تَعْلَمُ

”جب تو اپنے علم کے مطابق عمل سے قاصر ہے تو مجال ہے کہ جس کا تجھے علم

نہیں، اس پر عمل کرے۔“

گویا یہ ہدایت اس پر منقش تھی کہ انسان اس حد تک عمل کوشش رہے جس حد تک اسے علم ہے تاکہ اس کی برکت سے وہ بھی جان لے جو نہ جانتا تھا۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

هَمَّةُ الْعُلَمَاءِ الدِّرَايَةُ وَهَمَّةُ السُّفَهَاءِ الرِّوَايَةُ .

”علماء کا خزانہ معلومات علم ہے اور جہلاء کا خزانہ علم محض روایات کا نقل کر دینا۔“

چونکہ علماء سے لوازمات جہالت منفی ہوتے ہیں اس وجہ سے وہ علم کو ذریعہ جاہ و عزت دنیا نہیں بناتے اور جو علم کے ذریعے جاہ طلبی کرتے اور عزت، دنیاوی چاہتے ہیں وہ لوازمات جہل میں ملوث رہ کر کوئی درجہ، درجات اہل علم سے نہیں پاتے۔ یہی وجہ ہے کہ علم بغیر کسی لطیفہ کے، ذریعہ خدا رسیدہ نہیں ہو سکتا اور علم کی برکت سے تمام مقامات کا مشاہدہ ہو جاتا ہے۔

وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ

فصل:

اب یہ سمجھنا چاہیے کہ علم دو ہیں: ایک علم الہی، دوم علم خلق۔ اور علم خلق متلاشی علم الہی ہوتا ہے۔ اس لیے کہ علم الہی اللہ تعالیٰ کی صفت ہے اور صفت الہی ذات الہی کے ساتھ قائم ہے اور صفات الہیہ بے نہایت ہیں اور ہمارا علم (یعنی علم خلق) صفت خلق ہے اور صفت خلق مخلوق کے ساتھ قائم ہے اور مخلوق کی صفات متناہی ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿ وَمَا أُوتِيتُمْ مِنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا ۝ ﴾ (۱)

”یعنی تم کو علم (تمہارے ظرف کے مطابق) قلیل دیا گیا ہے۔“

الغرض علم مدح کی صفتوں میں سے ہے اور اس کی تعریف احاطۃ المعلوم ہے۔ یعنی معلومات کا احاطہ کرنا یا تبیین المعلوم تعریف علم ہے، یعنی معلوم کا واضح طور پر بیان کرنا اور بہترین جامع و مانع تعریف علم یہ ہے کہ:

الْعِلْمُ صِفَةٌ يَصِيرُ الْجَاهِلُ بِهَا عَالِمًا.

”یعنی علم ایک ایسی صفت ہے جس سے جاہل عالم ہو جاتا ہے۔“

اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿ وَاللَّهُ مُخِيطٌ بِالْكَافِرِينَ ۝ ﴾ (۲)

”بے شک اللہ کافروں کو گھیرنے والا ہے۔“

اور فرماتا ہے:

﴿ وَاللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ۝ ﴾ (۳)

”اللہ ہر شے کا جاننے والا ہے۔“

اور علم الہی ایک ایسی صفت ہے جس سے وہ تمام وجودات و معدومات کو جاننے والا مانا گیا ہے اور ایسا عالم مانا گیا کہ اس جیسا عالم ہونے میں مخلوق کا کوئی جز شریک صفت نہیں ہو سکتا، اور اس علم ذاتی کی تجزی بھی نہیں ہو سکتی اور نہ یہ علم اس کی ذات سے کبھی جدا ہو سکتا ہے۔ اور اس علم پر اس کی ترتیب فعالی دلیل ہے اس لیے کہ ہر فعل بحکم علم ظہور پذیر ہوتا ہے اور علم الہی کی ہی یہ شان ہے کہ ہر مکتوم و ظاہر پر ہر آن محیط ہے۔

طالبِ حق کو لازم ہے کہ بوقتِ عمل یہ یقین کرے کہ وہ عالمِ غیب، حاکمِ حقیقی میرے اس عمل کو دیکھ رہا ہے جیسا کہ اس کا عقیدہ ہے کہ وہ ہماری ہر حرکت و سکون کو دیکھنے والا ہے۔

حکایت:

روایت ہے کہ ایک رئیس بصرہ کسی دن اپنے باغ میں گیا۔ اس کی نظر اپنے باغ کے مالی کی بیوی پر پڑی اور بڑا خیال پیدا ہو گیا۔ رئیس نے مالی کو کسی کام کے لیے بھیج دیا اور اس کی بیوی کو کہا: باغ کے سب دروازے بند کر دے۔ عورت نے آکر کہا: میں نے سب دروازے بند کر دیے

۱۔ سورۃ بنی اسرائیل: ۸۵ ۲۔ سورۃ البقرہ: ۱۹

۳۔ سورۃ البقرہ: ۲۸۲

ہیں مگر ایک دروازہ ایسا ہے کہ میں اس کو بند نہیں کر سکتی۔ رئیس نے پوچھا وہ کون سا دروازہ ہے؟ مالی کی بیوی نے کہا وہ دروازہ وہ ہے جو میرے اور میرے رب کے مابین ہے۔ یہ سن کر رئیس شرمندہ ہوا اور اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہ کی معافی مانگی۔

حاتم اصم رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے چار علم اختیار کیے ہیں اور دنیا کے تمام علوم سے آزاد ہوں۔ لوگوں نے پوچھا کہ حضرت وہ چار علم کون سے ہیں؟ فرمایا: پہلا علم تو یہ ہے کہ میرا رزق جتنا میرے لیے مقسوم ہے، کم یا زیادہ نہیں ہو سکتا، اس وجہ سے میں زیادہ کی تلاش سے بے پروا ہوں۔

دوسرا علم یہ ہے کہ مجھ پر میرے رب جل مجدہ کے ایسے حقوق ہیں، جو میرے سوا دوسرا ادا نہیں کر سکتا، تو میں ان حقوق کی ادائیگی میں مشغول ہو گیا ہوں۔ تیسرا علم یہ ہے کہ میرا ایک طالب ہے جسے موت کہتے ہیں، اس سے بھاگنا ناممکن ہے، اس لیے میں اس کے لیے تیار ہوں۔

چوتھا علم یہ ہے کہ میرا رب جل مجدہ و تعالیٰ شانہ مجھے ہر لمحہ دیکھنے والا ہے۔ میں اس سے شرماتا ہوں اور نا کردہ کاری سے اجتناب کرتا ہوں اور ہر ایسے فعل سے بچنے کی کوشش کرتا ہوں، جس کی وجہ سے کل قیامت کے دن شرمندہ ہونا پڑے۔

فصل:

بندہ کا علم اوامر الہیہ اور اس کی ذات کے جاننے میں ضروری ہے اور علم اوقات اور اوقات میں جو بندہ پر لازم ہے، اس کا جاننا بھی ضروری ہے۔ پھر احکام ظاہری و باطنی کا سمجھنا بھی ضروری ہے، اور ظاہر و باطن امور کے لحاظ سے علم مخلوق کی دو قسمیں ہیں: ایک علم اصول، دوسرا علم فروع۔ اصول ظاہری میں تو کلمہ شہادت ہے یعنی وحدانیت الہی کا اعتراف اور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق، اور اصول باطن میں معرفت کی تحقیق۔ اسی طرح فروع ظاہری آپس میں معاملات اور برتاؤ درست رکھنا اور فروع باطنی دل سے نیت صحیح رکھنا اور اس صحت پر قائم رہنا اور یہ ایسی چیزیں ہیں کہ ایک کا وجود دوسرے کے وجود کے بغیر محال ہے۔

چنانچہ ظاہر کا برتاؤ صاف رکھنا اور دل میں اس کے خلاف ہونا نفاق خالص ہے۔ اسی وجہ سے باطن کی اصلاح ظاہر کے بغیر سمجھنا زندقہ ہے اور شریعت پر ظاہری اطاعت بغیر اطاعت باطنی یعنی قلبی کے ناقص ہے اور جو چیز باطن میں نہ ہو اسے ظاہر داری میں دکھانا ہوس باطل ہے۔

یہی وجہ ہے کہ علم حقیقت کے تین رکن ہیں:

رکن اوّل: ذاتِ باری تعالیٰ اور اس کی وحدانیت کا اعتقاد اور اس کی تشبیہ سے نفی۔

رکن دوئم: علم صفاتِ باری تعالیٰ عز اسمہ، اور اس کے احکام کا علم۔

رکن سوئم: حکمتِ الہیہ کا تسلیم کرنا اور اس کے افعال کو ماننا۔

اسی طرح علم شریعت کے بھی تین رکن ہیں:

اوّل: کتاب اللہ

دوئم: سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

سوئم: اجماعِ امت

اور اثبات وجود ذات واجب تعالیٰ شانہ اور علم صفات و افعال پر خود ربّ جل مجدہ کا فرمان دلیل واضح ہے، جیسا کہ ارشاد ہے:

﴿فَاعْلَمْ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ﴾ (۱)

”جان لے کہ بے شک وہی ایک معبود ہے اور اس کے سوا کوئی نہیں۔“

اور فرمایا:

﴿فَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَوْلَاكُمْ﴾ (۲)

”یعنی جان لو کہ بے شک اللہ ہی تمہارا مالک ہے۔“

اور فرمایا:

﴿الْم تَرَىٰ إِلَىٰ رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ﴾ (۳)

”کیا نہیں دیکھا تو نے اپنے ربّ کو کہ اس نے کس طرح سایہ پھیلا یا۔“

اور فرمایا:

﴿أَفَلَا يَنْظُرُونَ إِلَىٰ الْآيِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ﴾ (۴)

”کیا تم نہیں دیکھتے اونٹ کی طرف کہ کس طرح بنایا گیا۔“

علاوہ اس کے بہت سی آیتیں ہیں جو افعالِ الہیہ پر نظر کرنے کی تلقین کر رہی ہیں تاکہ اس سے انسان صفاتِ ذات کو جان کر فاعل حقیقی کا شناسا بنے، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی فرمایا:

۲۔ سورة الانفال: ۲۰

۱۔ سورة محمد: ۱۹

۴۔ سورة الغاشية: ۱۷

۳۔ سورة الفرقان: ۳۵

مَنْ عَلِمَ أَنَّ اللَّهَ رَبُّهُ وَ آتَى نَبِيَّهُ حَرَمَ اللَّهِ تَعَالَى لَحْمَهُ وَ دَمَهُ عَلَيَّ

النَّارِ . (۱)

”جس نے دل سے جان لیا کہ بیشک اللہ اس کا رب ہے اور میں اس کا نبی ہوں، اس کے گوشت و خون کو اللہ تعالیٰ نے جہنم پر حرام فرمایا۔“

لیکن علم ذات باری تعالیٰ عز اسمہ میں یہ شرط بھی ہے کہ ہر عاقل و بالغ اس امر کو یقیناً جان لے کہ حق تعالیٰ شانہ موجود قدیم ہے اور اس کی ذات قدیم، غیر محدود اور مکان و جہت سے منزہ ہے اور وہ ذات موجب آفت نہیں اور وہ زن و فرزند سے پاک ہے۔ انسانی اوہام میں جو چیزیں متصور ہوتی ہیں ان کا بھی وہی آفریدن گار ہے اور وہی تمام مخلوق کا پرورش کرنے والا۔ اس نے حق فرمایا:

﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ﴾ (۲)

”اس کی مثل کوئی شے نہیں وہ سننے دیکھنے والا ہے۔“

اور علم صفات ذات عز اسمہ یہ ہے کہ اسے جانے کہ اس کے لیے ایسی صفات ہیں جو اس کی ذات کے ساتھ قائم ہیں اور ہمیشہ رہیں گی۔ مگر وہ صفات نہ عین ذات ہیں نہ غیر ذات مگر ابدی و ازلی ہیں جیسے علم، قدرت، حیات، ارادہ، سمع، بصر، کلام، بقا، جیسا کہ خود ارشاد فرمایا:

﴿إِنَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ﴾ (۳)

”بے شک وہ ذات پاک تمہارے دلوں کے خطرات کی بھی عالم ہے۔“

اور فرمایا:

﴿وَ اللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ﴾ (۴)

”بے شک اللہ ہر چیز کے پیدا کرنے پر قادر ہے۔“

اور فرمایا:

﴿وَ هُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ﴾ (۵)

”ذات مقدس بلا احتیاج آلہ سمیع و بصیر ہے۔“

۱۔ اسے امام طبرانی نے ”المعجم الكبير“ ۱۸/۱۲۳ میں اور امام حنفی نے ”مجمع الزوائد“ ۱/۱۹ میں ان الفاظ کے

ساتھ نقل کیا ہے۔ مَنْ عَلِمَ أَنَّ اللَّهَ رَبُّهُ وَ آتَى نَبِيَّهُ حَرَمَ اللَّهِ تَعَالَى لَحْمَهُ وَ دَمَهُ عَلَيَّ النَّارِ .

۲۔ سورة الشوریٰ: ۱۱

۳۔ سورة الشوریٰ: ۱۱

۴۔ سورة الشوریٰ: ۱۱

۵۔ سورة ال عمران: ۲۹

اور فرمایا:

﴿فَقَالَ لِمَا يُرِيدُ﴾ (۱)

”بڑا زبردست اپنے ارادے کو پورا کرنے والا ہے۔“

اور فرمایا:

﴿هُوَ الْحَيُّ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ﴾ (۲)

”وہ حی قدیم ازلی سرمدی ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔“

اور فرمایا:

﴿قَوْلُهُ الْحَقُّ ۖ وَلَهُ الْمُلْكُ﴾ (۳)

”اس کا فرمان حق ہے اور اسی کے لیے حقیقی ملک ہیں۔“

اب علم اثباتِ افعال۔۔۔ اس کے حصول کی صورت یہ ہے۔ انسان جانے اور یقین کر لے کہ وہی خالقِ خلق و افعالِ خلق ہے۔ علم نابود کو وجود میں لانے والا سوا اس کے کوئی نہیں۔ خیر و شر کا خالق وہی ہے۔ جیسا کہ فرمایا:

﴿اللَّهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ﴾ (۴)

”اللہ ہی ہر شے کا خالق ہے۔“

اور اثباتِ احکامِ شریعت پر دلیل یہ ہے کہ اسی واجب الوجود نے ہم تک اپنے رسول مبعوث فرمائے، انہیں گونا گوں معجزات عطا فرمائے جو قطعاً خارقِ عادات تھے اور محیرِ العقول۔۔۔ اور ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سچے رسول ہیں۔ ان کو معجزات بے حد عطا کیے گئے اور ان کے ذریعے ہمیں خبریں پہنچیں، وہ اخبارِ غیبیہ سے ہیں اور تمام عین الحق۔ اور شریعتِ مطہرہ کا اول رکن کتاب اللہ ہے۔ جیسا کہ عزائمہ نے فرمایا:

﴿مِنْهُ آيَاتٌ مُّحْكَمَاتٌ هُنَّ أُمُّ الْكِتَابِ﴾ (۵)

”اس کتابِ مقدس میں بعض آیات محکم اور واضح ہیں، وہی اصل کتاب ہیں۔“

دوسرا رکن شریعتِ اسلامی کا سببِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے جس کی اطاعت کے

لیے قرآن کریم نے فرمایا:

۲۔ سورۃ المؤمن: ۶۵

۱۔ سورۃ البروج: ۱۶

۳۔ سورۃ الزمر: ۶۲

۳۔ سورۃ الانعام: ۷۳

۵۔ سورۃ آل عمران: ۷

﴿ وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا ﴾ (۱)

”جو حکم ہمارے حبیب تمہیں دیں قبول کرو اور جس بات سے منع فرمائیں باز رہو۔“

تیسرا رکن اجماع امت ہے۔ جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَا تَجْتَمِعُ أُمَّتِي عَلَى الضَّلَالَةِ وَعَلَيْكُمْ بِالسَّوَادِ الْأَعْظَمِ. (۲)

”میری امت گمراہی پر کبھی جمع نہ ہوگی تم بڑی جماعت یعنی اہلسنت وجماعت کو لازم پکڑے رہو۔“

ان تمام احکام میں حقیقت اسلام ہے۔ اب اگر کوئی چاہے کہ تمام اپنے اندر جمع کر لے تو ایسا نہیں کر سکتا، اس کی قوت سے ایسا ہونا وراء الراء ہے، اس لیے کہ لطائف اسماء الہیہ بے نہایت ہیں اور جب ان کی حد اور منتہی نہیں تو انسان ان سب پر حاوی نہیں ہو سکتا۔

فصل:

یہ بات اچھی طرح یاد رکھو کہ ایک جماعت ملحدوں کی ہے۔ اللہ کی ان پر لعنت ہو، انہیں ”سوفسطائی“ کہا جاتا ہے۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ حقائق اشیاء کا علم تحقیقی حاصل ہونا محال ہے اور علم اشیاء خود کچھ نہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ اس امر کا انہیں علم ہو یا نہیں۔ اگر وہ کہیں کہ ہاں اس امر کا ہمیں علم ہوا کہ حقائق اشیاء کا علم حاصل ہونا محال ہے، تو وہ خود اپنی زبانی اثباتِ علم کر چکے اور اگر کہیں کہ نہیں تو پھر یہ کہنا غلط اور بے علمی ہے کہ علم اشیاء کا حصول محال ہے اور یہ دعویٰ قطعاً باطل۔ پھر ایسی جماعت سے گفتگو کرنا اور اسے منہ لگانا عقلمندی اور دانشمندی نہیں ہوتی۔

۱۔ سورۃ الحشر: ۷

۲۔ اسے امام احمد نے اپنی ”مسند“ میں، امام طبرانی نے ”المعجم الکبیر“ میں اور ابوخیثمہ نے اپنی ”تاریخ“ میں، ابو بصیرۃ الغفاری سے مرفوعاً بایں الفاظ روایت کیا ہے: سألت ربی ان لاتجتمع امتی علی ضلالۃ فاعطانیہا۔

امام ابو نعیم نے ”حلیۃ الاولیاء“ میں، امام حاکم نے ”المستدرک“ میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً روایت کیا ہے۔ ان اللہ لایجمع هذه الأمة علی ضلالۃ ابدأ وان یداللہ مع الجماعة، فاتبعوا السواد الأعظم فانه من شد شد فی النار۔ ابن ابی عاصم نے اسے ”السنۃ“ میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کے طریق سے ان الفاظ میں مرفوعاً روایت کیا ہے۔ ان امتی لاتجتمع علی ضلالۃ فاذا رايتم الاختلاف فعلیکم بالسواد الأعظم امام عجولونی اسے ”کشف الخفا“ ۱/۱۴۱ میں اور ملا علی قاری ”الأسرار المرفوعہ“ (۱۶۳) میں لائے ہیں۔

اور ملاحظہ کا یہ کہنا کہ ہمارا علم کسی چیز کے ساتھ درست نہیں، یہ دو حال سے خالی نہیں، یا نفی علم کا علم حاصل کر کے وہ کہہ رہے ہیں یا بذریعہ علم یہ دعویٰ کر رہے ہیں۔ بہر حال دونوں صورتوں میں اثباتِ علم یقینی ہوگا یا نفی کا علم یا حصول علم کا۔ اور یہ امر ظاہر ہے، کہ علم شئی نفی علم نہیں کر سکتا۔ بہر حال علم کی ضد جو جہل ہے، نفی کی حقدار ہوگی۔ علم سے علم کی نفی ناممکن ہے اور اب دعویٰ محض حق و جہالت ہے، اور جب یہ امر متحقق ہو گیا کہ نفی علم جہل سے ہو سکتی ہے تو جاہل ذلیل و مذموم ہوتا ہے اور جہالت کفر خالص اور باطل کی علامت ہے، اور حق کو جہل سے کوئی واسطہ نہیں۔ یہی عقیدہ تمام مشائخ کرام کا ہے اور ملحدین کا تخیل باطل مشائخ کرام کے قطعی خلاف ہے۔

اور جب عوام نے ملحدین کے اس قول کو سنا تو بہک گئے اور کہنے لگ گئے کہ اہل تصوف بھی اس جماعت میں سے ہیں اور ان کے اعتقادات بھی ایسے ہی پریشان خیالی پر قائم ہیں اور بوجہ جہل وہ حق کو باطل سے جدا کرنے میں عاجز رہ گئے۔ اب ہم ملحدین کے تمام معاملات کو خدا کے سپرد کرتے ہیں تاکہ وہ اپنی ضلالت و گمراہی میں رہیں۔ اگر دین حق ان کی اعانت کرتا تو جو زوران کا اس گمراہی میں صرف ہوا، احقاق میں صرف ہوتا، اور دین حق کی رعایت و اعانت کی حرمت ان کے ہاتھ سے نہ جاتی، اور خاصانِ بارگاہ کو وہ ایسی اندھی آنکھ سے نہ دیکھتے، بلکہ اپنے لیل و نہار کی اصلاح کے لیے ان کی خاص حرمت کرتے اور ملحدوں کی جماعت اہل تصوف کا احترام کرتی، ان کے نظریات کی تائید میں رہتی اور ان کے جمال وحدت و تجلیات حق کے زیر سایہ رہ کر ہر قسم کی آفتوں سے محفوظ و مصون ہو جاتی اور ان کی عزت باطن کے سایہ میں نشوونما پاتی۔ پھر ایسا ہرگز نہ ہوتا کہ سب کو اپنے جیسا سمجھ کر اہل تصوف کو بھی ملحد قرار دے کر ان کی عزت خداداد کو ٹھکرانے کی کوشش میں خود ذلیل و رسوا ہوتے۔

ہمارا ایک مدعی علم سے مقابلہ ہوا جو بجائے علم کے، کلاہ رعونت و خود پسندی سر پر لیے پھرتا تھا اور اس ذلیل خصلت کا نام اس نے ”علیت“ رکھ چھوڑا تھا۔ خواہشاتِ نفسانیہ کو متابعتِ سنتِ رسول ﷺ کہتا تھا۔ موافقتِ شیطانی کو سیرتِ ائمہ کی پیروی کہتا تھا۔ اثنائے گفتگو میں کہنے لگا کہ ملاحظہ کے بارہ فرقتے ہو گئے ہیں، انہیں میں سے ایک فرقہ متصوفین کا ہے۔ ہم نے کہا: اگر ایک فرقہ صوفیوں کا انہیں بارہ میں سے ہے تو گیارہ فرقے تم میں سے ہوئے۔ پھر جب ایک فرقہ سے تم اپنے آپ کو بچا سکتے ہو تو صوفی ان گیارہ سے اپنے آپ کو کیونکر نہیں محفوظ رکھ سکتے۔

درحقیقت یہ سب زمانہ کے پر آشوب ہونے کا نتیجہ ہے۔ آج اس قدر فتنے ہیں جو عوام کو

خراب کر رہے ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوبوں کو اس قوم سے پوشیدہ کر لیا ہے اور سب سے جدا رکھ کر ان کی محافظت فرمائی ہے۔ کیا خوب فرمایا سرداروں کے سردار اور آفتاب عقیدت مندانِ علی ابن بندار صیر فی رحمۃ اللہ علیہ نے:

فَسَادُ الْقَلْبِ عَلَى حَسْبِ فَسَادِ الزَّمَانِ وَ أَهْلِهِ .

”دل کی خرابی زمانہ و اہل زمانہ کے خیالات کے فساد کے موافق ہے۔“

اب ہم ان اقوالِ مشائخِ کرام کی نقل کے لیے، ایک مستقل فصل بناتے ہیں تاکہ وہ لوگ جن پر اللہ تعالیٰ کا کرم ہے، منکروں کے دامِ تذویر سے محفوظ رہیں اور اس فصل سے تشبیہ حاصل کریں۔ وَ بِاللّٰهِ التَّوْفِیْقُ

فصل:

حضرت محمد بن فضل بلخی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

الْعُلُومُ ثَلَاثَةٌ عِلْمٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ عِلْمٌ مَّعَ اللّٰهِ وَ عِلْمٌ بِاللّٰهِ .

”علم تین قسم کے ہیں۔ اول علم اللہ کی طرف سے، دوسرا اللہ تعالیٰ کے فضل کی معیت سے

تیسرا اللہ تعالیٰ کی یاد کے ساتھ۔“

علم باللہ وہ عرفانِ تام ہے جو تمام انبیا کرام علیہم السلام اور اولیاء عظام کو حاصل ہوتا ہے جس کی وجہ سے وہ عارفِ الہی بنتے اور عرفانِ الہی حاصل کرتے ہیں۔ جب تک یہ معیتِ الہی حاصل نہ ہو تمام ذرائعِ جدوجہد منقطع رہتے ہیں۔ اس لیے کہ علم اکتسابی معرفتِ الہی کی علت نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ علم اکتسابی سے عرفانِ الہی ناممکن ہے۔ جب تک علم باللہ حاصل نہ ہو درجہ عرفانِ حق کا حصول محال ہے۔

اور علم من اللہ وہ علم شریعتِ حقہ ہے کہ اس کے ذریعے ہم مکلف احکام بالا بنائے

گئے اور وہ فرمانِ حق ہے جو زبانِ انبیاء سے ہم کو پہنچا۔

اور علم مع اللہ وہ علم ہے جو فضلِ الہی کی معیت میں حاصل ہوتا ہے، جس کے ذریعے

مقاماتِ ولایت و طریقتِ حق و ہدایت اور بیانِ نہایت مدارجِ ولایت بعنایتِ الہی حاصل ہوتے ہیں۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ معرفتِ مدارجِ ولایت بغیر علم شریعت جانے صحیح نہیں اور اتباع

شریعت بغیر مقاماتِ رشد و ہدایت جانے نہیں ہو سکتا (یعنی قانون کے مقتضیات کا جاننا قانون دانی

ہے نہ کہ قانونی کتابوں کا محض مطالعہ)۔

حضرت ابوعلی ثقفی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

الْعِلْمُ حَيَاةُ الْقَلْبِ مِنَ الْجَهْلِ وَنُورُ الْعُيُونِ مِنَ الظُّلْمَةِ .
 ”علم، حیات قلب ہے جہالت کی موت سے اور چشم یقین کا نور ہے کفر کی
 ظلمت سے۔“

خلاصہ یہ کہ جس کو علم عرفان حاصل نہیں اس کا دل ظلمتِ جہلی سے مُردہ ہے، اور جسے علم
 شریعت حاصل نہیں اس کا دل نادانی کی بیماری میں مریض ہے۔ کفار کا دل مردہ ہے، اسی وجہ سے وہ
 ذاتِ واجب تعالیٰ جل شانہ کے عرفان سے جاہل ہیں، اور اہل غفلت کا دل بیمار ہے اس وجہ سے وہ
 فرمان ہائے رسول ﷺ سے بے خبر ہیں۔

حضرت ابو بکر وراق ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

”مَنْ اِكْتَفَى بِالْكَلَامِ مِنَ الْعِلْمِ دُونَ الزُّهْدِ فَقَدْ تَزَنَّدَقَ، وَمَنْ
 اِكْتَفَى بِالْفِقْهِ دُونَ الْوَرَعِ فَقَدْ تَفَسَّقَ.“

”جس نے علم کلام یعنی عقائد و علم توحید کی عبارات پر قناعت کی اور زہد و
 تقویٰ حاصل نہ کیا وہ زندقہ میں پڑ گیا اور جس نے علم فقہ و شریعت اسلامیہ
 بلا ورع کے حاصل کیا، وہ حدود و احکام سے نکل کر بے حکما اور فاسق ہو گیا۔“

اس مضمون سے مقصود قائل یہ ہے کہ بغیر عمل و مجاہدہ و تجرید کے، توحید محض جبر ہے اور موجد
 کے لیے قولا جبری ہونا لازمی ہے اور قدری کے لیے فعلا قدری ہونا ضروری ہے، تاکہ اس کا روزمرہ
 قدر و جبر کے مابین صحیح رہے۔

اور اس بحث کا لب لباب وہی ہے جو انہی ابو بکر وراق پیر کامل رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

نے فرمایا:

التَّوْحِيدُ دُونَ الْجَبْرِ وَفَوْقَ الْقَدْرِ .

”حقیقت توحید جبر سے نیچے اور قدر کے اوپر ہے۔“

تو خلاصہ یہی نکلا کہ جو شخص علم توحید بلا عمل محض الفاظ تک پسند کرے اور اس کے خلاف
 باتوں سے اجتناب نہ کرے، وہ زندیق ہے اور جو شخص فقہ کے شرائط پر محتاط نہ ہو اور علم فقہ و شریعت
 کو بلا پرہیزگاری حاصل کر کے رخصتوں اور تاویلوں کے پیچھے لگ کر شبہات میں پڑے اور بلا قید
 قلاوہ مذہب ائمہ خود مجتہد بن کر اجتہادات کی جرأت کرنے لگے وہ بہت جلدی آسانی سے فاسق ہو
 کر رہے گا، اور یہ سب باتیں غفلتِ دل کی وجہ سے ظہور پذیر ہوتی ہیں۔ خوب فرمایا شیخ المشائخ

حضرت ابن معاذ رازی رحمۃ اللہ علیہ نے:

اجْتَنِبْ صُحْبَةَ ثَلَاثَةِ أَصْنَافٍ مِّنَ النَّاسِ، الْعُلَمَاءِ الْغَافِلِينَ وَ الْفُقَرَاءِ
الْمُذَاهِبِينَ وَ الْمُتَصَوِّفَةَ الْجَاهِلِينَ .

”اجتناب کر، تین قسم کے لوگوں کی صحبت سے: غافل بے عمل علماء اور حق سے
زبان بند کرنے والے فقیر اور بنے ہوئے جاہل صوفی۔“

اب سمجھ لے کہ علماء غافل کون سے ہیں، یہ وہ ہیں جنہوں نے دنیا کو اپنا قبلہ دلی بنا لیا
ہے اور شریعتِ مطہرہ سے حیلے بہانے تراش کر آسانیاں گھڑ رکھی ہیں اور اہل حکومت کے پجاری
بن گئے ہیں۔ ظالموں کی چالپوسی کرنا اپنا روزمرہ کر چکے اور ان کی چوکھٹوں کے طواف کو کعبہ مقصود بنا
چکے ہیں اور عوام میں عزت و جاہ حاصل کرنا ان کی محرابِ مسجد ہو چکی ہے۔ اپنے غرور و نخوت کو اپنی
زیر کی اور ہوشیاری جانتے ہیں اور اس پر فریفتہ ہیں اور کلام میں اس قدر تصنع پسند کرنے والے ہیں
کہ ان کا کلام عوام میں نہایت دقیق اور باریک مشہور ہے، اور ائمہ کرام کی شان میں اپنے استادوں
کی قابلیت میں ان کی زبان طعن و راز ہے اور بزرگانِ دین، سلف صالحین کے مقابلے میں اپنی
فوقیت علمی بگھارتے ہیں۔ اگر کونین کا ان کے تفوق علمی کے مقابلہ میں وزن کیا جائے تو ان کی تعلی
کا وزن زیادہ ہو جس قدر حسد کو انہوں نے مذہب بنا لیا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ تمام جہان کا
کوئی عالم نہیں ہو سکتا۔ پھر علم ایک ایسی صفت ہے کہ انواعِ جہل علم سے منفی ہو جاتے ہیں۔

اور فقیر مداہن وہ ہے کہ اگر اس کی خواہشاتِ نفسانی کے مطابق کوئی کتنا ہی غلط کام کرے
وہ اس کا مداح ہوگا اور اگر اس کی مرضی کے خلاف کچھ کرے خواہ کتنا ہی صحیح کام کیوں نہ ہو، اس کی
برائی میں وہ کبھی کمی نہ رکھے اور عوام کے آگے اپنے عملوں کا مظاہرہ کر کے عزت و رفعت کا خواہشمند
رہے اور باطل پرستی میں عوام کے آگے حق گوئی سے زبان روکتا رہے۔

اور متصوفہ جاہل وہ ہیں جو کبھی کسی پیر کامل کی صحبت سے مستفید نہ ہوئے اور کسی مرشد سے
تعلیم نہ لی اور عوام میں اپنے آپ کو باکمال کہلانے کی آرزو رکھیں۔ مصائبِ زمانہ اور نشیب و فرازِ علم
کا ذائقہ تک کبھی نہ چکھا ہو، مگر اندھے جاہلوں میں اپنے کو بہکی بہکی باتیں بنا کر کامل کہلوائیں
اور ذلت و تذلیل کی راہیں اختیار کر لیں اور بے وقوفوں میں بیٹھ کر سب کو اپنے جیسا کہتے
پھریں۔ ایسی حالت میں ان پر منجانب اللہ راہِ حق پوشیدہ ہو جاتی ہے اور وہ اسی ظلمت میں پڑے
رہتے ہیں۔

غرضیکہ یہ ہر سہ گروہ وہ ہیں جنہیں حضرت معاذ بن رازی رحمۃ اللہ علیہ نے بتا کر اپنے

مریدوں کو ان کی صحبت سے مجتنب رہنے کی ہدایت فرمائی ہے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے کہ یہ تینوں گروہ اپنے دعوے میں جھوٹے ہیں اور ان کے عمل کی رفتار باطل ہے۔

حضرت ابو یزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

عَمِلْتُ فِي الْمَجَاهِدَةِ ثَلَاثِينَ سَنَةً فَمَا وَجَدْتُ شَيْئًا أَشَدَّ عَلَيَّ مِنَ الْعِلْمِ وَمُتَابِعَتِهِ.

”میں نے تیس سال مجاہدہ کیا مگر مجھ پر کوئی چیز سخت ترین نہ محسوس ہوئی سوائے علم اور اس کے اتباع کے۔“

ہر قدم آگ پر رکھنا طبیعت گوارہ کر سکتی ہے مگر علم کے موافق اطاعت کرنا اس سے بھی زیادہ سخت ہے۔ پل صراط پر سے جاہل ہزار ہا بار گزرنا گوارا کر سکتا ہے مگر اسلامی احکام کے ایک مسئلہ کو سیکھ کر اس پر عمل کرنا مصیبت اور بلا ہے۔ جہنم میں خیمہ لگا کر بیٹھنا آسان ہے اس سے کہ ایک مسئلہ شرعی معلوم کر کے اس پر عمل کرے۔

لہذا چاہیے کہ علم حاصل کیا جاوے، اور اس پر بحد و وسعت عمل کرنے کی سعی ہو اور یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ بندہ جب علم میں درجہ کمال حاصل کر لیتا ہے تو وہ علم الہی کے مقابلے میں ایک جاہل کا درجہ پاتا ہے۔ پس لازم ہے کہ انسان وہاں تک علم حاصل کرے اور حقائق جانے جہاں تک وہ نہ جانتا تھا۔ اس اجمال کا خلاصہ یہ ہے کہ بندہ اپنے رب کی بندگی کے سوا کچھ جان ہی نہیں سکتا۔

اور بندگی ہی بندہ کے لیے حجاب اکبر ہے (جو جہنم سے اسے بچائے گی) اسی حقیقت کے اظہار میں کسی بزرگ نے فرمایا ہے:

الْعَجْزُ عَنْ دَرْكِ الْاِدْرَاكِ اِدْرَاكٌ

وَالْوَقْفُ فِي طُرُقِ الْاِخْتِيَارِ اِشْرَاكٌ (۱)

”دراک اور اک ذات سے اظہار عجز کرنا ہی اور اک ذات ہے اور محض

روایات اختیار پڑھ کر کورانہ تقلید کرتے ہوئے ان کے اقوال کی نقل کرتے

پھر ناشرک اکبر ہے۔“ (۲)

۱۔ تفسیر مظہری میں یہ شعر اس طرح نقل کیا گیا ہے:

العجز عن درك الا دراك ادراك والبعث عن سر الذات اشراك

۲۔ ترجمہ از جانب مترجم

سمجھ آئی سمجھ میں کچھ نہ آیا سمجھنا ہی تمہارا بس خطا ہے

یعنی وہ لوگ جو جانتے خاک نہیں اور اپنے جہل پر مصر ہیں وہ مشرکِ طریقت ہیں اور وہ لوگ جو جانتے ہیں اور ان پر ان کے علم کے کمال نے معنی حقیقی ظاہر کر دیئے ہیں، ان پر یہ فضل الہی ہوتا ہے کہ وہ اس علم پر غرور و نخوت کرنے سے محفوظ ہو جاتے ہیں اور ان پر یہ حقیقت واقعہ ظاہر ہو جاتی ہے کہ ان کا علم علم الہی کے مقابلہ میں عجز محض کے سوا کچھ نہیں ہے، اور حقیقت واقعہ بھی یہی ہے کہ حق تعالیٰ جل شانہ کے نزدیک علم مخلوق محض وہم ہے اور وہمیات کا اثر معانی حقیقی میں کچھ نہیں۔

پس خلاصہ یہ ہے کہ ادراک ذات سے اظہار عجز کرنا ہی ادراک ذات ہے اور بس!



اثبات فقر

ہمیشہ یاد رکھو کہ درجہ درویش کا راہ مولیٰ میں بہت بڑا مرتبہ ہے اور درویش کے لیے اس راستہ میں بڑے خطرات ہیں۔ جیسا کہ حضرت حق جل مجدہ کا ارشاد ہے:

﴿لِلْفُقَرَاءِ الَّذِينَ أُحْصِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ لَا يَسْتَطِيعُونَ ضَرْبًا فِي الْأَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ أَغْنِيَاءَ مِنَ التَّعَفُّفِ﴾ (۱)

”ان فقیروں کے لیے حق ہے جو محصور ہیں اللہ کی راہ میں اپنی بے نیازی سے وہ چلنے اور سفر کرنے کے محتاج نہیں۔ جاہل عوام انہیں ان کی بے نیازی کی وجہ سے غنی تصور کرتے ہیں۔“

اور ارشاد ہے:

﴿ضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا عَبْدًا مَمْلُوكًا لَا يَقْدِرُ عَلَىٰ شَيْءٍ وَمَنْ رَزَقْنَاهُ مِنَّا رِزْقًا حَسَنًا﴾ (۲)

”مثال میں بتایا ہے اللہ نے اس اپنے بندہ کو جو مملوک خاص ہے (بظاہر) کسی چیز پر کچھ قدرت نہیں رکھتا اور وہ، وہ ہے کہ ہم نے اسے بہترین رزق کے ساتھ مرزوق کیا ہے۔“

اور فرمایا:

﴿تَتَجَافَىٰ جُنُوبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَطَمَعًا﴾ (۳)

”علیحدہ رکھتا ہے ان کا پہلو ان کی خواب گاہوں سے، یاد کرتے ہیں اپنے رب کو خوف بے نیازی اور امید بخشش سے۔“

اور حضور سید یوم النور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا میں فرمایا اور فقر کو پسند کیا:

اللَّهُمَّ أَحْيِنِي مَسْكِينًا وَأَمِتْنِي مَسْكِينًا وَاجْشُرْنِي فِي زُمْرَةِ

۱۔ سورۃ البقرہ: ۲۷۳ ۲۔ سورۃ النحل: ۷۵

۳۔ سورۃ السجدہ: ۱۶

المَسَاكِينِ . (۱)

”الہی! مجھے مسکیت میں زندہ رکھ اور مسکینی ہی میں مار اور زمرہ مساکین ہی میں مجھے محشور فرما۔“

اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ بروز محشر فرمائے گا:

أَذْنُوا مِنِّي أَحِبَّائِي فَيَقُولُ الْمَلَائِكَةُ مَنْ أَحْبَبَاكَ فَيَقُولُ اللَّهُ
عَزَّوَجَلَّ الْفُقَرَاءُ وَالْمَسَاكِينِ . (۲)

”میرے قریب لاؤ میرے محبوبوں کو! تو فرشتے عرض کریں گے: الہی! وہ محبوب کون سے ہیں؟ تو ارشاد باری ہوگا، وہ فقراء و مساکین ہیں۔“

اور مثل اس کی بہت سی آیات اور ایسی احادیث ہیں جو اپنی شہرتِ روایت کے ساتھ اثباتِ سند و دلیل کی محتاج نہیں۔

اور یہ امر تو واضح ہے کہ عہدِ رسالت ماب ﷺ میں جو خاص فقراء تھے وہ مہاجرین کرام تھے۔ جنہوں نے سید اکرم ﷺ کی اطاعت کے لیے مسجد میں قیام فرمایا اور حقِ عبودیت ادا کرنے کے لیے گھریا چھوڑا (انہیں اصحابِ صُفّہ کہا جاتا ہے)۔ یہ وہ ہی محبوبانِ خدا ہیں جنہوں

۱۔ اسے امام ابن ماجہ نے ابو خالد الأحمر کے طریق سے، انہوں نے یزید بن سنان سے، انہوں نے ابن مبارک سے، انہوں نے عطاء بن ابی رباح سے۔ انہوں نے ابوسعید خدری سے روایت کیا ہے راوی کہتے ہیں:

أحبوا المساكين فاني سمعت رسول الله ﷺ يقول في دعائه وذكره. اور اسے امام طبرانی نے ابوفروہ یزید، محمد بن یزید بن سنان الرهاوی کے طریق سے روایت کیا ہے جس میں ”توفني“ کے لفظ کے ساتھ روایت کی گئی ہے۔ اسی طرح امام بیہقی نے ”شعب الایمان“ میں ان الفاظ سے بیان کیا ہے: يا ايها الناس

لا يحملنكم العسر على أن تطلبوا الرزق من غير حله ، فاني سمعت رسول الله ﷺ يقول اور کچھ زیادہ الفاظ بیان کیے ہیں، امام شوکانی ”الفوائد المجموعه“ میں کہتے ہیں کہ اسے دارقطنی نے حضرت ابوسعیدؓ سے مرفوعاً روایت کیا ہے لیکن اس کی سند میں ”یزید بن سنان اور ابو مبارک“ آتے ہیں پہلا

متروک الروایۃ ہے اور دوسرا مجہول الحال ہے۔ امام سخاوی ”المقاصد الحسنه“ میں فرماتے ہیں کہ اس روایت پر موضوع کا حکم لگانا درست نہیں۔ حوالہ کے لیے دیکھئے: سنن ابن ماجہ (۳۰۳) (ابواب الزهد)، جامع الترمذی ۶۰/۲ (ابواب الزهد) کتاب اللّمع ص: ۹۶، الفوائد المجموعه

للسوکانی (ص ۲۴۰) المقاصد الحسنه للسخاوی (۱۶۶) احیاء العلوم ۵/۱۷۵.

۲۔ اس روایت کو انہی الفاظ کے ساتھ امام زبیدی نے ”تصحاف السادة المتقين بشرح احیاء علوم الدین“ ۹/۲۷۸ میں نقل کیا ہے۔

نے تمام اشغال دنیاوی سے اعراض کر کے توکل بخدا گوشہ نشینی اختیار کی اور اللہ تعالیٰ کے روزی رساں ہونے کے وعدہ پر یقین کر کے بیٹھے رہنے کے حق میں ارشاد باری تعالیٰ ہوا اور اپنے حبیب پاک ﷺ کو مخاطب کر کے ان کا خیال رکھنے کا حکم فرمایا:

﴿وَلَا تَطْرُدِ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيدُونَ وَجْهَهُ﴾ (۱)

”ان لوگوں کو فراموش نہ فرماؤ جو لوگ اپنے رب کو صبح شام یاد کرتے اور

پکارتے ہیں اور صرف اسی کی رضا چاہتے ہیں۔“

اور فرمایا (جل جلالہ) نے:

﴿وَلَا تَعْدُ عَيْنُكَ عَنْهُمْ تُرِيدُ زِينَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا﴾ (۲)

”ان سننے والے لوگوں سے اپنی نظر نہ پھیر، کیا تو حیات دنیا کی زینت کا

خواہشمند ہے۔“

چنانچہ حضور سید یوم النشور ﷺ جب ان اصحابِ صفہ کو ملاحظہ فرماتے تو آپ ﷺ کی زبان مبارک سے ارشاد ہوتا (میرے ماں باپ ان پر فدا ہوں) کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی نگرانی کرنے پر تاکید فرمائی۔ غرض یہ کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک فقر کا درجہ بہت بلند ہے اور فقیری کو مرتبہ خاص کے ساتھ ممتاز فرمایا۔

یہی وجہ ہے کہ جو درویش ہیں انہوں نے اسباب ظاہری و باطنی کو ترک کر کے خالق اسباب کی طرف توجہ تمام کی اور اس پر توکل کر لیا اور اس قسم کا فقرا ایسے فقراء کے لیے موجب صد فخر ہے اور اس صبر و رضا اور فقر کا وقار ان کے دلوں میں اس قدر ہے کہ اس کے چھوٹ جانے سے وہ غمگین ہوتے اور ملنے سے راضی و مسرور، اور ان کی نظروں میں سوا ایسے فقراء کے، سب ذلیل ہیں۔ لیکن فقر کے لوازمات و مراسم خاص ہیں، منجملہ اس کے سب کے مقدم مرضیات الہی کا اقبال و اختیار ہے اور جس نے محض رسم فقیری اختیار کی وہ صرف رسم کا ہی فقیر رہا اور اس میں جب اس نے مراد نہ پائی تو حقیقت فقر سے کوسوں دُور رہا اور جس نے حقیقت فقر کو پالیا، اس نے موجودات سے منہ پھیر لیا اور رویت کلی حاصل کر کے فناء کل میں مستغرق ہو کر بقاء کل میں چلا گیا۔

مَنْ لَمْ يَعْرِفْ سِوَى رَسْمِهِ لَمْ يَسْمَعْ سِوَى اسْمِهِ .

”جس نے رسم فقیری کے سوا فقر میں کچھ نہ جانا اس نے سوا اسم فقر کے کچھ

نہ سنا۔“

تو حاصلِ کلام یہ ہوا کہ فقیر وہی ہے جو اپنے پاس علل و اسباب سے کچھ نہ رکھے اور اس کی طمانیتِ قلب میں اس کے نہ ہونے سے کچھ خلل واقع نہ ہو اور اسباب کو دیکھ کر غنی نہ ہو اور اسباب نہ ہوں تو ان کی طرف احتیاج محسوس نہ کرے۔ گویا اسباب کا ہونا یا نہ ہونا اس کی نظر میں مساوی ہو، بلکہ اسباب ظاہری نہ ہوں تو اسے فرحت زیادہ ہو، یہ بلند مرتبہ ہے۔

یہی وجہ ہے کہ مشائخِ کرام نے فرمایا کہ درویش جس قدر تنگ دست ہو، اس کے لیے مفید ہے تاکہ حقیقت توکل و شانِ رزاق کے راز کا اس پر انکشاف ہو۔ اس لیے کہ درویش کے لیے علاقہ دنیاوی جس قدر زیادہ ہوں گے اسی قدر اس کو نقصان ہوگا، غرض یہ کہ درویش درحقیقت وہی ہے جو ضروریاتِ زندگی کی کسی چیز سے واسطہ نہ رکھے۔ مگر اسی قدر جس قدر کہ اس کی ضرورت قوتِ لایموت کو کافی ہو، غرضیکہ محبوبانِ الہی کی زندگی کا محض الطافِ خفی اور اسرارِ بے نیازی کے ساتھ وابستہ رہنا ہی بہتر و افضل ہے۔

لہذا صوفی کو چاہیے کہ اپنے آپ کو اپنے محبوب سے وابستہ رکھے اور دنیائے خدا رو بے وفا کے علل و اسباب سے آزاد رہے کہ یہ دنیا سرائے فجار و فساق ہے اور صوفی کا سرمایہ زندگی محبتِ محبوبِ حقیقی ہے اور متاعِ دنیا متاعِ راہِ رضا و صبر ہے۔

حکایت:

کہتے ہیں کہ ایک درویش کی ملاقات ایک بادشاہ سے ہوئی۔ بادشاہ نے کہا کہ کچھ مانگیے۔ درویش نے کہا: میں اپنے غلاموں سے کوئی حاجت روائی نہیں چاہتا۔ بادشاہ نے کہا، یہ کس طرح؟ درویش نے فرمایا: میرے دو غلام ہیں اور دونوں تیرے مالک و صاحب ہیں۔ ایک حرصِ دنیا، دوسرا طولِ اہل یعنی امیدِ غیر متناہی۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

الْفَقْرُ عِزٌّ لِأَهْلِهِ. (۱)

”فقر اہل فقر کے لیے موجبِ عزت ہے۔“

تو جو چیز اس کے اہل کے حق میں عزت ہوتی ہے، وہ اس کے نااہل کے لیے موجبِ ذلت ہے، اور فقیر کی عزت یہی ہے کہ وہ محفوظ الجوارح ہو یعنی اس کے جسم کا کوئی جز حوائج و ضروریات کا احساس کر کے جاوہ صبر و رضا سے لغزش نہ کرے، اور اس کے دل و جان پر کبھی

۱۔ یہ الفاظ تو نہیں ملے مگر امام سخاوی نے ”المقاصد الحسنہ“ (ص: ۲۰۰) میں اور امام غزالی نے ”احیاء العلوم“ ۵/۵۳ میں اس مفہوم کی کئی روایات ذکر کی ہیں۔ اور ان میں سے چند ایک یہ ہیں: ”الْفَقْرُ أَرِزِينَ بِالْمُؤْمِنِينَ مِنَ الْعَدَارِ الْحَسَنِ“. ”تحفة المؤمن فی الدنیا الفقر“. ”الفقر فخری وبہ الفخر“

اضطراب و اضطراب اثر انداز نہ ہو، نہ اس کا جسم معصیت و ذلت کی طرف جائے، نہ اس کی جان و روح پر بلا و آفت دنیا آئے۔ فقیر کا ظاہر بھی ہر حال میں نعمتِ ظاہری سے مستغنی ہوتا ہے اور اس کا باطن نعمائے باطنی کا منبع۔ پھر جب اس کا باطن منبعِ نعمتِ الہیہ ہو، تو اس کا تن روحانی اور دل ربانی ہونا ضروری ہے، اور عوام الناس کو اس سے کوئی تعلق نہیں۔ فقیر صفاتِ ملکی سے متصف ہوتا ہے۔ بشرطیکہ اس کا فقر رسمی نہ ہو، یعنی عوام کے رجوعات اور ریاکاری کے لیے وہ فقیر نہ ہو، بلکہ وہ خالصتاً مخلصاً وجہ اللہ فقیر ہو۔ تو ایسے فقیر کو دنیاوی مملکت سے بے نیازی حاصل ہوتی ہے۔ پھر یہ عالم دنیا بلکہ دونوں جہان اس کے فقر کے پلڑے میں پریشہ کے برابر بھی وزن نہیں رکھتے۔ پھر اس فقیر کا ایک سانس کوئین میں نہیں سہا سکتا۔



فقر و غنا

فصل:

اس امر میں مشائخ کرامؒ کا اختلاف ہے کہ فقر و غنا میں باعتبار صفات خلق کون افضل ہے۔ اس لیے کہ غنی حقیقی تو صرف ذات واجب تعالیٰ شانہ ہے، اور جمیع اوصاف میں کامل سوائے ذات واجب تعالیٰ کے کوئی نہیں۔ حضرت یحییٰ بن معاذ رازی اور احمد بن خوارزمی، حارث محاسبی، ابو العباس بن عطا، رویم بن محمد، ابو الحسن بن شمعون رحمہم اللہ اور متاخرین میں سے شیخ المشائخ حضرت ابو سعید فضل اللہ بن محمد المہینی رحمہم اللہ اس امر پر متفق ہیں کہ غناء افضل ترین صفت ہے فقر کے مقابلے میں، اس دعویٰ پر ان کی دلیل یہ ہے کہ غنا صفت حق سبحانہ و تعالیٰ ہے اور فقر اس کی ذات کے لیے ممنوع ہے۔ تو تعلق و لا میں وہ صفت جو مابین عبد و معبود مشترک ہو، وہ غنا ہی ہے، اور صفت فقر ذات واجب تعالیٰ شانہ کے لیے روا نہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ یہ شرکت بھی محض شرکت الٰہی ہوگی نہ کہ شرکت معنوی، اور شرکت معنوی اس وقت ہو سکتی ہے جب مماثلت کا امکان ہو۔

پھر چونکہ صفات واجب تعالیٰ شانہ قدیم اور صفات خلق حادث ہیں، اس وجہ سے یہ دلیل باطل ہے اور میں علی بن عثمان جلابیؒ کہتا ہوں کہ غنی کا نام ہی صرف ذات باری تعالیٰ کے شایان شان ہے، اور مخلوق اس نام کی مستحق نہیں ہو سکتی۔

اور فقر ایسی صفت ہے کہ خاص مخلوق کے لیے زیبا ہے اور حضرت جل مجدہ و عز اسمہ کی ذات کے لیے یہ ناروا۔ اور اگر مجازاً کسی کو غنی کہہ دیتے ہیں تو اس کے معنی یہ نہیں کہ وہ درحقیقت غنی ہے، اور پھر یہ امر بھی روشن و واضح ہے کہ ہمارا غنا محض وجود اسباب ظاہری کی بنا پر ہے اور ہم اس سبب غنا کی وجہ سے اس وقت تک غنی کہلا رہے ہیں جب تک ہمارے پاس مال و دولت ہے برخلاف غنی حقیقی کے کہ وہ اسباب پیدا فرمانے والا اور اپنے بندے کو اس کے ذریعے غنی بنانے والا ہے۔ لیکن غنی حقیقی کے لیے مال و اسباب علت غنا نہیں۔ اس اعتبار سے مشارکت بصفحت غنا کا وہم بھی باطل ہوا۔

اور یہ حقیقت واضح ہے کہ مخلوق کو ذات خالق میں مشارکت ممنوع ہے۔ تو جب ذات میں شرکت ممنوع ہوئی تو یقیناً صفات میں بھی شرکت ممنوع ہوگی اور جب صفت میں شرکت ممنوع ٹھہری تو

اسم ذات میں بھی شرکتِ ربی روا نہ ہوگی۔

اب رہا محض نام رکھ دینا، اور کہہ دینا کہ فلاں غنی ہے، یہ نام خود ایک نشان ہے جو مابین عبد و معبود واضح ہے۔ اس کی تفصیل کی حد نہیں۔ پس خلاصہ اتنا سمجھ لینا چاہیے کہ وہ غنا جو حق تعالیٰ شانہ کی صفتِ خاص ہے، وہ وہ غنا ہے کہ اس میں اس ذات پاک کو کسی کے ساتھ حاجت و نیاز مندی نہیں، جو چاہے کرے، اس کے ارادہ اور مشیت کو کوئی نہیں روک سکتا، نہ اس کے پورا ہونے میں کوئی مانع بننے کی طاقت رکھتا ہے، نہ اس کے ارادہ کے مقابل کوئی مخالف ارادہ کی تاب لاسکتا ہے۔ اس کے دارالافتداری میں کسی کو مجال و مزدن نہیں، اس کی تمام صفات قدیم ہیں۔ ہمیشہ وہ اپنی صفات سے متصف رہے گا اور ہمیشہ سے متصف تھا، برخلاف غناء مخلوق کے کہ وہ اپنی حیات چند روزہ میں حصول مال و متاع سے فارغ البال ہوتا ہے، اور وہ بھی دوامی زندگی میں نہیں بلکہ کبھی مصیبت میں، کبھی نجات پا کر فرصت میں۔ غرضیکہ محض حادث متغیر کبھی طالب، کبھی متمنی، کبھی عاجز، کبھی خوار، کبھی بیمار۔ مختصر یہ کہ بندہ کا غنی ہونا محض مجازاً بلکہ نام کا ہی ہے اور حق تعالیٰ شانہ کا غنا حقیقی، ابدی، ازلی، سرمدی، قدیم۔ چنانچہ خود قرآن کریم میں ارشاد ہے:

﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ أَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ إِلَى اللَّهِ وَاللَّهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ﴾ (۱)

”اے لوگو! تم محتاج اور فقیر ہو اللہ کے در کے سوا لی اور اللہ ہی غنی ہے اور وہی حمید عالم یعنی زمانہ میں تعریف کیا گیا ہے۔“

اور فرمایا:

﴿وَاللَّهُ الْغَنِيُّ وَأَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ﴾ (۲)

”بیشک اللہ حقیقی غنی ہے اور تم سب اس کے محتاج اور فقیر بے نوا۔“

عوام الناس میں یہ امر مشہور ہے کہ تو نگر، مالدار درویش سے افضل ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے خوش قسمت بنایا اور عطا نعمت پر شکر کا حکم دیا اور وہ جاہل اس غنا اور نعمت سے مراد کثرت مال دنیا سمجھتے ہیں اور جانتے ہیں کہ دنیا میں شہواتِ نفسانیہ کے موافق دل کی مرادیں پوری ہو جانا کامیابی ہے اور اسی کا نام غنا و تو نگری ہے اور اس قسم کی نعمت پر شکر کرنے کا حکم فرمایا اور فقیر کو صبر کی تلقین کی تو معلوم ہوا کہ چونکہ صبر ہمیشہ بلا و مصائب پر ہوتا ہے اور شکر نعمت الہیہ پر تو نعمت و مال و غنا افضل ہوا جس پر شکر کا حکم ہے اور فقر مصیبت و بلا ہے جس پر صبر کا حکم ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ نعمت پر شکر کا حکم فرما کر اسی نعمت کے زیادہ کرنے کا وعدہ فرمایا ہے۔ مگر فقر پر صبر کی تلقین کرتے

ہوئے اپنے تقرب کی بشارت عطا فرمائی ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے:

﴿إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ﴾ (۱)

”بیشک اللہ صابروں کے ساتھ ہے“

اور شکر تو صرف علت از دیا و نعمت ہے۔ فرمایا جیسا کہ ارشاد ہے:

﴿لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ﴾ (۲)

”اگر تم شکر کرو گے تو البتہ میں تم کو زیادہ دوں گا“

اور جو فقر میں کہ وہ اصل امتحان ہے، صبر کرے گا، جو موجب تقرب ہے، تو اس کا تقرب اور بڑھ جائے گا۔ حتیٰ کہ ہم اس کے ساتھ ہوں گے۔ لیکن وہ غنا جس کو مشائخ کرام غنا کہتے ہیں وہ مال و دولت دنیا نہیں ہے بلکہ وہ غنا منعم حقیقی کی نعمت وصل ہے۔ تو اب واضح ہو گیا کہ غفلت اور چیز ہے اور نعمت وصل اور۔۔۔ اور نعمت وصل کا غنا وہی ہے جسے بعض مشائخ نے افضل کہا ہے۔ چنانچہ حضرت شیخ ابوسعید رحمۃ اللہ فرماتے ہیں:

الْفَقْرُ هُوَ الْغِنَاءُ بِاللَّهِ .

”فقر وہ غنا ہے جو اللہ تعالیٰ کی معیت سے حاصل ہوتا ہے۔“

اور اس سے مراد کشفِ ابدی ہے، جو اللہ تعالیٰ کے مشاہدہ جمال سے حاصل ہوتا ہے۔ لیکن ہم کہتے ہیں کہ یہ کشف جو مشاہدہ جمال سے حاصل ہوا ہے، جسے بعض مشائخ نے غنا فرمایا۔ یہ ممکن الحجاب ہے یا نہیں۔ اگر کہا جائے کہ ممکن الحجاب ہے تو لامحالہ بوقت حجاب اسے احتیاج مشاہدہ ہوگی۔ اگر کہو کہ بصورت حجاب وہ محتاج کشف و مشاہدہ نہیں ہوتا تو یہ محال اور اگر کہو کہ محتاج وصل و مشاہدہ ہوتا ہے تو پھر نام غنا ساقط ہو گیا اور درحقیقت یہ غنا جسے مشائخ غنا کہہ رہے ہیں، یہ بھی ہمہ درویش کو حاصل نہیں ہوتا، بلکہ اسے حاصل ہوتا ہے جو قائم الصفت اور ثابت المراد ہو، اور بلا اقامت مراد اور اثبات اوصاف آدمیت لفظ ”غنا“ درست نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ انسان کا یہ وجود کثیف قابل غنا ہو ہی نہیں سکتا۔ اس لیے کہ وجود بشریت کی حقیقت عین نیاز ہے اور جسم حادث طرہ امتیاز عین احتیاج۔ تو جو باقی الصفت ہو تو وہی غنی ہے، اور جو فانی الصفت ہو، اس کے لیے کوئی نام بھی موزوں نہیں تو الْغِنَى مِنْ اَغْنَاهُ اللّٰهُ (غنی وہ ہے جسے اللہ غنی کر دے) کا مفہوم واضح یہی بتا رہا ہے۔ غنی اللہ ہے جو فاعل ہے اور جسے غنی کیا وہ مفعول ہے۔ تو فاعل ہمیشہ قائم بالذات ہوتا ہے اور وجود مفعول، فاعل کے ساتھ وابستہ تو اقامت بخود صفت بشریت تھی اور

اقامت بحق مع صفت۔ تو میں علی بن عثمان جلابیؒ یہی کہتا ہوں کہ: جب بندگی درست اور صحیح ہوگی تو غناء حقیقی و باقی، حقیقی صفت کے سوا کے لیے درست نہ ہوا۔ اس لیے کہ بقائے صفت آدمیت محل علت و موجب آفت ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے دلائل میں بیان کر چکے ہیں اور غنا وہ صفت ہے جو فنا کے ساتھ کبھی صحیح نہیں ہو سکتی، اس لیے کہ جو اپنی ذات کے ساتھ باقی نہ رہ سکے اسے نامی اور کسی اسم کا مسکئی بنانا لغو ہے۔ اور ظاہر ہے کہ انسان کی صفت کے ساتھ فنا ہے۔ تو جب صفت فانی ہے، اسے کسی نام سے مسکئی بنانا کسی طرح صحیح نہیں تو ثابت ہوا کہ صفت غنا ذات واجب تعالیٰ شانہ سے متجاوز نہیں ہو سکتی اور صفت فقر بھی عاجز انسان کے لیے ہے۔ اس لیے کہ یہ معدوم ہے کہ اس پر نہ اسم فقر صحیح نہ اسم غنا۔ اور جو اکثر و بیشتر علماء مشائخ فقر کو غنا پر فضیلت دیتے رہے ہیں اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ کتاب اللہ اور سنت رسول ﷺ اس کی فضیلت پر شاہد ہیں اور اس پر اجماع امت ہے۔ بہت سی حکایتوں میں پایا کہ ایک روز حضرت جنید بغدادیؒ اور ابن عطاءؒ کے مابین اس مسئلہ پر بحث ہوئی۔ ابن عطاء اغنیاء کی فضیلت پر دلیل پیش کرتے تھے اور کہتے کہ اغنیاء سے یوم قیامت محاسبہ ہو گا اور اس محاسبہ میں جمیل حقیقی سے کلام بے واسطہ ہونے کا انہیں شرف ملے گا۔ اور اگرچہ ان پر عتاب ہی ہو، لیکن عتاب محبوب بھی محبت کو محبوب ہوتا ہے۔ حضرت جنیدؒ نے فرمایا: یہ تو صحیح ہے کہ اغنیاء سے محاسبہ فرمایا جائے گا مگر درویشوں سے عذر لیا جائے گا، اور عذر خود بھی مرتبہ میں محاسبہ سے زیادہ ہے۔

اس جگہ ایک عجیب و غریب لطیفہ تمہیں سنائیں: وہ یہ کہ مقام محبت میں عذر چاہنا بیگانگی ہے اور عتاب اس مخالفت پر ہوتا ہے جو محبوب کی مرضی کے خلاف ہو اور دل ایسے مقام میں ہوتا ہے کہ اس کے لیے یہ دونوں باتیں آفت ہیں۔ اس لیے کہ عذر کسی فروگذاشت پر کیا جاتا ہے جو دوست کے ساتھ دوست نے کی ہو، یا جب دوست اپنا حق طلب کرے تو محبوب اس کا قرضہ ادا کرے اور عتاب ایسی غلطی اور قصور پر ہوتا ہے جو فرمان محبوب کے خلاف کیا گیا ہو۔ اُس وقت محبوب اپنے محبت سے اُس نافرمانی پر عتاب کرتا ہے، اور یہ دونوں باتیں محال ہیں اس لیے کہ سب اپنے اپنے مطلب میں ہوں گے۔

فقر صبر کے ساتھ، غنا شکر کے ساتھ، اور درحقیقت کوئی دوست نہ دوست سے کچھ طلب کرے گا، نہ دوست مطالبہ دوست کو رد فرمائے گا بلکہ ظلم من سَمی ابنِ ادمِ امیراً وَقَدْ سَمَاهُ رَبُّهُ فَقِيرًا۔ (اُس نے اپنے اوپر ظلم کیا جس نے ابنِ آدم کو اپنا نام امیر رکھا حالانکہ اس کے رب نے اس کا نام فقیر رکھا ہے۔) وہ وجود جس کا نام خدائے قدیر کی بارگاہ میں فقیر ہے اگرچہ بظاہر امیر

ہو مگر درحقیقت فقیر ہے، اور وہی ہلاک ہو گیا جس نے اپنے محبوب کی زنجیر میں مقید نہ سمجھا۔ اگرچہ بظاہر اس کی بارگاہ میں تخت و سریر ہو۔ اس لیے اغنیاء صاحبِ صدقہ ہوتے ہیں اور فقیر صاحبِ صدق اور صاحبِ صدق صاحبِ صدقہ نہیں ہو سکتے۔

گو خلاصہ یہ نکلا کہ حقیقتاً فقیر ایوب (علیہ السلام) مثل غناء سلیمان (علیہ السلام) ہے۔ اس لیے حضرت ایوب (علیہ السلام) کو جو کہ سخت صبر کرنے والے تھے ﴿يَعْمَدُ الْعَبْدُ﴾ (۱) (اچھا بندہ) فرمایا۔ اور سلیمان علیہ السلام کو جب کہ وہ مملکت و حکومت کے اندر استقامت پر تھے تو ﴿يَعْمَدُ الْعَبْدُ﴾ فرمایا۔

جب رضائے رحمن حاصل ہوئی تو فقیر ایوب علیہ السلام کو مثل غناء سلیمان علیہ السلام گردانا گیا۔

حکایت:

میں نے استاد ابوالقاسم قشیری سے سنا کہ لوگوں نے فقر اور غناء میں گفتگو کر کے اپنے لیے ایک کو پسند کر لیا ہے۔ مگر میں یہ پسند کرتا ہوں کہ میرے لیے میرا جمیل حقیقی جو پسند فرمائے اس میں ہی مجھے رکھے۔ اگر میرے لیے غناء پسند فرمائے تو مجھے اپنی یاد سے غافل نہ کرے اور اگر فقر پسند فرمائے تو اس میں حریص ہونے سے محفوظ رکھے۔ غرضیکہ غناء بھی اس کی نعمت ہے۔ مگر اس کی وجہ سے جو غفلت پیدا ہو وہ آفت ہے، اور فقر بھی اس کی نعمت ہے مگر اس میں اگر حرص پیدا ہو جائے تو وہ سخت آفت و بلا ہے۔ گویا غناء و فقر دونوں منعم حقیقی کے تنعمات سے ہیں۔ مگر اس میں جو نتائج پیدا ہوتے ہیں وہ مختلف ہیں۔ اس لیے کہ فقر نام ہے ماسوائے اللہ سے دل کا فارغ ہونا اور غنا نام ہے ماسوائے اللہ کی طرف دل کا مشغول ہونا۔

جب بتوفیق الہی دونوں سے آزرده ہو جائے تو نہ فقر غنا سے بہتر ہے اور نہ غنا فقر سے افضل۔ غنا کثرتِ مال ہے اور فقر قلتِ مال ہے اور مال و منال چونکہ سب رب عز اسمہ کی ملک ہے تو طالب نے جب ملک ترک کر دی تو مشارکت باقی نہ رہی اور جب مشارکت نہ رہی تو غنا و فقر دونوں سے فراغت مل گئی۔

فصل:

مشائخ طریقت میں سے ہر ایک نے فقر اور غنا کے معنی میں کچھ کچھ رموز لکھی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے چاہا تو میں اپنی استطاعت کے موافق ان کے ارشادات اس کتاب میں نقل کرتا ہوں۔

ایک متاخرین صوفیاء میں سے فرماتے ہیں:

لَيْسَ الْفَقِيرُ مَنْ خَلَا مِنَ الزَّادِ إِنَّمَا الْفَقِيرُ مَنْ خَلَا مِنَ الْمُرَادِ
 ”فقیر وہ نہیں جو مال و متاع سے خالی ہو بلکہ فقیر وہ ہے کہ جس کا دل
 خواہشاتِ باطل اور طمع و آرزو سے خالی ہو۔“

چنانچہ اگر کسی کو اللہ مال دے اور وہ اس کی محافظت میں اپنی زندگی بسر کرے تو وہ بھی غنی ہے اور اگر منجانب اللہ کسی کو مال ملے اور وہ اس کے صرف میں اپنی قوت صرف کرے تو وہ بھی غنی ہے۔ لیکن یہ دونوں باتیں ایسی ہیں جن کا تعلق ملک میں تصرف کرنے سے ہے اور یہ شان فقر کے خلاف ہے۔ درحقیقت فقر میں ترکِ محافظت اور ترکِ خیال اسراف لازمی ہے۔ حضرت یحییٰ بن معاذ رازی فرماتے ہیں:

عَلَامَةُ الْفَقْرِ خَوْفُ الْفَقْرِ

”یعنی فقر کی علامت خوفِ فقر ہے۔“

یعنی سچا فقیر وہ ہے کہ کمال ولایت کی فرقت قیام مشاہدہ ذات کا آرزو مند رہ کر اس صفت کے فنا ہونے میں خائف رہے اور زوال کمال و قطعیت مشاہدہ جمال سے ڈرے۔ جب یہ بات فقیر میں پیدا ہو جائے تو سمجھ لو کہ اب وہ اپنے حال میں درجہ کمال کو پہنچ گیا اور حقیقت بھی یہی ہے کہ کمال کو پہنچنے کے بعد زوال سے ڈرا جائے اور رویم بن محمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

مِنْ نَعْتِ الْفَقِيرِ حِفْظُ سِرِّهِ وَصِيَانَةُ نَفْسِهِ وَ اَدَاءُ فَرَائِضِهِ

”فقیر کی خوبیوں میں سے اپنے راز مکتوب کی محافظت اور اپنے نفس کے

جھانسون سے ہوشیار رہ کر فرائضِ محبوب کا ادا کرنا ہے۔“

غرضیکہ فقیر وہ ہے کہ اس کا ضمیر اغراض و ہوائے نفسانی سے محفوظ رہے اور قیدِ نفس سے ہوشیار رہ کر اپنے معبودِ حقیقی کے فرائض کما حقہ ادا کرے اور اس قدر ہوشیار رہے کہ جو اسرارِ باطنی اس پر منکشف ہوں ان کو ظاہر نہ ہونے دے اور ہمیشہ اپنے حال پر قال کو نہ آنے دے اور یہ علامت اس فقیر کی ہوگی جو کیفیتِ بشریہ سے متجاوز ہو کر عہدِ مطلق ہو چکا اور واصلِ بحق ہو گیا۔ بشر حافی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

أَفْضَلُ الْمَقَامَاتِ اِعْتِقَادُ الصَّبْرِ عَلَى الْفَقْرِ إِلَى الْقَبْرِ

”افضل ترین درجہ فقر کا یہ ہے کہ وہ صبر کے ساتھ دنیاوی تنگ دستی کو اس حد

تک گزارے کہ میدانِ حشر کی محتاجی تک وہ قائم رہے۔“

یعنی فقر پر ہمیشہ صبر کے ساتھ رہنا فقیر کا درجہ کمال ہے اور یہ مرتبہ عبدیت کا خاص مقام ہے، مقام عبدیت مقام فنا ہے۔ مقام فقر وہ مقام ہے جہاں مقامات بھی فنا ہو جاتے ہیں۔ غرضیکہ مقام فقر پر ہی کیفیت اعمال اور آفات مال و مصائب زوال کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ اس اجمال کے ظاہر معنی یہ ہوں گے کہ غناء پر فقر کو فضیلت ہے اور جب فضیلت فقر ظاہر ہو جائے گی تو فقیر اس امر کا عہد کرے گا کہ میں جاوہ فقر سے کبھی سرتابی اور زور گردانی نہ کروں گا۔ حضرت شبلیؒ نے فرمایا:

الْفَقِيرُ مَنْ لَا يَسْتَعِينُ بِشَيْءٍ دُونَ اللَّهِ.

”فقیر وہ ہے جو کسی چیز کے ساتھ سوا ذات پاک سبحانہ و تعالیٰ کے، آرام نہ پکڑے۔“

اس لیے کہ اس کی مراد سوا اس ذات کے کوئی نہیں اور اصل مطلب یہ ہے کہ بغیر اس ذات غنی جل شانہ کے، تو نگری حاصل نہیں ہو سکتی۔ تو جب اس ذات کو پالیا، تو نگر ہو گیا اور یہ ظاہر ہے کہ وجود فقیر ذات کے سوا ہے، تو جب تو نگری ماسوا کو ترک کیے بغیر نہیں پاسکتا تو خود وجود فقیر غنا و تو نگری کا حجاب ہوا۔ تو جب تک یہ وجود جو ماسوائے اللہ سے ہے، فنا نہ ہو جائے گا، غنی نہیں ہو سکتا اور جب اپنے کو فنا کر لے گا، غنی ہو جائے گا۔ اہل تحقیق کے نزدیک یہ نکتہ نہایت باریک اور لطیف ہے اور اس کی تحقیق و حقیقت معنی یہی صحیح ہو سکتے ہیں کہ:

الْفَقِيرُ مَنْ لَا يَسْتَعِينُ عَنْهُ. ”یعنی فقیر وہ ہے کہ اس کی ذات میں ہرگز غنا نہ ہو۔“

اور یہ وہی بات ہے جو پیر کامل حضرت عبداللہ انصاری ہروی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمائی: کہ ہمارا رنج و اندوہ ابدی ہے، نہ ہمارا مرکز ہمت مقصود پاسکتا ہے، نہ ہمارا وجود کلیۃً دنیا و آخرت میں فنا ہو سکتا ہے، اس لیے کہ کسی چیز کے حاصل کرنے کے لیے مجاہدت لازمی ہے اور وہ مقصود ازلی ہمارا ہم جنس نہیں اور اس کے فرمانے اور اعراض کرنے کے لیے غفلت کی ضرورت ہے اور درویش غافل نہیں ہوتا، وہ تو دوامی خدمت ذمہ ہے اور ایک راہ مشکل گزار سامنے۔ غرضیکہ ہمارا دوست وہ ہے کہ اس سے ملنے کے لیے ہماری سعی مدد نہیں کر سکتی اور اس کا شربت دیدار حاصل ہونے کے لیے ہمارے اختیارات کو کوئی دخل ہی نہیں اور اس کا وصل حاصل کرنا مقدور خلاق سے بالاتر۔ فنا ہونے سے اس کیفیت میں تبدل نہیں آتا اور باقی رہنے سے وہ متغیر نہیں ہوتا، پھر فانی محض باقی کیونکر ہوتا کہ وصل حاصل کرے اور باقی ازلی کس طرح فانی ہوتا، کہ فانی سے قربت کرے۔

مختصر یہ کہ اس کے طالب اور دوست کا کام محنت و مشقت میں رہنا ہے اور جو کچھ لوگوں کے بیانات ہیں وہ سب دل کی تسلی کے لیے گھڑے ہوئے ہیں۔ اسی طرح اپنی جان کو

تسکین دینے کے لیے مقامات و منازل و طریق کے نام رکھ لیے ہیں، ورنہ وہ جمیل حقیقی ان تمام اختراعی ناموں اور مقاموں سے پاک اور بالاتر ہے اور وہ ذات اوصاف و احوال خلق سے منزہ۔
﴿سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ﴾ (۱)

حضرت ابوالحسن نوری قدس سرہ فرماتے ہیں:

نَعْتُ الْفَقِيرِ السَّكُوْثِ عِنْدَ الْعَدَمِ وَالْبَدْلُ عِنْدَ الْوُجُوْدِ .
”فقیر کی تعریف میں یہ ہے کہ جب نہ ہو، تو خاموش رہے اور جب ہو،
تو خوب خرچ کرے۔“

اور فرمایا:

اَلَا ضَطْرَابٌ عِنْدَ الْوُجُوْدِ .
”جب ہو تو مضطرب رہے۔“

یعنی جب نہ پائے سکوت کرے اور جب پائے تو دوسرے کو اپنے سے زیادہ حق دار سمجھ کر اس پر خرچ کرے اور یہ بھی فرمایا: کہ جب پاس ہو تو اس کو خرچ کرنے کی عجلت میں بے قرار ہو، اور چونکہ انسان کا مقصد لقمہ ہے، تو جب لقمہ حاصل ہو تو خود کھانے کی بجائے دوسرے آدمی کو اپنے سے زیادہ حق دار جانے اور اس پر وہ لقمہ صرف کرے اور جب اس کی مراد لقمہ اسے حاصل نہ ہو تو اطمینان قلب کے ساتھ خاموش رہے۔ اس مقولہ میں جو حضرت ابوالحسن نوریؒ نے فرمایا، دو معنی ہیں: ایک فقیر کا سکون و اطمینان بحال عدم رضا ہونا۔ یعنی خواہش و مراد کے خلاف میں خاموش و ساکت رہنا اور حال رضاء و وجود لقمہ کے وقت دوسروں پر خرچ کر دینا اور یہ دونوں باتیں وجود محبت کے بغیر نہیں ہو سکتیں اور یہ ظاہر ہے کہ راضی برضاء محبوب مستحق خلعت ہوتا ہے اور عطا تقرب کی نشانی ہے۔ اور محبت تارک خلعت اس لیے ہوتا ہے کہ اسے عطاء خلعت میں علامات فرقت نظر آتی ہیں، دوسرے یہ سکون فقیر عدم وجود لقمہ میں ہو، اس لیے کہ وجود لقمہ وجود ماسوی اللہ ہے اور فقیر ماسوائی اللہ سے آرام و سکون نہیں پاتا۔ اسی وجہ سے وہ ماسوی اللہ کو ترک کر دیتا ہے۔ اور یہی معنی شیخ المشائخ حضرت ابوالقاسم جنید بن محمد الجینید رحمۃ اللہ علیہ کے اس قول کے ہیں جو آپ نے فرمایا:

اَلْفَقْرُ خُلُوُّ الْقَلْبِ عَنِ الْاَشْكَالِ .

”فقر نام ہے تمام توہمات سے دل کا خالی رکھنا۔“

تو جب فقیر کا دل تمام اندیشوں اور واہموں سے خالی ہو جاتا ہے تو ہر شکل وہمی کو اسے دل سے نکال دینے کے سوا اور چارہ ہی نہیں، اس لیے کہ وہ تمام غیر خدا اور ماسوائے اللہ ہیں۔

حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

الْفَقْرُ بَحْرُ الْبَلَاءِ وَبَلَاؤُهُ كُلُّهُ عِزٌّ.

”فقر دریائے بلا کا نام اور فقیر کے لیے بلا ہائے فقر ہی عزت ہیں۔“

اور عزت فقیر تمام اس کا حال ہے اور حال فقیر خالص محبت اور محبت محبوب خالص مجاہدہ تاکہ دماغ طالب متحمل دیدار جمیل ہو جائے اور افراط و خیال و تصور جمال کے ذریعہ بے آنکھ جمال جمیل دیکھنے کے لائق ہو سکے اور فرمان محبوب بغیر کانوں کے سننے لگے۔

غرضیکہ محبوب حقیقی کا عزیز بندہ وہی ہے جو بارِ بلاء محبوب بطیب خاطر اٹھائے۔ اس لیے کہ وہ بلا جواز جانب محبوب آئے، وہ عزت خالص ہے اور نعماء دنیا و بلاء دنیا در حقیقت ذلت خالص ہیں۔ اس لیے عزت اس بندے کو ملتی ہے جو سچائی کے ساتھ اپنے محبوب کے حضور حاضر ہو اور ذلت اسے جو مشاہدہ حق سے اپنے کو غائب کرے۔

یاد رکھو! بلا فقر نشانِ حضورِ حقیقی اور عیشِ غنا نشانِ غیبت و مہجوری۔ تو جو حاضر بحضور حق ہے وہ معزز و ممتاز ہے اور جو غائب بحضور حق ہے وہ ذلیل۔ وہ بلا جس کا نتیجہ مشاہدہ جمال اور دیدار محبوب ہو وہ بہر صورت غنیمت اور نعمتِ غیر مترقبہ ہے۔ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

يَا مَعْشَرَ الْفُقَرَاءِ إِنَّكُمْ إِنَّمَا تَعْرِفُونَ بِاللَّهِ وَتُكْرَمُونَ لِلَّهِ
فَانظُرُوا كَيْفَ تَكُونُونَ مَعَ اللَّهِ إِذَا خَلَوْتُمْ بِهِ.

”اے جماعتِ فقراء! تم عارفِ بحق ہونے کی وجہ سے ممتاز ہو اور یہی شان تمہاری عزت کی موجب ہے تو تمہیں لازم ہے کہ اپنی خلوتوں میں ہوشیار رہو اور دیکھو کہ اپنے رب کے ساتھ اس وقت تم کس طرح قریب ہو۔“

یعنی جب لوگوں میں تم درویش مشہور ہو جاؤ اور وہ تمہارے حقوق ادا کرنے لگیں اور تمہیں بنظر عظمت دیکھیں تو اس وقت تمہیں حق درویشی ادا کرنے میں خاص خیال رکھنا ضروری ہے۔ اگر لوگ تمہیں تمہاری اصلیت کے خلاف تمہارا نام اور رکھیں تو تم ان کی اس آواز کو پسند نہ کرو۔ اپنے کو بنظر انصاف در منعم کا ایک فقیر جانو۔ اس لیے کہ بدترین انسان وہی ہے کہ لوگ اسے مردِ خدا جانیں اور وہ در حقیقت ایسا نہ ہو مگر اس سے خوش ہو، اور بہترین انسان وہ ہے کہ لوگ اسے درویش جانیں

اور درحقیقت وہ درویش ہو اور سب سے زیادہ افضل ترین وہ ہے کہ لوگ اسے مردِ کامل نہ سمجھیں مگر وہ درحقیقت اعلیٰ پایہ کا مردِ خدا ہو۔ اس کی مثال جسے لوگ کامل جانتے ہوں اور درحقیقت وہ ایسا نہ ہو، اس طرح ہے جیسے کوئی مدعی حکمت ہو اور مریضوں کا علاج کرتا ہو مگر جب بیمار ہو تو اس کی طب سے کچھ فائدہ نہ پہنچائے اور دوسروں کے آگے جھکتا پھرے تاکہ علاج کرائے مگر طبیب کی مجوزہ دوا کے مفاد سے محض بے خبر ہے، اور اس کی مثال جس کو لوگ درویش جانیں اور وہ درویش ہو، ایسے ہے جیسے کہ طبیب فی الواقع طبیب ہے اور مریضوں کا علاج کرتا ہے اور جب خود بیمار ہوتا ہے دوسرے طبیب کی اسے ضرورت پڑتی ہے مگر اس کے مجوزہ نسخہ کے مفاد کو خود بھی سمجھتا ہے۔ اور اس کی مثال کہ جسے لوگ مردِ کامل نہیں جانتے اور حقیقتاً وہ کامل مرد ہوتا ہے ایسے ہے کہ ایک طبیب کامل ہے مگر لوگ طبیب کامل نہیں جانتے اور وہ عوام کی مشغولیت سے آزاد رہ کر اپنی حفظانِ صحت کا پورا نظام کیے ہوئے ہے۔ اپنے مزاج کے موافق غذا لطیف، شربت مفرح، ہوا معتدل حاصل کر کے اپنی صحت کو مکمل طور پر درست رکھتا ہے تاکہ اس کے پاس مرض آکر اسے مریض نہ بنا سکے اور عوام کی نظریں اس کے حال سے بالکل بے پتہ ہیں۔ بعض متاخرین فرماتے ہیں:

الْفَقْرُ عَدَمٌ بِلاَ وَجُودٍ .

”یعنی فقر عدم، بلا وجود کا نام ہے۔“

اس کا مطلب واضح طور پر بیان کرنا سخت مشکل ہے۔ اس لیے کہ شے تو بذاتہ کچھ نہیں ہوتی اور جب تک کسی شے کا وجود نہ ہو اسے بیان کس طرح کیا جائے۔ تو اس عبارت کا مفہوم سوا اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ ان کے نزدیک فقر کوئی چیز نہیں اور مقربانِ الہی کا اجتماع اور اقوالِ محض بے اصل ہیں۔ اس لیے کہ فقیر اپنی ذات میں معدوم محض ہے اور اگر اس عبارت میں عدم عین مراد نہ لیا جائے بلکہ عدم آفت مراد ہو تو یہ بھی صحیح نہیں اس لیے کہ آفت اوصافِ انسان سے ہے اور نفی آفت کرنا گویا نفی صفت کرنا ہے۔

اور آفت وہ صفتِ انسانی ہے جو ذریعہ ہے وصولِ الی اللہ کی۔ پھر وصولِ الی اللہ جو ذریعہ ہے، جب اسی کو معدوم کر دیا تو ان کی رفتار کو ہی معدوم کیا اور نفی رفتار، مستلزم نفی وجود ہوگی اور اس میں ہلاکت ہی ہلاکت ہے۔ میں نے اربابِ کلام کا ایک گروہ دیکھا جو اس قول کو صحیح نہیں مانتا، بلکہ اس قول کا استہزا کرتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ قول نامعقول ہے۔ دوسرا گروہ وہ دیکھا جو اس قول کو صحیح مانتا اور اس پر عقیدہ رکھ کر کہتا ہے کہ ”الْفَقْرُ عَدَمٌ بِلاَ وَجُودٍ“ صحیح ہے۔

اور حقیقتِ حال یہ ہے کہ اصل حال دونوں کو معلوم نہیں اسی وجہ سے دونوں گروہ غلطی پر

ہیں۔ ایک گروہ تو بوجہ جہل منکر صداقت ہوا اور دوسرا گروہ جہل کو حقیقت جان کر بہک گیا ایک نے عدم اور فنا سے مراد ناقابل تعریف صفات لے کر ستودہ صفات کی طلب کرنی چاہی دوسرے نے ترک صفت کو ستودہ صفت سمجھ لیا۔

اور درحقیقت بات یہ ہے کہ فقر کے معنی کلیہ کے بیان سے خود درویش بھی عاری ہے اور اصل مقصود کے اسباب کلیہ سے قطعاً بیگانہ، مگر اسرار الہیہ کی گزرگاہ وہی درویش ہوتا ہے اور جب تک درویش کا کام زہد و تقویٰ سے مکتسب ہو اس کے تمام افعال کو درگاہ الہی میں نسبت قبولیت حاصل ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ ایک وقت وہ آتا ہے کہ تمام افعال درویش قید کسب سے رہا ہو جاتے ہیں۔ اس وقت اس کے فعل کی نسبت بھی اس سے منقطع ہو جاتی ہے (۱)۔ اور الفاظ و معنی کو حقیقتاً فقیر سے کوئی نسبت ہی نہیں بلکہ اسرار و رموز الہیہ سے جو کچھ فقیر پر وارد و صادر ہوتا ہے اس کی محض گزرگاہ فقیر ہوتا ہے نہ کہ خود راہ رویا صاحب اختیار۔ بلکہ فقیر کسی کام کو اپنے اختیار سے نہیں کرتا۔ نہ کسی چیز کو اپنے اختیار سے لیتا، نہ کسی کو با اختیار خود دفع کرتا ہے۔ اگرچہ وہ من حیث العبد ذات واجب تعالیٰ شانہ سے غیر ہے مگر ذات تعالیٰ شانہ کا یہی نشان خاص ہے۔

ہم نے ایک گروہ اور بھی دیکھا جو مدعی کلام اور اہل زبان تھا۔ وہ اس مضمون سے وجود کی نفی کو کمال عین فقر بتاتا تھا اور اسے بہت مہتمم بالشان تعریف کہتا تھا۔ دوسرا گروہ دیکھا کہ حقیقت فقر کے بیان میں نفی اور عدم بیان کو مقدم جانتا تھا اور عین فقر میں نفی صفات کے معنی قرار دیتا تھا۔ ایک گروہ ایسا دیکھا کہ اس کے نزدیک صفوت تام جب ہی حاصل ہوتی ہے جبکہ طلب حق میں نفی حقیقت کردی جائے۔ ایک گروہ دیکھا جن کے نزدیک سوا اسباب حرص تمام موجودات کی نفی کا نام ہی فقر ہے اور درحقیقت یہ تمام گروہ اپنے اپنے خیالات کے حجابوں میں حقیقت فقر سے محجوب ہیں۔ اس لیے کہ سب سے پہلے کمال ولایت میں اس کا ہی سمجھنا ضروری ہے اور اس ہی قول کی حقیقت میں غوطہ زنی کرنا اور اس کے سمجھنے کی محبت پیدا ہونا ہی غایت الغایات فقر ہے۔ تو طالب حق کو اس حقیقت کے سمجھے بغیر چارہ نہیں اور اس راہ کو عبور کیے بغیر کامیابی نہیں اور انہی عبارات کا اچھی طرح سمجھ لینا اس راستہ کی راہ و رسم میں لازمی ہے تاکہ راہ و رسم محبت سے ناواقف رہ کر عوام کی طرح دھوکا میں نہ پڑ جائیں، اس لیے کہ تمام قواعد اصول سے نکلتے ہیں اور تمام جزئیات فروع سے، پھر جو

۱۔ بقول شاعر:

تم ذاتِ خدا سے نہ جدا ہو، نہ خدا ہو
خود داد بر تو گواہی نخست

اللہ ہی کو معلوم ہے تم کون ہو، کیا ہو

چو شد محبت بر خدائی درست

فروع سے بے خبر رہا وہ اصول سے یقیناً بے خبر رہے گا، اور جو اصول سے بے خبر ہوا وہ کسی جگہ بھی صحیح نہیں اتر سکتا۔ یہ اس لیے میں نے کہا تا کہ تم ان معنی کی راہ پہلے طے کرو اور اس کے حقوق کی رعایت کی طرف مشغول ہو سکو۔

اب ہم تھوڑے سے باب تصوف میں خرقہ صوفیہ کے اصول و اشارات بیان کریں گے، پھر ان مردانِ خدا کے اسماء گرامی بتائیں گے جنہوں نے اس شاہراہ کو عبور فرمایا اور منزل حاصل کی۔ پھر صوفیائے کرام کے مسلک پر بحث کریں گے تا کہ تم سمجھ سکو کہ ان کے اختلافات، اختلاف نہیں۔ پھر معرفت و حقیقت و احکام شریعت کا تذکرہ کریں گے۔ پھر بعد مقدوران کے مقامات اور مقامات رموز و حقائق و آداب بیان کریں گے تا کہ تم پر اور دوسرے پڑھنے والوں پر اس مقام کی حقیقت کا انکشاف ہو سکے۔

وَبِاللّٰهِ التَّوْفِیْقُ.



تصوّف

فصل:

اللہ تعالیٰ جل مجدہ کا ارشاد ہے:

﴿وَعِبَادُ الرَّحْمَنِ الَّذِينَ يَمْشُونَ عَلَى الْأَرْضِ هَوْنًا وَإِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُونَ قَالُوا سَلَامًا﴾ (۱)

”خاص بندگان الہی وہ ہیں جو زمین پر جھک کر چلتے ہیں اور جب جاہل انہیں چھیڑیں تو وہ بجائے جواب کے، ان سے کہہ دیتے ہیں کہ اچھا خوش رہو۔“

اور حضرت محمد ﷺ نے فرمایا:

مَنْ سَمِعَ صَوْتَ أَهْلِ التَّصَوُّفِ فَلَا يُؤْمِنُ عَلَى دُعَائِهِمْ كُتِبَ عِنْدَ اللَّهِ مِنَ الْغَافِلِينَ .

”یعنی جس نے اہل تصوف کی آواز سن کر ان کی دعوت کو قبول نہ کیا وہ اللہ کے نزدیک غافلوں میں لکھا گیا۔“

(مگر یہ سمجھنا ضروری ہے کہ صوفی کون ہے اس لیے کہ) لوگوں نے نام صوفی کی بہت سی تعریفیں بنا رکھی ہیں اور اس بحث میں بہت سی کتابیں بھی تالیف ہو چکی ہیں۔ ایک جماعت تو کہتی ہے کہ صوفی کو صوفی اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ کمبلی اوڑھتا ہے۔ ایک جماعت کہتی ہے کہ صوفی کو صوفی اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ بروز قیامت صفِ اول میں ہوں گے، ایک گروہ اس طرف گیا کہ صوفی وہ کہا جاسکتا ہے جو اصحابِ صفہ کے ساتھ محبت و ولا کارابطہ رکھے۔ ایک فرقہ کہنے لگا کہ صوفی ایک اسم ہے جو صفا سے مشتق ہے۔ یعنی جس کے اندر و باہر صفائی ہے وہ صوفی کہلانے کا حقدار ہے۔ اگرچہ بلحاظ طریقت ان توجیہات میں بہت سے لطائف حاصل ہو سکتے ہیں لیکن آخری طبقہ کی تعریف کے اعتبار سے لغوی معنی اس کے علیحدہ ہی نکلیں گے گرچہ صفا بمعنی صفائی ہے اور صفائی ہر پہلو سے اچھی ہے اور صفائی کی ضد کدورت ہے۔

اور حضور ﷺ نے بھی فرمایا:

ذَهَبَ صَفْوُ الدُّنْيَا وَبَقِيَ كَدْرُهَا . (۱)

”دنیا کی صفائی جاتی رہی اور اس کی کدورت باقی رہ گئی۔“

اور ظاہر ہے کہ لطیف و صاف چیز اور میلی و مکدر چیز علیحدہ علیحدہ ہے۔ اور یہ امر ظاہر و واضح ہے کہ اہل تصوف نے اپنے تمام معاملات اخلاقی و معاشی و معادی و ملی مہذب کر لیے اور اپنے دل کدورت آفات دنیا سے صاف فرما لیے۔ اس لیے انہیں صوفی کہا گیا اور یہ اسم عارفوں کے لیے اسمائے اعلام سے ہے کیونکہ اہل تصوف کے خطرات قلبیہ اور اموراتِ حالیہ اس اسم سے کہیں بڑھ کر ہیں، بلکہ درحقیقت لفظ ”صوفی“ ان کے صفاتِ باطن کی ترجمانی کے لیے کافی نہیں اور ان کے معاملات تقرب پر اس کی تعریف محیط نہیں ہو سکتی۔ بنا بریں اسم صوفی کا مبداء اشتقاق ”صفا“ بنا کر اسے اسم صفت قرار دینا صحیح نہیں ہو سکتا۔ پھر یہ زمانہ تو وہ ہے کہ حضرت حق تعالیٰ شانہ نے عوام کو حقیقت تصوف اور اہل تصوف سے حجاب میں فرما کر ان کے منصبِ جلیل کی بلندی اور نورانیت قلبی کو عوام کے دلوں سے مخفی کر دیا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ کوئی جماعت تو یہ سمجھ بیٹھی کہ تصوف ایک طریقہ کا نام ہے جو مشاہدہ باطن میں مدد دیتا ہے اور اصلاح ظاہری کر دیتا ہے۔ کوئی اس گمان میں بہک گیا کہ یہ صوفی اور تصوف ایک بے حقیقت چیز ہے اور یہ نام محض بے اصل نام ہے۔ حتیٰ کہ بعض کمینہ و جاہل تو مسخرہ پن کر کے نا فہم اہل علم کو اپنے ساتھ ملا کر محض ظاہر بین نظروں سے دیکھ بھال کر سرے سے تصوف کے منکر ہو گئے اور باوجودیکہ وہ سخت حجابِ غفلت میں مجبوب ہیں لیکن اپنی اندھی نظر کی تحقیق پر مطمئن ہیں۔ ان کی پیروی جاہل عوام کا لانا عام نے کی اور صفاءِ باطن کی خواہش ہی دل سے نکال دی اور سلف صالحین اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کے طریقہ کو چھوڑ بیٹھے۔

إِنَّ السَّنَا صِفَةَ الصِّدِّيقِ إِنَّ أَرْدَتْ صُوفِيًّا عَلَى التَّحْقِيقِ

”یعنی اگر تو واقعی صوفی کا متلاشی ہے تو یاد رہے کہ صوفی ہونے کی شان صفا تو

صرف صدیق اکبر رضی اللہ عنہ میں تھی۔“

۱۔ یہ الفاظ تو نہیں ملے لیکن امام بخاری نے ”کتاب الجہاد“ میں اور امام نسائی نے ”کتاب الأشربة“ (باب: ۵۶) میں ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے۔ ”ذہب صفوا متی“ امام عجلونی اسے ”کشف الخفاء“ ۵۰۳/۱ میں، ابن ماجہ نے اپنی ”سنن“ میں (۴۰۳۵) امام أحمد بن حنبل نے اپنی ”مسند“ (۹۴/۴) میں امام طبرانی نے ”المعجم الكبير“ ۸۶۶/۱۰ میں، امام اوزاعی نے ”مسند الشہاب“ ۱۹۷/۲ میں ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے۔ إنسابی من الدنيا بلاء وفتنة، وتمام عمل أحدكم كمثل الوعاء، اذا طاب أعلاه طاب أسفله، واذا خبث أعلاه خبث أسفله.

اس لیے کہ صفا حقیقی کے لیے ایک اصل اور ایک فرع ہے اصل تو دل کا ماسوا اللہ تعالیٰ سے منقطع ہونا ہے اور فرع دل کا دنیا غدار کی محبت سے خالی کر دینا اور یہ دونوں صفتیں صدیق اکبر رضی اللہ عنہ میں تھیں جن کا نام حضرت عبداللہ ابو بکر بن ابی قحافہ رضی اللہ عنہ ہے۔ اس لیے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی ہی وہ ہستی ہے جسے امام اہل طریقت اور مقتداء اہل تصوف کہا جائے اور یہی وہ پاک باطن تھے جن کا دل اغیار سے اس قدر صاف تھا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں بھی آپ کی ہستی کا ہمسر کوئی نہ تھا، بوقت وفات قیامت آیات سرور عالم ﷺ تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس عالی جناب گردوں رکاب کی جدائی سے اس قدر دل شکستہ تھے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے از خود فگلی میں برہنہ تلوار کھینچ کر با آواز بلند فرما دیا: خبردار جس نے کہا کہ حضور سرور عالم ﷺ انتقال فرما گئے ہیں، اس کا سر قلم کر دوں گا۔

حضرت افضل البشر بعد الانبیاء صدیق اکبر رضی اللہ عنہ باہر تشریف لائے اور بلند آواز سے فرمایا:

أَلَا مَنْ عَبْدٌ مُحَمَّدًا فَإِنَّ مُحَمَّدًا قَدْ مَاتَ وَمَنْ عَبْدٌ رَبِّ مُحَمَّدٍ
فَإِنَّهُ حَيٌّ لَا يَمُوتُ. (۱)

خبردار رہو! جس نے حضور ﷺ کو حتی قدیم جان کر عبادت کی، تو بیشک اُس ہستی مالک نے وجودِ عنصری سے پردہ فرمایا اور جو عابد الہی ہے وہ سن لے کہ وہ جل مجدہ حتی قدیم ہے اُسے فنا نہیں۔“

پھر حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے یہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی:

﴿وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۗ أَفَأَنْ مَاتَ أَوْ قُتِلَ
انْقَلَبْتُمْ عَلَىٰ أَعْقَابِكُمْ ۗ﴾ (۲)

”ہمارے محبوب محمد ﷺ خدا نہیں بلکہ ہمارے رسول ہیں۔ ان سے پہلے جو رسول آئے وہ بھی دنیا سے تشریف لے جا چکے ہیں۔ تو کیا اگر یہ انتقال فرما جائیں یا شہید ہو جائیں تو تم اپنے پچھلے رویہ پر لوٹ جاؤ گے۔“

یعنی جو محمد ﷺ کو خدا مانتا ہے اسے چاہیے کہ سن لے کہ وہ تشریف لے گئے ہیں اور

جو خدائے محمد ﷺ کو پوجنے والا ہے وہ جان لے کہ وہ ذات زندہ اور قدیم ہے۔

۱۔ صحیح بخاری، ج ۱، ص ۱۶۶

۲۔ سورۃ آل عمران: ۱۴۴

گویا دوسرے الفاظ میں اپنی صفوۃ کا مظاہرہ فرمایا کہ تعلیم مصطفیٰ علیہ التحسینہ والتمایہ ہے کہ سوا ذات باقی کے، سب فانی ہیں اور فانی سے وراء الوریٰ ذات باقی ہے۔ تو جس کا دل فانی سے بندھا ہوا ہے وہ سمجھ لے کہ صورت فانی فنا ہو گئی اور اس کی تمام محنت رائیگاں گئی اور جس نے اپنی جان حضرت باقی کے سپرد فرمادی اس کی شان یہ ہے کہ اس کا نفس فانی فنا ہو جاتا ہے اور وہ ذات باقی کے ساتھ دوامی بقا میں رہتا ہے۔ لہذا جس نے ذات محمد ﷺ کو چشم ظاہر سے دیکھا ہے وہ اپنا اسلام اور ان کی تعظیم ختم کر دے، اس لیے کہ وہ صورت ظاہری تو فنا ہو گئی اور جس نے اس ہستی پاک کو چشم حقیقت دیکھا ہے اسے نقش ظاہری سے کچھ تعلق نہیں۔ اس کے نزدیک اس صورت کا رہنا اور غائب ہو جانا دونوں برابر ہیں۔ اس لیے کہ حالت بقاء میں وہ اپنی بقاء منجانب اللہ سمجھتا اور یقین کرتا ہے، اور کیفیت فنا کو بھی منجانب اللہ جانتا ہے۔ جب اس نے ہر دو کیفیات منجانب محول حقیقی دیکھیں تو محول سے اعراض کر کے محول حقیقی کا اعتراف کر لیا اور جان لیا کہ ہر محول یعنی متغیر ہونے والے کا وجود محول حقیقی یعنی متغیر کرنے والے اور پھیرنے والے کے قبضہ قدرت میں ہے۔ تو پھر فرمان رب العزت جل مجدہ کے مطابق وہ ہر شے کی تعظیم و تکریم کرنے والا ہو گیا اور بنظر دل کسی غیر کو دیکھنا بھی گوارا نہ کیا اور نظر ظاہر کو بھی ماسوا اللہ سے بند کر لیا۔

مَنْ نَظَرَ إِلَى الْخَلْقِ هَلَكَ وَمَنْ رَجَعَ إِلَى الْحَقِّ مَلَكَ. (جس نے مخلوق فانی کی طرف نظر کی ہلاک ہوا، اور جس نے وجود باقی اور ذات حق کی طرف رجوع کیا ملکی صفات سے متصف ہو گیا)۔ یعنی ماسوا اللہ اور مخلوق کی طرف نظر ہونا نشان ہلاکت ہے اور رجوع حق ہونا علامت ملکیت ہے۔ تو خلود ماسوائے اللہ کے یا دنیا و مافیہا سے یہ ہوا کہ جو کچھ مال و متاع غلام اس کے قبضے میں ہو، راہ مولیٰ میں دے ڈالے اور ایک کملی میں لپٹ کر دربار رسالت پناہ میں حاضر ہو۔ جیسا کہ صدیق اکبرؑ کا واقعہ ہے کہ سب مال و متاع، غلام، لونڈی اللہ کے واسطے تصدق کر کے اس شان سے حاضر ہوئے کہ ایک کملی جسم اطہر پر تھی۔ حضور ﷺ نے فرمایا مَا خَلَفْتَ لِعِيَالِكَ؟ ”ابو بکر! اپنے بیوی بچوں کے لیے کیا چھوڑ آئے ہو؟“ عرض کی: اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهُ. بیوی بچوں کے لیے دو خزانے بے خزاں اور دو گنج بیکراں چھوڑ کر آیا ہوں۔ ایک محبت واحد حقیقی دوسرا متاعیت رسولی بطحی۔ اس لیے کہ جب میرا دل تعلق دنیا سے آزاد ہو چکا تو مجھے ناگزیر تھا کہ گندگی اور میل کچیل سے صفائی حاصل کروں۔ یہ ہے کھلم صفت صوفی صافی و عارف صادق کی اور اس سے انکار کرنا درحقیقت انکار ذات باقی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ (درحقیقت، حقیقت تصوف یہی ہے) اس لیے کہ صوفی وہ ہے جو صاف دل ہو، اقسام کدورات سے اور صفائی کی ضد تکدر اور میلا پن ہے۔

دوسرے مکدر و ملوث بدنیا ہونا صفات بشری میں داخل ہے اور درحقیقت صوفی وہ ہے جو حقیقت تکدر سے گذر کر صفات بشری سے بالاتر ہو جائے۔ جیسا کہ بحالت استغراق و محویت مشاہدہ جمال و لطائف حسن یوسف کر کے زنان مصر پر کیفیت بشریہ نے غلبہ کیا۔ پھر اس کیفیت غلبہ بشریت پر جب حسن یوسفی نے اپنا عکس حسن ڈالا تو وہ غلبہ بشریت درجہ غایت کو پہنچ گیا، پھر جب مشاہدہ حسن نہایت پر پہنچا تو غلبہ بشریت فنا ہو گیا اور انہیں زنان مصر کی زبان سے ﴿حَاشَ لِلَّهِ مَا هَذَا بَشَرًا﴾ (۱) نکل گیا۔ ”یعنی خدا کی قسم یہ بشر نہیں ہے“۔ (یہاں درحقیقت پر تو حسن یوسفی نے زنان مصر کی کیفیت بشری کو بدل ڈالا تھا) مگر انہوں نے اس دعویٰ کا نشانہ حسن یوسف علیہ السلام کو بنایا اور فی الواقع اپنا حال بیان کیا تھا۔ اسی کی تائید میں مشائخ طریقت رحمہم اللہ نے فرمایا:

”لَيْسَ الصِّفَاتِ الْبَشَرِيَّةُ لِأَنَّ الْبَشَرَ مَدْرٌ وَالْمَدْرُ لَا يَخْلُوهُ مِنَ الْكَدْرِ.“

”صفاتی صفات بشریہ سے نہیں اس لیے کہ بشر کی تخلیق مٹی سے ہے اور مٹی کے خواص ذاتی میں کدورت و کثافت ہے۔ بنا بریں بشر کو کثافت و کدورت بغیر چارہ نہیں۔“

تو ظاہر ہو گیا کہ حصول صفات افعال و اعمال سے نہیں ہو سکتا اور بشر کی صفت خالص مجاہدہ و ریاضت سے زائل ہونا ناممکن ہے۔ اس لیے کہ صفت کو افعال و اعمال سے کوئی نسبت نہیں اور اسم صفت کو کسی نام یا کسی لقب سے کوئی حاصل نہیں کر سکتا بلکہ: الصِّفَاتُ صِفَةُ الْأَحْبَابِ وَهُمْ شَمُوسٌ بِبَلَاءِ مَسْحَابٍ۔ ”صفت صفا محبوبان الہی کی صفت ہے اور وہ وہ ہیں کہ اپنی صفت بشری سے فانی ہو کر صفت محبوبان الہی کے ساتھ باقی ہو چکے ہیں اور محبوبان بارگاہ وہ ہیں کہ ان کی کیفیت حالی اہل حال کی نظروں میں مثل اس آفتاب کے روشن اور نمایاں ہے جس پر آبر کا بھی حجاب نہیں۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ سرور عالم ﷺ سے صحابہ کبار رضی اللہ عنہم نے حضرت حارثہ بن زید رضی اللہ عنہ کے متعلق دریافت کیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا:

عَبْدٌ نَوَّرَ اللَّهُ قَلْبَهُ بِالْإِيمَانِ.

”وہ وہ بندہ ہے جس کا دل اللہ تعالیٰ نے نور ایمان سے منور کر دیا ہے۔“

اس کا چہرہ یہ اثر رکھتا ہے کہ اس میں کیفیت مقررہ موجود ہے (یعنی جس طرح چاند آفتاب کو دیکھ کر روشن ہو جاتا ہے۔ حضرت حارثہ بن زید کے چہرے کو دیکھنے سے، دیکھنے والے میں نور

آجاتا ہے) اور حارثہؓ کو اللہ نے اپنے نور سے مصور و مخلوق فرمایا۔ کہتے ہیں کہ مشائخ سلاسل میں سے کسی نے یہ شعر فرمایا:

ضِيَاءُ الشَّمْسِ وَالْقَمَرِ إِذَا اشْتَرَكَا
 اَلْمُؤَدَّجُ مِنْ صَفَاءِ الْحُبِّ وَالتَّوْحِيدِ إِذَا اشْتَبَكَا
 ”نورِ آفتاب و قمر جب بیک دیگر مل جائیں تو ان کی مثال توحید و محبت کی
 صفائی ہے جبکہ یہ دونوں یکجا جمع ہو جائیں۔“

لیکن یاد رکھو کہ نورِ آفتاب و ماہتاب کے وہاں کچھ حقیقت نہیں، جہاں نورِ محبت و توحید جبار کی جلوہ ریزی ہو۔ مگر اس مثال نورِ محبت و توحید کو اس لیے محبت دی گئی کہ اس دنیا میں کوئی نور اس سے زیادہ منور نہیں اور ہماری چشم ظاہرِ آفتاب و ماہتاب کے نور سے آسمان دیکھ رہی ہے اور بس۔ اور نورِ توحید و محبت سے قیامِ قیامت تک کے تمام احوال دنیا میں منکشف ہوتے ہیں اور اس پر جملہ مشائخ طریقت مجتمع ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ جب بندہ قید و مقامات سے آزاد ہو جاتا ہے تو کیفیتِ مکدرہ سے خالی ہو کر مقامِ تغیر و تلون سے بھی آزادی حاصل کر لیتا ہے، اور اس میں تمام احوال محمود آجاتے ہیں اور وہ صفاتِ محمودہ کے ساتھ متصف ہوتا ہے مگر اس وقت وہ فی نفسہ قیدِ اوصاف سے بھی بیگانہ ہوتا ہے اور قیدِ صفات سے بالاتر ہو کر حمید و محمود کو نہیں دیکھتا، یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی لطائف کے مشاہدہ سے عجب و نحوث نہیں کرتا، مغرور نہیں ہوتا۔ بلکہ اُس کی کیفیتِ حالیہ ادراکِ عقل سے مخفی ہو جاتی ہے اور اس کا ظاہر و باطن شکوک و ظنون و اوہام کی دستبرد سے محفوظ بلکہ پاک ہوتا ہے۔ یہ اس لیے کہ اس کی کیفیتِ حضوری کو ذہاب یعنی حجاب و خفا نہ ہو اور اس کا وجود ظاہری علل و اسباب کا محتاج نہ رہے۔

لَاِنَّ الصِّفَا حُضُوْرًا بِلَا ذَهَابٍ وَّ وُجُوْدًا بِلَا اَسْبَابٍ.

”یعنی مقتضائے صفاء قلب یہ ہے کہ اسے زائل نہ ہونے والا حضور حاصل ہو اور

بلا احتیاج سبب سبب کچھ موجود ہو۔“

حاضریِ بارگاہِ بلا غیبت ہو اور ہر چیز بلا سبب و علت موجود۔ اس لیے کہ جو حضور غیبت سے مٹ جائے وہ حضور نہیں اور جو موجود سبب و علت سے موجود ہو، وہ موجود کوئی وجود نہیں رکھتا۔ جب اس درجہ پر صوفی پہنچ جاتا ہے تو دنیا و عقبیٰ میں فنا ہو جاتا ہے اور بظاہر جسمِ انسانی رکھ کر ربانی بن جاتا ہے۔ پھر اس کی نظر میں زرو جوہر اور کنکر و پتھر یکساں ہوتے ہیں اور جو کچھ اہل دنیا پر دشوار ہوتا ہے وہ سب اس پر آسان ہو جاتا ہے خواہ اتباعِ احکام ہو یا اور کچھ۔

چنانچہ حضرت حارثہ بن زید رضی اللہ عنہ دربار رسالت میں حاضر ہوئے۔ حضور ﷺ

نے فرمایا:

كَيْفَ أَصْبَحْتَ يَا حَارِثَةُ؟ (۱)

”اے ابن زید آج تم نے کیسی صبح کی؟“

قَالَ أَصْبَحْتُ مُؤْمِنًا بِاللَّهِ حَقًّا فَقَالَ أَنْظِرْ مَا تَقُولُ يَا حَارِثَةُ إِنَّ لِكُلِّ شَيْءٍ حَقِيقَةً فَمَا حَقِيقَةُ إِيمَانِكَ فَقَالَ عَزَلْتُ وَحَرَفْتُ نَفْسِي عَنِ الدُّنْيَا فَاسْتَوَى عِنْدِي حَجْرُهَا وَذَهَبُهَا وَفِضَّتُهَا وَمَدْرُهَا فَاسْهَرْتُ لَيْلِي وَأَظْمَأْتُ نَهَارِي حَتَّى صِرْتُ كَأَنِّي أَنْظُرُ إِلَى عَرْشِ رَبِّي بَارِزًا وَكَأَنِّي أَنْظُرُ إِلَى أَهْلِ الْجَنَّةِ يَتَزَاوَرُونَ فِيهَا وَكَأَنِّي أَنْظُرُ إِلَى أَهْلِ النَّارِ يَتَضَارَعُونَ وَفِي رِوَايَةٍ يَتَعَاوَرُونَ. الْحَدِيثُ

”حارثہ بن زید رضی اللہ عنہ نے عرض کی: حضور! میں نے آج سچا مومن ہونے کی حالت

میں صبح کی۔ حضور ﷺ نے فرمایا: حارثہ غور کر کیا کہہ رہے ہو؟ یاد رکھو ہر چیز کی ایک حقیقت ہوتی ہے اور ہر چیز پر ایک دلیل، تیرے اس دعویٰ کی کیا حقیقت ہے اور تیرے ایمان کی کیا دلیل؟ عرض کی: حضور! میں نے اپنی جان کو دنیا سے علیحدہ کر لیا اور اپنا منہ دنیا سے موڑ لیا، اب میری نظر میں دنیا کا پتھر، سونا، چاندی، کنکر، کوڑا سب یکساں ہے، اور جب میں دنیا و مافیہا سے آزاد ہو چکا تو مقام

۱۔ یہ اس حدیث کا جزو ہے جسے امام بزار اور ابن ابی شیبہ نے یوسف بن عطیہ کے طریق سے، انہوں نے حضرت ثابت سے، انہوں نے حضرت انس رضی اللہ عنہم سے روایت کیا ہے۔ مکمل حدیث یوں ہے:

بينما رسول الله ﷺ يمشي اذا استقبله شاب من الأنصار يقال له حارثة، فقال له النبي ﷺ كيف أصبحت يا حارثة؟ قال: أصبحت مؤمناً حقاً، فقال ﷺ: انظر ما تقول يا حارثة، إن لكلِّ حقَّ حقيقة، فما حقيقة إيمانك؟ فقال: عزلت نفسي عن الدنيا، فاستوى عندي حجرها وذهبها وفضتها ومدرها، فأسهرت ليلي وأظمأت نهارها، فأسهرت ليلي وأظمأت نهارها، حتى صرت كأنني أنظر إلى أهل الجنة يتزاورون فيها، وكأنني أنظر إلى أهل النار يتضارعون فيها، وفي رواية يتغامرون فيها، فقال ﷺ: عرفت فالزم، قالها ثلاثاً.

حوالہ کے لیے دیکھئے:

مجمع الزوائد للهيثمي ۵/۱، مصنف ابن أبي شيبة ۴۲/۱، مسند البزار (۳۲) كتاب

اللمع للسراج الطوسي (ص: ۱۰۲) احياء العلوم للغزالي ۳/۱۵۷، أسد الغابة ۱/۳۵۵

(ترجمة أبي عبد الله حارثة بن النعمان الأنصاري رضي الله عنه)

اقصی یعنی درجہ انتہائی پر پہنچ گیا۔ حتیٰ کہ آج میں نے انہار کی شکم پری اور شب بیداری میں مجھے (بہ تصدق سرکار یہ منصب حاصل ہے کہ) گویا میں رب العلیٰ کے عرش بریں کا مشاہدہ بلا حجاب کر رہا ہوں اور گویا کہ میں اہل جنت کو دیکھ رہا ہوں اور وہ سیر و تفریح میں ہیں اور گویا کہ میں جہنمیوں کو دیکھ رہا ہوں کہ وہ تڑپ رہے ہیں۔ ایک روایت میں ہے کہ آنکھ پھاڑ پھاڑ کر جہنم میں دیکھ رہے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”عَرَفْتُ“ (جان تو لیا تو نے) مگر ”فَالزِّم“ (اب اس منصب کی محافظت کر)۔ اس لیے کہ بس اس کے سوا اور عرفان (مخلوق کو حاصل نہیں) ولیوں کو اسی منصب و نام سے پکارتے ہیں۔

کسی بزرگ نے مشائخ کرام سے فرمایا:

مَنْ صَفَاهُ الْحُبُّ فَهُوَ صَافٍ وَمَنْ صَفَاهُ الْحَبِيبُ فَهُوَ صُوفِيٌّ.

”جو محبت کے ذریعہ صاف ہوا وہ صافی ہوا، اور جو محبت حبیب میں محو و مستغرق

ہوا وہ غیر محبوب سے بری ہو کر صوفی ہو گیا۔“

اور بمقتضاء لغت اس اسم صوفی کا مشتق ہونا درست نہیں۔ اس لیے کہ لفظ ”صوفی“ معنی لغوی سے وراء الوزی ہے۔ اس لیے کہ اگر اس کو بمناسبت معنی لغوی دیکھا جائے گا تو اسے جنس ماننا پڑے گا، تاکہ وہ جنس کسی جنس سے مشتق ہو سکے۔ کیونکہ ہر مشتق کو اپنی مبداء اشتقاق سے مجانست لازمی ہے اور لفظ ”صوفی“ جس معنی سے وابستہ ہے وہ ہے جو صافی و مصطفیٰ ہے اور جس قدر مبادی اشتقاق ہیں وہ یقیناً ضد صفا ہیں۔ لہذا ضد سے ضد کا اشتقاق صحیح نہیں، تو اس کے معنی اظہر من الشمس ہو گئے کہ اہل تصوف کے نزدیک تعریف صوفی محتاج تعریف نہیں اور اس کی تشریح کی حاجت نہیں:

لَاِنَّ الصُّوفِيَّ مَمْنُوعٌ عَنِ الْعِبَارَةِ وَالْاِشَارَةِ.

”اس لیے کہ صوفی عبارت و اشارت سے روکا ہوا ہے۔“

تو جب صوفی زبانی تعریفات و تعبیرات و اشارات سے آزاد ہوا تو سب جہاں اس کے لیے معنی اور تعبیر چھانٹا کرے اور کوئی اس کی حقیقت سمجھے یا نہ سمجھے، اسم صوفی کو ان تعبیرات سے کچھ خطرہ نہیں۔ تو بحالت حصول معنی اہل کمال نے انہیں صوفی کہا اور جو اس کمال کا طالب اور اہل کمال سے وابستہ ہیں، ان کو متصوف اور تصوف باب تفعّل ہے اور یہ باب مقتضی تکلف ہے اور تصوف میں تکلف و مجاہدہ اس کی جز یعنی اصل کی ایک فرع اور شاخ ہے اور مقتضاء لغت و معنی سے صوفی کے معنی حقیقی کا فرق ظاہر بلکہ اظہر ہے۔

الصِّفَاءُ وَلاَ يَةٌ وَلَهَا آيَةٌ وَرِوَايَةٌ وَالتَّصَوُّفُ حِكَايَةٌ لِلصِّفَاءِ بِلا

ہِکَايَةُ

”صفاء ولایت کا نام ہے اور اس کے لیے علامت اور روایت کی ضرورت ہے

اور تصوف بلاشبہ حصول صفا کے لیے ایک حکایت ہے۔“

جس میں شائبہ شکایت نہیں ہوتا تو صفاء کے روشن معنی ظاہر ہو گئے اور تصوف کا محض حکایت ہونا واضح ہو گیا۔ تو درجہ تصوف میں جو لوگ ہیں ان کی تین قسم ہیں: ایک صوفی، دوسرا متصوف، تیسرا مستصوف۔ صوفی وہ ہے جو اپنے وجود سے فانی ہو کر باقی بحق ہو گیا۔ قید مزاج و طبائع سے آزاد ہو کر حقیقت حقائق کے ساتھ مل گیا۔ متصوف وہ ہے جو اس درجہ کے حاصل کرنے کی آرزو میں تکلف و مشقت و مجاہدہ کر رہا ہے، اور صوفی بننے کا خواہش مند ہے اور صوفیائے کرام کے رسم و رواج کی پیروی میں اپنی اصلاح کرتا ہے، اور مستصوف وہ ہے جو مال و منال دنیاوی حاصل کرنے کی غرض سے صوفیائے کرام کے اعمال و افعال و حرکات کی نقل کرتا ہے۔ صوفیاء کے اقوال کہتا پھرتا ہے مگر خود محض بے خبر ہے اور کچھ نہیں جانتا۔ چنانچہ ایسے شخص ہی کے حق میں مشائخ کرام نے فرمایا:

الْمُسْتَصَوِّفُ عِنْدَ الصُّوفِيَّةِ كَالذَّبَابِ وَعِنْدَ غَيْرِهِمْ كَالذِّئَابِ .

”مستصوف صوفیائے کرام کے نزدیک ایک ذلیل مکھی ہے، (جو کچھ کرتا ہے

وہ محض لغو اور فضول ہے۔) اور عوام کے حق میں مستصوف مثل بھیڑیے کے

ہے (یا بچو کی طرح، وہ جو کچھ کرتا ہے سب بیکار ہے۔)“

اس لیے کہ وہ جو کچھ کرتا ہے اس سے اس کی مراد تھوڑے سے نکلے کا حاصل کرنا ہے۔ تو

خلاصہ یہ نکلا کہ صوفی صاحب وصول ہوتا ہے اور متصوف صاحب اصول اور مستصوف صاحب فضول۔

جو صوفی ہے اسے اصل کشف و وصل محبوب نصیب ہو گیا اور وہ ہمیشہ رسم و لطائف میں مستقیم رہا، اور

جس کو درجہ فضول ملا وہ سب سے پیچھے رہ گیا اور رسم کے دروازے پر پڑا رہا اور اس پر حجاب معنی

اس قدر پڑے کہ وہ محبوب ہو کر وصل و اصل دونوں سے محروم رہ گیا۔ اس حال کو مشائخ کرام نے

اس قدر رموز میں بیان فرمایا ہے کہ سب کا بیان کرنا ممکن نہیں تاہم بعض اُن کی رموزات اس کتاب

میں ہم بیان کریں گے تاکہ ناظرین کو کافی فائدہ پہنچے۔ ان شاء اللہ

فصل:

حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

الصُّوفِيُّ إِذَا نَطَقَ بَانَ نَطْقَهُ مِنَ الْحَقَائِقِ وَإِنْ سَكَتَ نَطَقَتْ عَنْهُ

الْجَوَارِحُ بِقَطْعِ الْعَلَائِقِ.

”صوفی وہ ہے کہ جب کلام کرے تو اس کا کلام اس کے حال کی حقیقت کا مظہر ہو اور کوئی ایسی بات نہ کہے جو اس میں نہ ہو اور جب وہ خاموش رہے تو اس کی خاموشی اس کے حال کی ترجمان ہو اور علائق دنیاوی سے بے تعلقیت کا ثبوت اس کے اعضاء سے واضح ہو۔“

گویا گفتارِ صوفی اس کے حسب حال ہو اور کردارِ صوفی میں شانِ تجرید اس قدر ہو کہ قطع دنیا واضح نظر آئے۔ غرضیکہ اگر وہ کلام کرے تو ایسا کہ سب اس پر صحیح اترے اور سچ نظر آئے اور خاموش رہے تو خاموشی سے اس کے فکر کی ادائیں نظر آئیں۔ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

التَّصَوُّفُ نَعْتُ أَقِيمِ الْعَبْدِ فِيهِ قِيلَ نَعْتُ لِلْعَبْدِ أَمْ لِلْحَقِّ فَقَالَ نَعْتُ
الْحَقِّ حَقِيقَةً وَ نَعْتُ الْعَبْدِ رَسْمًا.

”تصوف ایک ایسی صفت ہے کہ بندہ اس صفت کے ساتھ بندہ ٹھہرتا ہے، بعض نے کہا کہ صفت اللہ تعالیٰ کے لیے ہے یا بندہ کے لیے؟ تو فرمایا بمعنی حقیقی تو ہر صفت مخصوص بذات باری تعالیٰ ہے لیکن رسماً صفت بطور مجاز، بندہ کے لیے ہوتی ہے۔“

یعنی حقیقتِ تصوف یہ ہے کہ بندہ کی صفت کو فنا کر دے اور صفاتِ عبد کا فنا ہونا صفتِ حقہ باقی رہنے کو ہے اور یہی صفتِ حق ہے اور رسمِ تصوف دواماً بندہ سے مجاہدات و ریاضات کا تقاضا کرتی ہے اور فنائے صفت استقامت و استمرار اس مجاہدہ پر رکھنا یہ بندہ کی شان ہے اور اس مضمون کو بالفاظ دیگر یوں بھی ادا کر سکتے ہیں کہ حقیقتِ توحید میں بندہ کو کسی صفت سے متصف کرنا صحیح نہیں اس لیے کہ صفاتِ عبد حق عبد میں دوامی نہیں اور بندہ کی صفت کی حقیقت محض رسم ہے۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں اور واضح طور پر روشن ہے کہ صفتِ عبد باقی نہیں رہتی بلکہ بندہ میں کسی صفت کا آنا یہ ایک فعل ہے اس قدیم الصفات کا۔ اور ذاتِ قدیم الصفات کے جتنے افعال ہیں وہ سب اس کی ملک اور تحت قدرت ہیں، تو درحقیقت جو صفت بندہ میں ہوگی وہ صفت واجب تعالیٰ شانہ ماننی پڑے گی۔ اسے اور وضاحت سے یوں سمجھا جائے گا کہ جب اللہ تعالیٰ بندہ کو روزہ رکھنے کا حکم دیتا ہے تو بندہ کو اس حکم کی تعمیل کے وقت اسم ”صائم“ عطا ہو جاتا ہے۔ تو روزہ رکھنا بطریق رسم بندہ کی طرف منسوب ہے ورنہ درحقیقت یہ صوم بھی از جانب الہی ہے۔ جیسا کہ حدیثِ قدسی میں حضور ﷺ

کو جناب باری تعالیٰ شانہ نے فرمایا:

الصَّوْمُ لِيْ وَأَنَا أُجْزِي بِهِ . (۱)

”روزہ میرے لیے ہے اور اس کی جزا میں دوں گا۔“

یعنی وہ روزہ جو بندہ نے رکھا، وہ میرے حکم سے رکھا اور اس کے تمام کام اُس کے ملک ہیں۔ مگر یہ اضافتِ ملک بندہ کی طرف جو ہے درحقیقت بطریق رسم و مجاز ہے نہ کہ بطریق حقیقت۔ حضرت ابوالحسن نوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

التَّصَوُّفُ تَرْكُ كُلِّ حَظٍّ لِلنَّفْسِ .

”تصوف نام ہے تمام حظوظِ نفسانیہ کا ترک۔“

اور یہ دو طرح ہوتا ہے: ایک رسمی طور پر، دوسرے حقیقی صورت میں۔ یہ بھی درحقیقت عجیب و غریب شان ہے اس لیے کہ اگر بندہ نے خوشی سے ترکِ حظِ نفس کیا تو فی نفسہ ترکِ حظ بھی تو ایک حظ ہے اور یہ خالص رسم ہے اور اگر خوشی نے بندہ کو ترک کر دیا اور حظِ نفس خود علیحدہ ہو گیا تو یہ فناء حظ ہوگا اور اس معنی کا تعلق درحقیقت مشاہدہ سے ہے۔ اس لیے کہ یہ امر واضح ہے کہ ترکِ حظ یعنی خوشی اور لذاتِ نفسانیہ کا ترک کر دینا یہ بندہ کا فعل ہے اور لذاتِ نفسانیہ اور حظوظِ جسمانیہ کا فنا ہونا من جانب اللہ ہے اور یہ امر مسلمات سے ہے کہ فعل عبد محض رسم و مجاز ہے اور فعل حق حقیقت ذات، اور حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ کا وہ قول جو ہم پہلے بیان کر چکے ہیں وہ بھی اس امر کو ظاہر کرتا ہے۔ حضرت ابوالحسن نوریؒ کہتے ہیں:

الصُّوْفِيَّةُ هُمْ الَّذِيْنَ صَفَّتْ أَرْوَاحُهُمْ فَصَارُوا فِي الصَّفِّ الْأَوَّلِ بَيْنَ

يَدَيِ الْحَقِّ .

”صوفی وہ ہیں کہ ان کی روہیں کدورتِ بشریت سے مجلا ہو چکی ہوں اور تمام

آفاتِ نفسانیہ سے پاک ہو کر حرص و ہوائے شہوانیہ سے خلاصی پا کر دربارِ الہی میں

صفِ اوّل کے اندر درجہِ تقرب پاتی ہیں۔ ماسوائے اللہ سے بعید ہو چکی ہیں۔“

اور حضرت ابوالحسن نوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

الصُّوْفِي الَّذِي لَا يَمْلِكُ وَلَا يُمْلِكُ .

۱۔ اسے امام مسلم نے اپنی ”صحیح“ ۳/۱۵۷ (کتاب الصیام) میں ان الفاظ کے ساتھ ذکر کیا ہے:

كُلُّ عَمَلٍ ابْنِ آدَمَ لَهُ إِلَّا الصِّيَامَ فَإِنَّهُ لِيْ وَأَنَا أُجْزِي بِهِ . مزید حوالہ کے لیے ملاحظہ کریں۔ الجامع

الصغیر للسيوطی ۲/۸۰، شرح المواہب اللدنیة للزرقلانی ۸/۹۸، إحياء العلوم ۱/۱۶۱،

شرح صحیح مسلم للنووی ۸/۲۹،

”صوفی وہ ہے جو نہ کسی کا مالک ہو، نہ کسی کی ملک۔“

یعنی صوفی وہ ہے جس کی قید میں کچھ نہ ہو اور وہ خود کسی کی قید میں مقید نہ ہو۔ اور یہ تعریف عین فنا کی ہے، اس لیے کہ فانی فی الصفت نہ کسی شے کا مالک بالذات ہوتا ہے نہ مملوک غیر ذات۔ اس لیے کہ ملک اس کی صحیح ہوتی ہے، جو خود موجود ہو اور مملوکیت کا بھی وہی اہل ہے، جو موجود ہو۔ تو مسئلہ واضح ہو گیا کہ صوفی متاع دنیا و آخرت میں سے خود کسی چیز کا مالک نہیں ہوتا اور آپ نفس و حرص و حظ اور خواہشات کے ملک میں نہیں رہتا۔ گویا اپنی مشیت اور ارادہ کو ماسویٰ اللہ سے منقطع کر لیتا ہے تاکہ غیر اس کی اطاعت و بندگی کا طمع نہ کر سکے اور یہ قول بالخصوص اس گروہ صوفیاء کے بہت مناسب حال ہے جو فناء کل کے قائل ہیں اور میں ان کے خیالات کو اس کتاب میں نقل کروں گا تاکہ تمہیں معلوم ہو جائے اِنْ شَاءَ اللّٰهُ۔ اللہ تمہیں اپنا برگزیدہ بنائے۔

حضرت علی بن عثمان الجلابی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ”التَّصَوُّفُ حَقِيقَةٌ لَا رَسْمَ لَهَا“
”تصوف ایسی حقیقت کا نام ہے جس کی تعریف رسمی نہیں ہو سکتی۔“

اس لیے کہ رسم مخلوقات کا وہ حصہ ہے جو معاملات میں مستعمل ہے اور تصوف حقیقۃً خاصۃً الہی ہے اور بات بھی یہی ہے کیوں کہ جب تصوف مخلوقات سے اعراض کرنے کو کہا جاتا ہے تو لامحالہ اس کے لیے رسم و رواج مخلوقی سے علیحدہ ہونا ضروری ہے۔

حضرت ابو عمر دمشقی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: التَّصَوُّفُ رُوْبِيَّةُ الْكُوْنِ بِعَيْنِ النُّقْصِ
بَلْ غَضُّ الطَّرْفِ عَنِ الْكُوْنِ۔ یعنی تصوف یہ ہے کہ عالم کون کو بظہر نقص و حدوث دیکھے اور یہ بھی بقا صفت کی دلیل ہے، بلکہ عالم سے آنکھ کو بند کر لے تاکہ یہ دلیل فناء صفت کی مکمل ہو جائے۔ اس لیے کہ جب تک نظر عالم کون کی طرف رہے گی خواہ ناقص ہو خواہ کامل۔ تو صفت باقی رہے گی مگر جب کون ہی نہ رہے گا تو نظر بھی اس پر نہ رہے گی، تو صفت کا فانی ہونا متحقق ہو جائے گا۔

غرضیکہ جب صوفی اپنی ذات سے نابینا ہو جاتا ہے، ذات واجب کے ساتھ بینا بن جاتا ہے اور جبکہ صوفی ہو کر طالب کون و فساد ہوا تو اس کے تمام کاروبار کا تعلق اسی کی ذات کے ساتھ رہے گا۔ تو پھر اسے اپنے سوا کسی اور کے ساتھ کوئی راستہ نہیں مل سکتا، تو ایک وہ ہوا جو خود کو دیکھتا ہے مگر ناقص دیکھتا ہے اور ایک وہ ہے جو اپنی آنکھیں ماسویٰ اللہ سے بلند کر کے کسی کو نہیں دیکھتا۔ تو جو دیکھ رہا ہے اگرچہ ناقص ہی دیکھے مگر ابھی اس کی چشم بینا پر حجاب دوئی ہے۔ اور ایک وہ ہے جو دیکھتا ہے تو اپنی بینائی کی وجہ سے محبوب ہو جاتا ہے اور ایک وہ جو ماسویٰ اللہ کو دیکھتا ہی نہیں، وہ اپنی چشم حق میں سے محبوب نہیں ہوتا اور یہی اصل قوت ہے جسے متصوفہ اور ارباب معانی اعلیٰ مقام بتاتے

ہیں، بس اب اس سے زائد شرح کرنا اس مقام کے ساتھ ناموزوں ہے۔

حضرت ابو بکر شبلی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

التَّصَوُّفُ شِرْكٌ لِأَنَّهُ صِيَانَةُ الْقَلْبِ عَنِ رُؤْيَةِ الْغَيْرِ وَلَا غَيْرَ .

”تصوف شرک طریقت ہے، اس لیے کہ متصوف اپنے دل کو محفوظ کرتا ہے

غیر کے دیکھنے سے، اور صوفی کی نظر میں وجود غیر معدوم ہے۔“

یعنی جب صوفی پر وحدۃ ذات کا پرتو کماھٹ پڑ جائے تو مقام توحید میں رویت غیر کو شرک

طریقت کہا گیا، اس لیے کہ جب قلب صوفی میں وجود غیر کی قدر و منزلت ہی نہیں تو اس سے

حفاظت کرنا یا اس کے وہم میں ذکر غیر آنا ہی محال ہے۔

حضرت ابوالحسن حصری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

التَّصَوُّفُ صَفَاءُ السِّرِّ مِنَ كُدُورَةِ الْمُخَالَفَةِ .

”تصوف نام ہے اپنے ضمیر کو مخالفت حق سے محفوظ رکھنے اور اس کی جلاء و

نورانیت کو کدورتِ اوہام سے بچانے کا۔“

اس لیے کہ محبت و وداد نام موافقت کا ہے اور موافقت ضد مخالفت ہے اور دوست کو تمام

عالم میں سوا اطاعت فرمان دوست کے کچھ محبوب ہی نہیں۔ تو جب دوست کی مراد وہی ہوئی جو

دوست کی مراد تھی تو پھر مخالفت وہاں کیونکر ممکن ہو سکتی ہے اور جب ممکن ہی نہیں تو اس کا وجود کہاں؟

حضرت ابو جعفر محمد بن علی بن الحسین ابن علی بن ابی طالب رحمہم اللہ فرماتے ہیں:

التَّصَوُّفُ خُلُقٌ فَمَنْ زَادَ عَلَيْكَ فِي الْخُلُقِ زَادَ عَلَيْكَ فِي

التَّصَوُّفِ .

”تصوف ایک نیک خصلت ہے، جو زیادہ نیک خصلت ہے وہ اعلیٰ صوفی ہے۔“

اور نیک خصلت دو قسم پر ہے:

ایک خصلت نیک بحق۔ دوسری خصلت نیک بخلق۔ نیک خوب حق وہ ہے جو رب جل

مجده کی رضا و قضا میں راضی رہے اور نیک خوب بخلق وہ ہے جو اللہ کے لیے مخلوق کا بار خدمت اپنے

سر لے اور یہ دونوں خصلتیں درحقیقت طالب کی طرف ہی ہوتی ہیں۔ یعنی ان خصلتوں کا محتاج

طالب حق ہی ہو سکتا ہے۔ اس لیے وہ ذات بے نیاز متصف باستغنا ہے اور رضا و سخط خوشی و غصہ کے

بار اٹھانے سے مبرا و بے نیاز ہے۔ یہ ہر دو صفت درحقیقت نظارۃ وحدانیت میں موقوف و مربوط

ہیں۔ حضرت ابو محمد ترغش رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

الصُّوفِيُّ لَا يَسْتَبِقُ هِمَّتَهُ خَطْوَتَهُ الْبَتَّةَ.

”صوفی وہ ہے کہ اس کا خطرہ قلبی بھی اس کے قدم ہمت سے قطعاً نہ بڑھ سکے۔“

ہمیشہ اس کی ہمت، اس کا خطرہ، اس کا ارادہ سب یکساں ہو۔ یعنی اس کا جسم جہاں ہو دل بھی وہاں ہو۔ اور جس مقام پر دل ہو اس جگہ اس کا تن ہو، جہاں اس کا قدم ہو وہاں ہی اس کا قول ہو، جہاں اس کا قول ہو، وہاں ہی اس کا قدم ہو، اور یہ بلاغیہ بیت نشانِ حضوری ہے، برخلاف ان کے جو کہتے ہیں کہ صوفی اپنے وجود سے غائب ہو کر ذاتِ سرمدی کے ساتھ حاضر ہوتا ہے۔ یہ کچھ نہیں بلکہ حاضر بحق بھی ہو اور حاضر بخود بھی۔ اور یہی حقیقی جمع الجمع ہے کیونکہ جب تک رویت ذاتِ اپنی ذات سے ہو، اس وقت تک وہ اپنے سے غائب و فناء نہیں اور جب یہ رویت اٹھ گئی تو بغیر غیبِ بیت کے حضوری ہوئی۔ اس اجمال کی تفصیل میں حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول خوب ہے:

الصُّوفِيُّ لَا يَرَى فِي الدَّارَيْنِ مَعَ اللَّهِ غَيْرَ اللَّهِ.

”صوفی وہ ہے جو دونوں جہان میں سوائے ذاتِ قدیم کے کچھ نہیں دیکھتا۔“

تو چونکہ بندہ غیر ہے، تو غیر کونہ دیکھنا اپنے آپ کونہ دیکھنا ہوا۔ گویا حالتِ نفی و اثبات میں صوفی اپنے آپ سے بالکل فارغ ہوتا ہے۔

حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

التَّصَوُّفُ مَبْنِيٌّ عَلَى ثَمَانِ خِصَالٍ : السَّخَاءُ وَالرِّضَاءُ وَالصَّبْرُ
وَالْإِشَارَةُ وَالغُرْبَةُ وَتَبَسُّ الصُّوفِ وَالسِّيَاحَةُ وَالْفَقْرُ أَمَّا السَّخَاءُ
فَلِإِبْرَاهِيمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ وَأَمَّا الرِّضَاءُ فَلِإِسْحَاقَ عَلَيْهِ السَّلَامُ وَأَمَّا
الصَّبْرُ فَلِإِيُوبَ عَلَيْهِ السَّلَامُ وَأَمَّا الْإِشَارَةُ فَلِزَكَرِيَّا عَلَيْهِ السَّلَامُ
وَأَمَّا الْغُرْبَةُ فَلِيَحْيَى عَلَيْهِ السَّلَامُ وَأَمَّا تَبَسُّ الصُّوفِ فَلِمُوسَى عَلَيْهِ
السَّلَامُ وَأَمَّا السِّيَاحَةُ فَلِعِيسَى عَلَيْهِ السَّلَامُ وَأَمَّا الْفَقْرُ فَلِمُحَمَّدٍ
نَ لِلْمُصْطَفَى ﷺ وَعَلَيْهِمْ أَجْمَعِينَ.

تصوف آٹھ خصلتوں پر مبنی ہے: یعنی آٹھ پیغمبرانِ اول العزم کی اقتداء سے صوفی، صوفی

بنتا ہے:

(۱) سخاوت ابراہیم علیہ السلام سے حاصل کرے کہ رضائے محبوب میں اپنے لختِ جگر کو فدا کر دیا۔

(۲) اور رضا اسحق علیہ السلام ☆ کی اقتداء میں کہ رضاءِ مولا پر اس درجہ راضی ہو کہ جان کی پرواہ نہ کرے۔

(۳) اور صبر ایوب علیہ السلام کی اقتداء میں کہ کیڑوں کے ساتھ بھی اگر امتحان ہو تو بخوشی برداشت کرے۔

(۴) اور اشارہ زکریا علیہ السلام یہ ہے کہ انہیں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿أَلَا تَتَكَلَّمُ النَّاسُ ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ إِلَّا رَمْزًا﴾ (۱) (تم لوگوں سے تین دن تک نہ بول سکو گے مگر اشارہ سے) اور اسی سورۃ میں فرمایا: ﴿إِذْ نَادَى رَبَّهُ نِدَاءً خَفِيًّا﴾ (۲) (جبکہ اس نے اپنے رب کو پکارا خفیہ طور سے)۔ تو صوفی کو بھی اس اشارہ کی اقتداء کرنا ہوتی ہے۔

(۵) اور غربت میں یحییٰ علیہ السلام کی اقتداء کرے کہ وہ اپنے وطن میں اپنے آپ کو مسافر سمجھتے تھے اور رشتہ دار، عزیز و اقارب میں رہ کر سب سے بیگانہ تھے۔

(۶) اور سیاحت میں عیسیٰ علیہ السلام کی اقتداء ہو کہ آپ اپنے سفر میں اس قدر مجرد تھے کہ سوائے ایک پیالہ اور ایک کنگھی کے ہمراہ کچھ نہ رکھا۔ حتیٰ کہ ایک شخص کو دیکھا کہ وہ دونوں ہاتھوں سے پانی پی رہا ہے تو اپنے پیالے کو پھینک دیا، اور جب ایک شخص کو دیکھا کہ بالوں میں انگلیوں سے خلال کر کے شانہ کا کام لے رہا ہے تو کنگھی بھی ضائع فرمادی۔

(۷) اور لبسِ صوف میں اتباعِ سیدنا موسیٰ علیہ السلام ہو کہ آپ کا لباس ہمیشہ پشمینہ کا رہتا تھا۔

(۸) اور فقر میں سید الانبیاء حبیب کبریٰ محمد رسول اللہ ﷺ کی اقتداء کی جائے کہ با آنکہ حق تعالیٰ شانہ نے خزانہ ہائے روئے زمین کی کنجی حضور ﷺ کی خدمت میں بھیجی اور فرمایا اے محبوب! اپنی جان پاک پر محنت و مشقت نہ ڈالے اور خزانوں سے جس قدر چاہیے خرچ فرما کر اپنی شانِ مجلہ دو بالا کیجئے۔ حضور سید یوم النشور ﷺ نے بارگاہِ جل مجدہ میں عرض کی کہ الہی! میں یہ نہیں چاہتا بلکہ یہ چاہتا ہوں کہ ایک روز کھاؤں اور ایک روز بھوکا رہوں، اور یہ اصول معاملہ تصوف میں انتہائی بہترین خصلت ہے۔

حضرت حصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

الصُّوفِيُّ لَا يُوجَدُ بَعْدَ عَدَمِهِ وَلَا يَعْدِمُ بَعْدَ وُجُودِهِ .

☆ اسحق علیہ السلام سے یہاں مراد شاید اسماعیل علیہ السلام ہوں

۲۔ سورۃ مریم: ۳

۱۔ سورۃ آل عمران: ۴۱

”صوفی وہ ہے کہ اس کی ہستی کو نیستی نہ ہو اور اس کی نیستی کو ہستی نہ ملے۔“
یعنی جو کچھ وہ پائے وہ ہرگز گم نہ ہو اور جس چیز کو اس نے گم کر دیا وہ کبھی وجود میں نہ آئے
اور بالفاظ دیگر اس کے یہ معنی ہو سکتے ہیں کہ صوفی وہ ہے جو ملی ہوئی چیز کو ملی ہوئی نہ جانے اور جو نہ
ملی ہوئی چیز ہو، وہ اسے ملنے والی نہ ہو یا اس کے پاس وہ اثبات ہو جس کی نفی نہیں اور وہ نفی ہو جس کا
اثبات نہ ہو۔

اس تمام مضمون کا خلاصہ یہ ہے کہ صوفی اس درجہ تک آجائے کہ حالتِ بشریہ سے کلیۃً
اُسے سقوط حاصل ہو کر شواہدِ جسمانی ذاتِ حق کے ساتھ معدوم و فوت ہو جائیں اور اس کی نسبت
کلیۃً منقطع ہو جائے تاکہ سر بشریت اس کے حق میں ظاہر ہو جائے تاکہ اس کی تفریق اور اختلاف
اس کے عین میں خود جمع ہو جائیں اور پھر خود بخود قیام پائے اور یہ صورت دو پیغمبروں میں ظاہر کی
جاسکتی ہے۔ ایک حضرت موسیٰ علیہ السلام میں ان کے وجودِ پاک میں عدم نہ تھا۔ حتیٰ کہ آپ نے
عرض کیا:

﴿رَبِّ اشْرَحْ لِي صَدْرِي﴾ (۱)

”اے میرے رب میرے لیے میرا سینہ کھول دے۔“

اور دوسرے ہمارے سرور عالم ﷺ کہ آپ کے عدم میں وجود ہی نہ تھا یہاں تک کہ
فرمایا: ﴿الَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ﴾ (۲) (کیا نہیں کھول دیا اے محبوب! ہم نے تیرا سینہ
پاک) ایک نے تو آرائش چاہی اور زینت طلب کی، دوسری ہستی پاک کو خود آراستہ کیا اور آراستہ کر
کے اسے اتنا چاہا کہ محبوب بنا لیا۔ صلی اللہ علیہ وسلم

حضرت علی بن بندار الصوفی نیشاپوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

التَّصَوُّفُ اسْقَاطُ الرُّؤْيَةِ لِلْحَقِّ ظَاهِرًا وَبَاطِنًا.

”تصوف یہ ہے کہ صاحبِ تصوف اپنے کو ظاہر اور باطن کسی حالت میں نہ

دیکھے اور دیکھے تو کلیۃً ذاتِ والا صفات کو دیکھے۔“

کیونکہ اگر ظاہر دیکھے تو ظاہر میں نشانِ توفیق پائے گا اور اگر معاملاتِ ظاہر کو دیکھے گا تو
اپنے پہلو میں پریشہ کے برابر توفیقِ حق نہ جانے دے گا۔ تو لامحالہ رویتِ ظاہری کو ترک کرے گا پھر
اگر باطن پر نشانِ تائیدِ حق پائے گا تو معاملاتِ باطنی دیکھنے سے پہلو میں تائیدِ حق ذرہ بھر نہ ملے گی۔
تو ترکِ باطن کے لیے کہے گا۔ لہذا ظاہر باطن کی رویت کو ترک کر کے ذاتِ حق کو دیکھے گا جب

صرف ذات حق کو دیکھے گا تو خود کو ہرگز نہ دیکھے گا۔

حضرت محمد بن احمد مقری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

التَّصَوُّفُ اسْتِقَامَةُ الْأَخْوَالِ مَعَ الْحَقِّ .

”تصوف وہ استقامت حال ہے جو ذات حق کے ساتھ ہو۔“

یعنی صوفی کی کیفیتِ حالیہ اس کے سر اور ضمیر کے موافق ہونی چاہئے۔ اس کے اسرار اسے کبھی میں نہیں جانے دیتے۔ گویا جس کا دل صید محول حال ہے اس کی کیفیتِ حالیہ اسے محور استقامت سے نہیں کرنے دیتی اور قرب حق سے نہیں روکتی۔

فصل

جو کچھ معاملات تصوف میں بزرگوں نے فرمایا ہے، اس میں سے حضرت ابو حفص حداد

نیشاپوری کا یہ ارشاد ہے:

التَّصَوُّفُ كُلُّهُ آدَابٌ، لِكُلِّ وَقْتٍ آدَابٌ وَ لِكُلِّ مَقَامٍ آدَابٌ وَ لِكُلِّ حَالٍ آدَابٌ، فَمَنْ لَزِمَ آدَابَ الْأَوْقَاتِ بَلَغَ مَبْلَغَ الرِّجَالِ وَمَنْ ضَيَّعَ الْأَدَابَ فَهُوَ بَعِيدٌ مِّنْ حَيْثُ يَظُنُّ الْقُرْبَ وَمَرْدُودٌ مِّنْ حَيْثُ يَظُنُّ الْقَبُولَ .

”تصوف ایک ایسا مجموعہ ادب کا نام ہے جو ہر وقت اور ہر مقام اور ہر حال میں ایک خاص ادب کی راہنمائی کرتا ہے۔ جس نے اس راہ میں ملازمتِ آداب و اوقات کر لی، مردانِ خدا کے درجہ کو پہنچ گیا اور جس نے اس راہ کی رسم ادب ترک کر دی اور آداب ضائع کر دیئے وہ ان درجہ والوں سے بعید ہو گیا اور گمان کرتا رہا کہ میں ان کے قریب ہوں اور وہ ان کی بارگاہ سے مردود ہو گیا بانکہ اسے یہی خیال رہا کہ میں قرب کے درجہ پر ہوں۔“

بموجب ارشاد حضرت ابوالحسن نوری رحمۃ اللہ علیہ آپ فرماتے ہیں:

لَيْسَ التَّصَوُّفُ رُسُومًا وَ لَا عُلُومًا وَ لَكِنَّهُ أَخْلَاقٌ .

”تصوف رسوم و علم نہیں ہے لیکن یہ ایک خاص خصلت ہے۔“

یعنی اگر تصوف رسمی چیز ہوتی تو مجاہدہ و ریاضت سے حاصل ہو جاتا اور اگر یہ علم ہوتا تو محض تعلیم و تعلم سے حاصل ہو جاتا۔ تو ثابت ہوا کہ تصوف ایک خصلتِ خاص کا نام ہے اور جب تک یہ خصلت خود اپنے اندر نہ پیدا کرے اس وقت تک وہ حاصل نہیں ہوتا۔

فرقِ رسم و خصلت:

اور رسم و خصلت میں یہ فرق ہے کہ رسم وہ فعل ہے جو تکلف انسان کر سکتا ہے اور یہ امر واضح ہے کہ بظاہر انسان جو کچھ کرتا ہے اگر باطن اس کے موافق نہیں تو وہ فعل ظاہر محض بے معنی اور فضول ہے اور خصلت اس خاص فعل کو کہتے ہیں جو بغیر بناوٹ اور تکلف کے صادر ہو اور اس کے تمام اسباب ظاہری اس کے باطنی کے موافق ہوں اور زبانی دعاوی محمود سے وہ بالکل خالی اور پاک ہو۔ حضرت مرتضیٰ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

التَّصَوُّفُ حُسْنُ الْخُلُقِ .

”تصوف نیک خصلت کو کہتے ہیں۔“

یہ خصائل حمیدہ تین قسم کے ہیں: ایک وہ کہ اوامر الہیہ ادا کرنے میں کسی قسم کا ریا اور دکھاوانہ ہو اور اپنے رب کی رضا جوئی میں اداء حق فرائض ہوں۔

دوسری یہ کہ عوام کے ساتھ نیک خصلت ہو۔ بڑوں کی عزت، چھوٹوں پر رحم اور ہر معاملہ میں انصاف پسند ہو اور اس میں کسی قسم کا معاوضہ حاصل کرنا مطلوب نہ ہو۔

تیسری یہ کہ اپنے کو ہوا و شیطانی کی متابعت سے مجتنب رکھے، اور ہر قسم کی حرص و خواہش نفسانی سے بچے۔

جو ان تینوں تعریفوں کے ساتھ اپنے کو متصف کر لے وہ نیک خصلت انسانوں میں شمار ہو گا اور وہ اس درجہ کو حاصل کرنے والا ہو سکتا ہے جو ہم نے اوّل بیان فرمایا۔ اس کی تائید میں ایک واقعہ ہے۔ ایک صحابی نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے عرض کیا: ہمیں اخلاق محمد رسول اللہ ﷺ کے متعلق کچھ سنائیں۔ آپ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: قرآن میں دیکھ لے۔ جو اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب کے اخلاق کی خبر دی، اور فرمایا ہے:

﴿خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِينَ﴾ (۱)

”اے محبوب درگزر فرمانے کی خصلت کو پکڑے رہو اور لوگوں کو بھلائی کرنے

کی ترغیب فرماؤ اور جاہلوں سے علیحدگی اور اعراض کرو۔“

حضرت مرتضیٰ نے بھی تصوف کے معاملہ میں فرمایا:

هَذَا مَذْهَبُ كُلِّ جَدِّ فَلَا تَخْلِطُوهُ بِشَيْءٍ مِّنَ الْهَزْلِ .

”یہ مذہب تصوف تمام کا تمام مجاہدہ ہے، اس میں لہو و لعب کا اختلاط نہ کرنا۔“

اور مترسمین یعنی رسم پرست لوگوں کی متابعت کر کے اسے مخلوط نہ کر دینا اور جو تصوف میں کورانہ تقلید کر رہے ہیں اور صوفی بن رہے ہیں ان سے اپنے آپ کو بچانا۔ عوام الناس نے جب اس زمانہ کے لوگوں کو دیکھا کہ رسمی متصوف لوگوں میں ٹھمکے کے ساتھ ناچنا اور رقص و سرود کرنا، بارگاہِ سلاطین میں پہنچ کر ایک ایک لقمہ پر جھگڑنا اور بادشاہ کی بارگاہ میں مشرف ہونا کمال فقر بن گیا ہے اور عوام کے خیالات خراب ہو گئے ہیں اور صوفیائے کرام سے اس قدر بد عقیدہ ہو گئے کہ عام طور پر کہنے لگ گئے کہ ان صوفیوں کا یہی طغرائے امتیاز ہے اور پہلے لوگ بھی ایسے ہی حال میں گزر گئے اور یہ نہ سمجھنا کہ یہ زمانہ فترت اور فتنہ کا ہے اور روز بروز بلائیں بڑھ رہی ہیں۔ غرض کہ جب بادشاہوں کی حرص بڑھ گئی تو اس نے انہیں ظلم و جور کی طرف مائل کر دیا اور زمانہ میں عوام کے اندر بدکاری و زنا اور فسق و فجور عام ہونے لگا۔ اسی طرح جب زہد و ورع میں ریا پیدا ہو جاتا ہے تو وہ زاہد کو نفاق کی بیماری میں مبتلا کر دیتا ہے اور ہوا و حرصِ شیطانی صوفی کو رقص و سرور کی طرف مائل کر دیتا ہے۔

اچھی طرح یاد رکھو! اگرچہ اہل طریقت تباہ ہو جائیں مگر اصول طریقت تباہ نہیں ہو سکتے اور اچھی طرح جان لو کہ اگر ایک جماعت افعالِ ہزل میں سے کچھ اختیار کر لے اور اس ہزل کو مجاہدہ و ریاضت یا جذبِ دل کے پردہ میں پوشیدہ کرنا چاہے تو اہل طریقت کے مجاہدات اس کی وجہ سے ہزل و لغو نہیں ہو سکتے (ان کے جذبات صادق، صادق ہی رہیں گے اور اہل ہزل کے ہزل ریاضت نما خالص ہزل ہی ہوں گے)۔

حضرت ابوعلی قزوینی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

التَّصَوُّفُ هُوَ الْأَخْلَاقُ الرَّضِيَّةُ.

”تصوف ایک خصلتِ پسندیدہ ہے۔“

اور خصائلِ پسندیدہ وہ ہوتے ہیں کہ بندہ تمام حالات میں اپنے رب کی رضا میں

راضی رہے۔

حضرت ابوالحسن نوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

التَّصَوُّفُ هُوَ الْحُرِيَّةُ وَالْفَتْوَةُ وَتَرْكُ التَّكْلِيفِ وَالسَّخَاءُ وَبَدَلُ

الدُّنْيَا.

”تصوف ایک ایسی آزادی ہے کہ بندہ قیدِ حرص سے آزاد ہو جاتا ہے اور

تصوف ایک ایسی جوانمردی ہے کہ بندہ خواہشاتِ شہوانیہ سے مجرد ہوتا ہے اور

تصوف تکلفات کا ایسا ترک کر دینا ہے کہ بندہ ہر متعلق اور مقسوم کے اندر خوش رہتا ہے اور تصوف ایک ایسی سخاوت کا نام ہے کہ دنیا اہل دنیا پر ہی چھوڑ دیتا ہے اور خود بے تعلق ہو جاتا ہے۔“

حضرت ابوالحسن بوسنجی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

التَّصَوُّفُ الْيَوْمَ اسْمٌ بِلاَ حَقِيقَةٍ وَقَدْ كَانَ حَقِيقَةً بِلاَ اسْمٍ.

”آج کے دن تصوف کا نام ہی نام رہ گیا اور حقیقتاً کچھ نہیں رہا۔ ایک دن وہ تھا کہ تصوف حقیقتاً خالص تصوف تھا اور نام و نمود نہ تھی۔“

یعنی عہد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور سلف صالحین رحمہم اللہ میں تصوف نام کا نہ تھا بلکہ حقیقت تصوف کا پرتو ہر کس و ناکس میں تھا۔ اب وہ انحطاطی دور آیا کہ تصوف نام تو باقی ہے مگر معنی حقیقی معدوم ہیں، یعنی اعمال تو صوفیوں کی نقل میں ہو رہے ہیں اور رسمی صوفی بہت مشہور ہیں مگر ان کے دعاوی تصوف میں بالکل مجہول ہیں۔ گویا اب صوفی ہونے کا دعویٰ تو مشہور و معروف ہے لیکن افعال و اعمال بالکل مجہول ہو گئے۔

یہاں تک میں نے اقوال مشائخ کرام کی تحقیق نقل کی تاکہ اللہ تعالیٰ تجھے سعادت عطا فرمائے اور تجھ پر طریق تصوف کا حال منکشف ہو جائے، اور منکرین تصوف کو بتا سکوں کہ تصوف کے انکار سے ان کی کیا مراد ہے۔ اگر تنہا اسم تصوف کا انکار کرتے ہیں تو مضائقہ نہیں، اس لیے کہ معانی حقائق میں مسمیات سے بالکل بیگانہ ہیں اور اگر عین تصوف کے منکر ہیں تو یہ انکار تمام احکام شرعیہ اور انبیاء کرام علیہم السلام کا ہے اور ان کے خصائل ستودہ کا انکار لازم آتا ہے۔ اللہ تجھے وہ سعادت عطا فرمائے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اپنے ولیوں کو سعید بنایا۔

اس کتاب میں ہم تمہیں ہدایت کرتے ہیں تاکہ تم حق تصوف کی رعایت رکھو اور انصاف

کو ہاتھ سے نہ جانے دو اور سچے صوفیوں کے ساتھ نیک اعتقاد رکھو۔

وَبِاللّٰهِ التَّوْفِیْقُ



خرقہ پوشی

فصل:

صوفیائے کرام ” کا شعار کمبل پوشی ہے اور کمبل پوشی باتباع سنت ہے۔ جیسا کہ خود سرور

عالم رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

عَلَيْكُمْ بِلِبْسِ الصُّوفِ تَجِدُونَ حَلَاوَةَ الْإِيمَانِ فِي قُلُوبِكُمْ. (۱)

”اپنے پر کمبل پوشی لازم کرو، اپنے دلوں میں حلاوت ایمان پاؤ گے۔“

اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں سے کسی ایک صحابی کا ارشاد ہے:

كَانَ النَّبِيُّ رضی اللہ عنہ يَلْبَسُ الصُّوفَ وَيَرْكَبُ الْحِمَارَ.

”حضور رضی اللہ عنہ پشمینہ زیب تن فرماتے اور عربی گدھے کی سواری

فرماتے تھے۔“

اور حضور سید یوم النشور رضی اللہ عنہ نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو فرمایا:

لَا تُضَيِّعِي الثَّوْبَ حَتَّى تَرْقِعِيهِ. (۲)

”اے عائشہ کپڑا ضائع نہ کرنا جب تک اس پر پوند نہ لگ جائیں۔“

۱۔ ابن عدی نے اسے ابو ہریرہ کے طریق سے ان الفاظ میں مرفوعاً روایت کیا ہے: مَنْ سَرِهَ أَنْ يَجِدَ حَلَاوَةَ

الْإِيمَانِ فَلْيَلْبَسِ الصُّوفَ وَخَطِيبٌ نَعَى ابْنِ أَبِي حَتْمَةَ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ النَّبِيَّ صلى الله عليه وسلم قَالَ:

عَلَيْكُمْ بِلِبْسِ الصُّوفِ، تَعْرِفُونَ بِهِ فِي الْآخِرَةِ. إمام شوکانی نے ”الفوائد المجموعه“ (ص: ۱۹۲) کتاب

اللباس) میں کہا ہے کہ اس کی کئی اسناد اور الفاظ ہیں جو صحیح نہیں اور ابن جوزی نے تین روایات ذکر کی ہیں۔

۲۔ یہ اس حدیث کا جز ہے جسے محمد بن یزید نے سعید بن عبدالعزیز کے طریق سے انہوں نے عروہ بن رویم سے

انہوں نے عروہ سے انہوں نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے:

قَالَتْ لِرَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، أَدْعُ اللَّهَ أَنْ يُزَوِّجَنِيكَ فِي الْجَنَّةِ، فَقَالَ: لَا

تَجْمَعِي طَعَامًا لِشَهْرٍ وَلَا تُضَيِّعِي ثَوْبًا حَتَّى تَرْقِعِيهِ.

اسے ابن جوزی ”العلل المتناهیة“ ۲/۲۳۱ میں لائے ہیں اور دارقطنی نے ”العلل“ ۵/۷۴۵، میں نقل کیا

ہے، امام ترمذی نے اپنی ”جامع“ ۳/۶۸۳ میں، امام حاکم اور امام بیہقی نے اور امام ابو نعیم نے اخبار اصفہان

۸۹۱ میں صالح بن حسان سے انہوں نے عروہ سے انہوں نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے ان

الفاظ کے ساتھ مرفوعاً روایت کیا ہے: (بقیہ حواشی اگلے صفحہ پر۔۔۔)

ایسے ہی خلیفۃ المؤمنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا حال تھا کہ آپ ایسا خرقة زیب تن فرمایا کرتے جس پر تیس پیوند لگے ہوتے اور حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ بہترین لباس وہ ہے جو کم قیمت میں حاصل ہو سکے۔

حضرت امیر المؤمنین مولائے کائنات سیدنا علی کرم اللہ وجہہ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ کا پیراہن مبارک ایسا ہوتا تھا کہ اس کی آستین انگلیوں تک ہوتی اور اگر کبھی اس سے لمبی آستینوں کا پیراہن زیب تن فرمایا تو جتنی لمبی اور زائد آستین ہوتی اسے آپ کاٹ ڈالتے تھے۔ اور جناب سرور عالم ﷺ بفرمان الہی کپڑا متوسط زیب تن فرماتے تھے۔ جیسا کہ ارشاد الہی ہے:

﴿وَتِيَابِكَ فَطَهَّرَهُ "أَيُّ فَقَصِرَ"﴾ (۱)

(یعنی اے محبوب! اپنے لباس مبارک کو درست رکھیو)

یعنی دراز اور لمبا ہو تو اسے کاٹ دو۔ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے ستر صحابہ بدر پشمینہ پوش کی زیارت کی ہے اور سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو میں نے بحالت تجرید دیکھا کہ آپ نے پوشاک پشم زیب تن فرما رکھی تھی اور وہی حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ کمر اوڑھے ہوئے ہیں اور اس کمر پر بہت سے پیوند لگے ہوئے تھے۔

اور سیدنا امیر المؤمنین عمر رضی اللہ عنہ اور سیدنا امیر المؤمنین علی کرم اللہ وجہہ اور ہرم ابن حبان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے حضرت اویس قرنی رضی اللہ عنہ کو ایسے لباس پشم میں ملبوس دیکھا جس پر بہت سے پیوند لگے ہوئے تھے۔

اور حضرت حسن بصری اور مالک بن دینار اور حضرت سفیان ثوری رحمہم اللہ تمام کے تمام مرقعہ صوف زیب تن فرماتے تھے۔

اور حضرت امام ہمام سیدنا ابو حنیفہ النعمان کوفی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ یہ روایت تاریخ مشائخ مصنفہ محمد بن علی حکیم ترمذی میں موجود ہے، لکھا ہے کہ امام اعظم رضی اللہ عنہ اول

(بقیہ حواشی گزشتہ صفحہ سے)

إِنْ أَرَدْتَ اللُّحُوقَ بِي فَيَكْفِيكَ مِنَ الدُّنْيَا كَزَادِ الرَّائِبِ ، وَإِيَّاكَ وَمُجَالَسَةَ الْأَغْنِيَاءِ ، وَلَا تَسْتَخْلِقِي نَوْبًا حَتَّى تُرَقِّعِيهِ .

امام ترمذی کہتے ہیں کہ یہ حدیث غریب ہے جسے ہم سوائے صالح کے طریق کے نہیں جانتے، امام ذہبی نے "میزان الاعتدال" ۲/۲۹۲ میں صالح کے ترجمہ میں اسے ذکر کیا ہے اور امام حاکم نے اسے صحیح السناد کہا ہے۔

پوشاک پشمینہ زیب تن فرمایا کرتے تھے، بعد ازاں آپ نے گوشہ نشینی کا عزم فرمایا تو سرکارِ دو عالم ﷺ کو خواب میں دیکھا۔ حضور ﷺ نے فرمایا۔ ابوحنیفہ! گوشہ نشین مت بنو بلکہ لوگوں میں تمہارا رہنا ضروری ہے، تمہارے سبب اللہ تعالیٰ میری سنت اور میرے طریقہ کو زندہ فرمائے گا۔ تو پھر آپ نے عزلت نشینی کے ارادہ کو فسخ فرمادیا اور آپ نے کبھی قیمتی جامہ زیب تن نہ فرمایا۔

حضرت داؤد طائی رضی اللہ عنہ نے ہمیشہ اپنا لباس صوف کا رکھا اور آپ محققین طبقہ صوفیاء کرام سے تھے۔ حضرت ابراہیم ادہمؒ ایک روز حضرت امام ابوحنیفہ رضی اللہ کی خدمت میں آئے تو آپ کے جسم مبارک پر پوشاک پشمینی تھی۔ حاضرین جلسہ نے آپ کو کچھ نظر حقارت سے دیکھا، سیدنا امام اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا یہ ابراہیم ادہمؒ ہمارے سردار ہیں۔ اصحاب جلسہ نے یہ سن کر آپس میں کہا کہ امام ہمام کی زبان حق ترجمان سے کبھی سچ اور حق کے سوا کوئی بات نہیں نکلی۔ ابراہیم ادہمؒ نے سید کا درجہ کیونکر پایا اور کہاں سے پایا۔ حضرت امام اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا یہ رتبہ ابراہیم ادہمؒ نے اپنے رب کی یاد دہانی کی برکت سے حاصل کیا اور وہ خدمتِ خداوندی میں مشغول رہا اور ہم اپنی تنہائی کی خدمت میں محو ہیں اس لیے وہ ہمارا سردار ہو گیا۔

اگر موجودہ زمانہ میں محض اہل زمانہ خرقہ پوش بن کر عوام میں عزت حاصل کرنا چاہیں اور درحقیقت ان کا دل اس لباس کے ساتھ موافق نہ ہو تب بھی روا ہے۔ اس لیے کہ لشکر میں مبارز طلب اور جنگ کا فاتح ایک ہی ہوتا ہے، اور اسی طرح ہر فرقہ میں محقق کم ہوتے ہیں۔ مگر چونکہ نسبت سب کی ایک ہی ہوتی ہے اور اس ایک کی طرف سب اپنے کو منتسب کرتے ہیں تو اگر احکام میں سے کسی ایک حکم میں بھی محققوں کا اتباع ہو گیا تو وہ انہی میں شمار ہو جائے گا۔ جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ تَشَبَهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ. (۱)

۱۔ اسے امام ابوداؤد نے اپنی ”سنن“ میں، امام طبرانی نے ”المعجم الکبیر“ میں اور امام احمد بن حنبل نے اپنی ”مسند“ میں بطریق ابی معین الجرجسی ابن عمر سے مرفوعاً روایت کیا ہے۔ امام عراقی نے اس کی سند کو صحیح کہا ہے، امام سیوطی اسے ”الجامع الصغیر“ میں لائے ہیں۔ اور اسے حسن قرار دیا ہے اور ابوداؤد نے ابن عمر رضی اللہ عنہما کی طرف منسوب کیا ہے۔ امام طبرانی نے اسے بطریق حدیفہ ”المعجم الاوسط“ میں ذکر کیا ہے۔ امام مناوی کہتے ہیں کہ اس کی سند میں عبدالرحمن بن ثابت بن ثوبان ہے جو ضعیف راوی ہے۔ جیسا کہ امام منذری نے کہا ہے۔

امام سخاوی نے ”المقاصد الحسنیة“ میں اسکی سند کو ضعیف کہا ہے لیکن اسکی شاہد روایات موجود ہیں۔ امام ابن تیمیہ نے ”اقتضاء الصراط المستقیم“ میں اسکی سند کو ”جید“ کہا ہے، ابن حجر نے ”فتح الباری“ میں اس سند کو ”حسن“ قرار دیا ہے۔ (بقیہ حواشی اگلے صفحہ پر۔۔۔)

”جو شخص (رفقار و گفتار میں یا اعتقاد میں یا اعمال میں) کسی قوم کی مشابہت اختیار کرے وہ اسی قوم میں شمار ہوگا۔“

لیکن بعض نظریں ان کے ظاہری عمل اور رسوم پر پڑتی ہیں اور بعض کی نگاہ ان کی صفات باطن کی طرف جاتی ہے۔ غرضیکہ نظر بظاہر رکھنے والے اور نظر باطن کی طرف ڈالنے والے جو بھی ہیں، اگر ان کا قصد صورت متصوف بنانا یا صوفی بننے کا ہے، یہ چار حال سے باہر نہیں۔

(۱) یا تو باطن کی صفائی اور دل کی روشنی، مزاج کی پاکیزگی، خواہشات کا اعتدال، خصلتوں کا نیک کرنا، خاصانِ بارگاہ کے اسرارِ خاص کی جلوہ ریزیوں سے منور ہونا، محققینِ راہِ طریقت کا تقرب حاصل کرنا اور ان کی بلندیوں کا معائنہ مقصود ہے تاکہ ان کی برکت سے یہ بھی اس درجہ تک پہنچ سکے۔

(ب) یا ان کی نقل اس لیے کرے گا کہ ان کی طرح صفائی حاصل کرے، بدن ستھرا کرے، دل کو اطمینان پہنچائے اور پاکیزگی طبع کے بعد سینہ میں صفائی ان کی ظاہری اتباع سے حاصل ہو اور اتباعِ طریقت کرے اور آدابِ اسلامی پر نگاہ رکھنے میں آسانی ہو، ان کی ابتداء مجاہدہ اور حسن معاملہ سے ہوتی ہے۔

(ج) یا اس لیے کہ ان کی پیروی میں لگے گا تاکہ مروتِ انسانی سے آپس میں بیٹھنے کے آداب درست کرے اور خصائل میں خوبی پیدا کرے اور ان کی زندگی کا ظاہر دیکھ کر اس کی نقل کرے، بڑوں سے عزت کے ساتھ ملے، چھوٹوں پر شفقت اور رحم کی عادت اختیار کرے، اپنے اعزاء و اقرباء کے ساتھ خنداں پیشانی کا برتاؤ کرے، زیادہ حرص و حصول

(بقیہ حواشی گزشتہ صفحہ سے)

امام ہاشمی ”مجمع الزوائد“ میں رقمطراز ہیں کہ: امام طبرانی نے ”المعجم الأوسط“ میں اسے روایت کیا ہے اس کی سند میں علی بن غراب ہے جس کو کئی ایک نے ثقہ کہا ہے اور ایک جماعت نے اسے ضعیف قرار دیا ہے اور اس کے باقی راوی ثقہ ہیں اور امام مناوی کہتے ہیں اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ طبرانی کی سند ابو داؤد کے طریق سے زیادہ اشل ہے۔

حوالہ کے لیے: مسند الامام احمد ۲/۵۰، سنن ابی داؤد (باب: فی لبس الصوف والشعر)
(۳۰۳۱)، المقاصد الحسنیة للسخاوی (۱۱۰۱) تمییز الطیب من الخبیث (۱۳۶۹)،
کشف الخفا (۲۴۳۶) الدرر المنشرة للسیوطی (۳۸۵)، الجامع الصغیر للسیوطی
(۸۵۹۳) فیض القدیر للمناوی ۲/۱۰۴، الفوائد المجموعۃ للشوکانی (ص: ۲۵۴) مسند
الشہاب للقضاہی ۱/۲۴۳، مشکل الآثار للطحاوی ۱/۸۸، تاریخ ابن عساکر ۱/۶۹،
اقتضاء الصراط المستقیم (۳۹) تخریج احادیث الاحیاء للعراقی ۱/۳۴۱

مال سے بے پروائی دکھائے، قناعت کا خوگر بن کر ان کی صحبت اختیار کرے اور محنت و مشقت کی بجائے حصول دنیا کے طریقے اپنے پر آسان بنائے، اپنے آپ کو نیکوں کی جماعت میں شمار کرائے۔

(د) یا بوجہ تن آسانی کے، اپنے میں رعونت اور نفس پرستی پیدا کر کے طلب حکومت و ریاست رکھے، بغیر منصب صدر نشینی کے صدر نشین بننا چاہے، بغیر علم اہل علم میں اپنی شخصیت قائم کرنے کو صوفی بنے اور سمجھے ہوئے ہو کہ صوفی میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔

تمام خواص صوفی کا یہی خلاصہ اور مقصود ہے۔ اسی وجہ سے وہ صوفیوں کی طرح صلح اور نرمی کے ساتھ زندگی کے لیل و نہار گزارتے ہیں۔ حالانکہ ان کے دلوں میں حقانیت قطعی نہیں ہوتی اور محض تنہا رہنے اور لوگوں میں دکھانے کو کم گو بننے کو طریقت بنا لیتے ہیں، حالانکہ اس طرح زندگی رایگاں کرنے سے انہیں کچھ حاصل نہیں ہوتا، ان کا صرف مقصد یہ ہوتا ہے کہ لوگ ان کی ایسی عزت کریں جیسی محقق صوفیاء کرام کی کی جاتی ہے اور ایسی عظمت ہونے لگے جیسی خاصانِ بارگاہ کی۔ وہ صحبت صوفیاء سے یہی فائدہ چاہتے ہیں کہ اپنی آفت حرص و ہوا کو ان کے معاملہ تجرید کے ظاہری پردہ میں مخفی کر کے ان کا سا جامہ پہن کر عوام میں کچھ مکر پھیلا سکیں اور درحقیقت یہ خرقہ بغیر کسی عمل اور بلا کسی حقیقت کے ہے وہ خود پکارتا اور اعلان کرتا ہے کہ یہ جامہ جامہ مکر ہے، لباس تکبر و غرور ہے اور بروز قیامت موجب حسرت و ندامت ہوگا۔

﴿مَثَلُ الَّذِينَ حُمِّلُوا التَّوْرَةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوهَا كَمَثَلِ الْيَمَارِ يَحْمِلُ أَسْفَارًا ط
يُسَّ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِ اللَّهِ ط وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ
الظَّالِمِينَ ﴿١﴾﴾

”ان لوگوں کی مثال جو تورات کو اٹھائے ہوتے ہیں اور درحقیقت اسے نہیں اٹھائے ہوئے مثل اس گدھے کی ہے جس نے کتابوں کا بوجھ اٹھا رکھا ہے، بُری مثال ہے اس قوم کی جس نے اللہ تعالیٰ کی نشانیوں کو جھٹلایا اور اللہ، ظالم بے دین کو راہ نہیں دیتا۔“

اس زمانہ میں ایسے گروہ بہت ہیں لہذا تم پر لازم ہے کہ جو کام تم سے نہ ہو سکے اس کا ارادہ نہ کرو اس لیے کہ اگر تم ہزار بار طریقت کے قبول کا اعلان کرو تو صوفی نہیں ہو سکتے نہ ہو سکو گے اور ایک لحظہ کے لیے طریقت تمہیں قبول نہ کرے گی۔ کیونکہ طریقت خرقہ پوشی سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ

حرقہ سے حاصل ہوتی ہے یعنی آتشِ عشق میں جلنے کا نام طریقت ہے۔

جس کو طریقت سے آشنائی حاصل ہوگئی اس کے لیے قباء و عباموزوں ہے اور جس نے بلا آشنائی طریقت خرقہ پوشی کی اور مرقعہ صوف پہنا تو وہ مرقعہ اس کے حق میں رقعہ ادبار و ناشرفقاوت یوم النشور ہو جائے گا۔ جیسا کہ ایک پیر مرد کے حال میں ہے کہ ان سے لوگوں نے پوچھا:

لِمَ لَا تَلْبَسُ الْمُرْقَعَةَ؟ قَالَ مِنَ النِّفَاقِ أَنْ تَلْبَسَ لِبَاسَ الْفِتْيَانِ وَلَا تَدْخُلَ فِي حَمْلِ الْقَالِ الْفِتْوَةِ .

”آپ مرقعہ یعنی خرقہ کیوں نہیں پہنتے؟ فرمایا اگر جوان مرد نہ ہو اور جوانوں کا لباس پہنے، تو یہ منافقت ہے، اس لیے کہ ان کے معاملات کا بوجھ تو اٹھانہ سکے اور جوان مرد بنا پھرے۔“

کیونکہ جوان مردوں کے لباس کو ملبوس کر کے جوان مردوں کے بوجھ سے بچنا خالص نفاق ہے۔ تو اگر یہ لباس اس لیے ہے کہ خدا تعالیٰ مجھے اپنے خاصوں میں سمجھ لے تو وہ بلا لباس بھی جانتا

ہے اور اگر اس لیے کہ لوگ اس خرقہ میں دیکھ کر خاصہ خاصان سمجھنے لگیں تو یہ ریامحض ہے یا نفاق خالص۔ یہ راستہ بہت مشکل اور خطرناک ہے۔ یاد رکھو! خدا کے خاصوں کی شہرت جامہ اور خرقہ پر موقوف نہیں، ان کا درجہ اس سے بالاتر ہے۔

الْصِّفَاءُ مِنَ اللَّهِ تَعَالَى اِنْْعَامٌ وَّ اِكْرَامٌ وَالصُّوفُ لِبَاسُ الْاِنْْعَامِ .

”صفا صوفی من جانب اللہ انعام و کرام الہی ہے اور صوف لباس حیوانی ہے۔“

تو خرقہ صوفی ایک حیلہ ہے۔ بعض لوگ تو یہ حیلہ بغرض تقرب کرتے ہیں اور جو کچھ اس خرقہ پوش پر لازم ہوتا ہے اسے پورا کرتے ہیں اور اپنے ظاہر کو خرقہ سے آراستہ کرتے ہیں، اس امید پر کہ شاید اس لباس کی برکت سے اللہ تعالیٰ کے حضور ہم بھی صوفیوں میں شمار ہو جائیں اور مشائخ تصوف نے خرقہ پوشی کرنا اور اس سے زینت حاصل کرنے کا اسی لیے حکم فرمایا اور خود بھی پہنا تا کہ وہ عوام میں ممتاز ہو جائے اور عوام اس کے ہر قدم کی نگرانی میں لگے رہیں، اور وہ اگر کبھی اپنے طریقہ کے خلاف قدم رکھے تو عوام اسے ملامت کریں تو اگر کبھی بہ شامت اعمال کوئی گناہ کا ارتکاب بھی کرنا چاہیں تو اس خرقہ کی وجہ سے لوگوں سے شرما کر رُک جائیں۔

مختصر یہ کہ کبیل پوشی محبوبوں کی ایسی زینت ہے کہ عام لوگ اس سے لوگوں میں ممتاز اور باعزت ہو جاتے ہیں اور خواص اس میں ذلیل۔ عوام کی عزت تو اس خرقہ پوشی میں یہ ہے کہ دنیا

والے انہیں عزت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور خواص کی ذلت یہ ہے کہ انہیں عوام اسی قسم کے لباس میں دیکھ کر اسی نظر سے دیکھتے ہیں جس نظر سے عوام نے ان خرقہ پوشوں کو دیکھا تھا اور یہ ان کے لیے ذلت محض ہے۔ اسی وجہ سے کہا گیا:

الْمُرَقَّةُ لِبَاسِ النِّعَمِ لِلْعَوَامِ وَجَوْشَنُ الْبَلَاءِ لِلْخَوَاصِّ .

”مرقعہ پوشی عوام کے لیے نعمت ہے اور خواص کے لیے مصیبت کی زرہ۔“

اس لیے کہ عوام میں بہت سے لوگ وہ ہیں جو کسی ایسے کام کو تو جانتے نہیں، جس سے عزت دنیا حاصل کریں اور انہیں مال و دولت جمع کرنے کی سخت حرص ہوتی ہے تو وہ اس کی تلاش میں ہوتے ہیں کہ کوئی ایسا حیلہ تراشا جائے، جس سے عزت و مال دنیا ہاتھ آئے، تو جب انہیں یہ صوفی جامہ مل جاتا ہے تو اس کو حصول جاہ و مال اور عزت دنیا کا ذریعہ بنا لیتے ہیں اور خواص صوفیاء اس قسم کی عزت کو ترک کرنے کا حکم دیتے ہیں اور ایسے موقع پر عزت کے مقابلہ میں ذلت کو ترجیح دیتے ہیں۔ اس لیے جس قوم کے لیے وہ عزت ہے، ان کی ایسی عزت بلا ہے:

الْمُرَقَّةُ قَمِيصُ الْوَفَاءِ لِأَهْلِ الصَّفَاءِ وَسِرْبَالُ السُّرُورِ لِأَهْلِ الْغُرُورِ .

”مرقعہ پیراہن وفا ہے اصحاب صفا کے لیے اور یہ لباس سرور ہے اہل غرور

کے لیے۔“

چنانچہ ارباب صفا تو اس کے پہننے سے دونوں جہاں کے قصہ اور تعلق سے علیحدہ ہو جاتے ہیں اور مالوفات و مرغوب طبع اشیاء سے بے نیازی حاصل کر لیتے ہیں اور ارباب سرور و غرور اس خرقہ پوشی کے ساتھ ذات الہی کے انوار سے محجوب ہو کر ہر قسم کی صلاحیت اور نیکی سے محروم رہ جاتے ہیں۔ غرضیکہ حقیقت الامر یہ ہے کہ یہ لباس صوفی اگرچہ سب کے لیے اس کے حصول مقصد اور دستگیری کا سبب ہے اور سب کے لیے ان کی مراد پوری کراتا ہے۔ مگر ایک کے لیے عطاء الہی ہے اور دوسرے کے لیے حجاب ناقصا ہی۔ غرض کہ ایک پر عطا اور دوسرے پر غطا اس کے ذریعہ حاصل ہے۔ ایک اس ہی خرقہ کے ذریعہ دنیا سے آزادی پاتا ہے دوسرا اسی کے ذریعہ صحبت و محبت سے آزاد ہو کر دنیا حاصل کرتا ہے حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: مَنْ أَحَبَّ قَوْمًا فَهُوَ مَعَهُمْ. (۱)

۱۔ امام سخاوی اسے ”المقاصد الحسنہ“ (ص: ۳۹۵، حدیث ۱۰۵۱) میں ان الفاظ کے ساتھ لائے ہیں:

مَنْ أَحَبَّ قَوْمًا حَشَرَ مَعَهُمْ، امام حاکم نے ”المستدرک“ میں ”باب المغازی“ سے پہلے انہی الفاظ کے ساتھ بغیر سند ذکر کیا ہے اور اس حدیث کی شاہد یہ روایت ہے: المرء مع من أحب. جبکہ امام طبرانی اور ضیاء المقدسی نے بطریق ابی قرصانہ ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے: مَنْ أَحَبَّ قَوْمًا حَشَرَ اللَّهُ فِي زَمَرَتِهِمْ

”جس نے جس قوم کو محبوب رکھا وہ بروز قیامت اسی کے ساتھ محشور ہوگا اور اسی کے زمرہ میں رہے گا۔“ لیکن لازم یہ ہے کہ انسان اپنا باطن درست کرے اور تحقیق کی طلب رکھے اور رسوم ظاہریہ سے اعراض کرے اس لیے کہ جو ظاہری چیزوں پر کفایت کرے گا وہ ہرگز تحقیق کے درجہ کو نہیں پہنچ سکتا اور یاد رکھو! وجود آدمی سراپا حجاب ربوبیت ہے اور یہ حجاب اس وقت تک فنا نہیں ہوتا جب تک کہ حال اور کیفیت کے بدلنے میں سعی نہ کی جائے۔ اور کیفیت صفا اسی فنا کا نام ہے جس میں زیبائش ظاہری اور علل و اسباب کا کوئی تعلق نہ ہو، تو فانی الصفت کے لیے علل و اسباب کا لباس اختیار کرنا محال ہے۔ اور تکلف دنیاوی سے اپنے کو آراستہ کرنا اور آرائش ظاہری سے مزین کرنا ممکن نہیں۔

تو جب فنا کی صورت پیدا ہوگئی اور آفت طبعی درمیان سے اٹھ گئی تو اسے کسی نام کے ساتھ مستحی ہونے کی حاجت نہیں رہتی۔ خواہ اسے صوفی کہیں یا اسے کسی اور نام سے پکاریں۔ اس کے لیے سب برابر ہیں۔

فصل:

خرقہ پوشی کی شرطیں یہ ہیں:

اول یہ کہ خرقہ اس لیے بنائے کہ بار ملبوسات سے ہلکا ہو جائے اور انواع و اقسام کے لباسوں سے فراغت حاصل کرے اور کمبلی جب تک رہے اس پر پیوند مسلسل چسپاں کرتا رہے، جہاں سے وہ پھٹے فوراً پیوند لگا دے۔

مشائخ طریقت رحمۃ اللہ علیہم کے اس میں دو قول ہیں: ایک جماعت کہتی ہے کہ پیوند لگانے میں ترتیب شرط نہیں، جہاں سوئی ڈالے وہاں ہی سے نکال لے، موزونیت کا تکلف نہ کرے اور ایک جماعت فرماتی ہے کہ پیوند لگانے میں موزونیت اور ترتیب کا لحاظ ضرور رکھا جائے بلکہ وہ پیوند بحکلف اس طرح چسپاں کیا جائے کہ دیکھنے والا اس کی موزونیت میں تکلف محسوس کرے اس لیے کہ معاملات فقر اور صحت معاملات کا مقتضی یہی ہے کہ اس کا کوئی فعل ناموزوں نہ ہو، اور میں نے (یعنی حضرت علی بن عثمان جلابی) نے حضرت شیخ ابوالقاسم گرگانی رحمۃ اللہ علیہ سے مقام طوس میں سوال کیا کہ درویش کو کم از کم کیا چیز لازمی ہے جس سے اس کے ساتھ نام فقر موزوں ہو سکے؟ فرمایا: تین چیزیں ضروری ہیں اور اس سے کم ہرگز نہ ہوں۔

اول: یہ کہ وہ اپنی کمبلی پر جب پیوند لگائے تو یہ سمجھے کہ پیوند کس طرح موزوں رہے گا اور اسے کس طرح کمبلی پر چسپاں کیا جائے۔

دوسرے: یہ کہ (دل کی آواز اور عوام کی بات) اچھی طرح سن سکے اور اس کی حقیقت کو سمجھنے کی اہلیت رکھے۔

تیسرے: یہ کہ فقیر کا کوئی قدم زمین پر بیکار و غیر موزوں نہ پڑے (یعنی ہر قدم ذکر الہی کے ساتھ اٹھے اور آگے بڑھے)۔

جس وقت میری گفتگو حضرت شیخ المشائخ گرگانی رحمۃ اللہ علیہ سے ہو رہی تھی تو اس وقت ایک جماعت درویشوں کی ہمارے ساتھ وہاں حاضر تھی۔ جب ہم بارگاہ شیخ سے باہر آئے تو ہر ایک کلام شیخ میں تصرف کرنے لگ گیا۔ ایک گروہ تو بوجہ نادانی اس کے اندر اس قدر اختلاف کر بیٹھا کہ اس نے کہہ دیا کہ بس فقیر یہی ہے۔ ایک کہنے لگا کہ فقر کا معنی ہی یہ ہے کہ بہت سے ٹکڑے جمع کر کے خوبصورت طریقہ سے سینے اور زمین پر اچھی طرح پاؤں رکھ کر چلے۔ اور ہر ایک اپنے اپنے گمان میں دعویٰ کرتا تھا کہ ہم طریقت کے معنوں کو خوب سمجھتے ہیں۔ میرے دل کا رجحان اس ہستی پاک شیخ گرگانی کی طرف تھا۔ میں نے یہ بات ناپسند کی کہ اتنی بڑی ہستی کا فرمان اور اس طرح اختلافات میں مخلوط ہو کر رایگاں ہو جائے۔ میں نے سب سے کہا: آؤ ہم سب کلام شیخ پر بحث کریں۔

چنانچہ سب نے میرے سامنے اپنی تقریر کی اور اپنا مافی الضمیر ظاہر کیا۔

جب میری باری آئی تو میں نے کہا پیوند وہی ٹھیک ہے جو فقر پر چسپاں کیا جائے نہ کہ وہ پیوند جو تن پر چسپاں ہو۔ جب تم پیوند فقر پر لگاؤ گے تو وہ اگر ٹھیک نہ بھی سیا گیا تب بھی ٹھیک رہے گا۔ صحیح بات یہ ہے کہ پیوند سے مراد صوفی کا وہ حال ہے جو بحالت کیف و تواجد اس پر طاری ہو، اور سناوہ ہے جو کیفِ حالیہ میں اسے مسموع ہونہ کہ ناز و نعم دنیا میں رہ کر۔ اس معنی میں اگر وجد کے حق سے تصرف کریں صحیح ہے اور اگر ہزل و لغو سے کریں غلط ہے۔ سمجھنا یہ ہے کہ آوازِ روح سننے نہ کہ آوازِ عقل۔

پاؤں ٹھیک رکھنا یہ ہے کہ حالت تواجد میں جو قدم اٹھے وہ صحیح ہونہ کہ کھیل اور رسم کے ساتھ۔ بعض لوگوں نے میرا یہ بیان حضرت شیخ المشائخ گرگانی رحمۃ اللہ علیہ کے حضور پیش کر دیا۔ آپ نے سن کر فرمایا: أَصَابَ عَلِيُّ حَيْزَةَ اللَّهِ. ”یعنی علی بن عثمان نے سچ کہا وہ میرے کلام کے مفہوم کو پہنچ گیا اللہ اسے اپنی حفاظت میں رکھے۔“ تو مرقعہ پوش سے مراد گروہ صوفیاء کی صرف یہ ہے کہ زیب و زینت دنیاوی کے غم سے نجات پائیں اور اپنے فقر میں حق تعالیٰ شانہ کے ساتھ سچا رابطہ رکھیں۔

اور آثارِ سلف میں مروی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بن مریم علیہا السلام شرقہ پوشی

فرماتے تھے اور اس خرقہ کے ساتھ آپ آسمان پر گئے اور کسی بزرگ کا قول ہے کہ انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مرقعہ خواب میں دیکھا وہ پشمینہ کا تھا اور اس پر جو پیوند تھے، ان سے ایک نور چمکتا تھا۔ فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا اے مسیح علیہ السلام! آپ کے اس خرقہ پر یہ نور کیسا ہے؟ آپ نے فرمایا: یہ نور میرے اس صبر کا ہے جو میں نے بحالتِ اضطراب و اضطرابِ صبر کے ساتھ اپنی ضرورت کے وقت اس خرقہ پر پیوند لگا لگا کر شکر کیا۔ اللہ تعالیٰ نے میرے ہرنج کے بدلہ میں ایک ایک نور عطا فرمایا۔

ایک بزرگِ کامل سلسلہ ملامتیہ کو ماوراء النہر میں دیکھا جن کا یہ حال تھا کہ وہ مرغوبِ اشیاء جسے انسان شوق سے کھاتا ہے، بالکل استعمال نہ فرماتے بلکہ گلاسٹراکدو، کڑوی نکڑی، سڑی ہوئی گاجر اور لباس گری پڑی لیریں جمع کر کے انہیں دھو کر پاک کر کے سیتے اور ملبوس فرماتے۔

مرؤ الرود (ترکستان میں ایک شہر ہے) وہاں متاخرین میں سے ایک صاحبِ حال ضعیف العمر نیک سیرت بزرگ تھے، جن کے لباس پر بے حد کلڑے پیوندوں کے سلے ہوئے تھے، ان کی مسند اور کلاہ کا یہ حال تھا کہ پرانے پیوندوں کی کثرت کی وجہ سے اس کے اندر بچھوؤں نے اپنے بچے دے رکھے تھے اور میرے شیخ رضی اللہ عنہ نے ایک خرقہ چھپن سال تک زیب تن فرمایا۔ جہاں سے پھٹتا بے ترتیبی کے ساتھ اس پر پیوند چپکاتے رہے۔

ایک حکایت میں عراقی درویشوں کا حال پڑھتے ہوئے دو درویشوں کا حال پایا۔ ایک صاحبِ مشاہدہ تھے اور دوسرے صاحبِ مجاہدہ۔ جو صاحبِ مشاہدہ تھے انہوں نے اپنی تمام عمر میں سوا اس کپڑے کے جو اہالیانِ سماع کے وجد میں پھٹ کر گرا، کوئی کپڑا نہ پہنا (یعنی اربابِ وجد کے پھٹے ہوئے کپڑوں سے اپنا خرقہ بناتے اور وہی زیب تن فرماتے) اور دوسرے جو صاحبِ مجاہدہ تھے وہ ان لوگوں کے دریدہ کپڑے جمع کر کے پہنتے تھے اور بارگاہِ الہی میں استغفار کرتے رہتے تھے۔ اس لیے کہ ان کا ظاہر، باطن کے موافق ہوتا تھا اور یہ اپنے حال کی نگہداشت اور احتیاط تھی۔ حضرت شیخ محمد بن خفیف فرماتے ہیں کہ میں نے بیس سال سخت ٹاٹ پہنا اور ہر سال میں نے چار چلے کیے اور ہر چلہ میں علومِ حقیقت کے حقائق و غوامض پر ایک کتاب تالیف کی۔

ان کے ہی زمانہ میں ایک بزرگ تھے، جو علماءِ محققینِ طریقت سے شمار ہوتے تھے اور وہ علاقہ فارس میں رہتے تھے انہیں ”محمد بن زکریا“ کے نام سے پکارتے تھے۔ انہوں نے کبھی خرقہ زیب تن نہ فرمایا۔ حضرت شیخ محمد رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا گیا کہ حضرت خرقہ کی کیا شرط ہے اور کس کے لیے خرقہ پوشی روا ہے؟ فرمایا: خرقہ پوشی کی شرط وہی ہے جو محمد بن زکریا اپنی سفید پیراہن میں

پوری کر رہے ہیں اور خرقہ پہننا بھی انہیں کوزیبا ہے۔

فصل:

لیکن اب جو اکثر مشائخ کرامؒ نے خرقہ پوشی ترک کر دی، یہ شرائط طریقت میں سے کوئی شرط نہیں ہے، بلکہ اس زمانہ میں جو ترک خرقہ پوشی کیا گیا اس کی دو وجہ ہیں:

ایک تو یہ کہ پشم مشکوک ہو گئی۔ اس وجہ میں کہ چار پائے لُٹ مار چوری چکاری میں منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ پھر یہ پتہ صحیح نہیں چلتا کہ جو پشم آئی وہ چوروں میں سے آئی یا کسی غارتگر سے خریدی گئی۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ نوخیز بدعت پرست لوگوں نے پشمینہ کے جامہ کو اپنا شعار بنا لیا۔ بدعتیوں کے کسی شعار کا خلاف کرنا گو سنت کے خلاف ہی کیوں نہ ہو، اچھا ہے۔

اور اونی لباس بنوانے میں جو مخصوص طریقہ تکلف اختیار کیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ عوام میں اپنی منزلت اور جاہ عزت چاہتے ہیں اور جو جماعت صوفیوں کی صورت بنا کر خرقہ پوشی کر رہی ہے، وہ صرف عوام میں صوفی بننے کے لیے اور محض دنیا حاصل کرنے کی غرض سے خرقہ پوش بن رہی ہے۔ حالانکہ ان سے بہت سے ناروا افعال ظاہر ہوتے ہیں اور صوفیاء کرامؒ کو ایسے لوگوں سے بہت رنج پہنچتا ہے، اور انہوں نے اس خرقہ کو موجب زیب و زینت بنا لیا ہے اور اس کی ایسی مخصوص طرز نکالی ہے کہ ان کے سوا اور کوئی ویسا خرقہ سینا بھی نہیں جانتا۔ اس مخصوص لباس میں یہ (مکار فرقہ رہتا ہے) اور آپس میں پہچان کے لیے اس مخصوص لباس کو علامت بنا لیا ہے، یہاں تک کہ ایک بناوٹی درویش کسی درویش کے پاس گیا، اس کے خرقہ پر بہت سے پیوند لگے ہوئے تھے اور بناوٹی فقیر بنا ہوا تھا، شیخ نے اسے اپنے سے جدا کر دیا۔ اس عمل سے یہ مطلب واضح ہوا کہ صفائی کی اصل طبیعت کی رقت اور مزاج کی لطافت ہے اور یہ امر واضح ہے صاف دل اور نیک طبع میں کجی اور ناہمواری نہیں ہو سکتی۔

جس طرح ناموزوں شعر طبیعت پسند نہیں کرتی ایسے ہی نادرست فعل کو بھی طبیعت قبول نہیں کرتی۔ ایک جماعت نے لباس ہونے نہ ہونے میں تکلف نہیں کیا۔ اگر خدا نے عبا و قبا عطا فرمائی وہ پہن لی اور اگر پھٹا پرانا پیرا ہن دیا، وہ قبول کر لیا۔

اور میں (علی بن عثمان الجلابی) اس طریقہ کو پسند کرتا ہوں اور اپنا لباس ایسا ہی رکھتا ہوں۔ حکایتوں میں منقول ہے جب حضرت احمد خضرو یہ رحمۃ اللہ علیہ، ابو یزید رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت کو حاضر ہوئے تو قبا زیب تن تھی اور جب شاہ شجاع، حضرت ابو حفص رحمۃ اللہ علیہ کی

زیارت کو آئے تو دیکھا کہ حضرت ابو حفصؒ قبا زیب تن فرمائے ہوئے ہیں حالانکہ حضرت ابو حفص رحمۃ اللہ علیہ کا یہ دوامی لباس نہ تھا بلکہ ہمیشہ اکثر و بیشتر آپ خرقہ ہی پہنا کرتے تھے اور کبھی کبھی سفید پیراہن، گاہے بگاہے جامہ پشم زیب تن فرماتے۔ غرضیکہ جیسا لباس میسر آتا، آپ وہی لباس ملبوس فرماتے۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ نفس بہت جلدی عادت قبول کرنے والا ہے اور عادتوں سے بہت ہی جلدی الفت ہو جاتی ہے۔ حتیٰ کہ عادت طبعیتِ ثانیہ بن جاتی ہے اور جو چیز طبعیتِ ثانیہ بن گئی، وہی حجاب ہو جاتی ہے۔

یہی سبب ہے کہ حضرت سرور عالم ﷺ نے فرمایا:

خَيْرُ الصِّيَامِ صَوْمُ أَخِي دَاوُدَ.

”نقلی روزوں میں بہترین روزے صومِ داؤدی ہیں۔“

عرض کیا: حضور ﷺ! صومِ داؤد کیسے تھے؟ فرمایا: ایک دن صائم رہتے اور ایک دن افطار فرماتے تاکہ روزہ رکھنے یا نہ رکھنے کا نفس عادی نہ ہو جائے۔ اس لیے کہ عادتِ نفسانی کی وجہ سے انسان مجبور ہو جاتا ہے اور اس مفہوم میں حضرت ابو حامد دوستان مروزی رحمۃ اللہ علیہ کا رویہ نہایت درست تھا کہ مرید آپ کو جو لباس چاہتے پہنا لیتے اور جس کسی مرید کو کپڑے کی حاجت ہوتی تو بحالتِ وجدان و کیف آپ سے وہ لباس اتار لیتے۔ حضرت ابو حامد رحمۃ اللہ نہ پہنانے والے کو کچھ فرماتے نہ اتارنے والے کو کچھ کہتے۔ اور ہمارے اس زمانہ میں بھی ایک بزرگ غزنی میں ہیں ان کا لقب ”موید“ ہے، اللہ انہیں اپنی حفاظت میں رکھے، انہیں بھی ملبوسات میں کچھ اختیار و تمیز نہیں ہے۔ (گویا وہ عالم امکان سے اس قدر تجرید حاصل فرما چکے ہیں کہ لباس تک سے اجنبی ہیں) یہ مرتبہ تقرب بہت صحیح ہے۔

اور جو لوگ مشائخ کرامؒ میں سے اپنا لباس اکثر نیلا رکھتے ہیں اور اس کی چند وجہ ہیں:

ایک تو یہ کہ وہ سیاح ہوتے ہیں اور بحالتِ سفر سفید کپڑے میلے ہو جاتے ہیں اور انہیں سفر میں صاف کرنے اور دھونے کا موقعہ بدشوار ملتا ہے۔

دوسرے یہ کہ سفید لباس کی خواہش ہر ایک کو ہوتی ہے۔ اس وجہ سے وہ عوام کی محبوب

ترین چیز سے مجتنب ہیں۔

تیسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ نیلگوں رنگ ملبوس کرنا اصحابِ غم اور اربابِ محنت کا کام سمجھا

جاتا ہے اور چونکہ دنیا صوفی کے لیے دارِ محنت و مصائب ہے اور اس کا تمام کام مہجوری اندوہ کے

ساتھ وابستہ ہے تو ارباب ارادت نے اس دنیا میں لباسِ غم اختیار کر لیا۔ اور ایک جماعت نے اس دنیا میں سوائے غم و اندوہ کچھ نہ پایا اور اس کا ہر معاملہ نقصان و خذلان کا پیش خیمہ دیکھا تو انہوں نے یہ دیکھ کر کہ یہاں سوائے اضماعت و فنا کچھ حاصل نہیں تو اس غم میں لباسِ کبود پہن کر غمگین بیٹھ گئے اور سمجھ گئے کہ فوت ہونا موت سے اشد ترین ہے۔ گویا ایک جماعت تو کسی عزیز کی موت پر سیاہ پوش ہوتی ہے۔ دوسری جماعت مقصود کے فوت ہونے پر سیاہ پوش ہو گئی۔

ایک بے علم مدعی فقیر نے ایک بزرگ سے پوچھا کہ حضرت! آپ نے سیاہ پوشی کیوں اختیار فرمائی ہے؟ آپ نے جواب دیا: حضور ﷺ نے تین چیزیں چھوڑیں تھیں: فقر، علم، شمشیر۔ شمشیر تو سلاطین نے لے لی مگر اس کے محل پر اسے استعمال نہ کیا۔ علم علماء نے اختیار کیا مگر اسے پڑھنے پڑھانے تک ختم کر دیا۔ فقر، فقراء نے اختیار کر لیا مگر اسے آلہ غناء و حصول مال بنا لیا۔ میں نے ان تینوں کے غم میں سیاہ پوشی اختیار کی ہے۔

حضرت مرتعش رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ آپ بغداد کے ایک محلہ میں سے گزرے۔ راستہ میں پیاس لگی۔ آپ نے ایک دروازہ پر آکر پانی طلب کیا۔ ایک لڑکی اندر سے آئی اور کوزہ آب ہمراہ لائی، آپ نے اس سے پانی لے کر پی لیا۔ آپ کی نظر پانی لانے والی کے چہرے پر پڑی۔ آپ کا دل اس کے جمال پر فریفتہ ہو گیا۔ جیسا کہ مثل مشہور ہے: کُلُّی بِکَلِّکَ مَشْغُولٌ (میرا کل تیرے کل پر فدا ہے)۔ آپ وہیں بیٹھ گئے حتیٰ کہ صاحب خانہ آیا۔ آپ نے فرمایا میاں! میرا دل ایک گلاس پانی میں مقید ہو گیا، مجھے تیرے گھر والوں نے ایک گلاس پانی دے کر میرا دل لے لیا۔ صاحب خانہ نے عرض کی کہ حضور! وہ میری لڑکی ہے، میں اسے آپ کے عقد میں پیش کرتا ہوں۔ حضرت مرتعش ”گھر کے اندر تشریف لے گئے اور عقد فرما لیا۔ یہ صاحب خانہ بغداد کے متمول گھرانے میں سے تھا۔ اس نے حضرت مرتعش رحمۃ اللہ علیہ کو گرما بہ یعنی حمام میں بیچ کر پوشاکِ مکلف سے آراستہ کیا اور وہ خرقہ فقر اتار ڈالا جو آپ کے زیب تن تھا۔

جب رات ہوئی تو حضرت مرتعش نماز میں مشغول ہو گئے اور خیال فرمایا کہ اپنے روزانہ کے اوراد سے فارغ ہو کر پھر دلہن کی طرف ملتفت ہوں گا کہ یک لخت آپ نے با آواز بلند فرمایا: هَانُوا مُرَقَّعَتِي. ”ہمارا خرقہ جلدی لاؤ۔“ سب نے متعجب ہو کر عرض کیا کہ حضور! کیا ہوا؟ آپ نے فرمایا: مجھے خلوتِ راز سے ابھی آواز آئی کہ مرتعش! جو پہلی نظر تو نے ہمارے سوا غیر پر ڈالی تھی، اس کی سزا میں ہم نے تجھ سے لباسِ محبوبیت اتار لیا ہے، اب اگر دوسری نظر ڈالی تو ہم لباسِ آشنائی

بھی سلب کر لیں گے۔

گویا وہ لباس جس کے پہننے سے رضاءِ الہی مقصود ہو اور محبوبِ الہی کے تتبع میں اسے پہننا ہو تو اپنے رب سے علاقہ رکھنے کے لیے ہمیشہ اس پر راضی رہنا ضروری ہے اور یہ استقامت نہایت مبارک و مسعود ہے ورنہ اپنے دین کی محافظت کافی ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر لباسِ اولیاء میں جانا درحقیقت خیانتِ مجرمانہ ہے۔ اس لیے کہ بلا کسی دعویٰ محبت کے محض مسلمان ہونا اور اسلام پر رہنا اس سے بہتر ہے کہ جھوٹا مدعی عشق و محبت بنے تو خرقة پوشی صرف دو قسم کے لوگوں کے لیے موزوں و مناسب ہے:

ایک تارک الدنیا جماعت کے لیے۔ دوسرے مشتاقانِ جمالِ الہی کے لیے۔ یہی وجہ ہے کہ مشائخِ کرام رحمہم اللہ کا طریقہ ہے کہ جب کوئی مرید ترکِ تعلق ماسویٰ اللہ کر کے اُن کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو دو سے تین سال تک تین معنی کے سمجھنے کی تعلیم دیتے ہیں۔ اگر وہ ان تین سال میں اس تعلیم پر ثابت قدم ہو تو فیہما، ورنہ اسے کہہ دیتے ہیں کہ طریقت اسے قبول نہیں کرتی۔۔۔ پہلے سال خدمتِ خلق کراتے ہیں۔ دوسرے سال اطاعتِ حق (یعنی تورع و تقویٰ بدرجہٴ غایت)۔ تیسرے سال میں دل کی (مراعات و) نگہداشت ہوتی ہے (یعنی خواہشات و لذاتِ نفسانیہ پر قبضہ کرنا)۔

یہ امر ظاہر ہے کہ انسان خدمتِ خلق جب ہی کر سکتا ہے جب کہ وہ اپنے کو خادم کی جگہ سمجھ کر خلقِ خدا کو اپنا مخدوم سمجھ لے۔ گویا بلا تمیز خورد و کلاں سب کو اپنے سے بہتر جانے اور سب کی خدمت اپنے اوپر واجب سمجھے۔ نہ یہ کہ خدمت تو کرے مگر اس خدمت کرنے میں اپنے آپ کو مخدوموں میں فضیلت دے۔ ایسے تخیل سے خدمت کرنا اپنے لیے نقصان میں ڈالنا اور بے نصیب ہونا ہے۔ در یہ زمانہ کی بلاؤں میں سے ایک بلا ہے۔

اور خدمت و اطاعتِ حق عز و جل اس وقت کر سکتا ہے جب اپنی تمام خطوطِ نفسانیہ کو دنیا و عقبیٰ سے منقطع کر لے اور خالصاً مخلصاً لوجہ اللہ اس کی پرستاری کرے اور اسی کے لیے وہ عبادت ہو اور اگر کسی چیز کے لالچ میں عبادت کرتا ہے خواہ وہ دنیا کی ہو یا آخرت کی، تو وہ پرستشِ اپنی پرستش ہے، نہ کہ خدائے قدس کی۔ اور دل کی مراعات و نگہداشت اس وقت ہو سکتی ہے کہ اس کی ہمت یکسو ہو اور ہر قسم کے غم سے اس کا دل پاک ہو اور بارگاہِ الفت میں مواقعِ غفلت سے دل کی نگہداشت کرے۔

جب مریدان ہر سہ شرائط میں مکمل اترتا ہے تو اسے خرقة پوشی کرنا مرتبہ تحقیق کے ساتھ موزوں ہوتا ہے اور یہ خرقة پوشی رسمی اور کورانہ تقلید میں نہیں ہوتی۔

مگر پھر بھی مرقع پہننے والوں کو چاہیے کہ وہ مستقیم الحال ہو۔ تمام نشیب و فراز طریقت سے گزر چکا ہو اور چاشنی حال چشیدہ ہو اور طرق اعمال سے پورا واقف ہو، قہر جلالی محبوبی اور لطف جمال جمیلی دیکھے ہوئے ہو۔

اور پیر کامل اس درجہ کامل ہو کہ احوالی مرید سے پورا پورا واقف ہو کہ وہ درجہ کمال میں کس حد تک پہنچ سکے اور اس مقام پر پہنچ کر اس کا واپس نزول ہو گا یا ٹھہر جانے والوں میں سے نکلے گا (یعنی درجہ قبض میں رہ جائے گا یا اس کا بسط بعد القبض ہوگا۔) اگر خرقہ پوشی کرنے والا پیر کامل دیکھ لے کہ یہ ایک نہ ایک دن اس کیف طریقت سے واپس لوٹ جائے گا تو اسے کہہ دے کہ تو اس راہ کی راہ نوردی نہ کر اور اگر جانے کہ اس مقام پر ٹھہر سکے تو اس سے معاملہ طریقت شروع کرے اور اگر جانے کہ منتہی کو پہنچ جائے گا تو اس کی پرورش کرے اور نگاہ رکھے۔

اور اس قسم کے جو مشائخ ہیں وہ درحقیقت طیب قلب ہیں، یعنی مرشد کامل مرید کے حق میں طیب قلب کی حیثیت رکھتا ہے اور جو طیب مریض کی بیماری سے جاہل اور بے خبر ہو تو ایسا طیب اپنی تجویز سے مریض کو ہلاک کر دیتا ہے۔ اس لیے کہ جب معالج مریض کی نگرانی میں جاہل ہوگا تو خطرات مرض کو کیسے سمجھ سکتا ہے۔ پھر ایسا معالج مریض کی غذا اور شربت اور دوا تمام مرض کے خلاف ہی تیار کرے گا۔

حضرت سید یوم النور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”الشَّيْخُ فِي قَوْمِهِ كَالنَّبِيِّ فِي أُمَّتِهِ.“ (۱)

۱۔ ابن حبان نے اسے ”کتاب الضعفاء“ میں، خلیلی نے زہد ”مشيخة“ میں، ابن نجار نے اپنی ”تاریخ“ میں ذکر کیا ہے اور ان تمام نے احمد بن یعقوب قرشی جرجانی اموی کے طریق سے، انہوں نے اپنے باپ سے، انہوں نے رافع سے، انہوں نے ابورافع سے روایت کیا ہے۔

ابن حبان نے اسے عبداللہ بن عمر بن خاتم افریقی کے حالات میں ذکر کیا ہے اور اس نے مالک سے، اس نے نافع سے اور انہوں نے ابن عمر سے مرفوعاً روایت کیا ہے، کہا ہے کہ یہ روایت موضوع ہے، امام شوکانی ”الفوائد المجموعہ“ میں اور امام زرکشی ”الذکوة“ میں کہتے ہیں کہ یہ الفاظ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام نہیں ہے بلکہ یہ کسی اہل علم کی کہی ہوئی بات ہے اور بعض حضرات نے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے: الشیخ فی جماعته کالنبی فی قومه، يتعلمون من علمه ويتأدبون من أدبه۔

امام ذہبی نے ”میزان الاعتدال“ میں محمد بن عبدالملک القناطری کے تعارف میں اسے ذکر کیا ہے کہ اس نے اپنے باپ سے، اس نے رافع سے باطل حدیث روایت کی ہے: الشیخ فی اہلہ کالنبی فی اُمتہ۔ اُسے قناطری اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ قناطیر یعنی انبار جھوٹ بولتا تھا۔ (بقیہ حواشی اگلے صفحہ پر۔۔۔)

”شیخ پیر کامل اپنی قوم اور مریدوں میں ایسے ہیں جیسے نبی اپنی امت میں۔“
 تو جیسے انبیاء اکرام علیہم السلام نے عوام کو دعوتِ توحید دے کر بصیرتِ حقہ بخشنی اور ہر ایک
 قبول کرنے والے کو اس کے درجہ ایمان کے مطابق درجہ تقرب بخشا اور جس میں جیسی بیماری جہل
 کی تھی ویسا ہی علاج کیا۔ اسی طرح مرشد کامل شیخ وقت کو بھی بصارتِ حق کی دعوت دینی چاہیے اور
 ہر ایک کی تعلیمی غذا اس کے اندرونی درجہ ایمان کے مطابق تجویز کرنی چاہیے تاکہ مرید کرنے کا جو
 مقصد ہے، وہ حاصل ہو۔

تو جب مرشدِ کامل صاحب ولایت مرید کو ان تین سال کے بعد ریاضت کی تعلیم دے کر
 اسے خرقة پہنائے تو جائز ہے اور خرقة پوشی کا مقصد درحقیقت حیاتِ دنیاوی کی لذتوں اور حصول

(بقیہ حاشیہ گذشتہ صفحہ سے)

امام ابن حجر عسقلانی ”لسان المیزان“ میں فرماتے ہیں: کہ امام خلیلی فرماتے ہیں: بطبرانی کی حدیث کو صخر حاجب
 نامی ایک جھوٹے شخص نے مالک پر گھڑا ہے اور اسی نے یہ حدیث گھڑی: الشیخ فی اہلہ کالنہی فی امتہ۔
 امام دیلمی نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے:

بجل المشائخ فان تبجیل المشائخ من اجلال اللہ عزوجل، فمن لم یبجلہم فلیس منا۔ امام
 سخاوی ”المقاصد الحسنہ“ میں فرماتے ہیں کہ مذکورہ تمام روایات سے بھی زیادہ صحیح روایت کے الفاظ یہ
 ہیں۔ ما اکرم شاب شیخا سنہ الا فیض اللہ لہ فی سنہ من یکرہہ۔ امام ترمذی نے اسے اپنی
 ”سنن“ میں ذکر کیا ہے اور اسے حسن قرار دیا ہے۔ امام شیرازی نے ”اللقاب“ میں، ابن حبان نے
 ”کتاب الضعفاء“ میں، امام دیلمی نے ”مسند الفردوس“ میں سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے ان الفاظ
 کے ساتھ روایت کیا ہے: الشیخ فی بیتہ کالنہی فی قومہ۔

امام سیوطی اسے ”الجامع الصغیر“ میں لائے ہیں اور اسے ضعیف قرار دیا ہے، ملا علی قاری
 ”الاسرار المرفوسہ“ میں رقمطراز ہیں: مذکورہ روایت کو معنی کے اعتبار سے یہ صحیح حدیث تقویت دیتی ہے۔
 العلماء ورثة الانبیاء: اور اللہ تعالیٰ کا فرمان بھی اسی کی تائید کرتا ہے: فَاسْأَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لَا
 تَعْلَمُونَ ﴿۲۳﴾ (سورۃ النحل: ۲۳)

حوالہ کے لیے دیکھئے: المقاصد الحسنہ للسخاوی (۶۰۹)، تمییز الطیب من الخبیث
 (۷۶۶) کشف الخفاء للمجلونی (۱۵۷۶) الاسرار المرفوعہ لعلی القاری (۲۵۳)، احادیث
 القصاص (۲۳)، تنزیہ الشریعة ۲/۳۰۷، الفوائد المجموعۃ للشوکانی (۱۲) اسنی
 المطالب (۸۰۸) میزان الاعتدال للذہبی ۳/۲۳۲، الموضوعات لابن الجوزی ۱/۱۸۳،
 اللالی المصنوعۃ للسیوطی ۱/۱۵۳، الجامع الصغیر للسیوطی (۲۹۶۹) فیض القدیر
 للمناوی ۳/۱۸۵، الدرر المنثرة للسیوطی (۲۶۶) کنوز الحقائق (۷۶)

نعت دنیا کی مرادوں سے انقطاع کر کے دل کو زندگی کی راحتوں سے صاف کرتے ہوئے اپنی عمر سماعتِ حق کے لیے وقف کرنے اور دنیا سے فنا ہو کر کفن پہننے میں ہے اور خرقة پوش ہو کر سوائے طلبِ حق کے سب چیزوں سے کنارہ کشی کرنا اس کی شرطِ اولین ہے۔ جب مرید اس قسم کا خرقة پہن لے گا تو وہ خرقة پوش بارگاہِ جل مجدہ میں عزت پائے گا۔ پھر اس کا فرض ہے کہ اس خرقة کا خاص لحاظ رکھے، اس کا حق کماھٹہ ادا کرنے میں پوری استقامت اور ہمت سے مساعی کرے اور اپنی تمنائیں اور خواہشات اپنے اوپر حرام کر لے۔

اب بحثِ خرقة پوشی میں بہت سے حقائق و ارشادات بتا دیئے گئے۔

شیخ ابو عمر اصفہانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس بحث میں ایک مکمل کتاب تالیف فرمائی ہے۔ اس کے ساتھ عوامِ متصوفہ کو بہت زیادہ غلو اور شغف و عقیدت ہے۔

اور چونکہ میری مراد اس کتاب میں محض نقلِ اقوال نہیں بلکہ انکشافاتِ حقیقت و مغلقات مقصود ہے اور یہی مقصودِ طریقت ہے۔

لہذا بہترین اشاراتِ خرقة پوشی بہم بتا دیتے ہیں۔

یاد رکھو! کہ خرقة کی حقیقت یہ ہے کہ اس کا گنبد یعنی اوپر کا حصہ صبر کے ساتھ ہو اور دونوں آستین خوف و امید کی ہوں اور اس کے آگے پیچھے کے دامن قبض و بسط سے بنیں اور اس کا گریبان جہاں سے کمر باندھتے ہیں، مخالفتِ نفس کے ساتھ ہو اور دونوں کرسیاں یعنی کلیانِ صحت و یقین کی ہوں۔ اس کی سنجاف یعنی مغزی، اخلاص کی ہو۔

اس سے بھی بہتر حقائقِ خرقة یہ ہیں کہ وہ قبہِ محبت میں رنگِ فنا سے رنگا جائے اور اس کی دونوں آستین حفظ و عصمتِ نفس کی ہوں اور اس کا آگے پیچھا فقر اور صعوبت کا بنے اور گریبان جہاں سے کمر بند ہے، مشاہدہِ جمال کے لیے مضبوط اور قائم ہو اور اس کی کرسیاں یعنی کلیانِ ایسی امن کی ہوں کہ تقربِ احدیت میں مامون رکھیں اور اس کی مغزی اور سنجاف قرارِ تام ہو جو مقامِ وصل میں اسے مضطرب نہ ہونے دے۔

جب صوفی اپنے باطن کو اس شان کا مرتعہ بنا لے گا تو ظاہر کے لیے بھی اسے خرقة بنانا چاہیے اور ہماری ایک کتاب اس بحث میں ہے جس کا نام ”اسرار الخرق والمونات“ ہے۔ اس کتاب کا ایک نسخہ ہمارے مرید کے پاس ہونا ضروری ہے۔

لیکن خرقة پہننے کے بعد اگر صوفی غلبہٴ حال یا قہرِ سلطانِ وقت سے تنگ آ کر اس خرقة کو چاک کر دے گا تو اسے معذور سمجھا جائے گا اور خرقة اس کا مسلم ہوگا مگر خرقة با اختیار خود

بحالت تمیز و درستی حواس میں کر ڈالا تو اسے خرقہ پوشی پھر جائز نہیں اور اہل طریقت اس رویہ کو نہیں مانتے۔

اور یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ خرقہ پوشی دیرینہ بھی ہو اور بغیر صفاء باطن کے محض ظاہری خرقہ پوش رہے۔ یہ اچھی طرح سمجھ لو کہ دریدگی خرقہ کے معنی یہ ہیں کہ جب صوفی اس مقام سے جہاں خرقہ پوش ہوا تھا دوسرے مقام کی طرف انتقال ہوتا ہے تو وہ ترقی درجہ شکر میں اُس پہلے جامہ سے باہر ہو جاتا ہے اور خرقہ کی بجائے دوسرا لباس ملبوس کر لیتا ہے۔ اس لیے کہ ہر ایک مقام کا لباس علیحدہ ہے تو دوسرے مقام پر پہنچ کر دوسرا لباس ملبوس کرنا صحیح ہے۔

اگرچہ خرقہ ایک لباس ہے کہ طریقت، فقر، صفوت کے تمام مقامات پر یہ لباس موزوں رہتا ہے تو ان مذکورہ مقامات سے بالا ہونے کی صورت میں تمام مقامات سے تبری کرنا بھی ضروری ہے، ہر چند کہ اس بحث کے لیے یہ مقام موزوں نہیں اس کے لیے باب ”خسرق و کشف و حجاب السماع“ مخصوص ہے۔ ہم وہاں اس بحث کو بیان کریں گے۔ مگر اس جگہ اشارتا اس لیے بیان کیا گیا ہے کہ لطائف خرقہ کے بیان میں فرو گذاشت نہ ہو جائے۔ خدا کو منظور ہے تو اس مسئلہ کو وضاحت کے ساتھ اس کی جگہ پر بیان کریں گے۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ خرقہ پہنانے والے کو حقیقت اور طریقت کے اندر اس قدر حکومت و قوت ہونی چاہیے کہ اگر کسی بیگانہ پر نظر ڈالے تو اسے چشم شفقت سے آشنا بنا دے اور اگر اس خرقہ کو کسی عاصی پر ڈال دے تو وہ ولی بن جائے۔

ایک دن میں اپنے شیخ کے ہمراہ تھا، چلتے چلتے آذربائیجان کی آبادی سے گذرا۔ میں نے دو تین خرقہ پوش دیکھے کہ گندم کے ڈھیروں پر کھڑے ہیں اور اپنے خرقہ کے دامنوں کو کسانوں کی طرف پھیلا رکھا ہے تاکہ وہ اس گندم میں سے ان کے دامنوں میں کچھ ڈالیں۔ میرے شیخ قدس سرہ نے ان کی طرف نظر ڈالی اور یہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی:

﴿أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرُوا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰی ۖ فَمَا رَبِحَت تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوا

مُهْتَدِیْنَ ۝﴾ (۱)

”یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے گمراہی خریدی ہدایت کے بدلے، تو ان کی

تجارت نے انہیں کچھ فائدہ نہ پہنچایا اور یہ ہدایت یافتہ نہیں ہیں۔“

میں نے عرض کی: حضور! یہ لوگ کس قدر ذلت میں مبتلا ہیں کہ لوگوں کی نظر میں ذلیل

ہو رہے ہیں۔ شیخؒ نے فرمایا کہ ان کے پیر کو مرید جمع کرنے کی حرص ہوئی ہے تو ان کو دنیا جمع کرنے کی حرص ہوگئی اور کوئی حرص کسی حرص سے بہتر نہیں اور خلاف امر و حکم کسی کو دعوت دینی حرص محض ہوتی ہے۔

حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے ”باب الطاق“ میں ایک ترسا کو دیکھا، بڑا خوبصورت جوان تھا۔ میں نے دعا کی: یا الہی! اس جوان کو میرے کام کا بنا دے، اس لیے کہ اسے تو نے بڑا حسین بنایا ہے۔ تھوڑی مدت اس دعا کو گذری تھی کہ وہ ترسا میرے پاس آیا اور کہنے لگا اے شیخؒ! مجھے کلمہ تلقین فرمائیے۔ وہ مسلمان ہو گیا اور جماعت اولیاء میں سے ایک ولی نکلا۔

حضرت شیخ ابوعلی سیاح رحمۃ اللہ علیہ سے لوگوں نے پوچھا کہ خرقہ کس کے لیے پہننا درست ہے؟ فرمایا: اس کے لیے کہ مملکت الہیہ میں تمام احکام و احوال اس کے حکم بغیر ظہور پذیر نہ ہوں۔

اب واضح ہو گیا کہ خرقہ صالحین اور اللہ کے نیک بندوں کا لباس ہے اور فقراء و صوفیاء اسے ملبوس فرماتے ہیں اور حقائق فقر و حقیقت صفوۃ ہم اس سے قبل بیان کر چکے ہیں۔
تو یاد رکھو جو کوئی لباس اولیاء کو کسب دنیا کے لیے آلہ بنالے گا وہ اپنے لیے آفت مول لے گا۔ فقراء و صوفیاء کا اس میں زیادہ نقصان نہیں۔

ہدایت یافتہ لوگوں کے لیے جو کچھ لکھا ہے وہ ہی کافی ہے۔ اگر ہم اس کی شرع کی طرف مشغول ہو جائیں تو یہ کتاب کافی نہیں ہوگی۔ وَ بِاللّٰهِ التَّوْفِیْقِ .



فقر و صفوت

فصل:

فقر اور صفوت کے فضائل میں علماء طریقت کا اختلاف ہے۔ ایک جماعت کے نزدیک فقر افضل ہے اور ایک کے نزدیک صفوت فقر سے افضل ہے۔ وہ لوگ جو فقر کو صفوت پر ترجیح دیتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ فقر فناء کلی کا نام ہے اور اس میں انقطاع اسرار ہو جاتا ہے اور صفوت مقامات فقر کے ایک مقام کا نام ہے اور جب فنا حاصل ہوگئی تو تمام مقامات ناچیز ہو گئے اور یہ مسئلہ بحث فقر و غنا کے ساتھ متعلق ہے جس کی تصریح ہم اوّل کر چکے ہیں۔

اور جو لوگ صفوت کو فقر پر مقدم رکھتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ فقر ایک چیز ہے جو موسوم بہ اسم ہے اور صفوت نام ہے تمام موجودات سے صفائی حاصل کرنے کا۔ اور جو صفوت عین فناء رہے اور فقر عین بقا تو معلوم ہوا کہ فقر نام ہے مقامات و درجات صفوت سے کسی درجہ یا مقام کا اور صفوت مقام کمال کا نام ہے۔

اس بحث میں بات بہت طول پکڑ گئی ہے اور اس زمانہ میں تو عجیب و غریب طریقہ سے فقر و صفوت کی تعبیرات پیش کی جا رہی ہیں اور ایک جماعت دوسری جماعت پر عجیب و غریب طریقے سے دلائل قائم کر رہی ہے اور درحقیقت یہ لوگ فقر و صفوت کی فضیلت اور اس کی حقیقت سے بالکل ناواقف ہیں اور بغیر سوچے سمجھے مقدم موخر بنا رہے ہیں۔

یاد رکھو! اس امر پر سب کا اتفاق ہے کہ زبانی جمع خرچ کر کے محض تقریر کر دینے کا نام نہ فقر ہے نہ صفوت، اور عوام نے جو اپنے ذہنی و وہمی تخیلات کے گھوڑے دوڑائے تو اپنے اپنے خیال کے مطابق معنی گھڑ لیے اور حقیقت معنی سمجھنے سے اپنے دل اور ذہن کو خالی کر کے روشِ حق و صداقت سے دُور ہو گئے کسی نے فہمی حرص کا نام فہمی عین رکھ لیا اور اثبات مراد کا نام اثبات عین گھڑ لیا۔

اور حقیقت یہ ہے کہ موجودہ مقصود منفی و مثبت تمام کے تمام ایسے ہیں کہ قیام نفس و وجود ہوا نفسانی اور اس کے طریقوں سے مزہ ہیں اور طریقت جھوٹے مدعیوں کی لغو باتوں سے بالکل پاک ہے۔

مختصر یہ کہ اولیاءِ الہی اس مقام پر پہنچ جاتے ہیں جہاں مکان و مقام ہی نہیں ہوتا اور تمام

مکان و مقام وہاں فنا ہوتے ہیں اور زبانی الفاظ اور عبارتیں اس حقیقت کے معنی بیان کرنے سے منقطع ہوتی ہیں۔ حتیٰ کہ نہ شرب رہتا ہے نہ ذائقہ، نہ ممتنع، نہ قہر، نہ صحو، نہ نحو۔ اس جگہ کا نام ارباب ظہور ہی ڈھونڈتے ہیں اور فکر کرتے ہیں کہ کوئی ایسا نام مل جائے کہ اس مقام پر چسپاں ہو سکے اور وہ مقام کسی نام کے نیچے آکر مسٹی بن جائے۔ لیکن جو مقام کہ معانی اسم کے تحت آہی نہیں سکتا اور اس پر کسی صفت کا استعمال ہی صحیح نہیں، اسے کسی اسم یا صفت سے کیونکر تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ تو مجبور ہو کر ارباب معنی کے نزدیک جو نام سب سے بزرگ نظر آیا اُسے اس مقام کے لیے مقرر کر دیتے ہیں۔

اور یہاں تقدیم و تاخیر کی اصل ہی نہیں۔ فقر و صفوت سے کسی کو مقدم و مؤخر کہنا بالکل ناروا ہے۔ تو خلاصہ یہ نکلا کہ ایک گروہ کو نام فقر زیادہ واجب الترتیب نظر آیا۔ اُن کے دلوں میں اس کی عظمت جاگزیں ہو گئی، اس لیے کہ نام فقر سے انہیں ترک ماسویٰ اللہ اور تواضع نظر آئی۔ دوسرے گروہ کو نام صفوت مقدم نظر آیا۔ اُن کے دلوں پر اس کی تعظیم و تکریم سکھ زن ہو گئی۔ اس لیے کہ رفح کدورت اور فناء آفات میں انہیں یہ نزدیک نظر آیا۔

غرضیکہ انہوں نے یہ دو نام ذریعہٴ اعلام بنانے چاہے۔ اگرچہ اس کی حقیقت الفاظ کا جامہ پہنا کر بیان نہیں ہو سکتی تھی۔ ان ناموں سے انہیں صرف یہ فائدہ حاصل ہو سکا، جس کی حقیقت بیان کرنے سے یہ قاصر تھے، انہیں ان اشارات کے ذریعے ایک دوسرے پر ظاہر کرتے رہیں اور ان ناموں کے ذریعے اپنے ذاتی کشف کو ہتھامہ ظاہر کر سکیں اور ان جماعتوں نے فقر یا صفوت اس درجہ کا نام رکھ لیا مگر پھر بھی حقیقت معنی میں کوئی اختلاف نہیں کیا۔ ہاں ارباب لسان یا اصحاب عبارات جو اس حقیقت سے محض بے خبر ہیں، انہیں محض الفاظ پر بحث کا میدان مل گیا اور ان میں سے کوئی فقر کو مقدم کہنے لگا، کوئی صفوت کو ترجیح دینے بیٹھ گیا اور یہ محض ان کی لفاظی یا لسانی ہے۔ یہ دونوں گروہ محض لفظی تحقیق معانی میں جا کر تاریکی عبارت میں رہ گئے۔ ان میں سے جسے حقیقت معنی منکشف ہو گئی وہ اہل حال میں مل کر اسے اور تحقیق حقیق کو اپنا قبلہ دلی بنا بیٹھے اور اسے اس کی پرواہ نہیں رہی کہ اُسے صوفی کہا جا رہا ہے یا فقیر۔ اس لیے کہ یہ دونوں نام اضطراری ہیں اور حقیقت فقر کے اسم کے تحت میں نہیں آسکتی۔

یہ اختلاف معنوی حضرت شیخ ابوالحسن سمنونی رحمۃ اللہ علیہ کے وقت سے چلا آ رہا ہے۔ اس لیے کہ وہ کبھی بحالت کشف فقر کو صفوت پر ترجیح دیتے، کبھی صفوت کو فقر پر۔ تو اس وقت کے محققین نے آپ سے عرض کی کہ حضرت ایسا کیوں کرتے ہیں؟ فرمایا: میرا ایک حال نہیں، کبھی

میری طبع معانی کو فناء و نگو نسااری کا مشرب حاصل ہوتا ہے اور بقاء کے درجہ میں بلندی کامل مل جاتی ہے اور کبھی ایسے مقام پر ہوتا ہوں کہ اُس کا تعلق فناء سے ہوتا ہے اور ایسی حالت میں فقر پر صفوت کو ترجیح دے دیتا ہوں اور جب اس درجہ پر ہوتا ہوں جس کا تعلق بقاء سے ہے تو صفوت پر فقر کو ترجیح دے دیتا ہوں اور اس لیے کہ فقر نام ہے بقاء کا اور صفوت فنا کا۔

تو چونکہ مقام فنا رویت کو خود سے بھی فنا کر دیتا ہے تو میری طبع معانی بھی فنا سے فنا ہو جاتی ہے اور مقام بقاء میں یہی فنا ہے اور یہ گفتگو اگرچہ از روئے عبادت خوب ہے مگر یاد رکھو کہ فنا کو بھی فنا نہیں اور بقاء کو بھی فنا نہیں اور جو باقی فانی ہوگا وہ خود سے ہی فانی ہوگا اور جو فانی باقی ہوگا وہ خود سے باقی ہوگا اور درحقیقت فنا بھی محض ایک ایسا اسم ہے جس میں مبالغہ محال ہے۔ حتیٰ کہ اگر کوئی کہے کہ فنا، فنا ہوتا ہے تو اس میں مبالغہ ہوا، معنی کے وجود کے اثر کی نفی کا۔ اس لیے کہ جو فنا ہو رہا ہے وہ جب تک فنا نہ ہو، اس وقت تک اس کا کچھ اثر باقی ہے اور جب تک اثر باقی ہے فنا نہیں اور جب فنا ہو چکا تو فنا کا فنا ہونا بے معنی ہوگا اور اس عبارت میں شیخ کے سوا کچھ حاصل نہیں اور یہ لسانیاں زبان دراز لوگوں کی سخن پروری کے ماتحت ہیں۔

اور کتاب ”فنا و بقاء“ میں ہم نے بھی ایک بحث لکھی تھی لیکن وہ اس وقت لکھی تھی جبکہ ہماری نوعمری کا جوش تھا اور جذباتِ حالیہ تیزی میں تھے۔ اس کتاب میں احتیاط کے ساتھ اس کے احکام و حقائق بیان کرتا ہوں۔ ان شاء اللہ عزوجل۔

اچھی طرح سمجھ لو! کہ فقر اور صفوت میں فرق معنوی یہ ہے کہ دنیا کی تجرید کی رو سے تو فقر و صفوت ایک ہے اور اپنے آپ کو اس سے خالی کر دینا یہ دوسری شان ہے اور پھر اس کی حقیقت فقر و مسکنت کے معنی میں ہوگی۔ ایک جماعت نے مشائخ کرام میں سے فرمایا ہے کہ فقیر، مسکین سے افضل ہے، اس لیے کہ حضرت جن مجاہد نے فرمایا:

﴿لِلْفُقَرَاءِ الَّذِينَ أُحْصِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ لَا يَسْتَطِيعُونَ ضَرْبًا فِي الْأَرْضِ﴾ (۱)

”مالِ زکوٰۃ ان فقراء کے لیے ہے جو اللہ کی راہ اور اس کی اطاعت میں ایسے

محصور ہیں کہ تجارت و رزق طلب کرنے کو زمین پر سیر نہیں کر سکتے۔“

اس لیے کہ مسکین صاحب مال ہوتا ہے اور فقیر تارک مال۔ تو ظاہر ہے کہ فقر عزت ہے اور

مسکنت ذلت اور صاحب مال طریقت میں ذلیل ہوتا ہے۔ کیونکہ حضرت سرور عالم ﷺ

نے فرمایا:

تَعِسَ عَبْدُ الدِّينَارِ وَ تَعِسَ عَبْدُ الدِّرْهَمِ وَ تَعِسَ عَبْدُ النِّخْمِصَةِ
وَالْقَطِيفَةِ . (۱)

”ہلاک ہو گیا دینار و درہم کا بندہ اور ہلاک ہو گیا تھیلے تھیلی کا پجاری اور تارک
معلوم یعنی جس کے پاس مال ہے اس کا تارک عزت والا ہے۔“

اس لیے کہ مال دار کا اعتماد اس مال پر ہوتا ہے اور جو تارک مال ہوگا اس کا بھروسہ رب
عز و جل پر ہوگا اور مالدار کو اگر کوئی کام ہوگا تو اپنا مال بڑھانے اور اس کے حاصل کرنے کے سوا اور
کوئی کام نہیں ہوگا۔

ایک جماعت نے کہا کہ مسکین افضل ہے، اس لیے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دعا

میں فرمایا:

اَللّٰهُمَّ اَحْيِنِيْ مِسْكِيْنَا وَ اَمِتْنِيْ مِسْكِيْنَا وَ اَحْشُرْنِيْ فِيْ زُمْرَةِ
الْمَسَاكِيْنِ . (۲)

”اے میرے رب! مجھے مسکین ہی زندہ رکھ اور اسی حال میں دنیا سے اٹھا اور
میدانِ حشر میں بھی مساکین میں مجھے محشور فرما۔“

تو جب حضور سید عالم ﷺ مسکین کو یاد فرما کر اس طرح دعا کریں کہ اللہ مجھے مسکینوں
کی زندگی عطا فرما اور حالتِ رحلت میں بھی مسکین رکھ اور جب فقر کا تذکرہ فرمایا تو کہا:

كَادَ الْفَقْرُ اَنْ يُّكُوْنَ كُفْرًا . (۳)

۱۔ امام سخاویؒ اسے ”المقاصد الحسنه“ (ص: ۱۵۷) میں لائے ہیں اور فرمایا ہے کہ اسے امام بخاریؒ نے
ابوبکر بن عیاش سے، انہوں نے ابو حصین سے، انہوں نے ابو صالح سے اور انہوں نے حضرت ابو ہریرہؓ سے
مرفوعاً روایت کیا ہے، امام عسکری نے اسے حضرت امام حسنؓ سے، انہوں نے حضرت ابو ہریرہؓ سے مرفوعاً روایت
کیا ہے لیکن تعس عبد الدرہم الخ کی بجائے ”لعن عبد الدرہم الخ“ کے الفاظ ہیں۔

۲۔ اس حدیث کا تفصیلی ذکر پچھلے صفحات میں گزر چکا ہے۔

۳۔ اسے امام احمد بن منیع نے یزید الرقاشی کے طریق سے، انہوں نے حسن سے، انہوں نے حضرت انس رضی اللہ
عنه سے مرفوعاً روایت کیا ہے اور ابو مسلم الکشی نے اپنی ”سنن“ میں، امام طبرانی نے عمرو بن عثمان الکلابی سے،
اس نے عیسیٰ بن یونس سے، انہوں نے سلیمان تمیمی سے، انہوں نے حضرت انس سے مرفوعاً روایت کیا ہے۔
امام سیوطی اسے ”الجامع الصغیر“ میں لائے ہیں اور امام ابو نعیم نے (حلیۃ الاولیاء) کی طرف منسوب
کیا ہے، امام قضاوی نے ”مسند الشہاب“ میں (بقیہ حواشی اگلے صفحہ پر۔۔۔۔۔)

”قریب ہے کہ فقر کفر بن جائے۔“

اس لیے فقیر وہ ہوتا ہے جو کسی سبب کے ساتھ وابستہ ہو اور مسکین وہ ہوتا ہے جو اسباب کو منقطع کر دے۔

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ سے)

اسے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے: كَادَ الْفَقْرُ أَنْ يَكُونَ كَفْرًا،
وَكَادَ الْحَسَدُ أَنْ يَسْبِقَ الْقَدْرَ،

امام زرکشی نے اسے ”التذکرة“ میں نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ اس کی شاہد روایات وہ ہیں جنہیں امام نسائی اور امام ابن حبان نے اپنی ”صحیح“ میں ابوالہشیم کے طریق سے، اس نے حضرت ابوسعید الخدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام بارگاہِ صدیت میں عرض کیا کرتے تھے:

اللهم اني اعوذ بك من الكفر والفقير، فقال رجل: ويعتد لان؟ قال: نعم. امام بیہقی نے اسے ”شعب الایمان“ (۴۳) میں، اور ابن عدی نے ”الکامل“ میں یحییٰ بن یمان کے طریق سے، انہوں نے ثوری سے، انہوں نے اعمش سے، انہوں نے یزید الرقاشی سے، انہوں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے۔ امام طبرانی نے اسے ”المعجم الأوسط“ میں عمرو بن عثمان الکلابی سے، انہوں نے عیسیٰ بن یونس سے، انہوں نے سلیمان التیمی سے، انہوں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ امام سخاوی نے ”المقاصد الحسنہ“ میں اس کی تمام اسناد کو ضعیف کہا ہے، امام عراقی نے ”المغنی عن حمل الأسفار فی الأسفار“ میں یزید کو ضعیف قرار دیا ہے، امام طبرانی نے ”المعجم الأوسط“ میں ایک اور سند سے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے: كَادَتِ الْحَاجَةُ أَنْ تَكُونَ كَفْرًا. اس میں بھی ضعف ہے، امام بیہقی نے ”مجمع الزوائد“ میں کہا ہے کہ طبرانی کی اسناد میں عمرو بن عثمان الکلابی کو ابن حبان نے ثقہ قرار دیا ہے اور وہ متروک ہے۔

حوالہ کے لیے دیکھیے: المقاصد الحسنہ للسخاوي (۷۸۹)، تمييز الطيب من الخبيث (۹۷۵) كشف الخفاء للعجلوني (۱۹۱۹) الجامع الصغير للسيوطي (۶۱۹۹) حلية الأولياء لأبي نعيم ۵۳/۳، ۳۰۹، ۲۵۳/۸، الجامع الكبير ۶۱۳/۱، أسنى المطالب (۱۰۲۷)، مسند الشهاب للقساضي (۱۰۰) الغماز على اللماز للسمهودي (۱۹۰)، الدرر المنتثرة للسيوطي (۳۲۶)، فيض القدير للمناوي ۵۳۲/۳، تاريخ اصبهان لأبي نعيم ۲۹۰/۱، المعجم الأوسط للطبراني (۲۷۳) شعب الایمان للبيهقي (۳۲۸)، المطالب العالیة ۱۳۹/۱، میزان الاعتدال ۲۶۲/۱، المغنی عن حمل الأسفار فی الأسفار للعراقي ۱۸۳/۳، مجمع الزوائد ومنبع الفوائد للهيثمی ۷۸/۸.

مزید برآں فقہ اسلامی میں ایک جماعت فقہاء کے نزدیک مسکین صاحبِ توشہ اور فقیر مجرد کو کہتے ہیں۔ تو اس جگہ اربابِ مقام مسکین کو صوفی کہتے ہیں۔ اور یہ اختلاف، اختلافِ فقہاء رضی اللہ عنہم سے ملتا ہوا ہے کہ بعض فقہاء کہتے ہیں کہ فقیر مجرد ہے اور مسکین صاحبِ توشہ تو فقیر افضل تر ہوا، صفوت سے۔ اور جن کے نزدیک مسکین مجرد کو کہتے ہیں اور فقیر صاحبِ توشہ کو تو ان کے یہاں صفوت افضل ہوگی فقر سے۔ یہ ہے خلاصہ احکام اختلافِ مشائخ کے فقر اور صفوت میں جو برسمبیل اختصار بیان کیے گئے۔

وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ



ملامت

فصل:

مشائخ طریقت کے ایک گروہ نے راہِ ملامت کو بھی پسند کیا ہے اور انہوں نے ملامت کے طریقے کو خلوص و محبت میں مؤثر عظیم مانا ہے اور ملامت کے ساتھ مردانِ خدا اور اہل حق بالعموم متفق ہیں۔ خصوصاً پیشوایانِ اُمتِ رسولِ کریم ﷺ جو امام و پیشوایِ اہل حق تھے اور ان سے بلند وہ پیش رو مجبان تھے، اُس وقت تک نیک نام رہے جب تک دلیلِ حق کا ظہور اور وحی آتی رہی۔ مگر جب لباسِ محبت و عشق پہنایا گیا تو لوگوں کی طرف سے اُن کے حق میں زبانِ ملامت دراز ہو گئی۔ بعض نے کہا: جا دو گر ہیں، کاہن ہیں۔ کسی جماعت نے کہا: شاعر ہیں۔ کسی نے کہا مجنون ہیں۔ کوئی کہنے لگا کاذب ہیں اور مثل اس کے بہت سی بد لگامی کی گئی مگر اللہ جل شانہ نے اُن کی تعریف میں فرمایا:

﴿لَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ ۚ ذَٰلِكُمْ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَن يَشَاءُ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ﴾ (۱)

”وہ لوگ کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے خوف نہیں کرتے۔ یہ اللہ کا فضل ہے کہ جسے چاہے عطا فرمائے اور اللہ بڑا وسیع العلم ہے۔“

اور سنتِ الہیہ بھی کچھ یہی ہے کہ جو اُسے یاد کرے اُس کے ذکر کو سنائے، عالم اس کی ملامت میں مشغول ہو جاتا ہے اور اس کے اندورنی راز مخفی کی نگہداشت اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اور یہ درحقیقت غیرتِ الہیہ ہے کہ اپنے محبوبوں کو غیروں کے دیکھنے سے بچا لیتا ہے تاکہ کوئی آنکھ اُس کے جمالِ باطنی پر نہ پڑے اور اس کی حقیقتِ حسن کو اس سے بھی مخفی فرما دیتا ہے تاکہ وہ اپنا جمال باکمال دیکھ کر مغرور نہ ہو جائیں اور آفتِ عجب و تکبر میں نہ پڑیں۔

تو اللہ تعالیٰ نے عوام کو اُن پر چھوڑا ہے تاکہ وہ ان پر زبانِ ملامت دراز کرتے رہیں اور نفسِ لوام ان کے اندر مرکب کیا ہے تاکہ انہیں ان کی کوتاہی پر ملامت کرتا رہے اور کسی فرد کو گذشت ہو جانے پر وہ اپنے پر ملامت کریں بلکہ اگر نیکی بھی کریں تو اس کے کم ہونے پر ملامت کریں اور یہ

راہِ مولا میں بڑی مضبوط جڑ ہے۔

کیونکہ عجب و تکبر سے بڑھ کر کوئی آفت اور حجاب نہیں اور عجب و تکبر کی جڑ دو چیزیں ہیں جن سے عجب و تکبر پیدا ہوتا ہے، وجاہت حاصل ہو جانا مخلوق میں اور مخلوق کی زبان سے اُس کی مدح سرائی۔ اور یہ اس طرح ہوتا ہے کہ کسی انسان کی گفتار و کردار کو عوام پسند کریں۔ اس کی مدح سرائی کریں اور اسے اس سے غرور پیدا ہو۔

دوسرے یہ کہ جو کام وہ کر رہا ہے، لوگ اسے پسند کرتے ہیں تو یہ اس کام کا اہل اور اس کے قابل اپنے آپ کو سمجھنے لگتا ہے اور اس وجہ میں متکبر بن جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے فضلِ خاص سے اس راستہ میں اپنے محبوبوں مقربوں پر یہ نظام فرما دیا ہے، تاکہ اس کے تمام کام اگرچہ نیک ہی ہوتے ہیں مگر عوام انہیں پسند نہ کریں اور عوام کے پسند کرنے کی یہ وجہ ہوتی ہے کہ وہ اس کام کی حقیقت کو دیکھنے سے قاصر ہیں اور مجاہدات و ریاضات ان مجاہدِ الہی کے بہت ہوتے ہیں مگر انہوں نے ان مجاہدات کو اپنی قوت کا نتیجہ کبھی نہیں سمجھا محض فضلِ الہی تصور کیا اور ان مجاہدات کی وجہ سے انہوں نے اپنی ذات کو پسندیدہ نظر سے نہیں دیکھا۔ اسی وجہ میں وہ تکبر سے محفوظ رہے۔

تو خلاصہ یہ ہوا کہ جسے اللہ پسند فرماتا ہے عوام اُسے پسند نہیں کرتے، اور جسے اپنا وجود پسند آیا اللہ تعالیٰ اسے پسند نہیں کرتا۔

جیسا کہ شیطان کہ اسے لوگوں نے پسند کیا اور ملائکہ نے بھی قبول کیا اور خود اس نے اپنے آپ کو اچھا سمجھا مگر اللہ تعالیٰ نے اسے پسند نہیں کیا تو لوگوں اور فرشتوں کا پسند کرنا اس کے لیے شمر لعنت بن گیا۔

اور آدم علیہ السلام کو اول ملائکہ نے پسند نہیں کیا اور صاف کہہ دیا:

﴿أَجْعَلُ فِيهَا مَنْ يُفْسِدُ فِيهَا﴾ (۱)

”کیا ایسے وجود کو دنیا میں وجود فرما رہا ہے جو فساد کرے۔“

اور خود آدم علیہ السلام نے اپنے وجود کو پسند نہ کیا اور عرض کر دیا:

﴿رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنْفُسَنَا﴾ (۲)

”اے ہمارے پروردگار ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا۔“

لیکن چونکہ آدم علیہ السلام پسندیدہ حق تھے تو جناب باری عزاسمہ کی طرف سے ارشاد ہوا:

﴿فَنَسِي وَكَمْ نَجِدُ لَهُ عَزْمًا﴾ (۱)

”سو وہ بھول گیا اور نہ پایا ہم نے اس کا کوئی عزم“۔

تو اللہ تعالیٰ کا پسند فرمانا آدم علیہ السلام کے لیے ثمر رحمت لایا تا کہ دنیا کے لوگ جان لیں کہ اللہ کا مقبول و مہجور خلق ہوتا ہے اور مقبول خلاق مہجور الہی ہوتا ہے۔

تو ثابت ہوا کہ ملامت خلق خدا علامت ہے محبوبان الہی کی، اور دلیل ہے اس کے مقرب بارگاہ ہونے کی اور جس طرح مقبول خلاق ہو کر خرم و شاد ہونا عام طور پر پسندیدہ ہے اسی طرح خاصان بارگاہ خلق کے ساتھ شاد کام و شادمان رہتے ہیں۔

حدیث میں آیا ہے کہ حضور ﷺ سے جبرائیل علیہ السلام نے عرض کیا اور جبرائیل علیہ السلام سے رب العزت جل مجدہ نے فرمایا:

أَوْلِيَانِي تَحْتَ قَبَائِي لَا يَعْرِفُهُمْ غَيْرِي إِلَّا أَوْلِيَانِي. (۲)

”میرے دوست میری قبا کے اندر ہیں، انہیں میرے اور میرے دوستوں کے سوا کوئی نہیں جانتا“۔

فصل:

ملامت کی تین صورتیں ہیں: راست روی۔ قصد کرنا۔ ترک کرنا

ایک سیدھا چلنے میں۔ دوسرے قصد کرنے میں۔ تیسرے ترک کرنے میں۔

راست روی میں صورت ملامت یہ ہے کہ اپنا کام کرتا رہے اور احکام دین کی پیروی کرے اور ہر معاملہ میں رعایت ملحوظ رکھے اور لوگ اسے ایسی حالت میں ملامت کریں جیسا کہ عوام کا رویہ ہے۔ مگر عارف کامل ان تین ملامتوں سے بھی بے تعلق اور فارغ ہو۔

اور قصد میں صورت ملامت یہ ہے کہ ایک شخص جبکہ اسے عز و جاہ کافی حاصل ہو چکی ہو اور لوگوں میں معزز و ممتاز ہو کر ان میں نشانہ ہو چکا ہو مگر اس کا دل اس عز و جاہ سے اور رجوع خلق سے متنفر ہو اور وہ چاہے کہ سب سے دل علیحدہ کر کے خلوت خاص میں اپنے جمیل حقیقی سے مشغول ہو تو اس تکلف کی وجہ میں لوگ ملامت کرنا شروع کر دیں، اور وہ بھی لوگوں کو دکھانے کے لیے ایسا طریقہ اختیار کرے جو خلاف شرع نہ ہو مگر اس رویہ سے لوگ اس کے ساتھ متنفر ہو جائیں مگر وہ خود لوگوں کے اس تنفر کی پرواہ نہ کرے۔ آخرش لوگ اس سے بے پرواہ ہو جائیں۔

۱۔ سورۃ طہ : ۱۱۵

۲۔ اسے امام غزالی نے ”احیاء العلوم“ ۳/۲۵۶ میں نقل کیا ہے۔

ترک کرنے میں صورتِ ملامت یوں ہوگی کہ کسی کا گریبان کفر و ضلالتِ طبعی سے یہاں تک پکڑے کہ وہ ترکِ شریعت اور انکارِ متابعتِ قانونِ اسلام کے لیے کہنے لگے اور کہتا پھرے کہ یہ طریقہ ملامت ہے جو میں نے اختیار کیا ہے اور درحقیقت میں راہِ راست پر ہوں۔ اس لیے کہ میری اصلی رفتارِ راست روی پر ہے اور نفاق و ریاء سے اجتناب کرنا ہے اور ایسی حالت میں اسے لوگوں کی ملامت کا خوف نہیں ہوتا اور اپنی دُھن میں پختہ رہتا ہے۔ جس نام سے لوگ اسے پکاریں وہ سب نام اس کی نظر میں برابر ہوں۔

ایک حکایت میں ہے کہ حضرت شیخ ابو طاہر حرمی رحمۃ اللہ علیہ ایک روز ایک گدھے پر سوار ہو کر بازار میں جا رہے تھے اور ان کے مرید اس گدھے کی باگ پکڑے ہوئے تھے۔ ایک شخص نے آوازہ کسا اور کہا یہ زندیق پھر آیا۔ مرید نے جب آواز سنی غیرتِ عقیدہ سے اس آواز کسنے والے کو مارنے کے لیے بڑھا۔ اس سے بازار کے لوگ جوش میں آگئے۔ شیخ ابو طاہر حرمی رحمۃ اللہ علیہ نے مرید سے فرمایا کہ اگر تو خاموش ہو جائے تو ہم تجھے ایسی چیز بتائیں گے کہ تیرا سارا رنج و محن جاتا رہے گا۔ مرید خاموش ہو گیا۔ جب اپنی جائے قیام پر تشریف لائے تو مرید کو حکم دیا کہ وہ صندوق لاؤ۔ مرید صندوق لایا۔ اس صندوق میں بہت سے خط بھرے ہوئے تھے۔ آپ نے ایک خط نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا اور فرمایا۔ دیکھ یہ متعدد لوگوں کے خطوط ہیں۔ ہر ایک نے میرے لیے علیحدہ علیحدہ نام رکھے ہیں۔ ایک مجھے ”شیخ الاسلام“ لکھ رہا ہے، ایک ”شیخ زکی“ اور ایک ”شیخ الحرمین“۔ اس طرح علیحدہ علیحدہ سب نے میرے نام رکھے ہیں، مگر جو میں ہوں وہ کبھی بھی نہیں لکھا۔ میرا نام کسی خط میں نہیں ہر ایک نے اپنے اعتقاد کے مطابق مجھے ایک لقب دے دیا ہے، اگر اس نے مجھے کوئی لقب دے دیا تو اس پر تو اتنا برا ہیجنتہ کیوں ہوا؟

اب یہ بھی سمجھ لے! جو اپنے طریقہ ملامت میں یہ قصد ہو کہ وہ جاہ، مرتبہ و ریاست ترک کرتا ہے تو وہ ایسا ہے جیسے کہ روایت ہے کہ حضرت امیر المؤمنین عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ ایک روز خرموں کے باغ سے تشریف لارہے تھے اور خرمہ کی خشک لکڑیوں کا گٹھا آپ کے سر پر تھا۔ باآنکہ آپ کے پاس چار سو غلام تھے۔ لوگوں نے عرض کیا: حضور! یہ کیا ہے؟ فرمایا:

أُرِيدُ أَنْ أَجُوبَ نَفْسِي.

”میں چاہتا ہوں کہ میں اپنے نفس کا تجربہ کروں۔“

میرے پاس اگرچہ بہت غلام ہیں، مگر میں دیکھتا ہوں کہ میرا نفس اس حال میں کیسا ہے، جاہ اعزاز و حشمت کی وجہ سے وہ بے کار تو نہیں ہو گیا۔ یہ حکایت شانِ ملامت کی صریح دلیل ہے اور

اس سے اثباتِ ملامت واضح ہے۔

ایسا ہی ایک حکایت میں امام اعظم رضی اللہ عنہ کا واقعہ ہے۔ اس کتاب میں جس جگہ ان کا ذکر ہوگا انشا اللہ وہاں لکھوں گا اور ابو یزید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپؐ سفر حجاز سے تشریف لائے تو منادی کرا دی گئی اور لوگوں میں شہرہ ہوا کہ بایزید تشریف لائے ہیں۔ شہر کے لوگ جمع ہوئے اور برائے استقبال شہر سے باہر آئے تاکہ اعزاز و اکرام کے ساتھ شہر میں لائیں۔ بایزید رحمۃ اللہ علیہ لوگوں کی آمد و رفت سے اُن کی طرف مشغول ہوئے اور محسوس فرمایا کہ اب دل بھی تقربِ حق سے بعید ہو رہا ہے۔ پریشان ہو گئے (تو آپ نے یہ حیلہ بنایا کہ) جب وسط شہر میں تشریف لائے تو ایک نکیہ روٹی کی نکال کر برسرِ راہ کھانا شروع فرمادی۔ عوام میں اس حالت سے منافرت پیدا ہو گئی اور آپؐ کو تنہا چھوڑ کر چل دیئے۔ اس لیے کہ یہ واقعہ رمضان شریف میں ہوا۔ حضرت بایزیدؑ نے اپنے اس مرید سے فرمایا جو آپ کا ہم سفر تھا، کہ دیکھا تو نے! ایک مسئلہ پر شریعتِ مطہرہ کے، میں نے عمل کیا تو لوگوں نے مجھے چھوڑ دیا اور آزاد کر دیا (یعنی مسئلہ شرعی یہ ہے کہ مسافر اگر بحالتِ مسافرت روزہ نہ رکھے تو اس پر گناہ نہیں۔ وہ ان روزوں کی قضا دوسرے ایام میں کر سکتا ہے) اور میں یعنی علی بن عثمان جلابی (رضی اللہ عنہ) کہتا ہوں کہ اس حالت میں حصولِ ملامت کے لیے ایک بُرا فعل ہونا بھی بہتر تھا اور کوئی چیز خلافِ عادت ظاہر کرنا مناسب، لیکن آج وہ زمانہ ہے کہ اب اگر چاہے کہ لوگ اس کو ملامت کریں تو یہی کافی ہے کہ کہہ دے، جا! اور دو رکعت نفل لمبے کر کے پڑھ یا اپنے دین کو مضبوطی سے تھام اور اتباعِ مکمل کر۔ تو آج عوام میں اس کہنے سے تجھے علی الفور منافق اور ریاکار کہہ دیں گے۔

لیکن وہ شخص جس کا طریقہ ترک ہے اور اس کی وجہ میں وہ کوئی بات خلافِ شریعت اختیار کر کے کہتا ہے کہ میں یہ ملامت کا طریقہ اختیار کرتا ہوں تو یہ صراحتاً گمراہی، وضاحتاً آفت اور ہوسِ کاذب ہے اور اس زمانہ میں ایسے بہت ہیں کہ اُن کا مقصود لوگوں کے رد کرنے سے اُن کا رجحان اپنی طرف بڑھانا ہے حالانکہ ردِ خلاق کرنا اسے زیبا ہے جو پہلے مقبول بارگاہ ہو چکا ہو، تو اس کے رد کرنے سے عوام اس کے اُس رویہ کا رد کرنے لگتے ہیں۔

اور جو پہلے ہی مقبول بارگاہ نہیں، وہ اگر لوگوں سے مجتنب رہے اور ردِ خلاق کرنے کا تکلف کرے تو یہ یقیناً لوگوں کو اپنی طرف رجوع کرنے کا بہانہ ہوگا۔

مجھے ایک مصنوعی ملامتی سے سابقہ پڑا۔ میں نے دیکھا کہ وہ کسی خراب فعل میں مرتکب تھا اور اس فعل پر ملامت کو عذر بنا رکھا تھا۔ ایک شخص نے اسے کہا کہ یہ بہانہ لغو ہے۔ میں نے اُسے

دیکھا کہ بڑا غضبناک ہو گیا۔ میں نے اسے کہا کہ تو درحقیقت ملامتی ہے اور یہ تیرا زبانی دعویٰ نہیں ہے۔ تو تیرے اس دعویٰ پر اس شخص کا انکار تیرے مقصد و مذہب کی تائید ہے اور جو تیرے خیالات و دعویٰ کی تائید کرتا ہے تو پھر اس پر تیرا غضبناک ہونا کیا معنی رکھتا ہے اور یہ قہر و غضب کس لیے؟ تیرا یہ رویہ اگرچہ مانند طریقہ ملامت ہے (مگر دراصل کچھ نہیں ہے)، ہمیشہ یاد رکھ کہ جو شخص کسی کو امر حق کی دعوت دیتا ہے، وہ کوئی دلیل بھی رکھتا ہے اور اس کی دلیل محافظتِ سنت ہے۔

پھر تجھ سے میں ترکِ فرض کا رویہ بھی دیکھ رہا ہوں اور لوگوں کو بھی اسی گمراہی کی طرف دعوت دے رہا ہے تو تیرا یہ انکار ملامت کے طریقہ پر نہیں بلکہ دائرہ اسلام سے خارج ہے۔

فصل:

یاد رکھو! مذہبِ ملامت کے اصول شیخ وقت ابو حمد ون قصاب رحمۃ اللہ علیہ نے جاری فرمائے اور طریقِ ملامت میں انہوں نے بہت سے لطائف و حقائق بیان فرمائے ہیں، چنانچہ فرماتے ہیں: **الْمَلَامَةُ تَرْكُ السَّلَامَةِ**. ”ملامت سلامتی ترک کر دینے کو کہتے ہیں“۔ جب کوئی آدمی کشفِ جلال اور طلبِ مال سے تبری حاصل کر لے اور مخلوقات میں رہ کر مخلوق سے ناامید ہو جائے تو وہ ترکِ سلامتی کا قصد کرتا ہے اور صاف فیصلہ کر لیتا ہے کہ مجھ پر بلائیں آئیں۔ میری تمام مالوفاتِ راحت مجھ سے چھن جائیں، اس لیے کہ میری طبیعت ان تمام چیزوں کی محبت سے آزاد ہو چکی ہے۔

اور حقیقت بھی یہی ہے کہ انسان جتنا ان چیزوں سے آزاد ہوتا جاتا ہے اپنے رب جل مجدہ کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے۔ تو سلامتی جس کی طرف عوام کو احتیاج ہوتی ہے، اہل ملامت اس سے اجتناب کرتے ہیں، اس لیے کہ ان کا مقصد عوام کے مقصد کے بالکل برعکس ہوتا ہے۔ عوام کی سلامتی و جاہ دنیا پر نظر ہوتی ہے۔ اہل ملامت کی اس سے پشت ہوتی ہے۔ اہل ملامت کی ہمت دنیا کی ہمت سے بالکل برعکس ہوتی ہے۔ اس لیے کہ صوفی اپنے اوصاف میں یکتا ہوتا ہے جیسا کہ حضرت احمد بن نائک رحمۃ اللہ علیہ حضرت حسین بن منصور سے روایت فرماتے ہیں کہ ان سے دریافت کیا گیا کہ:

مَنِ الصُّوفِيِّ؟ قَالَ وَجَدَ اِنْبِي الدَّاتِ.

”صوفی کون ہے؟ فرمایا: جو معرفتِ ذات کر چکا ہو۔“

اور حضرت ابو حمد ون سے ملامت کی بابت سوال ہوا۔ آپ نے فرمایا:

راہ آن بر خلق دشوار و مغلق است۔

”ملامت کا راستہ عوام پر دشوار بلکہ بند ہے۔“

مگر ہم کچھ بیان کرتے ہیں: رَجَاءُ الْمَرْجِيَّةِ وَخَوْفُ الْقَدْرِیَّةِ . ترس قدریاں اور امید مرجیاں صفتِ ملامت ہے اور اس جمال میں ایک رمز خاص ہے وہ یہ کہ ملامتی کی طبیعت درگاہِ الہی کے علاوہ کسی طرف راغب نہیں ہوتی اور ماسویٰ اللہ سے نفرت جتنی اسے ہے، کسی کو اس سے زائد نہیں۔ یہ ہمیشہ وجاہت سے متنفر رہتا ہے، برخلاف عوام کے کہ وہ اس حد تک اپنے لیے وجاہت ضرور چاہتا ہے کہ لوگ اسے پسند کریں اور اس کی تعریف ہو بلکہ اپنی تعریف کے لیے جان و دل سے مرجاتا ہے اور اسی تعریف کی خواہش میں اپنے رب جل مجدہ سے جدا ہو جاتا ہے۔

تو خائف ہمیشہ یہ خوف کرتا ہے کہ خطرہ اس پر نہ آئے اور اس وجہ میں وہ خطرہ کے مقام سے بچا رہتا ہے اور اس سعی و کوشش میں طالب کو دو خطرے پیش ہوتے ہیں:

ایک: خلقت کے حجاب کا خوف۔

دوسرے: ایسے فعل کا نہ کرنا جس سے لوگ اس کے فعل پر اس کے ساتھ گنہگار ہوں اور اس پر عوام زبانِ ملامت دراز کریں۔

نہ یہ اسے منظور ہو کہ اس کی وجاہت میں لوگ آرام کریں نہ یہ گوارا کہ وہ اپنے میں کسی کو گنہگار کرے تو ملامتی کو بالخصوص یہ لازم ہے کہ دنیا و عاقبت کی خصومت جو اس کے معاملہ میں ہے اس سے انقطاع کرے اور نجاتِ دل کے لیے وہ کام کرے جو شریعتِ مطہرہ میں نہ کبیرہ ہونہ صغیرہ تاکہ لوگ اسے رُو کریں اور اس کا خوف اُس کے معاملات میں مثل خوفِ قدریاں رہ جائے اور اس کی امید معاملہ ذاتی میں ملامت کرنے والوں کی طرف سے مثل امید مرجیان ہو۔

اور دوستی و محبت کے حقائق میں ملامت سے زیادہ خوشگوار کوئی چیز نہیں، اس لیے کہ دوست کے دل پر دوست کی ملامت کا اثر نہیں ہوتا اور دوست کو سوائے کوچہ گردی کوئے یار اور کسی سے سرو کا ربھی نہیں ہوتا اور بغیر کوئے یار اس کی گذر بھی مشکل ہے۔ اور اعتبار کا خطرہ دوست کے دل پر کبھی نہیں ہوتا۔

إِنَّ الْمَلَامَةَ رَوْضَةُ الْعَاشِقِينَ وَ نُزْهَةُ الْمُحِبِّينَ وَ رَاحَةُ الْمُشْتَاقِينَ وَ
سُرُورُ الْمُرِيدِينَ .

”ملامت عاشقوں کا باغ ہے، محبوں کی نزہت و تازگی ہے، مشتاقانِ جمال کی راحت ہے اور مریدینِ خالص کا سرور ہے۔“

یہ جماعت ملامت تن اختیار کر کے ثقلین میں ممتاز ہو گئے اور سلامتی دل میں کوئی ان کے

مقابل میں نہیں۔ مقربانِ بارگاہ اور کروہیاں خاص اور عالم ارواح والے ان کے اس درجہ کو نہیں پہنچتے اور سابقہ امتیوں میں اگرچہ زاہد، عابد، راغب، طالب گذرے اور رب کے چاہنے والے تھے مگر اس مرتبہ کو کوئی نہ پہنچا، سوا اس گروہ کے جو اس امت میں ہوا کہ اپنے سلوکِ طریقت میں سب سے دل منقطع کر کے اپنے دل سے تعلق رکھا۔

لیکن میرے نزدیک طلبِ ملامت ریا خالص ہے اور ریا، عین نفاق۔ اس لیے کہ ریا کار اس راستہ پر چلنا پسند کرتا ہے جس میں عوام کی نگاہیں تکلف پائیں اور لوگ اسے اس راہ پر چلنے کی وجہ سے پسند کریں اور ملامتی اس راستہ پر جاتا ہے جس راستہ پر جاتے ہوئے کو لوگ رد کر دیں اور یہ دونوں قسم کے ملامتی مخلوق میں موجود ہیں۔ اور دونوں کو سوا اس کے اور کسی جگہ سے گذرنا بھی ناممکن ہے۔ ایک ایسی صورت میں ظاہر ہے تو دوسرا ویسی شکل میں، اور درویش کو مخلوق کی کسی بات سے تعلق ہی نہیں تو جبکہ اس کا دل مخلوق سے بے تعلق ہو چکا اور وہ ان دونوں قسموں سے آزاد ہے تو پھر کسی چیز کا پابند نہیں۔

مجھے ایک بار ماوراء النہر کے ملامتی سے ملاقات کا اتفاق ہوا تو جب وہ بے تکلف ہو گیا تو میں نے اس سے کہا: بھائی اس قسم کے شوریدہ افعال سے تمہاری کیا مراد ہے؟ کہنے لگا، مخلوق سے اپنے کو چھپانا۔ میں نے کہا کہ لوگ بہت ہیں اور تیری عمر کم، تو زمانہ میں ان سے پیچھا چھڑانے میں کامیاب نہیں ہو سکے گا لہذا تو خود ان کو کیوں نہیں چھوڑ دیتا تا کہ اس مشغل سے بھی تو آزاد ہو جائے اور ایسے لوگ ہوتے ہیں کہ لوگوں میں مشغول ہوتے ہیں، ان کا یہ خیال ہوتا ہے کہ لوگ ان کی طرف مشغول ہیں۔ تو ایسا کیوں نہیں کرتا کہ تو اپنے کو نہ دیکھ تا کہ پھر تجھے کوئی نہ دیکھے۔ جب زمانہ کی الفت کی بلا تو نے دیکھی ہوئی ہے تو تجھے غیر سے کیا کام۔ جس کو کچھ نہ کھانے سے ہی شفا مل جاتی ہے، اُسے دوا کھانے کی کیا حاجت اور اگر وہ ایسا کر رہا ہے تو مرد نہیں۔

ایک گروہ محض ریاضتِ نفس کے لیے اپنے کو ملامتی بنا لیتا ہے تا کہ انہیں لوگ خوار کریں اور اس خواری سے اُن کا نفس ادب سیکھے، کیونکہ اُن کی خوشی اسی میں ہوتی ہے کہ اپنے نفس کو خواری اور ابتلاء میں دیکھیں۔

حضرت ابراہیم ادھم رحمۃ اللہ علیہ سے ایک حکایت ہے۔ کسی نے ان سے پوچھا کہ کبھی آپ اپنی مراد کو پہنچے ہیں یا نہیں؟ فرمایا: ہاں! دو بار مراد ملی ہے۔ ایک بار میں کشتی میں تھا اور کوئی مجھے وہاں نہیں جانتا تھا۔ میں نے بہت میلے کپڑے پہن رکھے تھے اور میرے سر کے بال لمبے تھے۔ میں اسی حالت میں کشتی میں سوار تھا کہ لوگ میری تحقیر کرنے لگے اور میرا مذاق اڑانے لگے۔

ان لوگوں میں ایک شخص ایسا بھی تھا جو تمسخر کرتے کرتے میرے سر کے بال نوچنے، کھسوٹنے لگ گیا اور لوگ مجھ سے تمسخر کرتے کرتے میرا اذواق اڑانے میں مشغول ہو گئے اور میں اپنے دل میں اس سے خوش تھا اور مراد دلی پارہا تھا۔ ہوتے ہوتے میری خوشی اپنی حد کو پہنچی اور وہ اس طرح کہ ایک مسخرے نے مجھ پر اٹھ کر پیشاب کر دیا۔

دوسری بار اس طرح مراد کو پہنچا کہ تیز بارش ہو رہی تھی اور میں جا رہا تھا کہ ایک گاؤں میں پہنچا۔ سردی کے موسم نے مجھ پر شدت کر رکھی تھی اور میرا خرقہ پانی میں شرابور تھا۔ میں ایک مسجد میں گیا۔ وہاں لوگوں نے مجھے رہنے نہ دیا۔ وہاں سے دو اور مسجدیں دیکھیں مگر وہاں سے بھی نکال دیا۔ سردی کی وجہ سے میرا دل لرز رہا تھا۔ میں ایک حمام کے چولہے پر گیا اور اپنا خرقہ اس پر تان دیا۔ اُس بھٹی کا دھواں جو گھٹا اس نے میرے کپڑے اور میرا منہ سیاہ کر دیا۔ اس وقت بھی میں اپنی مراد کو پہنچا۔

اور مجھے بھی (یعنی حضرت علی بن عثمان جلابی رحمۃ اللہ علیہ کو) ایک دفعہ ایسا واقعہ گذرا، میں نے اس امید پر بہت کوشش کی کہ کسی طرح یہ واقعہ حل ہو، مگر حل نہ ہوا۔ اور ایک دفعہ اس سے بھی قبل ایسا ہی واقعہ پیش آیا تو میں مزارِ حضرت شیخ بایزید رحمۃ اللہ علیہ کا اس وقت تک مجاور بنا رہا، جب تک وہ حل نہ ہوا، آخر حل ہو گیا۔

اس دفعہ بھی وہاں کا قصد کیا اور تین بار مزارِ پاک کی مجاورت کی تاکہ حل ہو، مگر نہ ہوا۔ ہر روز تین بار غسل کیے، تیس بار وضو کیے اور امید کشف میں رہا مگر بالکل انکشاف نہ ہوا۔ آخر اٹھا اور خراسان کا سفر اختیار کیا۔ اس شہر میں ایک شب اس علاقہ کے ایک گاؤں ”کمس“ نامی میں اترا۔ یہاں ایک خانقاہ تھی اور اس خانقاہ پر جماعتِ متصوفین موجود تھی۔ میں نے خرقہ خشیش یعنی ٹاٹ کا کرتہ پہنا ہوا تھا اور نہایت تھکا ہوا تھا۔ میرے پاس سامانِ اہلِ رسم میں سے کچھ نہ تھا، سوا ایک عصا اور کوزہ کے یعنی ایک ہاتھ کی لکڑی اور چمڑے کے لوٹے کے سوا سامان نہ تھا۔

وہاں کے صوفیوں کی نظروں میں بہت حقیر نظر آیا اور میرا جاننے والا اس جماعت میں کوئی نہ تھا۔ انہوں نے مجھے دیکھ کر عام رسم کے مطابق آپس میں گفتگو کی کہ یہ شخص ہم میں سے نہیں ہے اور بات بھی یہی تھی جو انہوں نے کہی تھی۔ میں فی الواقع ان میں سے نہیں تھا۔ لیکن میرے لیے لابدی تھا کہ اُس شب اُس جگہ رہوں۔ مجھے انہوں نے ایک بالاخانہ پر بٹھا دیا اور خود اس سے اونچے بالاخانہ پر بیٹھ گئے۔

مجھ کو انہوں نے ایک روٹی پھینک دی جو بس کر سبز رنگ کی ہو چکی تھی۔ میں اس کھانے

کی یو سو نگھ رہا تھا جو وہ کھا رہے تھے اور میرے ساتھ طنز باتیں بھی کرتے جاتے تھے۔ بالا خانہ پر جب وہ کھانے سے فارغ ہو گئے تو خر بوزہ کھانے لگے اور اس کے چھلکے میرے اوپر پھینکتے رہے، اس لیے کہ میں ان کی نظروں میں بہت حقیر تھا۔ آخر میں نے اپنے دل میں کہا: الہی! اگر یہ لوگ وہ ہیں جو تیرے دوست ہیں تو جامہ دوست انہیں کیوں مل گیا یا مجھے ان سے علیحدہ نہ کیا ہوتا۔ غرضیکہ جس قدر ان کی طعن مجھ پر زیادہ ہوتی جاتی تھی میرا دل اندر سے بہت خوش ہو رہا تھا، حتیٰ کہ ان کی طعن و طنز کے بوجھ سے مجھ پر میرا واقعہ حل ہو گیا اور میں نے سمجھ لیا کہ مشائخ نے ان جاہلوں کو کس لیے اپنے اندر رکھا ہوا ہے اور ان کا بار کیوں اٹھائے ہوئے ہیں۔

یہ ہیں احکامِ ملامت جو پوری تحقیق سے میں نے حاصل کیے۔

بتوفیق الہی تبارک و تعالیٰ



صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم

فصل:

اب ہم اُن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا احوال بیان کرتے ہیں جو صحابہ کرامؓ کے پیش رو اور امام گذرے ہیں اور بعد انبیاء سب سے افضل اور معاملات میں سب کے پیشوا اور انفاسِ زکیہ میں قواد اور اہل حال کی جماعت میں بعد انبیاء سابقین الاولین اور تمام مہاجرین و انصار سے افضل تر ہیں، تاکہ تیری مراد معلومات پوری ہو۔ ان شاء اللہ عزوجل

ان میں شیخ الاسلام، بعد انبیاء خیر الانام، خلیفہ پیغمبر و امام سید اہل تجرید، شہنشاہِ اربابِ تفرید و آفاتِ انسانی سے بعید امیر المؤمنین حضرت ابو بکر عبداللہ ابن عثمان الصدیق رضی اللہ عنہ ہیں۔ آپؓ کی کرامات مشہور ہیں اور احکامات و معاملات میں آپؓ کے قوی دلائل ہیں اور مسائل و حقائق تصوف میں مشہور۔ آپؓ کا کچھ حال تصوف کے باب میں ذکر کیا گیا ہے اس وجہ میں مشائخ کرام آپؓ کو پیشوا اور اہل مشاہدہ مانتے ہیں (اس لیے کہ صاحبِ مشاہدہ جو ہوتا ہے اس کا حال دوسروں پر کم اور بہت کم منکشف ہوتا ہے) اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو ان کی سخت گیری کی وجہ میں پیشوا و مجاہدین مانتے ہیں۔ احادیث میں آیا ہے اور علماء میں مشہور ہے کہ سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ رات کے وقت نماز میں قرآن کریم آہستہ آہستہ تلاوت فرماتے اور جب سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نماز پڑھتے قرآن کریم با آواز پڑھتے۔ حضور ﷺ نے حضرت صدیق رضی اللہ عنہ سے دریافت فرمایا کہ تم آہستہ تلاوت کیوں کرتے ہو؟ عرض کیا: حضور! اَسْمَعُ مِنْ اُنَا جِیْہِہ۔ ”حضور! اس لیے آہستہ پڑھتا ہوں کہ میں جانتا ہوں کہ جس کی مناجات کر رہا ہوں وہ مجھ سے غائب نہیں۔“ اور اس کی سماعت ایسی ہے کہ اس کے لیے نزدیک و بعید اور آہستہ پڑھنا یا بلند آواز سے پڑھنا برابر ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے پوچھا۔ عرض کیا:

أَوْقِظُ الْوَسْطَانَ أَيْ النَّائِمَ وَ أَطْرُدُ الشَّيْطَانَ.

”میں سوتے ہوئے لوگوں کو جگاتا ہوں اور شیطان کو بھگاتا ہوں۔“

یہ شانِ مجاہدات کا مظاہرہ تھا اور وہ شانِ مشاہدات کا، اور یہ امر واضح ہے کہ مشاہدہ نے

اندر مجاہدہ اس طرح ہے جیسے قطرہ دریا میں اور یہی وجہ تھی کہ حضور ﷺ نے فرمایا: هَلْ اَنْتَ

إِلْحَسَنَةً مِّنْ حَسَنَاتِ أَبِي بَكْرٍ ”عمر تم ابو بکر کی بھلائیوں میں سے ایک حصہ میں ہو۔“ جب عمر فاروق رضی اللہ عنہ جیسی جلیل القدر ہستی جن سے عزت وقار اسلام ترقی پر آیا۔ وہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے مقابلہ میں ایک حصہ بھلائی کے مالک ہیں تو غور کر کے دیکھ دنیا کے لوگ آپ کے مقابلہ میں کس درجہ پر ہوں گے پھر باوجود اس شان کے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں :

”دَارُنَا فَانِيَةٌ وَأَحْوَالُنَا عَارِيَةٌ وَأَنْفُسُنَا مَحْدُودَةٌ وَكَسَلُنَا مَوْجُودَةٌ.“
 ”ہمارا گھر فانی ہے ہمارے حالات پرائے ہیں اور ہمارے گنتی کے سانس ہیں اور ہماری سستی بدستور موجود ہے۔“

تو سرائے فانی میں دل لگانا، عمارت کرنا جہالت کے مقتضیات سے ہے اور اپنے حالات و کوائف پر بھروسہ کرنا حماقت و بیوقوفی ہے اور چند سانس کے بھروسہ پر دل لگانا غفلت محض ہے اور اپنی کاہلی اور سستی کو دین کہنا خیانت مجرمانہ ہے جو موجب حرمان و نقصان ہے۔

اس لیے کہ جو چیز عاریۃ آئے وہ واپس جائے گی اور جو چیز گذرنے والی ہے وہ فانی ہے اور کبھی نہیں رہ سکتی اور جو گنتی کے ساتھ ملی وہ ضرور ختم ہوگی اور کاہلی و سستی اس کی دوا معدوم ہے۔ اس فرمان میں صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے ہمیں ہوشیار فرمایا کہ دنیا اور دنیا کی چیزیں اس قابل نہیں کہ ان سے دل لگایا جائے۔ اس لیے کہ جو مشغول بہ فانی ہو گیا وہ باقی کے ساتھ محبوب ہو جائے گا۔ تو جب دنیا اور نفس امارہ طالب حق کے لیے زبردست حجاب ہیں تو مجھے لازم ہے کہ ان سے عرض کروں اور جب جان لیا کہ عاریۃ جو چیز ملتی ہے وہ دوسرے کی ملک ہوتی ہے تو جو چیز کسی اور کی ملک ہے، اس سے اپنا دست تصرف کوتاہ رکھنا ہی مناسب ہے۔

اور ان ہی حضرت صدیق رضی اللہ عنہ سے ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ نے اپنی دعاؤں میں فرمایا:

اللَّهُمَّ ابْسُطْ لِي الدُّنْيَا وَزَهِّدْ لِي فِيهَا.

”اللہ! میرے لیے دنیا فراخ فرما دے اور مجھے دنیا سے زاہد رکھ یعنی جب مجھ پر دنیا فراخ ہو جائے تو مجھے اس کی آفتوں سے محفوظ رکھ۔“

اس دعا کے ضمن میں ایک رمز ہے، یعنی پہلے مال عطا فرماتا کہ اس کا شکر ادا کروں، پھر ایسی توفیق دے کہ تیرے لیے اس سے ہاتھ کھینچ لوں اور اس سے مستغنی ہو کر منہ پھیر لوں تاکہ مجھے شکر گزاری اور انفاق فی سبیل اللہ کا درجہ حاصل ہو جائے اور درجہ صبر بھی اتنا عطا فرما کہ بحالت فقر

مضطر نہ ہو جاؤں تاکہ فقر اختیار ہو۔ پھر اس میں معاملات کا قول درست ثابت ہوتا ہے، جو کہ فرمایا ہے: جس کا فقر اضطراری ہو، وہ مصنوعی ہے اور جس کا فقر اختیاری ہو وہ ہے کہ اس کا یہ کسب فقر، جلب فقر سے منقطع ہوتا ہے تو وہ فقر اس سے بہتر ہے جو بہ تکلف اپنے لیے کوئی دوسرا درجہ بنائے۔

ہم کہتے ہیں کہ فقر کی صفت زیادہ تر ظاہر تب ہو سکتی ہے جبکہ بحالتِ غنا ارادہ فقر اس کے دل پر مستولی ہو اور اس حد تک اس ارادہ کو عملی جامہ پہنائے کہ ابنائے بنی آدم کی تمام مرغوب چیزوں سے دل کا رجحان ہٹالے اور وہ تمام مرغوب انسان اشیاء کے مجموعہ کا نام دنیا ہے نہ یہ کہ بحالتِ فقر و غنا کی خواہش اس کے دل پر مستولی ہو اور اس حد تک دنیا حاصل کرنے میں سعی کرے کہ حصولِ درہم دینار کے لیے بارگاہِ امراء و سلاطین پر جہ سلائی کرتا پھرے۔ تو اچھی طرح سمجھ لو کہ صفتِ فکر یہ ہے کہ وہ غنا سے فکر کی طرف آئے یہ کہ بحالتِ فقر طالبِ ریاست ہو جائے۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی ہستی مبارک وہ ہستی ہے کہ: ”أَفْضَلُ الْبَشَرِ بَعْدَ الْأَنْبِيَاءِ“ ہیں، اُن سے آگے بڑھ کر کسی کو قدم اٹھانا روا نہیں اور وہ ایسے الفاظ میں دعا فرما چکے ہیں (جو پہلے گزر چکی) اس لیے اختیاری فقر پر اضطراری فقر کو مقدم کرنا کسی طرح صحیح نہیں اور تمام مشائخ متصوفہ اسی مذہب پر ہیں۔ مگر ایک پیر جس کا ذکر ہم کر چکے ہیں اور اس کے حجت و دلائل نقل کر کے اس کا رد بھی کر دیا ہے اور اس رد کو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے اس قول سے اور مؤکد کرتے ہیں، جو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے فرمان کو زہری نے روایت کیا ہے۔ یہ دلیل واضح ہے کہ جب آپ نے خلافت کے لیے لوگوں سے بیعت لی، آپ ممبر پر جلوہ آراء ہوئے اور خطبہ پڑھا۔ خطبہ میں آپ نے فرمایا:

وَاللّٰهِ مَا كُنْتُ حَرِيصًا عَلَى الْأَمَارَةِ يَوْمًا وَلَا لَيْلَةً وَلَا كُنْتُ فِيهَا رَاغِبًا
وَلَا سَأَلْتُهَا اللَّهَ قَطُّ سِرًّا وَعَلَانِيَةً وَمَالِي فِي الْأَمَارَةِ مِنْ رَاحَةٍ.

”خدا کی قسم! میں اس خلافت و امارت کا حریص نہیں ہوں اور نہ تھا اور کسی رات دن میں اس کی خواہش میرے دل میں پیدا نہیں ہوئی اور میری رغبت اس کی طرف نہیں اور نہ میں نے کبھی اللہ تعالیٰ کے حضور خفیہ و علانیہ اس کے لیے دعا کی اور مجھے اس میں کوئی راحت و خوشی نہیں۔“

حقیقت حال یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ اپنے عبد صادق کو کمالِ صدق پر پہنچا دیتا ہے اور اس درجہ تمکین کے ساتھ معزز و ممتاز بنا دیتا ہے تو وہ کسی معاملہ کو اپنے اختیار میں نہیں رکھتا بلکہ منتظر ہوتا

ہے کہ بارگاہِ الہی کی طرف سے کیا حکم وارد و صادر ہوتا ہے۔ پھر اگر صدورِ حکم ہوتا ہے کہ فقیر بن کر رہ، تو فقیری پسند کر لیتا ہے اور حکم آتا ہے کہ امارت پر متمکن ہو تو امیر بن جاتا ہے۔ کسی معاملہ میں اسے اپنے اختیارات کا تصرف و اختیار نہیں ہوتا اور نہ وہ خود کسی معاملہ میں تصرف کرنا چاہتا ہے۔ جیسا کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کہ آپ نے ابتداء میں بھی تسلیم ہی اختیار فرمائی اور انتہاء تک اسی تسلیم و رضا کے محور پر رہے، چنانچہ تسلیم و رضا کے مسئلہ پر جتنے بعد میں ہوئے، سب کے سب اسی ہستی کو اپنا امام و پیشوا مانتے چلے آ رہے ہیں اور آپ تمام اربابِ تسلیم کے امام اور اہلِ طریقت کے پیشوا خاص ہیں، رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔

اور انہیں اجل صحابہ (رضی اللہ عنہم) میں سے سرہنگِ اہلِ ایمان، صلوکِ اربابِ احسان، امامِ اہلِ تحقیق، در بحرِ محبت غریق یعنی سردارِ اہلِ ایمان، پیشوائے اربابِ احسان، امامِ اہلِ تحقیق، محبت کے دریا میں غریق ابو حفص سیدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ تھے کہ آپ کی کرامات بہت مشہور ہیں اور آپ کی فراست و سیاست عالم میں مذکور ہے۔ بلکہ احکامِ دین کا تشدد اور سیاسیاتِ اسلامی کا تفرس آپ کا ضرب المثل ہے۔ آپ کی باریک بینی لطائف و طریقت میں اور آپ کے مسائل ذیقہ معانی تصوف میں مشہور ہیں۔ بلکہ خود سرورِ عالم ﷺ نے فرمایا:

الْحَقُّ يَنْطِقُ عَلَى لِسَانِ عُمَرَ (۱)

”حق زبانِ عمر (رضی اللہ عنہ) پر کلام فرماتا ہے۔“

اور فرمایا حضور ﷺ نے:

قَدْ كَانَ فِي الْأَمَمِ مُحَدِّثُونَ فَإِنْ يَكُ مِنْهُمْ فِي أُمَّتِي فَعُمَرُ رَضِيَ

اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ (۲).

- ۱۔ حدیث پاک کے مذکورہ الفاظ تو نہیں مل سکے مگر اس کی ہم معنی روایات موجود ہیں جنہیں امام ترمذی نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”ان اللہ جعل الحق علی لسان عمر و قلبہ“۔ حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ کی روایت کردہ حدیث شریف کے الفاظ یوں ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”ان اللہ وضع الحق علی لسان عمر یقول بہ“۔ جبکہ امام بیہقی نے ”دلائل النبوة“ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے طریق سے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے: ما کنا بعد ان السکينة تنطق علی لسان عمر۔ حوالہ کے لیے ملاحظہ کریں: مشکوٰۃ المصابیح (کتاب المناقب: باب مناقب عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ، حدیث: ۶۰۳۳، ۶۰۳۴، ۶۰۳۵)۔
- ۲۔ امام بخاری نے اپنی صحیح (۱۳۳۹/۳) فضائل الصحابة باب فضل عمر رضی اللہ عنہ میں حضرت ابو ہریرہ کے طریق سے، امام ترمذی نے مشکوٰۃ المصابیح ۱۷۰۲/۳ میں اور امام سراج طوسی نے کتاب اللمع (ص: ۱۳۵) میں ذکر کیا ہے۔

”پہلی امتوں میں محدث تھے اور اگر میری امت میں کوئی محدث ہے تو وہ عمر
(رضی اللہ عنہ) ہی ہے۔“

آپؐ کی طرف سے طریقت میں بے حد رموز و لطائف مذکور ہیں، حتیٰ کہ ان سب کا
احصار احاطہ اس کتاب میں نہیں ہو سکتا۔ تاہم بعض ان میں سے نقل کرتا ہوں۔
آپؐ نے فرمایا:

الْعَزَلَةُ رَاحَةٌ مِّنْ خُلَطَاءِ السُّوءِ.

”گوشہ نشینی موجبِ راحت ہے بُرے ہم نشین و مصاحبین کے اندر رہنے سے۔“

عزالت دو قسم کا ہے: ایک اعراض از مخلوقات۔ دوسرے انقطاع اس مخلوقات سے۔

خلقت سے منہ موڑنا ایسی صورت ہے کہ کسی علیحدہ مقام میں جا بیٹھے اور علانیہ طور پر صحبت

ابنائے جنسی سے بے زار ہو جائے اور اس تخلیہ میں بیٹھ کر اپنے عیوب کی نگرانی کرے اور اپنے لیے

مخالفتِ اغیار سے اتنی خلاصی پائے کہ لوگوں کو اپنی طرف سے ہر قسم کی بدی سے مامون کر دے۔

لیکن مخلوق سے انقطاع دل سے ہوتا ہے اور اس تعلقِ دلی کی صفت اس شان کی ہوتی ہے

کہ اسے ظاہر سے قطعاً تعلق نہیں ہوتا۔

اور جب انقطاعِ دل کے ساتھ مخلوق سے ہو جائے تو اس کے دل پر اندیشہِ مخلوق مستولی

رہتا ہے۔ اس وقت اس کی یہ شان ہوتی ہے کہ اگرچہ مخلوق میں ہو مگر مخلوق سے تنہا ہی ہوتا ہے اور

اس کی توجہ مخلوق سے بالکل علیحدہ ہوتی ہے اور یہ مقام نہایت بلند ہے اور ہر ایک کے لیے یہ شان

بہت بعید ہے۔ اس راہ میں صحیح اترنے والے اور اس صفت کے صحیح موصوف حضرت عمر فاروق رضی

اللہ تعالیٰ عنہ تھے کہ آپ رضی اللہ عنہ نے تخلیہ کی راحت کا پتہ دیا اور بظاہر لوگوں میں منصبِ امارت

اور تختِ خلافت پر جلوہ فرماتے۔

اور یہ دلیل واضح ہے کہ اہل باطن اگرچہ بظاہر مخلوق میں شامل ہوتے ہیں مگر ان کا دل

اپنے جمیل حقیقی کے ساتھ آویختہ ہوتا ہے بلکہ ہر حال میں حقِ جل و علا شانہ کی طرف رجوع

رہتے ہیں۔

اور جس قدر مخلوقات سے ان کی صحبت ہو، اُسے منجانب اللہ ایک بلا تصور کرتے ہیں اور

مخلوق کی طرف اس مجبوری سے رجحان کر لیتے ہیں کہ سمجھتے ہیں کہ محبوبانِ الہی دنیا سے قطعی طور پر

صاف نہیں ہو سکتے اور یہ اگرچہ انہیں گوارا نہیں، جیسا کہ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

”ذَا رَأَيْتَ عَلَى الْبَلْوَى بِلَا بَلْوَى مُجَاهًا.“

”جس گھر کی بنیاد بکلا پر رکھی گئی، مجال ہے کہ وہ بلا سے خالی ہو۔“

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اجل صحابہ، خاص اصحاب رسالت مآب ﷺ سے ہیں اور اس پایہ کے مقبول بارگاہ لم یزل ہیں کہ آپؐ کے تمام افعال بارگاہ ایزدپناہ میں مقبول ہیں، حتیٰ کہ جب آپؐ مشرف باسلام ہونے آئے تو پہلے جبریل علیہ السلام بشارت لائے اور عرض کی:

يَا مُحَمَّدُ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْكَ وَسَلَّمَ اَقْدِ اسْتَبَشَرَ اَهْلُ السَّمَاءِ الْيَوْمَ
بِاسْلَامِ عَمْرٍو.

”حضور! آج ملائکہ کو عمر کے اسلام کا مژدہ ملا ہے۔“

تو اس طائفہ صوفیاء میں خرقہ پوشی میں باقتداء عمر فاروق رضی اللہ عنہ جاری ہے اور صوفیاء کرامؒ کا مذہب میں سخت اور متصلب ہونا ہی اسی ہستی مقدس کی پیروی میں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بعد اسلام سب باتوں میں امام خلق ہوئے۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔

انہیں اجل صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں سے ابجد وفا بدرگاہ رضا، گنج حیا، اعبد اہل صفا، متعلق درگاہ کبریا، متجلے بطریق مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثناء ابو عمر و حضرت عثمان بن عفان باحیا رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں۔

آپؐ کا وجود باجود فوائد دین میں اظہر من الشمس ہے اور مقاصد اسلامی میں آپؐ کی فضیلت روشن ہے اور آپؐ کے مناقب ہر شان میں عام ہیں۔ حضرت عبد اللہ بن ربیع اور حضرت ابوقتاہدہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ”حرب الدار“ کے روز یعنی جس دن بلوایوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا محاصرہ کیا تھا، ہم امیر المومنین حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس حاضر تھے۔ جب بلوائی بارگاہ عثمانی میں جمع ہو گئے تو آپؐ کے غلاموں نے ہتھیار اٹھالیے اور مقابلہ کو آمادہ ہوئے۔ حضرت امیر المومنین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا جو میرا غلام ہتھیار اٹھانے سے رُکار ہے وہ میری طرف سے آزاد ہے۔ ہم خوفِ بلوہ کی وجہ سے باہر آئے تو راستے میں حضرت حسن بن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہمیں ملے۔ ان کی ہمراہی میں پھر واپس حضرت امیر المومنینؒ کی خدمت میں حاضر آئے تاکہ ہمیں اس امر کا علم ہو جائے کہ حضرت حسن بن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خدمت میں کس غرض سے تشریف لائے ہیں۔

حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ نے بعد سلام سنت الاسلام بلوایوں کی شرارت پر اظہارِ افسوس کرتے ہوئے اجازت چاہی کہ ان بلوایوں کو ان کے کیفرِ کردار تک پہنچایا جائے اور کہا کہ چونکہ آپؐ ہمارے سچے امام ہیں، لہذا آپؐ کی بلا اجازت ہمیں تلوار اٹھانا روا نہیں، اس لیے ہم

چاہتے ہیں کہ آپ سے اجازت حاصل کریں، پھر ان بلوائیوں کے فتنہ کو مٹائیں۔
امیر المومنین عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

يَا ابْنَ أُخِي أَرْجِعْ وَاجْلِسْ فِي بَيْتِكَ حَتَّى يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ
فَلَا حَاجَةَ لَنَا فِي إِهْرَاقِ الدِّمَاءِ.

”اے بھتیجے! واپس تشریف لے جاؤ اور گھر میں آرام کرو، حتیٰ کہ جو پردہ تقدیر میں ہے آجائے۔ ہمیں مسلمانوں کا خون بہانا، اُن پر قتل کا بازار گرم کرنا زیبا نہیں، نہ ایسے کاموں سے ہمیں سروکار ہے۔“

یہ علامات خاص تسلیم رضا کی تھیں کہ عین کربت و غربت اور دردِ بلا کی حالت میں ظاہر ہوئی اور یہ وہ درجہ خلعت ہے جو نمرود عَلَيهِ اللَعْنَةُ کی آگ دہکانے کے وقت ابراہیم علیہ السلام کو عطا ہوا تھا کہ جب منجنيق کے پلے میں آپ علیہ السلام کو ڈال کر آگ کی طرف پھینکا گیا تو جبرائیل امین علیہ السلام حاضر آئے اور عرض کی: هَلْ لَكَ مِنْ حَاجَةٍ؟ ”کیا اس وقت کوئی آپ کو حاجت ہے؟“ آپ نے فرمایا: أُمَّ الْإِيكِ فَلَا. ”جبریل! تمہاری طرف میری کوئی حاجت نہیں۔“ جبریل علیہ السلام نے عرض کی: حضور! اگر میری طرف کوئی حاجت نہیں تو معطی حقیقی رب جل مجدہ کے حضور اپنی حاجت پیش فرمادیں۔ فرمایا: حَسْبِي مِنْ سُؤَالِي عِلْمُهُ بِحَالِي. ”یعنی مجھ کو وہ جانتا ہے کہ اس وقت مجھ پر کیا ہو رہا ہے اور وہ مجھ سے دانا ہے۔ وہ عالم ہے کہ میرے لیے کس حال میں صلاحیت ہے اور کیا چیز میرے حق میں مفید ہے۔ تو ثابت ہوا کہ عثمان رضی اللہ عنہ اس مقام پر مقامِ خلیفہ ابراہیم علیہ السلام پر تھے کہ منجنيق اور اجتماعِ بلوائیاں بجائے آگ کے تھا اور حسن رضی اللہ عنہ بجائے جبریل علیہ السلام حاضر تھے۔

لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام عین بلا میں جا کر نجات پا چکے تھے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اس بلا میں ہلاک ہو گئے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نجات متعلق بہ بقاء ہے اور ہلاک متعلق بقاء۔ اس حقیقت کے متعلق ہم کچھ پہلے بیان کر چکے ہیں۔

تو اتفاقِ مال و ہدیہ جان اور تسلیمِ امور و اخلاص میں مشائخِ طریقت حضرت امیر المومنین عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے تابع ہیں اور وہ یقیناً شریعت و حقیقت میں سچے امام تھے اور ان کی تعلیم و داد و محبتِ اسلامی میں اظہر من الشمس ہے۔ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ

اور انہی میں برادرِ مصطفیٰ ﷺ، غریقِ بحرِ بلا، حریقِ نارِ وِلا، مقتداءِ اولیاء و اصفیاء ابوالحسن علی بن ابی طالب شیرِ خدا کرم اللہ وجہہ ہیں۔ ان کی شانِ جاوہِ طریقت میں بڑی ارفع و اعلیٰ ہے اور

بیان حقیقت میں ان کی باریک بینی بہت بلند ہے، آپ کا اصول حقائق میں خاص حصہ تھا، حتیٰ کہ جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ ان کی شان میں فرماتے ہیں:

شَيْنُنَا فِي الْأُصُولِ وَالْبَلَاءِ عَلِيُّ بْنُ الْمُؤْتَصِي رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ.
 ”یعنی اصول عشق و محبت اور راضی برضائِ الٰہی کے ماہر ہمارے شیخ و امام حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم ہیں۔“

گویا صاف فرما رہے ہیں کہ علم معاملات طریقت میں ہمارے امام حضرت علی کرم اللہ وجہہ ہیں، اور اصول اصطلاح صوفیاء میں علم تصوف اور طریقت کو کہتے ہیں اور طریقت میں عمل خاص جو ہے وہ بلاؤں کو برداشت کرتا ہے۔

روایت ہے کہ ایک شخص حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض پیرا ہوا کہ یا امیر المؤمنین! مجھے ہدایت فرمائیں۔ آپ نے فرمایا:

لَا تَجْعَلَنَّ اكْبَرَ شُغْلِكَ بِأَهْلِكَ وَوَلَدِكَ فَإِنْ يَكُنْ أَهْلُكَ
 وَوَلَدُكَ مِنْ أَوْلِيَاءِ اللَّهِ تَعَالَى فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَوْلِيَاءَهُ فَإِنْ كَانُوا
 أَعْدَاءَ اللَّهِ فَمَا هُمْكَ وَ شُغْلُكَ لِأَعْدَاءِ اللَّهِ سُبْحَانَهُ .

”یا درکھو! کہ مشغولیت کو بیوی بچوں میں اہمیت کے ساتھ نہ رجوع کرنا، اس لیے کہ اگر وہ اولیاء اللہ سے ہوئے تو اللہ تعالیٰ اپنے دوستوں کو خراب اور ضائع نہیں فرماتا اور اگر دشمن خدا ہوئے تو دشمنانِ خدا کے لیے غمخواری و ہمدردی کیوں ہو!!“

یہ مسئلہ انقطاع ماسویٰ اللہ سے متعلق ہے۔ اس لیے کہ اللہ جس طرح چاہے اپنے بندوں کو رکھتا ہے۔ جیسے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت شعیب علیہ السلام کی دختر نیک اختر کو سخت تنگ حالت میں چھوڑ دیا اور سپردِ خدا کر دیا۔ ابراہیم علیہ السلام نے حضرت حاجرہ کو اسماعیل علیہ السلام کے ساتھ ہمراہ لے جا کر انہیں جنگل میں چھوڑا جہاں زراعت وغیرہ بھی نہ تھی۔ ﴿يُوَادُّ غَيْرَ ذِي زَرْعٍ﴾ (۱) جس کی شان میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے اور خدا کے سپرد کر دیا اور ان میں اپنے آپ کو مشغول نہ کیا اور اپنا دل اپنے رب حقیقی کی طرف رجوع کر لیا۔ حتیٰ کہ ان دونوں کی مراد دو جہاں میں پوری ہوئی۔ بآئکہ بظاہر انہیں اپنے بحالت نامرادی میں چھوڑا گیا تھا مگر وہ اپنے سب کام اپنے رب عزوجل کے سپرد کیے ہوئے تھے۔

اسی قسم کی بات وہ ہے جو حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے ایک پوچھنے والے کو فرمائی، جبکہ آپؑ سے اس نے سوال کیا کہ پاکیزہ ترین عمل کیا ہے؟ فرمایا: غِنَاءُ الْقَلْبِ بِاللَّهِ. یعنی اللہ تعالیٰ کے تقرب کے ساتھ دل کا ہر شے سے مستغنی ہو جانا۔ حتیٰ کہ دنیا کے نہ ہونے سے فقیر نہ ہو اور مال کی کثرت کی وجہ میں مسرور نہ ہو۔ اس قول کی حقیقت اسی فقر و صفوت کی طرف جاتی ہے جس کا ذکر ہم کر چکے ہیں۔

تو اہل طریقت حضرت شیر خدا کرم اللہ وجہہ کی بیرونی حقائق عبارات و دقائق اشارات میں کرتے ہیں اور تجرید علوم دنیا و آخرت سے حاصل کرنے اور نظارۃ تقدیر حق میں رہنا بھی انہیں کی اطاعت کے ماتحت ہے اور لطائف کلام میں آپؑ کے مضامین اس قدر ہیں کہ ان کی گنتی نہیں ہو سکتی اور اس کتاب میں میرا رویہ اختصار پر ہے۔ وَاللَّهُ أَعْلَمُ.



اہل بیت رضی اللہ عنہم

اہل بیت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم وہ پاک ہستیاں ہیں کہ ان کے لیے پاکی ازلی ان کی ذات کے واسطے مخصوص ہے اور ان میں ہر ایک طریقت میں کامل اور مشائخ طریقت کے امام ہیں۔ عام اس سے کہ عوام میں سے ہوں یا خواص میں سے۔ میں ان کے ایک گروہ کا کچھ بیان کرتا ہوں۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

امام حسن سید الشہداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ:

ان میں سے جگر بند مصطفیٰ وریحانِ دل مرتضیٰ، قرۃ العین زہراء، ابو محمد حسن بن علی کرم اللہ وجہہ ہیں۔ ان کو طریقت میں نظر کامل عطا ہوئی اور تصوف کے مسائل حل کرنے اور اس کے دقائق بیان فرمانے میں آپ کو بڑا حصہ ملا ہے۔ آپ نے فرمایا:

”عَلَيْكُمْ بِحِفْظِ السَّرَائِرِ فَإِنَّ اللَّهَ مُطَّلِعٌ عَلَى الضَّمَائِرِ.“

”تمہیں اپنی اندرونی اسرار کا محفوظ رکھنا لازمی ہے اس لیے کہ اللہ ضمیروں کے حال کا جاننے والا ہے۔“

اس کا مطلب یہ ہے کہ بندہ کو حکم ہے کہ راز کے معاملات پر نگاہ رکھے اور اس کی محافظت ہمیشہ کرتا رہے تو رازِ الہیہ کا نگاہ رکھنا عدم التفات کی بالاغیار کو مستلزم ہے، اور اظہارِ راز کی محافظت کرنا مخالفتِ جبار کو مستلزم ہے۔

کہتے ہیں کہ جب قدریوں نے غلبہ پایا اور مذہب معتزلہ (یعنی منکرینِ عالم بطون) جہان میں پھیلا تو خواجہ حسن بصری رضی اللہ عنہ نے حضرت مولاء کائنات شیر خدا علی کرم اللہ وجہہ کے صاحبزادے حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کی خدمت میں عریضہ بھیجا جس پر یہ مرقوم تھا:

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ.

السَّلَامُ عَلَيْكَ يَا ابْنَ رَسُولِ اللَّهِ وَقُرَّةَ عَيْنِيهِ وَرَحْمَةَ اللَّهِ وَ
بَرَكَاتِهِ. أَمَا بَعْدُ فَإِنَّكُمْ مَعَاشِرُ بَنِي هَاشِمٍ كَالْفُلْكِ الْجَارِيَةِ فِي
بَحْرِ لُجِّيٍّ وَمَصَابِيحِ الدُّجِيِّ وَأَعْلَامِ الْهُدَى وَالْأَيْمَةِ الْقَادَةِ الَّذِينَ

مَنْ تَبِعَهُمْ نَجَا كَسَفِينَةَ نُوحٍ الْمَشْحُونَةِ الَّتِي يُتَوَلَّى إِلَيْهَا
 الْمُؤْمِنُونَ وَيُنَجُّوا فِيهَا الْمُسْتَمْسِكُونَ فَمَا قَوْلُكَ يَا ابْنَ رَسُولِ
 اللَّهِ عِنْدَ حَيْرَتِنَا فِي الْقَدْرِ وَاجْتِلَانِنَا فِي الْإِسْطِطَاعَةِ لِتَعْلَمِنَا بِمَا
 تَاكَّدَ عَلَيْهِ رَأْيُكَ فَإِنَّكُمْ ذُرِّيَّةٌ بَعْضُهَا مِنْ بَعْضٍ يَعْلَمُ اللَّهُ عِلْمَتُمْ
 وَهُوَ الشَّاهِدُ عَلَيْكُمْ وَأَنْتُمْ شُهَدَاءُ اللَّهِ عَلَى النَّاسِ . . . وَالسَّلَامُ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ!

”سلام ہو آپ پر اے فرزند سرور عالم اور نور چشم رسول! اور خدا کی رحمتیں اور
 برکتیں آپ پر ہمیشہ رہیں۔ آپ لوگ بنی ہاشم مثل ہمارے لیے ایسے کشتی کے
 ہیں جو موجزن دریا متلاطم میں چل رہی ہو اور آپ وہ ستارے ہیں کہ جو ان
 کی پیروی اور راہنمائی کے مطابق چلا، اس کو اس میں امن مل گئی اور جو آپ
 لوگوں کی پیروی کر لے گا، نجات پائے گا، جس طرح کشتی نوح علیہ السلام کے
 پیرو نجات پا گئے اور مومن ہو گئے۔ فرمائیے آپ کا کیا ارشاد ہے، اے ابن
 رسول ﷺ! ہمارے اس تئیر میں جو قدریوں کی وجہ سے پیدا ہوا اور وہ
 اختلاف جو اپنی اپنی معلومات کے ماتحت پیدا ہو گیا ہے، تاکہ ہم سمجھ سکیں کہ
 اس وقت آپ کا مسلک کیا ہے، اس لیے کہ آپ اہل بیت نبی اکرم ﷺ
 سے ہیں اور ہمارا عقیدہ ہے کہ آپ کا علم تعلیم الہی سے منقطع نہیں ہو سکتا، بلکہ
 وہ ذات پاک آپ کی نگہداشت و محافظت میں ہے اور آپ مخلوقات کے محافظ
 ہیں اور ان کے گواہ۔۔۔ والسلام۔“

جب یہ نامہ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کو ملا، آپ نے حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ کو

یہ جواب ارقام فرمایا:

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ.

أَمَّا بَعْدُ فَقَدْ أَتَى إِلَيَّ كِتَابُكَ عِنْدَ حَيْرَتِكَ وَحَيْرَةٍ مَنِ زَعَمَتْ مِنْ
 أُمَّتِنَا وَالَّذِي عَلَيْهِ رَأْيٌ إِنْ مَنْ لَمْ يُؤْمِنْ بِالْقَدْرِ خَيْرِهِ وَشَرِّهِ مِنَ اللَّهِ
 تَعَالَى فَقَدْ كَفَرَ وَمَنْ حَمَلَ الْمَعَاصِي عَلَى اللَّهِ فَقَدْ فَجَرَ إِنْ اللَّهُ لَا
 يُطَاعُ بِإِكْرَاهٍ وَلَا يُعْصَى لِغَلْبَةِ وَلَا يُمَهَّلُ الْعِبَادَ فِي مَلِكِهِ لَكِنَّهُ
 الْمَالِكُ لِمَا مَلَكَهُمْ وَالْقَادِرُ عَلَى مَا عَلَيْهِ مَا قَدَّرَهُمْ فَإِنْ ائْتَمَرُوا

بِالطَّاعَةِ لَمْ يَكُنْ صَادًّا وَلَا هُمْ عَنْهَا مُشْبَعًا وَإِنْ اتَّوَا بِالْمَعْصِيَةِ وَ
 شَاءَ أَنْ يُؤْمِنَ عَلَيْهِمْ فَيَحُولُ بَيْنَهُمْ وَبَيْنَهَا فَعَلَّ وَإِنْ لَمْ يَفْعَلْ فَلَيْسَ
 هُوَ حَمْلُهُمْ عَلَيْنَا إِجْبَارًا وَلَا الزَّمُّ إِكْرَاهًا بِأَحْتِجَاجِهِ عَلَيْهِمْ إِنْ
 عَرَفْتَهُمْ وَمَكَّنْتَهُمْ وَجَعَلَ لَهُمُ السَّبِيلَ إِلَى أَخَذِ مَا دَعَاهُمْ إِلَيْهِ وَ
 تَرَكَ مَا نَهَاهُمْ عَنْهُ وَ لِلَّهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ وَالسَّلَامُ .

اللہ کے نام سے شروع جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

”آپ کی کتاب یعنی تحریر ہمیں ملی۔ اس میں جو آپ نے اپنی حیرت کے متعلق لکھا ہے اور جو ہماری اُمت کے متعلق مسئلہ قدر میں لکھا ہے اور اس کی بابت ہماری رائے مستقیم یہ ہے کہ جو شخص قدر خیر و شر من اللہ پر ایمان نہ لائے وہ کافر ہے اور جو اپنے افعال معصیت کو خدائے جل مجدہ کی مشیت کی طرف منتسب کرے وہ قاجر، یعنی انکارِ قدر و تقدیر کرنا مذہبِ قدریہ ہے اور اپنے بُرے افعال اور گناہوں کو مشیتِ الہیہ کی طرف منسوب کرنا مذہبِ جبریہ ہے۔ اس لیے کہ بندہ کو مختار کیا گیا ہے۔ اس کے افعال اور اکتساب میں اُس کی استطاعت و قوت کی حد تک اور یہ اختیار منجانب اللہ عطا ہوا ہے اور ہمارا دین قدر و جبر کے درمیان ہے اور میری مراد اس نامہ میں جو کچھ میں نے ظاہر کیا ہے، اس سے زائد ایک کلمہ نہیں ہے۔“

لیکن کچھ اور الفاظ اس لیے لکھتا ہوں تاکہ مضمون زیادہ واضح اور فصیح ہو جائے، اس لیے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ حقائق اور اصول علم میں اتنے بلند درجہ پر تھے کہ حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ نے اُن کی طرف علوم میں بہت مبالغہ کے ساتھ ارشاد فرمایا ہے اور حکایتوں میں میں نے دیکھا ہے کہ جنگل سے ایک اعرابی آیا اور حضرت امام حسن بصری رضی اللہ عنہ اُس وقت کوفہ میں ایک مکان کے دروازے پر تشریف فرما تھے۔ اس نے امام حسن رضی اللہ عنہ سے سب و شتم کے ساتھ مکالمہ شروع کر دیا اور اتنا بڑھا کہ آپ کے آباء و اجداد کرام کی شان میں بھی بکنے لگا، حضرت امام نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ اُسے فرمایا کہ میاں اعرابی! تم مجھے بھوکے معلوم ہوتے ہو یا پیاسے یا تمہیں کوئی تکلیف پہنچی ہوئی ہے۔ اس نے جواب میں اور سخت کلام شروع کر دی۔ حتیٰ کہ بکنے لگا: تم ایسے، تمہاری والدہ ایسی، تمہارے باپ ایسے۔

امام سید الشہداء رضی اللہ عنہ نے خادم کو حکم دیا کہ چاندی کا کوزہ اندر سے لائے، وہ لایا۔

آپؐ نے وہ کوزہ نقری اسے عطا فرمایا اور کہا میاں معاف کرو، اس وقت ہمارے پاس یہی تھا ورنہ اور کچھ خدمت بھی کرنے میں دریغ نہ تھا۔ اعرابی نے جب یہ الفاظ سنے اور جب یہ سخاوت دیکھی تو پکار اٹھا:

أَشْهَدُ أَنَّكَ ابْنُ رَسُولِ اللَّهِ.

”میں گواہی دیتا ہوں بیشک آپ ابن رسول اللہ ﷺ ہیں۔“

اور میں صرف آپ کے حلم و کظم غیظ کے تجربہ کے لیے آیا تھا اور یہ صفت محققان مشائخ کی ہے کہ مدح و ذم خلایق ان کے نزدیک یکساں ہوتی ہے اور وہ لوگ کسی کلمہ سخت و ست سے اپنی حالت متغیر نہیں کرتے۔

امام حسین سید الشہداء رضی اللہ عنہ:

انہیں میں سے شمع آل محمد، از علاقہ خلایق مجرد، سید زمانہ خود ابو عبد اللہ حضرت امام حسین بن علی بن ابی طالب رضوان اللہ علیہم اجمعین ہیں۔ جو محققان اولیاء کرام سے ہیں اور قبلہ اہل صفاء، قاتل دشت کربلا ہیں اور شہزادہ گلگون قبا ہیں۔

اس قصہ میں محققین صحیح حالات کے ماتحت متفق ہیں کہ سید الشہداء رضی اللہ عنہ نے اس وقت تک اُن پر تلوار نہیں اٹھائی جب تک وہ کچھ بھی مائل بحق تھے اور اتباع کی طرف جھکے رہے، جبکہ احقاق حق ان سے مفقود و معدوم ہو گیا، اُن پر شمشیر کھینچی۔ حتیٰ کہ جان عزیز کو فدائے بارگاہِ الہی کر دیا اور جب تک جان فدا نہ فرمادی، آپؐ نے آرام نہ فرمایا۔ آپؐ میں سرکار ابد قرار ﷺ کے اخلاق کریم کے بہت سے ایسے نشان تھے کہ آپؐ کی ذات مقدس ہی اُن نشانوں میں سے مخصوص تھی۔ چنانچہ حضرت عمرؓ، الخطاب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک روز میں دربار رسالت میں حاضر ہوا تو دیکھا کہ حضور ﷺ نے سیدنا امام حسین سید الشہداء رضی اللہ عنہ کو اپنی پشتِ اقدس پر سوار کر رکھا تھا اور ایک ڈوری اپنے دہن مبارک سے نکال کر امام حسین رضی اللہ عنہ کے دست مبارک میں دے رکھی تھی اور امام حسین رضی اللہ عنہ ہانک رہے اور حضور ﷺ اپنے گھٹنوں سے تشریف لے جا رہے تھے۔ تو جب میں نے یہ شان دیکھی تو عرض کیا:

نِعْمَ الْجَمَلُ جَمَلُكَ يَا أَبَا عَبْدِ اللَّهِ.

”اے ابو عبد اللہ آپ نے سواری تو بہت عجیب پائی۔“

تو حضور ﷺ نے فرمایا:

وَنَعَمَ الرَّاٰكِبُ يَا عَمْرُوَ. (۱)

”اے عمر! سوار بھی تو بہت اچھے ہیں۔“

اس گفتگو میں بہت لطیف باتیں اور اہل طریقت کے لیے بہت سے رموز ہیں اور عجیب و غریب معاملات ظاہر ہیں۔ انہیں عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا:

اَشْفَقُ الْاِخْوَانَ عَلَيَّكَ دِيْنِكَ.

”شفیق ترین تیرا بھائی تیرا دین ہے۔“

اس لیے کہ نجات انسان کی متابعت دین میں ہے اور اس کی ہلاکت مخالفت دین میں، تو انسان کو چاہیے کہ اپنے مشفق کے حکم کے ماتحت چلے اور اس کی شفقت کا سایہ اپنے اوپر سمجھے اور اس کی پیروی بغیر کسی طرف نہ جائے۔

اور بھائی وہی ہے کہ نصیحت کرتا رہے اور شفقت و محبت میں اس کا پابند نہ بنے۔ ایک حکایت میں ہے کہ ایک روز ایک شخص حضرت امام رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا۔ اے ابن رسول اللہ! میں غریب و مفلس عیالدار ہوں، مجھے آپ رضی اللہ عنہ کی طرف سے آج شب کھانے کا انتظام ہونا چاہیے۔ آپ نے فرمایا: بیٹھ جا ہمارا وظیفہ راستہ میں ہے، آجائے تو تجھے دے دیں۔ تھوڑی دیر نہیں گزری تھی کہ پانچ تھیلیاں دینار کی لائی گئیں، جو حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف سے آئی تھیں۔ ہر تھیلی میں ایک ہزار دینار تھے۔ لانے والے نے کہا: حضور! معاویہ معافی چاہتے ہیں اور ان کی یہ خواہش ہے کہ یہ رقم غرباء میں تقسیم فرمادیں۔ آپ نے وہ تھیلیاں اسی سائل کو دے دیں اور معذرت فرمائی کہ تجھے انتظار میں بہت دیر ٹھہرنا پڑا۔ اگر اتنی سی رقم کا مجھے گمان ہوتا تو تجھے اس قدر زحمت کش انتظار نہ بناتا۔ ہمیں معاف کر اس لیے کہ ہم اہل بلا سے

۱۔ نعم الراكب هو يا عمر (۱) فی رواية عن عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ انہ راى ابا عبد اللہ الحسين بن علی رضی اللہ عنہما راكب النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، فقال: نعم السجمل جملک یا ابا عبد اللہ فقال صلی اللہ علیہ وسلم.... الخ. یہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے مروی تو نہیں لی لیکن امام ترمذی نے بروایت ابن عباس رضی اللہ عنہما ان الفاظ کے ساتھ ذکر کیا ہے: کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حاملاً الحسين بن علی رضی اللہ عنہما علی عاتقه، فقال رجل: نعم الراكب رکبت یا غلام فقال النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: ونعم الراكب هو:

حوالہ کے لیے: مشکاة المصابیح ۳/۴۳۹ (۱) کتاب المناقب: باب مناقب اہل بیت النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

ہیں اور ہم نے جملہ عیش دنیاوی سے انقطاع کر لیا ہے اور اپنی تمام تمنائیں اور آرزوئیں مٹا دی ہیں اور دوسروں کی تمنا پوری کرنے میں عمر وقف کر دی ہے۔

علاوہ اس کے آپ کے بہت سے فضائل ایسے ہیں جو امت کے کسی فرد سے پوشیدہ نہیں۔

حضرت امام زین العابدین رضی اللہ عنہ:

انہیں میں سے وارثِ نبوت، چراغِ امت، سید مظلوم، امام محروم، زین عباد، شمع اوتاد، ابوالحسن علی بن حسین بن علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ جو اکرم اعبدا اپنے زمانہ کے لوگوں میں سے گذرے۔

آپ بیانِ حقائق اور انکشافِ دقائق میں لوگوں کے اندر مشہور تھے۔ آپ سے لوگوں نے پوچھا: حضور! دنیا و آخرت میں نیک بخت شخص کون ہو سکتا ہے؟ فرمایا:

مَنْ إِذَا رَضِيَ لَمْ يَحْمِلْهُ رِضَاهُ عَلَى الْبَاطِلِ وَإِذَا سَخِطَ لَمْ يُخْرِجْهُ
سَخِطَهُ مِنَ الْحَقِّ.

”وہ شخص دارین میں نیک بخت ہو سکتا ہے، جب خوش ہو تو باطل پر نہ ہو اور جب غضبناک ہو تو اس کا غصہ اسے حق سے باہر نہ کر دے۔“

اور یہ صفت اسی میں ہو سکتی ہے جو اپنے اوصافِ کمال میں استقامت حاصل کر چکا ہو، اس لیے کہ رضا بالباطل باطل ہے اور غضبناکی میں حق و صداقت کا ہاتھ سے چلا جانا اور خشمگینی کی حالت میں انصاف کا خون کر دینا بھی باطل ہے اور مومن کامل، باطل کو اختیار کرنے والا کسی حالت میں نہیں بن سکتا۔

ایک روایت میں ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے لختِ جگر حضرت امام حسین سید الشہداء رضی اللہ عنہ کو کربلا میں شہید کر لیا گیا تو تمام کے شہید ہو جانے کے بعد سوائے حضرت زین العابدین رضی اللہ عنہ کے محذرات عصمت کی نگرانی کو کوئی نہیں تھا اور آپ اس وقت بیمار تھے۔ حضرت شہزادہ گلگلوں قبا امام حسین سید الشہداء رضی اللہ عنہ آپ کو ”علی اصغر“ کے نام سے پکارا کرتے تھے۔

جب مریم عفتِ پناہ کے قافلہ کو اونٹوں پر سر برہنہ بے پردہ دمشق لایا گیا اور یزید بن معاویہ علیہ ما یتسحق، اخزاه ذون ابیہ کے روبرو پیش کیا گیا تو کسی نے حضرت زین العابدین رضی اللہ عنہ سے عرض کی:

كَيْفَ أَصْبَحْتُمْ يَا عَلِيُّ وَيَا أَهْلَ بَيْتِ الرَّحْمَةِ.

”اے علی اور اے اہل بیت رحمت! آپ لوگوں نے آج کیسی صبح فرمائی۔“

آپ نے فرمایا:

أَصْبَحْنَا فِي قَوْمِنَا بِمَنْزِلَةِ قَوْمِ مُوسَىٰ مِنَ آلِ فِرْعَوْنَ يَذَّبِحُونَ
أَبْنَانَهُمْ وَيَسْتَحْيُونَ لِسَانَهُمْ فَلَا نَذْرِي صَبَاحَنَا بَيْنَ مَسَائِنَا وَهَذَا
مِنْ حَقِيقَةِ بَلَائِنَا .

”ہماری صبح ہماری قوم کے ظلم و جور سے ایسے ہوئی جسے موسیٰ علیہ السلام کی قوم کی صبح ظلم فرعون سے ہوئی کہ قوم موسیٰ علیہ السلام کے بچوں کو ذبح کرتے اور عورتوں کو زندہ رکھتے تھے۔ یہاں تک کہ ہم اس وقت اپنی صبح کو شام کے مابین نہیں جانتے۔ ہمارے امتحان و ابتلاء کی یہ حقیقت ہے اور ہم اپنے رب ذوالجلال کا شکر ہر حال میں بھی ادا کر رہے ہیں اور اس کے امتحان پر صبر کر رہے ہیں۔“

ایک حکایت میں ہے کہ ہشام بن عبدالملک بن مروان ایک سال حج کے لیے آیا اور طواف بیت اللہ سے فارغ ہو کر استلام حجر اسود کو چلا، مگر انبوہ خلق کی وجہ سے اُسے راستہ نہ ملا، خدام عرب نے اس کے لیے کرسی لگا دی۔ وہ بیٹھا اور خطبہ کرنے لگا۔ اسی اثناء میں حضرت زین العابدین رضی اللہ عنہ مسجد میں تشریف لائے تو آپؑ کے روئے انور سے چاند کی طرح روشنی پھیل رہی تھی اور رخسار مبارک سے نور تاباں تھا اور لباس معطر کے عطر بیزی سے راستہ مہک گیا، اول آپؑ نے طواف بیت فرمایا پھر جبکہ آپؑ حجر اسود کے پاس پہنچے تو لوگوں نے آپؑ کو تشریف لاتے دیکھ کر تعظیماً راستہ صاف کر دیا اور آپؑ با آسانی حجر اسود کے بوسہ کو تشریف لے گئے۔ ہشام آپؑ کی یہ ہیبت اور سطوت دیکھ رہا تھا۔ ایک شامی نے ہشام سے پوچھا اے امیر المؤمنین یہ عزت اور عظمت والا کون ہے کہ تجھے حجر تک لوگوں نے راستہ نہ دیا، حالانکہ امیر المؤمنین تُو ہے اور یہ جوان رعنا حسین و جمیل کون ہے کہ وہ جب آیا تمام لوگ حجر اسود سے ایک طرف ہٹ گئے اور صرف اُس کے لیے راستہ حجر اسود خالی کر دیا؟

ہشام اگرچہ جانتا تھا مگر محض اس خیال سے کہ شامی لوگ انہیں پہچان کر ان کے ساتھ عقیدت نہ کر لیں اور اس کی امارت و ریاست میں کہیں فرق نہ آجائے، کہنے لگا میں نہیں جانتا کہ یہ کون ہے۔ اتفاقاً فرزدق شاعر وہاں کھڑا تھا۔ کہنے لگا ہشام! تو نہ جانتا ہوگا مگر میں انہیں خوب جانتا ہوں۔ شامیوں نے کہا: ابو فارس! بتا یہ کون ہیں تاکہ ہم معلوم کر سکیں کہ اتنی شان و شکوہ والا جوان

آخر کون ہے؟ فرزدوق نے کہا: لو سنو! میں ان کے صفاتِ جمیلہ تمہیں سناتا ہوں، پھر برجستہ فرزدوق نے یہ اشعار آپ کی مدح میں سنائے:

قصیدہ فرزدوق ابو فارس

(جو حضرت امام زین العابدین رضی اللہ عنہ کی مدح میں ہشام کے سامنے سنایا تھا)

هَذَا الَّذِي تَعْرِفُ الْبَطْحَاءَ وَطَائِفَهُ . وَالْبَيْتُ يَعْرِفُهُ وَالْحِجْلُ وَالْحَرَمُ

”یہ وہ ہستی ہے جس کے قدموں کی آہٹ سرزمین بطحا جانتی ہے اور ان کے

منصبِ جلیل کو کعبہ جانتا ہے اور حل و حرم واقف ہے۔“

هَذَا ابْنُ خَيْرِ عِبَادِ اللَّهِ كَلِمَتُهُمْ هَذَا التَّقِيُّ النَّقِيُّ الطَّاهِرُ الْعَلَمُ

”یہ نختِ جگر ہے اس ہستی پاک کا جو اللہ کے بندوں میں سب سے افضل ہے،

یہ خود پرہیزگار، پاکباز اور پاک باطن دنیا میں مشہور ہے۔“

هَذَا ابْنُ فَاطِمَةَ إِنْ كُنْتَ جَاهِلَهُ وَبِجَدِّهِ النَّبِيَاءِ اللَّهُ قَدْ خْتَمَ

اچھی طرح پہچان لے یہ نورِ نظر سیدہ زہرا فاطمہ (رضی اللہ عنہا) کا ہے اگر تو

ان سے بے خبر ہے اور یہ وہ ہے جس کے جدِ امجد کی بعثت پر اللہ کے تمام

نبیوں کی تشریف آوری ختم ہے۔“

يَنْمِي إِلَى ذُرْوَةِ الْعِزِّ الَّتِي قَصُرَتْ عَنْ نَيْلِهَا عَرَبُ الْإِسْلَامِ وَالْعَجَمُ

”انہوں نے وہ بلند مقام حاصل فرمایا جس کے مساوی عزت حاصل کرنے

سے قاصر ہیں عرب و عجم کے تمام مسلمان۔“

إِذَا رَأَتْهُ قُرَيْشٌ قَالَ قَائِلُهَا إِلَى مَكَارِمِ هَذَا يَنْتَهِي الْكَرَمُ

”جب قبائل قریش ان کی رفعتِ شان دیکھتے ہیں تو پرکھنے والا کہہ دیتا ہے ان

کے منصبِ جلیل تک اعزاز و مناقب ختم ہو جاتے ہیں۔“

مَنْ جَدُّهُ دَانَ فَضْلُ الْأَنْبِيَاءِ لَهُ وَفَضْلُ أُمَّتِهِ دَانَتْ لَهُ الْأُمَّمُ

”یہ وہ ہیں جن کے جدِ امجد کے منصب کے آگے تمام انبیاء نیچے ہیں اور یہ وہ

ہے کہ ان کی امتیوں کی فضیلت سے تمام امتیوں کی فضیلت کم ہو گئی۔“

يَنْشَقُّ نُورِ الدُّجَى عَنْ نُورِ طَلْعَتِهِ كَالشَّمْسِ يَنْجَابُ عَنْ إِشْرَاقِهَا الظُّلْمُ

”ان کی وجہ منیر کے ظہور سے ہدایت کے انوار پھیل گئے، جیسے سورج کی روشنی سے ظلمتیں کافور ہو جاتی ہیں۔“

يَكَادُ يُمَسِّكُهُ عِرْفَانٌ رَاحَتِهِ رُكْنُ الْحَطِيمِ إِذَا مَا جَاءَ يَسْتَلِمُ
”شاید ان کے دستِ اقدس کی ہتھیلی کی خوشبو کو جمع کر لیا ہے رکنِ حطیم نے، جبکہ وہ حجرِ چو منے آئے۔“

يُغْضِي حَيَاءً وَيُغْضِي مِنْ مُهَابَتِهِ فَمَا يُكَلِّمُ إِلَّا حِينَ يَتَّبِعُ
”حیاءِ ایمانی کی وجہ سے ان کی آنکھیں بند ہیں اور لوگوں کی آنکھیں ان کی مہابتِ شان سے بند ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان سے کلام صرف اس وقت کیا جا سکتا ہے جب وہ تبسم ریز لہجہ میں ہوں۔“

فِي كَفِّهِ خَيْرٌ زَانَ وَرِيحُهَا عَبْقُ مِنْ كَفِّ أَرْوَعِ فِي عَرِينِهِ شَمَمُ
”اُن کے دستِ نوری میں خزران کی چھڑی ہے اور اس کی مہک اڑ رہی ہے اور وہ ایسے کے ہاتھ میں ہے جو بہت اونچی ناک والا سردار ہے۔“

مُشْتَقَّةٌ عَنِ رَسُولِ اللَّهِ يَنْعَتُهُ طَابَتْ عَنَّا صِرَةٌ وَالنَّخِيمُ وَالشِّيمُ
”یہ اللہ کے رسول ﷺ کی ذات سے مشتق ہے اور اس کی تعریف جہاں کر رہا ہے۔ اس کا عنصری وجود ہی پاک ہے اور اس کی خصلتیں اور عادتیں بھی پاک ہیں۔“

فَلَيْسَ قَوْلُكَ مِنْ هَذَا بَضَائِرَةَ الْعَرَبُ تَعْرِفُ مَنْ أَنْكَرَتْ وَالْعَجَمُ
”تیرا یہ کہنا کہ یہ کون ہے ان کو نقصان نہیں دے سکتا، اس لیے کہ انہیں عرب جانتا ہے اور جس سے تو نے تجاہلِ عارفانہ کیا، اسے عجم جانتا ہے۔“

كَلَّمَا يَدِيهِ غِيَاثٌ عَمَّ نَفْعُهُمَا يَسْتَوْفِيَانِ وَلَا يَعْرُوهُمَا الْعَدَمُ
”ان کے دونوں ہاتھ ایسے برستے ہوئے بادل ہیں جن سے عام نفع ہے، ہر ایک کے ساتھ وہ ہاتھ اعانت کرتے ہیں امدان پر اس صفت کا عدم نہیں آتا۔“

عَمَّ الْبَرِيَّةُ بِالْإِحْسَانِ فَانْقَشَعَتْ عَنْهُ الْغِيَابَةُ وَالْإِمْلَاقُ وَالظُّلْمُ
”محسن عالم ہیں اپنے احسانات کے ساتھ اور ان کی شانِ جوان کی وجہ میں ہے پراگندہ ہو چکی ہیں گمراہی، محتاجی اور ظلم کی اندھیریاں۔“

لَا يَسْتَطِيعُ جَوَادُ بَعْدَ غَايَتِهِمْ وَلَا يُدَالِيهِمْ قَوْمٌ وَإِنْ كَرُمُوا

”دنیا کا کوئی سخی ان کی منجانب سخاوت کو پہنچنے کی طاقت نہیں رکھتا، اور کوئی قوم کا

بڑا ان کی برابری نہیں کر سکتا اگرچہ وہ اپنی قوم میں معزز ہو۔“

هُمُ الْغِيُوثُ إِذَا مَا أَزْمَةٌ أَزَمَتْ وَالْأَسْدُ أَسْدٌ الشَّرِي وَالْيَاسُ مُتَحَدِّمٌ

”قحط سالی میں یہ موسلا دھار بارش ہیں جبکہ وہ قحط سخت ہو چکا ہو اور شیر ہیں

سخت گرم ایام اور انتہائی مایوسی میں۔“

سَهْلُ الْخَلِيقَةِ لَا يَخْشَى بَوَادِرَهُ يُزَيِّنُهُ النَّانُ حُسْنَ الْخُلُقِ وَالشِّيمُ

”نہایت نرم دل ہیں، حتیٰ کہ ان کے غصہ سے بھی خوف زدہ نہیں ہوتا بہ سبب

اس کے کہ یہ دو صفتوں، حسنِ خلق اور حسنِ خصلت سے مزین ہیں۔“

مِنْ مَعْشَرَ حُبُّهُمْ دِينٍ وَبُغْضُهُمْ كُفْرٌ وَقُرْبُهُمْ مَنَجَا وَمُعْتَصِمٌ

”یہ اس گھرانہ سے ہیں جس کی محبت عین دین ہے اور ان سے بغض کرنا کفر

اور ان کا قرب مقامِ نجات ہے اور قلعہٴ محافظت۔“

إِنْ عُدَّ أَهْلُ التَّقَى كَالْوَأِثِ كَانُوا أَيْمَتَهُمْ أَوْ قَبِيلَ مَنْ خَيْرُ أَهْلِ الْأَرْضِ قَبِيلَ هُمْ

”اگر زمانہ کے متقی گنے جائیں تو سب ان کے تابع ہوں گے۔ اگر پوچھا جائے

کہ روئے زمین میں سب سے افضل کون ہے، تو کہا جائے گا یہی ہیں۔“

سَيَانُ ذَلِكَ إِنْ أَلْرُوا وَإِنْ عَلَامُوا لَا يَنْقُصُ الْعُسْرُ بَسْطًا مِنْ أَكْفِهِمْ

”اُس کا ہاتھ کبھی عطا کرنے سے نہیں رکتا خواہ تنگی ہو، برابر ہے ان کے لیے

خواہ دولت ہو یا نہ ہو۔“

اللَّهُ فَضْلُهُ قَدَمًا وَشَرَفُهُ جَرِي بِذَلِكَ فِي اللُّوحِ وَالْقَلَمِ

”اللہ نے فضیلت بخشی ہمیشہ سے اور شرف تام عطا فرمایا اور ان کے اکرام کا

حکم لوح و قلم میں جاری ہو چکا۔“

مُقَدَّمٌ بَعْدَ ذِكْرِ اللَّهِ ذِكْرُهُمْ فِي كُلِّ يَوْمٍ وَمَخْتَوْمٌ بِهِ الْكَلِمُ

”اللہ کے ذکر کے بعد ان کا ذکر ہی ہے، ہر دن، اور اس کے علاوہ ہر کلام پر مہر

لگ گئی ہے۔“

مَنْ يَعْرِفِ اللَّهَ يَعْرِفِ أَوْلِيَّتَهُ ذَا وَالِدَيْنِ مِنْ بَيْتِ هَذَا نَالَهُ الْأَمُّ

”جو اس ہستی الہی کو جانتا ہے ان کی فضیلت کو بھی جانتا ہے اور حقیقت یہ ہے

کہ دین ان کے گھر سے امت نے حاصل کیا۔“

أَيُّ الْقَبَائِلِ لَيْسَتْ فِي رِقَابِهِمْ لَا وَلِيَّتَهُ هَذَا أَوْلَاهُ نَعَمْ

”عرب کا کونسا قبیلہ ہے جس کی گردن میں نہ ہو ان کی بزرگی کا قلابہ، یا اس

کے لیے ان کے گھر سے نعمتیں نہ پہنچی ہوں۔“

اور اس کے مثل چند اور بیت فرزدق نے کہے اور اہل بیت اطہار رضوان اللہ علیہم کی تعریف اتنی زیادہ کی کہ ہشام غضبناک ہو گیا اور حکم دے دیا کہ اسے عسفان میں قید کیا جائے۔ عسفان مکہ و مدینہ کے پاس ایک مقام ہے (جہاں ایک کنواں ہے جس میں قیدی بند کیے جاتے تھے)۔

اس واقعہ کی خبر لوگوں نے امام زین العابدین رضی اللہ عنہ کی خدمت میں عرض کر دی۔ آپ نے بارہ ہزار درہم فرزدق کو بطور عطیہ بھیجے اور فرمایا اُسے کہنا ابو فارس! ہمیں معاف کرے کہ ہم لوگ اس وقت امتحان و ابتلاء میں ہیں، اس ہدیہ سے زائد اس وقت ہمارے پاس کچھ نہ تھا جو کچھ زائد عطا فرماتے۔

فرزدق نے وہ درہم نقری واپس کیے اور کہلوا یا کہ حضور قسم بخدا! زر و سیم کے لالچ میں بادشاہ و امراء کے دربار میں بہت کچھ کہہ چکا ہوں مگر وہ محض دروغ بیروغ ہی تھا، مگر یہ قصیدہ جو میں نے کہا ہے یہ محض اپنے گناہوں کے کفارہ کے لیے اور اللہ و رسول ﷺ کی محبت کے لیے لکھا ہے۔

جب یہ پیغام حضور زین العابدین رضی اللہ عنہ کو ملا، آپ نے حکم دیا کہ درہم واپس لے جاؤ اور اُسے کہو کہ ابو فارس! اگر ہمیں دوست رکھنا ہے تو ایسا نہ کر، اس لیے کہ ہم جو چیز کسی کو عطا فرمادیں وہ واپس نہیں لیا کرتے تو پتھمیل حکم فرزدق نے وہ عطیہ قبول کیا۔

اور درحقیقت امام زین العابدین رضی اللہ عنہ کے فضائل اس سے کہیں زیادہ ہیں جو فرزدق نے کہے۔ ان کا جمع کرنا امکان میں نہیں۔

حضرت امام ابو جعفر محمد باقر رضی اللہ عنہ:

اسی گھرانہ سے حجت اہل معاملات، برہان ارباب مشاہدات، امام اولادِ نبی، برگزیدہ نسل

علی حضرت ابو جعفر محمد بن علی بن حسین بن علی بن ابی طالب الباقر رضی اللہ عنہ ہیں۔

ایک روایت میں ہے کہ آپ کی کنیت بھی ”ابو عبد اللہ“ تھی اور آپ کا لقب ”باقر“ تھا۔

آپ بیانِ علوم و دقت اور لطائف اشارات میں قرآن کریم کے ساتھ خصوصیت سے مشہور ہیں۔ آپ

کی بہت سی کرامات مشہور ہیں اور آپ کے بہت سے نشانات اور دلائل انور معروف ہیں۔

آپؐ کا ایک واقعہ مشہور ہے کہ ایک دفعہ ایک بادشاہ نے آپؐ کو اپنے پاس بلا بھیجا۔ اس نیت سے بلوایا کہ جب یہاں آجائیں تو انہیں شہید کر دیا جائے۔ آپؐ بلا خوف و خطر اس کے پاس تشریف لے گئے۔ جب آپؐ اس کے قریب پہنچے تو اُس نے معذرت کی اور کچھ ہدیہ پیشکش کیا اور بڑے ادب و احترام سے واپس کیا۔ حاضرین دربار نے خلاف توقع عمل دیکھ کر کہا کہ جہاں پناہ نے تو امام کو شہید کرنے کی نیت سے بلایا تھا، لیکن جب وہ تشریف لے آئے تو اور طرح برتاؤ کرتے دیکھا۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ بادشاہ کہنے لگا کہ جب وہ میرے قریب آئے تو میں نے دیکھا کہ دو شیر ان کے دائیں بائیں کھڑے ہیں اور مجھ سے کہہ رہے ہیں کہ اگر تو نے ان کے قتل کا ارادہ بھی کیا تو ہم تجھے ہلاک کر دیں گے

حضرت امام ابو جعفر رضی اللہ عنہ کے متعلق روایت ہے کہ آپؐ نے آیہ کریمہ: ﴿فَمَنْ يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِنْ بِاللَّهِ﴾ (۱) کی تفسیر میں فرمایا: كُلُّ مَنْ شَغَلَكَ عَنْ مُطَالَعَةِ الْحَقِّ فَهُوَ طَاغُوتُكَ، ”ہر وہ چیز جو تجھے مطالعہ حق سے باز رکھے وہ ہی تیرا بت ہے۔“

تو خیال رکھ کہ کیا چیز تجھے حق سے مجبور رکھتی ہے اور کس چیز کی وجہ سے تجھے حق سے بعد ہوا۔ اسی کو ترک کر دے تاکہ تو مرتبہ کشف میں پہنچے اور بارگاہ تقرب سے ممنوع و مجبور نہ رہے اور جو ممنوع ہے اُسے یہ زیبا نہیں کہ وہ دعویٰ تقرب کرے۔

آپؐ کی خصوصیات میں ایک روایت ہے کہ آپؐ کچھ رات گذر جانے کے بعد اپنے معمولات سے فارغ ہو جاتے تو با آواز بلند الفاظ میں دعا فرماتے۔

”اے میرے رب! اے میرے مالک! رات آگئی ہے اور بادشاہوں کی حکومت انجام کو پہنچ گئی۔ ستارے آسمان پر ظاہر ہو گئے اور سب لوگ ایسے سو گئے ہیں کہ گویا ناپید ہو گئے۔ آدمیوں کی آوازیں بند ہیں اور ان کی آنکھیں مچی ہوئی ہیں اور تمام بنی اُمیہ آرام میں ہیں۔ اُن کے دروازوں پر پاسبان بیٹھے ہوئے ہیں اور بنی اُمیہ کے دربار بند پڑے ہیں اور ان کی ڈیوڑھیوں پر دربان لگے ہوئے ہیں۔ جن لوگوں کی خواہشات ان سے وابستہ تھیں وہ اس وقت چھوڑ چکے ہیں۔ اے میرے اللہ! تو زندہ و پائندہ، بینندہ و دانندہ ہے۔ اونگھ اور نیند سے تو مبرا ہے۔ جو تجھے اونگھنے سونے والا جانے وہ تیری نعمتوں سے محروم ہے۔ الہی! تو وہ ہے کہ کوئی تجھے تیرے ارادہ سے باز نہیں رکھ سکتا اور رات دن میں کسی ساعت تیری صفت بقا میں خلل نہیں آسکتا۔ تیرا در رحمت کشادہ ہے۔ اس پر تجھے جو پکارے تیرے خزانہ بخشش اُس پر فدا ہیں۔ جو تیری ثناء میں رطب اللسان ہو،

تو مالک الملک ہے کہ سائل کا رد کرنا تجھے روا نہیں۔ جو مومن تیری درگاہ میں سوال کرنے تو سائل کو تو روکنے والا نہیں خواہ وہ مخلوق ارضی ہو یا سماوی۔ الہی! جب میں موت اور قبر کا خیال کرتا ہوں اور حساب کا تصور آتا ہے تو سوچتا ہوں کہ تیری حضوری کے مقابل دنیا کی کس چیز سے سکون پکڑا جائے۔ جب ملک الموت کا خیال آتا ہے تو سوچتا ہوں کہ کس طرح دنیا سے تعلق رکھوں تو میں تجھ سے عرض پیرا ہوں اس لیے کہ تر دامن ہوں اور تجھ سے تجھی کو چاہتا ہوں۔ اس لیے کہ جب تجھے پکارتا ہوں، دل میں سکون محسوس کرتا ہوں۔ الہی! مجھ پر کیفیت مرگ بے عذاب نازل کر اور زندگی اخروی میں حساب بے عذاب لے کر مجھے عزت دے۔“

یہ سب کچھ فرما کر اس قدر گریہ فرماتے کہ صبح ہو جاتی۔

ایک شب میں نے عرض کی کہ اے میرے سردار! میرے ماں باپ کے سردار! کب تک آپ روتے رہیں گے اور کب تک یہ خروش رہے گا۔ آپ نے فرمایا: بھائی! یعقوب علیہ السلام کا صرف ایک یوسف گم ہو گیا تھا تو اتنے روئے کہ چشم مبارک سپید ہو گئیں اور میں نے اپنے اٹھارہ آدمی معہ باپ یعنی امام حسین سید الشہداء رضی اللہ عنہ اور شہداء کربلا کو اپنے سے گم کیے ہیں تو اس وقت تک میں گم ہی رہوں گا، جب تک ان کی جدائی میں رو کر آنکھیں سپید نہ کر لوں۔

یہ مناجات عربی میں نہایت فصیح ہیں۔ مگر بخوف طوالت اس کے معنی ہی فارسی میں نقل کیے گئے تاکہ مکرر نہ ہو جائے۔ انشا اللہ کسی دوسری جگہ اس اصل کو بھی نقل کریں گے۔

حضرت امام محمد جعفر رضی اللہ عنہ:

انہیں میں سے سیف سنت، جمال طریقت، معبر اہل معرفت، مزین اہل صفوت ابو جعفر بن محمد بن علی بن الحسین بن علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہم ہیں۔

آپ نہایت بلند خیال اور پسندیدہ سیرتوں سے مزین تھے اور سریر امامت کی رونق دینی میں آپ موزوں تھے۔ آپ کے اشارات جمیلہ تمام علوم میں مشہور ہیں اور معانی دقیقہ میں آپ کی تقریر مسلم تھی۔ مشائخ کرام میں آپ کو لطائف کلام اور حقائق طریقت میں خاص درجہ حاصل ہے۔ بیان طریقت میں آپ کی تصنیفات مشہور ہیں۔

آپ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا:

مَنْ عَرَفَ اللَّهَ أَعْرَضَ عَمَّا سِوَاهُ.

”جس نے اللہ کو جان لیا وہ ماسوی اللہ سے علیحدہ ہو گیا۔“

یعنی عارف الہی وہی ہے جو معرض از غیر اور منقطع از علل و اسباب ہو جائے، اس لیے کہ

اللہ کی معرفت یہی ہے کہ غیر خدا کے ساتھ اجنبی ہو جائے۔

یہی وجہ ہے کہ عرفانِ مخلوقات اور اس کی فکر سے اپنے آپ کو جدا رکھتے اور اپنے رب سے ملے ہوئے ہوتے ہیں۔ اُن کے دل میں غیر کی ایسی قدر و منزلت نہیں کہ اُس کی طرف متوجہ ہوں اور نہ وجودِ غیر سے انہیں کچھ خطرہ ہوتا ہے اس لیے کہ وہ ذکرِ غیر کے لیے اپنے دل میں جگہ نہیں رکھتے۔

ایک روایت میں حضرت امام جعفر رضی اللہ عنہ سے یوں بھی مروی ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

لَا تَصِحُّ الْعِبَادَةُ إِلَّا بِالتَّوْبَةِ لِأَنَّ اللَّهَ تَعَالَى قَدَّمَ التَّوْبَةَ عَلَى الْعِبَادَةِ

قَالَ اللَّهُ تَعَالَى ﴿التَّائِبُونَ الْعِبَادُونَ...﴾ (۱)

”عبادت بغیر توبہ کے صحیح نہیں حتیٰ کہ خود حضرت عز مجدہ و عز اسمہ نے عبادت پر

توبہ کو مقدم کیا۔ اس لیے کہ توبہ عبادت کی ابتدا ہے اور عبودیت اس کی انتہا۔“

چنانچہ جہاں اللہ تعالیٰ نے گنہگاروں کا ذکر نہیں کیا تو انہیں بھی توبہ کا حکم فرمایا۔ جیسا کہ

ارشاد ہے:

﴿وَتُوبُوا إِلَى اللَّهِ جَمِيعًا أَيُّهَا الْمُؤْمِنُونَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ﴾ (۲)

”اللہ کی طرف اے مسلمانو! توبہ کرو تا کہ تم فلاح یافتہ ہو جاؤ۔“

اور جہاں سید اکرم تاجدارِ عرب و عجم کو یاد فرمایا وہاں بھی ﴿فَأَوْحَىٰ إِلَىٰ عَبْدِهِ مَا أَوْحَىٰ﴾

(۳) کہا تو گویا مقامِ عبودیت منجہاءِ کمال کا نام ہے۔

ایک حکایت میں ہے کہ حضرت داؤد طائی رحمۃ اللہ علیہ ایک روز امام جعفر صادق رضی اللہ

عنہ کی خدمت میں آئے اور عرض کی یا ابن رسول اللہ! مجھے کچھ نصیحت فرمائیے، اس لیے کہ میرا دل

سیاہ ہو چکا ہے۔ آپؑ نے فرمایا کہ ابو سلیمان! (حضرت داؤد طائی کے صاحبزادے کا نام سلیمان تھا)

آپ اس زمانے کے بڑے زاہدوں میں سے ہیں، آپ کو میری نصیحت کی کیا ضرورت ہے؟۔۔۔

عرض کی، اے فرزندِ رسول! آپ کو اللہ نے سب پر فضیلت بخشی ہے، آپ پر نصیحت کرنا واجب

ہے۔ حضرت ابو جعفر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اے ابو سلیمان میں اس سے ڈرتا ہوں کہ کہیں بروز

قیامت میرے جدا مجھ سے یہ نہ فرمائیں کہ تو نے ہماری اطاعت کا حق کیوں ادا نہیں کیا، اس لیے کہ

یہ کام نسب کی نسبت سے صحیح نہیں اترتا، یہ کام عمل کے اوپر موقوف ہے۔

یہ سن کر حضرت داؤد طائیؑ رو پڑے اور کہنے لگے، الہی! جن ہستیوں کا خمیر آبِ نبوت سے ہو اور جن کی ترکیب طبعی اصول دین پر اور برہان و حجت قرآن سے ہو، جس کے دادا شفیع المذنبین ﷺ ہوں، جن کی ماں حضرت زہرا بتول رضی اللہ عنہا ہوں وہ اس خوفِ حیرانی میں رکھے گئے ہیں اور اپنے اعمال کا اس شان سے محاسبہ کر رہے ہیں تو پھر داؤد طائی کس شمار میں ہے اور وہ اپنے اعمال و عبادات پر کیا فخر کرے!!

ایک روایت میں ہے کہ ایک روز حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ اپنے احبابِ خدام میں تشریف فرماتھے تو آپؑ نے سب سے فرمایا: آؤ! ہم تم آپس میں بیعت کر لیں اور اس امر کا عہد کر لیں کہ جسے اللہ تعالیٰ بروزِ قیامت رسنگاری عطا فرمادے وہ سب کی شفاعت کرے۔ سب نے عرض کی کہ اے ابن رسول اللہ! اس عہد کی اسے حاجت ہے جو محتاجِ شفاعت ہو، آپ کو ہماری شفاعت کی کیا پرواہ ہے! آپ کے جدا مجد شفیع مجرمانِ خلاق ہیں۔ آپ نے فرمایا: میں اپنے اعمال پر شرماتا ہوں اور اپنے نفس کے عیبوں پر نظر کر کے ڈرتا ہوں کہ بروزِ قیامت جدا مجد ﷺ کے حضور کس طرح منہ دکھاؤں گا۔

یہ ہے وہ کمالِ خاص جو عارفِ کامل کو حاصل ہوتا ہے کہ وہ ہر وقت اپنے نفس کے عیبوں پر نظر رکھتا ہے۔ یہ صفت اوصافِ کمالیہ سے ہے۔

اور تمام مسکنانِ الہی یعنی نبی، ولی، غوث، قطب سب کے سب اسی اصول پر قائم ہیں۔ چنانچہ حضور سید یوم النشور ﷺ نے فرمایا:

إِذَا أَرَادَ اللَّهُ بَعْدَ خَيْرٍ بَصْرَةً بِعُيُوبِ نَفْسِهِ . (۱)

”جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کے ساتھ ارادہ خیر فرماتا ہے تو اسے عیوبِ نفس کے لیے چشمِ بینا عطا فرماتا ہے۔“

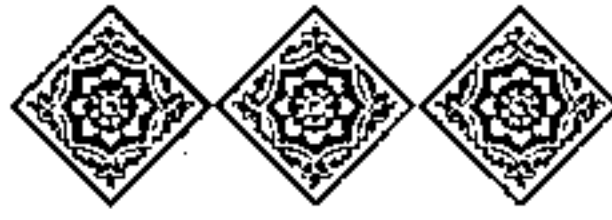
اور جو آزر وئے تو اضع اپنا سر بارگاہِ حق میں جھکاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی مراداتِ دارین پوری فرماتا ہے۔

اب اگر ہم تمام مناقبِ اہل بیت رضی اللہ عنہم بیان کریں اور ہر ایک کے فضائل مفصل بتائیں تو یہ کتاب اس کی متحمل نہیں۔ لہذا ان کے لیے جن کی عقل خلعتِ ادراک سے مزین ہے اور جو مریدانِ خاص ہیں، اسی قدر کافی ہے اور منکر کے لیے بھی، اگر سمجھنا چاہے تو کم نہیں۔

۱۔ اس حدیث پاک کو امام دیلمی نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی سند کے ساتھ روایت کیا ہے (کتاب، الجمع، ص:

اب اگر ہم اصحابِ صفہ رسول کریم علیہ التحیۃ والتسلیم کا مذاکرہ بہ سبیل ایجاز و اختصار کرتے ہیں اور فضائل اہل بیت میں علیؑ التفصیل ایک کتاب مسمیٰ ”منہاج الدین“ ہم نے تالیف کی ہے، جس میں ہر ایک کے علیحدہ علیحدہ فضائل درج ہیں۔ اس جگہ تو ہم نے محض اسمائے کنیت پر ہی اکتفا کیا ہے تاکہ پڑھنے والے کا مقصود معلومات حاصل ہو جائے۔

أَعَزَّكَ اللَّهُ تَعَالَى وَبِاللَّهِ التَّوْفِيقُ .



اصحابِ صفہ رضوان اللہ علیہم

فصل:

اس امر پر اجماع اُمت ہے کہ حضور ﷺ کی ایک خاص جماعت تھی۔ صحابہ کرام میں جو تارک الدنیا ہو کر مسجد نبوی میں اللہ کی خاص عبادت کے لیے بیٹھ گئے تھے اور ہر قسم کے کسب معاش سے دست بردار تھے انہی کی شان میں قرآن پاک نے اپنے حبیب پاک محمد ﷺ کو فرمایا:

﴿وَلَا تَطْرُدِ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيدُونَ وَجْهَهُ﴾ (۱)

”اے محبوب نہ فراموش فرماؤ ان لوگوں کو جو اپنے رب کی عبادت میں صبح

و شام مشغول ہیں اور اسی کی رضا چاہتے ہیں۔“

تو خدا کی کتاب ان کی افضلیت پر شاہد ہے اور حضور یوم النشور ﷺ کی احادیث ان کے فضائل میں ہمیں بہت پہنچی ہیں۔ ہم نے ان کا تھوڑا سا حصہ مقدمہ کتاب میں نقل کیا ہے۔ حضرت امام المفسرین ابن عباس رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں:

وَقَفَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ عَلَى أَصْحَابِ الصُّفَّةِ فَرَأَى فَقْرَهُمْ وَ
جُهْلَهُمْ وَ طَيْبَ قُلُوبِهِمْ فَقَالَ أَبَشِرُوا يَا أَصْحَابَ الصُّفَّةِ فَمَنْ بَقِيَ
مِنْ أُمَّتِي عَلَى النَّعْتِ الَّذِي أَنْتُمْ عَلَيْهِ رَاضِيًا بِمَا فِيهِ فَإِنَّهُ مِنْ رُفَقَائِي
فِي الْجَنَّةِ.

اس حدیث کے معنی ہیں کہ حضور ﷺ اصحابِ صفہ پر تشریف لائے، ان کو دیکھ کر ٹھہر گئے تو ان کے دل اس فقر و مجاہدہ میں حضور ﷺ نے نہایت خوش دیکھے۔ فرمایا: اے اصحابِ صفہ تمہیں مبارک ہو! تمہارے بعد جو بھی تمہاری سی شان میں خرم و شاد رہے گا، وہ بروز قیامت جنت میں میرا رفیق ہوگا۔“

ان اصحابِ صفہ میں سے:

- پہلے: مناد حضرت جبار و پسندیدہ سید الا برار حضرت بلال بن رباح رضی اللہ عنہ ہیں۔
- دوسرے: دوست خداوند اور محرم احوال پیغمبر ابو عبد اللہ سلمان فارسی رضی اللہ عنہ ہیں۔
- تیسرے: سرہنگ مہاجر و انصار، متوجہ رضوان جبار ابو عبیدہ بن عامر بن عبد اللہ الجراح رضی اللہ عنہ ہیں۔
- چوتھے: برگزیدہ اصحاب، زینت ارباب ابو الیقظان حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ ہیں۔
- پانچویں: گنج علم خزانہ حلم حضرت ابو مسعود عبد اللہ بن مسعود ہزلی رضی اللہ عنہ ہیں۔
- چھٹے: متمسک درگاہ حرمت پاک از عیب و آفت حضرت عقبہ بن مسعود برادر عبد اللہ رضی اللہ عنہ ہیں۔
- ساتویں: سالک طریق عزلت معرض از معائب و ذلت حضرت مقداد ابن الاسود رضی اللہ عنہ ہیں۔
- آٹھویں: داعی مقام تقویٰ راضی بہ بلا و بلوی حضرت خباب بن الارت رضی اللہ عنہ ہیں۔
- نویں: قاصد درگاہ رضا طالب بارگاہ بقا اندر فنا حضرت صہیب بن سنان رضی اللہ عنہ ہیں۔
- دسویں: درج سعادت بحر قناعت حضرت عقبہ بن غزو ان رضی اللہ عنہ ہیں۔
- گیارہویں: برادر فاروق معرض از کونین و مخلوق حضرت زید بن الخطاب رضی اللہ عنہ ہیں۔
- بارہویں: خداوند مجاہدات اندر طلب مشاہدات حضرت ابو کبشہ مولیٰ حضور ﷺ ہیں۔
- تیرہویں: عزیز از کل خلاق بحق جل مجدہ آیت حضرت ابولمرید کنانہ بن الحصین عدوی رضی اللہ عنہ ہیں۔
- چودھویں: عامر طریق تواضع سپرندہ مجتہ تقاطع حضرت سالم مولیٰ حدیفۃ الیمان رضی اللہ عنہ ہیں۔
- پندرہویں: خائف عقوبت ہارب از طریق مخالفت حضرت عکاشہ ابن المحسن رضی اللہ عنہ ہیں۔
- سولہویں: زین مہاجر و انصار سید بنی قار حضرت مسعود بن ربیع القاری رضی اللہ عنہ ہیں۔
- سترہویں: اندرزہد مانند عیسیٰ اندر شوق بدرجہ موسیٰ ابو ذر جندب ابن جنادہ الغفاری رضی اللہ عنہ ہیں۔
- اٹھارہویں: حافظ انفاں پیغمبر ﷺ مرخیرات درخور حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ ہیں۔
- انیسویں: اندر استقامت مقیم و اندر متابعت مستقیم حضرت صفوان بن بیضار رضی اللہ عنہ ہیں۔
- بیسویں: صاحب ہمت خالی از تہمت حضرت ابو دراعویم بن عامر رضی اللہ عنہ ہیں۔
- اکیسویں: متعلق درگاہ جابرگزیدہ رسول پادشاہ حضرت ابولبابہ عبد المنذر رضی اللہ عنہ ہیں۔
- بائیسویں: کیمیائے بحر شرف و در توکل راصدق حضرت عبد اللہ بن بدر الجہنی رضی اللہ عنہ ہیں۔
- غرضیکہ اسی طرح اور بھی بہت ہیں۔ اگر ہم تمام اہل صفہ کا ذکر کریں تو کتاب طویل ہو جائے۔
- حضرت شیخ ابو عبد الرحمن محمد بن حسین سلمی رضی اللہ عنہ بڑے زبردست ناقل مسائل طریقت اور جامع کلام مشائخ گذرے ہیں۔ انہوں نے صرف اہل صفہ کے حالات میں ایک تاریخ تالیف فرمائی ہے۔ اس میں ان کے علیحدہ علیحدہ فضائل اور نام بنام حالات اور ان کی کیفیتیں

لکھی ہیں۔

اُس میں انہوں نے مسطح بن ثابت بن عباد کو بھی اہل صفہ میں نقل کیا ہے مگر میں اسے درست نہیں سمجھتا۔ اس لیے کہ یہ وہ مسطح ہیں جنہوں نے قصۃ اقلک اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہ کی ابتداء کی تھی لیکن حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور حضرت ثوبان اور حضرت معاذ بن حارث اور حضرت سائب بن خلاب اور حضرت ثابت بن ودیعہ اور حضرت ابوالیسر کعب بن عمر اور حضرت وہب بن مغفل اور حضرت عبداللہ بن انیس اور حضرت حجاج بن عمر الاسلمی رضی اللہ عنہم اجمعین تمام اہل صفہ سے ہیں، اگرچہ کبھی یہ کسی سبب سے دنیا کی طرف مشغول فرمالتے تھے مگر تاہم یہ تمام درجہ میں برابر اور حقیقتہً قرونوں کے خیر القرون سے تھے اور جس وقت بھی یہ جس درجہ پر تھے، متاخرین سے بہتر اور افضل ترین خلائق تھے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں صحبت سید الانبیاء ﷺ کا شرف بخشا تھا۔ ان کے ضمیر تمام عیوب سے محفوظ تھے۔ جیسا کہ خود حضور ﷺ نے فرمایا:

خَيْرُ الْقُرُونِ قَرْنِي ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ... الخ (۱)

”زمانوں سے بہترین زمانہ میرا زمانہ ہے پھر وہ زمانہ جو اس سے قریب ہے۔۔۔“

اور خود اللہ جل مجدہ و تبارک و تعالیٰ و عز اسمہ نے فرمایا:

﴿وَالسَّابِقُونَ السَّابِقُونَ مِنَ الْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنْصَارِ وَالَّذِينَ اتَّبَعُوهُمْ بِإِحْسَانٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ﴾ (۲)

”اور وہ لوگ جو مسابقت کرنے والے ہیں پہلے ایمان لانے والوں میں

مہاجرین و انصار سے اور وہ لوگ جو پیروی اسلام کرتے ہیں اور نیک ہیں۔

اللہ ان سے راضی ہے اور وہ اللہ سے راضی ہیں۔“

۱۔ یہ متفق علیہ روایت ہے جسے امام بخاری اور امام مسلم نے عبیدہ سلمانی سے انہوں نے ابن مسعود سے مرفوعاً روایت کیا ہے اور اسی طرح یہ روایت زہد بن مضرب سے بھی مروی ہے۔ انہوں نے عمران بن حصین سے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے:

خیر کم قرنی، ثم الذین یلونہم، ثم الذین یلونہم.

حوالہ کے لیے ملاحظہ فرمائیں: المقاصد الحسنیة للسخاوی (ص: ۲۰۸) صحیح البخاری ۲/۹۳۸

(کتاب الشهادات، باب: ۹)، صحیح مسلم، (کتاب فضائل الصحابة ثم الذین یلونہم، حدیث: ۲۵۳۵)

۲۔ سورۃ التوبہ: ۱۰۰

ائمہ تابعین رضوان اللہ علیہم

فصل:

حضرت اولیس قرنی رضی اللہ عنہ:

ان میں سے آفتاب امت، شمع دین و ملت حضرت اولیس قرنی رضی اللہ عنہ ہیں۔ یہ ہستی مشائخ کرام کے طبقہ کی بہت بڑی مانی گئی ہے اور اہل تصوف میں معظم ہیں۔ یہ عہد رسول پاک ﷺ میں تھے لیکن حضور ﷺ کے فیض صحبت سے دو وجہ میں مستفیض نہ ہو سکے اور محروم شربت دیدار رہے:

ایک: مانع حضوری آپ کا غلبہ حال رہا۔

دوسرے: اپنی والدہ ماجدہ کے حق خدمت ادا کرنے میں مصروف رہے۔

مگر حضور فخر عالم ﷺ نے اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں فرما دیا تھا کہ ایک مرد خدا مقام قرن میں ہے۔ اس کا نام اولیس ہے۔ اس کا یہ مرتبہ ہے کہ اس کی شفاعت میری امت میں قبیلہ ربیعہ اور قبیلہ مضر کی بکریوں کے بالوں کے برابر ہوگی اور پھر حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ اور حضرت مولائے کائنات علی کرم اللہ وجہہ کی طرف رخ فرما کر ارشاد ہوا تم دونوں اسے دیکھو گے، ان کا قد چھوٹا ہوگا، ان کے سر کے بال لمبے ہوں گے، ان کے پہلوئے چپ پر ایک درہم برابر سفید داغ ہے اور ایک داغ اس کے ہاتھ کی ہتھیلی پر ہے، جب تم اس سے ملو، ہمارا اسے سلام کہنا اور کہنا کہ وہ ہماری امت کے لیے دعا کریں۔

بعد وفات سید اکرم ﷺ حضرت عمر اور حضرت علی رضی اللہ عنہما مکہ معظمہ تشریف لائے۔ اثناء خطبہ میں آپ ﷺ نے فرمایا: يَا أَهْلَ نَجْدٍ قَوْمُوا. ”اور اے نجد کے لوگو کھڑے ہو جاؤ“۔ حکم سن کر تمام کھڑے ہو گئے۔ عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا تمہارے اندر کوئی قبیلہ مقام قرن کا رہنے والا ہے لوگوں نے عرض کی، حاضر ہے اور جو مقام قرن کے لوگ تھے، انہیں امیر المؤمنین عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں پیش کر دیا۔

آپ نے پوچھا کہ تمہارے اندر کوئی ”اولیس“ نام کا آدمی ہے؟۔۔۔ عرض کی ”اولیس“

ایک دیوانہ آدمی ہے جو آبادی میں نہیں آتا، کسی کے پاس نہیں آتا، کسی کے پاس نہیں بیٹھتا، لوگوں کی غذا سے اس کی غذا بھی علیحدہ ہے، خوشی و غم اس کے نزدیک یکساں ہیں، جب لوگ ہنستے ہیں تو وہ روتا ہے، جب لوگ روتے ہیں تو وہ ہنستا ہے۔ امیر المؤمنین عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہم انہیں دیکھنا چاہتے ہیں۔ لوگوں نے عرض کی: حضور! جنگل میں اونٹوں کے پاس ملے گا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اٹھے اور جنگل میں جا کر ان سے ملے۔ دیکھا کہ اولیس (رضی اللہ عنہ) نماز میں مشغول ہیں۔ بیٹھ گئے۔ جب وہ نماز سے فارغ ہوئے تو فاروق و اسد اللہ نے انہیں سلام کیا اور ہاتھوں کی ہتھیلی پر نشان دیکھے۔ پھر حضور ﷺ کا سلام پہنچایا اور اُمت کے حق میں دعا کرنے کا حکم حضور ﷺ سنایا۔

تھوڑی دیر فاروق و اسد اللہ (رضی اللہ عنہما) اولیس کے پاس بیٹھے تھے کہ حضرت اولیس رضی اللہ عنہ نے عرض کی: آپ حضرات کو تکلیف ہوئی، اچھا اب تشریف لے جائیں، قیامت بہت نزدیک ہے اس جگہ ہمیں وہ دیدار ہوگا جس کے لیے بازگشت نہیں، میں اب قیامت کے راستہ کے سامان میں مشغول ہوں۔ جب قرنی لوگ حضرت فاروق اور اسد اللہ رضی اللہ عنہما کے ساتھ حضرت اولیس کی خدمت میں آئے تو انہوں نے آپ کا مرتبہ سمجھا اور آپ کا احترام کرنے لگے تو حضرت اولیس قرنی رضی اللہ عنہ وہاں سے کوفہ میں آگئے۔ اس کے بعد ہرم ابن حیان نے ایک روز انہیں دیکھا۔ اس کے بعد جنگ و غزوات علی کرم اللہ وجہہ تک کسی نے نہ دیکھا۔ پھر جب کہ حرب صفین ہوا، اس میں حضرت اولیس رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرفداری میں آئے، شریک حرب ہو کر شہید ہو گئے۔ عَاشَ حَمِيدًا وَمَاتَ شَهِيدًا۔ ”زندہ رہے تو حضور ﷺ کی زبان مبارک سے تعریف ہوئی، انتقال فرمایا تو شہادت پائی۔“

حضرت اولیس قرنی رضی اللہ عنہ سے ایک روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: ”السَّلَامَةُ فِي الْوَحْدَةِ“ ”یعنی سلامتی تخیلہ اور تنہائی میں ہے۔“ اس لیے کہ جو اپنا دل خالی رکھے وہ اغیار کے خطرہ اور اندیشہ سے آزاد ہے اور اپنے ماحول میں سب سے مایوس اسی وجہ میں وہ اغیار کی تمام آفتوں سے سلامتی میں رہتا ہے اور سب سے منہ پھیرے ہوئے ہوتا ہے۔

لیکن اگر کوئی یہ خیال کرے کہ وحدت سے مراد تنہا زندگی بسر کرنا ہے تو یہ محال ہے۔ اس لیے کہ جب تک کسی کے دل میں شیطان کی محبت ہو اور اس کے سینہ میں نفس غالب ہو اور دنیا و عاقبت کی فکر اور لوگوں کا اندیشہ ہو اس وقت تک اس کو کیفیت وحدت حاصل نہیں ہوتی۔ اس لیے کہ ماسوائے اللہ سے آرام ہو یا اس کا اندیشہ دونوں کی ایک ہی کیفیت ہے۔ تو جو تنہا ہوتا ہے اگرچہ اس

کی صحبت لوگوں میں ہو، اسے اپنی کیفیت وحدت میں کوئی خلل نظر نہیں آتا اور مشغول بغیر اللہ ہو، اگرچہ خلوت نشین ہی کیوں نہ ہو وہ کیفیت وحدت سے محروم ہی رہے گا۔

تو قطع محبت ماسوی اللہ کے یہ معنی ہیں کہ اس کے دل میں سوا ذات واحد کے، کسی کا تعلق اور کسی کی محبت نہ ہو اور جب اس کے دل میں خالص ذات واحد جاگزیں ہو چکی، وہ کتنا ہی لوگوں کے ساتھ میل جول رکھے اسے کوئی خطرہ نہیں۔

اور جو مخلوق سے محبت رکھے اس کے دل میں محبت الہیہ کا گزر نہیں ہو سکتا۔ گویا وہ محبت الہی کو سمجھتا ہی نہیں: لِأَنَّ الْوَحْدَةَ صِفَةُ عَبْدٍ صَافٍ سَمِعَ قَوْلَهُ تَعَالَى ﴿هُوَ أَلَيْسَ اللَّهُ بِكَافٍ عَبْدًا﴾ (۱)

”صفت عبد صافی محض وحدت ہے، سن اللہ کا فرمان! کیا اللہ اپنے بندہ کو کافی نہیں۔“

حضرت ہرم بن حیان رضی اللہ عنہ:

انہیں تابعین میں سے شمع صفاء، معدن وفا حضرت ہرم بن حیان رضی اللہ عنہ ہیں، جو بزرگان طریقت سے گزرے ہیں اور معاملہ حقیقت میں حظ وافر رکھتے ہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے صحبت یافتہ ہیں۔ حتیٰ کہ حضرت اویس قرنی رضی اللہ عنہ کی بھی زیارت کر چکے ہیں، آپ کی ملاقات کا واقعہ یوں ہے کہ آپ نے اویس قرنیؓ کی زیارت کا قصد کیا۔ حتیٰ کہ قرن پہنچے مگر نا امید واپس آئے۔ پھر مکہ معظمہ گئے تو خبر ملی کہ اویسؓ اب کوفہ میں رہتے ہیں، آپ شوق زیارت لیے کوفہ آئے مگر زیارت نصیب نہ ہوئی۔ امید زیارت میں ایک مدت دراز کوفہ میں گزاری۔ آخر ش بھرہ آنے کا عزم کیا، روانہ ہوئے تو راستہ میں دیکھا کہ لب فرات اویسؓ ٹھہراتے فرما رہے ہیں اور آپ کے جسم پر خرقہ ہے، پہچان لیا۔ وضو فرما کر اویسؓ نے شانہ فرما کر بالوں کو سنوارا اور چلنے لگے تو ہرم بن حیان سامنے آئے اور سلام کیا۔

حضرت اویسؓ نے جواب سلام میں فرمایا: وَعَلَيْكُمْ السَّلَامُ يَا هَرَمُ بْنُ حَيَّانَ.

ہرم متعجب ہو کر کہنے لگے آپ نے کس طرح پہچان لیا؟ آپ نے فرمایا:

عَرَفْتُ رُوحِي رُوحَكَ.

”میری جان نے تیری جان کو پہچان لیا“

تھوڑی دیر بیٹھے پھر مجھے رخصت فرما دیا۔ میرے ساتھ جو گفتگو فرمائی اس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق زیادہ باتیں تھیں اور مجھے حضرت عمر و علی رضی اللہ عنہما کی روایت سے حضور

ﷺ کی یہ حدیث سنائی اور کہا کہ انہوں نے فرمایا کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ وَإِنَّمَا لِكُلِّ امْرِئٍ مَّا نَوَىٰ فَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ فَهِجْرَتُهُ إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ إِلَى دُنْيَا يُصِيبُهَا أَوْ إِلَى امْرَأَةٍ يَتَزَوَّجُهَا فَهِجْرَتُهُ إِلَى مَا هَاجَرَ إِلَيْهِ . (۱)

”جزائیں نیست کہ عملوں کی جزائیتوں پر ہے اور ہر ایک شخص کے لیے وہی بدلہ ہے جو اس کی نیت ہو، تو جس نے ہجرت کی اللہ و رسول (ﷺ) کی طرف تو اس کی ہجرت اللہ و رسول (ﷺ) کی طرف ہوگی اور جس نے ہجرت کی حصول دنیا کے لیے یا کسی عورت کے لیے کہ اس سے عقد کرے تو اس کی ہجرت اسی طرف ہوگی جس نیت سے ہجرت کی۔“

اس کے بعد فرمایا ”عَلَيْكَ بِقَلْبِكَ“ .

”اپنے دل کی نگرانی ہر قسم کے اندیشہ غیر سے رکھ۔“

اس عبارت کے دو معنی ہیں: ایک یہ کہ مجاہدہ اتنا ہو کہ اپنے دل کو تابع حق کر لیا جائے۔ دوسرے یہ کہ اپنی خواہشات کو اس دل کا فرمانبردار بنالے۔

یہ دونوں زبردست اصول ہیں، مگر دل کو خدا کا تابع کرنا ان مریدوں کا کام ہے جو کثرت شہوت اور محبتِ حرص سے مجتنب ہو جائیں اور ہر قسم کے تفکرات جو درجہ بدرجہ پیدا ہوتے ہیں، انہیں دل سے دور کریں اور تدبیر صحت و حفظ امور میں کوشاں رہیں اور ہر معاملہ میں نظر برحق رکھیں تاکہ از دیاد محبت ہو اور اپنے کو تابع دل مرکزی بنا لینا کاموں کا کام ہے۔ اس لیے حق تعالیٰ شانہ ان کے دلوں کو اپنے نورِ جمال سے منور فرمادیتا ہے اور تمام علل و اسباب سے آزاد کر دیتا ہے، اور وہ وہاں پر پہنچا کر خلعتِ تقرب بخش کر اپنے الطاف کی تجلیات ان پر فرماتا ہے اور اپنا مشاہدہٴ جمال اور قرب

۱۔ امام مسلم نے اپنی ”صحیح“ ۴۸/۶ میں (کتاب الأمانة) امام بخاری نے اپنی ”صحیح“ (۵۳، ۲۵۲۹، ۳۸۹۸) میں، اسی طرح ابن حبان نے اپنی صحیح ۳۰۲/۱ میں، ابن خزیمہ نے اپنی ”صحیح“ (۱۳۳) میں، امام سخاوی نے ”المقاصد الحسنہ“ (ص: ۶۸) میں، امام قضاوی نے ”مسند شہاب“ ۳۵/۱ میں اور انہی الفاظ کے ساتھ امام بیہقی نے کتاب المعرفة ۳۵/۱ میں، امام نووی نے بستان العارفین (ص: ۲۴) میں، ابن الملقن نے ”البدور المنیر“ ۸۹/۱ میں اور امام عسقلانی نے ”التلخیص الحبیر“، ۵۵/۱ میں روایت کیا ہے۔ امام ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں: بلکہ صحیح بخاری میں مالک کے طریق سے الأعمال بالنية کے الفاظ آئے ہیں یعنی ”الما“ نہیں ہے اور ”النية“ مفرد ذکر کیا گیا ہے جبکہ ابن جارود ”المنتقى“ میں یہ الفاظ لائے ہیں: ”ان الأعمال بالنية“، ص: ۸۳

کو ان پر مستولی کر دیتا ہے۔ اس وقت ان کا جسم بھی ان کے دل کے موافق کر دیا جاتا ہے۔
تو وہ گروہ جو پہلے اہل دل گزرا، وہ صاحب القلوب اور باقی الصفت ہے اور یہ گروہ جو
مغلوب القلوب ہے وہ فانی الصفت ہے اور اس مسئلہ کی حقیقت یہ ہے جو حق جل جلالہ نے فرمائی:

﴿إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمْ الْمُخْلِصِينَ﴾ (۱)

”مگر وہ بندے جو خالص کیے گئے۔“

اسے لام پڑھا گیا اس لیے کہ مُخْلِصِينَ قائل ہے اور باقی الصفت۔ اور مخلص مفعول
فانی الصفت۔ اور یہ بہت بڑا درجہ رکھتے ہیں کہ تن کو موافق دل بناتے ہیں اس لیے کہ ان کے دل
تجلی حق کی طرف محول اور مشاہدہ جمال میں محور ہتے ہیں اور باقی الصفت جو ہیں وہ دل کو بتکلف
موافق امر بناتے ہیں۔

یہ مسئلہ درحقیقت صحو و سکر و مشاہدہ و مجاہدت سے تعلق رکھتا ہے اس مسئلہ کو زیادہ وضاحت
سے شرح طور پر کسی اور جگہ بیان کیا جائے گا۔ ان شاء اللہ

حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ:

انہیں تابعین میں امام عصر، فرید دہر، ابوعلی الحسن بن ابی حسن البصری رضی اللہ عنہ ہیں۔
ایک گروہ نے آپ کی کنیت ”ابو محمد“ لکھی ہے اور ایک جماعت نے ”ابوسعید“۔ آپ کا مرتبہ اہل
طریقت میں بہت بلند ہے اور فن تصوف میں آپ کے نہایت لطیف اشارات ہیں۔
ایک حکایت ہے کہ آپ کی خدمت میں ایک اعرابی آیا اور اس نے صبر کے متعلق سوال
کیا۔ آپ نے فرمایا: صبر دو طرح کا ہوتا ہے:

ایک صبر وہ ہے جو مصائب و بلا کے اندر کیا جائے۔

دوسرا صبر ان چیزوں سے جن سے ہمیں باز رہنے کا حکم اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملا، ان
سے اطاعت حکم کرتے ہوئے رکنا اور خواہشات کے خلاف پر صبر کرنا۔

اعرابی نے کہا:

أَنْتَ زَاهِدٌ مَا رَأَيْتُ أَزْهَدَ مِنْكَ .

”آپ ایسے زاہد ہیں کہ آپ سے زیادہ زاہد میں نے نہیں دیکھا۔“

اور آپ سے زیادہ صابر بھی کوئی نہ ہوگا۔ حضرت حسن بصری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا:

اے اعرابی! میرا زہد تو رغبت کلی ہے اور میرا صبر خالص جزع اور بے صبری۔ اعرابی نے عرض کی کہ

حضرت اس اجمال کی تفصیل فرمائیں؟ آپ نے ان جملوں سے تو مجھے مشوش کر دیا اور میرا عقیدہ مذذب ہو گیا۔

آپؐ نے فرمایا: ہمارا صبر بلا پر یا اطاعت حکم پر بوجہ خوف جہنم ہے اور یہ عین بے صبری ہے اور ہمارا زہد دنیا میں رغبتِ خالص ہے نعمتِ آخرت کے ساتھ اور یہ عین رغبت ہے۔ نہایت مبارک ہیں وہ لوگ جو اپنا حصہ اور اپنی قوتِ ارادی کو درمیان سے اٹھا چکے ان کا صبر خالص اللہ کے لیے ہے نہ کہ اپنے جسم کو جہنم سے امن دینے کے لیے اور زہد ہمارا خالص اللہ کے لیے ہونہ کہ خصوصیت سے بہشت میں داخل ہونے کے لیے، اور یہ علامتِ صحتِ اخلاص کی ہے۔

آپؐ ہی سے مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

إِنَّ صُحْبَةَ الْأَشْرَارِ تُورِثُ الظَّنَّ بِالْأَخْيَارِ.

”جو بد بختوں میں رہے گانیکوں کی جماعت سے اور ان کے پیشواؤں سے بدگمان ہو جائے گا۔“

اور یہ بات متفق علیہ ہے بلکہ یقینی اور موجودہ دور کے لوگوں کے بالکل موافق حال ہے جو عام طور پر محبوبانِ بارگاہ کے منکر ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ رسمی صوفیوں کی مجالس میں عوام بیٹھے اور ان کے ہر کام میں انہیں خیانت نظر آئی اور ان کی زبانوں پر دروغ بے فروغ پایا اور دوسروں کی غیبت کرتے سنا اور ان کے کان دوپیت اور ہزلیات پر لگے ہوئے دیکھے۔ ان کی آنکھیں لہو و لعب اور شہوت پرستی پر لگی ہوئی دیکھیں اور ان کی تمام تر کوششیں حرام و مشتبہ مال جمع کرنے میں صرف پائیں۔ تو انہوں نے خیال کر لیا کہ صوفی عام طور پر ایسے ہی ہوتے ہیں اور ان کا عمل اور مجاہدہ یہی ہے بلکہ صوفیاء کا یہی مذہب ہے۔ حالانکہ یہ بالکل غلط اور اتہام ہے۔ بلکہ صوفیوں کے تمام افعال اطاعتِ الہی پر ہیں اور ان کی زبان کلامِ حق اور شرمِ محبتِ حق حاصل کرنے پر کھلتی ہے۔ ان کے ضمیروں میں خالص محبتِ الہی بھری ہوئی ہوتی ہے، ان کے کان سماعِ حق کے محل اور حقیقتِ نبوت ہوتے ہیں۔ ان کی آنکھیں مشاہدہٴ جمالِ یار کو کھلی ہوتی ہیں۔ ان کی سعی و کوشش تمام حصولِ اسرارِ خفیہ پر ہوتی ہے اور وہ راز مخفی کے دیکھنے میں مجاہدہ کرتے ہیں۔

اگر کوئی قوم ایسی ظاہر ہو جائے کہ صوفیاء کے زمرہ میں مل کر ان کی سی رفتار و گفتار میں خیانت کرے تو ان کی خیانت کا اثر ان پر ہی پڑے گا نہ ان احرارِ جہان اور ساداتِ زمان پر۔ یاد رکھو! جو شریر لوگوں سے صحبت رکھے گا وہ اپنی شرارتِ نفس کے ماتحت ہوگا اور اگر اس میں بھلائی اور نیکی ہوگی تو وہ اختیار کے ساتھ ہی صحبت پسند کرے گا۔ از مترجم شعر

کند ہم جنس باہم جنس پرواز
کبوتر با کبوتر باز با باز

تو یاد رکھو! ہر کسی کی برائی اس کی ذات سے ہوگی صحبت ناسزا اور غیر کفو قبول کرنا اس کی نااہلی ہے بلکہ وہ روزِ ازل ہی سے اس قومِ اشرار سے ہوگا اور اس نے اپنے نفس کے شر کو نہ سمجھا ہوگا تو ایسے منکر جو خاصانِ بارگاہ سے بدظن ہو گئے، وہ ایسے مکاروں کی اقتداء میں خراب ہوئے برخلاف ان اخیار و محبوبانِ بارگاہ کے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں پچشمِ رضا دیکھا اور اپنے خواص میں انہیں جگہ عطا فرمائی، ان کی صحبت اگر جان و دل کے بدلہ میں حاصل ہو تو بھی ارزاں ہے، اس لیے کہ ان کا طریق عمل برگزیدہ اور وہ تمام عالم سے علیحدہ اور ان کی برکت سے انسان مقاصدِ دارین حاصل کرتا ہے ان کا حال اس شعر میں کسی نے خوب کہا ہے:

فَلَا تَحْقِرَنَّ نَفْسِي وَأَنْتَ حَبِيبِيهَا فَكُلُّ أَمْرٍ يَصِبُّ إِلَى مَنْ يُجَانِسُ
”نہ حقیر سمجھو میرے وجود کو حالانکہ تو اس کا محبوب ہے، یاد رکھو! ہر شخص اپنے ہم جنس سے مطلب کو پہنچتا ہے۔“

حضرت سعید بن المسیب رضی اللہ عنہ:

انہیں میں سے رئیس العلماء، فقیہ الفقہاء، حضرت سعید بن المسیب رضی اللہ عنہ ہیں۔ بڑے عظیم الشان اور بلند رتبہ والے گزرے ہیں۔ آپ کے فرامین بہت مقبول ہیں اور بہت زیادہ پاک باطن تھے۔ آپ کے مناقب بہت ہیں خصوصاً فنِ فقہ میں اور توحید و حقائقِ تفسیر و شعر لغت و غیرہ میں آپ یدِ طولیٰ رکھتے تھے۔ مشہور ہے کہ آپ بظاہر مردِ عیاری نظر آتے اور دل کے اعتبار سے نہایت پارسا تھے کہ پارسا نما اور عیاری طبع اور مذہبِ طریقت میں یہ صورت نہایت محمود ہے۔

مشائخِ کرام رضی اللہ عنہم میں آپ سے ایک روایت مشہور ہے کہ آپ نے فرمایا:
”إِرْضَ بِالْيَسِيرِ مِنَ الدُّنْيَا مَعَ سَلَامَةِ دِينِكَ كَمَا رَضِيَ قَوْمٌ
بِكَثِيرِهَا مَعَ ذَهَابِ دِينِهِمْ“

”راضی رہ اس تھوڑی دنیا سے جس میں تیرا دین سلامت رہے، جیسے راضی

ہیں کثرتِ مال و دنیا کے ساتھ اپنا دین فنا کر کے عوامِ الناس۔“

یعنی فقرِ سلامتی دین کے ساتھ اس سے بہتر ہے کہ غنا غفلت کے ساتھ حاصل ہو۔ یہی وجہ ہے کہ جب فقیر اپنے دل میں نظر کرتا ہے تو اندیشہ کی زیادتی نہیں پاتا اور جب ہاتھ پر نظر ڈالتا ہے تو اسے قانع پاتا ہے اور غنی، اور غنی جب دل میں نگاہ کرتا ہے تو اندیشوں کی دنیا آباد دیکھتا ہے

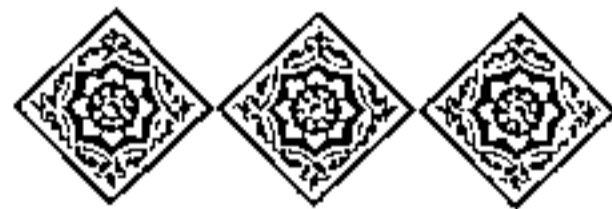
اور جب ہاتھ کو دیکھتا ہے تو مشتہ مال سے ملوث ہوتا ہے۔

تو رضاء دوستان الہی اس کے خداوندی پر بلا غفلت رہتی ہے اور رضائے غافلان دنیا پر غرور کے حصول اور آفت بے حسرت و ندامت اس آفت سے اچھی ہے جو آفت پر ذلت و معصیت ہو۔ غرضیکہ جب کوئی بلا غفلوں پر آتی ہے تو کہتے ہیں الحمد للہ مال پر ٹل گئی، جان و تن اس آفت سے محفوظ رہے اور جب کوئی بلا محبوبانِ بارگاہ پر آتی ہے تو کہتے ہیں کہ الحمد للہ کہ یہ بلا تن پر ٹل گئی اور دل محفوظ رہ گیا اس لیے کہ جو بلا تن پر آئی اور اس سے دل محفوظ رہ جائے وہ نہایت اچھی بلا ہے اور اگر وہ بلا دل پر آتی اور دل غافل ہو جاتا تو اگرچہ تن نعمتوں میں ہوتا مگر ایسی نعمت، نعمت نہیں بلکہ نعمت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قلیل دنیا کے ساتھ راضی رہنا اس کے کثیر ہو جانے کی موجب ہے اور رضاء کثیر دنیا کے ساتھ اسے قلیل کر دینے والی ہے اور ایسی جماعت کے لیے قلیل مثل کثیر ہے۔ آپ رضی اللہ عنہ ہی سے ایک روایت ہے کہ آپؐ مکہ معظمہ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک شخص آپؐ کے پاس آیا اور عرض کرنے لگا سعید! مجھے وہ حلال بتاؤ کہ اس میں حرام نہ ہو اور وہ حرام بتاؤ جس کے اندر حلال نہ ہو۔ آپؐ نے فرمایا:

”ذِكْرُ اللَّهِ حَلَالٌ لَيْسَ فِيهِ حَرَامٌ وَ ذِكْرُ غَيْرِهِ حَرَامٌ لَيْسَ فِيهِ حَلَالٌ“

”اللہ تعالیٰ کا یاد کرنا ایسا حلال ہے کہ اس میں حرام نہیں اور غیر خدا کا ذکر ایسا حرام ہے کہ اس میں حلال نہیں۔“

اس لیے کہ اس کے ذکر میں نجات ہے اور اس کے غیر کے ذکر میں ہلاک ہی ہلاک۔
و بِاللَّهِ التَّوْفِيقِ.



تبع تابعین تا بہ زمانہ حال

حضرت حبیب عجمی رحمۃ اللہ علیہ:

شجاع طریقت، متمکن اندر شریعت حضرت حبیب عجمی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ بڑے بلند ہمت اور بہت با قدر لوگوں سے گزرے ہیں۔ اپنے زمانہ کے مشائخ میں بہت معزز تھے۔ آپ کی ابتدائی توجہ اور بیعت حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے تھی۔

آپ ابتداء زمانہ میں بڑے ریاکار اور فتنہ و فساد میں مشاق تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو توفیق توبۃ النصوح عطا فرمائی اور ایسے مقرب بارگاہ ہو گئے۔

کچھ علم و عمل حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے حاصل کیا۔ آپ کی زبان عجمی تھی اس وجہ سے زبان عربی پر دشواری سے چلتی تھی۔ آپ کی بہت سی کرامتیں مخصوص ہیں۔ آپ کا درجہ یہاں تک بلند ہوا کہ ایک روز حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ آپ کی عبادت گاہ میں آئے۔ نمازِ شام کی تکبیر ہو رہی تھی اور جماعت کھڑی ہو چکی تھی۔ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے کھڑے ہو کر اقتداء کی مگر جب دیکھا کہ حضرت حبیب عجمی کی زبان سے مخارج قرآن کریم صحیح نہیں نکل رہے تھے، نماز تو آپ نے پڑھی مگر یہ محسوس فرمایا کہ ان کے مخارج صحیح نہیں ہیں۔

شام کو جب سوئے تو خواب میں جمالِ الہی سے مشرف ہوئے۔ عرض کی: الہی تیری رضا کس چیز میں ہے۔۔۔ جواب ملا حسن! اگر میرے حبیب عجمی کے پیچھے نماز پڑھتا اور صحیح نیت کرنے سے تجھے اس کی عجمی زبان نہ روکتی تو میں تجھ سے راضی ہو جاتا۔

اور مشائخ میں مشہور ہے کہ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ جب ظلم حجاج سے فرار ہو کر تشریف لائے تو حبیب عجمی رحمۃ اللہ علیہ کے حجرہ میں روپوش ہوئے۔ حجاج کے آدمی آئے اور آپ سے کہنے لگے۔ حبیب! تم نے حسن کو کبھی دیکھا ہے۔ آپ نے فرمایا: ہاں۔ ملازموں نے کہا کہاں دیکھا ہے؟ آپ نے فرمایا ابھی میرے عبادت خانہ میں تشریف لے گئے ہیں۔ متلاشی اندر حجرہ میں گئے، کسی کو نہ پایا، سمجھے کہ حبیب عجمی نے ہم سے مذاق کیا ہے۔ غضبناک ہو کر بولے سچ بتاؤ کہ کس جگہ نہیں دیکھا ہے۔ آپ نے قسم کھا کر فرمایا کہ سچ کہتا ہوں کہ وہ میرے حجرہ عبادت میں

ہیں۔ دوبارہ پھر گئے مگر حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ انہیں نظر نہ آئے۔ پھر سہ بارہ دیکھنے گئے، آخرش واپس ہو کر چلے گئے۔ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ حجرہ سے باہر تشریف لائے اور فرمایا حبیب! تو میں جانتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے تمہاری برکت سے مجھے ان کی نظر سے مخفی کر دیا مگر تم نے ان سے یہ کیوں کہہ دیا کہ حسن بصری اس جگہ اندر ہیں۔ عرض کی استاد! میری برکت سے آپ ان کی نظر سے پوشیدہ نہیں کیے گئے بلکہ وہ سچ جو میں نے بولا اس کی برکت سے آپ کو وہ سپاہی نہ دیکھ سکے، اگر میں جھوٹ بول دیتا تو مجھے اور آپ کو وہ رسوا کرتے۔

اس قسم کی بہت سی کرامتیں آپ سے ظاہر ہوئیں۔

آپ سے لوگوں نے پوچھا: رضاء الہی کس چیز میں ہے؟ آپ نے فرمایا:

فِي قَلْبٍ لَيْسَ فِيهِ غَبَارُ النِّفَاقِ .

”اس دل میں رضاء الہی ہے جس پر غبارِ نفاق نہ ہو“

اس لیے کہ نفاق خلافِ وفاق ہے اور رضاعین وفاق اور محبت کو نفاق کے ساتھ کچھ تعلق نہیں۔ اس کا مقام محض رضا ہے تو رضاء صفتِ محبوبان ہوئی اور نفاق صفتِ دشمنان اور یہ مضمون بڑا زبردست ہے۔ ان شاء اللہ کسی دوسری جگہ بیان کیا جائے گا۔

حضرت مالک بن دینار رحمۃ اللہ علیہ:

انہیں میں سے نقیبِ اہل انس، زین جملہ جن و انس حضرت مالک بن دینار رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ آپ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کے سرِ خاص تھے۔ مشائخ میں آپ کی کرامات مشہور ہیں اور ریاضت و مجاہدہ میں آپ کی خصلتیں مذکور۔

”دینار“ ایک غلام تھا اور یہ صاحبزادہ اسی حالت میں پیدا ہوئے کہ ان کے والد غلام تھے۔ آپ کی بیعت کا واقعہ یوں ہے کہ حضرت مالک ایک شب ہم چشموں میں مشغولِ عیش و طرب تھے۔ جب سب سو گئے تو آپ نے اس عود سے آواز سنی جسے بجا رہے تھے:

يَا مَالِكُ مَا لَكَ أَنْ لَا تَتُوبَ ؟

”اے مالک! تجھے کیا ہو گیا ہے کہ تُو توبہ نہیں کرتا؟“

یہ سنتے ہی آپ نے سب کاموں سے ہاتھ کھینچا اور حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں آ کر بیعتِ توبہ کی اور اپنے چال چلن کی اصلاح اس درجہ کی کہ ایک دن مالک بن دینار کشتی میں لوگوں کے ساتھ جا رہے تھے کہ کسی کا ایک نگینہ جو اہرات کا گم ہو گیا، سب کی طرف نظر ڈالی، حضرت مالک بن دینار ہی سب میں اجنبی نظر آئے، آپ پر اس نگینہ کی چوری کا الزام لگ

گیا۔ آپ نے آسمان کی طرف نظر اٹھائی کہ یک لخت تمام دریا کی مچھلیاں دریا سے منہ نکالے ہوئے نظر آئیں اور دیکھا کہ ہر مچھلی کے منہ میں ایک ایک گنینہ ہے۔ آپ نے ایک گنینہ لے کر اسے دے دیا اور خود کشتی سے سطح آب پر اتر کر کنارہ پر تشریف لائے اور دریا سے باہر ہو گئے۔ آپ کے ارشادوں میں سے ہے کہ:

”أَحَبُّ الْأَعْمَالِ عَلَيَّ الْإِخْلَاصُ فِي الْأَعْمَالِ.“

”عملوں میں سے محبوب ترین عمل مجھے وہ اخلاص ہے جو عمل میں ہو۔“

اس لیے کہ عمل با اخلاص ہی عمل ہوتا ہے اور اخلاص عمل کے اندر بمنزلہ روح ہے اور عمل بمنزلہ جسم، چنانچہ جب جسم بے روح رہ جاتا ہے تو وہ جماد محض ہوتا ہے۔ اسی طرح عمل بلا اخلاص محض حياء منشور ہے مگر اخلاص تمام اعمال میں باطن ہے اور طاعات اعمال ظاہرہ کا نام ہے اور اعمال ظاہری عمل باطن کے ساتھ تکمیل کو پہنچتے ہیں اور اعمال باطن کی قدر و قیمت اعمال ظاہر پر موقوف ہے۔

جیسے اگر کوئی کسی کے ساتھ ہزار برس دل سے مخلصانہ محبت رکھے مگر جب تک اس کا عمل اخلاص کا نظر نہ آئے گا وہ اخلاص، اخلاص نہ ہوگا۔ اسی طرح اگر کوئی ہزار سال ظاہری عمل کرتا رہے مگر جب تک اس میں اخلاص نہ آئے گا، وہ عمل طاعت مخلصانہ نہ کہلائے گا۔

حضرت ابو حبیب بن سلیم الراعی رحمۃ اللہ علیہ:

انہیں میں سے امیر الاولیاء، فقیر بے ریا ابو حلیم حضرت حبیب بن سلیم الراعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ہیں۔ مشائخ کرام میں آپ کی بہت زیادہ قدر و منزلت ہے، آپ دلائل اور آیات کے بیان فرمانے میں خاص مہارت رکھتے تھے اور آپ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے خاص مصاحب تھے اور آپ کے حالات اصحابِ حال کے سے تھے۔ آپ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث نقل فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

نِيَّةُ الْمُؤْمِنِ خَيْرٌ مِنْ عَمَلِهِ. (۱)

”مومن کی نیت اس کے عمل سے بہتر ہے۔“

آپ بکریاں چراتے اور کنارہ فرات پر تشریف رکھتے، آپ کا طریقہ زیادہ تر عزلت

نشینی تھا۔

مشائخ کرام میں سے ایک راوی ہیں کہ جب میں فرات کے کنارے سے گزرا۔ حبیب

۱۔ اس حدیث پاک کا تفصیلی ذکر پیچھے گزر چکا ہے۔

کو نماز میں پایا اور آپؐ کی بکریوں کی نگرانی بھیڑیا کر رہا تھا۔ میں نے کہا اس بزرگ کی زیارت کرنی چاہیے اس میں علاماتِ ولایت پائے جاتے ہیں۔ میں ٹھہرا رہا۔ جب آپ نماز سے فارغ ہوئے، میں نے سلام عرض کیا۔ آپؐ نے فرمایا: صاحبزادہ کس کام سے ادھر آئے ہیں۔۔۔ میں نے عرض کی: حضور کی زیارت کے لیے۔ آپؐ نے فرمایا: جزاک اللہ۔

میں نے کہا حضرت یہ کیا معاملہ ہے کہ بھیڑیے اور بکریوں کو ایک جگہ دیکھ رہا ہوں۔ فرمایا اس کی وجہ یہ ہے کہ بکریوں کا چرواہا اپنے رب کے ساتھ موافق ہے۔ یہ فرمایا اور اپنا پیالہ چوبیس ایک پتھر کے نیچے رکھ دیا۔ اس پتھر سے دو چشمے جاری ہو گئے: ایک دودھ کا اور دوسرا شہد کا۔ میں نے یہ دیکھ کر عرض کیا حضور! یہ درجہ کس عمل کے بدلہ میں حاصل کیا۔ فرمایا: بِمُتَابَعَةِ مُحَمَّدٍ رَسُولِ اللَّهِ حَضْرًا يَوْمَ النُّشُورِ ﷺ۔ پھر فرمایا صاحبزادے! قوم موسیٰ علیہ السلام جبکہ ان کی مخالف تھی، تو پتھر نے انہیں پانی دیا تھا حالانکہ موسیٰ علیہ السلام درجہ مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثناء کے برابر نہ تھے پھر جبکہ میں حضور ﷺ کا پیروکار ہوں تو پتھر مجھے کیوں نہ شیر و شہد دے۔ اور پھر محمد ﷺ تو موسیٰ علیہ السلام سے کہیں افضل و اعلیٰ مرتبہ پر ہیں۔ میں نے عرض کی۔ حضور! مجھے کچھ نصیحت فرمائیں۔ آپؐ نے فرمایا:

لَا تَجْعَلْ قَلْبَكَ صَنْدُوقَ الْحِرْصِ وَبَطْنَكَ وِعَاءَ الْحَرَامِ.

”اپنے دل کو حرص و ہویٰ کا صندوق نہ بنا اور اپنے شکم کو حرام کا برتن نہ کر۔“

اس لیے کہ ہدایتِ مخلوق انہیں دو چیزوں میں ہے اور نجات انہیں دو چیزوں سے مجتنب رہنے میں ہے۔ علاوہ اس کے میرے شیخ سے یہاں بہت سی روایات ہیں لیکن میں اس وقت ضیق میں ہوں، اس وجہ سے میں زیادہ نہیں لکھ سکتا۔ میری کتابیں غزنی میں رہ گئیں۔ اللہ اس شہر کو اپنی حفاظت میں رکھے۔ میں اس وقت ہندوستان کے شہر لہانور (۱) میں ہوں جو مضافات ملتان سے ہے اور نا جنسوں میں پھنسا ہوا ہوں۔ والحمد لله على السراء والضراء

حضرت ابو حازم مدنی رحمۃ اللہ علیہ:

انہیں میں سے پیر صالح حضرت ابو حازم مدنی رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ آپؐ بھی مشائخ کرام میں مقتداء مانے جاتے ہیں۔ آپ کو معاملاتِ عبادت میں خاص حصہ عطا ہوا اور میدانِ فقر میں آپؐ کا قدم بہت صحیح تھا اور آپ کے مجاہدات کی روش نہایت پاکیزہ تھی۔

۱۔ ”لہانور“ سے مراد شہر لاہور ہی ہے۔

اور حضرت عمر و ابن عثمان کئی نے آپ کے حالات میں بہت کوشش کی ہے۔ آپ کے کلام و مضامین مقبول خواص ہیں اور آپ کے عملی جواہر پارے بہت سی کتابوں میں مشہور ہیں اور عمر و ابن عثمان روایت کرتے ہیں کہ آپ سے کہا گیا:

مَا مَالِكَ، قَالَ: الرِّضَاءُ مِنَ اللَّهِ وَالْغِنَى عَنِ النَّاسِ.

آپ کا خزانہ اور مال کیا ہے؟ فرمایا: میرا مال رضاء الہی ہے اور مخلوقات سے بے نیازی۔

جو اپنے رب سے راضی ہو گیا وہ مخلوقات سے مستغنی ہو گیا اور زبردست خزانہ مردِ کامل کا رضائے مولا ہے اور اس میں اشارہ غنا جو ہے وہ من جانب اللہ ہے، تو جو من جانب اللہ غنی ہو گا وہ یقیناً غیر خدا سے مستغنی ہو گا اس کا راستہ بجز درگاہ الہی کوئی نہیں، وہ خلاء ملا میں بجز اپنے رب حقیقی کے کسی کو نہیں پکارتا۔ کسی نے مشائخ میں سے کہا کہ میں حضرت ابو حازم کے پاس آیا، دیکھا کہ آپ سو رہے ہیں، میں کچھ دیر ٹھہرا رہا تا کہ وہ بیدار ہوں، تھوڑی دیر بعد آپ اٹھے، مجھے دیکھ کر فرمایا کہ میں نے حضور ﷺ کی زیارت کی۔ حضور ﷺ نے میرے ذریعہ آپ کو پیام فرمایا ہے کہ جاؤ ماں کی خدمت کرو، یہ حج سے بہتر ہے۔ یہ سنتے ہی میں واپس گھر آ گیا اور حج کو نہیں گیا۔ بس اس سے زائد ان سے میری گفتگو نہیں ہوئی۔

حضرت محمد بن واسع رحمۃ اللہ علیہ:

انہیں میں سے داعی اہل مجاہدت، قائم اندر مشاہدت حضرت محمد بن واسع رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ہیں۔ آپ اپنے زمانہ میں اپنی نظیر آپ ہی تھے اور آپ کو بہت سے تابعین (یعنی وہ جنہوں نے صحابہ کرام کی زیارت کی) کی صحبت کا شرف ملا اور بہت سے مشائخ آپ کو اپنا امام و پیشوا مانتے ہیں اور رموزِ طریقت میں آپ پوری دستگاہ رکھتے تھے اور حقائقِ تصوف میں آپ کے خیالات بہت بلند تھے۔ آپ کے ارشادات جامع اور کامل ہوتے تھے۔ آپ ہی سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا:

مَا رَأَيْتُ شَيْئًا إِلَّا وَرَأَيْتُ اللَّهَ فِيهِ.

”میں نے کوئی چیز نہ دیکھی مگر جو دیکھا اس میں جلوہ الہی دیکھا۔“

اور یہ خاص مقام مشاہدہ ہے کہ بندہ غلبہ محبتِ یار میں اس مقام پر پہنچ جائے کہ جب وہ فعل میں نظر ڈالے تو اسے فعل نہ سمجھے۔ جیسے کوئی تصویر کو دیکھے تو اس کی نظر مصور پر پڑتی ہے۔ اس مضمون کی حقیقت بموجب فرمان ابراہیم علیہ السلام ہے کہ جب آپ نے ماہتاب و آفتاب کو دیکھا

تو ”هَذَا رَبِّي“ (۱) فرمایا اور جب ستارہ دیکھا تو ”هَذَا رَبِّي“ اور یہ کہنا تمام تر غلبہ شوق میں تھا کہ جس چیز کو دیکھا اس میں صفاتِ محبوب کا مشاہدہ کیا۔

اس لیے کہ جب مجاہدانِ خاص عالم پر نظر ڈالتے ہیں تو ہر شے کو مقہور بقہر و اسیر سلطانِ دہر دیکھ کر جان لیتے ہیں کہ یہ سب کچھ جو ہو رہا ہے اس کے پردہ میں فاعلِ حقیقی کی قدرت کام کر رہی ہے، تو اس کی تلاش کرتے کرتے اپنے دل میں ہر چیز کو محض ناچیز یقین کر لیتے ہیں اور جب مجاہدانِ بارگاہِ پشمِ اشتیاق اس عالم پر نظر ڈالتے ہیں تو مقہور نہیں بلکہ سب کو قاہر دیکھتے ہیں اور مخلوق کو نہیں بلکہ سب میں جلوہ خالق دیکھتے ہیں اور اس بحث کو ہم بابِ مشاہدہ میں بیان کریں گے۔ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ۔ اس مسئلہ میں ایک جماعت کو غلط فہمی ہو گئی ہے اور وہ اس غلط فہمی کے ماتحت کہتے ہیں کہ وہ مرد جس نے کہا ”رَأَيْتُ اللّٰهَ فِيْهِ“ یعنی اللہ کو میں نے اس میں دیکھا۔ اس سے مکان اور حلول ثابت ہوتا ہے۔ اِگر بِالْفَرَضِ وَ التَّقْدِيْرِ كُوْنِيْ كِهے کہ مکان مخلوق ہے تو مکین بھی مخلوق ہوگا اور اگر مکین قدیم تو مکان بھی قدیم ماننا پڑے گا۔ اس میں دو فساد آتے ہیں یا خلق کو قدیم کہا جائے یا معاذ اللہ خالق کو محدث، اور یہ دونوں کفر ہیں۔

تو دیکھنے سے مراد ذاتِ حقیقی نہیں ہوگی بلکہ اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ہر چیز میں نشانیِ قدرتِ الہیہ اور براہینِ فطرتِ قادرہ کا مشاہدہ ہو رہا ہے اور یہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں پھر اس بحث میں بڑے لطیف رموز و نکات ہیں جو اپنی جگہ پر ان شاء اللہ بیان کریں گے۔

حضرت ابو حنیفہ النعمان رضی اللہ عنہ:

انہیں میں سے امامِ امامان، مقتداءِ ستیاں، شرفِ فقہاء، نزلاءِ حضرت امام ابو حنیفہ نعمان بن ثابت النخرازی رضی اللہ عنہ ہیں۔ آپ مجاہدات و عبادات میں نہایت ثابت قدم تھے اور طریقت کے اصول میں بڑے جلیل الشان عالم مانے گئے ہیں، حتیٰ کہ ابتداءِ زمانہ میں آپ نے عزمِ عزالت نشینی فرمایا تھا اور مخلوقات سے علیحدگی فرمائی تھی۔ چاہتے تھے کہ مخلوقات سے علیحدہ ہو کر دل کو ریاست و جاہِ مخلوق سے پاک فرمائیں اور خالص ربّ جل مجدہ کی اطاعت میں کمر بستہ ہوں کہ ایک شب خواب میں دیکھا کہ حضور سید اکرم ﷺ کے استخوانہائے مبارک لحد مبارک سے جمع کر کے ان میں سے بعض کو بعض پر ترجیح دے کر پسند کر رہے تھے۔ اس خواب سے اتنی ہیبت طاری ہوئی کہ بیدار ہو گئے اور سخت پریشان۔ آخر صحابہ کرام کے ایک تلامذہ میں سے حضرت محمد بن سیرین رضی اللہ عنہ تھے، ان کی خدمت میں گئے اور خواب بیان کیا۔ آپ نے تعبیر دی کہ خواب مبارک ہے، تم

علم سید الانبیاء ﷺ حاصل کر کے محافظت سنت میں اعلیٰ درجہ پاؤ گے بلکہ ان روایات سنت میں نقد و تنقیح کر کے تصرف فرمانے کے مجاز بنو گے اور صحیح کو سقیم سے علیحدہ کرو گے۔

دوبارہ پھر خواب میں جناب رسالت مآب ﷺ کو دیکھا کہ حضور ﷺ فرما رہے ہیں:

”ابو حنیفہ! تجھے اللہ نے میری سنت زندہ کرنے کے لیے بنایا ہے، گوشہ نشینی کا عزم نہ کر۔“

چنانچہ آپؐ نے خدمت دین شروع کر دی اور بڑے بڑے مشائخ کرامؓ سے مثل ابراہیم اور فضیل بن عیاض، داؤد طائی، بشر حافی رحمہم اللہ وغیرہم کے استاد ہوئے اور علاوہ اس کے آپؐ کے تورع اور اتقاء کے بہت سے واقعات علماء میں مشہور ہیں۔ چنانچہ بادشاہ ابو جعفر منصور کے عہد کا واقعہ مشہور ہے کہ چار آدمی اس نے اپنی سلطنت کے قضاة کے لیے خاص طور پر منتخب کیے اور فیصلہ کیا کہ ان میں سے ایک قاضی اسلام بنایا جائے: [i] امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ [ii] حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ [iii] حضرت مسعر ابن کدام رحمۃ اللہ علیہ [iv] حضرت شریح رحمۃ اللہ علیہ۔ اور یہ حقیقت ہے کہ یہ چاروں زبردست علماء میں سے تھے۔ کسی کو ملازمین میں سے حکم ملا کہ ان چاروں کو بلا لائے۔ جب اپنی آیا، چاروں روانہ ہوئے راستہ میں امام صاحبؒ نے فرمایا کہ میں آپ حضرات کو کچھ باتیں کہوں جو فرستائے میرے ذہن میں آئی ہیں۔ سب نے جواب دیا کہ فرمائیں۔

آپؐ نے فرمایا میں تو حیلہ سے اپنے کو عہدہ قضا سے بچا لوں گا اور مسعر دیوانہ بن کر بچ جائے گا اور سفیان دربار سے بھاگ جائیں گے۔ اب رہے شریح، یہ قاضی بنیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ حضرت سفیان تو راستہ ہی سے بھاگے اور کشتی میں بیٹھ کر فرمانے لگے مجھے چھپا لو کہ حکومت میرا سر کاٹنا چاہتی ہے اور یہ جملہ حدیث سید اکرم ﷺ سے ماؤل فرمایا۔ حضور ﷺ نے فرمایا ہے:

مَنْ جُعِلَ ذَنْبًا فَقَدْ ذُبِحَ بِغَيْرِ سَكِينٍ. (۱)

”جو قاضی بنایا گیا وہ بغیر چھری کے ذبح کیا گیا۔“

ملاحوں نے آپ کو چھپا دیا اور یہ تینوں حضرات دربار ابو جعفر منصور میں پہنچے۔

۱۔ اسے امام احمد، امام ابو داؤد، امام نسائی اور ابن ماجہ وغیرہم نے ابو عاصم کی طرح بطریق عثمان بن محمد الحسنی روایت کیا ہے۔ امام قضاعی نے بطریق زید بن اسلم، سعید المقبری اور اعرج ان دونوں نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے۔ بعض کے الفاظ یہ ہیں اور ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں: فانه قد ذبح مذکورہ الفاظ ابن ماجہ کے ہیں اور اسی طرح امام نسائی اور امام دارقطنی کے الفاظ ہیں اور ایک روایت اس طرح ہے: من استعمل علی القضاء جبکہ ابو داؤد کے یہ الفاظ ہیں: من ولی القضاء۔ امام ترمذی کہتے ہیں: یہ حسن اور غریب ہے۔ (بقیہ حواشی اگلے صفحہ پر۔۔۔۔۔)

ابو جعفر منصور نے خصوصیت سے حضرت امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ سے عرض کی کہ آپ کو منصب قضاء پر متمکن ہونا چاہیے۔ آپ نے فرمایا امیر المومنین! میں عربی النسل نہیں بلکہ ان سے محبت رکھنے والا ہوں تو سادات عرب میرے حکم پر خوش نہ ہوں گے۔ ابو جعفر منصور نے کہا حضرت! اس عہدہ کو نسب سے تعلق نہیں ہے، یہ عہدہ علم والے کو ملتا ہے۔ آپ نے فرمایا پھر بات یہ ہے کہ میں اس منصب کے لائق نہیں اور سچ کہتا ہوں کہ لائق نہیں۔ پھر اگر میں سچ کہہ رہا ہوں تو ظاہر ہے کہ میں اس عہدہ کے لائق نہیں اور اگر میں جھوٹ کہہ رہا ہوں تو ظاہر ہے کہ دروغ گو قاضی مسلمانان بننے کا کس طرح اہل ہو سکتا ہے؟ اور آپ کہ خلیفہ الہی ہیں، کبھی روا نہیں رکھ سکتے کہ دروغ گو کو اپنا نائب بنائیں اور مسلمانوں کے خون، مال، عزت و روپیہ کا اس پر بھروسہ کریں۔ یہ فرمایا اور بموجب پیشگوئی نجات پا گئے۔

اب حضرت مسعر بن کدام کی باری آئی۔ آپ آگے بڑھے اور امیر المومنین، ابو جعفر منصور کا ہاتھ پکڑ کر فرمانے لگے: ابو جعفر! اچھی طرح ہو، تمہارے بچے بیوی تو اچھے ہیں، منصور نے یہ بے ربط کلام سن کر حکم دیا کہ اسے دربار سے نکال دو، یہ دیوانہ معلوم ہوتا ہے۔

اس کے بعد حضرت شریح کو فرمایا گیا کہ تمہیں منصب قضاء پر آنا چاہیے۔ آپ نے کہا کہ میں سودائی آدمی ہوں، میرا دماغ کمزور ہے۔ منصور نے کہا علاج کرا لیں، عصار ہائے موافقہ اور نبیذ ہائے مثلث استعمال کریں آپ کی عقل کامل ہو جائے گی۔ آخر شریح منصب قضاء شریح کو دے دیا گیا۔ حضرت امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ نے اسی وقت شریح کو چھوڑ دیا اور کبھی ان سے کلام نہ فرمایا اور یہ آپ کے کمال حال کی خاص نشانی تھی، ان میں دو علیحدہ علیحدہ شانیں نظر آئیں، ایک تو ان کی پیشگوئی کی صداقت کہ جیسا فرمایا ویسا ہوا، دوسرے اپنے کو صحت و سلامتی پر اتنا قائم رکھا کہ جاہ و اعزازِ خلقت کی پرواہ نہ کی۔

یہ ستون ایسے پایہ کے نکلے کہ کسی نہ کسی حیلہ سے مخلوق کو اپنے سے دور رکھ کر اتنے بڑے

(بقیہ حوالہ گزشتہ صفحہ سے)

امام نسائی کہتے ہیں: داؤد مشہور راوی نہیں اور اعلیٰ قوی نہیں، اور امام سخاوی رقمطراز ہیں: یہ حدیث صحیح بلکہ حسن ہے۔ حوالہ کے لیے: مسند الامام احمد ۲/۲۳۰، ۳۶۵، سنن ابی داؤد ۳/۲۲۳، ۲۲۴ (حدیث: ۳۵۵۴، ۳۵۵۵) سنن الترمذی ۶/۲۷۵ (حدیث: ۱۳۴۰)، المعجم الصغیر للطبرانی ۱/۱۷۶، السنن الكبرى للبیہقی، ۱۰/۹۶، تاریخ بغداد للخطیب ۶/۱۵۰، ۱۵۱، تاریخ جرجان، السہمی، (ص: ۶۱)، العلل المتناہیة لابن الجوزی ۲/۱۷۰، کشف الخفاء ۶/۲۲۳، المقاصد الحسنة للسخاوی (ص: ۴۰۹، حدیث: ۱۱۰۷)

منصب سے مجتنب ہو گئے۔ آج کے دن عام علماء و فضلاء اس قسم کے عمل اور ورع و تقویٰ کی پرواہ نہیں کرتے اس لیے کہ وہ سب کے سب حرص و ہویٰ کے ساتھ وابستہ ہیں اور طریقہ حق سے فرار شدہ ہیں۔ ان کے لیے امراء کے گھر بمنزلہ قبلہ ہیں، ظالم اہل حکومت کی بارگاہ بیت المعمور ہے اور جابروں کے درباروں میں ان کے فرش تک پہنچ جانا، ”قَابَ قَوْسَيْنِ أَوْ أَدْنَىٰ“ سے کم نہیں سمجھتے اور جو کچھ ان کی مرضی کے خلاف بات ہو اس سے یہ پہلے منکر ہو جاتے ہیں۔

ایک دفعہ غزنی میں (خدا اس شہر کو محفوظ رکھے) علم و امامت کے مدعیوں میں سے ایک شخص کہنے لگا کہ مرقعہ پہننا بدعت ہے۔ میں نے اسے جواب دیا کہ بَجَّہ حَشِيشٍ اور پوشاک دہیق جو خالص ابریشم سے تیار ہوتا ہے تمہارے اور تمام مردوں کے لیے شرعاً حرام ہے، تم ان عباؤں اور قباؤں کو ظالم جابر حکام سے خوشامد کر کے لیتے اور پہنتے ہو، اس میں اول تو خوشامد حرام، پھر ظالم سے لے کر حرام، پھر اس کا پہننا حرام، لیکن اسے تم پہنتے ہو اور کبھی اسے بدعت تک نہیں کہتے، برخلاف خرقہ کے کہ وہ جامہ حلال ہوتا ہے اور مال حلال سے خریدا جاتا ہے، اس کا پہننا کس طرح بدعت بنا دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر تمہارے دلوں پر رعونت غالب نہ ہو اور نفس کی گمراہی میں تم نہ پھنسے ہوتے تو اس کے بجائے کہ خرقہ کو بدعت کہہ دیا کوئی اچھی بات کہہ دیتے۔

عورتوں پر لباس ابریشم حلال ہے اور مردوں پر حرام اور دیوانوں پر مباح، اگر تم لوگ عورت یا دیوانہ ہو تو پھر تم معذور ہو۔ وَنَعُوذُ بِاللَّهِ مِنْ الْإِنصَافِ.

حضرت امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب حضرت نوفل بن حیان رضی اللہ عنہ نے وفات پائی تو میں نے خواب میں دیکھا کہ قیامت قائم ہے اور مخلوقات حساب و کتاب کے مقام پر کھڑی ہے۔ حضور سید یوم النشور ﷺ کو دیکھتا ہوں کہ حوض کوثر کے کنارے جلوہ فرما ہیں اور آپ کے بائیں طرف بہت سے مشائخ حاضر ہیں۔ ایک بزرگ معمر کو دیکھا کہ بہت خوبصورت ہیں اور آپ کے سر کے بال بکھرے ہوئے ہیں اور انہوں نے اپنا رخسار مبارک حضور ﷺ کے رُخ اقدس پر رکھا ہوا ہے اور ان کے برابر حضرت نوفل بن حیان رضی اللہ عنہ کھڑے ہیں۔ انہوں نے جیسے ہی مجھے دیکھا تو میری طرف آئے اور سلام فرمایا۔ میں نے انہیں کہا: مجھے پانی دیجئے۔ فرمایا: حضور ﷺ سے اجازت لے لوں، کہ حضور ﷺ نے انہیں انگلی سے اشارہ فرما کر پانی دینے کا حکم فرمایا۔ میں نے پانی پیا اور میرے ساتھی جو تھے انہیں پلایا۔ مگر وہ جام جس میں پانی ملا تھا، بدستور مملو ہی رہا کچھ کم نہ ہوا۔

میں نے حضرت نوفل بن حیان سے پوچھا کہ یہ بزرگ سفید بالوں والے جو حضور

ﷺ کے داہنے جانب کھڑے ہیں کون ہیں؟ فرمایا یہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ علی نبینا وعلیہ السلام ہیں اور بائیں طرف جو کھڑے ہیں وہ صدیق اکبر خلیفہ رسول رضی اللہ عنہ ہیں۔

اسی طرح میں پوچھتا رہا اور اپنی انگلیوں میں گنتا رہا حتیٰ کہ سولہ بزرگوں کو میں نے گنا۔ جب میں بیدار ہوا تو سولہ عدد پر میری انگلی میں گرہ کے نشان تھے۔

حضرت یحییٰ بن معاذ رازی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے حضور ﷺ کو خواب میں دیکھا۔ میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! اِنَّ اَطْلُبُكَ قَالَ عِنْدَ عَلِمِ اَبِي حَنِيفَةَ. ”حضور! میں حضور کو کہاں تلاش کروں، فرمایا ابو حنیفہ کے علم کے نیچے۔“

غرضیکہ حضرت امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ کے ورع و تقویٰ میں اس قدر مناقب ہیں کہ یہ کتاب ان کی متحمل نہیں۔

میں (یعنی حضرت علی بن عثمان جلابی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ) ایک بار شام میں تھا اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ مؤذن حضور اکرم ﷺ کے مزار کے سرہانے سو رہا تھا کہ اپنے آپ کو مکہ میں دیکھا اور اسی خواب میں دیکھا کہ سرکارِ مدینہ ﷺ باب بنی شیبہ سے تشریف لارہے ہیں اور ایک بزرگ معمر کو اپنے پہلو میں اس طرح لے رکھا ہے جیسے بچوں کو شفقت سے لیتے ہیں۔

میں فرطِ محبت سے دوڑا اور حضور ﷺ کے پائے اقدس کو چومنے لگا اور میں اس تعجب میں تھا کہ یہ معمر، حضور ﷺ کے اتنے محبوب کون ہیں!! حضور ﷺ میرے تعجب کو نورِ نبوت سے سمجھ گئے۔ مجھے فرمانے لگے یہ تیرا امام ہے اور تیرے شہر کے لوگوں کا امام ہے یعنی ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ۔ مجھے اس خواب کے بعد اس ہستی پاک کے ساتھ امید قوی ہے اور میرے اہل شہر بھی بالخصوص امیدوار ہیں اور اس خواب سے میرا یہ خیال بھی صحیح ہو گیا کہ حضرت امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ انہیں پاک ہستیوں میں سے تھے جو اوصافِ طبع سے فانی اور احکامِ شرع کے ساتھ باقی و قائم ہیں، اس لیے ان کے چلانے والے حضور سید یوم النشور ﷺ ہیں۔ اگر آپ خود چلتے تو باقی الصفت ہوتے اور باقی الصفت یا مخطی ہوتا ہے (یعنی ارادہ صواب کرے گا مگر بلا ارادہ خطا ظاہر ہو جائے) یا مصیب ہوتا ہے (یعنی حقیقتِ معاملہ کو اچھی طرح پہنچنے والا)۔

اور جب ان کے قائد خود حضور ﷺ ہیں تو فانی الصفت ہوئے اور نبی کی صفت بقا سے قائم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پیغمبر سے صدورِ خطا ناممکن ہے جو اس ذات کے ساتھ قائم ہے، اس سے بھی خطا نہیں ہو سکتی۔ یہ درحقیقت ایک نہایت لطیف رمز ہے۔

مروی ہے کہ جب حضرت داؤد طائی رضی اللہ عنہ علم دین حاصل فرما کر پیشوا بن چکے اور

منصب افتاء حاصل کر لیا تو حضرت امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ اب مجھے کیا حکم ہے؟۔۔۔ امام صاحب نے فرمایا:

عَلَيْكَ بِالْعَمَلِ فَإِنَّ الْعِلْمَ بِلاَعْمَلٍ كَالْجَسَدِ بِلا رُوحٍ

”اب تم پر عمل لازم ہے اس لیے کہ علم بلا عمل ایسے ہے جیسے جسم بلا روح۔“

جب تک علم، عمل کے ساتھ نہ ہو، صاف نہیں ہوتا اور نہ بغیر عمل زمانہ سے مخلصی ملتی ہے اور جو مجرد علم پر قناعت کرے وہ عالم نہیں ہے۔ اس لیے کہ عالم مجرد علم پر قانع نہیں ہوتا اور علم کا جو عین ہے وہ خود عمل کا متقاضی ہے۔ جس طرح ہدایت، مجاہدہ، کی متقاضی ہے یا جیسے مشاہدہ بلا مجاہدہ نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح علم بے عمل نہیں آتا اور علم میراث عمل ہے اور علم کا فائدہ اور اس کا انکشاف عمل کی برکت سے حاصل ہوتا ہے۔ غرضیکہ کہ کسی صورت میں علم کو عمل سے جدا نہیں کرنا چاہیے جیسے نور آفتاب کو آفتاب سے علیحدہ نہیں کر سکتے۔ اور ابتداء کتاب میں ہم نے بیان علم پر ایک مختصر باب لکھ دیا ہے۔ وَ بِاللّٰهِ التَّوْفِیْقِ

حضرت عبداللہ بن المبارک رضی اللہ عنہ:

انہیں میں سے سید زہاد، قائد اوتاد حضرت عبداللہ بن المبارک مروزی ہیں! رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ آپ کا وجود اپنے زمانہ میں مستثمان قوم میں سے تھا اور شریعت و طریقت کے احوال و اسباب و اقوال میں آپ کو امام وقت مانا گیا۔ آپ نے بڑے بڑے مشائخ کرام و صوفیاء عظام کی زیارت فرمائی اور ان کے فیض صحبت سے مستفیض ہوئے۔ آپ کی تصانیف ہر علم و فن میں مشہور اور کرامتیں مذکور ہیں۔

ابتدائی دور آپ کا ایسا تھا کہ آپ ایک کینر پر فریفتہ تھے اور اتنے دلدادہ تھے کہ ایک رات ستانہ واراٹھے اور ایک اپنے ہم چشم کو ساتھ لے کر اپنی معشوقہ کے مکان کے زیر دیوار کھڑے ہو گئے۔ معشوقہ بھی آپ کی فریفتہ تھی، وہ وقت معہودہ پر برسرام آگئی اور تمام شب یہ اسے دیکھتے رہے، وہ انہیں دیکھتی رہی۔ تمام شب گزر گئی۔

جب صبح کی اذان کی آواز آئی، ابن مبارک کو خیال آیا کہ عشاء کی اذان ہو رہی ہے مگر جب دن نکل آیا تو سمجھ گئے کہ یہ عشاء کی نہیں فجر کی اذان تھی اور میں نے تمام شب حسن پرستی معشوقہ میں گزار دی۔ نفس لوامہ نے ملامت کی، آپ کو محسوس ہوا اور دل سے کہنے لگے: تجھے شرم کرنی چاہیے کہ تمام رات محض ہوائے نفسانی کو پورا کرنے کو تو نے ایک پاؤں کھڑے ہو کر گزار دی، اس پر خواہش ہے کہ اعزازِ اخروی حاصل کرے، اگر یہ شب نماز میں طویل سورت شروع کر کے

اپنے رب کے حضور کھڑا ہوتا تو دیوانہ وار خود رفتہ ہو جاتا۔ ابن مبارک!۔۔۔ اس پر دعویٰ ایمان۔۔۔!!

پس یہ مکالمہ دل سے کر کے آپ نے فی الفور توبہ کی اور ایسی توبہ کی کہ اس کے بعد آپ کے اوقات، علم اور طلبِ حق میں صرف ہوئے اور زہد و دیانت میں یہ درجہ پایا کہ ایک بار آپ کی والدہ باغ میں گئیں اور آپ کو باغ میں سویا ہوا دیکھا۔ قریب پہنچیں تو دیکھتی ہیں کہ ایک بہت بڑا سانپ شاخ گل منہ میں لے کر آپ کے سرہانے مگس رانی کر رہا ہے۔ اس زمانہ میں آپ مقام مرو میں تھے۔ اس کے بعد آپ یہاں سے بغداد شریف چلے آئے اور بزرگانِ عظام کے فیضِ صحبت سے مستفید ہوئے پھر کچھ عرصہ مکہ معظمہ میں حاضر رہے بعد ازاں پھر مرو واپس آ گئے۔

لوگوں کو معلوم ہوا تو برائے زیارت حاضر آئے اور ایک درس آپ کے لیے قائم کیا گیا اور ایک مجلس خاص آپ کے فیضِ صحبت سے استفادہ کرنے کو قائم ہو گئی۔ مرو میں مسلمانوں کے اندر کچھ لوگ عقلی دلائل کے ماتحت اپنی رائے کے مطابق عمل کرنے والے تھے اور کچھ لوگ فرمان رسالتِ نبوی ﷺ پر عامل تھے۔ اب تک ان کا یہی رویہ ہے، ان لوگوں کو ”رضی الفریقین“ کہتے ہیں اس لیے کہ دونوں فریق باہم موافق تھے۔ پھر آپ نے یہاں دو مسافر خانے بنوائے۔ ایک ان لوگوں کے لیے جو حضور ﷺ کے حکم کے ماتحت عمل کرتے تھے، دوسرا ان کے لیے جو اپنی رائے اور عقل کی روشنی میں چلتے تھے۔ چنانچہ آج تک یہ دونوں لوگ وہاں موجود ہیں اور اصلی عقیدہ میں دونوں متحد اور ایک عقیدہ پر قائم ہیں۔

بعد ازاں آپ وہاں سے پھر حجاز تشریف لے آئے اور یہاں ہی ہمیشہ کے لیے رہ گئے۔ لوگوں نے آپ سے ایک بار پوچھا کہ آپ نے عجائباتِ عالم میں سے کیا چیز خاص دیکھی؟۔۔۔ فرمایا: ایک راہب دیکھا (راہب نصاریٰ کے زاہد کو کہتے ہیں جو تارک الدنیا ہو) جو اپنے طریقہ کے مجاہدہ و ریاضت میں گھل کر زار و نزار ہو چکا تھا اور خوفِ الہی سے اس کی کمر اتنی جھک گئی تھی کہ دوہرا ہو گیا تھا، میں نے اس سے پوچھا:

”يَا رَاهِبُ كَيْفَ الطَّرِيقُ إِلَى اللَّهِ فَقَالَ لَوْ عَرَفْتُ اللَّهَ لَعَرَفْتُ

الطَّرِيقَ إِلَيْهِ فَقَالَ أَعْبُدْ مَنْ لَا أَعْرِفُهُ، وَتَعَصِي مَنْ تَعْرِفُهُ.“

”اللہ تعالیٰ تک رسائی کا کونسا راستہ ہے؟ کہنے لگا اگر تو اللہ کو پہچان لے گا،

اس کے راستہ کو بھی جان لے گا۔ (پھر) کہنے لگا میں اس کا پرستار ہوں جسے

آج تک نہیں پہچانا اور تو اس کی نافرمانی کر رہا ہے جسے تو جانتا ہے۔“

یعنی معرفتِ ذات، مقتضی خوف ہے اور میں تجھے بے خوف اور بے غم پاتا ہوں اور بے خوفی مقتضی کفر و جہل ہے۔ اس جواب سے میں نے اپنے دل میں خوف محسوس کیا اور اس کے الفاظ نے مجھ پر یہ اثر کیا کہ بہت سے ناکردنی افعال سے رکا رہا۔

آپ سے ایک روایت ہے کہ آپ نے فرمایا:

”السُّكُونُ حَرَامٌ عَلَى قُلُوبِ أَوْلِيَائِهِ“

”محبوبانِ بارگاہ کے قلوب پر سکون حرام ہے۔“

اس لیے ان کے دل سکون میں نہیں ہوتے۔ دنیا میں ان کا اضطراب طلبِ جمال کے لیے رہتا ہے اور عقبیٰ میں ان کا اضطراب طربِ بے کیف کی وجہ میں۔ چونکہ دنیا میں وہ جلوہ یار سے غیبت میں رہنے کی وجہ سے مضطرب رہتے ہیں اور عقبیٰ میں وصلِ بے کیف کے باعث۔ تو خلاصہ یہ نکلا کہ ان کی دنیا مثلِ عقبیٰ کے ہے اور عقبیٰ مثلِ دنیا کے۔ اس لیے کہ سکونتِ دل کے لیے دو چیزیں ضروری ہیں یا حصولِ مقصود یا مراد پانے سے غفلت اور یہ لوگ ان دونوں چیزوں کو روا نہیں رکھتے۔ ☆

ان کا مقصد یہ ہے کہ خفقانِ محبت سے دل کو سکون ہی نہ ملے اور غفلت، مہمانِ الہی کے یہاں حرام ہے اس لیے کہ غفلت آئی اور حرکاتِ طلب میں سکون ہوا، اور وہ اضطراب و اضطراب طلب سے دل میں سکون پسند نہیں کرتے۔ اس بحث میں اہل طریقت محققین کے بہت قوی دلائل ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم

حضرت فضیل بن عیاض رضی اللہ عنہ:

انہیں میں سے شاہِ اہل حضرت، بادشاہِ درگاہِ وصلت ابوعلی الفضیل بن عیاض رضی اللہ عنہ ہیں۔ آپ بھی ”صعالیک“ قوم میں سے تھے اور اکابرِ صوفیا سے گزرے ہیں۔ آپ ”کو اعمال و عبادات سے خاص حصہ عطا ہوا تھا اور ارباب طریقت میں ایک مشہور صوفی مانے گئے۔

آپ کی بھی ابتدائی کیفیت عیاری و راہزنی میں رہی۔ مرو سے باور کے مابین ان کا محاذِ ترقاقی تھا، لیکن طبیعت کی خوبی اس وقت بھی اتنی تھی کہ آپ کو جوانمرد اور رحمِ دل، صلح پسند و بلند ہمت کہا جاتا تھا۔ حتیٰ کہ جس قافلہ میں نسوانی طبقہ ہوتا اسے لوٹا بُرا جانتے تھے، اس کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہ فرماتے اور جس کے پاس کالائے سفر یا سرمایہ زادِ راہ کم ہوتا اس سے کچھ نہ لیتے بلکہ متمول کو اگر لوٹتے تو اتنا مال ضرور چھوڑ دیتے جس سے وہ اپنا سفر پورا کر سکے۔

آخر کار ایک سوداگر مرو سے روانہ ہوا۔ لوگوں نے اسے کہا کہ راستہ میں فضیل راہزن

☆ دو گونہ رنج و عذابست جان مجنون را بلا فرقت لیلے و صحبت لیلے

ہے۔ اس کے لیے کچھ بدرقہ لے جاؤ (یعنی اس کے مقابلہ کا انتظام کر کے جاؤ)۔ سوداگر نے کہا میں نے اس کی راہزنی کے ساتھ یہ بھی سنا ہے کہ وہ خدا ترس آدمی ہے، اس لیے کسی خاص انتظام کی حاجت نہیں، صرف ایک قاری صاحب کو کچھ روزینہ مقرر کر کے ساتھ لے لیا ہے اور اونٹ پر بٹھا کر کہہ دیا ہے کہ آپ راستہ بھر تلاوت قرآن مجید شب و روز فرمائیں۔ غرضیکہ قافلہ اس جنگل میں آگیا جہاں فضیل کی کمیں گاہ تھی۔

قافلہ دیکھتے ہی فضیل گھات میں لگے اور قافلہ کے قریب پہنچے۔ اتفاقاً اس وقت قاری کی زبان پر یہ آیت کریمہ آگئی:

﴿الْمَرِيانَ لِلَّذِينَ آمَنُوا أَنْ تَخْشَعَ قُلُوبُهُمْ لِذِكْرِ اللَّهِ﴾ (۱)

”کیا ایمان والوں کے لیے وہ وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کے ذکر اور یاد سے خشوع و خضوع حاصل کریں۔“

اس آیت کے سنتے ہی فضیل رضی اللہ عنہ کے دل میں رقت محسوس ہوئی اور آفتاب ہدایت و رحمت ان کی پیشانی پر تاباں ہوا۔ انہوں نے راہزنی کے ایام میں جن جن پر غارت کی تھی سب کی فہرست بنا رکھی تھی۔ اسی وقت توبہ کی اور جن جن کا مال لوٹا تھا انہیں راضی کر کے معافی لی اور مرو سے روانہ ہو کر بیت اللہ شریف کے مجاور بن گئے۔ یہاں بڑے بڑے بزرگان دین اور عرفاء کا ملین کے فیض صحبت سے مستفید ہوئے۔ پھر کوفہ میں آ کر حضرت امام ہمام ابو حنیفہ النعمان رضی اللہ عنہ کی صحبت سے ایک مدت تک متمتع رہے۔ آپ ہی سے فن حدیث میں بڑی بڑی بلند روایات منقول ہیں اور فن تصوف و معرفت میں بہت سے بلند کلام مشہور ہیں۔ آپ ہی سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا:

مَنْ عَرَفَ اللَّهَ حَقَّ مَعْرِفَتِهِ عَبْدَهُ بِكُلِّ طَاقَتِهِ

”جو اللہ تعالیٰ کا عرفان کامل کر لے وہ ضرور اپنی تمام ہمت و قوت اس کی

پرستش میں صرف کرے گا۔“

اس لیے کہ جو بھی عارف الہی ہو جائے گا، وہ یقیناً اس کے انعام و احسان کو جان لے گا اور اس کی رافت و رحمت سے واقف ہوگا، پھر جب اسے جان لے گا اس کا یقیناً دوست بن جائے گا اور جب دوست بنے گا تو دوست کی پیروی بحد استطاعت لازمی کرے گا اس لیے کہ حکم محبوب محبت پر دشوار و بار نہیں ہوا کرتا۔

تو جس کی دوستی جس سے زیادہ ہوگی، حرصِ اطاعت بھی اس میں بڑھ جائے گی اور از دیاد محبت حقائق معرفت میں سے ہے۔ جیسا کہ اُم المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا واقعہ ہے۔ آپ فرماتی ہیں کہ ایک شب حضور ﷺ میرے پاس سے اٹھے اور میری نظروں سے اوجھل ہوئے۔ مجھے وہم ہوا کہ شاید حضور ازواج کے کسی کمرہ میں تشریف لے گئے ہیں۔ میں حضور ﷺ کے پیچھے پیچھے چلی، مسجد میں آئی تو میں نے حضور ﷺ کو نماز میں قیام فرما دیکھا اور اشکباری میں تمام شب گزر گئی۔ صبح کو بلال آئے، فجر کی اذان دی مگر حضور ﷺ بدستور نماز میں اشکباری کے ساتھ مشغول تھے۔

جب جماعت سے فارغ ہو گئے تو حضور ﷺ حجرہ میں تشریف لائے۔ میں نے دیکھا کہ پائے اقدس اس قدر متورم ہیں کہ انگلیوں سے شقاق ہو کر زرد پانی جاری ہے۔ میں رونے لگی اور عرض کی حضور ﷺ اللہ تعالیٰ نے آپ کے سبب خواص کے اول آخر تمام گناہ عفو فرما دیئے، پھر اس قدر غم کیسا! چھوڑیئے، یہ کام وہ کرے گا جسے اپنی عاقبت کے امن کا خطرہ ہے۔

حضور ﷺ نے فرمایا: اے عائشہ! یہ میرے رب کا فضل ہے کہ اس نے مجھے یہ منصب جلیل عطا فرمایا:

أَفَلَا أَكُونُ عَبْدًا شَكُورًا (۱)

”تو کیا مجھے اس کی بارگاہ میں شکر گزار بندہ نہ ہونا چاہیے۔“

جبکہ اس نے مجھ پر کرم فرمایا مژدہ بخشش سنایا تو کیا تم یہ چاہتی ہو کہ میں عبادت و شکر بھی نہ کروں اور اپنی استطاعت و قوت کے موافق استقبالِ نعمت بھی نہ کروں۔

۱۔ اسے امام ترمذی نے ”الشمائل المحمدیہ“ میں حضرت مغیرہ بن شعبہ سے روایت کیا ہے، راوی کہتے ہیں:

قام رسول اللہ ﷺ حتى انتفخت قد ماہ فقیل له : اتكلف هذا وقد غفر الله لك ما تقدم من ذنبك وما تاخر، قال : افلا اكون عبدا شكورا۔ اسے امام مسلم نے اپنی ”صحیح“ کی کتاب المنافقین ۱۴۱/۸ (حدیث نمبر ۲۸۱۹) میں اور امام بخاری نے اپنی صحیح ۱۴۹/۱ کی کتاب ”التہجد و التفسیر“ میں روایت کیا ہے اور امام عسقلانی نے اسے ”فتح الباری“ میں عطا، عن عائشہ رضی اللہ عنہا کے طریق سے روایت کیا ہے، ابوالشیخ ابن حبان نے اسے کتاب اخلاق رسول اللہ ﷺ میں ذکر کیا ہے اور انہی کے طریق سے ابن جوزی نے الوفاء باحوال المصطفیٰ ﷺ میں ذکر کیا ہے۔ اس روایت کی سند میں ابو جناب نامی ایک راوی ہے جسے جمہور محدثین نے ضعیف قرار دیا ہے اور اسی کو ابن حبان نے اپنی ”صحیح“ میں عبدالمالک کی سند سے روایت کیا ہے اور اسی طرح امام عراقی نے ”تخریج احیاء علوم الدین“ میں کہا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ حضور سرور عالم ﷺ نے لیلۃ المعراج میں پچاس نمازیں قبول فرمائیں اور وہ حضور ﷺ کو قطعاً گراں نہ گزریں۔ حتیٰ کہ جناب موسیٰ علیہ السلام کے عرض کرنے سے حضور ﷺ محض اُمت کی خاطر واپس تشریف لے گئے اور پچاس کی، پانچ نمازیں کرا لائے۔ اس لیے کہ اس ہستی مقدس کی طبع مقدسہ فرمان محبوب کے ساتھ کسی مخالفت کی روادار نہ تھی:

لَاِنَّ الْمُحِبَّةَ هِيَ الْمُوَافِقَةُ.

”اس لیے کہ محبت نام ہی موافقت محبوب کا ہے۔“

حضرت فضیل بن عیاض رضی اللہ عنہ سے یہ بھی روایت ہے کہ آپ نے فرمایا:

الدُّنْيَا دَارُ الْمَرَضِيِّ وَالنَّاسُ فِيهَا كَالْمَجَانِينِ وَاللِّمَجَانِينَ فِي دَارِ الْمَرَضِيِّ الْغُلُّ وَالْقَيْدُ.

”دنیا بیمار خانہ ہے اور لوگ اس میں پاگلوں کی طرح آباد ہیں اور ظاہر ہے کہ پاگلوں کے لیے زنجیر و قید ہوتی ہیں تو ہماری خواہشات نفسانیہ ہمارے لیے

بیڑیاں ہیں اور ہماری معصیت شعاریاں ہماری قید۔“

حضرت فضل بن ربیع رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں ہارون رشید کے ہمراہ مکہ معظمہ میں

تھا۔ جب حج کیا تو مجھے کہنے لگے اس جگہ مردانِ خدا میں سے کوئی خدا کا بندہ ہو تو اس کی زیارت

کریں۔ میں نے عرض کی ہاں! حضرت عبدالرزاق صنعانی رحمۃ اللہ علیہ اس جگہ ہیں۔ ہارون رشید

نے کہا چلو مجھے ان کی خدمت میں لے چلو۔ ہم ان کے پاس پہنچے اور تھوڑی دیر باتیں ہوتی رہیں۔

جب رخصت ہونے لگے تو ہارون رشید نے میرے ذریعہ دریافت کرایا کہ اگر آپ پر کچھ قرض ہے

تو فرمائیں تاکہ ادا کر دیا جائے۔ آپ نے فرمایا ہاں کچھ مقروض ہوں۔ مختصر یہ کہ بحکم ہارون رشید وہ

قرض ادا کر دیا گیا۔ جب باہر آگئے تو ہارون نے مجھ سے کہا: فضل! ابھی میرا دل کسی، ان سے زیادہ

رفع الشان مقرب بازگاہ کی زیارت کا متقاضی ہے۔ میں نے کہا حضرت سفیان بن عیینہ بھی یہاں

ہیں۔ ہارون نے کہا چلو۔ چنانچہ وہاں پہنچے۔ تھوڑی دیر فیض صحبت سے مستفید ہو کر رخصت ہونے

لگے اور حسب سابق میرے ذریعہ یہاں بھی سوال قرضداری کا کیا گیا۔ آپ نے بھی اپنا مقروض

ہونا ظاہر کیا اور بموجب حکم شاہی وہ ادا کر دیا گیا۔ باہر آ کر ہارون مجھ سے کہنے لگے فضل ابھی

میرے دل کا مقصد حل نہیں ہوا کہ اچانک مجھے یاد آ گیا کہ فضیل بن عیاض رضی اللہ عنہ بھی یہاں

ہی ہیں۔ میں ہارون کو ان کی خدمت میں لے گیا۔ آپ بالا خانہ کے جھروکہ میں تلاوت قرآن فرما

رہے تھے۔ ہم نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ آپ نے اندر سے دریافت فرمایا کون ہے؟ میں نے کہا امیر المؤمنین ہیں۔ فضیل رحمۃ اللہ علیہ نے جواب سن کر فرمایا مجھ سے اور امیر المؤمنین سے کیا تعلق۔ میں نے کہا سبحان اللہ! حضور ﷺ کی حدیث ہے جس میں ارشاد ہے:

لَيْسَ لِلْعَبْدِ أَنْ يُدِلَّ نَفْسَهُ فِي طَاعَةِ اللَّهِ.
 ”بندہ کو یہ زیبا نہیں کہ اطاعتِ الہی میں اپنے کو ذلیل کرے۔“

آپ نے فرمایا:

بَلَى، أَمَا الرِّضَاءُ فَعِزُّدَايَمٍ عِنْدَ اللَّهِ.

”ٹھیک ہے مگر رضاءِ مولا میں رہنا دوامی عزت ہے۔“

اس رضا کے اہل کے نزدیک تو میری ذلت دیکھ رہا ہے، اور میں رب جل و تعالیٰ کے حکم کے آگے راضی ہو کر ہمیشہ کی عزت پاتا ہوں۔ پھر آپ نیچے تشریف لائے اور دروازہ کھول کر چراغ گل فرما دیا اور ایک گوشہ میں حجرہ کے اندر تشریف فرما ہو گئے۔ ہارون اندھیرے میں آپ کو ڈھونڈنے لگے۔ آخر حضرت فضیلؒ پر ہارون کا ہاتھ جا پڑا۔ حضرت فضیلؒ نے فرمایا وہ ہاتھ جس سے زیادہ نرم میں نے نہیں دیکھا اگر عذابِ الہی سے نجات یافتہ ہے تو بہت ہی اچھا ہے۔ ہارون رشید سن کر رو پڑے اور اتنے روئے کہ بیہوش ہو گئے۔ جب ہوش آیا عرض کی: حضور! مجھے کچھ نصیحت فرمائیں۔ آپ نے فرمایا: اے امیر المؤمنین تمہارے باپ حضور ﷺ کے چچا تھے۔ انہوں نے حضور ﷺ سے درخواست کی تھی کہ مجھے کسی ایک قوم کا امیر بنا دیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا چچا! میں نے آپ کے ایک ایک سانس کو آپ کی دنیائے جسم کا امیر بنایا۔ یعنی آپ کا ایک ایک سانس جو اطاعتِ الہی میں گزرے وہ مخلوقات کی اطاعت سے تمہارے لیے بہتر ہے۔ لَآئِ الْأَمَارَةِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ النَّدَامَةُ۔ ”اس لیے کہ امارت سے قیامت کے روز بجز ندامت کچھ حاصل نہیں۔“

ہارون عرض کرنے لگے، حضور! کچھ اور بھی فرمائیں۔ حضرت فضیلؒ نے فرمایا: جب عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ کو مسندِ خلافت پر متمکن کیا تو آپ نے حضرت سالم بن عبداللہ اور رجا بن حیوٰۃ اور محمد بن کعب القرظی رضوان اللہ علیہم اجمعین کو بلا کر عرض کی کہ میں اس بلا میں مبتلا ہو گیا ہوں، اب بتائیے ان بلاؤں کا علاج میرے لیے کیا ہے، میں درحقیقت اس منصب کو بلا سمجھتا ہوں اگرچہ عوام اسے نعمت جانیں۔ ان حضرات میں ایک صاحب فرمانے لگے کہ امیر المؤمنین اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ کل روز قیامت عذاب سے مامون رہیں تو ہماری اس نصیحت پر عمل پیرا ہو جائیں:

(۱) معمر مسلمانوں کو باپ کی طرح بانگاہ عزت دیکھو۔

(۲) جوان مسلمان کو مثل بھائی کے برتو۔

(۳) مسلمانوں کے بچوں کو بیٹوں کی طرح سمجھو۔

پھر انہیں باپ، بھائی، بیٹوں کی طرح سمجھنا ہی کافی نہیں بلکہ ان کے ساتھ معاملہ بھی باپ، بیٹوں، بھائیوں کا سا رہے۔ پھر یقیناً دیارِ اسلامیہ گھر کی طرح ہوں گے اور اہل و عیال کا سا برتاؤ تیرے ساتھ رہے گا۔ اور بموجب حکم حدیث نبی کریم ﷺ آپ کی حکومت قائم ہوگی جیسا کہ ارشاد ہے:

زُرُّ اَبَاكَ وَ اَكْرِمُ اَخَاكَ وَ اَحْسِنُ عَلٰی وَ لَدِكَ.

”اپنے باپ کی زیارت کر اور بھائی کے ساتھ احترام سے پیش آ اور اولاد کے

ساتھ نیک برتاؤ کر۔“

پھر حضرت فضیل بن عیاض رضی اللہ عنہ نے ہارون کو فرمایا، امیر المؤمنین! مجھے خوف ہے کہ یہ آپ کا حسین رُخ زیبا کہیں دوزخ کی آگ میں نہ جھلسے۔ لہذا آپ سب سے زیادہ خوفِ الہی رکھیں اور اس کے احکام کے حقوق اس وقت سے زیادہ بہترین صورت میں ادا کریں۔ اس کے بعد امیر المؤمنین ہارون رشید نے عرض کی: حضرت! آپ پر کچھ قرضہ تو نہیں۔ حضرت فضیل نے فرمایا ہاں قرضہ ہے مگر وہ تیرے ادا کرنے کا نہیں، مجھ پر اللہ تعالیٰ کے احکام اور اس کی پیروی کا قرضہ ہے، اگر اس قرضہ میں وہ مجھے پکڑ لے تو مجھے افسوس ہی افسوس ہے، ہارون رشید عرض کرنے لگے حضرت! میں تو لوگوں کے قرض کے متعلق استفسار کر رہا ہوں۔ آپ نے فرمایا اللہ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ اس کی طرف سے مجھے بے حد نعمتیں مل رہی ہیں، مجھے ہرگز اپنے رزاق حقیقی کا شکوہ نہیں جو میں بندوں سے کرتا رہوں۔

ہارون رشید نے ہزار دینار پیشکش کیے اور عرض کی یہ قبول فرمائیں اور اپنی ضرورتوں میں صرف کریں۔ حضرت فضیل فرمانے لگے: امیر المؤمنین! میری کوئی نصیحت تم پر کارگر نہ ہوئی اور ابھی سے ظلم و جور اور رباگری شروع کر دی۔ ہارون کہنے لگے: حضور! میں نے کیا ظلم کیا۔ فرمایا میں نے تجھے نجات کی طرف بلانا چاہا، تو تو نے مجھے بلا میں پھانسنے کا ارادہ کیا، یہ ظلم نہیں تو کیا ہے۔

مختصر یہ کہ ہارون اور فضل رحمہما اللہ دونوں روتے ہوئے رخصت ہوئے، حضرت فضل بن ربیع فرماتے ہیں کہ باہر آ کر ہارون نے مجھے کہا اے فضل! فرشتہ خصلت صوفی اگر ہے تو یہ ہے۔ یہ شانِ بے نیازی اور یہ رعب و داب کی ادائیں اس کے کمال ولایت کی دلیل ہیں، ان کی نظر میں دنیا اور اہل دنیا ہی جو حقارت ہے اس کی نظیر وہی حضرت فضیل ہیں اور زینتِ دنیا سے منافرت اور

اہل دنیا کی تواضع سے بے پرواہی جو میں نے ان میں پائی اس کی مثال بھی یہی خود ہیں۔
 علاوہ ازیں حضرت فضیل بن عیاض رحمۃ اللہ علیہ کے بہت سے مناقب و پاک حالات
 ہیں، مگر یہاں مختصراً اس پر اکتفا کیا گیا۔

حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ:

انہیں میں سے سفیہ التحقیق و کرامت، شمشیر شرف و ولایت ابوالفیض حضرت ذوالنون
 بن ابراہیم مصری رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ آپ نہایت خوش خلق تھے، آپ کو ”ثوبان“ کے نام سے پکارا
 جاتا تھا۔ خاندانی حیثیت سے عالی اور اہل طریقت میں عارف اور صوفی کامل مانے گئے ہیں۔ آپ
 طریقہ ملامتیہ پر تھے۔ اسی وجہ سے اہل مصر کی نظروں سے آپ کے مناصب عالی مخفی رہے۔

کوئی آپ کو بری نظر سے دیکھتا، کوئی معمولی آدمی سمجھتا۔ غرضیکہ جب تک آپ مصر
 میں رہے کسی نے آپ کے حال باطن اور جمال ایمانی کو نہ پہنچانا۔ جب آپ کی رحلت ہوئی اور
 جس رات دنیا سے کوچ فرمایا تو شہر کے ستر آدمیوں نے حضور ﷺ کی خواب میں زیارت کی اور
 یہ فرماتے سنا کہ: ”اللہ کا دوست ذوالنون مصری آرہا ہے، ہم اس کے استقبال کو آئے ہیں۔“

جب وفات ہوگئی تو آپ کی پیشانی پر بخط جلی لکھا ہوا پایا۔

”هَذَا حَبِيبُ اللَّهِ مَاكَ فِي حُبِّ اللَّهِ قَتِيلُ اللَّهِ.“

”یہ خدا کا محبوب ہے۔ اللہ کی محبت میں وفات پائی، یہ قتل اللہ ہے۔“

جب آپ کا جنازہ اٹھایا گیا تو مرغان ہوائی آپ کے جنازہ پر اس طرح چھا گئے کہ پر
 سے پر ملا کر مثل ابر، سایہ کنان تھے۔ اہالیان مصر نے جب آپ کا یہ درجہ رفیع دیکھا تو چپھتائے
 اور جو لوگ آپ کو بری نظر سے دیکھتے تھے تائب ہوئے۔

آپ کی تعلیمات اور حقائق علوم میں کافی نہایت نفیس بیانات موجود ہیں۔ چنانچہ

فرماتے ہیں:

الْعَارِفُ كُلُّ يَوْمٍ أَحْشَعُ لِأَنَّهُ فِي كُلِّ سَاعَةٍ مِنَ الرَّبِّ أَقْرَبُ.

”ہر روز عارف کامل خاشع و ترساں رہتا ہے اس لیے کہ اس کی ہر ساعت

تقرب مرتبہ قرب میں قریب تر ہوتی ہے۔“

اور ظاہر ہے کہ جو شخص بارگاہ میں قریب تر ہوتا جائے گا لامحالہ شیون جبروتی کا تحیر بردھتا

رہے گا اور جتنا تحیر ترقی افزاء ہوگا، خشوع و خضوع ترقی کرے گا اور جلال حق اس پر اور اس کے دل
 پر مستولی ہوتا جائے گا۔

تو پھر وہ اپنے کو اتنا اجنبی اور بعید دیکھتا ہے کہ آرزوئے وصل بھی فنا ہو جاتی ہے اور خشوع پر خشوع زیادہ ہونے لگ جاتا ہے۔ چنانچہ موسیٰ علی نبینا وعلیہ السلام نے بحالت مکالمہ جناب باری سے عرض کیا:

أَيْنَ أَطْلُبُكَ قَالَ عِنْدَ الْمُنْكَسِرَةِ قُلُوبُهُمْ.

”الہی! میں تجھے کہاں تلاش کروں، فرمان الہی ہوا ٹوٹے دلوں میں“۔ اور ان

میں جو قیدِ عشق سے اپنے کو مایوس کر چکے ہیں۔[☆]

موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی: الہی! مجھے میرے دل سے زیادہ کوئی نا امید تر اور شکستہ نظر

نہیں آتا۔ تو ارشاد باری ہوا کہ موسیٰ! پھر وہیں ہوں جہاں تو ہے۔ خلاصہ یہ نکلا کہ جس میں ترس و خشوع نہیں اس کا دعویٰ عرفان جہالتِ خالص ہے اسے عارف نہیں کہہ سکتے۔

اس لیے کہ حقیقتِ معرفت کے لیے علاماتِ صدقِ ارادتِ لازمی ہے اور ارادتِ صادق

بندۂ کامل۔ کہ اسباب و انساب کو قطع کرنے کی طرف آمادہ کرتی ہے۔ اسے سوائے اپنے رب جل

مجہدہ کے کسی سے تعلق و نسبت نہیں رہتی۔ جیسا کہ ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

الصِّدْقُ سَيْفُ اللَّهِ فِي أَرْضِهِ مَا وَضِعَ عَلَى شَيْءٍ إِلَّا قَطَعَهُ.

”راستی ایسی شمشیر الہی ہے کہ روئے زمین پر کوئی چیز اس کے سامنے نہیں ہوتی

مگر اسے کاٹ دیتی ہے“

اور صدقِ رویتِ مسبب کی طرف ہے نہ کہ اسبابِ سبب کی طرف اور جب سبب ثابت

ہو گیا، حکمِ صدقِ ساقط ہو گیا۔ ایک حکایت میں ہے کہ حضرت ذوالنون رحمۃ اللہ علیہ اپنے یارانِ

طریقت کے ساتھ کشتی میں تشریف فرما تھے اور رود نیل کی سیر میں مشغول تھے جیسا کہ اہل مصر کی

عادت ہے، کہ اچانک ایک اور کشتی آئی جس میں ایک جماعت اہل طرب و نشاط کی بیٹھی تھی اور

باہمی جھگڑے فساد کی باتیں کرتے جا رہے تھے۔ حضرت ذوالنون رحمۃ اللہ علیہ کے ہم نشین

شاگردوں کو ان سے سخت نفرت پیدا ہوئی۔ حتیٰ کہ آپ کی خدمت میں عرض گزار ہوئے کہ حضور!

ان کے لیے بددعا فرمائیں کہ یہ سب غرقِ دریا ہو جائیں تاکہ مخلوق سے ان کی شومی و بدچلنی منقطع

ہو جائے۔ حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ کھڑے ہوئے اور دستِ دعا دراز فرما کر عرض کی،

الہی! جس طرح اس گروہ کو دنیا کے عیشِ عطا فرمائے ہیں اسی طرح انہیں اس جہاں کا عیش بھی عطا

فرمادے۔ یہ سن کر مریدانِ خاص متعجب ہوئے، جب ان اوباشوں کی کشتی آپ کے قریب آئی اور ان

☆ بقول شاعر: مکتب عشق کا دستور نرالا دیکھا اس کو چھٹی نہ ملی جس نے سبق ماد کیا

کی نگاہیں حضرت ذوالنون رحمۃ اللہ علیہ پر پڑیں، یک لخت سب رونے لگے اور اپنے عود اور تمام ساز توڑ کر توبہ کرتے ہوئے رجوع الی اللہ میں متوجہ ہو گئے۔

آپ نے اپنے خواص کو فرمایا تم دیکھ رہے ہو اس جہان کا عیش، اس جہان کے عیش سے توبہ کرنے میں تھا، دیکھا! دونوں کی مراد حاصل ہو گئی اور اس طرح مراد ملی کہ کسی کو رنج نہ ہوا۔ یہ فرمان مسلمانوں پر اس مرد خدا کی شفقت خاص کے ماتحت تھا اور اس میں حضور سید یوم النور ﷺ کی اقتداء بھی تھی کہ کفار نے جس قدر ظلم و تعدی میں زیادتی کی، حضور ﷺ کی شانِ رحمت اتنی ہی بڑھتی گئی اور ان کے مظالم سے شانِ رحمت میں تغیر نہ آیا بلکہ فرمایا:

اللَّهُمَّ اهْدِ قَوْمِي فَإِنَّهُمْ لَا يَعْلَمُونَ. (۱)

”الہی! اس قوم کو راہِ ہدایت دکھا دے، یہ نادان ہیں۔“

حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے آپ فرماتے ہیں کہ میں بیت المقدس سے مصر آ رہا تھا۔ راستہ میں ایک شخص کو دیکھا کہ دُور سے آ رہا ہے، میں نے دل میں سوچا کہ اس سے کچھ باتیں کی جائیں۔ چنانچہ جب وہ قریب آیا تو میں نے دیکھا وہ مرد نہیں ہے بلکہ ایک بڑھیا معمر ہے، ہاتھ میں لکڑی ہے اور پشمینہ کا جبہ زیب تن ہے۔ میں نے کہا مینِ اُین؟ ”آپ کہاں سے تشریف لارہی ہیں؟“ قَالَتْ مِنَ اللَّهِ ”فرمایا اللہ کی طرف سے“ قُلْتُ: اِلَى اُين؟ ”میں نے کہا کدھر تشریف لائے جارہی ہیں؟“ قَالَتْ اِلَى اللَّهِ ”فرمایا اللہ کی طرف“۔ میرے پاس کچھ دینار تھے۔ میں نے نکال کر پیش کرنے چاہے کہ اشارے سے مجھے روک دیا اور فرمایا کہ ”ذوالنون! تیرا وہم جو میری طرف سے تیرے دل میں پیدا ہوا یہ تیری عقل کے ضعف کی بنا پر ہے، میں جو کام کرتی ہوں اللہ کے لیے کرتی ہوں اور سوائے اپنے رب کے کسی سے کچھ نہیں لیتی، اس لیے کہ میں سوائے اس کے کسی کی پرستار نہیں، تو جس کی پرستار ہوں اسی سے جو لینا ہو وہ لیتی ہوں“۔ یہ فرمایا اور مجھ سے علیحدہ ہو کر چل دیں۔ اسی واقعہ میں ایک عجیب و غریب رمز لطیف ہے کہ

۱۔ اسے امام مسلم نے اپنی ”صحیح“ ۲۴/۸ کی ”کتاب البر والصلۃ والآداب“ میں، امام بخاری نے ”الادب المفرد“ (ص: ۱۱۹) میں، قاضی عیاض نے ”الشفاء“ ۱۳۷/۱ میں، ابن سید الناس نے ”عیون الاثر“ ۴۱/۲ میں، ابن جوزی نے ”الوفاء“ ۴۳۹/۲ میں، امام غزالی نے ”احیاء علوم الدین“ ۳۱۳/۲ میں اور امام زرقانی نے ”شرح المواہب اللدنیہ“ ۲۵۱/۳ میں ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے:

انی لم ابعث لعانا ولكن بعثت داعيا ورحمة، اللهم اغفر لقومي أو اهد

قومي، فانهم لا يعلمون.

اس لیے کہ لوگوں کے عمل دو صورت پر ہوتے ہیں: ایک تو وہ جو اپنا ہر کام صرف اللہ کے لیے کرتے ہیں اور جانتے ہیں کہ ہم نے یہ کام خالص اللہ کے لیے کیا ہے، لیکن باوجود اس کے کہ وہ خالصتاً لوجہ اللہ کرتے ہیں مگر پھر بھی وہ اپنے لیے کرتے ہیں اگرچہ ان کی ہوائے نفسانی اور خواہش ان سے منقطع ہوتی ہے مگر آخر وہ جو عمل کر رہے ہیں اس میں حرصِ ثوابِ آخرت اور جزائے جنت کا لالچ ضرور ہوتا ہے۔ دوسرے وہ ہیں کہ عمل کرتے ہیں مگر ثواب و عتابِ آخرت اور ریاءِ سمع دنیا دونوں سے علیحدہ ہو کر محض تعمیلِ حکمِ محبوب کے لیے کرتے ہیں اور حقیقتاً محبتِ حق تعالیٰ اس کی متقاضی ہے کہ اپنے حقوق سے بھی علیحدہ ہو کر فرمانِ محبوب کی تعمیلِ حکم اور تعظیم میں جھک جائے۔

پہلی جماعت کے خیال میں یہ بات سمائی ہوئی ہے کہ جو کچھ آخرت کے لیے کیا جائے وہ خالص اللہ کے لیے ہے اور انہوں نے یہی سمجھ رکھا ہے کہ اطاعت کرنے سے مطیع کو جو بے حد و کراں حصہ ملے گا وہ دنیا کی اس مصیبت سے بہتر ہے جس میں اس دنیا کے اندر راحت اور تھوڑی دیر لطف حاصل ہوتا ہے۔ اس لیے اطاعتِ الہی کے بدلہ جو راحتِ ابدی ملے گی وہ ہمیشہ کے لیے ہو گی اور ظاہر ہے اللہ تعالیٰ کو ہمارے اعمال و عبادات و ریاضات و مجاہدات سے کیا فائدہ ہے اور اعمالِ صالحہ ترک کرنے سے کیا نقصان!! اگر تمام عالم صدقِ ابو بکر رضی اللہ عنہ حاصل کرے تو اس کا فائدہ اسی کے لیے ہے اور کذبِ فرعونِ اختیار کرے تو اس کی ذاتِ ستودہ صفات کا کیا نقصان!! سوا اس کے کہ اپنی جان پر ظلم ہوگا۔ جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد ہے:

﴿إِنْ أَحْسَنْتُمْ أَحْسَنْتُمْ لِأَنْفُسِكُمْ وَإِنْ أَسَأْتُمْ فَلَهَا﴾ (۱)

”اگر تم اچھے عمل کرو گے تو اپنی جانوں کے ساتھ بھلائی کرو گے اور اگر برے

عمل کرو گے تو وہ بھی تمہاری جانوں پر ہیں۔“

اور یہ بھی فرمایا:

﴿وَمَنْ جَاهَدَ فَإِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهِ إِنَّ اللَّهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ﴾ (۲)

”جس نے کوشش کی تو یقیناً اس نے اپنے لیے کوشش کی بیشک اللہ تمام عالم

سے بے نیاز ہے۔“

لوگ ملکِ ابدی اپنے لیے چاہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں وہ خالص اللہ کے لیے کر رہے ہیں۔ یاد رکھو! محبتِ الہی میں طریقِ محبت اختیار کرنا، یہ بالکل علیحدہ چیز ہے۔ دوست و دوست کے حکم کی تعمیل اس غرض سے نہیں کیا کرتا کہ اس کا معاوضہ ملنے کی امید رکھے بلکہ اس

کا مقصد اس تعمیل میں صرف اور صرف دوست کے حکم کی ادائیگی اور اس کی خوشنودگی مرکوز ہوتی ہے۔ اس کی نظر کسی اور چیز پر نہیں جاتی۔ یہاں صرف اتنا ہی کافی ہے، خدا نے چاہا تو اس کی تفصیل بابِ اخلاص میں بیان ہوگی۔

حضرت ابراہیم ادہم رحمۃ اللہ علیہ:

انہیں میں سے امیر امراء، سالک طریق لقاء ابو سلق حضرت ابراہیم بن ادہم بن منصور رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں۔ اپنے زمانہ کے یگانہ عارف طریقت اور سید اقران گزرے ہیں۔ آپ کی بیعت حضرت خضر علی نبینا وعلیہ السلام سے تھی۔ آپ نے بہت سے قدماء مشائخ کو دیکھا اور حضرت امام ہمام حضرت امام اعظم ابو حنیفہ النعمان رضی اللہ عنہ کے ساتھ رہ کر تحصیل علم فرمایا۔ ابتدائی دور میں آپ امیر بلخ تھے۔ ایک دن آپ شکار کو گئے اور اتفاقاً لشکر سے پکھڑ گئے اور ایک ہرن کے پیچھے لگ گئے۔

اللہ تعالیٰ نے اس ہرن کو قوتِ ناطقہ عطا فرمائی اس نے بزبان فصیح حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ کو مخاطب کر کے کہا:

أَلِهَذَا خُلِقْتُ أَوْ بِهَذَا أُمِرْتُ؟

”کیا اسی لیے تم پیدا کیے گئے تھے یا اسی کام کا تمہیں حکم ملا ہے۔“

یہ سنتے ہی آپ کے دل میں خیال آیا اور توبہ فرما کر سب سے ہاتھ اٹھا لیا اور زہد و ورع کے پابند ہو گئے۔ پھر حضرت فضیل ابن عیاض رضی اللہ عنہ اور حضرت سفیان ثوری رضی اللہ عنہ سے ملے۔ ان کی صحبت میں رہ کر مستفید ہوئے اور توبہ کے بعد آپ نے اپنی محنت کی آمدنی کے سوا بیت المال وغیرہ کسی ذریعہ کو ذریعہ معاش نہ بنایا۔ آپ کی عملی شان اظہر من الشمس ہے اور آپ کی کرامات بے حد مشہور ہیں۔ فن تصوف میں آپ کے بڑے بڑے لطیف و بدیع اقوال نفیسہ منقول ہیں۔ چنانچہ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ آپ کی توصیف میں فرماتے ہیں:

مَفَاتِيحُ الْعُلُومِ اِبْرَاهِيمُ .

”کنجیاں جمیع علوم ابراہیم بن ادہم ہیں۔“

آپ سے مروی ہے کہ فرمایا:

”اِتَّخِذِ اللّٰهَ صَاحِبًا وَ ذَرِ النَّاسَ جَانِبًا .

”اللہ جل علا شانہ کو اپنا یار پکڑ اور لوگوں کو ایک طرف چھوڑ۔“

اس سے آپ کی مراد یہ ہے کہ جب بندہ کا رجوع بحق تعالیٰ درست ہو تو وہ محبتِ الہی

میں مخلص بنتا ہے اور مخلصانہ رجوع الی اللہ اس امر کا متقاضی ہے کہ ماسوائے اللہ سے اعراض و انحراف کر لے اس لیے کہ صحبتِ خلق کو معاملہ الہی سے کوئی سروکار نہیں اور صحبتِ الہی اگر صحیح طور پر قبول کر لی جائے تو پھر مخلص بحق تعالیٰ ایسا ہو جاتا ہے کہ فرمانِ الہیہ کے پورے کرنے اور اطاعتِ الہی میں ٹکنا رہنے میں اخلاص کے سوا اور کچھ نہیں رہا اور ظاہر ہے کہ خلوص عینِ محبت ہے اور خلوصِ محبت بحق جب ہی پیدا ہو سکتا ہے جب نفسِ امارہ سے دشمنی ہو جائے، تو نفسِ امارہ کے دشمن سے حرص و ہویٰ کی تمام بھیڑ بھاڑ دور ہو جاتی ہے اس لیے کہ جو ہوا و حرص کا آشنا و پابند ہے وہ یقیناً خدا سے جدا ہے اور جو شاخِ ہویٰ کو کاٹ چکا، وہ اپنے رب کی خلوةِ خاص میں آرمیدہ ہو گیا۔

تو درحقیقت وجودِ انسان ہی اپنے حق میں دنیا ہے۔ جب انسان اپنے وجود سے اعراض کرے تو گویا اس نے مخلوقات سے اعراض کر لیا اور جس نے اپنے وجود کی طرف توجہ کی تو گویا مخلوق کی طرف متوجہ ہوا اور یہی وہ جفا ہے جو اس نے اپنے اوپر کی اور یہ بھی مسلم امر ہے کہ تمام مخلوقات جس حال میں ہے بحکم قضا و قدر صحیح ہے مگر ہر انسان کو اپنے سے کام ہے اور ہر انسان مخلوق ہے۔

تو بناء استقامت ظاہر و باطنی، طالب کے لیے دو چیزوں پر ہے۔ ایک اس امر پر کہ اپنے کو پہچانے اور جانے یعنی علم حاصل کرے، دوسرے وہ عمل جو کر رہا ہے اسے سمجھے، اس کا تعلق رویتِ لوحِ تقدیر پر ہے۔ اس میں ترکِ فرمانِ حق کو حجت ماتحت تقدیر نہیں بنایا جاسکتا۔

اس لیے اعراضِ مخلوقات سے اس وقت تک صحیح نہیں ہوگا جب تک خود اس کی جانب سے ارادتا اعراض نہ ہو۔ تو جب خود اپنے ارادہ سے اعراضِ مخلوقات سے کر لیا تو سب کچھ مرادیں اپنے رب سے پالے گا اور جب حق تعالیٰ شانہ کی طرف رجوع ہوتا تو گویا اقامت امرِ حق کے لیے خود آیا، اب مخلوقات سے آرام حاصل کرنے کی کوئی صورت تیرے پاس نہ رہے گی تو جو چیز بھی سوائے حق جل علاہ کے کسی غیر سے چاہے گا تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ غیر اللہ سے آرام جان طلب کر رہا ہے اور بغیر رویتِ توحید ہوگا اور آرام اپنی ذات سے حاصل کرنا اثباتِ تعطل ہے۔

حضرت شیخ ابوالحسن سالبہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ مریدِ کابلی کی طرح رہنا، اس سے بہتر ہے کہ اپنے اختیارات میں رہے۔ اس لیے کہ صحبت یا غیر خدا کے لیے ہے اور صحبت با خود، حرص و ہویٰ کے پالنے کے لیے۔ اب اس بحث کو ہم اسی کتاب میں کسی اور جگہ مفصل بیان کریں گے۔

حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ کی ایک حکایات ہے جو فرماتے ہیں کہ جب میں جنگل میں گیا ایک ضعیف العمر بزرگ صورت سے ملا۔ وہ مجھ سے کہنے لگا: اے ابراہیم! تمہیں معلوم ہے یہ کون سی جگہ ہے تم بغیر زادِ راہ کے جا رہے ہو؟ میں اسے سمجھ گیا کہ یہ ضعیف العمر بزرگ نہیں

بلکہ شیطان ہے۔ میری جیب میں چار درم نقرئی پڑے تھے جو میں نے کوفہ میں زنبیل بیچ کر جیب میں ڈال لیے تھے، میں نے انھیں نکال کر پھینک دیا اور عہد کیا کہ ہر میل پر چار سو رکعت نفل پڑھوں گا۔ چار سال متواتر صحرا نوردی میں رہا۔ میرا رزاق مطلق بلا کسی تکلیف کے مجھے روزی پہنچاتا رہا۔ اسی اثناء میں حضرت خضر علیہ السلام کی زیارت ہوئی۔ ان کے فیضِ صحبت میں میں نے ان سے اللہ کا نام سیکھا۔ بس اس کے بعد سے میرا دل ماسوائے اللہ سے قطعاً فارغ ہو گیا۔ علاوہ ازیں آپ کے بہت سے مناقب ہیں۔ وَ بِاللّٰهِ التَّوْفِیْقِ

حضرت بشر حافی رحمۃ اللہ علیہ:

انہیں میں سے سریر معرفت تاج، اہل معاملت حضرت بشر بن الحارث الحافی رضی اللہ عنہ ہیں۔ مجاہدات و ریاضات میں بڑی بلند شان والے ہیں۔ اعمال و اخلاص میں حظ تام رکھتے ہیں۔ حضرت فضیل بن عیاض رحمۃ اللہ علیہ کے خاص صحبت یافتہ لوگوں میں سے تھے۔ وہ اپنے ماموں حضرت علی بن حشر رضی اللہ عنہ کے مرید تھے۔ علم اصول و فروع کے بڑے جید عالم گزرے ہیں۔ آپ کی توبہ کا ذکر یوں ہے کہ ایک روز آپ مست شباب ہوئے جارہے تھے۔ راستہ میں ایک کاغذ کا ٹکڑا ملا۔ اسے تعظیم کے ساتھ آپ نے اٹھالیا، اسے پڑھا تو لکھا ہوا تھا، ”بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ“ آپ نے اسے عطر لگا کر پاک مقام پر رکھ دیا۔

اسی رات خواب میں جمال الہی سے مشرف ہوئے اور یہ بشارت سنی:

يَا بَشْرُ طَيِّبَتِ اسْمِي فَبِعِزَّتِي لَا طَيِّبٌ اِسْمَكَ فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ.
”اے بشر! تو نے میرے نام کو خوشبو کیا، میری عزت و جلال کی قسم! میں

تیرے نام کی مہک دنیا و آخرت میں پھیلاؤں گا۔“

حتیٰ کہ کوئی تیرا نام نہ سنے گا مگر نام سن کر اسے راحت دلی ملے گی۔ آپ نے اپنی آزاد روش سے اسی وقت توبہ کر لی اور زہد و تقویٰ کا طریقہ مضبوط تھام لیا اور مشاہدہ جمالِ یار میں اتنے محو ہو گئے کہ غایتِ استغراق میں جوتی بھی نہ پہنتے، اسی وجہ میں آپ ”حافی“ کہلاتے ہیں (حافی ”ننگے پیر“ کو کہتے ہیں)۔ لوگوں نے پوچھا آپ نے جوتی پہننا کیوں ترک کر دی؟ فرمایا: زمین میرے محبوب کا بنایا ہوا فرش ہے، میں جائز نہیں سمجھتا کہ محبوب کے بچھائے ہوئے فرش سے اپنے پیروں کو علیحدہ کروں اور میرے پیر اور اس کی بساط میں کوئی واسطہ رکھوں۔

یہ بات آپ کے غرائبِ معاملات میں سے ہے کہ ان کے نظر و خیال میں پاؤں اور زمین کے مابین جوتی حجاب تھی۔ آپ سے مروی ہے کہ فرمایا:

” مَنْ أَرَادَ أَنْ يَكُونَ عَزِيزًا فِي الدُّنْيَا وَ شَرِيفًا فِي الْآخِرَةِ فَلْيَجْتَنِبْ
ثَلَاثًا لَا يَسْأَلُ أَحَدًا حَاجَتَهُ وَلَا يَذْكُرُ أَحَدًا بِسُوِّهِ وَلَا يُجِيبُ أَحَدًا
إِلَى طَعَامِهِ.“

”جو چاہے کہ دنیا میں عزت دار رہے اور آخرت میں شریف، تو اسے چاہیے
کہ تین باتوں سے بچتا رہے:

(۱) مخلوقات میں سے کسی سے اپنی حاجت روائی نہ چاہے۔

(۲) کسی کا ذکر برائی کے ساتھ نہ کرے۔

(۳) اور کسی کا مہمان نہ بنے۔“

اس لیے کہ جو اپنے رب کے دروازہ کو جانتا ہے، اسے مخلوق کے سامنے حاجت لے
جانے کی کیوں حاجت ہو، اور یہ حقیقت ہے کہ وہاب مطلق کے در کو چھوڑ کر مخلوق کی طرف وہی
دستِ سوال دراز کرے گا جسے کیف عرفانِ حق حاصل نہ ہوا ہو اور جبکہ یقین قلب کے ساتھ وہ جان
چکا کہ قاضی الحاجات تمام عالم کا وہی جمیل حقیقی ہے تو جس غیر سے حاجت روائی چاہے گا وہ اپنے
جیسے سے حاجت روائی چاہنا ہوگا۔

لَاِنَّ اسْتِعَانَةَ الْمَخْلُوقِ مِنَ الْمَخْلُوقِ كَاسْتِعَانَةِ الْمَسْجُوعِ مِنَ
الْمَسْجُوعِ .

”اس لیے کہ طلبِ اعانتِ مخلوق کی مخلوق سے ایسے ہے جیسے ایک قیدی اپنے

ساتھ کے قیدی سے اعانت چاہے“ (۱)

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ:

انہیں میں سے فلکِ معرفت، فلکِ محبت ابو یزید طیفور بن علی بسطامی رضی اللہ عنہ ہیں۔

۱۔ (أَقُولُ بِإِلَهِ التَّوْفِيقِ) حضرت بشر حائے کے اس قول پر جو ذکر ہوا، عارف باللہ فانی فی اللہ حضرت خواجہ عالم
مخدوم علی بن عثمان الجلابی رحمۃ اللہ نے جو تحریر فرمایا بِاللَّهِ الْعَظِيمِ ان کے مرتبہ اور شان کے لیے یہی شایان
ہے لیکن اس سے کوئی زبانی توحید کا بیمار یہ نہ سمجھ لے کہ یہ شان ”ہر ایرا غیر انتھو خیرا“ کی ہے بلکہ یہ مرتبہ ان
پاک ہستیوں کا ہے جو مشاہدہ جمال یار میں ہر آن مستغرق رہنے والے ہیں، عوام کے لیے تو قرآن پاک:
”وَابْتَغُوا إِلَيْهِ الْوَسِيلَةَ“ فرما رہا ہے اور حضور سید یوم النشور صلی اللہ علیہ وسلم ”فَلْيُنَادِ اعِينُونِي يَا عِبَادَ
اللَّهِ“ کا حکم دے رہے ہیں، لہذا اس مضمون سے عوام غلط فہمی میں پڑ کر اپنے کو محرومِ اعانتِ خاصانِ بارگاہ نہ
بنائیں۔ اچھی طرح یاد رکھیں کہ یہ خاصانِ بارگاہِ شادورانِ دریائے محبت، غریقِ بحرِ وحدت، سرستانِ بادۂ عشق
و معرفت کے شان کی ترجمانی ہے۔ عوام کا یہ درجہ ہرگز ہرگز نہیں۔

اجل مشائخ سے گزرے ہیں ان کی کیفیت حالیہ اعلیٰ درجہ پر تھی اور ان کی شانِ تصوف بہت بلند مانی گئی ہے، حتیٰ کہ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

أَبُو يَزِيدٍ مِنَّا بِمَنْزِلَةِ جِبْرِئِيلَ مِنَ الْمَلَائِكَةِ.

”بایزید بسطامی ہم میں ایسے معظم ہیں جیسے جماعت ملائکہ میں جبریل امین۔“

آپ کے جدا مجد مجوسی تھے اور بسطام کے معززین میں سے ایک آپ کے والد بھی تھے اور آپ سے احادیث نبی کریم ﷺ میں بہت روایات ہیں اور آپ اپنے بسطام کی آبادی میں فرد الفرید گزرے ہیں اور فنِ تصوف میں آپ کو یکتا عالم مانا گیا ہے اور حقائقِ علم بیان کرنے میں آپ سے زائد دوسرا نظر نہ آیا اور آپ علم کے ساتھ محبت اور شریعتِ مطہرہ کی خاص طور پر تعظیم کرنے والے تھے اور یہ تمام صفات آپ میں حقیقتاً موجود تھیں، یہ نہیں کہ الحاد و زندق کی مدد کے لیے زہد و ورع کا محض پردہ ڈال لیا ہو، جیسا کہ اکثر ایسا کر لیتے ہیں۔

بلکہ آپ ابتداء سے مجاہدہ و عمل صالح میں رہے۔ چنانچہ آپ خود فرماتے ہیں:

عَمِلْتُ فِي الْمُجَاهَدَةِ ثَلَاثِينَ سَنَةً فَمَا وَجَدْتُ شَيْئًا أَشَدَّ عَلَيَّ مِنَ الْعِلْمِ وَمُتَابَعَتِهِ وَلَا اخْتِلَافَ الْعُلَمَاءِ لَبَقِيْتُ وَاخْتِلَافَ الْعُلَمَاءِ رَحْمَةً إِلَّا فِي تَجْرِيدِ التَّوْحِيدِ.

”تیس سال مجاہدہ کرتا رہا، میں نے شدید ترین علم و عمل سے زیادہ کسی چیز کو نہ پایا اور اختلافِ علماء نہ ہوتا تو میں زہد و ورع سے رہ جاتا اور حق اطاعتِ دین ادا نہ کر سکتا اور سچ بات یہ ہے کہ اختلافِ علماء رحمت ہے مگر جبکہ توحید میں مجرد ہو جائے تو پھر یہ اختلاف نہیں رہتا۔“

بقول شاعر۔

چہ کافر چہ مومن چہ گبر و چہ ترسا

دو عالم بدو زلف شیدا برآمد (مترجم)

اور حقیقت حال یہ ہے کہ عام طور پر طبیعتِ علم کے مقابلہ میں جہل کی طرف زیادہ میلان رکھتی ہے اور جہل کا یہ ادنیٰ فائدہ واضح ہے کہ بہت سے کام بغیر کسی فکر کے انسان کر سکتا ہے اور اس علم کا پہلا نتیجہ یہ ہے کہ عالم کا کوئی قدم فکر و غور کے بغیر نہیں اٹھ سکتا اور شریعتِ اسلامیہ کا راستہ اور اس کی پل صراطِ اخروی پل صراط سے کہیں زیادہ باریک اور پر خطر ہے۔

تو ایسے ماحول میں انسان کو چاہیے کہ ہر حال میں اس طرح رہے کہ اگر بلند و بالا

مقاماتِ ولایت حاصل کرنے سے عاجز ہو تو میدانِ شریعت میں رہ جائے اور بلندی سے گرے تو ادھر ادھر نہ گرے بلکہ شریعت کے ماحول میں گر کر ٹھہر جائے تاکہ اگر تمام کمالات و مراتب تقرب تجھ سے رہ جائیں تو کم از کم تیری عملی کیفیت تو باقی رہے۔ اس لیے کہ مرید کے لیے سب سے سلوک میں بڑی بلا اور آفت ترکِ عمل ہے اور شریعتِ مطہرہ کی اتباع اور اس کے ماتحت معاملہ رکھنے میں مدعیانِ ولایت و کرامت کے تمام دعاوی گم ہو جاتے ہیں اور تمام انسان اپنی لسان سے جو پردہ ڈال کر لوگوں کو گمراہ کرتے پھرتے ہیں، برہنہ ہو جاتے ہیں۔

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا:

الْجَنَّةُ لَا خَطَرَ لَهَا عِنْدَ أَهْلِ الْمَحَبَّةِ وَ أَهْلِ الْمَحَبَّةِ مَحْجُوبُونَ
بِمَحَبَّتِهِمْ.

”عشاق اور اہلِ محبت کے دلوں میں جنت کا کبھی خطرہ بھی نہیں گزرتا، اس لیے کہ وہ اپنے محبوب کے پردہِ محبت میں محجوب ہیں۔“

انہیں اپنے محبوب کے انداز و ناز کے مقابلہ میں کسی دوسرے کی طرف دیکھنے کی مہلت ہی نہیں۔

اور چونکہ بہشت مخلوق ہے، اگرچہ مخلوقات میں بہترین مخلوق سہی مگر محبتِ محبوب، صفتِ محبوب ہے اور صفتِ مخلوق نہیں، تو قدیم کو چھوڑ کر جو مخلوق کی طرف گیا، وہ محروم ہوا۔ تو مجبانِ محبوب پردہِ محبت میں روپوش ہیں اس لیے کہ وجودِ محبتِ محبوب، مقتضیِ دوستی ہے اور اصل توحید میں دوستی کا وجود ہی نہیں۔ اس لیے مجبانِ الہی وحدانیت سے وحدانیت کی طرف ہوتے ہیں اور ماسوائے اللہ سے بالکل محجوب، اور یہ بھی حقیقتِ الامر ہے کہ طریقہِ محبت میں علتِ محبت بھی محبت ہی ہے۔ اب ایک بڑی آفت جو اس بحث میں ہے وہ یہ کہ دوستی میں ایک مرید اور ایک مراد ضروری ہے تو اب اگر مرید حق ہے تو بندہ مراد ہوگا اور اگر مراد حق ہے تو مرید بندہ ہوگا۔

تو ایسی صورت میں جبکہ حق کو مرید اور بندہ کو مراد کہا جائے تو بندہ کا ثابت ہونا لازم ہوگا (جو بالکل باطل ہے) اور اگر حق تعالیٰ مراد اور بندہ مرید قرار دیا جائے تو بھی طلب و ارادتِ مخلوق بجانب حق لازم آئے گی۔ اور طریقہِ محبت میں ان توہمات کا قطعاً دخل نہیں۔ بہر حال محبت میں آفتِ ہستی وجود جب تک ہے اس وقت تک محبت نہیں ہو سکتا۔ محبت، محبت ہی جب کہلائے گا جبکہ اس کے ارادہ اور دعاوی تمام فنا ہو جائیں اور یہی محبت کے لیے بہترین مقام ہے اور محبت درحقیقت وہی ہے جو بقاءِ محبت کے ساتھ فنا ہو جائے۔ حضرت بایزید رحمۃ اللہ علیہ ہی سے مروی ہے آپ

نے فرمایا:

”ایک دفعہ میں مکہ معظمہ گیا تو صرف بیت اللہ نظر آیا۔ میں نے کہا حج مقبول نہیں ہوا اس لیے کہ ایسے پتھر میں نے بہت سے دیکھے ہیں۔ دوبارہ جب گیا تو بیت اللہ بھی دیکھا اور رب جل علا صاحب بیت کو بھی پایا۔ تو میں نے کہا ابھی حقیقت توحید منکشف نہیں ہوئی (اس لیے کہ قدیم کے ساتھ حادث بھی نظر آ رہا ہے)

تیسری بار گیا تو تمام کا تمام جلوہ خداوندی نظر آیا۔ نہ بیت تھا نہ کوہ۔ تو غیب سے ندا آئی اے بایزید! تو اگر اپنے کو بھی نہ دیکھتا تو خواہ تمام عالم دیکھتا مگر مشرک نہ ہوتا اور جبکہ تو تمام عالم کو میرے ساتھ نہیں دیکھتا مگر اپنے کو دیکھ رہا ہے، مشرک ہے۔ میں نے فوراً توبہ کی اور توبہ کرنے سے بھی توبہ کی (اس لیے کہ توبہ کرنے والا حادث ہو کر اپنا وجود مانتا ہوا توبہ کرتا ہے) اور اس مقام پر وجود کا اثبات ہی عند الصوفیاء شرکِ خالص ہے۔“

حضرت عبداللہ بن حارث رحمۃ اللہ علیہ:

انہیں میں سے امام فنون، جاسوس ظنون حضرت ابو عبداللہ حارث بن اسد محاسبی رضی اللہ عنہ ہیں۔ آپ عالم تھے اور اصول و فروع میں عالم کے علماء آپ کی طرف رجوع کرتے تھے۔ اپنے زمانہ کے علماء میں ممتاز اور یکتہ زمانہ تھے۔ آپ نے ایک کتاب اصول تصوف میں تالیف کی ”رغائب“ نام رکھا۔ علاوہ اس کے بہت سی تصانیف بڑے بلند فنون میں تصنیف فرمائیں۔ اتنے بلند ہمت تھے کہ بغداد شریف میں اپنے وقت کے شیخ المشائخ مانے گئے۔

آپ کا ایک ارشاد منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:

”الْعِلْمُ بِحَرَكَاتِ الْقُلُوبِ فِي مُطَالَعَةِ الْعُيُوبِ أَشْرَفُ مِنَ الْعَمَلِ

بِحَرَكَاتِ الْجَوَارِحِ“

”جو حرکات دل عیوب پر واقف و نگران رہے، وہ عمل ظاہری کرنے والے

سے افضل ہے۔“

اس سے مراد یہ ہے کہ علم محل کمال ہے اور جہل محل طلب اور علم بارگاہ رب العزت میں بہتر ہے اور جہل بدتر۔ علم انسان کو درجہ کمال تک پہنچانے والا ہے اور جہل بارگاہ الہی میں جانے سے روکتا ہے۔

اور خلاصہ تو یہ ہے کہ حقیقتاً علم، عمل سے بزرگ ترین ہے، اس لیے علم ہی وہ چشمہ ہے جس کے ذریعہ انسان کو عرفان الہی حاصل ہوتا ہے اور اگر بحالت جہل عمل کرتا رہے تو اللہ تعالیٰ کو نہیں پاسکتا۔ ع

کہ یہ علم نتوان خدارا شناس۔ (از مترجم)
اور پھر واضح طور پر ظاہر ہے کہ اگر عمل بلا علم میں کوئی قوت ہوتی تو نصاریٰ کے رہبان اپنے انتہاء زُہد اور شدتِ مجاہدے سے مقامِ مشاہدہ پر پہنچ جاتے اور مومن غیبت میں پڑے رہ کر عاصی کے عاصی ہی رہ جاتے۔

یہ یاد رکھنے کی بات ہے کہ عمل بندہ کی صفت ہے اور علم اللہ تعالیٰ کی صفت ہے۔ بعض راویوں نے ہماری مذکورہ بالا عبارت میں غلطی کی اور انہوں نے علم و عمل کی جگہ عمل ہی نقل کر دیا یعنی اسی طرح انہوں نے کہا:

الْعَمَلُ بِحَرَكَاتِ الْقُلُوبِ أَشْرَفُ مِنَ الْعَمَلِ بِحَرَكَاتِ الْجَوَارِحِ. ☆
حالانکہ یہ محال ہے کہ بندہ کا عمل حرکاتِ دل کے ساتھ ہو اور اگر اس سے مراد فکر و مراقبہ اور حالاتِ قلبیہ ہوں تو تعجب نہیں اس لیے کہ حضور سید یوم النور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
تَفَكَّرُ سَاعَةً خَيْرٌ مِّنْ عِبَادَةٍ سِتِّينَ سَنَةً. (۱)

☆ (یہ حکم ایسی ہستیوں کے لیے ہے، عوام اس سے علیحدہ ہیں) یہ ایک لطیف واقعہ حضرت بایزید رحمۃ اللہ علیہ کے حال کی ترجمانی کے لیے کافی ہے۔ (از مترجم غفرلہ)
۱۔ اسے ابو الشیخ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے۔ جبکہ امام دیلمی نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے ایک اور سند کے ساتھ ذکر کیا ہے اور امام سیوطی نے ”اللائلی المصنوعہ“ میں ان الفاظ کے ساتھ ذکر کیا ہے: ان تفکر ساعة خیر من عمل الدهر: امام دیلمی کی ایک روایت میں ثمانین سنة (اسی سال) اور دوسری روایت کے مطابق الف سنتہ (ہزار سال) ہے، ملا علی قاری نے ”الأسرار المرئیة“ میں کہا ہے کہ اسے امام فاکہانی نے ”فکر ساعة“ کے الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حضرت سری سقطی کے کلام سے ماخوذ ہیں۔ جبکہ امام ابن جوزی نے ”الموضوعات الکبیر“ میں حضرت عثمان بن عبد اللہ القرشی سے، انہوں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ عثمان اور اس کا شیخ دونوں جھوٹے ہیں اور امام سیوطی نے ”اللائلی المصنوعہ“ میں ان کی گرفت کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ: عراقی نے ”تخریج الاحیاء“ میں ان کو ضعیف قرار دینے پر اکتفا کیا ہے حالانکہ اس کی شاہد روایت موجود ہے۔ پھر امام دیلمی کی روایت کو سعید بن میسرہ کی طرف اپنی سند کے ساتھ بیان کیا ہے کہ میں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے یہ الفاظ سنے ہیں: تفکر ساعة فی اختلاف اللیل والنهار خیر من عبادة الف سنة.
(بقیہ حواشی اگلے صفحہ پر۔۔۔۔۔)

”ایک ساعت قدرت الہیہ کے فکر و مراقبہ میں بیٹھنا ساٹھ ہزار برس کی عبادت سے افضل ہے۔“

لیکن درحقیقت عمل جو ارح کو فکر و مراقبہ ستری سے کوئی نسبت نہیں اگرچہ وہ یقیناً عمل ستری ہونے کے علاوہ اعمال جو ارح سے فاضل ترین ہے اور افعال باطن سے جو حالات پر اثر ہوتا ہے وہ درحقیقت اعمال ظاہر کی تاثیر سے اثر پذیر ہوتا ہے۔
اسی بنا پر حضور ﷺ نے فرمایا:

نَوْمُ الْعَالِمِ عِبَادَةٌ وَ سَهْرُ الْجَاهِلِ مَعْصِيَةٌ . (۱)

”عالم کا سونا بھی عبادت ہے اور جاہل کی بیداری معصیت۔“

اس لیے کہ خواب و بیداری میں جاہل کا ستر یعنی قلب مغلوب ہوتا ہے اور جس کا دل مغلوب ہے اس کا جسم بھی یقیناً مغلوب ہے تو دل کا مغلوب بحق ہونا حرکات ظاہری اور محنت کے سبب نفس امارہ کے غالب ہونے سے بہتر ہے۔

آپ سے ایک روایت ہے کہ ایک روز آپ نے ایک درویش کو فرمایا:

”كُنْ لِلّٰهِ وَاِلَّا فَلَا تَكُنْ .“

”تو یا تو اپنے کو ذات واجب کے سپرد کر دے یا فنا ہو جا۔“

یعنی یا بحق باقی بن یا از خود فانی ہو یا اس صفت سے متصف ہو جیسے رب جل مجدہ نے فرمایا:

﴿اسْجُدْ وَاِلَّا دَمًا﴾ (۲)

”آدم کو سجدہ کرو۔“

یا اس صفت سے متصف ہو:

﴿هَلْ اَتَى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنَ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُوْرًا﴾ (۳)

”کیا انسان پر وہ وقت آ گیا اس زمانہ سے جبکہ وہ کچھ نہ تھا۔“

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ سے)

حوالہ کے لیے ملاحظہ کریں: الفوائد المجموعۃ للشوکانی (ص: ۲۴۲) تنزیہ الشریعہ
۳۰۵/۲، کشف الخفا، للعجلونی ۳۷۰/۱، تذکرۃ الموضوعات لابن الجوزی (ص:
۱۸۸)، الاسرار المرفوعۃ لعلی القاری، (حدیث: ۳۷۲)، اللالی المصنوعۃ للسیوطی
۲۲۷/۲

۱۔ سلسلۃ الاحادیث للالبانی ۲۰۹/۱

۲۔ سورۃ البقرۃ: ۳۳۔ ۳۔ سورۃ الدھر: ۱

اگر تو بحق باقی رہتا ہے تو تیری قیامت تیرے اختیار میں ہوگی اور اگر فنا ہو جائے گا تو باقی بحق رہ کر قیامت بحق کے ساتھ تیرا نثر ہوگا اور اس میں ایک معنی ہیں (جسے رازدان راز جمیل جانتے ہیں) وَاللّٰهُ تَعَالٰی اَعْلَمُ۔

حضرت داؤد طائی رحمۃ اللہ علیہ:

انہیں میں سے معرض خلق، طلب ریاست سے منقطع حضرت ابوسلیمان داؤد بن نصر طائی رحمۃ اللہ تعالیٰ ہیں۔ کبراء مشائخ سے گزرے ہیں اور اہل تصوف میں سید السادات تھے۔ اپنے زمانہ کے بے مثل صوفی اور امام اعظم رضی اللہ عنہ کے شاگرد رشید ہیں اور حضرت فضیل ابن عیاض و ابراہیم بن ادہم رحمہما اللہ وغیرہ عارفانِ کامل کے ہم عصر گزرے ہیں اور حضرت حبیب ابن سلیم راعی رحمۃ اللہ علیہ کے مرید خاص ہیں۔ آپ ”کو علوم عقلیہ و نقلیہ سے حظ وافر ملا اور فن فقہ میں ”فقہیہ الفقہاء“ مشہور ہیں۔

حکومت در ریاست چھوڑ کر آپ نے گوشہ نشینی اختیار فرمائی، آپ کا زہد و ورع خصوصیت سے مشہور ہے۔ آپ کے مناقب و فضائل بہت زیادہ ہیں اور آپ کی عملی شان خاص طور پر قابل ذکر ہے اور بیان حقائق معرفت میں آپ کامل گزرے ہیں۔

آپ سے مروی ہے کہ آپ نے اپنے مریدان خاص میں سے ایک مرید کو فرمایا:

” اِنْ اَرَدْتَ السَّلَامَةَ سَلِّمْ عَلٰی الدُّنْيَا وَاِنْ اَرَدْتَ الْكِرَامَةَ كَبِّرْ

عَلَى الْاٰخِرَةِ۔“

”بیٹے! اگر دنیا کی سلامتی چاہتا ہے تو دنیا سے وداع ہو کر اس سے غائب ہو جا

اور اگر کرامتِ آخرت چاہتا ہے تو آخرت پر تکبیر مرگ پڑھ لے۔“

یعنی یہ دونوں چیزیں محلِ حجاب ہیں اور تمام فراغتیں دنیا و آخرت کے ترک میں مضمر ہیں۔ اگر کوئی چاہے کہ وجود سے فارغ ہو جائے، اسے کہہ دو کہ دنیا سے اعراض کرے اور جو چاہے کہ دل فارغ ہو اس سے کہہ دو کہ عاقبت کی امیدوں سے اپنا دل علیحدہ کر لے۔

ایک حکایت ہے کہ حضرت داؤد طائی رحمۃ اللہ علیہ حضرت محمد بن حسن رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ ربط ضبط رکھتے اور حضرت امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ قاضی اسلام سے ملنا جلنا پسند نہ فرماتے۔ عرض کیا گیا یہ دونوں مبلغ علم مانے ہوئے ہیں پھر ان میں سے ایک کو آپ محبوب رکھتے ہیں اور ایک سے تعلقات ربط نہیں فرماتے۔

آپ نے فرمایا اس کی وجہ یہ ہے کہ محمد بن الحسن نے نعمت ہائے دنیاوی ترک کر دیں اور

منصب علم کو پسند فرمایا ہے تو اس کی عزت کا دینی سبب علم ہے اور ذلت دنیاوی اس کی نظر میں ہے اور قاضی ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ اول سے ایک درویش تارک الدنیا تھے اور ان کی تنگدستی حصول علم کی وجہ میں رہی۔ اب ان کی عزت کا سبب اور وجاہت و ثروت کا باعث ان کا علم بنا ہے۔ تو محمد بن حسن ابو یوسف جیسا نہیں۔

حضرت معروف کرخی رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ آپؑ نے فرمایا کہ میں نے حضرت داؤد طائی جیسا ”مستغنی عن الدنیا“ نہیں دیکھا۔ ان کی نظر میں تمام دنیا اور اہل دنیا کی کچھ حیثیت ہی نہیں۔ آپؑ کو حزب فقراء پچشم کمال دیکھتے تھے اگرچہ آپؑ دنیاوی بلا میں بھی ہوتے۔ علاوہ اس کے آپؑ کے بہت سے مناقب ہیں۔ وَاللّٰهُ تَعَالٰی اَعْلَمُ

حضرت سرّی سقطی رحمۃ اللہ علیہ:

انہیں میں سے شیخ اہل حقائق، منقطع از علائق حضرت ابوالحسن سرّی بن مغلس السقطی رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ آپؑ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کے ماموں تھے اور تمام علوم میں اعلیٰ دستگاہ رکھتے تھے بالخصوص فن تصوف میں آپؑ کی شان بہت بلند تھی اور تصوف کی ترتیب، مقامات اور بسط احوال میں سب سے اول جس نے غور و خوض کیا وہ یہی سرّی سقطی ہیں اور مشائخین عراق کا اکثر حصہ آپؑ کے ہی بیعت سے مشرف ہے۔ آپؑ نے حضرت حبیب بن سلیم راعی کی رحمۃ اللہ علیہ بھی زیارت کی اور ان کی فیض صحبت سے بھی مستفیض ہوئے۔ آپؑ حضرت معروف کرخی رحمۃ اللہ علیہ کے مرید تھے۔ چونکہ آپؑ بازار بغداد میں ”سقط فروشی“ کیا کرتے تھے (جسے اردو زبان میں ”کباڑی“ کہتے ہیں) اسی بناء پر آپؑ کو ”سقطی“ کہا جاتا ہے۔

آپؑ کا رجوع الی اللہ کا واقعہ یوں ہے کہ جس بازار میں آپؑ کباڑی کا کام کرتے تھے اس میں آگ لگ گئی۔ تمام بازار جل کر خاک سیاہ ہو گیا، آپؑ سے کہا گیا کہ حضرت! آپؑ کی دکان بھی جل گئی ہے، آپؑ نے فرمایا میں دکان اور مال کی قید سے آزاد ہو چکا ہوں۔ جب آ کر لوگوں نے دکان دیکھی کہ تمام بازار میں وہی ایک دکان ہے جو جلنے سے بچی ہوئی تھی اور چاروں طرف کی تمام دکانیں سوختی تھیں، جب آپؑ نے اپنے حافظ حقیقی کا یہ کرم دیکھا تو فرط مسرت میں تمام سامان و دکان درویشوں کو دے کر طریقہ تصوف اختیار فرمایا۔

بعض نے آپؑ سے پوچھا کہ ابتداء عرفان آپؑ کو کس طرح حاصل ہوا؟ فرمایا: ایک روز حبیب بن سلیم راعی رحمۃ اللہ علیہ کا میری دکان پر گذر ہوا، میں نے اپنے کباڑ خانہ کی بعض شکتہ چیزیں انہیں دیں کہ وہ درویشوں میں تقسیم فرمادیں تو انہوں نے مجھے دعا دی: خَيْرَ كَبَّ اللَّهُ (اللہ

تجھے اختیار فرمائے) اس روز سے کہ میرے کان میں ان کی دعا کی آواز آئی، میرا دل دنیاوی معاملات سے متنفر ہو گیا۔

آپ سے مروی ہے کہ آپ دعا میں فرمایا کرتے:

اللَّهُمَّ مَهْمَا عَذَّبْتَنِي بِهِ مِنْ شَيْءٍ فَلَا تُعَذِّبْنِي بِلَدِّ الْحِجَابِ .

”الہی! مجھے عذاب دینا ہی منظور ہو تو اپنے جمال کے حجاب کا عذاب مجھ پر

نہ فرمانا۔“

اس لیے کہ اگر میں مشاہدہ جمال سے محبوب نہ ہوا تو پھر کوئی بھی مصیبت و بلا آئے، مجھے آسان ہوگی اور اگر تیرے مشاہدہ جمال سے محبوب رہ کر معذب ہوا تو ذلت حجاب کی وجہ میں تیری نعمتیں بھی میرے لیے موجب ہلاکت ہوں گی۔ اور بات بھی ٹھیک ہے کہ مشاہدہ جمال محبوب ہوتے ہوئے جو بلا بھی آئے وہ بلا نہیں ہو سکتی لیکن بغیر مشاہدہ یا نعمت بھی اگر ہو تو بوجہ حجاب بلاء عظیم ہے۔ اور جہنم میں سب سے اشد ترین جو عذاب ہے وہ حجاب ہے اور اگر جہنم میں جلوہ ذات کا مشاہدہ رہے تو کسی مومن کو بہشت یاد نہ آئے اس لیے کہ دیدار حق کی اس قدر مسرت و فرحت ہوگی کہ بلاءِ تن اور عذابِ جسم کا ہوش ہی نہ رہے گا۔

اور بہشت میں کوئی نعمت جمال ذاتِ باری عزاسمہ سے بڑھ کر نہ ہوگی اگر وہ نعمتیں جو بہشت میں ہیں ان سے سوگنی اور نعمتیں ملیں اور جلوہ احدیت سے جتنی محبوب ہو جائے تن من دھن سب فنا کر دے اور ہلاک ہو جائے۔

توسعتِ الہیہ یہی ہے کہ اپنے محبوبوں کے قلوب کو اپنے جمال کے مشاہدہ میں بہر حال رکھتا ہے تاکہ مجاہدہ و ریاضت و بلا ہائے ترکِ اکل و شرب تمام برداشت کر سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ عارفانِ کامل کی بے صدا دعا ہے کہ ہر عذاب منظور ہے مگر اپنے جمال کے حجاب سے محفوظ رکھ، اگر تیرا جمال ہمارے دلوں کی چشمِ حق میں مکشوف ہے تو پھر ہمیں کسی بلا و مصیبت کی پرواہ نہیں ☆ وَاللَّهُ أَعْلَمُ

حضرت ابوعلی شقیق بن ابراہیم ازدی رحمۃ اللہ علیہ:

انہیں میں سے سرہنگ اہل بلا و بلوی، مایہ زہد و تقویٰ حضرت ابوعلی شقیق ابن ابراہیم ازدی رضی اللہ عنہ ہیں۔ بڑے معزز قوم اور مقتدائے ہم چشماں، عالم جمیع علوم شرعی و فقہی گذرے ہیں۔ آپ کی بہت سی تصانیف، تصوف اور دیگر علوم میں مشہور ہیں۔ حضرت

☆ بقول شخصے: پکارا، دیکھ کر میں حور کی شکل خداوند! یہ وہ صورت نہیں ہے

گریباں چاک کر کر باغِ رضواں سے نکل بھاگیں مزا آیا ہے جن کو آپ کی جلوہ نمائی کا (از مترجم)

ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ کے ہم صحبت تھے اور بڑے بڑے مشائخ کرام کی زیارت سے مشرف ہوئے اور ان کے فیض صحبت سے مستفیض ہوئے۔

آپ سے مروی ہے آپ نے فرمایا:

”جَعَلَ اللَّهُ أَهْلَ طَاعَتِهِ أَحْيَاءَ فِي مَمَاتِهِمْ وَأَهْلَ الْمَعَاصِي أَمْوَاتًا فِي حَيَاتِهِمْ.“

”اللہ تعالیٰ نے اپنے اطاعت کرنے والے کو موت کے اندر بھی زندہ فرمایا ہے اور اہل معصیت کو زندگی کے اندر بھی مردہ بنایا ہے۔“

یعنی مطیع اگرچہ مردہ ہو، زندہ ہوتا ہے اس لیے کہ تمام ملائکہ اس کی اطاعت پر آفرین کہتے ہیں جو قیامت کے دن ان کے اجر و ثواب کے لیے مؤید ہوگی تو وہ لوگ فناء مرگ میں باقی بہ بقاء جزا ہوتے ہیں۔

ایک واقعہ ہے کہ ایک ضعیف العمر حضرت ابوعلی شقیق رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں آئے اور عرض کی کہ حضور! میں سخت گناہ گار ہوں اور توبہ کرنا چاہتا ہوں۔ آپ نے فرمایا بڑے میاں بڑی دیر میں توبہ کی طرف رخ کیا!! وہ عرض کرنے لگا حضور! دیر میں نہیں آیا بلکہ جلدی آیا ہوں۔ آپ نے فرمایا وہ کیسے؟ عرض کی حضور! جو مرنے سے قبل توبہ کی طرف آجائے اگرچہ بظاہر دیر میں آئے، اس کا نام جلدی آنے کے مترادف ہے۔

مشہور ہے کہ حضرت ابوعلی شقیق رحمۃ اللہ علیہ کا رجوع الی اللہ بالا خلاص اس طرح ہوا کہ ایک سال بلخ میں قحط پڑا اور اتنا شدید پڑا کہ آدمی آدمی کو کھانے لگ گیا۔ تمام مسلمان غمناک تھے کہ بازار میں ایک غلام آپ نے دیکھا جو نہایت بے فکر اور ہنسی مذاق کر رہا تھا۔ لوگوں نے اسے کہا تو اتنا بے فکر ہو کر ہنستا پھر رہا ہے تجھے شرم کرنی چاہیے اس لیے کہ مسلمانوں میں تو سخت اضطراب اور غم ہے، تو یہ خوشیاں رچا رہا ہے۔ غلام کہنے لگا بات یہ ہے کہ مجھے اصلاً کسی بات کا غم نہیں اس لیے کہ میں جس کا غلام ہوں وہ جاگیردار ہے اور اس گاؤں کی پیداوار کافی ہے، اس کی فراخ دستی نے مجھے بے غم کر رکھا ہے۔

حضرت ابوعلی شقیق رحمۃ اللہ علیہ نے غلام کا یہ جواب سنتے ہی عبرت حاصل کی اور دل میں کہا کہ اس غلام کو ایک جاگیردار کے استغنا کی وجہ میں بے غمی حاصل ہوئی اور میں جس کا بندہ ہوں وہ مالک الملک، رزاق کل رب الارباب ہے اور سب کو بلا معاوضہ روزی پہنچانے والا ہے،

پھر ہمیں کسی اندوہ و غم کا شکار بننا کیونکر روا ہے۔☆

یہ سوچا اور مشغل دنیا سے منہ پھیر کر طریق حق کا رخ فرمایا اور غم روزی سے آزاد ہو گئے اور یہ قصہ بھی آپ کی کیفیت تو واضح پر ہے۔ آپ کے بہت سے فضائل و مناقب ہیں۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ میں ایک غلام کا شاگرد ہوں، جو کچھ مجھے ملا اسی کی بدولت ملا۔ وَاللّٰهُ التَّوَفِّیْقُ

حضرت ابو سلیمان عبدالرحمن بن عطیہ دارانی رحمۃ اللہ علیہ:

انہیں میں سے اپنے وقت کے شیخ فرد، طریق حق میں مجرد حضرت ابو سلیمان عبدالرحمن بن عطیہ دارانی رضی اللہ عنہ ہیں۔ قوم کے چمکتے جوہر اور ریحانِ قلوبِ خلائق گزرے ہیں۔ آپ کا ریاضت و مجاہدہ آپ کے ساتھ ہی مخصوص ہے۔ اپنے وقت کے عالم فرزانہ تھے اور نفسِ امارہ کی عیاریوں پر آپ خاص طور سے متنبہ تھے۔

آپ کے اقوال نہایت لطیف و نفیس ہیں۔ معاملات اور محافظتِ قلوب اور رعایتِ جوارح میں آپ کی نصائح رجوع الی اللہ میں نہایت مفید ہے۔ آپ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا:

اِذَا غَلَبَ الرَّجَا عَلٰی الْخَوْفِ فَسَدَ الْوَقْتُ .

”جب امیدیں خوف بے نیازی پر غالب آجائیں تو اس کا وقت خراب ہو جاتا ہے۔“

اس لیے کہ وقت کہتے ہیں اپنی حالت کی نگہبانی کو، تو جب انسان اپنی حالت و ماحول کا نگہبان نہ رہا تو کس طرح خوف بے نیازی اس کے دل پر مستولی ہو سکتا ہے، اور جب اٹھ گیا تو یقیناً انسان نگہبانی کے ماحول سے بے پرواہ ہو جائے گا اور ایسی صورت میں اس کا وقت ضائع ہونے کے سوا اور کیا ہوگا۔ اور اگر خوف، امید پر غالب رہا تو کیفِ توحید باطل ہو جائے گا اس لیے کہ غلبہ خوف سے مایوسی ہوتی ہے اور حق سے مایوسی (مذہبِ صوفیا میں) شرکِ خالص ہے۔ (تو بہترین حال صوفی یہ ہے کہ) محافظتِ کیفِ توحید رہے اور امید کے میدان کو بھی ہاتھ سے چھٹنے نہ دے اور اپنے وقت کی محافظت بھی کرے اور خوفِ الہی بھی دل پر مستولی رکھے۔ گویا خوف و امید کے دونوں پلہ مساوی ہوں اور بندہ محافظتِ توحید میں مومن ہوتا ہے۔ كَمَا فِي الْحَدِيثِ: الْاِيْمَانُ بَيْنَ الْخَوْفِ وَالرَّجَا (از مترجم غفرلہ) اور محافظتِ وقت کے ساتھ ساتھ مطیع بننا ہے اور امید و رجاء کا تعلق محض مشاہدہ سے ہے اور اسی میں اعتقادات کی جڑ مستتر ہے اور خوف کا تعلق محض مجاہدہ سے ہے اور اس میں اضطراب ہی اضطراب ہے اور مشاہدہٴ جمالِ مورتِ مجاہدہ ہے۔

☆ دوستان را کجا کنی محروم تو کہ با دشمنان نظر داری (از مترجم)

اور اس کے معنی یہ ہیں کہ تمام امیدیں ناامیدی سے ظاہر ہوتی ہیں اور جو اپنے اعمال کی فلاح و بہبود سے ناامید ہو تو اس کا ناامید ہونا نجات و فلاح اور کرم الہی کی طرف راہنمائی کرتا ہے اور اس پر منجانب اللہ درکشادگی کھل جاتا ہے اور اس کے دل کو خواہشات کی بلاؤں سے پاکی حاصل ہو جاتی ہے اور تمام اسرار ربانی اس پر کھل جاتے ہیں۔

حضرت احمد بن حواری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک شب خلوت میں نوافل پڑھ رہا تھا کہ اثناء نماز میں مجھے نہایت راحت محسوس ہوئی، دوسرے دن حضرت ابو سلیمان رحمۃ اللہ سے عرض کی تو فرمایا: ابھی تو ضعیف ہے، ابھی خطرہ خلاق تیرے دل سے نہیں نکلا یہی وجہ ہے کہ خلوت میں تیرا اور حال ہے اور جلوت میں اور حال۔

دونوں جہان میں اس سے بدتر کوئی وسوسہ اور خطرہ نہیں جو بندہ کو تقرب ذات سے روک دے۔ جب دلہن کو رونمائی کے لیے بٹھاتے ہیں تو اس غرض کے لیے بٹھاتے ہیں کہ سب اسے دیکھیں اور اس رونمائی میں اس کی عزت بڑھتی ہے لیکن دلہن کو یہ نازیبا ہے کہ اس وقت اپنے کو خود دیکھنے میں مصروف ہو جائے اور غیر کے دیکھنے سے اس کی ذلت ہو۔

اسی طرح اگر سب لوگ مطیع کی اطاعت کو دیکھنے لگیں تو اس میں مطیع کا کچھ نقصان نہیں لیکن اگر مطیع خود اپنی اطاعت اور حسن عمل پر ناز کرنے لگے تو یہ اس کی ہلاکت کا موجب ہے۔
عیاذاً باللہ منہا۔

حضرت معروف کرخی رحمۃ اللہ علیہ:

انہیں میں سے پروردہ حضرت علی بن موسیٰ رضارضی اللہ عنہ، وابستہ درگاہ مولا، ابو محفوظ حضرت معروف بن فیروز الکرخنی رضی اللہ عنہ ہیں۔ قدماء سادات اور مشائخ کبار سے گذرے ہیں۔ جو انمردی اور ورع و تقویٰ میں آپ ”مشہور و معروف تھے۔

آپ کا ذکر اس سے پہلے چاہیے تھا لیکن میں نے یہ ترتیب دو بزرگوں کی تتبع میں مناسب سمجھی۔ حضرت شیخ عبدالرحمن سلمیٰ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب میں اسی ترتیب پر اذکار مشائخ بیان فرمائے اور استاد ابوالقاسم رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اپنی کتاب میں اسی ترتیب سے بیان فرمایا۔ حضرت معروف کرخی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت سری سقطی رحمۃ اللہ علیہ کے استاذ تھے اور حضرت داؤد طائی رحمۃ اللہ علیہ کے خاص مرید۔

ابتداء میں غیر مسلم تھے پھر حضرت علی بن موسیٰ رضارضی اللہ عنہ کے دستِ حق پرست پر

اسلام قبول فرمایا اور ان کی خدمت میں نہایت محبوب بن کر رہے۔ ان کے اوصاف حمیدہ بہت ہیں۔ حتیٰ کہ آپ فنون و علوم میں ”سید القوم“ کہلائے۔

آپ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا:

لِلْفِتْوَةِ ثَلَاثُ عَلَامَاتٍ وَفَاءٌ بِلَا خِلَافٍ وَمَدْحٌ بِلَا جُودٍ وَعَطَاءٌ بِالسُّوَالِ.

”جو ان مرد کے لیے تین علامتیں ہیں: وفاداری میں پورا اترنا کہ کبھی بے وفائی نہ کرے اور مدح بلا امید جو دو بخشش اور عطا بلا سوال“۔

وفاء بلا بے وفائی یہ ہے کہ بندہ اپنے عہدِ عبودیت میں بیوفائی اور معصیت کو اپنے اوپر حرام جانے، اور مدح بلا جو د یہ ہے کہ تعریف اس کی کرے جس سے اپنے اوپر کوئی احسان کا بار نہ لیا ہو، اور عطا بلا سوال یہ ہے کہ جب استطاعت ہو تو دینے میں کسی کی تمیز نہ کرے اور جب کسی کا حال معلوم ہو تو اسے سوال کرنے سے پہلے کچھ بخشے۔

اور یہ تینوں صفتیں خلق سے خلق میں ہیں مگر تمام مخلوقات ان صفتوں سے عاریتاً متصف ہے۔ اس لیے کہ درحقیقت یہ ہر سہ صفت صفاتِ حق سے ہیں اور ان صفات کا مظہر بندگانِ الہی ہیں اور بندگانِ الہی، ان صفات میں حقیقتِ صفتِ الہیہ کے دکھانے والے ہیں۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے بندوں کے ساتھ وہ وفا ہے کہ اس کا خلاف نہیں۔ ہر چند کہ بندے اپنی وفا میں خلاف کرتے ہیں مگر وہ ان پر اپنے الطاف کی بارشیں ہی کرتا ہے۔

دوسرے اس کی وفا پر یہ امر بھی دلیل واضح ہے کہ روزِ ازل میں بلا کسی فعل کے نیک بندوں کو، جو مقدر میں نیک تھے، جلا لے گا اور دنیا میں فعلِ بد کی وجہ سے فہرستِ مرحومین سے خارج نہیں فرماتا اور مدح بلا جو د سوائے اس ذاتِ پاک کے کوئی نہیں کر سکتا اس لیے کہ بندہ کے کسی فعل کا وہ محتاج نہیں ہے مگر بندہ کے ادنیٰ سے ادنیٰ نیک عمل کی وہی تعریف فرماتا ہے۔

اور عطاء بلا سوال بھی سوائے اس کے کوئی نہیں کر سکتا۔ اس لیے کہ کریم وہی ہے اور ہر ایک کا حال اس پر منکشف ہے اور ہر ایک کا مقصود بغیر زبان سے ظاہر کیے وہی جانتا ہے۔ تو جب اللہ تعالیٰ اپنے بندہ کو اعزاز و کرامت کا منصب عطا فرماتا ہے، اسے بزرگ بناتا ہے تو وہ اپنی استطاعت و قوت کے مطابق بندوں کے ساتھ ان ہر سہ صفات کو لے کر برتاؤ کرتا ہے۔ اس وقت بارگاہِ ایزدی سے اس کا نام ”صاحبِ فتوت“ رکھا جاتا ہے اور جماعتِ نقیان میں اس کا نام درج ہو جاتا ہے۔

یہ ہر سہ صفت حضرت ابراہیم علیہ السلام میں دیکھی گئی تھیں اور اس کا خلاصہ اس کی جگہ ان شاء اللہ بیان کیا جائے گا۔

حضرت حاتم الاصم رحمۃ اللہ علیہ:

انہیں میں سے زبدۂ عباد، جمال الاوتاد حضرت ابو عبد الرحمن حاتم بن الاصم رضی اللہ عنہ ہیں۔ آپ محشمان بلخ سے ہیں اور قدماء مشائخ خراسان سے گزرے ہیں۔ آپ حضرت ابو علی شقیق بن ابراہیم ازدی رحمۃ اللہ علیہ کے مرید ہیں اور حضرت احمد خضرویہ رحمۃ اللہ علیہ کے استاد۔ آپ ”کا ابتداء سے انتہاء تک کوئی قدم صدق و اخلاص کے خلاف نہیں اٹھا، حتیٰ کہ ان کے منقبت میں حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

”صِدِّيقُ زَمَانِنَا حَاتِمُ الْاَصَمِّ.“

”ہمارے زمانے کا صدیق حاتم اصم ہے۔“

آپ کے اقوال، آفات نفس کے دیکھنے اور سمجھنے میں نہایت دقیق اور بلند منقول ہیں اور رعونت و تلون طبع کے متعلق بہت کچھ ارشادات ہیں۔ آپ کی بہت سی تصانیف معاملات و عبادات میں مشہور ہیں۔ مروی ہے کہ آپ نے فرمایا:

”الشَّهْوَةُ ثَلَاثَةٌ شَهْوَةٌ فِي الْأَكْلِ وَ شَهْوَةٌ فِي الْكَلَامِ وَ شَهْوَةٌ فِي

النَّظْرِ فَاحْفَظِ الْأَكْلَ بِالثِّقَةِ وَاللِّسَانَ بِالصِّدْقِ وَالنَّظَرَ بِالْعِبْرَةِ.“

”شہوت تین ہیں: ایک کھانے کے اندر، ایک کلام کرنے میں اور ایک دیکھنے

میں۔ لہذا کھانے میں ہوشیار رہ اور اپنی روزی کا خدا پر بھروسہ رکھ اور زبان کو

سچ بولنے کے علاوہ محفوظ رکھ اور آنکھ کو محفوظ رکھ، جہاں نظر پڑے اس سے

عبرت حاصل ہو۔“

تو جو کھانے پینے میں اللہ پر توکل کر لیتا ہے وہ شہواتِ اکل و شرب سے آزاد ہو جاتا ہے

اور جو بات کرنے میں راست گوئی کا پابند ہو جاتا ہے وہ شہوتِ کذب سے آزاد ہو جاتا ہے۔ جو

آنکھ سے دیکھتے وقت راستی ملحوظ رکھتا ہے (یعنی جائز و ناجائز کا خیال کر لیتا ہے) وہ شہوتِ چشم سے

آزاد ہو جاتا ہے۔

اور حقیقت توکل یہ ہے کہ اپنا رب حقیقی دل زبان سے اپنے رب حقیقی کو جانے اور اس پر

اسے استقامت حاصل ہو۔ جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد ہے:

﴿ إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا... الخ ﴾ (۱)

اس وقت اس کی عبادت بھی اخلاص اور راستی سے ادا ہوگی اور معرفت و صداقت کے ساتھ ہر شے پر نظر رکھے گا۔ حتیٰ کہ اس کا اکل و شرب سوائے دوست کے نہ ہوگا۔ اور اس کی ہر حرکت و سکون میں کیفیت و جدانیہ کے سوا کچھ نہ ہوگا اور اس کی نظر سوائے مشاہدہ ذات کے کسی طرف نہ جائے گی۔ تو جب وہ صحیح طور پر کھائے گا، صحیح کلام کرے گا تو یہ کھانا خالص حلال ہوگا اور یہ کلام خالص ذکر دوست ہوگا اور صحیح دیکھنا بھی جب ہی صحیح ہوگا جبکہ سوائے ذات کے کچھ نہ دیکھے۔

اس لیے کہ عارف کے لیے وہی کھانا حلال ہوتا ہے جو رب حقیقی کا عطیہ ہو اور بلا اذن محبوب اسے وہ کھانا کھانا بھی حلال نہیں ہوتا اور سوائے ذکر محبوب کے اٹھارہ ہزار عالموں میں سے کسی عالم کا ذکر راست نہیں آتا۔

اور سوائے جمال و جلال محبوب، موجودات عالم میں اس کا نظارہ ہی جائز نہیں۔ پھر جب اسی سے کھائے، اسی سے بولے، اسی کو دیکھے تو شہوت نہ ہوئی اور جب اس سے کلام ہو اور بلا اس کی اجازت کلام بھی نہ ہو تو یہ بھی شہوت لسانی نہ رہی اور جب ہر شے میں جو فعل دیکھا اس کی طرف سے دیکھا اور اس کے اذن سے دیکھا تو یہ دیکھنا بھی منی علی الشہوت نہ ہو۔

اور اگر تو اپنی خواہش اور حرص سے کھائے اگرچہ کسب حلال ہی سے کھائے مگر یقیناً شہوتِ اکل ہے اور اگر تو اپنی ہوائے نفسانی کے ماتحت کلام کرے اگرچہ وہ دروغ نہ ہو مگر شہوتِ لسانی ہے اور اگر اپنی خواہش نفسانی سے دیکھے اگرچہ اس دیکھنے سے شہادت وغیرہ میں کام لے مگر یہ وبال اور شہوتِ نظر ہے۔ وَاللَّهُ تَعَالَىٰ أَعْلَمُ

حضرت امام محمد بن اور لیس شافعی رحمۃ اللہ علیہ:

انہیں میں سے امام مطہری، ابن عم نبی رضی اللہ عنہما حضرت ابو عبد اللہ محمد بن اور لیس شافعی رضی اللہ عنہ ہیں۔ آپ اپنے وقت کے تمام علوم میں امام گزرے ہیں اور جو انمردی و ورع میں مشہور ہیں، آپ کے بہت زیادہ مناقب ہیں اور آپ کا کلام بہت بلند مانا گیا ہے۔

آپ حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے اس وقت تک شاگرد رہے جب تک مدینہ منورہ میں آپ کا قیام رہا، پھر جب عراق میں تشریف لائے تو حضرت محمد بن حسن رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ نشست و برخاست رکھی۔ آپ کے مزاج میں خلوت نشینی کا خاص شوق تھا، مگر ایک جماعت

آپ کی خدمت میں آئی اور آپ کی مقلد بن گئی۔ حضرت امام احمد حنبل رحمۃ اللہ علیہ بھی انہیں تبعین میں سے ہیں جب اس خدمت کی طرف آپ مجبور ہو گئے تو پھر آپ نے اجتہادیات کے ذریعہ خدمتِ امامت انجام دینی شروع فرمائی اور آپ کی وجاہت عام ہو گئی اور خلوت نشینی نہ فرما سکے لیکن اس امامت و جاہت کے دور میں بھی آپ محمود الخصال رہے۔

ابتداءً دور میں آپ کے مزاج کے اندر کچھ سختی تھی۔ جب حضرت سلیمان راعی رحمۃ اللہ علیہ کے فیضِ صحبت سے مستفیض ہوئے تو اس کے بعد آپ کی وہ خشونت جاتی رہی اور جہاں بھی آپ تشریف لے گئے طلبِ حق میں رہے۔ آپ کا ارشاد ہے:

إِذَا رَأَيْتَ الْعَالِمَ يَشْتَغِلُ بِالرُّخَصِ فَلَيْسَ يَجِيئُ مِنْهُ شَيْءٌ.

”جب تو علماء کو دیکھے کہ رخصت اور تاویلات میں مشغول ہیں، سمجھ لے کہ

اب ان سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔“

یعنی علماء پیشوا تمام اصنافِ خلاق سے ہیں اور یہ ہرگز روا نہیں کہ ان سے آگے کوئی ایک قدم بھی بڑھے اور راہِ حق اور معنی حقیقی کا انکشاف بغیر احتیاط اور مجاہدہ کے ہرگز نہیں ہو سکتا اور علم حاصل کرنا اس کا کام ہے جو مجاہدہ سے گریز کرے اور طالبِ علم کو چاہیے کہ احکام میں تخفیف اختیار کرے۔ اس لیے کہ علم حاصل کرنا درجہ عوام میں ہے تاکہ کم از کم اس علم کے ذریعے دائرہ شریعت سے توباہر نہ گریں اور مجاہدہ و ریاضت یہ درجہ خواص ہے، ان کا عام درجہ جو ہے وہ رضاءِ محض ہے، اس سے زائد وہ کسی چیز پر نظر نہیں ڈالتے اور نہ انہیں نظر ڈالنا چاہیے۔

اور علماء حق اس درجہ میں اخص الخواص ہیں۔ جب یہ اخص الخواص عوام کے درجہ پر راضی ہو گئے تو اس کا نتیجہ کچھ نہیں اور نہ ایسی حالت میں ان سے کچھ امید رکھنی چاہیے اور رخصت اور تاویلات ڈھونڈنا خدا تعالیٰ کے احکام میں نرمی اور خفت نکالنا ہے۔

اور علماء تو خاص محبوبانِ خدا ہیں پھر فرمانِ دوست کو ہلکا اور خفیف کرنا کس طرح گوارا کر سکتا ہے اور وہ تعمیلِ حکمِ دوست میں ادنیٰ درجہ ہرگز منظور نہیں کر سکتا بلکہ ہر حکم کی تعمیل اعلیٰ درجہ احتیاط پر کرے گا۔

ایک شیخ مشائخِ کرام سے راوی ہیں کہ ایک شب حضور ﷺ کو خواب میں دیکھا۔ عرض کی، حضور! مجھے روایت پہنچی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین پر اوتا داویا مقرر فرمائے ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا: اس راوی نے تجھے خبر صحیح پہنچائی ہے۔ میں نے عرض کی حضور! میں چاہتا ہوں کہ ان میں سے کسی ایک کی زیارت کروں، فرمایا: حضرت محمد بن ادریس ان میں سے ایک ہیں۔ آپ

کے مناقب اس کے علاوہ اور بہت ہیں۔

حضرت امام ابو محمد احمد بن حنبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ:

انہیں میں سے شیخ سنت، قاہر اہل بدعت حضرت ابو محمد احمد بن حنبل رضی اللہ عنہ ہیں۔ آپ ورع و تقویٰ میں امتیازِ خصوصی رکھتے ہیں، حافظِ حدیث تھے اور انہیں اربابِ شرع اور اہل طریقت دونوں فریق مبارک مانتے ہیں، آپ بڑے بڑے مشائخ کرام کے صحبت یافتہ ہیں۔ مثل حضرت ذوالنون مصری اور بشر حافی اور سری سقطی، معروف کرنی رحمہم اللہ تعالیٰ اور ان کے علاوہ اور بھی مشائخ کرام کے فیضِ صحبت سے مستفید ہوئے ہیں۔ آپ کی کرامتیں بہت ہیں اور آپ کی فراست (یعنی نورِ ایمانی سے خطراتِ قلوبِ عوام پر عبور بالکل صحیح ہے)۔ بعض لوگ حضرت ممدوح کا تعلق فرقہ مشبہ (۱) سے بتاتے ہیں یہ محض غلط ہے اور ان پر افتراء ہے (مشبہ مثل معتزلہ دہریہ کے اس زمانہ میں کوئی فرقہ تھا) وہ قطعاً اس الزام سے بری ہیں۔ ان کے عقائد اور اصولِ دین و مذہب نہایت پسندیدہ تھے اور تمام علماء اس پر متفق ہیں۔ جبکہ آپ بغداد شریف تشریف لائے تو فرقہ معتزلہ نے آپ پر غلبہ کیا اور یہ تجویز کی کہ آپ ”کو تکلیف دے کر مجبور کیا جائے تاکہ آپ بھی قرآن کریم کو مخلوق فرمادیں۔

باوجودیکہ آپ معمر اور نہایت ضعیف تھے، آپ کی مشکلیں کسی گنیں، ہزار تازیانہ آپ کو لگائے گئے اور پھر کہا کہ قرآن کریم کو مخلوق کہیں مگر آپ ”مستقیم علی الحق رہے۔ اسی حالت میں آپ کی شلوار مبارک کا کمر بند کھل گیا اور چونکہ آپ کے دونوں ہاتھ بندھے ہوئے تھے اسے باندھنے میں آپ عاجز ہوئے کہ یہ کرامت ظاہر ہوئی کہ ایک تیسرا ہاتھ غیب سے نمودار ہوا اور کمر بند باندھ کر غائب ہو گیا۔ جب ان ظالموں نے آپ کی یہ کرامت دیکھی تو گھبرا گئے اور آپ کو چھوڑ دیا۔ آپ نے اس تمام تکلیف کو بھی من جانب اللہ سمجھا اور ان سے کوئی انتقام قوتِ باطنی کے ذریعہ نہ لیا۔ غرضیکہ آخر عہد حکومتِ معتزلہ میں ایک جماعت آپ کی خدمت میں حاضر آئی اور عرض کیا کہ جن لوگوں نے آپ کو یہ تکلیف دی اس کی بابت آپ کا کیا حکم ہے؟ فرمایا میں کیا کہوں میرا خیال تو یہ ہے کہ انہوں نے اللہ واسطے مجھے یہ تکلیف دی، وہ یہ سمجھے کہ میں قرآن کریم کو مخلوق نہ کہنے

۱۔ فرقہ مشبہ کی تعریف میں حضرت غوث الاعظم رضی اللہ عنہ اپنی کتاب ”غنیۃ الطالبین“ میں فرماتے ہیں: (ترجمہ) مشبہ میں تین فرقے ہیں بشاریہ اور مقاتلیہ اور واسمیہ، اور وہ عقیدہ جس پر یہ تینوں متفق ہیں یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک جسم ہے اور وہ جسم ایسا ہے کہ اس کا ادراک عقل کو جائز نہیں، وہ موجود ہے اور جسم ہے۔ (از غنیۃ الطالبین عربی صفحہ ۲۱۴ مطبوعہ مطبع صدیقی۔ لاہور (ابوالحسنات))

میں باطل پر ہوں اور وہ اپنے کو حق پر سمجھتے رہے۔ میں یہاں تو یہاں بروز قیامت بھی ان تازیانوں کے بدلہ میں ان سے خصومت کے لیے تیار نہیں۔

آپ کا کلام بہت بلند ہے اور معاملات میں آپ کے احکام نہایت واضح ہیں۔ چنانچہ جب کوئی آپ کے پاس مسئلہ پوچھنے آتا تو آپ معاملات کے سوال کا جواب واضح دیتے اور اگر حقائق تصوف کے متعلق ہوتا تو اسے حضرت بشرحانی رحمۃ اللہ علیہ کے سپرد فرماتے۔ چنانچہ ایک روز ایک شخص آیا اور اس نے پوچھا: مَا الْإِخْلَاصُ؟ ”حضور! اخلاص کی کیا تعریف ہے؟“ فرمایا: الْإِخْلَاصُ هُوَ الْإِخْلَاصُ مِنْ آفَاتِ الْأَعْمَالِ. ”اخلاص کہتے ہیں اعمال سے آفات کے نجات پانے کو۔“ یعنی جو عمل کرے اس میں اس کی آفت جو ریا ہے وہ قطعاً نہ ہو اور دکھاوے کا کوئی حصہ تیرے عمل میں نہ آئے۔

اس نے عرض کی: مَا التَّوَكُّلُ؟ ”حضور! توکل کیا ہے؟“ فرمایا: الْإِثْقَةُ بِاللَّهِ۔ ”اللہ پر پورا بھروسہ کر لینا اور اس کی رزاقی پر یقین واثق کر لینا۔“ عرض کی: حضور! مَا الرِّضَا؟ ”رضا کیا چیز ہے؟“ فرمایا: تَسْلِيمُ الْأُمُورِ إِلَى اللَّهِ۔ ”اپنے تمام کام اللہ کے سپرد کر دینا۔“ عرض کی: حضور! مَا الْمَحَبَّةُ؟ ”محبت کیا چیز ہے؟“ فرمایا: یہ بشرحانی سے جا کر پوچھ اس لیے کہ جب تک وہ رونق افروز ہیں میں اس کا جواب دینے کا اہل نہیں۔ اور حضرت احمد بن حنبل رضی اللہ عنہ تمام احوال میں امتحان لیے گئے۔ اپنی زندگی میں تو طعن معززہ سے امتحان ہوا اور بعد وفات مشہ کے ساتھ مل جانے کی تہمت سے۔ حتیٰ کہ آج تک بعض اہل سنت و جماعت میں بوجہ عدم واقفیت حال آپ پر تہمت لگاتے رہے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ آپ ان اتہامات سے بالکل بری ہیں۔ وَاللَّهِ أَعْلَمُ

حضرت ابوالحسن احمد بن حواری رحمۃ اللہ علیہ:

انہیں میں سے سراج وقت، واقف اسرار آفات مقت حضرت ابوالحسن حواری رضی اللہ عنہ ہیں۔ مشائخ شام میں بڑے زبردست شیخ مانے گئے ہیں اور ان کی تعریف مشائخ نے خود بے حد فرمائی، حتیٰ کہ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: أَحْمَدُ بْنُ الْحَوَارِيِّ رِيحَانَةُ الشَّامِ ”احمد بن حواری ملک شام کے مہکتے ہوئے پھول ہیں۔“ ان کا کلام بہت بلند ہے ان کے اشارات بغایت لطیف ہیں۔ علم طریقت اور متعدد فنون میں ماہر گذرے ہیں۔ آپ سے صحیح روایات کے ساتھ حضور ﷺ کی احادیث بھی مروی ہیں اور آپ کے زمانہ میں لوگوں کا رجوع آپ کی طرف زیادہ تھا یعنی اپنے قضیہ جھگڑے کا فیصلہ لوگ آپ سے ہی کراتے تھے۔ آپ ابو سلیمان دارانی رحمۃ اللہ علیہ کے مرید تھے اور حضرت سفیان بن عیینہ اور مروان بن معاویہ فرازی کی صحبت میں رہ چکے

ہیں۔ علاوہ اس کے، سیاحت کر کے متعدد مقامات سے ادب و فائدہ حاصل فرمایا۔ آپ سے مروی ہے، آپ نے فرمایا:

الدُّنْيَا مُزْبَلَةٌ وَمَجْمَعُ الْكِلَابِ وَأَقْلُ مِنَ الْكِلَابِ مَنْ عَكَفَ عَلَيْهَا
فَإِنَّ الْكَلْبَ يَأْخُذُ مِنْهَا حَاجَةً وَيُنْصَرِفُ وَالْمُحِبُّ لَهَا لَا يَزُولُ
عَنْهَا وَلَا يَتْرُكُهَا بِحَالٍ.

”دنیا گندگی کا ڈھیر ہے (یعنی کوڑھی ہے) اور کتوں کا جمع رہنے کا مقام، اور ادنیٰ درجہ کا ذلیل کتا وہ ہے جو اس کے گرد پھرتا رہے اور ہوسِ دنیا سے اسے سیری نہ ہو۔ اس لیے کہ کتا مزبلہ پر آ کر اپنی حاجت کے مطابق لیتا ہے اور لوٹ جاتا ہے اور دنیا کا دوست اور حریصِ خالص وہ ہے جو کبھی مالِ دنیا سے سیر نہیں ہوتا۔“

حضرت ابوالحسن احمد رحمۃ اللہ علیہ ان مردانِ خدا سے گزرے ہیں کہ ان کی نظر میں دنیا اتنی حقیر تھی کہ اسے ”مزبلہ“ سے تشبیہ دی اور دنیا دار کو ذلیل ترین کتا بتایا اور اس پر دلیل میں فرمایا کہ کتا اپنا پیٹ بھر کر مزبلہ سے ہٹ جاتا ہے مگر دنیا دار مالِ دنیا سے سیر نہیں ہوتا اس کی حرص میں آخر عمر تک لگا رہتا ہے۔

یہ فرمان آپ کے انقطاعِ دنیا پر خاص نشان ہے اور اہل دنیا سے آپ کے اعراض پر خاص دلیل ہے اور دنیا سے قطع تعلق کر لینا ہے، اہل طریقت کا خوش آئند چمن زار اور میدانِ خوشگوار ہے۔ آپ نے ابتداء میں علم حاصل فرمایا حتیٰ کہ اماموں کے منصبِ جلیل پر پہنچے۔ اس کے بعد اپنی تمام کتابیں اٹھا کر دریا برد فرمادیں اور کہا:

نِعْمَ الدَّلِيلُ أَنْتَ وَأَمَّا الْإِسْتِغَالُ بِالذَّلِيلِ بَعْدَ الْوُصُولِ مَحَالٌ.

”میرے لیے بہترین دلیل اور میرا راہبر تو ہے اور جب تو میرے لیے کافی ہے (تو پاءِ استدلالیان چوین بود) کے بموجب ”إِسْتِغَالٌ بِالذَّلِيلِ وَاصِلٌ إِلَى اللَّهِ“ کے لیے محال ہے۔“ اس لیے دلیل کی اس وقت حاجت ہے جبکہ مرید راستہ میں ہو اور جب بارگاہ تک پیش ہو چکا ہو تو دیدار کا جلوہ مل گیا۔ اب بارگاہ اور راہ دونوں کی قدر و قیمت نہ رہی۔ مشائخِ کرام فرماتے ہیں کہ یہ فعل آپ کا بحالتِ سکر ہوا تھا اور یہ کلام بھی سکر یہ ہے۔

اس لیے کہ اس راہ میں جو یہ کہے ”وَصَلْتُ“ (میں مل گیا)، فَقَدْ فَصَلَ (وہ یقیناً علیحدہ ہو گیا) کیونکہ اس بارگاہ تک خود پہنچنا اس بارگاہ سے دور ہونے کے مترادف ہے۔ تو ہر شغل، مشغل ہی

ہے اور ہر فراغت، فراغت ہی ہے اور ہر اصول مشاغل وصول میں اپنے وجود سے نیست ہوتا ہے۔

اس لیے کہ وصل و فصل اور مشغل و فراغت اور اصول و وصول یہ سب بندہ کی صفت ہیں۔ فصل و وصل اور عنایت الہی بارگاہِ احدیت سے ازل میں اس کے انتخاب کے موافق ہو چکی ہوتی ہے اور بندہ اپنی قوتِ ارادی سے کسی طرح اس مقام کو حاصل نہیں کر سکتا۔

اور عنایت الہی اور اس کے ازلی مقرر شدہ حصہ کے وصول کے لیے اس کا کوئی اصول، اصول نہیں اور نہ ملازمت اور ارادہ قرب و مجاورت اور مجاہدہ اس کا قدیم بن سکتے ہیں تو عاشق کے لیے یہ دعویٰ روا ہی نہیں ہو سکتا۔

ہاں! یہ ضرور ہے کہ وصل ذات بندہ کی عزت کا موجب ہے اور فصل و ہجر بندہ کی ذلت و اہانت کا سبب۔ اور صفاتِ قدیمہ میں تغیر جائز نہیں۔

میری رائے ہے کہ (یعنی حضرت علی بن عثمان جلابی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں) ممکن ہے ”وصول الی اللہ“ کے لفظ سے اس شیخِ کامل کی مراد خدا کا راستہ ہو، اس لیے کہ کتابوں میں خدا کا راستہ ہے، تو جب راستہ واضح ہو گیا تو کتاب و عبارت منقطع ہو گئی۔ اس لیے کہ عبارات کتب میں وہ فقرہ نہیں جو مشاہدہ میں ہے۔ عبارت تو مقصود کو غائبانہ ہی سمجھا سکتی ہے اور جب مشاہدہ حاصل ہو گیا تو عبارت گم ہو گئی اور پھر مشاہدہ و معرفت کے بعد زبان بھی عبارت کی طرف سے گونگی ہو جاتی ہے۔ تو جب عبارت کی طرف سے زبان ہی گنگ ہو تو کتاب کا ضائع کرنا ہی بہتر ہے۔

حضرت ابو الحسن رحمۃ اللہ علیہ کے علاوہ اور بزرگوں نے بھی ایسا کیا منجملہ ان کے۔ حضرت ابوسعید فضل اللہ، محمد مہمینی کے صاحبزادہ ہیں، جب ان پر یہ کیفِ شہودی طاری ہوا، انہوں نے بھی اپنی تمام کتابیں دریا برد کر دیں۔

اور محض رسمی لوگوں نے مصنوعی صوفی بن کر اپنی کاہلی اور نااہلی کی وجہ میں ان مردانِ خدا کی تقلید کی، مگر وہ بے حاصل بات ہے۔ ان خاصانِ خدا نے جو ایسا کیا وہ محض تعلق دنیاوی کے انقطاع کی غرض سے کیا اور توجہ الی الغیر کو ترک فرمایا ماسوی اللہ سے اپنے قلب منور کو فارغ غرض سے ان کا یہ فعل ہوا۔

اور یہ حالت جب تک ازلی سکر اور ازلی دانش و بینش و دیعت نہ ہو، کبھی نہیں ہو سکتی اور اس حالت کا تعلق کیفیت سکر اور ابتداء عشق کی آگ میں ہے، منتہی کو اس سے یوں تعلق نہیں ہوتا کہ وہ متمکن بالمشاہدہ ہوتا ہے اور متمکن کے لیے کونین بھی حجاب نہیں بن سکتے۔ اس لیے کہ ان کا دل علائق سے بالکل منقطع ہو جاتا ہے۔ تو جس پر کونین حاجب نہ ہو سکے اس پر ایک کاغذ کی کیا حیثیت

جو حجاب بن سکے (اور اگر یہ کہا جائے کہ کتابیں دھو ڈالیں) تو اس سے مراد نفی عبارت ہو سکتی ہے اس لیے کہ جب حقیقت معنی حاصل ہو جائے تو عبارت بے کار ہے، جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں۔ تو بہترین بات یہ ہے کہ عبارت خود بخود زبان سے منفی ہو۔

اور جو عبارت کتاب میں لکھی ہے وہ زبان پر جاری ہے اور عبارت، عبارت سے اولیٰ نہیں ہوتی۔ میرا خیال ہے کہ شیخ ابوالحسن احمد بن حواری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے غلبہ حال میں کچھ لکھا ہوگا مگر جب اس کے سننے والے نہ پائے تو اسے دریا برد کر دیا ہوگا اور یہ جو فرمایا کہ تو بہترین میری دلیل اور میرا راہنما ہے، تو جب مراد مرید اس ذات سے پوری ہو گئی تو ماسوی اللہ سے اس کی مشغولی محال ہے۔

اس امر میں یہ بھی احتمال ہے کہ آپ کے پاس بہت سی کتابیں جمع ہو گئی ہوں جو آپ کو اپنے اور ادو اعمال سے روکتی ہوں اور مشغول کرتی ہوں تو آپ نے مشغول غیر اللہ کو اٹھا ڈالا ہو اور فراغت قلبی غیر سے حاصل کی ہو اور ترک عبارت کے لیے فرمایا ہو۔ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ

ابو حامد حضرت احمد بن خضرو یہ البلخی رحمۃ اللہ علیہ:

انہیں میں سے سرہنگ جو ان مردان، آفتاب خراسان حضرت ابو حامد احمد بن خضرو یہ البلخی رضی اللہ عنہ ہیں۔ آپ اپنے حال میں بہت بلند گزرے ہیں اور شرافت وقت میں مخصوص ہیں اور اپنے زمانہ کے مقتداء قوم اور مرجع خواص و عوام تھے اور آپ کا طریقہ ملامتیہ تھا۔ آپ کا لباس ہمیشہ سپاہیانہ ہوتا تھا اور آپ کی بیوی صاحبہ مسماة فاطمہ، امیر بلخ کی صاحبزادی تھیں رحمہما اللہ۔ یہ بھی طریقت میں عظیم الشان مرتبہ رکھتی تھیں اور امیر بلخ کی صاحبزادی یعنی بیگمات شاہی سے تھیں۔ جب ان کے دل میں نور عرفان من جانب اللہ پیدا ہوا، حضرت احمد خضرو یہ "کی خدمت میں آدمی بھیجا اور عرض کرایا کہ آپ مجھے میرے والد سے طلب فرمائیں۔ آپ نے التفات نہ کیا دوبارہ پھر آدمی بھیجا اور کہلایا کہ حضور! میں آپ کو اس وجہ میں چاہتی ہوں کہ آپ راہ برحق ہیں، نہ اس لیے کہ آپ کو جواں حسین دیکھ کر آپ کی طرف مائل ہوں، راہ راست سے ہٹا دینے والے بہت ہیں، مجھے راہبر کی تلاش ہے، لہذا آپ پیام دیں۔

آخرش آپ نے امیر بلخ کے یہاں پیام دیا۔ امیر بلخ نے ایک مرد خدا، عارف کامل سے اپنی صاحبزادی کو نامزد کرنا اپنے لیے عین سعادت جانا اور فوراً رشتہ کر دیا۔ بعد شادی حضرت فاطمہ بنت امیر بلخ نے آپ کی خدمت میں آتے ہی مشاغل دنیاویہ ترک فرما دیئے اور گوشہ نشین ہو گئیں۔ آپ کے خلوت خانہ خاص میں صرف حضرت احمد اور حضرت فاطمہ ہی رہتے۔

حتیٰ کہ ایک بار حضرت احمد بن خضروییہ رحمۃ اللہ علیہ کو حضرت بایزید بسطامی رضی اللہ عنہ کی زیارت کا شوق ہوا۔ حضرت فاطمہ رحمۃ اللہ علیہا بھی حضرت بایزید کے دربار میں ہمراہ حاضر ہوئیں۔ جب حضرت بایزید کے سامنے دونوں آگئے، حضرت فاطمہ نے نقاب ہٹا دیا اور حضرت بایزید رضی اللہ عنہ کے ساتھ بے حجابانہ گفتگو شروع کر دی۔ حضرت احمد خضروییہ ”کو ان کی اس حرکت پر تعجب ہوا اور غیرت زوجیت آپ پر مستولی ہوئی۔ فرمانے لگے: فاطمہ! جس بے حجابی سے تم بایزید کے سامنے باتیں کر رہی ہو اس کی وجہ مجھے بھی معلوم ہونی چاہیے۔

حضرت فاطمہ نے فرمایا: احمد! تم محرم طبیعت ہو اور بایزید محرم طریقت، تمہارے ذریعہ میری آتش حرص و ہویٰ کا علاج ہوتا ہے اور ان کے ذریعہ خداری ہوتی ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ بایزید مجھ سے بے نیاز ہے اور تم میرے محتاج ہو۔

غرضیکہ حضرت فاطمہ ہمیشہ حضرت بایزید کے سامنے بے حجاب رہتیں اور نہایت بے تکلفی سے کلام فرماتیں۔ ایک روز حضرت بایزید کی نظر حضرت فاطمہ کے ہاتھ پر پڑی دیکھا مہندی لگی ہوئی ہے۔ فرمایا: فاطمہ! ہاتھوں میں مہندی لگا رکھی ہے۔ آپ نے فرمایا بایزید! اب تک کہ تمہاری نظر میرے ہاتھ پر نہ پڑی تھی، میرا آپ کے ساتھ رابطہ بے حجاب تھا، اب جبکہ تمہاری نظر مجھ پر پڑنے لگی اب آپ سے بے حجابی حرام ہے۔ بس اسی روز واپس ہو گئیں اور نیشاپور تشریف لا کر قیام فرمایا۔ اہل نیشاپور آپ کے ساتھ نہایت خوش اعتقاد تھے اور مشائخ نیشاپور بھی آپ کے یہاں زانوئے عقیدت تہہ فرماتے تھے۔

ایک بار کا واقعہ ہے کہ حضرت یحییٰ بن معاذ رازی نیشاپور آئے۔ بلخ جانے کا عزم تھا۔ حضرت احمد رحمۃ اللہ علیہ نے دعوت کرنی چاہی۔ حضرت فاطمہ سے مشورہ کیا کہ دعوت یحییٰ میں کیا کیا کھانے ہوں اور کیا کیا سامان مہیا ہونا چاہیے۔ آپ نے فرمایا: اتنی گائیں، اتنی بکریاں، اتنا سامان تزئین، اتنے چراغ، اتنی قسم کے عطر اور ان تمام سامانوں کے ساتھ بیس گدھے بھی ذبح ہونے چاہئیں۔ حضرت احمد نے فرمایا یہ بیس گدھوں کے گوشت سے کیا مطلب ہے؟ فرمایا جب کوئی صاحب کرم صاحب ثروت کے گھر جاتا ہے تو محلہ کے لوگوں کے ساتھ محلہ کے کتوں کے لیے بھی کچھ ہونا چاہیے۔

حضرت بایزید بسطامی رضی اللہ عنہ نے آپ کی منقبت میں فرمایا:

مَنْ أَرَادَ أَنْ يُنْظَرَ إِلَى رَجُلٍ مِنَ الرِّجَالِ مَخْبُوءَةً تَحْتَ لِبَاسِ
النِّسْوَانِ فَلْيَنْظُرْ إِلَى فَاطِمَةَ رَحِمَهَا اللَّهُ.

”جو چاہے کہ کسی مرد کو عورت کے لباس میں مخفی دیکھے اس سے کہو کہ وہ فاطمہ کو دیکھ لے۔“

اور حضرت ابو حفص صلاً ورحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

لَوْلَا أَحْمَدُ بْنُ خَضْرٍ وَبِهِ مَا ظَهَرَتِ الْفُتُوَّةُ

”اگر احمد بن خضرو یہ نہ ہوتے تو دنیا میں مروت و جوانمردی پیدا نہ ہوتی۔“

آپ کے بڑے بلند کلام اور نہایت مہذب تخیل ہیں اور آپ کی تصانیف ہر فن میں اعمال

وآداب و نکات میں مشہور و معروف ہیں۔

آپ سے ایک روایت ہے کہ آپ نے فرمایا:

الطَّرِيقُ وَاصِحٌ وَالْحَقُّ لَائِحٌ وَالرَّاعِي قَدْ أَسْمَعُ فَمَا الْمُتَحَيِّرُ

بَعْدَهَا إِلَّا مِنَ الْأَعْمَى.

”راستہ کھلا ہے اور حق روشن ہے اور نگہبان سننے والا، پھر تھیرو ہی کر سکتا ہے جو

اندھا ہو۔“

یعنی اب راستہ ڈھونڈنا محض غلطی ہے اس لیے کہ راہِ حق مثل آفتاب کے تابان ہے بلکہ

انسان اپنے آپ کو ڈھونڈے کہ وہ کہاں ہے اور جب اپنے کو پالے تو راستہ پر آ جائے کیونکہ حق اس سے بھی زیادہ اظہر ہے کہ طالب اس کی طلب کرے۔

آپ سے ہی مروی ہے کہ فرمایا:

أُسْتُرُّ عِزًّا فَقَرِيكٌ.

”فقیری کے منصبِ جلیل کو پوشیدہ رکھ۔“

یعنی مخلوق کے آگے نہ کہتا پھر کہ میں درویش ہوں تاکہ تیرا راز نہ کھل جائے اس لیے کہ

یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بڑی زبردست بخشش ہے۔

آپ ہی سے مروی ہے کہ فرمایا ایک درویش نے رمضان المبارک میں ایک متمول کی

دعوت کر دی اور ان کے گھر میں ایک روٹی کے سوا کچھ نہ تھا۔ جب وہ دولت مند واپس ہوا تو اس نے

ایک سنہری تھیلی سکھ کی ان کی خدمت میں بھیج دی۔ آپ نے اس تھیلی کو واپس کر دیا اور کہلا دیا کہ یہ

تھیلی اسے دے جو اپنا راز تیرے جیسے کے آگے ظاہر کر دے یا تیرے جیسے دولت مند کو اپنی عزت

نقر سے بلند جانے۔

یہ ان کے سچے فقر کی دلیل ہے۔ وَاللَّهُ تَعَالَى أَعْلَمُ

حضرت عسکری بن الحسین رضی اللہ عنہ:

انہیں میں سے امام متوکلان، برگزیدہ اہل زمان، ابوتراب حضرت عسکری بن الحسین رضی اللہ عنہ ہیں۔ مشائخ خراسان میں اجلہ سادات میں مشہور ہیں اور جوانمردی و زہد و ورع میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ آپ کی بے حد کرامتیں ہیں اور بہت زیادہ عجائبات ایسے ہیں جو جنگلوں میں دیکھے گئے۔

سیاح متصوفین میں سے آپ تھے اور ہمیشہ جنگل میں خلوت نشیں رہا کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی وفات بھی بصرہ کے ایسے جنگل میں ہوئی کہ بعد وفات کئی سال بعد ایک قافلہ پہنچا تو آپ کی لاش مبارک کو ایک پیر پر قبلہ رو کھڑے دیکھا۔ لاش مبارک بے جان تھی اور خشک ہو چکی تھی اور آپ کے پاس سامنے چمڑے کا کؤہ یعنی کھنول چرمی رکھا ہوا تھا اور عصا ہاتھ میں تھا لیکن جنگل کے درندے آپ کی لاش مبارک کے پاس نہ پھٹکے اور اتنی مدت تک پاء مبارک سے لاش نہ گری۔ آپ سے مروی ہے کہ فرمایا:

الْفَقِيرُ قُوْتُهُ مَا وَجَدَ وَ لِبَاسُهُ مَا سَتَرَ وَ مَسْكَنُهُ حَيْثُ نَزَلَ .

”فقیر کی غذا وہی ہے جو مل جائے اسی کو اختیار کرے، اور لباس وہ ہے جس سے بدن ڈھانپ لے، اس میں اپنا تصرف نہ کرے اور اس کے مقام کے لیے وہی جگہ ہے جہاں چلتے چلتے ٹھہر جائے اپنے لیے کوئی خاص جگہ نہ بنائے۔“

اس لیے کہ ان تین چیزوں میں تصرف کرنا غیر اللہ ہونا ہے اور درحقیقت تمام عالم ان ہی تین چیزوں کی بلاء میں مبتلا ہے (اور یہ جو کچھ تین چیزوں کا ذکر فقیر کا ہوا) یہ بھی اسباب ظاہری کے لحاظ سے ہے، ورنہ درحقیقت غذائے درویش وجد ہے اور لباس درویش تقویٰ ہے اور مسکن درویش مقام غیب۔ اس لیے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿وَ اَنْ لَّوِ اسْتَقَامُوا عَلٰى الطَّرِيْقَةِ لَاسْقَيْنَهُمْ مَّاءً غَدَقًا﴾ (۱)

”اور اگر یہ لوگ صراط مستقیم پر قائم رہتے تو ہم انہیں کافی پانی پلاتے۔“

اور فرمایا:

﴿وَرِبِّشَاءٍ وَّلِيَّاسُ التَّقْوٰى ذٰلِكَ خَيْرٌ﴾ (۲)

”اور باعث زینت ہے اور پرہیزگاری کا لباس سب سے بہتر ہے۔“

حضور ﷺ نے فرمایا: الْفَقْرُ وَ طُنُّ الْغَيْبِ ”فقر و طن غیب ہے۔“ تو جب اکل و

شرب فقیر، شراب دیدار یار ہے اور لباس فقیر، تقویٰ اور مجاہدہ اور وطن فقیر مقام غیب اور وصل کے مقام کا اظہار چاہنا فقر کے طریقہ کا کھلا راستہ ہے اور اس کے عمل روشن ہیں اور یہ فقیر کا درجہ کمال ہے۔

حضرت ابو زکریا یحییٰ بن معاذ رازی رضی اللہ عنہ:

انہیں میں سے لسانِ محبت و وفا، زمینِ طریقت و ولا حضرت ابو زکریا یحییٰ بن معاذ رازی رضی اللہ عنہ ہیں۔ آپ نہایت بلند حال اور نیک سیرت بزرگ گذرے ہیں اور آپ کا مقام رجاہ میں میدانِ حقیقت کے اندر پورا قدم راسخ تھا۔ حتیٰ کہ حسن بصری رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے دو یحییٰ پیدا فرمائے ہیں: ایک نبیوں میں اور ایک ولیوں میں۔ انبیاء میں حضرت یحییٰ بن زکریا علیہ السلام تھے کہ آپ کو طریقِ خوف اس درجہ عطا ہوا کہ تمام مدعیانِ افراطِ خوف کی وجہ میں اپنی کامیابی سے ناامید ہو گئے۔

اور حضرت یحییٰ بن معاذ رضی اللہ عنہ کو طریقِ رجاہ و امید اس درجہ عطا ہوا کہ تمام مدعیوں کے ہاتھ امید سے بھر گئے۔ کسی نے کہا حضرت یحییٰ بن زکریا علیہما السلام کا حال تو معلوم ہے لیکن یہ یحییٰ کون ہیں اور ان کا حال کیا ہے؟ تو جواب دیا گیا کہ یہ یحییٰ، جہالت کی طرف ہرگز نہیں تھے اور آپ سے کبھی کبیرہ گناہ سرزد نہیں ہوا اور اعمال و عبادت میں پوری سعی فرماتے تھے۔ بلکہ ایسی جدوجہد کرتے تھے کہ ان کی سی کسی میں محنت کرنے کی تاب و طاقت نہیں۔

ان سے کسی نے فرمایا کہ یحییٰ! تمہارا مقام مقامِ رجاہ ہے اور تمہارا عمل عملِ خائفان ہے۔ آپ نے فرمایا صاحبزادے اچھی طرح یاد رکھو! ترکِ عبودیت ضلالت ہے اور خوف و رجاہ ستونِ ایمان ہیں۔

یہ محال ہے کہ کوئی ارکانِ ایمانیہ کی حفاظت میں سعی کرتا ہو اگر وہ خوف والا اس خوف سے عبادت کرتا ہے کہ وہ مقامِ تقرب سے کہیں قطع نہ ہو جائے اور رجاہ والا با امید وصل جمیل عبادت کرتا ہے اور جب تک عبودیت و عبادت نہ ہو تو خوف صحیح ہے نہ رجاہ، اور جب عبادت حاصل ہے تو دونوں یعنی خوف و رجاہ عبادت ہیں اور جہاں عبادت نہیں وہاں عبارت اور لفظ امید و رجاہ کوئی فائدہ نہیں دے سکتے۔

آپ کی تصانیف بہت ہیں اور نکات و اشارات عجائب و غرائب کافی۔ خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم کے بعد جو سب سے پہلے مشائخ کرام میں سے برسرِ ممبر جلوہ افروز ہوئے وہ بھی ابو زکریا حضرت یحییٰ بن معاذ ہیں اور میں ان کے کلام کو بہت پسند کرتا ہوں اس لیے کہ ان کا کلام

میرا رفق طبع ہے اور سماعت میں نہایت لذیذ اور اصلیت میں بحد غایت دقیق اور عبارت کی حیثیت سے نہایت مفید۔

آپ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا:

الدُّنْيَا دَارُ الْأَشْغَالِ وَالْآخِرَةُ دَارُ الْأَهْوَالِ وَلَا يَزَالُ الْعَبْدُ بَيْنَ الْأَشْغَالِ وَالْأَهْوَالِ حَتَّى يَسْتَقِرَّ بِهِ الْقَرَارُ إِمَّا إِلَى الْجَنَّةِ وَإِمَّا إِلَى النَّارِ.

”دنیا جائے اشغال و اعمال ہے اور آخرت مقام خوف و ہول اور بندہ ہمیشہ اعمال اور خوف میں رہتا ہے یہاں تک کہ اس کے ٹھہرنے کا مقام یا جنت ہو جاتی ہے یا جہنم بن جاتا ہے کہ اس میں پڑا روتا رہے۔“

بہت بختا اور خوش وقت وہ ولی ہے کہ اعمال و اشغال اور خوف سے مامون ہو کر اپنی ہمت کو دونوں سے جدا کر کے اپنے رب حقیقی سے پیوستہ ہو چکا ہو۔

آپ اپنے خیال میں غنا کو فقر پر بزرگ جانتے تھے اور جب مقام ”رے“ میں آپ پر بہت قرض ہو گیا تو خراسان کا قصد فرمایا۔ جب بلخ پہنچے تو اہل بلخ نے آپ کو روکا تا کہ کچھ وعظ و پند سنیں۔ غرضیکہ یہاں کے لوگوں نے آپ کو ایک لاکھ درہم نذر کیے۔ جب آپ یہاں سے واپس ہوئے تو راستہ میں چوروں نے سب لوٹ لیے اور آپ تنہا نیشاپور تشریف لے آئے۔ آپ کی وفات نیشاپور میں ہوئی لوگوں میں آپ کی خاص عزت تھی۔ وَاللَّهُ تَعَالَى أَعْلَمُ

حضرت عمرو بن سالم نیشاپوری حدادی رحمۃ اللہ علیہ:

انہیں میں سے شیخ المشائخ خراسان، نادری زمین و زمان ابو حفص حضرت عمرو بن سالم نیشاپوری حدادی رضی اللہ عنہ ہیں۔ قوم کے بڑے بزرگ اور سادات سے تھے۔ مشائخین وقت کے بڑے مدوح گزرے ہیں۔ حضرت ابو عبد اللہ دیوروی کے ہم نشین اور حضرت احمد خضرویہ کے رفق خاص ہیں۔ کرمان سے شاہ شجاع ان کی زیارت کے لیے آئے اور آپ اس وقت بغداد میں تشریف فرما تھے۔ مریدوں نے آپس میں کہا سخت افسوس ہے کہ شیخ الشیوخ خراسان سے یہاں تشریف لائیں اور ہم ان کے کلام فیض ترجمان سے استفادہ نہ کریں، آپ کے لیے ایک ترجمان تلاش کیا جائے (اس لیے کہ عام طور پر یہ سب جانتے تھے کہ آپ کو عربی زبان نہیں آتی)۔

جب آپ مسجد شوینیزیہ میں تشریف لائے تو بہت سے مشائخ یہاں جمع ہوئے۔ حضرت جنید بغدادی رضی اللہ عنہ بھی تشریف لائے۔ آپ نے تمام مشائخ کے ساتھ ایسی فصیح و بلیغ عربی

زبان میں گفتگو فرمائی کہ حاضرین جلسہ آپ کے بلاغت کے مقابلہ سے عاجز آگئے۔ آپ سے سوال کیا گیا، ”مَا الْفُتُوَّةُ؟“ (حضرت فتوت کیا چیز ہے؟) آپ نے فرمایا تمام مشائخ تشریف فرما ہیں اور سب یکے بعد دیگرے تعریف فتوت کریں۔

چنانچہ حضرت جنید بغدادی رضی اللہ عنہ پہلے شروع ہوئے اور فرمایا:

الْفُتُوَّةُ عِنْدِي تَرْكُ الرُّوِيَةِ وَاسْقَاطُ النِّسْبَةِ.

”میرے نزدیک فتوت یہ ہے کہ انسان اپنی فتوت یعنی جو انمردی کو نہ دیکھے اور جو کچھ کر رہا ہے اس فعل کو اپنی طرف منسوب نہ کرے اور یوں نہ کہے کہ یہ میں کرتا ہوں۔“

حضرت ابو حفص رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

مَا أَحْسَنَ مَا قَالَهُ الشَّيْخُ ”نَهَايَةُ اِحْجَابِ بَيَانِ فَرَمَايَا شَيْخِ نِي“:

وَلَكِنُّ الْفُتُوَّةُ عِنْدِي اِدَاءُ الْاِنْصَافِ وَتَرْكُ مُطَالَبَةِ الْاِنْصَافِ.

”لیکن میرے نزدیک فتوت نام ہے انصاف کا حق ادا کرنا اور اپنے لیے طلب انصاف کو ترک کرنا۔“

حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

قَوْمُوا اَصْحَابَنَا فَقَدْ زَادَ اَبُو حَفْصٍ عَلٰى اَدَمَ وَذُرِّيَّتِهِ.

”اے میرے یارو! کھڑے ہو جاؤ، ابو حفص جو انمردی میں آدم (علیہ السلام) اور آدم کی اولاد سے بڑھ گیا۔“

آپ کی ابتداء توبہ کا حال یوں بیان کرتے ہیں کہ آپ ایک لوٹڈی پر فریفتہ ہو گئے تھے۔ لوگوں نے آپ سے کہا کہ شہر نیشاپور میں ایک جادوگر یہودی ہے اس کے ذریعہ سے تمہارا مقصد حل ہو جائے گا۔ حضرت ابو حفص اس کے پاس آئے اور سب حال سنایا۔ یہودی نے کہا چالیس روز کے لیے نماز چھوڑنی ہوگی اور اپنے تمام ذکر و اذکار نیک نیتی کے اعمال دل اور زبان سے ترک کرنے ہوں گے تو میں جو افسوس کروں گا وہ تیری کامیابی میں پورا ہوگا۔

آپ نے ایسا ہی کیا۔ جب چالیس دن گزر گئے یہودی نے اپنا منتر کیا لیکن آپ کی مراد پوری نہ ہوئی تو یہودی کہنے لگا آپ نے تمام باتیں میری ہدایت کے موافق پوری نہیں کیں، آپ کچھ نہ کچھ کرتے رہے ہیں۔

حضرت ابو حفصؒ نے فرمایا: اپنے اعمال ظاہری میں نے سب ترک کر دیئے لیکن میرا ضمیر جو ملامت کرتا رہا وہ علیحدہ بات ہے یا ایک روز جس راستہ سے میں آ رہا تھا وہاں ایک پتھر پڑا ہوا تھا اسے میں نے راستہ سے علیحدہ کر دیا تھا تا کہ اس سے کسی کو ٹھوکر نہ لگے۔

یہودی نے کہا ابو حفصؒ! لوگوں کی ایذا رساں چیز کو تم نے ہٹایا، اور اپنے رب کو غضبناک کیا اور چالیس روز اس کا حکم ضائع کر دیا۔ اگر تو اپنے رب کو غضبناک نہ کرتا تو وہ تجھے اس لوٹڈی کی مہاجرت کے رنج سے نجات دے دیتا۔

حضرت ابو حفص رحمۃ اللہ علیہ نے اسی وقت توبہ کی اور وہ یہودی بھی مشرف باسلام ہو گیا۔ آپ لوہار کا کام کرتے تھے، آپ مقام باورد گئے اور حضرت عبداللہ باوردی رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت کی اور ان کے دستِ حق پرست پر بیعت ہو گئے۔ جب واپس نیشاپور تشریف لائے، بازار میں ایک نابینا کو دیکھا کہ تلاوتِ کلام پاک کر رہا ہے، آپ اپنی دکان پر بیٹھے ہوئے اس کی تلاوت سن رہے تھے کہ آپ پر وجد طاری ہوا اور حالتِ جذب میں بغیر سدا سے کے، سرخ لوہا بھٹی سے ہاتھ میں لے لیا۔ جب شاگردوں نے یہ حال دیکھا تو حواس باختہ ہو گئے۔ جب آپ کی کیفیت وجدانی فرو ہو گئی اور ہوش میں آئے تو کسبِ معاش سے ہاتھ اٹھا لیا اور دکان چھوڑ دی۔

آپؒ سے مروی ہے کہ آپؒ نے فرمایا:

تَرَكَتُ الْعَمَلَ ثُمَّ رَجَعْتُ إِلَيْهِ ثُمَّ تَرَكَتُ الْعَمَلَ فَلَمْ أَرْجِعْ إِلَيْهِ.

”میں نے کسبِ معاش چھوڑا، پھر اس کی طرف رجوع ہوا، پھر کسب نے مجھے

چھوڑا تو اب میرا اس کی طرف رجوع نہیں۔“

اس لیے کہ جو چیز بندہ اپنے ارادہ سے ترک کرے وہ ترک کرنا بہتر نہیں، اس لیے کہ یہ صحیح اصول ہے کہ ہر کسب محلِ آفت ہے اور یہ بہتر نہیں بلکہ بہتر یہ ہے کہ بلا قصد و ارادہ غیب سے وہ چیز ترک ہو اور ہر موقع پر اختیار بندہ اس سے متصل نہ رہے اس لیے کہ لطیفہ حقیقت اس ارادہ کے ساتھ زائل ہو جاتا ہے۔

تو کسی کا ترک و اخذ بندہ کی طرف سے بالکل درست نہیں اس لیے کہ عطا و زوال در حقیقت منجانب اللہ ہے تو پھر جو عطا آئے تو حق کی طرف سے اسے لے اور جب زوال آئے تو ترک کر دے۔

جب اس حال میں صوفی ہو جاتا ہے تو وجود اخذ و ترک منجانب اللہ ہو جاتا ہے نہ یہ کہ بندہ کی طرف سے ہو کہ بندہ اپنی کوشش سے اس کا لینے والا بنے یا دفع کرنے والا۔ تو اگر ہزار سال

مرید قبول حق میں کوشاں رہے تو اتنا نہیں ہو سکتا کہ ایک لمحہ بھی اس کا قبولیت حق کے ساتھ مانا جائے اس لیے اقبال لایزال قبولیت ازلی کے ساتھ بستہ ہے اور سرورِ سرمدی سعادت سابقہ ازلیہ سے پیوستہ اور بندہ کو اخلاص و خلوص کے سوا چارہ نہیں، تو وہ بندہ محبوب بارگاہ ہے جو تمام اسبابِ مسبب کی مشیت پر چھوڑ دے۔

حضرت ابوصالح حمدون رحمۃ اللہ علیہ:

انہیں میں سے قدوہ اہل ملامت حضرت ابوصالح حمدون ابن احمد بن عمار القصار رضی اللہ عنہ ہیں۔ قدماء مشائخ میں متورع اور فقہ کے اندر خاص درجہ کے مالک تھے، آپ کا سلسلہ نوری تھا اور حضرت ابوتراب نخشی رحمۃ اللہ علیہ کے مرید تھے اور حضرت علی نصر آبادی کے مقربوں میں سے تھے۔ آپ کے نہایت دقیق رموز اور اعمال میں آپ کا کلام دقیق مشہور ہے اور مجاہدات میں اتنے منصب بلند پر تھے کہ نیشاپور کے ائمہ و مشائخ نے آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی کہ آپ ممبر پر جلوہ فرما ہوں اور لوگوں کو وعظ کریں تاکہ آپ کے کلام سے لوگوں کے دلوں میں فائدہ پہنچے۔ آپ نے فرمایا مجھے وعظ کہنا روا نہیں ہے۔ لوگوں نے کہا کیوں؟ فرمایا اس لیے کہ ابھی میرا دل دنیا اور جاہ کے ساتھ وابستہ ہے۔ میرا کلام بے فائدہ ہے اور لوگوں کے دلوں پر اثر نہیں کرے گا اور جو کلام دلوں پر اثر پذیر نہ ہو وہ علم کے استخفاف کا موجب ہے اور شریعتِ مطہرہ کا استہزاء کرنا ہے۔ کلام کرنا اس کے لیے مسلم ہے کہ خاموشی اس کی دین میں داخل ہو اور جب بولے تو جتنا خلل ہو مٹ جائے۔ آپ سے پوچھا گیا کہ سخن سلف صالحین کس لیے دلوں کے واسطے بہت مفید ہیں آج کل کی باتیں کرنے سے۔ آپ نے فرمایا:

لَا نَهُمْ تَكَلَّمُوا لِعِزِّ الْأِسْلَامِ وَ نَجَاةِ النَّفُوسِ وَ رِضَاءِ الرَّحْمَنِ
وَ نَحْنُ نَتَكَلَّمُ لِعِزِّ النَّفْسِ وَ طَلَبِ الدُّنْيَا وَ قُبُولِ الْخَلْقِ.

”اس لیے کہ وہ کلام فرماتے تھے اعزازِ اسلام کے لیے اور نفسوں سے نجات کے لیے اور رضاءِ الہی حاصل کرنے کو اور ہم بولتے ہیں نفس کے اعزاز کی خاطر اور طلبِ دنیا کے لیے اور لوگوں میں مقبولیت پیدا ہونے کی غرض سے۔“

تو جو کلام موافقتِ حق کے لیے ہو وہ حق کی مدد کے ساتھ ہوتا ہے، اس میں رعب و داب ہوتا ہے اور اشرار پر اثر کرتا ہے اور جو کلام اپنی موافقت کے لیے ہو اس میں ذلت و خواری ہے اور اس کا فائدہ کچھ نہیں، ایسے بولنے سے نہ بولنا بہتر ہے اس لیے کہ ایسا بولنے والا اپنے لفظوں سے خود بریگانہ ہوتا ہے۔

حضرت منصور بن عمار رحمۃ اللہ علیہ:

انہیں میں سے شیخ باوقار، مشرف خواطر و اسرار حضرت ابوسریٰ منصور بن عمار رضی اللہ عنہ ہیں۔ اکابر مشائخ سے گزرے ہیں اور اہل عراق کے ہم محبت اور اہل خراساں میں مقبول الکلام واعظ تھے۔ آپ کے بیان لطیف کے متعلق یہی کہا جا سکتا ہے کہ اثنائے تقریر میں فنون و علوم و روایات درایات، احکام و معاملات کے دریا موجزن ہوتے تھے بلکہ بعض اہل تصوف نے تو آپ کی تعریف میں بہت ہی مبالغہ کیا ہے۔

آپ کے ذکر میں ہے کہ آپ نے فرمایا:

سُبْحَانَ مَنْ جَعَلَ قُلُوبَ الْعَارِفِينَ أَوْعِيَةَ الذِّكْرِ وَ قُلُوبَ الزَّاهِدِينَ
أَوْعِيَةَ التَّوَكُّلِ وَ قُلُوبَ الْمُتَوَكِّلِينَ أَوْعِيَةَ الرِّضَا وَ قُلُوبَ الْفُقَرَاءِ
أَوْعِيَةَ الْقَنَاعَةِ وَ قُلُوبَ أَهْلِ الدُّنْيَا أَوْعِيَةَ الطَّمَعِ .

”اس کے وجہ منیر کو پاکی ہے جس نے عرفاء کے قلوب کو ذکر کا برتن بنایا اور زاہدوں کے دلوں کو ظرف توکل کیا اور متوکلین کے قلوب کو طبع رضاء بنا دیا اور درویشوں کے ضمیر کو محل قناعت قرار دیا اور دنیا داروں کے دلوں کو طمع کا برتن کیا۔“

اس میں عبرت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر عضو کو حساس بنایا اور اس میں معنی متجانس رکھے، چنانچہ ہاتھوں کو محل بطش و گرفت بنایا، پیروں کو چلنے کے کام کا آلہ قرار دیا، آنکھوں کو دیکھنے کے لیے پیدا کیا، کانوں کو سماعت کے واسطے مخصوص بنایا اور زبان کو بولنے کے لیے رکھا۔

اور ان اعضاء کے اسماء خلقی میں اور وہ افعال جو ان سے ظاہر ہوتے ہیں، ان میں کوئی زیادہ خلاف نہیں رکھا بلکہ ہر جگہ ہر عضو ایک کا اپنے کام میں یکساں ہی ہے مگر دل ایک ایسی چیز پیدا فرمائی کہ ہر ایک کے اندر وہی دل ہے مگر اس میں مختلف ارادے اور مختلف خواہشات ہیں۔ ایک دل ظرف عرفان بنایا تو ایک دل طبع ضلالت کر دیا۔ ایک دل میں قناعت ڈال دی تو ایک دل کو اوجیہ سمعہ و ریا کر دیا۔ تو معلوم ہوا کہ مخلوقات میں سے وہ مخلوق جس سے خلاق عالم کی صنعت کمال تعجب نیز ظاہر ہو، سوادل کے نظر نہیں آتی۔

آپ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا:

النَّاسُ رَجُلَانِ عَارِفٌ بِنَفْسِهِ فَشُغْلُهُ فِي الْمُجَاهَدَاتِ وَالرِّيَاضَةِ
وَعَارِفٌ بِرَبِّهِ وَشُغْلُهُ بِخِدْمَتِهِ وَعِبَادَتِهِ وَ مَرْضَاتِهِ .

”لوگوں میں دو گروہ ہیں: یا بخود عارف ہیں یا بحق عارف ہیں، وہ لوگ جو بخود عارف ہیں ان کا مشغلہ مجاہدہ و ریاضت ہے اور وہ لوگ جو بحق عارف ہیں ان کا مشغلہ خدمت و عبادت و طلبِ رضا ہے۔“

تو عارفانِ بخود کی عبادت ریاضت ہوئی اور عرفانِ بحق کی عبادت ریاضت ہوئی۔ پہلا اس لیے عبادت کر رہا ہے کہ درجہ حاصل کرے دوسرا اس لیے عبادت کرتا ہے کہ عطا شدہ نعمت کا شکر گزار رہے۔

فَشْتَانِ مَابَيْنَ الْمَنْزِلَتَيْنِ ”تو دونوں کے منازل و مقام میں بڑا فرق ہے۔“ یعنی عارف بخود وہ بندہ ہے جو مجاہدہ پر قائم ہے اور عارف بحق وہ بندہ ہے جو مشاہدہ میں محو ہے۔ آپ ہی سے مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

النَّاسُ رَجُلَانِ مُفْتَقِرٍ إِلَى اللَّهِ فَهُوَ فِي أَعْلَى الدَّرَجَاتِ عَلَى لِسَانِ الشَّرِيعَةِ وَآخَرُ لَا يَرَى الْاِفْتِقَارَ بِمَا عَلِمَ مِنْ فَرَاحِ اللَّهِ مِنَ الْخَلْقِ وَالرِّزْقِ وَالْأَجَلِ وَالْحَيَاةِ وَالسَّعَادَةِ وَالشَّقَاوَةِ فَهُوَ فِي اِفْتِقَارِهِ إِلَيْهِ وَاسْتِغْنَائِهِ بِهِ.

”لوگ دو قسم کے ہیں: ایک نیاز مند بخدا، یہ نہایت اعلیٰ و ارفع درجہ والے ہیں اور شریعتِ مطہرہ نے بھی انہیں بلند درجہ کہا۔ دوسرے وہ ہیں جو اپنی نیاز مندی اور حاجت کو نہیں دیکھتے اس لیے کہ وہ جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ازل ہی میں مخلوق کے رزق، اجل، حیات، شقاوت، سعادت سب مقدر کر دی ہے اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔ تو وہ گروہ اپنی حوائج میں حاجات کا محتاج ہوا اور یہ گروہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ سب سے مستغنی۔“

یعنی پہلا گروہ عین افتقار میں مجبوب ہوا مقادیر اللہ سے۔ دوسرا گروہ اپنی حاجتوں سے مستغنی ہو کر اللہ کے ساتھ غنا و مشاہدہ میں ہوا۔ تو پہلا گروہ نعمت کے ساتھ ہوا دوسرا گروہ منعم نعمت کے ساتھ۔ پہلا گروہ مشاہدہ نعمت میں اگر چہ غنی ہے مگر فقیر ہے، دوسرا گروہ مشاہدہ منعم میں اگر چہ فقیر ہے مگر غنی ہے۔

حضرت احمد بن عاصم انطاکی رحمۃ اللہ علیہ:

انہیں میں سے ممدوح اولیاء، قدوۃ اہل رضا حضرت ابو عبد اللہ احمد بن عاصم انطاکی رضی اللہ عنہ ہیں۔ اعیان قوم اور سادات قبائل سے گزرے ہیں۔ علوم شریعت کے بہترین عالم اصول و

فروع میں اعلیٰ ماہر تھے، نہایت دراز عمر پائی۔ قدماء مشائخ کی صحبتوں سے مستفیض ہوئے۔ اتباع تابعین کو دیکھا اور ہم عصر بشر حافی اور سرری سقطی رضی اللہ عنہما تھے، حضرت حارث محاسبی کے مرید تھے۔ حضرت فضیل ابن عیاض کی بھی آپ نے زیارت کی اور ان کے فیض صحبت سے مستفید ہوئے، آپ اکثر زبانوں میں ستودہ تھے، آپ کا کلام بہت بلند مانا گیا ہے۔ آپ کے لطائف نہایت شافی ہیں۔ علم طریقت میں آپ ماہر گزرے ہیں۔ آپ سے مروی ہے کہ فرمایا:

انْفَعُ الْفَقْرِ مَا كُنْتَ بِهِ مُتَجَمِّلًا وَ بِهِ رَاضِيًا.

”نافع ترین فقر وہ ہے جس سے تُو جمال پائے اور اپنے جمیل کے ساتھ راضی رہے۔“

یعنی مخلوقات کا جمال وجود اسباب میں ہے اور فقیر کا جمال نفی اسباب اور اثبات مسبب میں اور اسی کی طرف رجوع رہ کر اس کے احکام پر راضی رہنے میں۔ اس لیے کہ فقر فقہان سبب کا نام ہے اور غنا، وجود سبب کو کہتے ہیں۔ تو فقیر بلا سبب حق کے ساتھ ہے اور جہاں سبب ہے وہاں وجود خودی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سبب محل حجاب ہے اور ترک سبب محل کشف و جمال دو جہاں، اور کشف میں رضاء ہے۔ سخط و غضب میں تمام عالم حجاب میں ہے اور یہ بیان فضیلت فقر میں واضح ہے۔

حضرت ابو محمد عبداللہ خبیب رحمۃ اللہ علیہ:

انہیں میں سے سالک طریق تقویٰ، اندرامت بزہد یحییٰ حضرت ابو محمد عبداللہ بن خبیب رضی اللہ عنہ ہیں۔ زہاد قوم میں سے گزرے ہیں اور ہر معاملہ میں اعلیٰ متورع تھے، آپ سے بہت روایات ہیں اور آپ فن حدیث میں مشہور ہیں، آپ کا مسلک فقہ میں مسلک ثوری تھا اور معرفت و حقیقت میں ماہر تھے۔

اور آپ نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کی زیارت کی اور ان کے فیض صحبت میں رہے۔ آپ کے مضامین قال و عمل میں نہایت لطیف ہیں۔ آپ کا ایک ارشاد ہے:

مَنْ أَرَادَ أَنْ يَكُونَ حَيًّا فِي حَيَاتِهِ فَلَا يُسْكِنُ الطَّمَعُ فِي قَلْبِهِ.

”جو چاہتا ہے کہ دنیاوی زندگی میں زندہ ہو جائے اسے کہو کہ وہ اپنے دل کو

مسکن طمع نہ بنائے تاکہ کل ماسوی اللہ سے آزاد ہو۔“

اس لیے کہ طماع ہمیشہ مردہ ہوتا ہے اور اپنے طمع کی قید میں مقید۔ تو جس دل میں طمع ہے

وہ دل ایسا ہے جس پر مہر لگی ہو اور لازمی ہے کہ جو دل مختوم یعنی مہر شدہ ہے وہ یقیناً مردہ ہے۔

سبحان اللہ! دل وہی دل ہے جو ماسویٰ اللہ سے مردہ ہو اور اپنے رب کی محبت میں زندہ۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے دل کے لیے عزت و ذلت پیدا فرمائی ہے اور اس کی یاد سے جو دل معمور ہے اسے دل کی عزت گردانا اور جس میں طمع ہے اسے دل کی ذلت قرار دیا۔ جیسا آپؐ نے فرمایا ہے:

خَلَقَ اللَّهُ تَعَالَى الْقُلُوبَ مَسَاكِينَ الذِّكْرِ فَصَارَتْ مَسَاكِينَ
الشَّهَوَاتِ وَلَا يَمْحُوا الشَّهَوَاتِ مِنَ الْقُلُوبِ إِلَّا خَوْفٌ مُدْعَجٌ
أَوْ شَوْقٌ مُقْلَقٌ .

”اللہ تعالیٰ نے دلوں کو مساکین ذکر بنایا تھا مگر جب نفسِ امارہ کی صحبت کا اثر پڑا، مسکنِ شہوت بن گیا۔ اب اس دل کو کوئی چیز شہوات سے پاک نہیں کر سکتی مگر وہ خوف جو مضطر کر دے یا وہ شوق جو آرام بھلا کر قلق پیدا کر دے۔“

تو خوف اور شوق دو ستون ہوئے ایمان کے، جیسے دل محلِ ایمان ہے اور اس کے قرین قناعت و ذکر ہیں نہ کہ طمع اور غفلت۔ تو قلبِ مومن طماع اور تابعِ شہوات نہیں ہو سکتا۔ اس لیے طمع و شہوت کا نتیجہ وحشت ہے جو دل کو متوحش کر کے ایمان سے بے خبر کر دیتی ہے اور ایمان کو اُنسِ بحق لازمی ہے اور وحشت کو اُنسِ غیر حق کے ساتھ ضروری۔ جیسا کہ کہا ہے کہ: الطَّمَاعُ مُتَوَحِّشٌ مِنْهُ كَلٌّ وَاحِدٌ۔ ”طماع کی صحبت سے ہر ایک وحشت زدہ ہو جاتا ہے۔“

حضرت جنید بغدادی رضی اللہ عنہ:

انہیں میں سے شیخِ طریقت، امامِ شریعت ابو القاسم حضرت جنید بن محمد بن جنید بغدادی رضی اللہ عنہ ہیں۔ مقبول اہل ظواہر و اہل باہر بابِ قلوب تھے۔ علوم کے تمام فنون میں کامل اور اصول و فروع و معاملات و عبادات میں مفتیِ اعظم، اور امامِ اصحابِ ثوری مانے گئے ہیں۔ آپ کے فرامین نہایت عالی ہیں اور آپ کا حال بدرجہ غایت کامل حتیٰ کہ تمام اہلِ طریقت آپ کی امامت پر متفق ہیں اور کسی مدعی علم و تصوف کو آپ پر اعتراض نہیں۔

اور آپ حضرت سزّی سقطی رحمۃ اللہ علیہ کے بھانجے ہیں اور انہیں کے مرید ہیں۔ ایک روز حضرت سزّی سقطی رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا گیا کہ کوئی مرید ایسا بھی ہے جس کا مرتبہ پیر سے بلند ہو گیا ہو، فرمایا: ہاں اس کے براہین ظاہر ہیں (یعنی حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا) اس کا درجہ میرے درجہ سے بلند ہے (اگرچہ یہ فرمان حضرت سزّی سقطی رحمۃ اللہ علیہ کا بصورتِ تواضع تھا) اور آپ نے جو کچھ فرمایا اپنی بصیرتِ باطنی کے ذریعہ فرمایا، اس لیے کہ کوئی اپنے سے اوپر والے کو نہیں دیکھ سکتا کیونکہ دیدار کا تعلق تحت سے ہے۔ بناءً برائیں آپ نے یعنی

حضرت سری سقطی رحمۃ اللہ علیہ نے جبکہ انہیں دیکھا اپنی نظر میں بلند دیکھا مگر یقیناً اپنے درجہ سے یہ دیکھنا نیچے ہی درجہ کا دیکھنا ہوگا۔

اور مشہور ہے کہ زمانہ حیوۃ سری سقطی رحمۃ اللہ علیہ میں پیر بھائیوں نے حضرت جنید بن محمدؒ سے عرض کی کہ ہمیں کچھ فرمائیے تاکہ ہمارے دل سکون و راحت پائیں۔ آپ نے صاف انکار کر دیا اور فرمایا جب تک میرے شیخ حضرت سریؒ جلوہ آراء مستظاہر ہیں، میں کوئی بات کہنے کا مجاز نہیں رکھتا۔ یہاں تک کہ ایک رات خوابِ استراحت میں تھے کہ سرکار ابد قرار صلی اللہ علیہ وسلم کے جمالِ جہاں آراء سے مشرف ہوئے۔ دیکھا کہ حضور ﷺ فرما رہے ہیں: ”جنید! لوگوں کو کچھ سنایا کر، اس لیے کہ تیرے بیان سے اللہ تعالیٰ ایک عالم کی نجات فرمائے گا۔“

جب بیدار ہوئے تو دل میں خطرہ پیدا ہوا کہ میں اپنے مرشد کے درجہ سے اتنا بلند ہو گیا ہوں کہ حضور ﷺ نے مجھے حکمِ دعوت فرمایا۔ جب صبح ہوئی حضرت سری رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مرید بھیجا اور حکم دیا کہ جب جنید نماز سے فارغ ہوں تو کہو کہ میرے مریدوں کی درخواست تم نے رد کر دی اور انہیں کچھ نہ سنایا، اشیاءِ بغداد نے سفارش کی اسے بھی تم نے رد کر دیا، میں نے پیغام بھیجا پھر بھی آمادہٴ وعظ نہ ہوئے اب جبکہ پیغمبر عالم سید اکرم ﷺ کا حکم تمہیں ملا ہے لہذا اس حکم کی تعمیل کرو۔

حضرت جنید بن محمدؒ نے یہ حکم سنتے ہی جواب میں کہلا بھیجا کہ حضور! جو میرے دماغ میں افضلیت کا سوڈا سما یا ہے وہ جاتا رہا ہے اور میں نے اچھی طرح سمجھ لیا کہ سری سقطی میرا مرشد کامل میرے تمام حالاتِ ظاہر و باطن سے مشرف ہے۔

اور آپ کا درجہ ہر حال میں میرے درجہ سے بلند اور آپ یقیناً میرے اسرار پر مطلع ہیں اور میں آپ کے منصبِ جلیل کی بلندی سے محض بے خبر ہوں اور اپنی اس غلطی سے استغفار کرتا ہوں جو میں نے اس خواب کے بعد اپنے متعلق سوچا تھا۔

حضرت جنید بغدادی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت سری سقطی رحمۃ اللہ علیہ سے عرض کی، حضور! آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ میں نے خواب میں حضور ﷺ کی زیارت کی۔ فرمایا: میں نے اللہ تعالیٰ کے جمال سے خواب میں شرف حاصل کیا، مجھے جناب باری تعالیٰ کی طرف سے ارشاد ہوا کہ میں نے اپنے حبیب محمد ﷺ کو جنید کے پاس بھیجا کہ اُسے حکم دو تاکہ وہ وعظ کہے تاکہ اہل بغداد کی مراد بر آئے۔

یہ حکایت دلیل واضح ہے کہ پیرانِ کامل ہر صورت میں مرید کے حالات پر واقف ہوتے

ہیں۔ آپ کے کلام بہت بلند ہیں اور رموز نہایت لطیف۔ آپ سے مروی ہے کہ فرمایا:
 كَلَامُ الْأَنْبِيَاءِ نَبَأٌ عَنِ الْحُضُورِ وَكَلَامُ الصِّدِّيقِينَ إِشَارَةٌ عَنِ
 الْمُشَاهِدَةِ.

”کلام انبیاء کرام حضور کے ذریعے ہوتا ہے (یعنی وہ جو کچھ فرماتے
 ہیں آنکھوں دیکھی اور تفصیلی علم کے ذریعے ہوتا ہے) اور کلام صدیقین مشاہدہ
 سے ہوتا ہے۔“

یعنی ان کی صحتِ خبر محض مشاہدے پر ہے جو نظر ناظر سے ہوتا ہے اور اسی وجہ میں مشاہدہ
 تخمیل سے ہے اور خبر سوائے آنکھ کے دیکھے نہیں جاسکتی اور اشارات سوائے غیر کے نہیں ہوتے۔
 تو صدیقین کا مرتبہ کمال انبیاء کرام علیہم السلام کے ابتدائی مراتب کے برابر ہوتا ہے اور
 اس میں جو فرق ہے وہ واضح ہے اور یہ عقیدہ ملحدین کا ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام کو فضیلت میں
 موخر مانتے ہیں اور اولیاء کرام کو مقدم کہتے ہیں۔

آپ سے مروی ہے، فرماتے ہیں ایک بار میرے دل میں خواہش ہوئی کہ ابلیس لعین کو
 دیکھوں۔ میں ایک دن مسجد کے دروازے پر کھڑا ہوا تھا کہ ایک بڑھا آیا اور دُور سے میری طرف
 دیکھا۔ جب میں نے اس کو دیکھا تو میں نے اپنے دل میں وحشت کا اثر محسوس کیا۔ جب وہ
 میرے نزدیک آیا میں نے اس سے پوچھا: بڑھے! تو کون ہے کہ میری نظر اثرِ وحشت سے تجھے
 دیکھنے کی تاب نہیں لاتی اور تیری نحوست کی ہیبت کو میرا دل برداشت نہیں کرتا!! کہنے لگا کہ میں وہی
 ہوں جس کے دیکھنے کی آپ نے خواہش فرمائی تھی۔ میں نے کہا: ملعون! تجھے حضرت آدم علیہ السلام
 کے سجدہ سے کس چیز نے روکا؟ بولا: جنید! آپ کا یہ خیال ہے کہ میں غیر خدا کو سجدہ کر لیتا۔ حضرت
 جنید فرماتے ہیں: میں متحیر سا ہو گیا اور اس کا یہ کلام میرے ضمیر پر اثر پذیر ہوا ہی تھا کہ مجھے الہام ہوا:

قُلْ لَّهُ كَذَبْتُ لَوْ كُنْتُ عَبْدًا مَّامُورًا مَا خَرَجْتُ عَنْ أَمْرِهِ وَنَهْيِهِ
 فَسَمِعَ النَّدَاءَ مِنْ قَلْبِي فَصَاحَ وَقَالَ أَخْرَقْتَنِي بِاللَّهِ وَغَابَ .

”اے جنید! اس خبیث کو کہہ دو کہ بے ایمان تو جھوٹا ہے، اگر تو بندہ تھا تو اپنے
 مالک کے حکم سے باہر نہ ہوتا اور اس کی نہی سے تقرب نہ کرتا۔ شیطان نے یہ
 آواز میرے قلب کی سن لی اور ایک چیخ ماری اور بولا خدا کی قسم! اے جنید!
 تو نے مجھے جلاؤالا اور نظر سے غائب ہو گیا۔“

یہ حکایت آپ کے تحفظِ عصمت پر خاص دلیل ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ اپنے ولی کی خود

نگرانی فرماتا ہے اور ہر حالت میں مکرہائے شیطانی سے محفوظ رکھتا ہے۔

ایک واقعہ ہے کہ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ سے آپ کا ایک مرید کچھ بداعتقاد ہوا اور اس غلط فہمی میں پڑا کہ اب میں بھی کسی درجہ پر فائز ہو چکا ہوں۔ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ سے کچھ اعراض کر لیا۔ چند روز بعد اس غرض سے آیا کہ تجربہ کرے اور دیکھے کہ میرا خیال حضرت جنید پر منکشف بھی ہوا یا نہیں۔ حضرت جنید اپنے نور فراست سے اس کی حالت ملاحظہ فرما رہے تھے۔ جب وہ مرید آیا، آپ سے کچھ سوال کرنے لگا۔ آپ نے فرمایا: کیسا جواب چاہتا ہے، الفاظ و عبارات میں یا حقیقت معنی میں؟ مرید نے عرض کی دونوں طرح۔ آپ نے فرمایا کہ عبارتی جواب تو یہ ہے کہ اگر میرا تجربہ کرنے کی بجائے اپنا تجربہ کر لیتا تو میرے تجربہ کا محتاج نہ ہوتا اور اس جگہ تجربہ کی غرض سے نہ آتا۔

اور معنوی جواب یہ ہے کہ میں نے تجھے مصعب ولایت سے معزول کیا۔ یہ فرمانا تھا کہ مرید کا چہرہ سیاہ ہو گیا اور پکارا کہ حضور! راحت یقین میرے دل سے جاتی رہی۔ توبہ کرنے لگا اور پہلی بکو اس سے ہاتھ اٹھایا۔ اس وقت حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: تو نہیں جانتا کہ اللہ کے ولی والیان اسرار ہوتے ہیں، تجھ میں ان کی ضرب کی برداشت نہیں۔ پھر ایک پھونک اس پر ماری، وہ پھر اپنے پہلے درجہ پر متمکن ہوا۔ اُس دن سے خاصانِ بارگاہ کے معاملات میں دخل دینے سے بھی توبہ کی اور پختہ عہد کر لیا۔

حضرت ابوالحسن نوری رحمۃ اللہ علیہ:

انہیں میں سے شیخ المشائخ طریقت، امام ائمہ شریعت، شاہِ اہل تصوف، بری از آفت تکلف حضرت ابوالحسن احمد بن محمد نوری رحمۃ اللہ علیہ نہایت نیک عمل اور واضح کلام فرمانے والے اور مجاہدات میں نہایت عالی ظرف گزرے ہیں۔ تصوف میں آپ کا مسلک مخصوص ہے اور صوفیوں میں اسی وجہ سے ان کی جماعت کو ”نوری“ کہتے ہیں۔ اور یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ متصوفین میں باعتبار مسلک بارہ (12) فرقہ ہیں۔ دو گروہ مردود ہیں اور دس گروہ مقبول بارگاہ ہیں۔ وہ بارہ فرقے یہ ہیں: (۱)

۱۔ ان میں سے دس فرقے شتاری فرقہ تک محققانِ اہل سنت و جماعت سے گزرے ہیں لیکن دو گروہ مردود ہیں ایک حلوی ہے جو حلول و امتزاج کا قائل ہے۔ از مترجم (یعنی اس فرقہ کا یہ عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بندے کے جسم میں حلول کرتا اور بندہ میں آکر مل جاتا ہے) معاذ اللہ اور اسی فرقہ سے وابستہ سالمی اور مشبہ ہے (مشبہہ کا تو عقیدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا جسم ہے) (بقیہ حواشی اگلے صفحہ پر۔۔۔۔۔)

- ۱۔ محاسبیاں ۲۔ قصاریاں ۳۔ طیفوریاں ۴۔ جنیدیان
 ۵۔ نوریان ۶۔ سہلیان ۷۔ حکیمان ۸۔ خرازیان
 ۹۔ حنیفیان ۱۰۔ شتاریان ۱۱۔ حلولیان ۱۲۔ حلاجیان

دوسرا فرقہ حلاجیان ہے جن کے نزدیک ترک شریعت اور الحاد موجب نجات ہے۔ یہ فرقہ بھی مردود ہے اور ان میں دو فرقہ اور ہیں ایک اباحتیان دوسرا فارسیان۔ ان کی تصریح اسی کتاب میں اپنے مقام پر تمہیں ملے گی۔

ان فرقوں کے عقائد اور ان کے فرق اور اختلاف کا بیان مفصل درج کیا جائے گا، ان شاء اللہ۔ لیکن حضرت ابوالحسن احمد نوری رحمۃ اللہ علیہ کا طریقہ پاکیزہ ہے اور ترک مداہنت اور رفع مساحت میں آپ نہایت سخت تھے اور ہمیشہ مجاہدات و ریاضات میں رہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں ایک بار حاضر ہوا۔ میں نے دیکھا آپ صدر مقام پر تشریف فرما ہیں۔ میں نے کہا:

يَا أَبَا الْقَاسِمِ غَشِيَتْهُمْ فَصْدْرُوكَ وَ نَصَحْتُهُمْ فَرَمَوْنِي بِالْحِجَارَةِ.

”اے بو القاسم! تم نے ان سے حق چھپایا تو انہوں نے تمہیں صدر نشین بنا لیا اور میں نے انہیں نصیحت کی تو انہوں نے مجھے پتھروں سے مارا۔“

اس لیے کہ مداہنت کو خواہشات نفسانی سے موافقت ہے اور حق گوئی اور نصیحت کو مخالفت۔ اور آدمی اس چیز کا دشمن ہے جو اس کی خواہشات کے مخالف ہو اور اس کا دوست ہے جو اس کے ہوائے نفسانی کے موافق ہو۔ حضرت ابوالحسن نوری رحمۃ اللہ علیہ، حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کے رفیق خاص تھے اور حضرت سری سقطی رحمۃ اللہ علیہ کے مرید۔ اور آپ نے بہت سے مشائخ کرام کی زیارت کی اور ان کی صحبت میں رہے اور آپ نے حضرت احمد بن ابی الحواری رحمۃ اللہ علیہ کو بھی پایا۔

(بقیہ حواشی گزشتہ صفحہ سے)

اور وہ جسم ایسا ہے کہ عقل اس کا ادراک نہیں کر سکتی، اور فرقہ سالمیہ کا عقیدہ یہ ہے کہ بروز قیامت اللہ تعالیٰ صورت انسانی میں جلوہ فرما ہوگا اور امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں (معاذ اللہ) ظہور کرے گا اور تمام مخلوقات کے لیے قیامت کے دن جن وانس اور ملائکہ اور حیوانات کی شباهت میں ظہور کرے گا اور ہر ایک کے ساتھ ایک خاص صفت ہوگی، حالانکہ قرآن کریم میں ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات تشبیہ و شباهت سے منزہ ہے۔

لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ. از غنیتہ الطالبین (مترجم غفرلہ)

فن تصوف میں آپ کے اشارات نہایت لطیف ہیں اور آپ کے اقوال نہایت پیارے اور جمیل، فنون میں آپ کے نکات عالی مشہور ہیں۔

آپ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا:

الْجَمْعُ بِالْحَقِّ تَفْرِقَةٌ عَنْ غَيْرِهِ وَتَفْرِقَةٌ عَنْ غَيْرِهِ جَمْعٌ بِهِ
 ”اللہ تعالیٰ کے ساتھ ملنا غیر سے مفارقت ہے اور غیر اللہ سے علیحدہ ہونا اللہ سے ملنا ہے۔“

یعنی جس کا دل اللہ تعالیٰ کے ساتھ جمعیت خاطر حاصل کر لے تو غیر خدا سے وہ قطعاً علیحدہ ہے اور اس کے ساتھ ملا ہوا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ ملنا اندر سے مخلوق سے جدا ہو جانا ہے۔ تو جب مخلوقات سے اعراض صحیح ہو جائے تو اقبال بحق درست ہوگا اور یہ مسلم امر ہے کہ اقبال بحق درست ہونے کی صورت میں ضِدَّانٍ لَا يَجْتَمِعَانِ ”دو ضدیں ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں۔“
 بقول مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ:

ہم خدا خواہی وہم دینائے دوز

ایں خیالست و محالست و جنوں (از مترجم)

ایک حکایت میں ہے کہ حضرت ابوالحسن احمد نوری رحمۃ اللہ علیہ ایک بار ایک مکان میں تین روز تک متواتر شور کرتے رہے۔ لوگوں نے حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں عرض کی۔ آپ فوراً اُٹھے اور تشریف لائے اور فرمایا: اے ابوالحسن! اگر تمہیں یہ معلوم ہو چکا ہے کہ اس بے نیازی کے ساتھ شور کرنا فائدہ مند نہیں ہے تو اپنے دل کو رضا و تسلیم کے محور پر لاؤ تاکہ تمہارا دل خوش و خرم رہے۔

حضرت ابوالحسن رحمۃ اللہ علیہ، حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ کی اس ہدایت پر خاموش ہوئے اور فرمانے لگے ابوالقاسم! تم میرے بہترین استاد ہو۔ آپ سے مروی ہے کہ فرمایا:

أَعَزُّ الْأَشْيَاءِ فِي زَمَانِنَا شَيْئَانِ عَالِمٌ يَعْمَلُ بِعِلْمِهِ وَعَارِفٌ يُنْطِقُ عَنْ حَقِيقَتِهِ.

”ہمارے زمانے میں محبوب ترین دو چیزیں ہیں ایک وہ عالم جو اپنے علم پر

عائل ہو، دوسرا وہ عارف جو حقائق راز اپنے کلام میں بیان کرے۔“

یعنی ہمارے زمانہ میں علم و معرفت دونوں محبوب ہیں اس لیے کہ علم بے عمل علم نہیں اور

عرفان بے حقیقت عرفان نہیں۔

اس بیان میں حضرت ابوالحسن رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے زمانہ کا پتہ دیا اور حقیقتاً ان کے وقت

تک ہمیشہ یہ دونوں چیزیں محبوب رہیں۔

آج کے دن بھی اگرچہ یہ دونوں چیزیں عزیز ہیں مگر اب یہ بات ہے کہ جو شخص کسی عالم کی یا عارف کی تلاش میں مشغول ہو تو اس کے لیل و نہار پر اگندہ ہو جائیں گے، مگر اُسے عارف و عالم نہیں ملے گا۔ آج کے دن طالب کو چاہیے کہ خود جدوجہد میں مشغول، داور اپنے رب کی طرف رجوع کرے تاکہ اسے عالم میں عالم و عارف ہی نظر آئیں اس لیے کہ عالم و عارف اسے عزیز ہے اور عزیز شے بمشکل ملتی ہے اور ظاہر ہے کہ جو شے عزیز الوجود ہو اس کی تلاش میں پریشان ہونا تضييع اوقات کرنا ہے۔ تو پھر جب اس نے علم و معرفت اپنے میں طلب کی تو گویا اس نے حقیقت و معرفت اپنے اندر پائی۔ لہذا یہی طریقہ بہترین ہے کہ فی زمانہ خود جدوجہد کرے اور اپنے رب سے اس درجہ کی طلب کرے۔

آپ ہی سے مروی ہے کہ فرمایا:

مَنْ عَلِمَ الْأَشْيَاءَ بِاللَّهِ فَرُجُوْعُهُ فِي كُلِّ شَيْءٍ إِلَى اللَّهِ.

”جو حقائق اشیاء تقرب الہی سے جانے، تو تمام اشیاء کی طرف جو اس کا

رجوع ہے، وہ خالق اشیاء کی طرف ہے نہ کہ اشیاء کی طرف۔“

اس لیے کہ وجود ملک اور ظہور ملک، مالک پر موقوف ہے۔

تو عارف کی راحت رویت مکون پر ہے نہ کہ کون پر۔ اس لیے کہ اگر اشیاء کو علت افعال جانے گا ہمیشہ رنجور و غمگین رہے گا، اور ہر شے کی طرف رجوع کرنا اس کے لیے شرک ہوگا اس لیے کہ یہ اشیاء کو سبب فعل جانتا ہے اور سبب اپنے آپ کبھی قائم نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ مسبب کے ماتحت ہوتا ہے، تو جب مسبب الاسباب ہی خالق اسباب ہے تو اسی کی طرف رجوع کرنا مشاغل ماسوی اللہ سے نجات دلاتا ہے۔

ابو عثمان حضرت سعید بن اسماعیل حیری رحمۃ اللہ علیہ:

انہیں میں سے مقدم سلف از سلف خود خلف ابو عثمان حضرت سعید بن اسماعیل حیری رضی اللہ عنہ ہیں۔ قدماء و اجلہ صوفیاء سے گزرے ہیں اور اپنے زمانہ میں فرد فرید تھے اور اہل دل آپ کو منصب رفیع پر مانتے تھے۔ آپ کی ابتدائے صحبت حضرت یحییٰ بن معاذ رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھی۔ اس زمانہ میں ایک مدت تک حضرت شاہ شجاع کرمانی رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت میں بھی رہ چکے ہیں اور انہیں کے ہمراہ نیشاپور آئے اور حضرت ابو حفص حذا درحمۃ اللہ علیہ کی زیارت کی اور انہیں کی خدمت

میں بقیہ عمر پوری فرمائی۔

آپ سے حکایت منقول ہے کہ آپ نے فرمایا: میرا دل ہمیشہ سے طلب حقیقت کی طرف راجع تھا اور بچپن ہی سے مجھے اہل ظواہر سے نفرت تھی۔ تو میں سمجھتا تھا کہ اس ظاہری عمل کے سوا جس پر عوام لگے ہوئے ہیں، شریعتِ مطہرہ میں ضرور کوئی خاص راز بھی ہوگا۔ آخرش میں اپنے مقصود کو پہنچا۔

وہ اس طرح کہ ایک روز یحییٰ بن معاذ رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس میں میرا گزر ہوا، میں ان سے ملا اور ان کی فیضِ صحبت سے جس راز کی مجھے تلاش تھی وہ مجھے حاصل ہو گیا۔ میں نے ان کی صحبت میں رہنا پسند کیا۔ پھر ایک جماعت شاہ شجاعؒ کے پاس سے آئی، اس نے ان کے فضائل مجھے سنائے مگر میں نے اپنے دل کا رجحان اسی طرف پایا۔ غرضیکہ ”رے“ سے ”کرمان“ آیا اور شاہ شجاعؒ کی خدمت میں رہنا چاہا۔ انہوں نے مجھے رہنے کی اجازت نہ دی اور فرمایا تیرا دل رجاء پروردہ ہو چکا ہے، تو نے یحییٰ بن معاذؒ کی صحبت پائی ہے اس کا مقام رجاء ہے اور جس نے مقامِ رجاء حاصل کر لیا ہو وہ طریقت نہیں پاسکتا۔ اس لیے کہ پیرویِ رجاء سے سستی کا پھل ملتا ہے۔

فرماتے ہیں کہ میں نے بہت تضرع و زاری کی اور بیس دن تک اُن کے در پر پڑا رہا۔ آخر کرم فرمایا اور مجھے قبول کیا اور فیضِ صحبت سے مستفیض فرمایا۔ ایک مدت تک اُن کی خدمت میں رہا۔ بڑے زبردست مردِ غیور تھے۔ آپ کا ارادہ نیشاپور میں آکر حضرت ابو حفصؒ کی زیارت کرنے کا ہوا تو میں بھی آپ کے ہمراہ آیا۔ جس روز شاہ شجاعؒ، حضرت ابو حفصؒ کے یہاں آئے، قبا پہنے ہوئے تھے۔

حضرت ابو حفصؒ نے شاہ شجاعؒ کو دیکھتے ہی قیام فرمایا اور استقبال کے لیے آگے بڑھے اور فرمایا: وَجَدْتُ فِي الْقَبَاءِ مَا طَلَبْتُ فِي الْعَبَاءِ ”قبا میں وہ چیزیں نے پائی جو میں عبا میں مانگ رہا تھا“۔ میں ایک مدت تک وہاں رہا، میری وابستگی یہاں ہو گئی میں شاہ شجاعؒ کے دبدبہء ولایت نے ان کی صحبت میں زیادہ دیر رہنے سے مجھے روک دیا۔ حضرت ابو حفصؒ فرست ولایت سے میری دلی مرضی کو دیکھ رہے تھے اور درحقیقت میں تضرع و زاری کے ساتھ جناب باری میں دست بدعا تھا کہ مجھے ابو حفصؒ کی صحبت اس طرح میسر ہو کہ شاہ شجاعؒ مجھ سے آزر نہ ہوں۔ غرضیکہ وہ دن جس دن شاہ شجاعؒ کا قصد واپسی کا ہوا تو میں نے اُن کی پیروی میں کپڑے پہنے مگر میرا دل ابو حفصؒ کے پاس ہی تھا کہ روانہ ہونے لگے تو حضرت ابو حفصؒ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت شاہ شجاعؒ رحمۃ اللہ علیہ سے فرمایا کہ حضرت اس بچے کو خوشی سے میری دلچسپی کے

لیے چھوڑ دیں کہ میں اسے محبوب رکھتا ہوں۔

حضرت شاہ شجاع رحمۃ اللہ علیہ نے میری طرف دیکھا اور فرمایا: اَجِبِ الشَّيْخَ ”شیخ کے حکم کی تعمیل کر“ اور تشریف لے گئے۔ میں بخوشی یہاں رہ گیا۔

اب میں نے ان کی صحبت میں جو جو عجائبات دیکھے (وہ قابل بیان نہیں بس اتنا سمجھ لو کہ) اللہ تعالیٰ نے انہیں مقامِ شفقت فرمایا تھا۔ خداوند کریم نے حضرت ابو عثمان ”کو تین پیروں کے ذریعہ تین مقامات سے عبور کرایا اور یہ تینوں لطیفے ان تین پیروں کے ذریعہ انہیں ملے۔ مقام رجاء حضرت یحییٰ بن معاذ رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت سے، مقام غیرت صحبت حضرت شاہ شجاع رحمۃ اللہ علیہ کے ذریعہ اور مقام شفقت حضرت ابو حفص رحمۃ اللہ علیہ کے فیض صحبت سے۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ مرید پانچ یا چھ یا اس سے بھی زائد مرشدوں کے ذریعے منزل رسیدہ ہو سکے اور ہر پیر کی صحبت علیحدہ علیحدہ اس کے ایک مقام کی کشف کے لیے ہو۔

مگر بہترین اخلاص کا مقتضی یہ ہے کہ اپنے پیر کو اپنی ترقی مقامات میں محدود کر کے اس کی شان نہ گھٹائے اور یہ نہ سمجھے کہ میرے پیر کی قوت کا انتہی یہیں تک تھا۔ بلکہ یوں کہے کہ اُن کے در سے میری قسمت میں اتنا ہی حصہ تھا، اس سے زائد نہ تھا اور میرا مرشد اس سے کہیں زیادہ درجہ ورتبہ کا مالک ہے اور یہی ادب کا مقتضی ہے۔ اس لیے کہ راہِ حق میں جو منزل تک پہنچ چکے ہیں انہیں کسی مقام اور حال سے کام نہیں رہتا۔

اور اظہارِ حقائق تصوف کے سبب نیشاپور اور خراسان میں حضرت جنید اور حضرت رویم اور حضرت یوسف بن الحسین اور حضرت محمد بن فضل بلخی ”ہوئے کہ ان کے فیض صحبت سے استفادہ کیا اور یہ لوگ اپنے فن میں زبردست دستگاہ رکھتے تھے کہ ان کے برابر مشائخ میں میں نے قوتِ باطنی نہیں دیکھی۔ نیشاپور کے لوگوں نے حضرت ابو عثمان رحمۃ اللہ علیہ کے لیے منبر لگایا اور انہوں نے تصوف کی تعلیم لوگوں میں پھیلائی۔ ان کی کتابیں نہایت اعلیٰ درجہ کے تصوف میں ہیں اور فنِ تصوف میں ان کی روایات بہت یقینی ہیں!

اُن سے مذکور ہے کہ آپ نے فرمایا:

حَقٌّ لِّمَنْ أَعَزَّهُ اللَّهُ بِالْمَعْرِفَةِ أَنْ لَا يَذُلَّهُ بِالْمَعْصِيَةِ.

”اللہ تعالیٰ کے لیے یہی زیبا ہے کہ جسے اپنے جامِ عرفان سے سرشار کر دے اور اپنی معرفت کی عزت سے نواز دے اُسے معصیت کے ساتھ ذلیل نہ کرے۔“

اور اس مرتبہ کا تعلق کسب بندہ پر ہے اور اس کے مجاہدہ دوائی پر اور امورِ حقہ کی رعایت کرنے پر، لیکن حضرت سعید بن اسماعیل رحمۃ اللہ علیہ کے منقولہ فرمان کے مطابق جب یہ سمجھا کہ اللہ تعالیٰ کو سزاوار ہے کہ جب کسی کو اپنی معرفت کے ساتھ نواز دے تو معصیت سے اسے خوار نہ کرے تو اس کا مفہوم یہ ہوگا: معرفت عطاءے حق پر موقوف ہے اور معصیت منتسب الی العبد ہے۔ تو جب کسی کو بے عطاء الہی اعزاز عرفان مل گیا تو محال ہوگا کہ وہ بندہ اپنے کسی بُرے فعل کے ساتھ ذلیل ہو۔ جیسے حضرت آدم علیہ السلام، کہ انہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے کیفِ عرفان سے نوازا اور تاجِ معرفت بخشا تو محض ذلتِ آدم کے ذریعہ انہیں ذلیل نہیں فرمایا۔

ابو عبد اللہ حضرت احمد بن یحییٰ بن الجلال رحمۃ اللہ علیہ:

انہیں میں سے سہیلِ معرفت، قطبِ محبت ابو عبد اللہ حضرت احمد بن یحییٰ بن الجلال رضی اللہ عنہ ہیں۔ قوم کے سردارِ ساداتِ وقت سے گذرے ہیں۔ آپ کا طریقہ نہایت نیک اور آپ کی سیرت نہایت پاکیزہ۔ مصاحبِ جنید بغدادی رضی اللہ عنہ اور حضرت ابو الحسن نورانی اور ایک جماعت کبرِ امشائخ کی زیارت کیے ہوئے ہیں۔ آپ کا کلام نہایت بلند ہے۔ آپ کے اشارات بہت لطیف ہیں حقائقِ معنی کے بیان میں آپ مخصوص تھے۔ آپ سے مروی ہے کہ فرمایا:

هِمَّةُ الْعَارِفِ إِلَى مَوْلَاهُ فَلَمْ يَعْطِفْ عَلَى شَيْءٍ سِوَاهُ .

”عارف کے تمام ارادے اور قوتیں اس کے مولا کی طرف موقوف ہیں تو ہرگز

وہ اپنے مولا کے حکم بغیر کسی طرف رجوع نہیں ہوتا۔“

اس لیے کہ عارف کو معرفت کے بغیر کچھ معلوم نہیں اور عارف کا سرمایہ ضمیرِ معرفت ہی ہے اور اس کے ضمیر کا مقصود رویت کے سوا کچھ نہیں۔ اس لیے کہ ہمت و تخیل کی پراگندی رنج و غم کا پھل دیتی ہے اور رنج و غم انسان کو بارگاہِ خاص سے روک دیتا ہے۔

آپ سے ایک حکایت ہے، فرماتے ہیں کہ ایک دن میں نے ایک خوبصورت جوان کو دیکھا۔ وہ جوان آتش پرست تھا۔ میں اس کے جمال کو دیکھ کر متحیر ہو گیا اور اس کے سامنے کھڑا ہو گیا کہ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ میری طرف سے گزرے۔ میں نے عرض کی حضور! کیا اللہ تعالیٰ ایسی صورت کو بھی آگ میں جلا دے گا؟ حضرت جنید نے فرمایا:

”صاحبزادے! یہ چند لمحاتِ زندگی کی گرم بازاری ہے جس نے تجھے اس

خیال میں پھانسا ہے، تو ان چیزوں کو بنظرِ عبرت نہیں دیکھتا، اگر بنظرِ عبرت

دیکھے تو ہر ذرہ میں ایسے ہی عجائبات موجود ہیں لیکن عنقریب وہ وقت آنے والا

ہے کہ تو ضرور اس چہ میگوئی اور بے حرمتی میں معذب ہوگا۔“
حضرت جنید ”تو یہ فرما کر تشریف لے گئے اور مجھ پر یہ عذاب آیا کہ کیف قرآنی مجھ سے
فراموش ہو گیا۔ کئی سال بحضور عزوجل توبہ کرتا رہا، تو کہیں جا کر وہ بلا دفع ہوئی اور اب میری ہمت
نہیں کہ موجودات میں سے کسی چیز پر التفات کروں یا اپنے وقت کو بنظر عبرت بھی موجودات میں
ضائع کروں۔ وَاللّٰهُ تَعَالٰی اَعْلَمُ۔

حضرت رویم بن احمد رحمۃ اللہ علیہ:

انہیں میں سے وحید العصر، امام الدہر حضرت محمد رویم بن احمد رضی اللہ عنہ ہیں۔ اجلہ
مشائخ و سادات قوم سے گزرے ہیں۔ حضرت جنید بغدادی رضی اللہ عنہ کے خاص رازدار، مرید اور
آپ کے ہم عصر تھے۔ آپ کا مسلک حضرت داؤد اطاکی کے موافق تھا۔ فن فقہ میں فقیہ الفقہاء تھے
اور علم تفسیر و قرأت میں کافی حصہ لیے ہوئے تھے۔ مختصر یہ کہ آپ اپنے زمانہ میں یکتائے علماء مانے
گئے۔ آپ کی کیفیت حالیہ نہایت بلند تھی اور آپ کا مقام تقرب رفیع، سیاحتی تصوف کی وجہ میں تجرید
اور کثرت ریاضت کے باعث تفرید میں آپ مشہور تھے۔ آپ نے اپنی آخری عمر اہل دنیا میں محض
اپنے آپ کو مخفی رکھنے کے لیے گذاری اور خلیفہ وقت کے معتمد خاص بن گئے اور ”قاضی القضاة“
کے عہدہ پر مامور ہوئے۔ حالانکہ آپ کا درجہ کمال اس سے کہیں زیادہ بلند تھا۔ اس وجہ سے آپ
اس عہدہ میں بھی چھپ نہ سکے۔

حضرت جنید بغدادی رضی اللہ عنہ نے ان کی تعریف میں فرمایا:

ما فارغان مشغولیم و رویم مشغول فارغست۔

”ہم دنیا کے علائق سے فارغ ہو کر مشغول دنیا ہیں اور رویم بن احمد علائق

میں مشغول رہ کر بھی دنیا سے فارغ ہے۔“

آپ کی تصانیف فن طریقت و حقیقت میں بہت ہیں۔ خاص کر بحث سماع میں ایک

کتاب ہے جس کا نام ”غلط الواجدین“ ہے۔ میں اس کتاب پر عاشق ہوں۔

آپ سے روایت ہے کہ ایک روز کوئی شخص آپ کی خدمت میں آیا اور عرض کی: کَیْفَ

حَالُكَ ”حضرت کیسے مزاج ہیں؟“ آپ نے جواب دیا:

کَیْفَ حَالٍ مِّنْ دِیْنِنَا هَوَاہُ وَهَمَّتْهُ دُنْيَاہُ لَیْسَ هُوَ بِصَالِحٍ نَّقِیٍّ وَ

لَا بَعَارِ فِی نَقِیٍّ۔

”اس کا مزاج کیا ہو سکتا ہے جس کا دین اس کی حرص آرزو اور جس کی منہاں

مقصود اس کی دنیا ہو، نہ وہ صالح اور متقی ہے اور نہ عارفِ نقی۔“

اس جواب میں آپ نے عیوبِ نفس کی طرف اشارہ فرمایا ہے، اس لیے کہ نفسِ امارہ کے نزدیک ہوئی و حرص ہی دین ہے اور نفس کے قبیح کا دین حرص کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے اور اس کی شریعت اس کا اتباع ہوتا ہے۔ جو شخص ان کی پیروی کرے، اگرچہ وہ بدعتی ہی کیوں نہ ہو مگر ان کے نزدیک دیندار ہوگا اور جو ان کے خلاف چلے اگرچہ وہ پرہیزگار ہی کیوں نہ ہو بے دین کہلائے گا۔ اور یہ آفت ہمارے زمانہ میں اتنی عام ہے کہ اس سے کوئی بھی بچا ہوا نہیں۔ ہم اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگتے ہیں ایسے شخص کی صحبت سے جس میں یہ صفت ہو۔

لیکن حضرت محمد رویم بن احمد رحمۃ اللہ علیہ نے مسائل کے جواب میں احوالِ زمانہ کی طرف اشارہ فرمایا تھا اور ممکن ہے کہ انہیں اس حال میں اپنا وجود معلوم ہوا ہو اور اس سے اپنے وجود کی صفت بیان فرمائی ہو، اور عارف چونکہ منصف ہوتا ہے اس لیے منصفانہ انداز میں جواب دیا ہو۔
وَاللّٰهُ تَعَالٰی اَعْلَمُ .

حضرت ابو یعقوب یوسف رحمۃ اللہ علیہ:

انہیں میں سے یگانہ زمانہ، بلند قدر حضرت ابو یعقوب یوسف رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ اپنے وقت کے امام اور مشائخِ عظام میں سے گزرے ہیں، معمر تھے۔ حضرت ذوالنون مصریٰ کے مرید تھے۔ علاوہ ان کے بہت سے مشائخ کی زیارت سے مشرف ہوئے ہیں۔ آپ کا ارشاد ہے:

اَزْدَلُّ النَّاسِ الْفَقِيْرُ الطَّمَاعُ كَمَا اَعَزُّهُمْ الْمُحِبُّ الصَّادِقُ .

”ذلیل ترین انسانوں میں طماع فقیر ہے جیسے معزز ترین انسان راستباز محبت

صادق ہے۔“

طمع، درویش کو دونوں جہان کی ذلت کا شکار بنا دیتی ہے۔ اس لیے کہ درویش پہلے ہی اہل دنیا کی نظر میں حقیر و ذلیل ہوتا ہے۔ تو جب وہ اہل دنیا سے طمع کرتا ہے تو اور بھی زیادہ حقیر و ذلیل ہو جاتا ہے۔ تو عزت کا غنا اس فقیر سے بہت افضل ہے جو ذلت کے ساتھ فقیر ہو اور طمع درویش کو جھوٹ کے ساتھ منتسب کر دیتی ہے اور محبت اپنے محبوب کی نظر میں سب سے زیادہ ذلیل ہوتا ہے۔ اس لیے کہ محبت اپنے آپ کو محبوب کے مقابلے میں حقیر سمجھتا ہے اور محبوب کی تواضع میں رہتا ہے اور یہ بھی نتائجِ طمع میں سے ایک نتیجہ ہے۔ پھر جب طمع جاتی رہتی ہے تو ذلت، عزت سے بدل جاتی ہے۔ جب تک زلیخا کو حضرت یوسف علیہ السلام کی طمع تھی، ہر لحظہ رسوا اور ذلیل ہوتی تھی۔ پھر جب ان کے دل سے طمع جاتی رہی تو پھر اللہ تعالیٰ نے خوبصورتی اور جوانی سب کچھ عطا فرما کر

معزز کر دیا۔ اور قاعدہ ہی کچھ ایسا ہے کہ دوست کی توجہ محبوب کی بے توجہی کے موجب ہوتی ہے اور جب محبت بے نیاز ہو جائے اور طمع جاتی رہے تو محبوب اس کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ اور درحقیقت محبت کی اس وقت تک ہی عزت ہوتی ہے جب تک طمع وصل نہ ہو اور جب طمع وصل آجائے اور وہ حاصل نہ ہو تو سب ذلتوں سے بدترین ذلت ہے۔ تو محبت وہی ہے جو محبوب کے وصال و فراق میں مشغول نہ ہو۔

حضرت ابوالحسن سمنون رحمۃ اللہ علیہ:

انہیں میں سے آفتابِ اہل محبت، قدوۃ اہل معاشرت حضرت ابوالحسن سمنون بن عبداللہ الخواص رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں۔ اپنے زمانہ کے بے نظیر عارف اور درجہ عشق و محبت میں شانِ رفیع رکھنے والے تھے۔ مشائخ وقت آپ کو بزرگ جانتے اور ”سمنون المحب“ کے نام سے پکارتے تھے۔ لیکن آپ اپنے کو ”سمنون الکذاب“ فرمایا کرتے تھے۔

آپ نے ”غلام الخلیل“ سے بہت رنج اٹھائے۔ یہ وہ شخص تھا کہ اس نے خلیفہ وقت کے سامنے خلاف واقعہ شہادتیں دیں اور اس سے شیخ سمنون کو دلی رنج تھا اور غلام الخلیل بڑا ریاکار تھا اور مدعی زہد و پارسائی بنا ہوا تھا اور اپنے آپ کو صوفی بنائے ہوئے تھا اور اعیانِ دولت اور خلیفہ وقت کے ساتھ بہت زیادہ ربط ضبط کر رکھا تھا۔ گویا اس نے دین کو دنیا کے بدلے بیچ ڈالا تھا۔ جیسے کہ اس زمانہ میں اس قسم کے صوفی نما دنیا دار پھرتے ہیں۔ یہ وہ بد باطن تھا کہ لباسِ تصوف میں امراء و خلفاء کے دربار میں پہنچتا اور خاصانِ بارگاہ کے خلاف دربار شاہی میں زہر اُگلتا اور اس سے اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ خاصانِ بارگاہ کے فیض سے یہ لوگ محروم رہیں اور ان کے فیضِ صحبت سے تبریک حاصل نہ کر سکیں اور یہ ان کی نظروں میں چچا رہے اور فروغِ صدق سے اس کا دروغ دب نہ جائے۔

بڑے خوش قسمت تھے حضرت سمنونؒ کہ ان کے زمانہ میں ان کے اور دیگر مشائخ کرام کے لیے ایک ہی غلام الخلیل تھا۔ ہمارے اس زمانہ میں تو ہر محقق کے لیے لاکھ لاکھ غلام الخلیل موجود ہیں، مگر پرواہ نہیں، اس لیے کہ مردار، کرگس کا ہی حصہ ہوتا ہے، مردار گوشت کھانے کے لیے گدھ ہوا کرتے ہیں۔

جبکہ حضرت سمنونؒ کے نورِ عرفان کی بارشوں نے بغداد میں انہیں مرجعِ خلائق بنایا اور ہر ایک آپ کے فیضِ صحبت سے استفادہ کرنے کو جھکا تو غلام الخلیل کو اس کی جلن ہوئی اور حضرت سمنونؒ کے خلاف افتراء پردازیاں شروع کر دیں۔ مختصر یہ کہ ایک عورت حضرت سمنون رحمۃ اللہ علیہ

کی تابانی حسن پر فریفتہ ہوگئی اور خدمت میں حاضر آکر اپنے آپ کو پیش کیا، آپ نے صاف انکار کر دیا۔ مایوس ہو کر حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کی کہ آپ حضرت سمون کو حکم فرمائیں کہ مجھے قبول کر لیں۔ حضرت جنید اس عورت پر سخت ناراض ہوئے۔

جب عورت نے دیکھا کہ کامیابی ناممکن ہے تو اس نے غلام الخلیل کے پاس جا کر افتراء پردازی شروع کی، جیسا کہ عورتوں کا ان کے مکر کے اعتبار سے عام رویہ ہوتا ہے۔ غلام الخلیل تو پہلے ہی جل بھن رہا تھا، اس عورت کے بیانات اس طرح نے جیسے ایک دشمن اپنے دشمن کے متعلق کچھ سنا کرتا ہے اور پھر خوب طعن و تشنیع حضرت سمون کی شان میں کرتا رہا۔ حتیٰ کہ خلیفہ وقت کے کان تک واقعہ پہنچا دیا۔ خلیفہ کچے کانوں کی وجہ سے علی الفور برہم ہوا اور تجویز قتل سمون کی ٹھانی۔ جب جلا د بلا لیا گیا اور اس نے ضابطہ کے موافق حکم چاہا تو خلیفہ کی زبان قدرتا بند ہوگئی اور کچھ حکم نہ دے سکا۔

رات جب سویا تو خواب میں منکشف ہوا کہ قتل سمون تیری سلطنت کے زوال کا موجب ہے (ہوش کر اور غلام الخلیل کی فتنہ پردازی سے اپنی جان بچا)۔ صبح خدمت سمون میں خلیفہ حاضر ہوا اور اپنی غلطی کی معافی چاہی اور بہ شان و شکوہ آپ کو بری کیا۔

آپ کے بڑے بلند کلام اور دقیق ارشادات ہیں جن سے حقیقتِ محبت واضح ہوتی ہے اور یہ وہ بلند ہستی ہیں کہ ایک بار آپ سفر حجاز سے تشریف لا رہے تھے، مقام فیہ میں آئے تو اہل فیہ نے درخواست کی کہ کچھ وعظ سنائیں۔ آپ منبر پر رونق افروز ہوئے تو مجمع مجتمع نہ تھا۔ آپ نے قنادیل کی طرف رخ کر کے فرمایا کہ میں تمہیں وعظ سناتا ہوں۔ یہ فرمانا تھا کہ تمام قنادیلیں گر کر پور پور ہو گئیں۔ آپ کا ارشاد ہے:

لَا يُعْبَرُ عَنْ شَيْءٍ إِلَّا بِمَا هُوَ أَرْقُ مِنْهُ وَلَا شَيْءٌ أَرْقُ مِنَ الْمَحَبَّةِ
فَبِمَ يُعْبَرُ عَنْهَا.

”کسی چیز کو کسی چیز کے ساتھ تعبیر نہیں دی جاسکتی مگر اس کی جو اس کی بہ نسبت رقیق ہو اور محبت ایک ایسی باریک چیز ہے کہ اس سے رقیق کوئی شے نہیں، تو اس کی تشبیہ و تعبیر کس شے سے کی جائے۔“

اور اس سے مراد یہ ہے کہ محبت وہ چیز ہے کہ تشبیہ کسی چیز کے ساتھ نہیں ہو سکتی اس لیے کہ محبت صفتِ محبوب ہے، تو پھر اس کی حقیقت تب بیان ہو سکتی ہے جبکہ اس کا ادراک ممکن ہو اور صفاتِ محبوب کا ادراک محال ہے۔ وَاللَّهُ تَعَالَى أَعْلَمُ

ابوالفارس حضرت شاہ شجاع الکرمانی رحمۃ اللہ علیہ:

انہیں میں سے شاہ شیوخ، ابوالفارس حضرت شاہ شجاع الکرمانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں۔ شہزادہ ہیں، اپنے زمانہ کے بے نظیر صوفی ہوئے ہیں۔ حضرت ابوتراب نخشی رحمۃ اللہ علیہ کے صحبت یافتہ ہیں اور بہت سے مشائخ کرام کی زیارت کر چکے ہیں۔ حضرت ابو عثمان حیریؒ کے مناقب میں ان کا مختصر حال بیان ہو چکا ہے۔ تصوف میں ان کے مسائل مشہور ہیں ایک کتاب ”مرآة الحکماء“ ان کی مؤلفہ مشہور و معروف ہے۔ آپ کا کلام بہت بلند ہے۔ آپ کا ارشاد ہے:

لَا هِلَ الْفَضْلِ فَضْلٌ مَا لَمْ يَرَوْهُ فَإِذَا رَأَوْهُ فَلَا فَضْلَ لَهُمْ وَلَا هِلَ

الْوَلَايَةِ وَلَا يَةِ مَا لَمْ يَرَوْهَا فَإِذَا رَأَوْهَا فَلَا وَلَا يَةِ لَهُمْ.

”اہلِ فضیلت کو اسی وقت تک فضیلت حاصل ہے جب تک کہ وہ اپنی فضیلت کو خود نہ دیکھیں اور جب خود بنی آگئی، فضیلت جاتی رہتی ہے اور اہلِ ولایت اسی وقت تک ولی ہوتے ہیں جب تک انہیں اپنی ولایت کا احساس نہ ہو۔ جب وہ اپنے آپ کو ولی سمجھنے لگیں تو سمجھ لو کہ ان کی ولایت گئی۔“

اس سے مراد یہ ہے کہ جب تک فضل ولایت رہتا ہے تو خود بنی ساقط ہو جاتی ہے۔ جب خود بنی آ جاتی ہے تو معنی حقیقی ولایت کے اس سے ساقط ہو جاتے ہیں۔ اس لیے کہ فضل ایسی صفت ہے کہ جسے وہ حاصل ہو جائے تو اسے معلوم نہیں ہوتا۔ اسی طرح ولایت بھی ایسی صفت ہے کہ ولی کو اپنی ولایت کی رویت نہیں ہوتی اور جب کوئی کہنے لگے کہ میں فاضل ہوں یا ولی، تو نہ وہ فاضل ہے نہ ولی۔ ان کی کرامتوں میں لکھا ہے کہ مکمل چالیس سال آپ نے دن رات خواب نہیں فرمایا اور قطعاً نہیں سوئے اور جب کبھی آنکھ لگی بھی تو اللہ تعالیٰ سے لگی۔ چنانچہ جب خواب میں جمال الہی سے مشرف ہوئے تو آپ نے عرض کی: الہی! میں تیرے جمالِ باکمال کو بیداری شب میں دیکھنا چاہتا تھا لیکن آج سویا تو جمال پایا۔ ارشاد ہوا: اے شاہ! ان راتوں کی بیداری کی بدولت ہی آج تو ہمیں خواب میں دیکھ رہا ہے، اگر وہ راتیں بیداری میں نہ گزارتا تو آج ہمیں خواب میں نہ پاتا۔

وَاللَّهُ تَعَالَى أَعْلَمُ

حضرت عمرو بن عثمان مکی رحمۃ اللہ علیہ:

انہیں میں سے سرور دل نور حضرت عمرو بن عثمان مکی رضی اللہ عنہ ہیں۔ کبرائے قوم سے اور سادات زمانہ سے گزرے ہیں۔ آپ کی تصانیف تصوف میں مشہور ہیں۔ آپ کو نسبت ارادت

حضرت جنید بغدادی رضی اللہ عنہ سے تھی۔ پہلے آپ حضرت ابوسعید خراز رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت سے مشرف ہوئے، پھر حضرت جنید سے بیعت کی۔

اصول میں آپ امام وقت تھے، آپ سے مروی ہے کہ فرمایا:

لَا يَقَعُ عَلَى كَيْفِيَةِ الْوَجْدِ عِبَارَةٌ لِأَنَّهُ سِرٌّ لِلَّهِ عِنْدَ الْمُؤْمِنِينَ.

”کیفیت وجدانیہ کی ترجمانی کسی لفظ اور عبارت سے نہیں ہو سکتی، اس لیے کہ

وہ خاص سر الہی ہے اور مؤمنین اس کے امین ہیں۔“

اور وہ چیز جس پر بندہ کی عبارت اور الفاظ کا تصرف ہو سکتا ہے وہ ہرگز سحر حق نہیں اس لیے کہ کیفیت تصرف و تکلف کا اسرار ربانیہ سے منقطع ہے۔

کہتے ہیں کہ جب حضرت عمرو بن عثمان اصفہان تشریف لائے تو ایک بے ریش نو عمر لڑکا آپ کی صحبت میں آیا اور اس لڑکے کا باپ اسے آپ کی خدمت میں آنے سے مانع تھا۔ آخر وہ اس روک ٹوک کی وجہ سے اس قدر غمگین ہوا کہ بیمار ہو گیا۔ ایک مدت تک بیمار رہا۔ آخر ایک روز آپ اپنی جماعت کے ساتھ اس کی عیادت کو تشریف لے گئے۔ لڑکے نے حضرت عمرو بن عثمان سے عرض کی کہ حضور! قوال کو حکم فرمائیں کہ وہ کچھ سنائے۔ آپ نے قوال کو فرمایا۔ قوال نے گانا شروع کیا اور یہ بیت پڑھی:

مَالِي مَرِيضٌ فَلَمْ يَعُدْ نِي عَائِدٌ وَيَمْرَضُ عِنْدَكُمْ فَأَعِيدُ

”کیا بات ہے کہ میں بیمار ہوا تو تم میں سے کسی نے میری عیادت نہ کی،

حالانکہ تم میں سے کوئی بیمار ہو تو میں عیادت کرتا ہوں۔“

مریض نے جیسے ہی یہ شعر سنا تو بستر مرض سے اٹھا اور بیٹھ گیا اور اس کے چہرے سے

ظاہر تھا کہ مرض میں افاقہ ہے، لڑکا بولا: زِدْنِي، کچھ اور بھی سنا، قوال نے یہ بیت سنائی:

وَأَشَدُّ مِنْ مَرِيضِي عَلَى صِدِّكُمْ وَصِدُّكُمْ عَلَيَّ شَدِيدٌ

”اور میرے مرض کی سخت ترین علت تم سے مجھے روکنا ہے اور اس سے زیادہ

اشد اور بھاری تمہارا مجھ سے رک جانا ہے۔“

اس کے بعد وہ لڑکا تندرست ہو گیا۔ باپ نے یہ کرامت دیکھ کر لڑکے کو حضرت عمرو بن

عثمان کے سپرد کر دیا اور جو بدگمانی اس کے دل میں تھی، وہ جاتی رہی اور تائب ہوا اور یہ لڑکا اپنی قوم

کے بہترین درویشوں میں ہوا۔ وَاللَّهُ تَعَالَى أَعْلَمُ

حضرت سہل بن عبداللہ تستری رحمۃ اللہ علیہ:

انہیں میں سے مالک القاب، ماجی العیوب حضرت ابو محمد سہل بن عبداللہ تستری رضی اللہ عنہ اپنے وقت کے بہترین شیخ ہیں۔ اور آپ ہر زبان میں نہایت ستودہ تھے۔ آپ کی ریاضتیں بہت زیادہ ہیں اور آپ نہایت باعمل تھے۔ آپ کا اخلاص و عیوب افعال میں نہایت لطیف کلام ہے۔ علماء ظاہری آپ کی شان میں کہتے:

هُوَ جَمْعُ بَيْنِ الشَّرِيعَةِ وَالْحَقِيقَةِ .

”انہوں نے شریعت و حقیقت میں اتحاد کر کے دکھا دیا۔“

لیکن یہ کہنا ان اربابِ ظواہر کا غلط ہے۔ اس لیے کہ کوئی صوفی ایسا نہیں جو شریعت و طریقت میں فرق کرتا ہو۔ اس لیے کہ شریعت، بغیر حقیقت کے مکمل نہیں اور حقیقت، بغیر شریعت کے حقیقت نہیں ہو سکتی۔

ہاں! یہ ضرور ہے کہ اور مشائخ کے کلام بہت باریک اور ادق ہیں جسے عوام کے ذہن قبول نہیں کر سکتے اور حضرت سہلؒ کے مضامین بہت سہل اور اس قدر آسان ہیں کہ عوام کے ذہن بھی اسے قبول کر لیتے ہیں۔ اس وجہ میں انہوں نے اس خصوصیت کے ساتھ حضرت سہلؒ کی تعریف کی، ورنہ جبکہ خود حضرت ربِّ عز اسمہ نے شریعت و طریقت اور حقیقت کو متحد کیا ہے تو اولیاء کرام کا اس میں فرق کرنا محال ہے۔ اس سے لامحالہ یہ بات ضرور ہوگی کہ جب فرق، حقیقت و شریعت میں سمجھا جائے گا تو ایک کو رد کر کے دوسرے کو قبول کرنا ہوگا اور یہ بات یاد رکھو کہ ردِ شریعت الحادِ خالص ہے اور ردِ حقیقت شرک، اور جو فرق کرتے ہیں وہ تفریق معنوی کے لیے کرتے ہیں تو وہ تفریق عین ثبات ہے۔

جیسے کہتے ہیں ”لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ“ حقیقت ہے اور ”مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللَّهِ“ شریعت۔ اگر کوئی چاہے کہ ایمان صحیح رکھ کر ایک کو دوسرے سے جدا کر دے، ایسا ہرگز نہیں کر سکتا اور اس کی یہ خواہش باطل محض ہوگی۔ درحقیقت شرع فرع حقیقت ہے جس طرح معرفت فرع حقیقت ہے۔

تو خلاصہ یہ ہوا کہ امثال امر اور تعمیل حکم کرنا، اہل ظواہر کے لیے شریعت کے معنی میں ہے۔ جس چیز کو اس کی طبیعت قبول نہ کرے اور بے سمجھی سے الجھ جائیں اس سے منکر ہو جاتے ہیں اور انکار کے اصل کا اصول راہِ حق میں نہایت خطرناک۔ وَالْحَمْدُ لِلَّهِ عَلَى الْإِيمَانِ ”اور اس ربِّ جلیل وجہ منیر کو عطاءِ ایمان پر حمد ہے“۔ آپ سے مروی ہے کہ فرمایا:

مَا طَلَعَتِ الشَّمْسُ وَلَا غَرَبَتْ عَلَى أَهْلِ وَجْهِ الْأَرْضِ إِلَّا وَهُمْ

جُهَالٌ بِاللَّهِ إِلَّا مَنْ يُوْتِرُ اللّٰهَ عَلٰى نَفْسِهِ وِرْوٰجَهُ وَدُنْيَاَهُ وَاٰخِرَتِهِ .
 ’آفتاب طلوع اور غروب نہیں ہوتا کسی روئے زمین کے رہنے والے پر، مگر وہ
 ذات عزاسمہ کے ساتھ جاہل ہوتا ہے مگر وہی جسے اللہ تعالیٰ نے برگزیدہ فرمایا
 ہو، اس کی جان و تن اور دنیا و آخرت سے۔“

یعنی جو اپنے کج دل میں اپنے دستِ ارادی کو متصرف مانتا ہے یہ اس کی جہالت کی دلیل
 ہے ذاتِ واجب تعالیٰ شانہ سے اور جسے نعمتِ عرفان حاصل ہے وہ ترکِ تدبیر میں جھکا ہوا ہے۔
 یہ جہل سے معرفتِ تقدیر کی دلیل ہے۔ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ
 حضرت ابو عبد اللہ محمد بن فضل بلخی رحمۃ اللہ علیہ:

انہیں میں سے برگزیدہ اہلِ حرمین، قرۃ العین حضرت ابو عبد اللہ محمد بن فضل بلخی رضی اللہ
 تعالیٰ عنہ ہیں۔ اجلہ مشائخ سے ہیں۔ اہلِ عراق و خراسان کے محبوب ترین پیشوا تھے۔ حضرت
 احمد بن حنبلہؒ کے مرید اور حضرت ابو عثمان حیری رحمۃ اللہ علیہ کو ان سے خاص محبت تھی۔ آپ کو بلخ
 کے متعصب کج رو جاہلوں نے، آپ کے مسلکِ عشق سے بدظن ہو کر بلخ سے نکال دیا۔ مگر آپ نے
 اپنا مسلک نہ چھوڑا۔ بلخ چھوڑ کر سمرقند میں عمر بسر فرمائی۔

آپ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا:

اَعْرَفَ النَّاسِ بِاللّٰهِ اَشَدُّهُمْ مُجَاهِدَةً فِیْ اَوْامِرِهِ وَاَتَّبَعُهُمْ بِسُنَّةِ
 نَبِيِّهِ (ﷺ) .

”اربابِ عرفان میں بزرگ ترین وہ ہے جو اوامرِ شریعت کی اتباع میں سعی و
 مجاہدہ کرے اور اہلِ اتباع میں بہترین وہ ہے جو سنتِ رسالتِ آدابِ ﷺ کا
 نہایت کوشش سے پیرو ہو۔“

آپ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا:

عَجِبْتُ مِمَّنْ يَّقْطَعُ الْبَوَادِي وَالْقَفَارَ وَالْمَفَاوِزَ حَتَّى يَصِلَ اِلَى بَيْتِهِ
 وَحَرَمِهِ لَانَ فِيهِ اَثَارَ اَنْبِيَائِهِ كَيْفَ لَا يَقْطَعُ نَفْسَهُ وَهَوَاهُ حَتَّى يَصِلَ
 اِلَى قَلْبِهِ لَانَ فِيهِ اَثَارَ مَوْلَاهُ .

”مجھے تعجب ہے اس پر جو وادی اور جنگل عبور کر کے اللہ کے گھر (مکہ) پہنچتا
 اور اس کی حرم سے آلتا، اس لیے کہ اس میں انبیاء کرام علیہم السلام کے آثار
 ہیں۔ وہ کیوں نفس کے لیے جنگلوں اور حرص کے دریاؤں کو قطع کر کے اپنے

کنج قلب تک نہیں پہنچتا کہ اس میں اس کے مالک کے نشان ہیں۔“
یعنی دل محل معرفتِ الہی ہے اور فضیلت میں کعبہ سے افضل ہے۔ اس لیے کہ کعبہ قبلہ
عبادت ظاہری اور بندہ کی نگاہ اس پر رہتی ہے مگر دل وہ ہے کہ اس پر نظر رب جلت مجد عز اسمہ ہے،
تو جہاں دل ہے وہاں میرا محبوب ہے اور جہاں اس کی ملکیت ہے میری مراد وہاں ہی ہے اور جہاں
انبیاء کرام علیہم السلام کے نشان ہیں وہاں ہمارے دوستوں، محبوبوں کا قبلہ ہے۔ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ
حضرت ابو عبد اللہ محمد بن علی ترمذی رحمۃ اللہ علیہ:

انہیں میں سے شیخ باخطر، فانی از صفات بشر ابو عبد اللہ حضرت محمد بن علی الترمذی رضی اللہ
تعالیٰ عنہ ہیں، علوم فنون میں امامِ کامل اور محققین مشائخ سے گزرے ہیں۔ آپ کی بہت سی تصانیف
ہیں اور کرامتیں بھی مشہور ہیں اور آپ کی تصانیف سے آپ کی کرامت شان ظاہر ہے۔ جیسے ”ختم
الولایت“، ”کتاب النهج“، ”نوادرا الاصول“ وغیرہ۔ علاوہ اس کے بعض کتابیں بہت ہی
زبردست ہیں۔ چنانچہ میرا ان کے ساتھ رابطہ عقیدت اتنا ہے کہ گویا میں اور میرا دل تو ان کا شکار
ہے اور میرے شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ محمد بن علی وہ دُرّ یتیم ہے کہ عالم میں اس کی مثال نہیں اور
علوم ظاہری میں بھی ان کی بہت سی تالیفات ہیں اور احادیث میں ان کی سندیں نہایت بلند ہیں اور
قرآن کریم کی تفسیر بھی لکھنی شروع کی مگر عمر تمام ہو گئی، مگر جس قدر لکھی ہے وہ اہل علم میں موجود ہے۔
اور علم فقہ ترمذی میں حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے خاص مصاحب و دوست
حضرت محمد حکیم سے حاصل کیا۔ یہ وہ محمد حکیم ہیں کہ ولایت ترمذ کے صوفی حکماء ان کا ہی اقتداء کرتے
تھے۔ غرضیکہ ان کے مناقب بہت ہیں۔ منجملہ ان کے ایک یہ ہے کہ آپ کو حضرت خضر علیہ السلام کی
صحبت بھی حاصل ہوئی۔ اور آپ کے مرید حضرت ابو بکر وراق راوی ہیں کہ ہر یک شنبہ یعنی اتوار
کو حضرت خضر علیہ السلام آپ کے پاس تشریف لاتے تھے اور آپس میں واقعات پر سوال و جواب
ہوا کرتے تھے۔ آپ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا:

مَنْ جَهَلَ بِأَوْصَافِ الْعَبُودِيَّةِ فَهُوَ بِنُعُوتِ الرَّبُّوبِيَّةِ أَجْهَلُ.

”جو علم شریعت اور اوصافِ بندگی سے جاہل ہے وہ نعت ربوبیت سے سخت

ترین جاہل ہے۔“

اور جو ظاہر میں نفس کو نہیں پہچانتا وہ حق تعالیٰ شانہ کے عرفان کا راستہ ہرگز نہیں جان سکتا
اور آفات، صفات بشریت نہیں دیکھ سکتا۔ وہ لطائفِ صفاتِ حق ہرگز نہیں جان سکتا اس لیے کہ ظاہر کا
تعلق باطن سے ہے۔ تو جو ظاہر سے بغیر باطن کے تعلق کرے، یہ محال ہے اور جو باطن سے تعلق

کرے، اس کا تعلق بغیر ظاہری تعلق کے محال ہے۔ تو خدا کی صفتوں کی معرفت عبودیت کے ارکان کی صحت پر موقوف ہے، اس کے بغیر معرفت حاصل نہیں ہو سکتی اور یہ کلمہ اصل اصول ہے اور نہایت ہی مفید بات ہے۔ ان شاء اللہ اس کی مزید توضیح اپنی جگہ پر کی جائے گی۔

حضرت ابو بکر محمد بن عمر وراق رحمۃ اللہ علیہ:

انہیں میں سے شرف زہاد امت، سر تاج اہل فقر و صفوۃ حضرت ابو بکر محمد بن عمر الوراق رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں۔ بزرگانِ مشائخ سے گزرے ہیں اور زہاد قوم میں تھے۔ حضرت احمد بن خضرو یہ اور حضرت محمد بن علی رضی اللہ عنہما کے دیکھنے والے اور ان کے صحبت یافتہ ہیں۔ آپ کی تالیفات آداب و معاملات میں متعدد ہیں اور مشائخ کرام میں آپ ”موڈب ادیب“ کہلاتے ہیں۔

آپ ایک حکایت فرماتے ہیں کہ حضرت محمد بن علی رحمۃ اللہ علیہ نے چند اجزاء مجھے دیئے اور فرمایا انہیں دریائے جیحون میں ڈال دے۔ میرے دل نے یہ گوارا نہ کیا، میں نے بجائے دریا میں ڈالنے کے انہیں گھر میں رکھ دیا اور خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی کہ دریا میں ڈال آیا ہوں۔ فرمایا: پھر کیا دیکھا؟ میں نے عرض کی، کچھ نہیں دیکھا۔ فرمایا: تو نے وہ دریا میں نہیں ڈالا، واپس جاؤ اور دریا میں ڈالو۔ واپس حکم کی تعمیل کے لیے چلا اور دل میں اس امر کا احساس ہوا کہ میں نے غلط بیانی کی۔ آخرش وہ اجزاء میں نے دریا میں ڈالے تو فوراً دریا پھٹا اور اس میں سے ایک صندوق ظاہر ہوا جس کا ڈھکنا کھلا ہوا تھا اور اس میں وہ جزو جو میں نے دریا میں ڈالے تھے چلے گئے اور صندوق کا ڈھکنا بند ہو گیا اور پانی بھی مل گیا اور صندوق واپس پانی میں چلا گیا۔ یہ سب تماشہ دیکھ کر میں واپس آیا اور تمام قصہ عرض کیا۔ فرمایا اب تو یقیناً وہ اجزاء پانی میں ڈال کر آیا۔ میں نے عرض کی حضور! اس معاملہ کا راز تو معلوم ہونا چاہیے۔ فرمایا ہم نے اصول اور تحقیق میں کچھ تصنیف کیا تھا لیکن اس کے سمجھنے کی عام عقلوں میں اہلیت نہ تھی۔ حضرت خضر علیہ السلام نے وہ مجھ سے طلب فرمائے اور اللہ تعالیٰ نے دریائے جیحون کو حکم دیا کہ ان اجزاء کو خضر تک پہنچا دے۔ چنانچہ وہ اس ذریعہ سے خضر علیہ السلام تک پہنچ گئے۔

آپ سے مروی ہے کہ فرمایا:

النَّاسُ ثَلَاثَةٌ الْعُلَمَاءُ وَالْأُمَرَاءُ وَالْفُقَرَاءُ فَإِذَا فَسَدَ الْعُلَمَاءُ فَسَدَ
الطَّاعَةُ وَالشَّرِيعَةُ وَإِذَا فَسَدَ الْأُمَرَاءُ فَسَدَ الْمَعَاشُ وَإِذَا فَسَدَ
الْفُقَرَاءُ فَسَدَ الْأَخْلَاقُ.

”آدمی تین قسم کے ہیں: ایک علماء، دوسرے امراء، تیسرے فقراء۔ جب علماء

میں فساد پیدا ہوگا، طاعتِ الہی اور شریعتِ مطہرہ میں فساد ہو جائے گا اور جب امراء میں فساد آگیا تو لوگوں کی معاش خراب ہو جائے گی اور جب فقراء بگڑ گئے تو لوگوں کے اخلاق و عادات خراب ہو جائیں گے۔“
تو امراء و سلاطین کا فساد، جور و تعدی، ظلم و ستم ہے اور علماء کا فساد طمع و حرصِ آز ہے اور فقراء کا فساد ریاست و جاہِ طلبی۔

جب تک علماء، امراء، ملوک، علماء سے علیحدہ نہ ہوں گے، تباہ نہ ہوں گے اور جو رملوک بے علمی کی وجہ میں ظہور پذیر ہوتا ہے اور علماء کا طمع بے دینی و ریا کی وجہ سے ہوگا اور فقر میں ریاستِ طلبی بے توکلی کی وجہ میں آئے گی۔ تو بادشاہ بے علم اور عالم بے عمل اور فقیر بے توکل شیطان کے قرین و انیس ہیں اور علم کا فساد ان تینوں میں آجانے سے ہوتا ہے۔ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ
حضرت ابوسعید احمد بن خراز رحمۃ اللہ علیہ:

انہیں میں سے سفینہ توکل و رضا، سالکِ طریق فنا ابوسعید احمد بن عیسیٰ خراز رضی اللہ عنہ ہیں۔ بڑے زبردست اہل کشف گزرے ہیں۔ مریدوں کے احوال درونی کے بہترین ترجمان اور طالبوں کے حالات پر زبردست برہان تھے۔ آپ کی خصوصیات سے یہ بات ہے کہ طریق ”فنا و بقا“ کو الفاظ کا جامہ پہنا کر واضح فرمانے والے ایک آپ ہی تھے۔ آپ کے مناقب مشہور ہیں اور آپ کی ریاضت اور نکات کا بہت زیادہ چرچا ہے۔ آپ کی تصانیف اور کلام اور رموزات نہایت بلند تھے۔ حضرت ذوالنون مصریؒ کو آپ نے پایا اور حضرت بشرحانی اور سری سقطی رحمۃ اللہ علیہما کے صحبت یافتہ تھے۔ آپ نے حضور سید یوم النشور ﷺ کے اس فرمان پر کہا، حضور کا فرمان ہے:

جُبِلَتْ الْقُلُوبُ عَلَى حُبِّ مَنْ أَحْسَنَ إِلَيْهَا. (۱)

۱۔ اسے امام ابو نعیم، ابوالشیخ، ابن حبان اور خطیب نے اپنی ”تاریخ“ میں اسماعیل بن ابان الخياط کے طریق سے روایت کیا ہے، کہتے ہیں کہ حسن بن عمارہ تک یہ بات پہنچی کہ اعمش نے اس کے بارے برا بھلا کہا ہے پس اس نے اس کی طرف ایک لباس بھیجا، جس پر اعمش نے اس کی تعریف کی، اعمش کو کہا گیا کہ (پہلے) ٹوٹنے اس کی خدمت کی پھر اس کی تعریف کی؟ (کہنے لگے کہ خیمہ نے مجھ سے ابن مسعود کے حوالہ سے بیان کیا کہ) انہوں نے کہا کہ: ”جُبِلَتْ الْقُلُوبُ عَلَى حُبِّ مَنْ أَحْسَنَ إِلَيْهَا وَبُغِضَ مَنْ أَسَاءَ إِلَيْهَا.“
اسے ابن عدی نے ”الکامل“ میں، امام بیہقی نے ”شعب الایمان“ میں اور امام ابن جوزی نے ”العلل المتناہیة“ میں اور قضاعی نے ”مسند شہاب“ میں مرفوعاً روایت کیا ہے اور ابن جوزی نے کہا ہے کہ یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ اسماعیل الخياط مجروح راوی ہے۔ (بقیہ حواشی اگلے صفحہ پر۔۔۔)

”دلوں میں اللہ تعالیٰ نے یہ جبلی اثر رکھا ہے کہ وہ اس کی طرف مائل ہوتا ہے جو اس کے ساتھ نیکی کرے۔“

یعنی جو کسی کے ساتھ احسان کرے لامحالہ اس کے ساتھ انسان کا دل نیکی کرے گا اور اسے محبوب سمجھے گا تو آپ نے اس پر فرمایا:

وَاعْجَبَا مِمَّنْ لَّمْ يَرْحَمْنَا غَيْرَ اللَّهِ كَيْفَ لَا يَعْجَبُ بِكَلْبِيَةِ إِلَى اللَّهِ.
”سخت تعجب ہے کہ جو شخص سوائے اپنے رب کے کسی کو محسن ہی نہ دیکھے، وہ کیوں کلبیۃ اپنے رب کی طرف مائل نہیں ہوتا۔“

اس لیے کہ احسان درحقیقت اسی کا ہے جو مالک اعیان رب الارباب کر رہا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ احسان کسی کے ساتھ نیکی کرنے کو کہتے ہیں۔ پھر اس احسان کا بدلہ اس کے ساتھ پورا ہو سکتا ہے جو جزائے احسان کا محتاج ہو اور اس کا احسان بھی اس شان کا ہو کہ جس چیز سے وہ احسان کر رہا ہے وہ اس کی ملک بھی نہیں ہے۔ پھر وہ احسان نہ احسان ہے نہ اس احسان کا بدلہ

(بقیہ حواشی گزشتہ صفحہ سے)

امام سیوطی نے ابن عدی کے حوالہ سے ”الجامع الصغير“ میں، ابو نعیم نے ”حلیۃ الاولیاء“ اور امام بیہقی نے ”شعب الایمان“ میں ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے طریق سے روایت کیا ہے اور اسے موقوفاً صحیح قرار دیا ہے، جب کہ امام سیوطی نے اسے ضعیف قرار دیا ہے اور امام سخاوی نے ”المقاصد الحسنۃ“ میں اس کے بارے میں کہا ہے کہ یہ موقوفاً اور مرفوعاً باطل ہے اور بیہقی کا ابن عدی کی طرح یہ کہنا کہ اعمش سے موقوف روایت معروف ہے، محتاج تاویل ہے کیونکہ امام ابن عدی اور امام بیہقی نے اسے ایسی سند کے ساتھ روایت کیا ہے جس میں ایک راوی متہم بالكذب والوضع ہے۔ امام مناوی نے ”فیض القدير“ میں کہا ہے کہ میں نے ابن عبدالمہادی کے تذکرہ میں ان کے خط کے ساتھ دیکھا ہے کہ انہوں نے کہا کہ میں نے اس کے بارے میں احمد اور یحییٰ سے سوال کیا تو انہوں نے کہا کہ اس روایت کی کوئی اصل نہیں، یہ موضوع ہے۔
حوالہ کے لئے دیکھیں:

الکامل لابن عدی ۱/۸۲، تاریخ بغداد للخطیب ۶/۳۲۶، مسند الشہاب (۱۰۳)، حلیۃ
الاولیاء لأبی نعیم ۳/۱۲۱، کشف الخفاء للعجلونی (۱۰۶۳)، المقاصد الحسنۃ
للسخاوی (۳۶۵)، تمییز الطیب من الخبیث (۳۸۰)، فیض القدير للمناوی ۳/۳۲۳،
أسنی المطالب (۵۲۹)، الجامع الصغير (۳۵۸۰)، الجامع الكبير (حدیث: ۱۳۱۹۲)،
الغماز علی اللماز للسمهودی (۸۱)، الدرر المنثرة للسيوطی (۱۷۶)، أمثال أبي الشيخ
(۱۲۰)، العلیل المتناهیة لابن الجوزی ۲/۲۹، الفوائد المجموعۃ للشوکانی (۸۲)،
میزان الاعتدال للذہبی ۱/۵۱۳.

ہے۔ اس لیے کہ بدلہ بھی ایسی ہی چیز سے ہوتا ہے کہ جو بدلہ دینے والے کے ملک نہیں۔
تو تمام ملک، ملک الہی ہے اور وہ، وہ ذات ہے کہ اپنے غیر سے بے نیاز ہے۔ اور
محبوبانِ بارگاہ اس کی حقیقت کو جانتے ہیں کہ انعام و احسان میں منعم حقیقی اور محسن حقیقی وہی ایک
ذات ہے اور وہ اپنے دلوں کو کلیۃً اس کا اسیر بنائے ہوئے ہیں اور اُن کی دوستی اسی ذات کے ساتھ
ہے اور وہ غیر ذات منعم حقیقی سے ہمیشہ اعراض کرتے ہیں۔

حضرت ابوالحسن علی بن محمد اصفہانی رحمۃ اللہ علیہ:

انہیں میں سے شاہد محققان، دلیل مریداں حضرت ابوالحسن علی بن محمد اصفہانی رضی اللہ عنہ
ہیں اور کہتے ہیں کہ حضرت علی بن سہیلؒ بھی مشائخ کبار سے گزرے ہیں اور حضرت جنید بغدادی
رضی اللہ عنہ کی خط و کتابت حضرت ابوالحسن علیؒ کے ساتھ جو ہوئی ہے، وہ نہایت لطیف مضامین سے
پُر ہے اور یہ اس پایہ کے بزرگ گزرے ہیں کہ حضرت عمرو بن عثمانؒ ان کی زیارت کے لیے
اصفہان حاضر ہوئے اور عمرو بن عثمانؒ خود اتنے زبردست صوفی عارف تھے کہ انہیں حضرت ابو تراب
رضی اللہ عنہ کی صحبت کا شرف حاصل تھا اور حضرت جنیدؒ کے رفیق خاص تھے۔ مگر ابوالحسن رضی اللہ عنہ
کا پایہ طریق تصوف میں بہت ستودہ تھا اور آپ فن تصوف میں رضا و ریاضت کے زیور سے آراستہ
تھے اور تصرفِ نفسِ لغاڑہ اور ہر قسم کے فتن و آفات سے محفوظ تسلیم کیے گئے ہیں۔ آپ کے طرزِ بیان
کو حقائق و معاملات میں نہایت پسند کیا جاتا تھا اور دقائق و اشارات میں آپ کا کلام لطیف تھا۔ آپ
سے مروی ہے کہ فرمایا:

الْحُضُورُ أَفْضَلُ مِنَ الْيَقِينِ لِأَنَّ الْحُضُورَ وَطَنَاكَ وَالْيَقِينُ خَطَرَاتٌ.

”حضورِ بارگاہِ لم یزل افضل ترین ہے محض یقین و جوہ ذات سے اس لیے کہ

حضورِ ذات جو آئینہ دل میں ہے وہ وطن کی طرح ہے اور اس پر غفلت کسی

طرح روا ممکن نہیں اور یقین خاطر ایک ایسا تصور ہے کہ کبھی آتا ہے اور کبھی

جاتا رہتا ہے۔“

تو حاضرین حضورِ بارگاہِ لم یزل میں رہتے ہیں اور مومنین درگاہِ ایزدی پر کبھی غیبی بیت کے

حجاب میں ہوتے ہیں، اور حضورِ بارگاہ کی تفصیل کے لیے ایک علیحدہ باب اس کتاب میں آئے

گا۔ اِنْ شَاءَ اللَّهُ

آپ نے فرمایا:

مِنْ وَقْتِ اِدْمَ اِلَى قِيَامِ السَّاعَةِ النَّاسُ يَقُولُونَ الْقَلْبُ الْقَلْبُ وَاَنَا

أَحِبُّ أَنْ أُرَى رَجُلًا يَصِفُ لِي شَقَّ الْقَلْبِ فَلَا أَرَى.

”آدم علیہ السلام کے وقت سے قیامت تک لوگ دل دل کہتے چلے آ رہے ہیں اور میں اس امر کو درست رکھتا ہوں کہ ایک ایسا آدمی دیکھوں جو بیان کرے کہ دل چیز کیا ہے اور وہ کیسا ہوتا ہے مگر میں نے ایسا آدمی نہیں دیکھا۔“

اور عوام الناس پارہ گوشت کو دل کہتے ہیں اور وہ گوشت پارہ بجانین و اطفال اور مغلوب النفس لوگوں کے لیے دل ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ اہل دل نہیں بلکہ محض بے دل ہیں۔ تو دل کیا چیز ہوا؟ اگر دل وہ ہے جس سے انواع و اقسام کی عبارتیں مسموع ہو رہی ہیں تو پھر اسے عقل کیوں نہ کہا جائے، وہ دل نہیں ہے۔

اور اگر روح کا نام دل رکھا جائے تو وہ بھی نہیں ہے اور اگر علم کو دل کہا جائے تو وہ بھی دل نہیں۔ تو خلاصہ یہ ہوا کہ دل وہ ہے کہ جس میں شواہد حقہ کا قیام ہو اور اس کے علاوہ جسے بھی دل کہو وہ عبارتیں اور لفظی دل ہے، حقیقتاً دل نہیں۔

حضرت ابوالحسن محمد بن اسماعیل خیر نسا ج رحمۃ اللہ علیہ:

انہیں میں سے پیر اہل تسلیم اندر طریق محبت مستقیم حضرت ابوالحسن محمد بن اسماعیل خیر نسا ج رضی اللہ عنہ ہیں۔ بزرگان مشائخ سے تھے اور اعمال میں آپ بہترین و اعظ گزرے ہیں۔ آپ کی عبارات نہایت مہذب ہوتی تھیں۔ عمر دراز پائی ہے۔ حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت ابراہیم خواص رحمۃ اللہ علیہ نے انہیں کی مجلس میں توبہ کی۔

آپ نے حضرت شبلیؒ کو محافظتِ مراحم جنید کے لیے حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں بھیج دیا۔ آپ حضرت سری سقطی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت تھے اور آپ حضرت جنید کے ہم عصر تھے اور حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ آپ کا بہت وقار کرتے تھے۔ حضرت ابو حمزہ بغدادی رحمۃ اللہ علیہ آپ کے فرامین گوش قبول سے سنا کرتے تھے۔

آپ کو ”خیر نسا ج“ اس وجہ میں کہا جاتا ہے کہ ایک بار آپ مولد سے سامرہ کی طرف بقصد حج تشریف لے جا رہے تھے۔ راستہ میں آپ کا گزر کوفہ میں ہوا۔ دروازہ کوفہ پر ایک خزاب یعنی ریشم بننے والے جلا ہے نے پکڑ لیا اور کہا تم میرے غلام ہو اور تمہارا نام خیر ہے۔ آپ نے اس کی اس حرکت کو منجانب اللہ سمجھا اور اس کی مخالفت نہ کی۔ کئی سال اس کی خدمت کرتے رہے جبکہ وہ آپ کو پکارتا: یا خیر! تو آپ اس کے جواب میں لبیک فرماتے۔ یعنی وہ کہتا اے خیر، تو آپ

فرماتے حاضر۔ آخرش وہ اپنے کیے پر پشیمان ہوا اور ایک دن کہنے لگا، تشریف لے جائیں، میں نے غلطی کی، آپ میرے غلام نہیں ہیں۔

آپ وہاں سے رخصت ہو کر مکہ معظمہ آ گئے۔ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کے متعلق فرمایا: خیر خیرة "خیر ہماری نیکی ہے"، اور اسے آپ محبوب رکھتے جو آپ کو "خیر" کے نام سے پکارتا اور آپ فرماتے کہ میرے لیے روا نہیں کہ ایک مرد خدا میرا نام رکھے اور میں اس نام کو پلٹ دوں۔

کہتے ہیں کہ جب آپ کی وفات کا وقت آیا، نماز مغرب کا وقت تھا۔ جب آپ کو کیفیتِ غشیانی سے ہوش آیا اور آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ ملک الموت کھڑا ہے۔ آپ نے فرمایا:

قَفَّ عَافَاكَ اللَّهُ فَإِنَّمَا أَنْتَ عَبْدٌ مَّامُورٌ وَأَنَا عَبْدٌ مَّامُورٌ وَمَا أَمَرْتُ بِهِ لَا يَفُوتُكَ وَمَا أَمَرْتُ بِهِ فَهُوَ شَيْءٌ يَفُوتُنِي فَدَعْنِي أَمْضِي فِيمَا أَمَرْتُ بِهِ ثُمَّ أَمْضِ بِمَا أَمَرْتُ بِهِ .

"کھمبہ، اللہ تجھے معاف فرمائے! بیشک تو بھی عبد مامور (حکم دیا ہوا بندہ) ہے اور میں بھی بندہ حکم الہی ہوں اور جو کچھ تجھے حکم ملا ہے وہ ٹل نہیں سکتا، یعنی جان لینا لازمی ہے، اور جو حکم مجھے ملا ہے وہ میری فروگزاشت کی وجہ میں ٹل رہا ہے یعنی وقت نماز ہے وہ مجھے پڑھ لینے دے تاکہ میں اس حکم سے سبکدوش ہوں جو مجھے حکم ملا ہے، پھر میں تجھے اجازت دوں گا کہ تو اپنے متعلقہ حکم کی تعمیل سے سبکدوش ہو۔"

پھر آپ نے پانی طلب فرمایا اور وضو کیا، نماز شام ادا فرمائی۔ اُس کے بعد جانِ آفرین کو جان سپرد فرمائی۔ اسی شب آپ کو لوگوں نے خواب میں دیکھا۔ پوچھا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے ساتھ کیا سلوک فرمایا۔ جواب دیا:

لَا تَسْتَلْنِي عَنْ هَذَا وَلَكِنْ اسْتَرَحْتُ مِنْ دُنْيَاكُمْ .

"مجھ سے یہ نہ پوچھو، مگر اتنا بتائے دیتا ہوں کہ تمہاری اس دنیا سے بہت راحت میں ہوں۔"

آپ سے مروی ہے کہ اپنی مجلس خاص میں فرمایا:

شَرَحَ اللَّهُ صُدُورَ الْمُتَّقِينَ بِنُورِ الْيَقِينِ وَكَشَفَ بَصَائِرَ الْمُؤَقِنِينَ بِنُورِ حَقَائِقِ الْإِيمَانِ .

”متقی کو یقین بغیر چارہ نہیں کہ اس کا دل نور یقین سے کھلا ہوا ہے اور مومن کو حقائق ایمان بغیر چارہ نہیں کہ ان کی چشمہائے عقل نور ایمان سے منور ہیں۔“
تو جس جگہ ایمان ہوگا اور جہاں یقین ہوگا، تقویٰ بھی ہوگا۔ اس لیے یہ سب باہم دیگر تابع

ہیں۔ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ

حضرت ابو حمزہ خراسانی رحمۃ اللہ علیہ:

انہیں میں سے داعی عصر، یگانہ دہر حضرت ابو حمزہ خراسانی رضی اللہ عنہ ہیں۔ قدماء مشائخ خراسان سے گزرے ہیں۔ حضرت ابو تراب رحمۃ اللہ علیہ کے صحبت یافتہ تھے اور حضرت ابو سعید احمد خراز کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ تو کل میں آپ کا قدم بہت راسخ تھا۔

ایک حکایت میں مشہور ہے کہ آپ ایک روز جاتے جاتے کنویں میں گر گئے۔ تین روز اسی کنویں میں رہے۔ ایک قافلہ ادھر پہنچا۔ آپ نے دل میں کہا کہ انہیں آواز دوں۔ پھر دل میں ہی فرمایا کہ یہ اچھا نہیں ہے کہ اپنے رب کے سوا کسی سے مدد چاہی جائے بلکہ یہ شکایت اپنے مولا کی ہے جو غیر سے کی جائے۔ اس لیے کہ مجھے یہ کہنا پڑے گا کہ میرے رب نے مجھے کنویں میں ڈالا، اب تم مجھے اس کنویں سے نکالو۔

کہتے ہیں کہ اس قافلہ کے لوگوں میں سے کسی نے اس کنویں کو دیکھا۔ آپس میں مشورہ کیا کہ یہ کنواں برسرِ راہ ہے۔ اگر اسے بند کر دیا جائے تو ہمیں ثواب ملے گا (اور یہ اِمَاطَةُ الْاَذَى ہے یعنی تکلیف دہ اور ایذا رساں ہے اس کو ہٹا دینا ثواب ہے)۔ آخرش وہ جمع ہوئے کہ اس کا منہ بند کر دیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ مجھے اضطراب محسوس ہوا اور مایوسی پیدا ہوئی۔ جب ان لوگوں نے کنویں کا منہ استوار کرنا شروع کیا اور تمام کنویں کا منہ پاٹ دیا اور واپس ہو گئے، میں اس بند کنویں میں اپنے رب کے حضور مناجات میں مشغول ہو گیا اور جان دینے کے لیے آمادہ ہو گیا اور تمام مخلوق سے ناامید تھا۔ جب شام ہوئی تو میں نے دیکھا کہ کنویں کے اوپر کچھ جنبش معلوم ہوئی۔ میں نے غور سے دیکھا کہ یہ کنواں کون کھول رہا ہے تو معلوم ہوا کہ ایک سانپ کے مانند کوئی جانور ہے۔ اس نے اپنی دم نیچے لٹکا رکھی ہے۔ میں سمجھ گیا کہ منجانب اللہ میری اس کنویں سے نجات اس کے ذریعہ مقرر ہے۔ میں نے فوراً اس کی دم پکڑ لی۔ اس نے مجھے اوپر کھینچ لیا۔

غیب سے فرشتے نے آواز دی اے حمزہ! تیری نجات بہت اچھی نجات ہے کیونکہ تجھے ایک بڑی ہلاکت کے بعد نجات ملی ہے۔

آپ سے لوگوں نے پوچھا غریب کون ہے؟ جواب دیا: اَلْمُتَوَحِّشُ مِنَ الْاَلْفَةِ. ”جو

الفت سے بھاگنے والا ہو۔ یعنی جس کو سب الفتوں سے وحشت ہوتی ہے وہ غریب ہے۔ اس لیے کہ دنیا اور عاقبت میں درویش کا وطن وحشت ہے اور الفت وطن میں وحشت ہوتی ہے۔ اور جب الفت محبوب کے سوا کائنات سے منقطع ہو گیا تو وہ تمام عالم سے متوحش ہوگا۔ اس وقت وہ غریب کہلائے گا اور یہ درجہ بہت بلند ہے۔ وَاللّٰهُ تَعَالٰی اَعْلَمُ

حضرت ابوالعباس احمد بن مسروق رحمۃ اللہ علیہ:

انہیں میں سے داعی مریداں حضرت ابوالعباس احمد بن مسروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں۔ اجلہ بزرگان مشائخ سے گزرے ہیں اور تمام اولیاء کرام کا اتفاق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ”اوتاد الارض“ بنایا۔ آپ کو ”قطب المدار“ کی صحبت کا شرف بھی حاصل ہے۔

آپ سے سوال کیا گیا کہ ”قطب“ کون ہے۔ آپ نے ظاہر نہیں فرمایا لیکن اشارہ بتایا کہ شاید جنید رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ آپ نے چالیس عارفانِ کامل کی خدمت کی اور ان سے فیض حاصل فرمایا اور علوم ظاہری و باطنی میں آپ نہایت اعلیٰ دستگاہ رکھتے تھے۔ آپ سے مروی ہے کہ فرمایا:

مَنْ كَانَ سُورُوهُ بِغَيْرِ الْحَقِّ فَسُرُوهُ يُورِثُ الْهُمُومَ وَمَنْ لَمْ يَأْنَسْ فِي خِدْمَةِ رَبِّهِ فَأَنْسَهُ يُورِثُ الْوَحْشَةَ .

”جو غیر اللہ کے ساتھ شاد و آباد ہے وہ جسمہ اندوہ و ملال ہے اور جسے اپنے رب کے ساتھ موانست نہیں اس کا اُنس خالص وحشت ہے۔“

یعنی وہ چیز جو ماسوائے اللہ میں ہے اسے فنا ہے اور جو فنا کے ساتھ شاد ہے، وہ باطل کے ساتھ باطل ہوگا اور اس کا نتیجہ غم و اندوہ ہے۔ اور سوائے اس ذات کے ہر شے ”لا شے“ ہے۔ تو لا شے سے اُنس رکھ کر جب اسے حقیر دیکھے گا تو اس کی حقارت اس پر منکشف ہو جائے گی۔ تو یہ اُنس وحشت ہی وحشت ہوگا۔ تو خلاصہ یہ ہوا کہ رویت غیر اللہ میں اندوہ و وحشت کے سوا کچھ حاصل نہیں۔ وَاللّٰهُ تَعَالٰی اَعْلَمُ .

حضرت ابو عبد اللہ بن محمد اسماعیل رحمۃ اللہ علیہ:

انہیں میں سے استاد متوکلان، شیخ محققان حضرت ابو عبد اللہ بن محمد اسماعیل مغربی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں۔ اپنے وقت کے بہت بڑے بزرگ گذرے ہیں اور مقبول استاد، نگہبان مریدان مانے گئے ہیں۔

حضرت ابراہیم خواص اور حضرت ابراہیم شیبانی رضی اللہ عنہما دونوں آپ کے مرید خاص

تھے۔ آپ کے براہین میں مباحثِ تجرید دنیا میں نہایت واضح تھے۔ آپ کا قدم انقطاعِ دنیا میں نہایت مضبوط تھا۔ آپ کا ارشاد ہے:

مَا رَأَيْتُ أَنْصَفَ مِنَ الدُّنْيَا إِنْ خَدَمْتَهَا خَدَمْتُكَ وَإِنْ تَرَكَتَهَا تَرَكَتَكَ.

”دنیا سے زیادہ منصف میں نے نہیں دیکھا، اگر تو اُس کی خدمت کرے تو وہ تیری خدمت کرتی ہے اگر تو اسے چھوڑ دے تو وہ تجھے چھوڑ دیتی ہے۔“

یعنی اگر تو اس سے اعراض کرے اور طلبِ ربِ عزاسمہ کو مضبوط کرے تو دنیا تجھ سے بھاگتی ہے اور اُس کے خطرات بھی تیرے دل پر نہیں آتے۔ تو جو شخص صداقت سے تارکِ دنیا ہو جائے وہ اس کے شر سے مامون ہو جاتا ہے اور اُس کی ہر قسم کی آفتوں سے نجات پا جاتا ہے۔

وَاللَّهُ تَعَالَى أَعْلَمُ

حضرت ابوالحسن بن علی جرجانی رحمۃ اللہ علیہ:

انہیں میں سے پیر زمانہ اور زمانہ میں یگانہ حضرت ابوالحسن بن علی جرجانی رضی اللہ عنہ ہیں۔ اپنے وقت میں بے نظیر عارف گزرے ہیں۔ آپ کی بہت سی تصانیف ہیں، معاملات میں بھی آپ نے تالیفات فرمائیں اور رویتِ آفاتِ نفس میں بھی بہت سی کتابیں لکھیں۔

آپ حضرت محمد بن علی ترمذی رحمۃ اللہ علیہ کے مرید ہیں اور حضرت ابوبکر وراق رحمۃ اللہ علیہ کے ہم عصر گزرے ہیں اور حضرت ابراہیم سمرقندیؒ آپ کے مرید تھے۔ آپ سے مروی ہے کہ فرمایا:

الْخَلْقُ كُلُّهُمْ فِي مَيَادِينِ الْغَفْلَةِ يَرْكُضُونَ وَعَلَى الظُّنُونِ يَعْتَمِدُونَ وَعِنْدَهُمْ أَنَّهُمْ فِي الْحَقِيقَةِ يَنْقَلِبُونَ عَنِ الْمُكَاشَفَةِ يَنْطِقُونَ.

”دنیا کے لوگ غفلت کے میدانوں میں ہیں اور اپنی توہمات و ظلمات پر اعتماد رکھتے ہیں اور ان کے نزدیک یہ سب باتیں مٹی بر حقیقت ہیں اور ان کی زبانی باتیں اسرار و مکاشفات کے ساتھ ہوتی ہیں۔“

اس فرمان میں آپ کا اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ عوام گمانِ طبع اور غرورِ نفس پر بھروسہ کیے ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی جاہل اپنی جہالت کا معترف نہیں، بالخصوص صوفیوں میں جو جاہل ہیں وہ بہت سخت ہیں۔

ایسے ہی علماء بھی اہل دنیا کے ہیں تو وہ اپنے کو ”أَعَزُّ مَا خَلَقَ اللَّهُ“ سمجھے بیٹھے ہیں یعنی

تمام دنیا میں انہیں اپنے سے زیادہ عزت والا کوئی نظر نہیں آتا۔ تو پھر عوامِ جہال میں بھی ”اَذَلُّ مَا خَلَقَ اللَّهُ“ ہو گئے ہیں کہ ان سے زیادہ ذلیل اللہ کی مخلوق میں کوئی نہیں۔
حالانکہ عالم کی یہ شان ہونی چاہیے تھی کہ اُن کی بات سوائے حقیقتِ حال نہ ہوتی اور غرور و نخوت ان میں قطعاً نہ ہوتا اور جاہلوں میں تو وجودِ حقیقت ہونا ہی محال ہے، تو ان میں غرور لازمی ہے۔

غرضیکہ سب غفلت کے میدان میں متحیر ہیں اور گمانِ باطل لیے بیٹھے ہیں کہ ہم جس حال میں ہیں وہ ولایت ہے اور اپنے ظن و وہم پر یقین کر کے سمجھ رہے ہیں کہ یہ خالص یقین ہے اور رسمِ تصوف کے موافق ہے، اور اپنی حرصِ آز کے ماتحت باتیں کر کے اسے مکاشفہ بنا بیٹھے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ انسان اپنے اسرار سے باز نہیں آتا مگر رویتِ جمال و جلالِ حق کے ساتھ یا اظہارِ جمال اُن پر اتنا مستولی ہو جائے کہ ہر شے میں جلوہٴ ذات کا مشاہدہ کرے اور اپنی شان کو فانی دیکھے اور کشفِ جلالِ ذات کے وقت اپنے وجود کو قطعاً نہ دیکھے اور اپنے وجود کا واہمہ بھی اس کے دل میں نہ ہو۔

حضرت ابو محمد احمد بن حسین حریری رحمۃ اللہ علیہ:

انہیں میں سے باسطِ علوم واضح رسوم حضرت ابو محمد احمد بن حسین حریری رضی اللہ عنہ ہیں۔ معاصرین حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ سے ہیں اور حضرت سہل بن عبد اللہ کے صحبت یافتہ تھے اور تمام علوم میں بہترین مہارت رکھتے تھے اور فقہ کے امام وقت گزرے ہیں اور اصول میں نہایت اعلیٰ دستگاہ رکھتے تھے اور طریقت و تصوف میں اتنا بلند پایہ تھا کہ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے آپ سے فرمایا کہ ہمارے مریدوں کو ادبِ تصوف اور ریاضتِ علم کی تعلیم دیں۔ حتیٰ کہ حضرت جنید کے بعد ان کی سجادگی آپ کو حاصل ہوئی۔

آپ سے مروی ہے کہ فرمایا:

دَوَامُ الْإِيْمَانِ وَقَوَامُ الْأَذْيَانِ وَصَلَاحُ الْأَبْدَانِ فِي ثَلَاثَةِ الْاِكْتِفَاءِ
وَالْاِتْقَاءِ وَالْاِحْتِمَاءِ فَمَنْ اِكْتَفَى بِاللّٰهِ صَلَحَتْ سِرِّيْرَتُهُ وَمِنْ اِتْقَى
مَا نَهَاهُ اللّٰهُ عَنْهُ اسْتَقَامَتْ سِرِّيْرَتُهُ وَمِنْ اِحْتَمَى مَا لَمْ يُوَافِقْهُ
اِرْتَضَتْ طَبِيعَتُهُ فَثَمَرَةُ الْاِكْتِفَاءِ صَفْوَةُ الْمَعْرِفَةِ وَعَاقِبَةُ الْاِتْقَاءِ
حُسْنُ الْبَخْلِيقَةِ وَغَايَةُ الْاِحْتِمَاءِ اِعْتِدَالُ الطَّبِيعَةِ.

”ایمان کا دوام و استمرار اور قوام و قیام دین اور اصلاحِ جسم تین چیزوں میں ہے: ایک کفایت کرنا دوسرا پرہیزگاری اختیار کرنا۔ تیسرے غذا میں احتیاط

رکھنا، جو شخص اپنے رب کے ساتھ اکتفا کرے اس کے باطن کی اصلاح ہو جاتی ہے اور جو تقویٰ حاصل کرے اور پرہیزگار ہو جائے اس کی عادت و خصلت نیک ہو جاتی ہے اور جو غذا میں احتیاط رکھے اس کا نفس ریاضت سے پاک و درست ہو جاتا ہے۔ تو ثمرۃ اکتفا صفائی قلب ہے اور انجام تقویٰ اور پرہیزگاری حُسن خلق ہے اور احتیاط غذا کا نتیجہ تندرستی اور اعتدال طبیعت ہے۔“

یعنی جو اپنے رب کے ساتھ توکل کرے، اس کا عرفان بلند اور قلب مصفیٰ ہو جاتا ہے اور جو اعمال میں تقویٰ کا پابند ہو اس کا خلق درست ہو جاتا ہے اور دنیا و آخرت میں عزت پا جاتا ہے جیسا کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

مَنْ كَثُرَتْ صَلَوَاتُهُ بِاللَّيْلِ حَسَنٌ وَجْهُهُ بِالنَّهَارِ.

”جورات میں نمازیں زیادہ پڑھے اس کا چہرہ دن میں بہت منور ہو جاتا ہے۔“

دوسری حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن متقیوں کی جب جماعت آئے گی تو: وَجُوهُهُمْ نُورٌ عَلَىٰ مَنَابِرٍ مِّنْ نُورٍ ”تو ان کے چہرے ممبروں پر منور ہوں گے اور ممبر بھی نوری ہوں گے۔“ اور جو غذا میں احتیاط رکھے تو اُس کا تن ہر بیماری سے محفوظ رہے اور یہ کلام نہایت جامع ہے اور یاد رکھنے کے قابل۔ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِالصَّوَابِ

حضرت ابوالعباس احمد بن محمد بن سہیل آملی رحمۃ اللہ علیہ:

انہیں میں سے شیخ ظرفا، قدوہ اہل وفا و صفا حضرت ابوالعباس احمد بن محمد سہیل آملی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں۔ بزرگان مشائخ سے گزرے ہیں اور اپنے ہم عصروں میں محتشم مانے گئے ہیں۔ علم تفسیر و علم تجوید کے بڑے عالم تھے۔ لطائف قرآنی کے بیان میں آپ مخصوص تھے۔ حضرت جنید بغدادی رضی اللہ عنہ کے مریدان خاص میں تھے۔ حضرت ابراہیم مارستانیؒ کے صحبت یافتہ تھے اور حضرت ابوسعید خراز رحمۃ اللہ علیہ آپ کی بہت عزت فرماتے تھے بلکہ آپ کے سوا کسی کو علم تصوف میں تسلیم نہیں فرماتے تھے۔

آپ سے مروی ہے کہ فرمایا:

السُّكُونُ إِلَىٰ مَا لَوْفَاتِ الطَّبَائِعِ يَقْطَعُ صَاحِبِهَا عَنُ بُلُوغِ دَرَجَاتِ الْحَقَائِقِ.

”جس چیز کی طرف رغبت طبع ہو اُس سے آرام سکون حاصل کرنا بلندی

حقائق کے درجات سے گرا دیتا ہے۔“

یعنی جو مالوفات کے ساتھ آرام حاصل کرے وہ حقیقتِ آشنائی سے محروم رہ جاتا ہے۔ اس لیے کہ امزجہ اور طبائع، آلات و اوزارِ نفس ہیں اور نفس، محلِ حجاب ہے اور حقیقت، محلِ کشف۔ تو جو طالبِ محبوب ہے اور اس سے سکون چاہتا ہے جبکہ مکاشف نہیں تو اور اکِ حقائق کیونکر کر سکے گا۔ اس لیے کہ محلِ کشف سے وہ محبوب ہے چنے ہوئے اعراض سے جو مالوف طبع ہیں اور رجحانِ طبع دو چیزوں پر ہوتا ہے: ایک دنیا کے تمام ملکہات کے ساتھ دوسرے عقبتی اور اس کے تمام احوال کے ساتھ۔

دنیا کے ساتھ بوجہ جنسیت الفت ہوگی یا عقبتی کے ساتھ بوجہ نا جنسیت، اور نا دیدہ ہونے کے تو نفسِ عاقبت کے ساتھ الفت محض گمان پر کرتا ہے نہ کہ اس کی حقیقت عینیہ سمجھ کر۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نفس حقیقتِ آشنا نہیں ہوتا۔ اگر حقیقت شناس ہوتا تو دنیا سے اپنا تعلق قطع کر لیتا اور جب ایسی دنیا سے انقطاع کر لیتا تو ولایتِ طبع طے ہو جاتی اور ولایتِ طبع کے طے ہو جانے سے مکاشفہ حقیقت ہو جاتا ہے کیونکہ عافیت کا خویش بالطبع فنا طبع ہے: لَآنَ فِيهَا مَا لَا خَطَرَ عَلَى قَلْبِ بَشَرٍ۔ ”اس لیے کہ اس میں قلبِ بشر پر عقبتی کا تصور نہیں آسکتا“۔ کہ وہ راہ کیسی پر خطر ہے، اور جو چیز بذریعہ کشف دل میں مستحضر ہو اس کا خطرہ نہیں ہوتا اور جب معرفت حقیقت عقبتی سے واہمہ انسان ہی عاجز آجاتا ہے، تو پھر طبعیت اس کے عین حقیقت سے کیونکر الفت کر سکتی ہے۔ تو یہ بات صحیح ہوئی کہ الفت طبعیت گمان عاقبت سے ہے۔ واللہ اعلم

حضرت حسین بن منصور حلاج رحمۃ اللہ علیہ:

انہیں میں سے مستغرق معنی، ابو الغیث حضرت حسین بن منصور حلاج رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں۔ آپ سرستانِ بادہ وحدت اور مشتاقِ جمالِ احدیت گزرے ہیں اور نہایت قوی الحال مشائخ میں سے تھے۔

آپ کی شان میں مشائخِ طریقت کے علیحدہ علیحدہ فیصلے ہیں۔ حتیٰ کہ ایک گروہ تو آپ کو مردود کہہ گیا۔ ایک گروہ آپ کو مقبول بارگاہ بتا گیا۔

مردود کہنے والوں میں سے ۱۔ عمرو بن عثمان مالکی، ۲۔ ابو یعقوب نہر جوری، ۳۔ ابو ایوب قطع، ۴۔ علی بن سہل اصفہانی وغیرہ ہیں اور مقبول بارگاہ ماننے والے متاخرین میں بازیدہ عطا محمد بن حنیف، ابو القاسم نصر آبادی رضی اللہ عنہم ہیں۔ اور ان کے علاوہ تمام متاخرین صوفیہ انہیں مقبول مانتے چلے آ رہے ہیں۔

اور ایک گروہ اور ہے جو آپ کے معاملہ میں توقف کرتا ہے جیسے حضرت جنید بغدادی، حضرت شبلی، حضرت حصری رضوان اللہ علیہم اجمعین۔ اور ایک گروہ نے آپ کو جادو وغیرہ اسباب ظاہری کے ساتھ منتسب کیا ہے، لیکن حضرت شیخ المشائخ ابوسعید ابوالخیر اور شیخ ابوالقاسم گرگانی اور شیخ ابوالعباس شقاقی رضی اللہ عنہم کے زمانہ میں حسین بن منصور کو صاحب سزا مانتے تھے اور ان لوگوں کے نزدیک حسین بن منصور ایک عارف کامل بزرگ تھے۔

لیکن استاذ ابوالقاسم قشیری فرماتے ہیں کہ اگر وہ ارباب معانی و حقیقت میں سے تھے تو لوگوں کے مطعون کرنے سے ایک عارف مجبور نہیں ہو سکتا اور اگر وہ مجبور فی الطریق والعرقان تھے اور مردود بارگاہ۔ تو مخلوق کے مقبول بنانے سے وہ مقبول نہیں ہو سکتے۔ لہذا ان کا معاملہ ہم خدا کے سپرد کرتے ہیں اور جس قدر ان سے ہم علامات عرفانی دیکھتے ہیں، اسی حد تک ہم انہیں بنظر عظمت سمجھتے ہیں۔

اور مشائخ میں علاوہ چند کے کوئی ان کی مقبولیت کا منکر نہیں بلکہ تمام مشائخ ان کے کمال فضل اور صفائی حال اور کثرت اجتہاد و ریاضت کے معترف ہیں، اور ان کے حالات کا اس کتاب میں ذکر نہ کرنا ایک حد تک بے امانتی و خیانت تھی۔ اس لیے کہ بعض لوگ ارباب ظواہر سے جو ہیں وہ ان کی تکفیر کرتے ہیں اور ان کی شان عرفان کے منکر ہیں اور ان کے تمام کمالات و خوارق عادات امور کو مکر اور جادو کے ساتھ نسبت کرتے ہیں۔

ان کا خیال ہے کہ یہ حسین بن منصور بن حلاج بغدادی ہے، جو محمود بن زکریا کا استاذ اور ابوسعید قرطبی کا رفیق خاص ہے۔ حالانکہ وہ ”حسین بن منصور بن صلاح“ ہے اور یہ ”حسین بن منصور حلاج“ ہیں رحمۃ اللہ علیہ۔ پھر وہ حسین بن منصور جو ابن صلاح ہے وہ بغداد کا ہے، یہ حسین بن منصور حلاج تالیسی مقام ”بیضا“ کے ہیں۔

اور جو مشائخ حضرت حسین بن منصور حلاج ہی کو مردود و مجبور مانتے ہیں اور ان کے دین میں بھی طعن کرتے ہیں کہ یہ طعن درحقیقت ان کے دین میں نہیں بلکہ ان کے کیفیت حال پر ہے۔ وہ یہ کہ حضرت حسین بن منصور حلاج رحمۃ اللہ علیہ پہلے حضرت سہل بن عبد اللہ سے بیعت ہوئے پھر ان کی بلا اجازت ان سے علیحدہ ہو کر حضرت عمر بن عثمان مکیؓ سے ملے، وہاں بھی مستقل طور پر نہیں رہے اور وہاں سے بھی بلا اجازت چل دیئے اور حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ سے آکر تعلق کر لیا۔ مگر حضرت جنید نے انہیں قبول نہ فرمایا اور اس وجہ میں سب نے انہیں اپنے یہاں سے رد کر دیا تو اس صورت میں آپ کو مجبور معاملت کہا جاسکتا ہے نہ کہ اصل میں آپ کو مردود مذہب مانا جائے۔

دیکھتے نہیں کہ حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت حسین بن منصور کی شان میں کیا فرما رہے

ہیں۔ آپ کا اعلان ہے:

أَنَا وَالْحَلَّاجُ فِي شَيْءٍ وَاحِدٍ فَخَلَّصَنِي جُنُونِي وَأَهْلَكَهُ عَقْلُهُ.

”میں اور حسین بن منصور حلاج ایک ہی طریق پر ہیں مگر مجھے میرے دیوانہ

پن نے آزاد کرادیا اور حسین بن منصور کو اس کی عقلمندی نے ہلاک کر دیا۔“

اگر (معاذ اللہ) وہ بے دین ہوتے تو شبلی رحمۃ اللہ علیہ نہ فرماتے کہ میں اور حلاج ایک

چیز ہی ہیں۔ حضرت محمد بن خفیف رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: هُوَ عَالِمٌ رَبَّانِيٌّ ”حسین بن منصور حلاج

عالم ربانی تھے“ اور ایسے ہی اوروں نے بھی بہت کچھ تعریف کی اور انہیں بزرگ بتایا۔

تو مشائخ کرام کی خوشنودی اور ان کی طرف سے عاق کر دینا اس امر کو مستلزم نہیں کہ

انہیں اسلام و مذہب سے بھی خارج کر دیا جائے بلکہ یہ مہجوری طریقت کی مانی جائے گی اور اس کا

طریقہ وحشت و اضطراب ہوتا ہے۔

آپ کی تصانیف مشہور ہیں اور آپ کے رموز اور کلام نہایت مہذب ہیں جو اصول و

فروع میں آپ نے فرمائے اور لکھے اور میں (یعنی حضرت علی بن عثمان جلابی رحمۃ اللہ علیہ) نے

پچاس رسالے ان کی تصنیف کیے ہوئے بغداد و حوالی بغداد میں دیکھے۔ بعض خورستان میں بعض

فارس و خراسان میں۔ سب میں ہم نے ایسی باتیں دیکھیں جو مرید ابتداء سلوک میں کیا کرتا ہے

اور ان تصانیف میں بعض رسالے نہایت معمولی، بعض کچھ آسان، بعض نہایت ادق مضمون سے پُر

تھے۔ اور یہ حالت کے ساتھ بات ہے۔ جب تجلی حق ہونے لگتی ہے تو اس کی قوتِ حال اس کی

زبان و قلم پر بعض بار ایسی جلدی اور عجلت سے مضمون آجاتے ہیں کہ ناواقف دیکھ کر تعجب ہی نہیں کرتا

بلکہ اس کا وہم اس کے سننے سے متنفر ہو جاتا ہے اور عقل اس کے سمجھنے سے قاصر رہتی ہے۔ تو جو آشاء

رمز خاصانِ بارگاہ ہے وہ کہہ دیتا ہے کہ یہ مضمون بہت بلند ہے اور جو جماعت بے خبر اور رموزِ

طریقت سے نا آشنا ہوتی ہے وہ قطعی منکر ہو جاتی ہے۔ تو ان کا انکار بھی بمنزلہ اقرار کے ہوتا ہے اس

لیے کہ وہ سمجھے بغیر منکر ہو کر اقرار کر رہے ہیں کہ یہ مضمون ہمارے محدود معلومات و بصارت کے

ماتحت غلط ہے۔ مگر جب اہل بصیرت و محققان حقیقت دیکھتے ہیں تو وہ ان منکرین کی ہمنوائی نہیں

کرتے اور خدمت و تعریف دونوں سے علیحدہ ہو کر ساکت ہو جاتے ہیں (اس لیے کہ جانتے ہیں کہ

ان منکرین کی عقل نارسا وہاں تک پہنچ نہ سکے گی۔ لہذا ان سے اعراض ہی مناسب ہے) تو منکر کو

کہہ دیتے ہیں کہ تیرا انکار تیری حیثیتِ علمی سے صحیح ہے (اور جاننے والے تو پہلے ہی ہمنوا ہوتے ہیں

تو اُن سے کہنا تحصیل حاصل ہوتا ہے۔

اور وہ لوگ جو اس مردِ خدا کے احوال کو سحر کے ساتھ منسوب کرتے ہیں، یہ اغتساب اُن کی ذات سے محال ہے، اس لیے کہ اگرچہ اہل سنت و جماعت کے نزدیک جادو بھی ویسا ہی حق ہے جیسا کہ کرامتِ اولیاء کو حق مانا جاتا ہے، لیکن ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ ساحری کے کمال کا مظاہر کفر ہے اور کمالِ حال میں کرامت کا اظہار کمالِ معرفت۔ تو ایک کا نتیجہ کمالِ غضبِ الہی ہے اور ایک کا نتیجہ قرینِ رضاءِ مولا ہونا۔

اور اس بحث کو تفصیل اثباتِ کرامات کے باب میں بیان کیا جائے گا۔

اور بالا تفاق اہل بصیرت و اہلسنت، ایک مسلمان خاسر اور ساحر نہیں ہو سکتا اور ایک کافر مکرم اور واجب التکریم نہیں بن سکتا، اور ظاہر ہے کہ سحر و کرامت میں ضد ہے اور اجتماع اضداد محال ہے اور حضرت حسین بن منصور حلاج رضی اللہ عنہ اپنی مدتِ العمر میں لباسِ صلاحیت کے ساتھ مزین رہے، نماز کے پابند ذکر و مناجات میں لیل و نہار گزارنے والے۔ روزہ کے پابند اور آپ کی حمد نہایت مہذب تھی اور توحید میں نہایت لطیف نکتہ بیان فرماتے تھے۔ اگر وہ جادو کا کام کرنے والے ہوتے تو صوم و صلوٰۃ کی پابندی اور ذکر اذکار میں سرگرمی اُن سے محال تھی۔ تو صحیح طور پر ثابت ہوا کہ اُن سے جو امورِ خارقِ عادات ظہور میں آئے، وہ کرامت تھی اور کرامت سوائے ولی کے محقق نہیں ہو سکتی۔

بعض اہل تصوف اُن کو اس وجہ میں رد کرتے ہیں کہ اُن کے بعض کلمات سے امتزاج و اتحادِ مذاہب کا مفہوم نکلتا ہے۔ یہ اعتراض بھی عبارت پر ہے نہ کہ ان کی حقیقتِ معنی پر۔ اس لیے کہ غلبہٴ حال میں صوفی اس قدر مغلوب ہوتا ہے کہ وہ اداءِ عبارت پر قدرت نہیں رکھتا اور اس سے امکانِ عبارت ناممکن ہو جاتا ہے، اگرچہ عبارت فی نفسہ صحیح ہوتی ہے۔ (مگر اس میں اس قدر اغلاق ہوتا ہے کہ عوام اور اہل ظواہر اس کی حقیقتِ معنی کو سمجھنے سے قاصر ہوتے ہیں)۔

اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ معنی عبارت اس قدر مشکل ہوں کہ اس کے مفہوم و مقصود کو عوام نہ سمجھ سکیں، اس وجہ میں اس کے منکر ہو جائیں۔ لیکن یہ انکار اُن کے سمجھنے کا انکار ہے نہ کہ اس عبارت کا۔

ہاں! یہ ضرور ہے کہ ہم نے بغداد اور اس کے گرد و نواح میں ملحدین کا گروہ دیکھا جو اپنے آپ کو حسین منصور حلاج رضی اللہ عنہ کا معتقد ظاہر کرتا ہے اور اپنے الحاد و زندقہ میں اُن کے کلام پر حجت لاتا ہے۔ اور اس گروہ کا نام ہی ”حلاجی“ ہے اور حضرت حسین بن حلاج کے معاملہ میں اس حد

تک غلو کرتا ہے جس حد تک روافضِ محبتِ علی کرم اللہ وجہہ میں کرتے ہیں۔
ان کی رد میں ایک باب ہم لائیں گے۔ اُس میں ان سب فرقوں کا حال بیان کریں
گے۔ انشاء اللہ العزیز۔

تو اس امر کا خیال رہے کہ اس قسم کے مغلوب الحال صوفیوں کے کلام کا اتباع نہیں کرنا
چاہئے۔ اس لیے کہ وہ اپنے حال میں اس قدر مغلوب ہوتے ہیں کہ ان میں استقامت قطعی نہیں
ہوتی اور صوفیائے کرام میں اُن کی پیروی کرنی چاہیے جو صاحبِ استقامت ہیں۔ میں حسین بن
منصور حلاج رحمہ اللہ کو بھلائی کے لیے اپنے دل میں عزیز رکھتا ہوں اور اُن کی عظمت میرے دل میں
ہے، لیکن یہ یقینی بات ہے، ان کی حالت مستقیم نہ تھی بلکہ وہ طریقت میں مغلوب الحال تھے، اور ہر
مغلوب الحال کا کلام فتنہ سے خالی نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت حسین بن منصور حلاج کے کلام
سے بہت زیادہ خوفِ فتنہ ہے بلکہ میرے ساتھ بھی میری ابتدائے زمانہ میں ایسی کیفیت حالیہ گزر
چکی ہے۔

میں نے حضرت حسین بن منصور حلاج کے کلام کی شرح بھی لکھی ہے اور اس کتاب میں
دلائل و حجج باہرہ کے ساتھ ہم نے ثابت کیا ہے کہ یہ کلام اتنا بلند ہے کہ اس کو اربابِ حال کے سوا اور
کوئی نہیں سمجھ سکتا۔

اور ایک کتاب مسمیٰ ”منہاج الدین“ ہماری تالیف ہے۔ اس میں حضرت حسین بن منصور
حلاج کے ابتداءِ حال سے انتہا تک تمام کوائف ذکر کیے ہیں۔ یہاں بھی ہم نے مختصراً ان کا کچھ
تذکرہ کر دیا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جس راستہ میں اس قدر پہلو موافق و مخالف نظر آئیں اس کی پیروی سے
احتراز کرنا لازم ہے (مگر زبانِ طعن دراز کرنے سے بھی اجتناب کیا جائے) اور جو نفسانی خواہشات
اور ہوئی پرستی کے تابع ہیں وہ ہر جگہ ایسے امور کے متلاشی ہوتے ہیں جس سے کجی اور تشنہ پیدا ہو (اُن
سے بھی بچنا چاہیے)۔

آپ کا ایک فرمان ہے جو آپ نے فرمایا:

أَلَا لِسِنَّةٍ مُّسْتَطَقَاتٍ تَحْتَ نُطْقِهَا مُسْتَهْلِكَاتٍ.

”یعنی گویا زبان، خاموش و بے زبان دل کی ہلاکت ہے۔“

یہ عبارت عوام کے لیے خاص آفت ہے۔ اس کے معنی میں حقیقتِ معنی کے بغیر
بے ہودگی ہے اور جب اس کے معنی حاصل ہو جائیں تو وہ اس عبارت سے مفقود نہیں ہوتے۔ اس

لیے کہ جب معنی مفقود ہو جائیں تو عبارت کے ساتھ موجود نہیں ہو سکتے۔

غرضیکہ ایسی عبارتیں طالب کو ہلاکت کے سوا اور کچھ فائدہ نہیں پہنچا سکتیں سوا اس کے کہ عبارت پڑھ کر یہ سمجھ لیا جائے کہ اس کے یہ معنی ہیں۔ وَاللّٰهُ تَعَالٰی اَعْلَمُ۔

حضرت ابو اسحاق ابراہیم بن احمد خواص رحمۃ اللہ علیہ:

انہیں میں سے سرہنگ متوکلان، سالار مستسلمان ابو اسحاق حضرت ابراہیم بن احمد خواص رضی اللہ عنہ ہیں۔ توکل میں عظیم الشان تھے اور نہایت بلند رتبہ والے گزرے ہیں۔ بڑے بڑے مشائخ کو پاچکے ہیں، آپ کی کرامتیں بہت ہیں، اعمال طریقت میں آپ کی تصانیف بھی بہت ہیں۔ آپ سے مروی ہے کہ فرمایا:

اَلْعِلْمُ كُلُّهُ كَلِمَتَيْنِ لَا تَتَكَلَّفُ فِيمَا كَفَيْتَ وَلَا تُضَيِّعُ مَا اسْتَكْفَيْتَ۔

”یعنی علم سارا دو کلموں میں ہے: ایک یہ کہ جس چیز کا اندیشہ اللہ تعالیٰ نے

تیرے دل سے اٹھا لیا، اس میں تکلیف نہ کر۔ دوسرے یہ کہ جو تجھے کرنا ہے

اور جو کچھ تجھ پر فرض و لازم ہے اُسے ضائع نہ کر تا کہ دنیا و آخرت میں

خوش رہے۔“

اس فرمان سے یہ مراد ہے کہ نوشتہ قسمت میں تکلیف نہ کر۔ اس لیے کہ جو تیرے لیے مقسوم ہے وہ تیری جدوجہد سے بدل نہیں سکتا اور جو حکم تجھے بذریعہ شرع ملا ہے اس کی تعمیل میں قصور نہ کر، اس لیے کہ ترک فرمان تیرے لیے موجب عذاب ہے۔ آپ سے کسی نے پوچھا کہ عجائبات میں سے آپ نے کیا ملاحظہ کیا؟ فرمایا: بہت سے عجائبات دیکھے مگر اس سے زیادہ تعجب ناک بات میرے نزدیک کوئی نہیں: حضرت خضر علیہ السلام نے مجھ سے اجازت صحبت چاہی مگر میں نے انکار کر دیا۔ عرض کیا گیا: حضور کیوں انکار فرما دیا۔ فرمایا: اس لیے نہیں کہ اُن سے بہتر کا میں متلاشی تھا بلکہ اس خوف سے کہ کہیں اپنے رب عزوجل کے سوا غیر پر میرا اعتماد نہ ہو جائے اور ان کی صحبت میرے توکل کو نقصان نہ پہنچادے اور نفل میں پڑ کر ادائے فرض سے کہیں نہ رہ جاؤں۔ یہ آپ کے درجہ کمال توکل کی دلیل تھی۔

حضرت ابو حمزہ بغدادی رحمۃ اللہ علیہ:

اہل یقین حضرت ابو حمزہ بغدادی رضی اللہ عنہ ہیں کہ یکتائے متکلمین اور مشائخ اہل بغداد

سے گزرے ہیں۔ حضرت حارث محاسبی رحمۃ اللہ علیہ کے مرید ہیں۔ حضرت سری سقطی رحمۃ اللہ

علیہ کے صحبت یافتہ تھے اور حضرت نوری اور خیر نساج رحمہما اللہ کے ہم عصر تھے اور علاوہ ان کے بڑے بڑے مشائخ کرام کے ساتھ رہے ہیں۔ ”سجد رصاقہ“ میں بغداد کے اندر آپ وعظ فرمایا کرتے تھے اور علم تفسیر و قرأت فن روات کے زبردست عالم گزرے ہیں اور حدیث میں بھی آپ کو کافی مہارت تھی۔

اور یہ وہ ہیں کہ حضرت نوری رحمۃ اللہ علیہ کے ایک بلا کے موقع پر یہ ساتھ تھے۔ آخرش اللہ تعالیٰ نے سب کو اس بلا سے نجات دی۔ اس کی تفصیل ہم مذہب نوری کا جہاں ذکر کریں گے وہاں بیان کریں گے، ان شاء اللہ۔ آپ سے مروی ہے کہ فرمایا:

”إِذَا سَلِمْتَ نَفْسَكَ فَقَدْ أَذَيْتَ حَقَّهَا وَإِذَا سَلِمَ مِنْكَ الْخَلْقُ

قَضَيْتَ حُقُوقَهُمْ.“

”جب تو اپنے نفس سے سلامتی حاصل کر لے تو تو نے اپنی حفاظت کا حق ادا کر

دیا اور جب خلق تجھ سے سلامتی حاصل کر لے تو تو نے حق مخلوق ادا کر دیا۔“

یعنی حق دو ہیں: ایک نفس کا حق تجھ پر اور ایک مخلوق کا حق تجھ پر۔ تو جب تو نے اپنے نفس کو معصیت سے روک لیا اور طریقہ سلامتی عقبی پر اسے چلایا، اس کا حق ادا کر دیا اور جب مخلوقات کو اپنے شر سے ایمن کر دیا اور ان سے برائی نہ کی تو مخلوق کا حق ادا کر دیا۔ گویا ایسی حالت میں زندگی گزار کہ تجھ کو خلائق سے اور تجھ سے خلائق کو کوئی برائی نہ پہنچے، اس کے بعد حق عبودیت اور عبادت الہی میں مشغول ہو۔ وَاللَّهُ أَعْلَمُ

حضرت ابو بکر محمد بن موسیٰ واسطی رحمۃ اللہ علیہ:

انہیں میں سے امام عالی مقام حضرت ابو بکر محمد بن موسیٰ واسطی رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ محققان مشائخ میں سے گزرے ہیں۔ حقائق شناسی میں عظیم الشان شخصیت تھی اور مدارج تصوف میں اعلیٰ درجہ رکھتے تھے۔ مشائخ کرام میں آپ ستودہ صفات مانے گئے اور حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ کے پرانے ہم صحبتوں سے گزرے ہیں۔ آپ کا کلام اس قدر دقیق ہے کہ اہل ظواہر کی اس کے مفہوم تک رسائی نہیں۔ اسی وجہ میں آپ نے اپنا کلام قلمبند نہیں فرمایا اور آپ کا کسی شہر میں قیام نہیں رہتا تھا (اسی وجہ میں کہ غالباً ہر جگہ نا اہلوں سے واسطہ پڑتا ہوگا وہاں سے پراگندہ خاطر ہو کر دوسرے شہر کو تشریف لے جاتے ہوں گے)۔ سیاحت کرتے کرتے جب آپ مقام ”مرو“ تشریف لائے تو اہل مرو کو آپ نے باعتبار طبع لطیف اور نیک سیرت پایا اور اہل مرو نے بھی آپ کی عظمت کی اور

آپ کے پند و نصائح گوشِ دل سے سُنئے۔ چنانچہ بقیہ عمر یہیں پوری فرمائی۔ آپ سے مروی ہے کہ فرمایا:

الذَّاكِرُونَ فِي ذِكْرِهِ أَكْثَرُ غَفْلَةً مِنَ النَّاسِ بْنِ لِذِكْرِهِ.

”یاد کرنے والوں کو یاد کرنے میں، فراموش کر دینے والے سے ذکر میں زیادہ غفلت ہوتی ہے۔“

اس لیے کہ رب جل مجدہ کو یاد رکھتے ہوئے اگر اس کا ذکر بھول جائے تو اتنا نقصان نہیں اور بڑا نقصان اس میں ہے کہ اُسے فراموش کر دے اور اس کا ذکر کرتا رہے۔ اس لیے کہ ذکر ایک علیحدہ چیز ہے اور مذکور علیحدہ۔ تو جو خیال، ذکر میں مذکور کی ذات کو فراموش کر دے اور اس سے روگرداں ہو جائے تو یہ بہت بڑی غفلت ہے کہ اس میں ذکر غیر ہے بہ نسبت اس کے کہ مذکور کی یاد کا گمان بھی نہ رہے بلکہ بھول جائے تو اس بھولنے والے کو باوجود ذکر، غفلت سے قریب ہے اور بھولنے والے کو نسیان و غفلت میں حجابِ غیبت ہی ہے اور مشاہدہ حضور نہیں۔ تو ذکر میں بحالتِ ذکر یاد اور تصورِ مذکور اگر ہے تو حجابِ غیبت میں بھی اُس کے لیے حضور ہے۔

تو خلاصہ یہ ہوا کہ اگر حضوری کا خود خیال کرے تو صوفی غفلت کے نزدیک ہے، اس لیے کہ طالبِ حق کے لیے اپنی طرف سے خواہش کرنا ہی ہلاک ہے کیونکہ اس راہ میں اگر گمان زیادہ ہو جائے تو معنی گم ہو جاتے ہیں اور اگر معنی زیادہ ہو جائیں تو گمان گم ہو جاتا ہے۔ درحقیقت صوفی کو گمان ہی جب ہوتا ہے جب عقل کے ساتھ وہ متہم ہو اور جب تک عقل کے ساتھ وہ متہم ہے ارادہ نفسانی لازمی ہے اور یہاں ہمت کو تہمت اور ارادے سے کوئی تقرب کی منزل حاصل نہیں ہوتی، اور جسے حقیقتِ ذکر کہتے ہیں وہ یا تو حالِ غیبت میں ہوتا ہے یا مقامِ حضور میں۔ (۱)

اور ذاکر مشاہدہ حضورِ حق کر لیتا ہے تو پھر ذکر نہیں رہتا بلکہ مشاہدہ ہوتا ہے اور جب غائب از حق ہو اور اپنے وجود سے مطلع تو اگر چہ ذکر ہوتا ہے مگر اُسے ذکر نہیں کہتے بلکہ وہ غیبت ہے اور غیبت درحقیقت غفلت ہے۔ وَاللّٰهُ تَعَالٰی اَعْلَمُ.

حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ:

انہیں میں سکینۂ احوال، سفینۂ مقال حضرت ابو بکر دلف بن حجد شبلی رضی اللہ عنہ ہیں۔

۱۔ یہی پروہ دوئی ہے یہی ہے حجابِ جاناں جو یہ آرزو ہے دل میں کہ وصالِ یار ہوتا

از مترجم غفرلہ

بزرگانِ مشائخ سے گزرے ہیں اور آپ کے لیل و نہار نہایت مہذب و مطیب بحق گذرے ہیں۔
آپ کے اشارات لطیف و ستودہ ہیں۔ چنانچہ ایک متاخرین سے فرماتے ہیں:

«لَلَّائِةٌ مِّنْ عَجَائِبِ الدُّنْيَا إِشَارَاتُ الشَّيْبِيِّ وَنَكْتُ الْمُرْتَعِشِ
وَحِكَايَاتُ جَعْفَرٍ»

”عجائباتِ عالم میں تین چیزیں ہیں: حضرت شبلی کے اشارات اور مرتعش کے
نکتہ اور جعفر کی حکایتیں۔“

آپ قوم کے بہت بڑے لوگوں میں سے تھے۔ اربابِ طریقت میں ساداتِ طریق سے
شمار کیے گئے ہیں۔ ابتداء میں خلیفہ وقت کے داروغہ ڈیوڑھی تھے۔ حضرت خیر نساہ رحمۃ اللہ علیہ کی
مجلس میں آپ تائب ہوئے اور تعلق بیعت حضرت جنید بغدادی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کیا۔ بہت
سے مشائخ کرام کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ آپ سے مروی ہے کہ فرمایا: اللہ تعالیٰ کے اس
فرمان کے معنی یہ ہیں:

﴿قُلْ لِلْمُؤْمِنِينَ يَغُضُّونَ أَبْصَارَهُمْ وَيَحْفَظُونَ أَرْوَاحَهُمْ ذَلِكُمْ أَزْكَ لَهُمْ

إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا يَصْنَعُونَ﴾ (۱)

”اے محبوب! مؤمنین کو حکم فرماؤ کہ وہ چشم سر کو نظرِ شہوت سے نگاہ رکھیں اور
چشمِ دل کو ماسویٰ اللہ سے اور انواعِ فکر و اندیشہ سے محفوظ کر کے رویتِ ذات
کا خیال رکھیں۔“

اس لیے کہ شہوت کا اتباع اور محارم کے گھورا گھاری غفلت میں سے ایک غفلت ہے۔ اہل
غفلت کے لیے عذابِ مہین یعنی نہایت ذلیل کرنے والا وہ عذاب ہے جو انہیں اپنے عیبوں سے
جاہل کہہ رہا ہے اور جو اس دنیا میں جاہل رہا، وہ عقبیٰ میں بھی جاہل ہی رہے گا۔

وَمَنْ كَانَ فِي هَذِهِ أَعْمَىٰ فَهُوَ فِي الْآخِرَةِ أَعْمَىٰ (۲)

”جو دنیا میں عیب و صواب کی طرف سے اندھا ہے وہ آخرت میں بھی اندھا
ہوگا۔“

جب تک اللہ تعالیٰ انسان کے دل سے اراداتِ شہوت کی نجاست نہ نکال دے اس
وقت تک اس کی چشم سر غوا مض یعنی جن سے آنکھ بند ہونا ضروری ہے، محفوظ نہیں رہ سکتی اور جب
تک اپنی محبت کسی کے دل میں ثابت نہ کرے، اس کی چشم سر بلا نظارہ غیر محفوظ نہیں رہ سکتی۔

آپ کا ایک واقعہ مروی ہے کہ ایک دن آپ بازار میں تشریف لائے تو لوگوں نے کہنا شروع کیا: هَذَا مَجْنُونٌ ”یہ دیوانہ“ ہے۔ آپ نے فرمایا:

”أَنَا عِنْدَكُمْ مَجْنُونٌ وَأَنْتُمْ عِنْدِي أَصِحَاءُ فَرَادَى نَبِي اللَّهِ فِي جُنُونِي
وَرَادَ كُمْ فِي صِحَّتِكُمْ“

”میں تمہارے نزدیک دیوانہ ہوں اور تم میرے نزدیک ہوشیار ہو، میرا جنون شدتِ محبتِ محبوب سے ہے اور تمہاری صحتِ قوتِ غفلت سے، تو اللہ عزوجل میری دیوانگی زیادہ کرے تاکہ میرا تقربِ قرب سے اقرب ہو اور تمہاری ہوشیاری زیادہ کرے تاکہ تمہارا بعدِ موجود بعد سے ابعد ہو جائے۔“

اور یہ ارشاد آپ کا بمقتضائے غیرت تھا کہ یہ لوگ دوست اور دیوانہ میں تمیز نہیں کرتے اور انہیں اپنی غفلت کا احساس نہیں تو یہ آخرت میں بھی ایسے ہی بے حس ہوں گے۔ واللہ تعالیٰ اعلم
حضرت ابو محمد بن جعفر بن نصیر خالدی رحمۃ اللہ علیہ:

انہیں میں سے حاکی احوال بہ الطف احوال و ادا حضرت ابو محمد بن جعفر بن نصیر خالدی رضی اللہ عنہ ہیں۔ حضرت جنید رضی اللہ عنہ کے کبار اصحاب سے گذرے ہیں اور فنون و علم میں تبحر تھے اور مشائخ کرام کی سیرتوں کے حافظ اور ان کے مراتب کے خاص نگران مانے گئے ہیں۔
آپ کا کلام ہر فن میں مشہور ہے اور خاص کر رعونت میں آپ نے بہت کچھ فرمایا اور ہر مسئلہ پر آپ نے حکایت چسپاں فرمائی اور اس کا حوالہ کسی نہ کسی کی روایت سے ثابت کیا۔ آپ سے مروی ہے کہ فرمایا:

التَّوَكُّلُ إِسْتِوَاءُ الْقَلْبِ عِنْدَ الْوُجُودِ وَالْعَدَمِ.

”توکل یہ ہے کہ وجود و عدمِ رزق تیرے دل کے نزدیک یکساں ہو۔“

اور جب وجودِ رزق ہو تو خرم و شاد نہ ہو اور عدمِ رزق کے وقت اندوہ گیس نہ ہو۔ اس لیے کہ یہ جسمِ ملکِ مالک ہے اور پرورش و ملوکِ جسم کے لیے تجھ سے بہتر وہی مالکِ عالم ہے جیسے چاہے رکھے۔ تو اس کی دارالسلطنت میں کسی قسم کا دخل نہ دے اور ملکِ مالک کے سپرد کر اور اپنا تصرف منقطع کر لے۔

حضرت ابو محمد جعفر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں حضرت جنید رضی اللہ عنہ کی خدمت میں ایک بار حاضر ہوا اور دیکھا کہ آپ کو بخار ہے۔ میں نے عرض کی: حضور! اپنے رب سے دعا کریں تاکہ وہ آپ کو شفا دے۔ فرمایا: کل میں نے عرض کی تھی تو مجھے جواب ملا کہ ”جنید! جسم ہماری ملک

ہے، ہم چاہیں تو تندرست رکھیں، چاہیں تو بیمار، تم کون ہو جو ہمارے اور ہماری ملک میں دخل و تصرف کر رہے ہو، خاموش رہو اور اپنا تصرف ہماری ملک سے منقطع کرو تا کہ ہمارے عبد صادق رہو۔“ وَاللّٰهُ تَعَالٰی اَعْلَمُ

حضرت ابو محمد بن القاسم رودباری رحمۃ اللہ علیہ:

انہیں میں سے شیخ محمود معدن جو حضرت ابو محمد ابن قاسم رودباری رضی اللہ عنہ ہیں۔ آپ شہزادہ تھے اور نوجوانان متصوفہ کے بزرگ تھے۔ اعمال طریقت میں عظیم الشان درجہ پایا ہے۔ دقائق طریقت میں آپ کا کلام بڑا لطیف ہے آپ سے مراد یہ ہے کہ فرمایا:

الْمُرِيدُ لَا يُرِيدُ لِنَفْسِهِ اِلَّا مَا اَرَادَ اللّٰهُ لَهٗ وَالْمُرَادُ لَا يُرِيدُ مِنَ الْكُوْنِيْنَ شَيْئًا غَيْرَهٗ.

”مرید وہ ہے جو کسی چیز کا ارادہ اپنی ذات کے لیے نہ رکھے مگر وہی جو اس کے رب کے ارادہ سے ہو، اور مراد وہ ہے کہ کونین میں سوائے ذات حق کسی چیز کا طالب نہ ہو۔“

تو جب تک اپنی ارادات و عقیدت میں راضی ہے، مرید ہے اور محبت کی ارادات و عقیدت جب نہیں رہتی تو وہ مراد ہو جاتا ہے۔ پھر جو حق تعالیٰ چاہے اس کے سوا وہ کچھ نہیں چاہتا اور جو خدا چاہے وہ کرے، سوائے خدائے تعالیٰ کے اور کچھ نہیں چاہتا۔ تو رضا مقامات ابتدائی سے ہے اور محبت انتہاء حال کا نام ہے اور مقامات کی نسبت وجود و عبودیت تک ہے اور سرچشمہ اور درجات تائید ربوبیت میں ہیں۔ جب یہ سمجھ لیا تو خلاصہ یہ ہوا کہ مرید بنو قائم ہوتا ہے اور مراد بحق قائم ہوتا ہے۔ وَاللّٰهُ تَعَالٰی اَعْلَمُ

حضرت ابو العباس مہدی سیاری رحمۃ اللہ علیہ:

انہیں میں سے خزینہ دار التوحید، عالم عامل علی الفرید ابو العباس حضرت مہدی سیاری رضی اللہ عنہ ہیں۔ امام وقت تھے اور علوم ظاہری و باطنی کے عالم گزرے ہیں۔ حضرت ابو بکر واسطی رحمۃ اللہ علیہ کے صحبت یافتہ تھے اور بہت سے مشائخ کے فیض صحبت سے مستفید ہوئے۔ نہایت عالی ظرف اور زہد و ورع میں مشہور۔ آپ کا کلام نہایت بلند اور تصانیف بہت زیادہ ہیں۔ آپ سے مروی ہے کہ فرمایا:

التَّوْحِيدُ اَنْ لَا يَخْطُرَ بِقَلْبِكَ مَا دُوْنَهُ

”توحید یہ ہے کہ ماسوائے ذاتِ حق، تیرے دل کے نزدیک کوئی خطرہ نہ آئے۔“
 اور مخلوقات کی نظر کا تیرے دل کے پاس گزرنہ ہو اور تیری صفائی معاملہ میں کدورت نہ
 ہو اس لیے کہ اندیشہ غیر، اثباتِ غیر بغیر نہیں ہوتا اور اثباتِ غیر ہونے کی صورت میں حکمِ توحید
 ساقط ہو جاتا ہے۔

یہ مرو کے بڑے رئیسوں کے خاندان سے تھے۔ اہل مرو میں ان کے مقابلہ کا کوئی رئیس
 نہ تھا۔ انہیں میراثِ پدری کافی ملی تھی، وہ تمام کی تمام دے کر دو موئے مبارک حضور اکرم ﷺ
 کے حاصل کیے۔ اللہ تعالیٰ نے موئے مبارک کی برکت سے توفیقِ توبۃِ النصوح دی۔

حضرت ابو بکر واسطی رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت میں آگئے اور اس درجہ کو پہنچ گئے کہ ایک
 گروہِ صوفیہ کے امام بن گئے۔ جب آپ نے دنیا سے رحلت فرمائی تو وصیت کی تھی کہ یہ موئے
 مبارک میرے منہ میں رکھ دیئے جائیں۔ آج تک مرو میں ان کا یہ اثر ہے کہ لوگ اپنی حاجت روائی
 کے لیے اس قبر پر جاتے اور بامراد واپس آتے ہیں اور حلِ مقاصد کے لیے آپ کی قبر پر جانا مجرب
 ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حضرت ابو عبد اللہ محمد بن حنفیہ رحمۃ اللہ علیہ:

انہیں میں سے مالکِ وقت خود در تصوف، خالی طبع از تصرف و تکلف حضرت ابو عبد اللہ محمد
 بن حنفیہ رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ اپنے زمانہ کے امامِ علوم گزرے ہیں اور مجاہدات میں آپ کی شان
 بہت بلند ہے اور آپ کا بیان معانی حقائق میں نہایت شافی ہے اور آپ کی عمر کا بیشتر زمانہ تصنیف
 و تالیف میں گزرا۔ حضرت ابن عطاء، حضرت شبلی، حضرت حسین بن منصور وغیرہ رحمہم اللہ کی زیارت
 فرما چکے ہیں اور مکہ معظمہ میں حضرت یعقوب نہر جوری رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت میں رہ چکے ہیں اور سیر
 مکاشفات آپ کی بہت اچھی ہے اور خلوت نشینی بھی آپ نے بہت کی ہے۔ آپ بھی خاندانِ شاہی
 سے گزرے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو توبہ کی توفیق دی اور حکومت و سلطنت سے اعراض فرما کر
 ماسوی اللہ سے انقطاع کیا۔

آپ کی بزرگی کا سکہ اربابِ معانی کے دلوں پر سکھ زن ہے۔ آپ سے مروی ہے کہ
 فرمایا: التَّوْحِيدُ الْإِعْرَاضُ عَنِ الطَّبِيعَةِ ”توحید نام ہے طبیعت سے اعراض کرنے کا۔“ اس
 لیے طبیعتِ آلاء و نعمتِ الہی سے محبوب و نابینا ہوتی ہے۔ توجہ تک طبائع سے اعراض نہ ہو تقرب
 الی اللہ نہیں ہو سکتا اور صاحبِ طبع حقیقت و توحید سے محبوب رہتا ہے۔

جب آفتِ طبع نظر آجائے تو یقیناً منزلِ توحید تک پہنچ جاتا ہے۔ آپ کی بہت سی کرامتیں

اور دلائل ہیں۔ وَاللّٰهُ تَعَالٰی اَعْلَمُ

حضرت ابو عثمان سعید بن سلام مغربی رحمۃ اللہ علیہ:

انہیں میں سے سیف سیادت، آفتاب سادۃ حضرت ابو عثمان سعید بن سلام مغربی رضی اللہ عنہ ہیں۔ اہل تمکین کے سردار اور علم خط کے بہترین ماہر تھے، ریاضت و ثبات توکل میں مشہور تھے۔ آفاتِ نفس کے عالم تھے۔ آپ کی علامات و روایات اور براہین روشن ہیں۔ آپ سے مروی ہے کہ فرمایا:

”مَنْ اَثَرَ صُحْبَةَ الْاَغْنِيَاءِ عَلٰی مُجَالَسَةِ الْفُقَرَاءِ اِبْتِلَاؤُ اللّٰهُ بِمَوْتِ الْقَلْبِ.“

”جو صحبتِ اغنیاء، فقراء کی صحبت پر پسند کرے، اللہ تعالیٰ اسے موتِ قلب میں مبتلا کرے گا۔“

اس لیے غنی لوگوں سے صحبت رکھنے والا اُن اغنیاء کے خیالات سے متاثر ہو کر اُن کے فیضِ صحبت سے محروم ہو جاتا ہے دوسری وجہ یہ ہے کہ اغنیاء کی صحبت کسی غرضِ دنیاوی کی وجہ میں رکھی جاتی ہے تو جب غرضِ دنیا کی مجالستِ اغنیاء سے بڑھ گئی تو یقیناً دل نیاز مندی دنیا کی وجہ میں مر جاتا ہے۔

اور اس کا تن خواہشات کا شکار ہو جاتا ہے۔ تو پھر صحبتِ اغنیاء کا نتیجہ موتِ قلب ہے، تو کس لیے ان کی صحبت سے اعراض نہ کیا جائے۔ اس مضمون میں صحبت و مجالستِ فقراء و اغنیاء کا فرق واضح ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حضرت ابراہیم محمد بن محمود نصیر آبادی رحمۃ اللہ علیہ:

انہیں میں سے مبارزِ صفِ صوفیان، معبرِ احوالِ عارفان حضرت ابو القاسم ابراہیم محمد بن محمود نصیر آبادی رضی اللہ عنہ ہیں۔ آپ نیشاپور میں مثل بادشاہ کے تھے۔ جس طرح نیشاپور میں شاہانِ جموہیہ تھے ویسے ہی یہ بھی اپنے حال میں بلند اور شہنشاہِ عقبی تھے، فرق اتنا تھا کہ شاہِ جموہیہ کی عزت دنیا میں تھی اور ان کی عزت کا تعلق عقبے سے تھا۔ آپ کے کلامِ دینیہ نہایت رفیع تھے۔ حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ کے مرید خاص تھے اور اہلِ خراسان کے متاخرین میں پیر و استاد مانے گئے ہیں۔ حتیٰ کے آپ کے زمانہ میں آپ کے مقابلہ کا کوئی عارف نہ تھا اور آپ عالمِ اہل زمانہ اور متورع مانے جاتے تھے۔ آپ سے مروی ہے کہ فرمایا۔

أَنْتَ بَيْنَ النَّسْبَيْنِ نِسْبَةٌ إِلَىٰ آدَمَ وَنِسْبَةٌ إِلَىٰ الْحَقِّ فَإِذَا انْتَسَبْتَ
إِلَىٰ آدَمَ دَخَلْتَ فِي مِيَادِينِ الشَّهَوَاتِ وَمَوَاضِعِ الْأَفَاتِ وَالزُّلُمَاتِ
وَهِيَ نِسْبَةٌ تَحَقُّقِ الْبَشَرِيَّةِ قَالَ اللَّهُ تَعَالَى: ” إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا
جَهُولًا“ (۱) فَإِذَا انْتَسَبْتَ إِلَىٰ الْحَقِّ دَخَلْتَ فِي مَقَامَاتِ الْكُشْفِ
وَالْبَرَاهِينِ وَالْعِصْمَةِ وَالْوِلَايَةِ وَهِيَ نِسْبَةُ الْعِبُودِيَّةِ قَالَ اللَّهُ تَعَالَى:
”وَعِبَادُ الرَّحْمَنِ الَّذِينَ يَمْشُونَ عَلَى الْأَرْضِ هَوْنًا“ (۲)

”تو دو نسبتوں میں ہے، ایک نسبتِ آدم، دوسری نسبتِ حق۔ جب تجھے آدم کے ساتھ نسبت ہوگی تو تجھے میدانِ شہوات و مقاماتِ آفات و ذلت میں پڑنا ہوگا۔ اس لیے کہ طبائعِ انسان نہایت ذلیل و بے قدر ہیں اور اگر تجھے نسبتِ حق حاصل ہوگئی تو مقاماتِ کشف و برہان اور عصمتِ ولایت میں آجائے گا اور نسبتِ عبودیت حاصل کرے گا اور یقینی امر ہے کہ نسبتِ آدم بروزِ قیامت منقطع ہو جائے گی اور نسبتِ عبودیت ہمیشہ قائم رہے گی اور اس کا تغیر ہرگز نہ ہوگا۔“

تو جب بندہ اپنے کو اپنے ساتھ منتسب کرے یا آدم کے ساتھ (تو یہ درجہ بہت گرا ہوا ہے) مقامِ کمال یہ ہے کہ بندہ خود کسی طرف اپنی نسبت نہ کرے بلکہ خود حق تعالیٰ سے فرمائے:
﴿يَعْبَادِ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ﴾ (۳)
”اے میرے بندو! آج کے دن تمہیں کوئی خوف نہیں۔“

وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِالصَّوَابِ

حضرت ابوالحسن علی بن ابراہیم حصری رحمۃ اللہ علیہ:

انہیں میں سے سرورِ سالکان طریقِ جمالِ جانہائے تحقیق حضرت ابوالحسن علی بن ابراہیم حصری رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں۔ احرارِ درگاہ کے مستثمان میں گزرے ہیں اور ائمہ تصوف میں بڑے امام مانے گئے ہیں۔ اپنے زمانہ کے بینظیر صوفی تھے۔ آپ کے کلام نہایت بلند ہیں اور آپ کی عبارات نہایت پر لطف ہیں۔ آپ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا:

دَعُونِي فِي بَلَانِي هَاتُوا مَالَكُمْ اَلَسْتُمْ مِنْ اَوْلَادِ آدَمَ الَّذِي خَلَقَهُ

۱۔ سورۃ الاحزاب: ۷۲ ۲۔ سورۃ الفرقان: ۶۳

۳۔ سورۃ الزخرف: ۶۸

اللَّهُ تَعَالَى بِيَدِهِ وَنَفَخَ فِيهِ مِنْ رُوحِهِ وَسَجَدَ لَهُ الْمَلَائِكَةُ ثُمَّ أَمَرَهُ
بِأَمْرٍ فَخَالَفَ إِذَا كَانَ أَوَّلُ الدِّينِ دُرْدِيًّا كَيْفَ يَكُونُ آخِرُهُ.

”چھوڑو مجھے میری بلا میں! کیا تم سب اولادِ آدم سے نہیں ہو اور کیا انہیں اللہ
تعالیٰ نے اپنے پدِ قدرت سے پیدا نہیں فرمایا۔ پھر اس میں نفخِ روح کیا اور
فرشتوں کو حکم دیا کہ سجدہ کریں۔ پھر اسے ایک حکم دیا گیا لیکن اس نے اس حکم
کے خلاف کیا تو جب پہلی ہی خُم میں تلچھٹ ہو تو بتاؤ اس کے اخیر و اختتام میں
کیا ہوگا؟“

جب آدمی کو اس کی نسبتِ آدمیت پر چھوڑ دیا جائے تو وہ مجسمہٴ مخالفت نہ ہوگا تو کیا ہوگا؟
اور جب عنایتِ حقہ نسبتِ حق کے ساتھ اس پر مستولی ہو تو پھر وہ محبتِ الہی میں عمر گزارنے کے سوا
کچھ پسند نہ کرے۔ وَبِاللَّهِ التَّوْفِيقُ

یہاں تک یعنی متقدمین صوفیائے کرام کے حالات اور ان کے پیشواؤں کے مناقب بیان
کیے گئے ہیں۔ اگر سب کے ذکر اس کتاب میں کیے جائیں اور ان کے حالات و کرامات و حکایات
جمع کریں تو مقصودِ تالیف کتاب رہ جائے اور کتاب اتنی طویل ہو جائے (کہ مطالعہ مشکل ہو) اب
ہم بعض متاخرین کے حالات نقل کریں گے۔



صوفیائے متاخرین

ناظرین کرام! اللہ تمہیں توفیق عطا فرمائے۔ اچھی طرح یاد رکھو کہ ہمارے زمانہ میں اس قسم کے لوگ باقی ہیں جو ریاستِ عرفان پر قبضہ، بلا ریاضت و مجاہدہ کے چاہتے ہیں اور متصوف بن کر اب بابِ قصد و حزم کو بھی اپنے اوپر قیاس کر کے اپنے جیسا سمجھتے ہیں۔

(طریقہ ان کا یہ ہے کہ) جب ذکر و ارتکال اور حالاتِ سلف سن کر ان کے تشریف و قرب کو دیکھتے ہیں اور ان کے زہد و ورع اور مجاہدہ کا قصہ معلوم کرتے ہیں، اپنے نفس اور دل سے پوچھتے اور نگاہ کرتے ہیں (کہ آیا ہم اتنا مجاہدہ، اس قدر ریاضت کرنے کے اہل ہیں یا نہیں)۔ تو وہ اپنے نفس اور دل کو ان مجاہدوں سے دور اور بعید پاتے ہیں (مگر صوفی بن کر عوام پر دام تزویر ڈالنے کے شوقین ہیں)۔ تو بس ان چیزوں سے انکار شروع کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ نہیں، اور ہم میں اس قسم کے لوگ اب باقی نہیں رہے۔

حالانکہ یہ قول ان کا بمرتبہ محال کے ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے کبھی زمین کو بے حجت الہیہ نہیں چھوڑا اور امتِ مرحومہ کبھی بغیر ولی کے نہیں رہی اور نہ رہے گی۔

چنانچہ حضور سید یوم النور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

”لَا يَزَالُ طَائِفَةٌ مِّنْ أُمَّتِي عَلَى الْخَيْرِ وَالْحَقِّ حَتَّى تَقُومَ السَّاعَةُ .“
”ہمیشہ میری امت ایسی جماعت سے خالی نہ رہے گی جو خیر اور حق پر قیامت تک رہے گی۔“

اور فرمایا:

لَا يَزَالُ فِي أُمَّتِي أَرْبَعُونَ عَلَى خُلُقِ إِبْرَاهِيمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ . (۱)

۱۔ اسے ابو نعیم نے ”حلیۃ الاولیاء“ میں بطریق اعمش، انہوں نے یزید بن وہب سے، انہوں نے ابن مسعود سے ان الفاظ کے ساتھ مرفوعاً روایت کیا ہے۔

لَا يَزَالُ أَرْبَعُونَ رَجُلًا مِّنْ أُمَّتِي قُلُوبُهُمْ عَلَى قَلْبِ إِبْرَاهِيمَ ، يَدْفَعُ اللَّهُ بِهِمْ عَنْ أَهْلِ الْأَرْضِ ، يُقَالُ لَهُمْ : الْأَبْدَالُ ، إِنَّهُمْ لَمْ يُدْرِكُوا بِصَلَاةٍ وَلَا بِصَوْمٍ ، (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر۔۔۔۔۔)

”ہمیشہ میری امت میں چالیس مردانِ خدا خلقِ ابراہیم علیہ السلام پر رہیں گے۔“

اب ہم جن لوگوں کا اس کتاب میں ذکر کر چکے ہیں وہ گذر گئے اور ان کی رو میں راحت ریحان میں پہنچ گئیں اور بعض ان میں سے ابھی حیاتِ جسمانی میں موجود ہیں۔ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَعَنْ أَعْمَارِهِمُ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُسْلِمَاتِ .

(بقیہ حواشی گزشتہ صفحہ سے)

وَلَا بِصَدَقَةٍ ، قَالُوا : يَا رَسُولَ اللَّهِ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ فَبِمَ يُذَرُّ كُؤُنْهَا ؟ قَالَ : بِالسَّخَاءِ .
”میری امت سے چالیس آدمی ایسے رہیں گے جن کے دل حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دل کی طرح ہوں گے، ان کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ اہل زمین سے مصائب دور کرے گا اور لوگ نماز، روزہ اور صدقہ کے سبب نہ پاسکیں گے، تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! پھر لوگ انہیں کس طرح پائیں گے تو فرمایا کہ سخاوت کے ساتھ۔“
امام احمد بن حنبل نے اسے اپنی مسند میں عباد بن صامت رضی اللہ عنہ سے ان الفاظ کے ساتھ مرفوعاً روایت کیا ہے:
أَلَّا بُدَّالُ مِنْ هَذِهِ الْأُمَّةِ لِأَلْتُونَ مِثْلَ أَبْرَاهِيمَ الْخَلِيلِ عَلَيْهِ السَّلَامُ ، كَلَّمَا مَاتَ رَجُلٌ ، أُبْدِلَ اللَّهُ مَكَانَهُ رَجُلًا .

”اس امت سے تیس ابدال حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کی طرح ہوں گے، جب (ان میں سے) کوئی ایک آدمی فوت ہوگا تو اللہ تعالیٰ اس کی جگہ دوسرا بدل دے گا۔“

مذکورہ روایت کو امام سیوطی انہی الفاظ کے ساتھ ”الجامع الصغير“ میں لائے ہیں اور اسے امام احمد بن حنبل کی طرف سے منسوب کیا ہے کہ انہوں نے اسے اپنی ”مسند“ میں حضرت عباد بن صامت رضی اللہ عنہ کے طریق سے ذکر کیا ہے اور اس کے صحیح ہونے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ امام زرکشی نے ”التذکرۃ“ میں کہا ہے کہ یہ حسن ہے اور ابن مسعود والی روایت، جسے ابو نعیم نے ”حلیۃ الاولیاء“ میں ذکر کیا ہے، اس کی شاہد ہے۔ امام سیوطی کہتے ہیں: کہ اس حدیث کی بہت ساری شاہد روایات ہیں جسے میں نے ”التعقیبات علی الموضوعات“ میں بیان کیا ہے۔ اور پھر انہیں علیحدہ ایک مستقل تالیف کی شکل دی ہے۔

حوالہ کے لئے:

مسند الإمام احمد بن حنبل ۱/۱۲۱، ۲/۳۳۲ المقاصد الحسنۃ للسرخاوی (۸)، کشف

لخفاء للعجلونی (۳۵)، الجامع الصغير للسیوطی (۳۰۳۲)، فیض القدیر للمناوی

۳/۱۶۷، ۱۷۰، الدرر المنثورة للسیوطی (۳۷۱)، التذکرہ للزرکشی (ص: ۱۴۲)،

الأسرار المرفوعة لعلی القاری (ص: ۴۸)

حضرت ابو العباس احمد بن قصاب رحمۃ اللہ علیہ:

اُن متاخرین صوفیہ سے طرازِ طریق ولایت، جمالِ اہل ہدایت ابو العباس حضرت احمد بن قصاب رضی اللہ عنہ ہیں۔ آپ نے متقدمین ماوراء النہر کی زیارت کی ہے اور ان کے فیضِ صحبت سے بھی مستفید ہوئے ہیں۔ آپ اپنے علو حال اور صدقِ فراست اور کثرتِ برہان و کرامات میں مشہور و معروف تھے۔ حضرت ابو عبد اللہ خیاط رحمۃ اللہ علیہ جو امام طبرستان تھے فرماتے ہیں کہ حضرت جلت مجد عز اسمہ کے فضلوں میں سے ایک فضل یہ ہے کہ اپنے مقرب بندے کو بلا تعلیم علم یہ ذہن سلیم عطا فرماتا ہے کہ اگر مجھے اصولِ طریقت میں یا دقائقِ توحید میں کوئی مشکل پیش آجاتی ہے تو میں ابو العباس احمد سے پوچھ کر حل کر لیتا ہوں۔ آپ غیر تعلیم یافتہ اُنسی تھے مگر کلام اور نکات اتنے بلند بیان فرماتے تھے کہ علمِ تصوف اور اصولِ طریقت میں ابتداء سے انتہا تک آپ کو عالی حال نیک سیرت مانا گیا۔

آپ سے بہت زیادہ حکایتیں میں نے سنی ہیں مگر اس کتاب میں میرا رویہ اختصار پر ہے (اس لیے بعض صرف نقل کروں گا)۔ آپ فرماتے ہیں ایک بچہ سامان لادے ہوئے اونٹ کی ٹکیل تھا مے بازار ”آمل“ میں جا رہا تھا اور اس بازار میں عموماً کیچڑ رہتی تھی، اتفاقاً اونٹ کا پاؤں پھسلا اور گر پڑا، پنڈلی چور ہو گئی۔ لوگوں نے ارادہ کیا کہ اونٹ کی پشت سے سامان اتار دیں۔ لڑکے نے منع کیا اور رو کر بارگاہِ الہی میں دست بدعا ہو گیا۔ فرماتے ہیں کہ میں بھی ادھر سے گزرا۔ دریافت کیا، لوگوں نے کہا اونٹ کا پاؤں ٹوٹ گیا۔ آپ نے اونٹ کی باگ تھامی اور آسمان کی طرف نظر اٹھائی اور عرض کی: الہی! اس اونٹ کا پاؤں ٹھیک کر دے، اگر درست کرنا منظور نہیں تو قصاب کا دل اس بچہ کے رونے سے کیوں سوختہ ہے؟ اتنے میں اونٹ اٹھا اور باسانی چلنے لگا۔

آپ سے مروی ہے کہ فرمایا: تمام عالم خواہ چاہے یا نہ چاہے اللہ تعالیٰ کی رضا کا خوگر کرنا چاہیے ورنہ رنج میں رہیں گے اس لیے کہ جو اللہ تعالیٰ کی رضا میں راضی رہنے کا خوگر ہو گا وہ ہر بلا کو منجانبِ مہلکی سمجھ کر بلا نہ سمجھے گا، پھر گویا جو بلا اس پر آئے گی وہ بلا نہ ہوگی۔ اور اگر خوگرِ رضانا ہو تو بلا جو آتی ہے آئے گی مگر رنجیدگی اس پر لازمی ہے اور درحقیقت بلا و عذاب جو ہمارے لیے مقدر ہے، اس تقدیر کو ہم متغیر نہیں کر سکتے اور اگر ہم راضی برضا رہیں گے تو ہماری رضا کی وجہ میں وہ بلا بحکمِ قادر ہمارے لیے راحت ہو جائے گی۔

تو جو اپنے رب کی رضا میں راضی رہنے کا خوگر ہے اس کا دل ہر حال میں راحت پاتا ہے اور جو قضا و قدر سے اعراض کرتا ہے تو درودِ قضا کے وقت رنجیدہ دل ہوتا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم

حضرت علی دقاق رحمۃ اللہ علیہ:

انہیں متاخرین میں سے صوفیہ بیان، مریدانِ برہانِ محققان حضرت ابوعلی بن حسن بن محمد دقاق رضی اللہ عنہ ہیں۔ امام فن تھے، اپنے زمانہ میں یکتائے عالم گزرے ہیں۔ بیان صریح، زبان فصیح رکھتے تھے اور کشفِ راہِ مولا میں کامل بہت سے مشائخ کرام کو دیکھ چکے ہیں اور ان کے فیضِ صحبت میں مستفید رہے ہیں۔ آپ حضرت محمد بن محمود نصیر آبادی رحمۃ اللہ علیہ کے مرید تھے اور بہترین واعظ تھے۔

آپ سے مروی ہے کہ فرمایا:

مَنْ اَنْسَ بِغَيْرِهِ ضَعِيفٌ فِي حَالِهِ وَمَنْ نَطَقَ مِنْ غَيْرِهِ كَذَبٌ فِي مَقَالِهِ.

”جسے غیر خدا کے ساتھ موانست ہو وہ اپنے کیفیتِ حال میں ضعیف ہے اور

جو اپنے رب کے سوا کسی سے مکالمہ کرے وہ اپنے بیان میں جھوٹا ہے۔“

اس لیے کہ انسِ غیر، قلتِ عرفان کی وجہ میں ہوتا ہے اور اس ذاتِ حق سے انس تب ہوتا

ہے جبکہ وحشتِ دلی جاتی رہے اور جو متوحش بالغیر ہوگا، غیر خدا سے ناطق نہیں ہو سکتا۔

ایک بزرگ سے سنا کہ وہ فرماتے تھے کہ ایک روز مجلسِ علی دقاق رحمۃ اللہ علیہ میں اس

نیت سے پہنچا کہ متوکلوں کا حال دریافت کروں۔ آپ کے سرِ اقدس پر دستارِ طبری زیب تھی۔

میرے دل میں اس دستار کی طرف میلان ہوا۔ میں نے علی دقاق ”سے عرض کی کہ حضور! تو کل کیا

چیز ہے؟ فرمایا تو کل یہ ہے کہ تو اپنے دل کا میلان کسی کی دستار کی طرف نہ ہونے دے۔ یہ فرمایا اور

دستارِ سرِ اقدس سے اتار کر میری طرف پھینک دی۔ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ

حضرت ابوالحسن خرقانی رحمۃ اللہ علیہ:

انہیں متاخرین صوفیاء سے شرفِ اہلِ زمانہ، امامِ یگانہ ابوالحسن حضرت علی بن احمد خرقانی

رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں۔ اجلہ مشائخ سے تھے اور اپنے وقت میں ممدوح اولیاء گزرے ہیں حتیٰ کہ

حضرت شیخ ابوسعید رحمۃ اللہ علیہ بقصد زیارت آپ کے پاس آئے اور آپ کے ساتھ خاص راز کی

باتیں ہوئیں۔ جب واپس ہوئے تو فرمایا: ابوالحسن! ہم نے تمہیں اپنی عہدِ ولایت کے لیے منتخب کیا

اور حسن مودب خادم شیخ ابوسعید کہتے ہیں کہ جب شیخ حضرت ابوالحسن خرقانی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس

پہنچے تو آپ نے اپنی طرف سے کوئی بات نہ کی اور حضرت ابوالحسن خرقانی رحمۃ اللہ علیہ کی باتیں سنتے

رہے، کبھی کبھی کسی بات کے جواب میں کلام فرماتے۔ میں نے عرض کی حضرت! آپ کس لیے

خاموش رہے۔ فرمایا: ایک بات کے لیے ایک ہی بولنے والا کافی ہوتا ہے۔

اور استاد ابو القاسم قشیری رحمۃ اللہ علیہ سے سنا کہ فرماتے ہیں جب ہم ولایت خراسان میں آئے تو ہماری فصاحت ختم ہو گئی اور عباراتِ حال جاتی رہیں۔ یہ دبدبہ و شوکت پیر خراسانی کا تھا، حتیٰ کہ ہم اپنے منصبِ ولایت سے وہاں کی مدتِ قیام میں معزول ہو گئے۔

آپ سے مروی ہے کہ فرمایا راستے دو ہیں: ایک راہِ ضلالت ہے، دوسرا راہِ ہدایت۔ جو راہِ ضلالت ہے، وہ بندہ کا راستہ ہے خدا کی طرف اور وہ جو راہِ ہدایت ہے وہ خدا کا راستہ ہے بندہ کی طرف۔ تو جو بندہ کہے کہ میں اللہ تعالیٰ تک پہنچا، وہ ہرگز نہیں پہنچا اور جو کہے مجھے اللہ تعالیٰ تک پہنچا دیا وہ یقیناً پہنچ گیا۔ اس لیے کہ کامیابی پہنچنے اور نہ پہنچنے اور کامیاب ہونے اور نہ ہونے میں نہیں ہے کہ پہنچانے اور نہ پہنچانے اور آزاد کرنے اور نہ کرنے میں مضمر ہے۔ واللہ اعلم۔

حضرت ابو عبد اللہ محمد بن معروف بسطامی رحمۃ اللہ علیہ:

انہیں متاخرین صوفیہ سے بادشاہِ زمان حضرت ابو عبد اللہ محمد بن معروف بہ داستانی بسطامی رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ علوم میں بہترین عالم اور درگاہِ حق میں محتشم تھے۔ آپ کا کلام نہایت مہذب تھا اور ارشادات نہایت لطیف۔

شیخ سہلکی رحمۃ اللہ علیہ جو اس ملک کے امام تھے، آپ سے بہت محبت کرتے تھے اور میں نے شیخ سہلکی سے ان کے کچھ اقوال سنے ہیں۔ منجملہ ان کے یہ ہے کہ آپ نے فرمایا:

التَّوْحِيدُ عِنْدَكَ مَوْجُودٌ وَأَنْتَ فِي التَّوْحِيدِ مَفْقُودٌ.

”تجھ میں تو حید درست ہے لیکن تو حید میں نادرست اور مفقود ہے۔“

یعنی بموجب اقتضائے حق، تو حید پر تیرا قیام صحیح نہیں اور ادنیٰ درجہ تو حید کا نفی تصرف ہے۔ ملک جسم سے اپنے امور میں حق عز و جل کا اثبات۔ شیخ سہلکی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ جس وقت کہ بسطام میں ٹڈیاں اس قدر آئیں کہ تمام درختوں کو چاٹ گئیں اور کشتیاں ان کی سیاہ ہو گئیں اور لوگ تضرع و زاری میں مشغول ہو گئے تو شیخ بسطامی نے مجھ سے پوچھا: یہ کیسا شور ہے۔ عرض کی: حضور ٹڈیاں آئی ہیں اور لوگ ان سے تنگ آئے ہوئے ہیں۔ یہ سنتے ہی شیخ اٹھے اور چھت پر تشریف لائے اور آسمان کی طرف رخ کیا کہ اسی وقت تمام ٹڈیاں اٹھیں اور عصر کی نماز تک ایک بھی نہ رہی اور کسی کا ایک پتا برابر نقصان نہ ہوا۔ واللہ اعلم

حضرت ابوسعید فضل بن محمد مہنی رحمۃ اللہ علیہ:

انہیں متاخرین صوفیہ سے شہنشاہِ مہمان، ملکِ ملوک صوفیاں حضرت ابوسعید فضل اللہ بن محمد مہنی رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ سلطانِ وقت و جمالِ طریقت گزرے ہیں۔ تمام اہل زمانہ آپ سے مسخر تھے۔ کوئی آپ کے دیدار کا مشتاق رہتا، کوئی آپ سے حسن عقیدت رکھتا۔ کوئی آپ کی قوتِ حال کا قائل تھا۔ علوم و فنون میں مانے ہوئے عالم ہونے کے علاوہ اشرافِ قوم میں عظیم الشان درجہ رکھتے تھے۔ مزید برآں طریقت میں آپ کی نشانیاں اور براہین بے حد ہیں۔ چنانچہ آج تک آپ کے آثارِ کمالات اتنے ظاہر ہیں کہ دنیا جانتی ہے۔

ابتدائی زمانہ میں آپ بغرض حصول علم مقام ”مہنہ“ سے مقام ”سرخس“ میں آئے اور حضرت ابوعلی راضی یعنی چابکسوار کی خدمت میں رہے۔ آپ کی ذہانت کا یہ عالم تھا کہ تین روز کا سبق ایک دن میں پڑھا کرتے اور تین دن عبادتِ الہی میں بسر فرماتے۔ امام ابوعلی رحمۃ اللہ علیہ نے جب آپ کی یہ راست روی ملاحظہ فرمائی تو آپ کی عظمت فرمانے لگے اور تعلیم میں کچھ زیادتی کر دی۔ اس زمانہ میں والی سرخس شیخ ابوالفضل حسن تھا۔ ایک دن حضرت فضل اللہ ابوسعید ”جو تبار“ نہر پر گلگشت فرما رہے تھے کہ ابوالفضل والی سرخس سے دوچار ہو گئے۔ ابوالفضل حسن نے آپ سے کہا: ابوسعید! جس راستے پر تم جا رہے ہو یہ تمہارا راستہ نہیں، اپنا راستہ لو۔ حضرت ابوسعید رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی طرف التفات نہ کیا اور سیر فرما کر اپنی قیام گاہ پر تشریف لے آئے اور اپنے مشاغلِ ریاضت و مجاہدہ میں مشغول ہو گئے، حتیٰ کہ حق تعالیٰ نے درِ ہدایت کھولا اور حضرت ابوسعید کو مدارجِ علیا پر فائز فرمایا۔

شیخ ابوفاری فرماتے ہیں کہ مجھے ابوسعید فضل اللہ سے دیرینہ خصومت تھی (لیکن ان کے زہد و ورع کا شہرہ سن کر) جب ان کی زیارت کا شوق ہوا تو میں ایسی حالت میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا کہ میرے جسم پر ایسا خرقہ تھا کہ میلا ہو کر چمڑے کی طرح ہو گیا تھا۔ جب میں آپ کی خدمت میں پہنچا تو میں نے دیکھا کہ آپ تختِ مرصع پر ردائے مصری ڈالے تشریف فرما ہیں۔ میں نے اپنے دل میں یہ اعتراض کیا کہ یہ مرد دعویٰ فقیری کر کے اس قدر علاقہ دنیاوی میں پھنسا ہوا ہے اور تمام علاقہ سے انقطاع کر کے مدعی فقر ہونے سے میری اس کے ساتھ کیونکر موافقت ہوگی۔ ابوسعید فضل اللہ اپنے نورِ فراست سے میرے اس خطرے سے واقف ہو گئے اور سراٹھا کر مجمع سے فرمایا:

يَا أَبَا مُسْلِمٍ فِي أَيِّ دِيْوَانٍ وَجَدْتُ مَنْ كَانَ قَلْبُهُ قَائِمًا فِي مُشَاهَدَةِ
الْحَقِّ يَقَعُ عَلَيْهِ اسْمُ الْفَقْرِ.

”ابو مسلم! تم نے کس کتاب میں دیکھا کہ جب کسی کا دل خدا کے مشاہدہ میں قائم ہو، اس پر نام فقر آتا ہے۔“

یعنی جو اصحاب مشاہدہ ہیں وہ اپنے رب کے ساتھ غنی ہیں اور جو فقیر ہیں وہ ارباب مجاہدہ کہلاتے ہیں۔ ابو مسلم نے کہا یہ جواب سن کر اپنے دل میں نخل و پریشان ہوا اور اپنے بے جا وسوسہ سے توبہ کی۔

آپ سے مروی ہے کہ فرمایا:

التَّصَوُّفُ قِيَامُ الْقَلْبِ مَعَ اللَّهِ بِبَلَاءٍ وَاسِطَةٍ .

”تصوف قیامِ دلِ بحق کا نام ہے جو بلا واسطہ ہو۔“

اور یہ بھی مشاہدہ کی طرف اشارہ ہے، اس لیے کہ مشاہدہ غلبہ دوستی سے ہوتا ہے اور شوقِ رویت و مشاہدہ استغراق میں ہوتا ہے اور فنا جسے کہتے ہیں وہ بقا بحق کہلاتی ہے۔ اس بحث کو کتاب الحج کے عنوان سے مشاہدہ وجود کی تفصیل کے لیے علیحدہ باب میں بیان کیا جائے گا۔ انشاء اللہ۔

ایک بار حضرت ابو سعید فضل اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے نیشاپور سے طوس کا قصد فرمایا۔ راستہ میں سردی سخت تھی۔ حتیٰ کہ موزوں کے اندر بھی پائے مبارک سردی محسوس کرنے لگے۔ ایک درویش کہتے ہیں کہ میں نے سوچا کہ اپنی کمر کی پٹی کے دو ٹکڑے کر کے پائے مبارک میں لپیٹ دوں مگر میرے دل نے اس کا کاٹنا گوارا نہ کیا اس لیے کہ وہ بہت عمدہ تھی۔ جب ہم طوس آ گئے۔ ایک روز محل میں نے عرض کی کہ حضور! وسواسِ شیطانی اور الہام میں کیا فرق ہے؟ فرمایا: الہام وہ ہے جس میں تجھے کہا گیا کہ کمر پٹی کاٹ کر ابو سعید کے پیروں کو سردی سے محفوظ کر اور وسواسِ شیطانی وہ ہے جس نے تجھے اس کام سے روکا، اور اس قسم کی بہت سی باتیں متواتر ہیں، لیکن اس مختصر میں یہ ہی بس ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

حضرت شیخ ابوالفضل محمد بن حسن نخلی رحمۃ اللہ علیہ ::

(یہ حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کے مرشد ہیں)

انہیں متاخرین صوفیاء میں میرے مرشدِ بحق، زین اوتاد، شیخ عباد ابوالفضل حضرت محمد بن حسن نخلی رضی اللہ عنہ ہیں۔ طریقت میں میری پیروی و اقتداء ان کے ساتھ ہے۔ علم تفسیر و روایات کے زبردست عالم تھے اور تصوف میں مسلک جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ رکھتے تھے اور آپ حضرت حصری رحمۃ اللہ علیہ کے مرید تھے اور سیرتی کے مصاحب اور حضرت ابو عمر قزوینی اور ابوالحسن بن سائبہ رحمہم اللہ کے ہم عصر تھے۔

ساتھ سال عزت نشین رہ کر مخلوق میں سے اپنا نام گم فرما چکے ہیں۔ زیادہ تر آپ کا قیام ”جبلِ لگام“ میں رہا، کافی عمر پائی۔ آپ کی آیات و براہین بہت ہیں مگر آپ کا لباس متصوفین کی رسم کا نہ تھا اور رسی چیزوں کے آپ سخت خلاف تھے۔ میں نے اس مردِ خدا سے زیادہ بازُعب کوئی نہیں دیکھا۔ آپ سے میں نے سنا کہ فرمایا: **الدُّنْيَا يَوْمٌ وَلَنَّا فِيهِ صَوْمٌ**۔ ”دنیا مثل ایک دن کے ہے اور اس دن میں ہمارا روزہ ہے۔“ یعنی اس دنیا سے ہم نے کچھ حصہ نہیں لیا اور اس کی قید میں ہم نہیں آئے، اس لیے کہ دنیا کی آفتیں ہماری دیکھی ہوئی ہیں اور اس کا جو حجاب ہے اس سے ہم واقف ہو چکے ہیں۔

ایک روز میں وضو کے لیے حضور کے ہاتھ پر پانی ڈال رہا تھا، تو میرے دل میں خطرہ پیدا ہوا کہ جب تمام نظامِ عالم اور کاروبارِ دنیا قسمت پر موقوف ہے تو کس لیے اچھے خاصے آزاد لوگ امیدِ کرامت و فیوض پر اپنے آپ کو پیروں، فقیروں کا غلام اور بندہٴ حکم بناتے ہیں۔ (میرے دل میں یہ خطرہ گزرا ہی تھا کہ) حضور فرمانے لگے: صاحبِ زادے! جو دوسو تمہارے دل میں پیدا ہوا، ہمیں معلوم ہے۔ یاد رکھو اور اچھی طرح سمجھ لو کہ قضا و قدر کے ہر حکم کے لیے اللہ تعالیٰ نے سبب رکھے ہیں۔ جب ظالم بچہ یعنی سپاہی زادہ کو اللہ تعالیٰ تاجِ عرفان و مملکتِ عشق سے نوازا جاتا ہے تو اسے توفیقِ توبہ دے کر اپنے کسی مقرب دوست کی خدمت میں مشغول فرما دیتا ہے، تاکہ وہ خدمتِ گزاری اس کی عزت و کرامت کے لیے سبب بنے۔“ اور مثل اس کے بہت سے لطائف ہر روز اوپر ظاہر ہوتے رہتے تھے۔

جس روز کہ حضرت کی وفات کا وقت آیا، آپ اس روز ”بیتِ الجن“ میں تھے۔ یہ ایک گاؤں ہے جو ”دمشق“ اور ”بانیارود“ کے مابین ایک گھائی پر آباد ہے۔ آپ کا سر مبارک میری گود میں تھا اور مجھے ایک پیر بھائی سے دل میں رنج تھا، جیسا کہ عام لوگوں کی عادت کے ماتحت لوگوں میں ہوتا ہے تو سرکارِ مجھ سے فرمانے لگے: بیٹا! تمہیں ایک عقیدہ بتاتا ہوں اگر تم اس پر قائم ہو گئے تو تمام جہان کے غموں سے آزاد ہو جاؤ گے۔ ”یاد رکھو! ہر جگہ اور ہر حال اللہ تعالیٰ جل شانہ کا پیدا کیا ہوا ہے، خواہ وہ نیک ہو یا بد، ہمیں چاہئے کہ ہم اللہ تعالیٰ کی کسی پیدا کی ہوئی چیز سے خصومت نہ رکھیں اور کسی کی طرف سے دل میں رنج نہ رکھیں۔“ بس اس وصیت کے بعد اور کچھ نہ فرمایا اور جانِ جانِ آفرین کے سپرد فرمادی۔ واللہ اعلم بالصواب۔

ابوالقاسم حضرت عبدالکریم بن ہوازن قشیری رحمۃ اللہ علیہ:

انہیں متاخرین صوفیاء میں استاد و امام زین الاسلام ابوالقاسم حضرت عبدالکریم بن

ہوازن قشیری رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ اپنے زمانے کے بدیع المثل لوگوں میں تھے اور عزت و حرمت میں رفیع المثل اور منزلوں میں علو الحال تھے۔ ان کی بزرگی کا زمانہ مقرر ہے اور ان کے فضائل عام طور پر مشہور ہیں۔ ہر فن میں ان کے لطائف بے حد ہیں۔ تصانیف بہت زیادہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کے حال و حال کو حشو و زوائد سے محفوظ فرمادیا تھا۔

آپ سے میں نے سنا کہ فرمایا:

مَثَلُ الْمُتَصَوِّفِ كَعِلَّةِ الْبُرْسَامِ أَوْلُهُ هَذَا يَأْنِ وَالْخِرَةُ سُكُوتٌ وَإِذَا تَمَكَّنَتْ خَرَسَتْ.

”صوفی کی مثال مریضِ برسام کی سی ہے جس کی ابتدا ہڈیاں اور بہکی بہکی باتوں سے ہوتی ہے اور آخر میں خاموشی اور جب وہ متمکن ہو جاتا ہے تو گونگا کر دیتا ہے۔“

تو صفاء قلب کے دورِ رخ ہیں: ایک وجد، دوسرے نمود۔ وجد کیفیتِ مبتدیانہ ہے اور نمود وجدِ منتہیان ہے اور وجد ایک ایسی کیفیت ہے کہ اس کی ترجمانی عبارت میں محال ہے تو جب تک مبتدی طالب رہتا ہے اپنی علو ہمت میں ناطق ہوتا ہے، جو مثل بکو اس ہے اور اسی کو ہڈیاں کہا گیا اور جب منتہاء کمال کو پہنچ گیا تو پھر نہ عبارت رہتی ہے نہ بیان نہ ہڈیاں۔

اس کی مثال یوں سمجھنی چاہیے کہ جب موسیٰ علیہ السلام درجہ مبتدی میں تھے، آپ کی ہمت رویت کی طالب تھی۔ حتیٰ کہ اپنی ہمت کے ماتحت طلبِ رویت کی عبارت بھی کہہ ڈالی اور صاف عرض کیا: رَبِّ أَرِنِي أَنْظُرَ إِلَيْكَ^ط (۱) ”اے رب! اپنا تجلی حسن دکھا کہ میں اس جلوہ کو دیکھوں۔“

یہ وہ عبارت ہے جس سے مقصود حاصل نہ ہونا تھا تو یہ نطق بے معنی ہی تھا اور ہمارے حضور سید یوم النور صلی اللہ علیہ وسلم مقامِ منتہی پر متمکن تھے۔ تو جب کسی کی شخصیت تمام مقامات سے عبور کر کے منتہا کو پہنچ جاتی ہے تو اس کی ہمت و خواہش سب فنا ہو جاتی ہے، تو حضور فرما رہے ہیں: لَا أُحْصِي ثَنَاءً عَلَيْكَ. (۲) ”تیری حمد و ثناء کا احصا ناممکن ہے۔“ یہ منزل رفیع اور مقام عالی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب.

۱۔ سورۃ الاعراف: ۱۴۳

۲۔ یہ امام مسلم کی ”صحیح“ ۳۵۲/۱ (کتاب الصلاة: باب ما يقال فی الركوع والسجود، حدیث: ۴۸۶) میں روایت کردہ حدیث کا جز ہے کمل الفاظ یہ ہیں:

اللَّهُمَّ اغْوِذْ بِرِضَاكَ مِنْ سُخْطِكَ، وَبِمُعَا فَاتِكَ مِنْ عُقُوبَتِكَ، لَا أُحْصِي ثَنَاءً عَلَيْكَ
(بقیہ حواشی اگلے صفحہ پر۔۔۔۔۔)

حضرت ابو العباس احمد بن محمد شقائی رحمۃ اللہ علیہ:

انہیں متاخرین صوفیاء سے امام اوحد ابو العباس احمد بن محمد شقائی رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ اصول و فروع میں بڑے ماہر اور امام وقت گزرے ہیں بہت سے مشائخ کبار کی زیارت سے مشرف ہو چکے ہیں۔ متصوفین کی جماعت میں خاص طور پر کبراء قوم مانے گئے۔ آپ خود کو مقام فنا کے ساتھ تعبیر فرماتے تھے اور آپ کی عبارات بہت مغلط ہوتی ہیں اور ان عبارتوں کے لیے آپ مخصوص ہیں۔

میں نے ایک جماعت جاہلوں کی پائی جو آپ کی عبارت کے ظاہر پر کورانہ تقلید کرتی ہے اور یہ تقلید بے معنی اور ناستودہ ہے (یعنی مفہوم مضمون قائل نہ سمجھ کر محض عبارت کے سطحی معنی کی تقلید جہالت محض ہے اور وہ تقلید جو امام معین کی جاتی ہے وہ عین منشاء اسلام ہے)۔ تم دیکھو کہ ان کی عبارتیں کس قسم کی ہیں، میرے دل میں ان کی زبردست محبت ہے اور مجھ پر ان کی بحد غایت، صادق شفقت ہے اور بعض علوم میں وہ میرے استاد بھی ہیں۔ جب تک میں ان کے پاس رہا، میں نے تعظیم شرع کرنے والا ان سے زیادہ کسی کو نہ پایا۔

(بقیہ حواشی گزشتہ صفحہ سے)

أَنْتَ كَمَا أُنِّيَتْ عَلَيَّ نَفْسِكَ.

اسی طرح امام ابو داؤد نے اپنی ”سنن“ (۱/۵۲۷، کتاب الصلاة: باب الدعاء فی الركوع والسجود حدیث: ۸۷۹) میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے امام مسلم کی صحیح میں روایت کردہ حدیث کے الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے، امام ماجہ نے اپنی ”سنن“ (۳/۳۷۳، کتاب اقامة الصلوة: باب ماجاء فی القنوت فی الوتر: حدیث: ۱۱۷۹) میں حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے:

كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ فِي آخِرِ وَتَرِهِ: اللَّهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِرِضَاكَ مِنْ سَخِطِكَ... الخ

اللَّهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِرِضَاكَ مِنْ سَخِطِكَ... الخ

اسی طرح اسے امام احمد بن حنبل نے اپنی ”مسند“ (۱/۱۱۸، ۱۵۰، ۱۵۸، ۲۰۱) میں، امام مالک نے ”الموطا“ (۱/۱۶۷، باب ماجاء فی الدعاء) میں، امام غزالی نے ”احیاء العلوم“ (۲/۶۳۷، ۲۰۹) میں، امام سیوطی نے ”الجامع الصغير“ (۵۹) میں سراج طوسی نے کتاب اللمع (ص: ۱۱۳) ان الفاظ کے ساتھ ذکر کیا ہے:

كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ وَسَلَّمَ يَدْعُو فِي سَجْدَتِهِ، أَعُوذُ بِرِضَاكَ مِنْ سَخِطِكَ، وَأَعُوذُ بِمَعَا فَاتِكَ مِنْ عُقُوبَتِكَ، وَأَعُوذُ بِكَ مِنْكَ... الخ

انہوں نے ماسوا اللہ اور کل موجودات سے اپنے دل کو صاف کر رکھا تھا۔ ان کے علم و عبادتِ دقیقہ کا خزانہ کسی کے لیے فائدہ نہیں تھا۔ ان کے وقت حال کے مطابق ان کی عبارتِ علمِ اصول سے پیوستہ ہوتی تھی اور ان کا دل دنیا و عقبی دونوں سے متنفر تھا۔ ہمیشہ جوش و خروش میں فرمایا کرتے تھے: اَشْتَهِي عَدَمًا لَا وُجُودَ لَهُ. ”میں نے ایسے عدم کی خواہش کی جس کا وجود ہی نہیں۔“

کبھی فارسی میں فرماتے:

مر آدمی رابایست محال باشد و مرانیزبایست محالست کہ
 بہ یقین دانم آن نباشد کہ و آن آنست کہ میبا یدم کہ خداوند
 تعالیٰ مرا بعدم برو کہ ہرگز آن عدم را وجود نباشد۔
 ”ہر آدمی کے لیے ایک جگہ ہے اور میرے لیے بھی یقیناً ایک محل ہے اور میں
 یقیناً جانتا ہوں کہ وہ عدم محض ہے اور وہ عدم وہ ہے کہ ضرور مجھے وہاں لے جایا
 جائے گا، اور میرا رب مجھے عدم میں پہنچا دے گا اور وہ وہ جگہ ہے جس کا
 وجود نہیں۔“

اس لیے کہ مقامات و کرامات تمام کے تمام محلِ حجاب و بلا ہیں اور انسان اپنے حجاب کا عاشق ہے اور نیستی و عدم جو دیدارِ یار میں ہو، وہ بہترین نعمت ہے اور اس بہشت سے افضل ہے جس میں حجابِ محبوب ہو اور جب حق جل علا شانہ وہ ہستی ہے کہ اس پر عدم محال ہے پھر اس کی ملکیت میں میرے نیست ہو جانے سے کیا زیاں ہو سکتا ہے اور یقیناً میرے عدم کو وجود نہیں ہے۔ یہ ان کی اصل طریقت میں دلیل قوی ہے جو مرتبہ فنا میں منکشف ہوتی ہے۔ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ

حضرت ابوالقاسم بن علی بن عبداللہ گرگانی رحمۃ اللہ علیہ:

انہیں متاخرین صوفیاء میں قطبِ زمانہ حضرت ابوالقاسم بن علی بن عبداللہ گرگانی (۱) رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ مَتَعْنَا اللّٰهُ وَالْمُسْلِمِينَ بِبَقَائِهِ۔ اپنے وقت میں عارف بے نظیر اور اپنے زمانہ میں صوفی بے بدیل گزرے ہیں۔ آپ کا ابتدائی زمانہ بھی بہت نیک گزرا اور آپ کے سفر بشرائطِ مجاہدہ بہت کامیاب ہوئے۔ آپ کی طرف قریب قریب ہر دل رجوع کرتا رہا ہے اور ہر ایک کی نظر میں آپ کا بہت زیادہ اعتماد تھا۔

۱۔ سمرقند کی مطبوعہ کتاب میں ”گرگان“ لکھا ہے اور مترجموں نے ”کرمانی“ لکھا ہے۔ یہ نہیں معلوم کہ انہوں نے کرمانی کن معلومات کے تحت لکھا ہے۔ واللہ اعلم (ابوالحسنات قادری)

مریدوں میں آپ کا کشف مشہور تھا۔ علوم ظاہری میں تمام فنون میں ماہر تھے۔ آپ کا ہر مرید ایک امتیاز خاص رکھتا تھا۔ آپ کا خلق بھی نہایت اچھا تھا اور آپ کے پسماندگان بھی ان شاء اللہ ایسے ہی ہوں گے کہ قوم ان کی اقتداء و پیروی کرے۔ آپ کو ”لسان العصر“ مانا جاتا تھا۔ حضرت ابوعلی حضرت ابوالفضل بن محمد فارمدی ابقاء اللہ نے دنیا سے اپنا حصہ ترک کر کے سب سے اعراض کر لیا ہے اور علامہ گرگانی رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت اختیار کی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی مراد اس مبارک ہستی کے صدقہ میں پوری کی اور سید علی گرگانی کی زبان بنا دیا۔ ایک روز میں شیخ گرگان کی خدمت میں حاضر تھا اور اپنے لطائف جو مجھ پر منکشف ہوئے تھے، عرض کر رہا تھا تاکہ اپنا حال ان کی ہدایت کے مطابق درست کروں کیونکہ آپ ناقد وقت تھے۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔

حضرت علی گرگانی رحمۃ اللہ علیہ میرا تمام حال احترام کے ساتھ سنتے ہیں۔ میرا لڑکپن اور بچپن کا نخوت اور جوش جوانی مجھے اپنے حال کی ترجمانی پر حرص بڑھا رہا تھا اور دل میں یہ خیال سکھ زن ہوا کہ جو لطائف مجھ پر منکشف ہوئے ہیں شاید اس قدر لطائف ان پر منکشف نہیں ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ اتنے غور و خوض سے سن رہے ہیں۔ شیخ علی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی فراست و ولایت سے میرے ضمیر کی آواز و خیال کو پہچان لیا اور فرمایا: اے جان پدر! میری یہ فروتنی اور نیاز مندی تیرے لیے نہیں ہے بلکہ ہر مبتدی سے جو اپنے حالات لطائف مجھے سناتا ہے، ایسے ہی سناتا ہے، یہ تمہارے لیے ہی خاص نہیں ہے۔ جب میں نے آپ سے یہ الفاظ سنے تو میں خاموش ہو گیا۔ آپ نے جب میری یہ خجالت محسوس فرمائی تو مجھ سے فرمایا۔ بیٹا! انسان کو طریقت میں اس سے زیادہ نسبت نہیں کہ جب وہ اس طریق کو اختیار کرتا ہے تو پھر اس کو چہ کے سوا کسی اور سمت اُسے جانا منظور نہیں ہوتا اور جب وہ اس منصب سے معزول کر دیا جاتا ہے تو اُسے اس کو چہ کے مذاکرہ سے فرحت ہوتی ہے۔ تو نفی و اثبات اور فقدان وجود ہر دو ایک خواہش کے ماتحت ہیں اور انسان کبھی اپنے پندار و ہم و خواہش سے دستکار نہیں ہو سکتا۔ اسے چاہیے کہ بارگاہ ایزدی میں بندگی و عبودیت اختیار کرے اور تمام نسبتوں کو اپنے سے رفع کر کے سوا نسبت مردانگی اور خرم و استقلال و فرمانبرداری کے، کسی وقت التفات نہ رکھے۔ (اس کے بعد منجانب اللہ اس پر اسرار منکشف ہوں گے)۔ علاوہ اس کے، اُن کے اور میرے مابین بہت سے راز تھے، اگر ان کی تفصیل کی طرف رجوع ہو جاؤں تو جو مقصود تالیف کتاب ہے، وہ رہ جائے۔ اس لیے اس اختصار پر ہی اکتفا کرتا ہوں۔

حضرت ابو احمد مظفر بن حمدان رحمۃ اللہ علیہ:

انہیں متاخرین میں سے رئیس الاولیاء، ناصح اہل صفا حضرت ابو احمد مظفر بن حمدان رضی

اللہ عنہ نے سریر سلطنت پر دروازہ اسرار منکشف فرمایا اور تاج کرامت و عرفان سے انہیں نوازا۔
بحسب فنا و بقا میں اُن کا پیغام نہایت عمدہ و بلند ہے۔

اور شیخ المشائخ حضرت سید ابوسعید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ہمیں بندگی و عبودیت کے ذریعہ سے یہ راہ طریقت ملی مگر ابواحمد مظفر کو اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی۔ یعنی ہم مجاہدہ کر کے مرتبہ مشاہدہ تک پہنچے مگر وہ بفضل الہی مشاہدہ سے مجاہدہ کی طرف آئے۔

میں نے خود حضرت ابواحمد مظفر سے سنا کہ فرماتے تھے کہ وہ نعمت جو عرفاء و کملاء کو قطع بوادی عشق اور طے مراحل جہد کے بعد حاصل ہوئی، اللہ تعالیٰ نے مجھے مسند پر حکومت کرتے ہوئے عطا فرمائی، بلکہ جو لوگ متکبر ہیں وہ (اپنے اوپر قیاس کر کے) حضرت خواجہ ابواحمد مظفر کے اس قول کو محض تعالیٰ خبر کرتے ہیں، حالانکہ یہ اُن کا عیب ہے۔ اس لیے کہ جو اپنے حال کو صداقت سے بیان کرے وہ محض دعویٰ نہیں ہوتا، علی الخصوص جب کہ اُن کی رفعت مکانی کو اربابِ معنی بھی بیان کر رہے ہوں۔

اور آج ان کے فرزند رشید موجود ہیں اور حضرت خواجہ احمد فرماتے ہیں کہ ایک روز میں اُن کی خدمت میں حاضر تھا کہ نیشاپور کا ایک مدعی تصوف ان کی خدمت میں آیا اور کہنے لگا: ”فانی نشود آنگاہ باقی نشود۔“ ”یعنی اول فانی ہو تو پھر باقی ہوگا۔“ حضرت خواجہ مظفر رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: فنا پر بقاء کس طرح صورت حاصل کر سکتی ہے اس لیے کہ فنا کے معنی نیست کے ہیں اور بقاء کے معنی ہست کے، اور ان دونوں صورتوں میں ایک دوسرے کی نفی ہے (اس لیے کہ فنا بقا کی ضد ہے اور بقاء فنا کی ضد)۔ تو جب فنا ہوئی تو فنا معلوم کی فنا ہوگی مگر یہ فنا عین نہیں بلکہ جسے فنا کہا جاتا ہے، وہ کچھ اور ہی چیز ہے کیونکہ یہ جائز نہیں کہ حقیقتیں فنا ہوں تو درحقیقت فنا نام صفت فنا کا ہے، اس لیے کہ سبب کا فنا ہونا جائز ہے۔

تو صفت و سبب کے فنا ہو جانے سے موصوف اور مسبب باقی رہتا ہے اور یہ یاد رکھو کہ ذات پر فنا کبھی درست نہیں۔ اور میں (یعنی حضرت علی بن عثمان جلابی رحمۃ اللہ علیہ) کہتا ہوں کہ مجھے خواجہ مظفر رحمۃ اللہ علیہ کی عبارت بلفظ یاد نہیں رہی۔ میں نے جو کچھ کہا ہے وہ اس عبارت کا مفہوم بیان کیا ہے۔

اور عبارت کے مفہوم کو میں اور زیادہ وضاحت سے بیان کرتا ہوں تاکہ عام فہم ہو جائے وہ یہ ہے کہ بندہ کا اختیار بندہ کی صفت پر ہے اور جب تک بندہ اپنے اختیار میں رہتا ہے محبوب ہوتا ہے تو گویا صفتِ عبد، حق تعالیٰ کی طرف بندہ کے لیے حجاب ہے اور اختیار ذات واجب اللہ تعالیٰ

شانہ ازلی وابدی ہے اور اختیاراتِ عبد حادث ہیں اور ازلی پر فنا محال ہے۔ تو جب اختیارِ فعال لیا
یُریدُ (۱) حق عبد میں بمرتبہ بقا قائم ہوتا ہے تو اس وقت اختیارِ عبد فانی ہو کر تصرفِ عبدیت کو منقطع
کردیتا ہے۔ واللہ اعلم

ایک دن میں گرمی کی شدت سے شیخ ابوالمظفرؒ کی خدمت میں اپنے کپڑوں کو شوریدہ کیے
ہوئے پسینہ میں شرابور سراسیمہ حاضر ہوا۔ مجھ سے فرمایا: ابوالحسن! کیا حال ہے جو اس قدر گھبرار ہے
ہو! میں نے عرض کی! سرکارِ سماع کی خواہش ہے۔ اسی وقت کسی خادم کو حکم ہوا، علی الفور قوال حاضر
ہو گئے اور ایک جماعت اہل مشرف کی بھی آگئی۔ قوالی شروع ہوئی کہ ایک نو عمر لڑکے نے جوشِ
جوانی اور قوتِ ارادہ اور آتشِ عشقِ حرارت سے اثناء سماع میں مجھے مضطرب کر دیا۔ کچھ اس کے
جذبات سے اور کچھ کلمات پر سوز سے میں بیقرار ہو گیا۔ تھوڑی دیر میں وہ کیفیت غیبانی جو آفت
حال سے مجھ پر طاری ہوئی تھی، کم ہوئی، تو مجھ سے دریافت فرمایا: اب تیرا کیا حال ہے؟ میں نے
عرض کی، اب بہت سکون ہے۔

سماع و قوالی کے نقصانات:

فرمایا: ایک وقت تجھ پر وہ آئے گا کہ یہ آوازِ سماع اور کوئے کی کائیں کائیں تیرے لیے
یکساں ہوگی، اس لیے کہ سماع کا اثر صوفی کے قلب پر اسی وقت ہوتا ہے جب تک وہ مشاہدہ سے
محروم ہے اور جب مشاہدہ حاصل ہو جاتا ہے تو اثرِ سماع بیکار ہو جاتا ہے۔ خیال رکھنا! اس سماع کی
عادت نہ ڈال لینا، کہیں یہ طبیعتِ ثانیہ بن کر تجھے مشاہدہ سے محجوب نہ کر دے۔

واللہ اعلم بالصواب



مختلف ممالک کے مشائخ متاخرین

بطریق اختصار ان صوفیاء کرام کے حالات میں جو متاخرین میں سے ان شہروں میں جلوہ افروز ہیں۔ اگر میں اس وقت تمام متاخرین صوفیاء کے حالات مفصل اس کتاب میں بیان کروں تو طوالت کتاب یقینی ہے اور اگر بعض کے حالات چھوڑ دوں جو مقصود کتاب ہے وہ پورا نہیں ہوتا۔ لہذا اب ہم ان کے اسمائے گرامی لکھتے ہیں جو ہمارے زمانہ میں ہیں اور وہ حقیقتاً اہل معانی اور ارباب بالحق سے ہیں اور وہ رسمی صوفی نہیں ہیں تاکہ اگر خدا چاہے تو حصول عوام سے قرب حاصل ہو جائے۔ ان شاء اللہ۔

مشائخ اہل شام و عراق

- ۱۔ حضرت شیخ ذکی ابن العلاء رحمۃ اللہ علیہ: بزرگان مشائخ سے ہیں اور سادات زمانہ سے مانے جاتے ہیں۔ میں نے انہیں شعلہٴ محبت میں مثل شعلہ پایا۔ ان کی کرامات مشہور ہیں۔
- ۲۔ حضرت شیخ ابو جعفر محمد بن مصباح صیدلانی رحمۃ اللہ علیہ: رئیس الصوفیا ہیں۔ تحقیق تصوف میں نہایت سلیس بیان رکھتے ہیں۔ حضرت حسین بن منصور حلاجؒ کے ساتھ خاص تعلق رکھتے ہیں، آپ کی بعض تصانیف میں نے پڑھی ہیں۔
- ۳۔ حضرت ابو القاسم مسدسی رحمۃ اللہ علیہ: بڑے مجاہدہ والے بزرگ ہیں اور بلند حال۔ چرواہے ہیں۔ بزرگوں کے ساتھ بہت عقیدت مند ہیں۔

مشائخ اہل فارس

- ۱۔ شیخ الشیوخ حضرت ابوالحسن بن سابع رحمۃ اللہ علیہ: تصوف میں فصیح اللسان تھے اور مسائل توحید میں واضح البیان۔ مشہور و معروف عالم ہیں۔
- ۲۔ شیخ مرشد حضرت ابواسحاق بن شہریار رحمۃ اللہ علیہ: محققان قوم ہیں۔ سیاست و شرع کے بہترین عالم ہیں۔

۳- شیخ طریقت حضرت ابوالحسن بن بکران رحمۃ اللہ علیہ: بزرگانِ متصوفہ سے ہیں۔
 ۴- شیخ ابوالفتح رحمۃ اللہ علیہ: اپنی سلطنت کے بہترین خلف اور اُمید افزا حال کے مالک ہیں۔

۵- شیخ ابوطالب رحمۃ اللہ علیہ: مرو کے رہنے والے، عاشقِ کلمہ گو گزرے ہیں۔

۶- شیخ الشیوخ حضرت ابواسحاق رحمۃ اللہ علیہ: ان کی میں زیارت نہ کر سکا۔

مشائخ قہستان و آذربائیجان و طبرستان و فک

۱- شیخ شفیق فرخ المعروف بہ اخی زنجانی رحمۃ اللہ علیہ: نہایت نیک سیرت اور ستودہ طریقت ہیں۔

۲- شیخ اندرین رحمۃ اللہ علیہ: بزرگانِ قوم سے ہیں۔ آپ کی بہت سی نیکیاں قابلِ تحسین ہیں

۳- حضرت بادشاہ تائب رحمۃ اللہ علیہ: راہِ خدا میں مستقل گزرے ہیں۔

۴- شیخ ابو عبد اللہ جنید رحمۃ اللہ علیہ: پیرِ کامل اور بہترین رفیقِ طریقت ہیں۔

۵- شیخ ابوطاہر رحمۃ اللہ علیہ: کشف میں اجلہ کلماء سے گزرے ہیں۔

۶- حضرت خواجہ حسن سمنان رحمۃ اللہ علیہ: عاشقِ زارِ جمیلِ حقیقی اور امیدوارِ رحمتِ جلی ہیں۔

۷- شیخ سہلکی رحمۃ اللہ علیہ: صوفیوں میں بڑے مجاہدہ و ریاضت کرنے والے ہیں۔

۸- حضرت احمد پیر شیخ قرقانی رحمۃ اللہ علیہ: فرزندِ سعید ہیں۔

۹- حضرت ادیب گندی رحمۃ اللہ علیہ: ساداتِ زمانہ سے ہیں۔

مشائخ اہلِ کرمان

۱- خواجہ علی الحسین سیرکانی رحمۃ اللہ علیہ: سیاحِ وقت، صاحبِ طریقت، توحید میں کامیاب اور سفر ہائے عرفان میں کامل گزرے ہیں۔

۲- خواجہ علی الحسین کے صاحبزادہ: حکیم اور مقبولِ حق ہیں۔

۳- شیخ محمد بن سلمہ رحمۃ اللہ علیہ: بزرگانِ وقت سے ہیں۔

ان کے علاوہ کرمان میں بہت سے مشائخ، اولیاءِ کرام، جوان و معمر، عوام سے مکتوم و مخفی بھی ہیں۔

مشائخ خراسان

۱- شیخ مجتہد حضرت ابو العباس سرمعانی رحمۃ اللہ علیہ: آپ کی زندگی خوب ہے اور وقت

نہایت اچھا ہے۔

- ۲۔ خواجہ ابو جعفر محمد بن علی حواری رحمۃ اللہ علیہ: بزرگان قوم اور محققان صوفیاء میں ہیں۔
- ۳۔ خواجہ ابو جعفر تری شیزی رحمۃ اللہ علیہ: معززین قوم میں سے ہیں۔
- ۴۔ خواجہ محمود نیشاپوری رحمۃ اللہ علیہ: مقتدائے زمانہ اور زبان با اثر رکھتے ہیں۔
- ۵۔ حضرت شیخ محمد معشوق رحمۃ اللہ علیہ: نیک زندگی گزار رہے ہیں اور صاحب باطن ہیں۔
- ۶۔ خواجہ رشید بن شیخ ابوسعید رحمۃ اللہ علیہ: اُمیدوار لچہ رحمت، مقتداء قوم و قبلہ قلوب ہیں۔
- ۷۔ خواجہ احمد حاوی سرخسی رحمۃ اللہ علیہ: زبردست مبارک وقت اور ایک مدت تک میرے رفیق رہے ہیں، ان کے معاملات عجیب میں نے دیکھے۔
- ۸۔ شیخ احمد نجار رحمۃ اللہ علیہ سمرقندی: مقیم مرو، اپنے زمانہ کے سلطان گزرے ہیں۔
- ۹۔ شیخ ابوالحسن علی بن اسود رحمۃ اللہ علیہ: اپنے باپ کے بہترین خلف ہیں۔ آپ کی علوہمت و صدق فراست کی تفصیل کروں تو اہل خراسان کے حالات ہی میں کتاب بہت طویل ہو جائے گی۔ میں نے تین سو مردانِ خدا، خراسان میں ایسے پائے جو آفتاب و ماہتابِ طریقت ہیں۔

مشائخ ماوراء النہر

- ۱۔ خواجہ امام رحمۃ اللہ علیہ: مقبول خواص و عوام سے ہیں۔
- ۲۔ حضرت ابو جعفر بن محمد حسین حرمی رحمۃ اللہ علیہ: مردِ مستمع و گرفتارِ عشقِ حقیقی ہیں، آپ کی ہمت عالی اور لیل و نہار نہایت مصفیٰ ہیں۔
- ۳۔ خواجہ فقیہہ رحمۃ اللہ علیہ: اپنے ہم عصر لوگوں میں وجاہت رکھتے ہیں۔
- ۴۔ حضرت ابو محمد بالعزی یا بالغزی رحمۃ اللہ علیہ: نہایت قوی المعاملہ اور عارف کامل ہیں۔
- ۵۔ حضرت احمد ایلاقی رحمۃ اللہ علیہ: شیخ وقت مخدوم زمانہ تھے۔
- ۶۔ خواجہ عارف رحمۃ اللہ علیہ: فرید وقت اور بدیع العصر گزرے ہیں۔
- ۷۔ حضرت علی بن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ: پیشوا زمانہ اور مردِ محتشم تھے۔ زیارت کی اور ان کے مناصب دیکھے۔

مشائخ غزنی

- ۱۔ شیخ عارف رحمۃ اللہ علیہ: حضرت ابوالفضل بن اسدی پیر بزرگ گزرے ہیں، آپ کی

- کرامتیں بہت ہیں اور آتشِ عشق میں مثلِ شعلہ تھے۔
- ۲۔ شیخ اسماعیل شاشی رحمۃ اللہ علیہ: پیرِ مختشم تھے اور آپ کا طریقہ ملامتیہ تھا۔
- ۳۔ شیخ سالار طبری رحمۃ اللہ علیہ: علماءِ متصوفہ سے گزرے ہیں۔
- ۴۔ حضرت ابو عبد اللہ محمد بن اککیم المعروف بہ مرید رحمۃ اللہ علیہ: مستانِ حضرتِ حق سے گزرے ہیں، اپنے مرتبہ کمال میں لاثانی تھے اور لوگوں سے آپ کا حال مخفی تھا، آپ کے دلائل واضح اور آپ کا حال بہترین تھا۔
- ۵۔ شیخ محترم حضرت سعید بن ابی سعید رضی اللہ عنہ: حافظِ حدیث تھے، کافی عمر پائی تھی۔ بہت سے مشائخ کی زیارت فرمائی، قوی الحال تھے مگر لوگوں سے اپنا حال مخفی رکھا۔
- ۶۔ خواجہ بزرگوار حضرت ابو العلاء عبد الرحیم بن محمد سعدی رحمۃ اللہ علیہ: معزز قوم تھے۔ مجھے ان سے بہت محبت ہے، نہایت قوی الحال اور عالمِ علوم تھے۔
- ۷۔ شیخ اوحد قودہ بن محمد جرویزی رحمۃ اللہ علیہ: اہلِ طریقت کے ساتھ محبت رکھنے والے اور صوفیاء میں آپ کی عزت بے حد تھی، اُمید ہے کہ جتنی عقیدت لوگوں کو ان سے ہے، ان کے بعد بھی کوئی ایسا پیدا ہو جس سے ایسی ہی عقیدت ہو۔ آپ نے بہت سے مشائخ کی زیارت کی۔
- اس وقت اگرچہ یہاں کے مکاروں نے شہر میں گندگی پھیلا دی ہے، اُمید ہے کہ ان سے جلدی شہر پاک ہو جائے گا اور پھر اولیائے کرام کا قدم گاہ بن جائے گا۔
- اب ہم صوفیائے کرام کے فرقوں کا فرق بیان کرتے ہیں۔ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ



صوفیاء کے مختلف مکاتب و مذاہب

قبل اس کے میں نے حضرت ابوالحسن رحمۃ اللہ علیہ کے ذکر میں بتایا تھا کہ صوفیا کرام میں بارہ فرقے ہیں۔ ان میں سے دو فرقے مردود ہیں اور دس مقبول۔ یہ دس فرقے عمال و طریقت میں نیک ہیں اور مجاہدہ و ریاضت میں ان کے آداب لطیف ہیں، مشاہدہ میں قوی الحال ہیں، اگرچہ ان کے مجاہدہ و ریاضت کے طریقوں میں اختلاف ہے۔ مگر اصول و فروع شرع میں اور عقیدہ توحید میں سب متفق ہیں۔

حضرت ابو یزید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: اِخْتِلَافُ الْعُلَمَاءِ رَحْمَةٌ اِلَّا فِي تَجْرِيْدِ التَّوْحِيْدِ۔ ”علماء کا اختلاف رحمت ہے مگر تجرید و توحید میں سب کا اتفاق ہونا ضروری ہے۔“ اور اس مضمون کے موافق ایک حدیث مشہور ہے۔

تو یہی اختلاف عمل فی المجاہدہ والریاضت تصوف میں ہے اور روایات مشائخ میں تو درحقیقت سب متفق ہیں اور از روئے مجاز مختلف۔

اب میں یہاں بر سبیل اختصار مشائخ کے اقوال کے ساتھ ان اختلافات کو تقسیم کروں گا اور ہر ایک کی وضاحت کے لیے ایک بساط بچھاؤں گا تاکہ آسانی سے سمجھ سکیں اور علماء کی اس سے اصلاح ہو اور مریدوں کے لیے اس سے فائدہ اور محبوبوں کو کامیابی اور اہل عقل کو اس کا اندازہ اور تشبیہ ہو اور میرے لیے اس خدمت کا ثواب دونوں جہان میں ہے۔ وبالله التوفیق۔

فرقہ محاسبیہ

فرقہ محاسبیہ کا تعلق ابو عبد اللہ بن اسد محاسبی رحمۃ اللہ علیہ سے ہے۔ آپ بہ اتفاق صوفیاء کرام مقبول زمانہ اور مقنول نفس تھے اور علوم اصول و فروع و حقائق تصوف میں بڑے ماہر، تجرید توحید کی حقیقت جاننے والے اور معاملات ظاہری و باطنی میں نہایت ثابت قدم۔

آپ کا عقیدہ تھا کہ راضی برضا رہنا، یہ کوئی مقام تصوف نہیں ہے بلکہ یہ صوفی کا ایک حال ہے۔ مقام رضا کو مقام نہ ماننے کا دعویٰ سب سے پہلے آپ نے فرمایا۔ پھر اہل خراسان نے اسے قبول کیا۔ پھر اہل عراق نے اس کا رد کیا اور کہا کہ رضا یقیناً ایک مقام ہے جو مقام توکل کا

منتہی ہے اور آج تک یہ اختلاف عراقی اور خراسانیوں میں چلا آ رہا ہے۔ اب ان شاء اللہ اس قول کی شرح ہم کرتے ہیں۔

حقیقتِ رضا

اول ہم رضا کی حقیقت بیان کریں اور اس کی اقسام بتائیں (تا کہ متنازع فیہ کو سمجھ لینے سے مسئلہ واضح ہو جائے) اس کے بعد حال اور مقام کی وضاحت کی جائے گی۔ اول کتاب و سنت میں تحقیق رضا کے متعلق تصریح موجود ہے، وہ یہ ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ﴾ (۱) ”اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہے اور وہ اس سے راضی ہیں۔“ اور فرمایا: ﴿لَقَدْ رَضِيَ اللَّهُ عَنِ الْمُؤْمِنِينَ إِذْ يُبَايِعُونَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ﴾ (۲) ”بے شک اللہ راضی ہوا مؤمنین سے، جب کہ انہوں نے تجھ سے بیعت کی شجر کے نیچے۔“

حضور سید یوم النور ﷺ نے فرمایا:

ذَاق طَعْمَ الْإِيمَانِ مَنْ رَضِيَ بِاللَّهِ رَبًّا (۳)

”اس نے ذائقہ ایمان کا لطف حاصل کر لیا جو راضی ہوا اللہ کی ربوبیت پر۔“

اور رضا کی دو قسمیں ہیں: ایک رضائے حق جل و علا بندہ کے ساتھ اور ایک رضائے بندہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ۔ تو رضائے حق تعالیٰ جو بندہ سے ہے اس کی حقیقت یہ ہے کہ بندہ سے حق تعالیٰ راضی ہو کر اُسے ثواب اور نعمت جنت اور کرامت عرفان عطا فرمائے۔ اور رضائے بندہ بحق تعالیٰ کی حقیقت یہ ہے کہ اس کے فرمان پر قائم ہو کر گردن اطاعت جھکائے رکھے تو رضائے حق مقدم رضائے بندہ ہے۔ حتیٰ کہ جب تک برضائے حق بندہ کو توفیق اطاعت و امتثال امر نہ ملے، بندہ کبھی اُس کے حکم کے آگے سر جھکا نہیں سکتا اور اس کی مرضی پر قائم نہیں رہ سکتا۔

اس لیے کہ رضائے بندہ مقرون برضائے حق ہے اور رضائے بندہ کا قیام رضائے حق کے ساتھ نسبت حاصل ہونے پر ہے اور بندہ کی رضائے اس وقت تک صحیح نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس کا دل مستوی و مستقیم نہ ہو جائے قضا الہی کے دونوں پہلوؤں پر۔ اس لیے کہ قضا الہی کا ایک پہلو منع نعمت و فرحت ہے۔ دوسرا پہلو عطا و بخشش ہے۔

رضا کے محور پر بندہ کا قیام تب صحیح ہوتا ہے جب کہ وہ عطا و منع دونوں کا نظارہ چشم دل سے اس طرح کرے جس طرح احوال عالم کا نظارہ کیا جاتا ہے (یعنی عطا پر خرمی و شادی اور منع کرنے پر

۲۔ سورۃ الفتح: ۱۸

۱۔ سورۃ التوبہ: ۱۰۰

۳۔ حوالہ کے لیے: مسند احمد بن حنبل ۲۰۸/۱

رنج و تعب اس کے دل پر اثر پذیر نہ ہو۔ گویا شانِ جلالی یا شانِ جمالی جو بھی اُس کے مشاہدہ میں آئے اس پر اُس کی رضا کا مشاہدہ ہو۔

یعنی جب کہ اُسے منع نعمت یا عطاءئے نعمت کا علم ہو تو احساسِ شادی و غم سے مقدم وہ سابق برضا ہو اور ایسا راضی ہو کہ دونوں کیفیتیں اُس کے مساوی ہوں۔ خواہ آتشِ ہیبت و جلالِ حق میں جلایا جائے یا نورِ لطفِ جمال میں منور کیا جائے۔ راضی برضا کے لیے جلنا اور مستعیر ہونا دونوں زبانِ ودل سے یکساں ہوں۔ اس لیے کہ راضی برضا شاہدِ حق ہوتا ہے اور منجانبِ حق جو ہوتا ہے، سب اچھا ہی ہوتا ہے۔

حضرت امیر المؤمنین شہزادہ گلگلوں، قبا، شہیدِ دشتِ کربلا امام حسین بن علی سید الشہداء رضی اللہ عنہ و کرم اللہ وجہہ سے حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ کے اس قول کے متعلق سوال کیا گیا جو انہوں نے کہا تھا:

الْفَقْرُ أَحَبُّ إِلَيَّ مِنَ الْغِنَاءِ وَالسَّقْمُ أَحَبُّ إِلَيَّ مِنَ الصِّحَّةِ.

”مجھے درویشی تو انگری سے زیادہ پیاری ہے اور بیماری تندرستی سے زیادہ محبوب ہے۔“

تو حضرت شہزادہ صاحب نے فرمایا: رَحِمَ اللَّهُ أَبَا ذَرٍّ أَمَا أَنَا فَأَقُولُ مَنْ أَشْرَفَ عَلَيَّ حُسْنِ إِخْتِيَارِ اللَّهِ لَمْ يَتَمَنَّ غَيْرَ مَا اخْتَارَ اللَّهُ لَهُ. ”اللہ رحم فرمائے ابو ذر پر اور اُن پر رحمتیں ہوں، لیکن میں یہ کہتا ہوں کہ جو کچھ اللہ جل شانہ کے حسنِ اختیار سے پہنچے، اس کے سوا میں ہرگز تمنا نہ کروں، سوا اس کے جو اللہ تعالیٰ نے میرے لیے اختیار فرمایا۔“

اس لیے کہ جب بندہ اختیارِ الہی کو دیکھ چکا اور اپنے اختیارات سے اعراض کر چکا تو تمام اندوہ و ملال سے آزاد ہو گیا، اور یہ عقیدہ مقامِ غیبت میں کبھی صحیح نہیں ہوتا۔ اس یقین و اطمینان کے لیے حضور و شہود چاہیے۔ لَأَنَّ الرِّضَاءَ لِلْأَحْزَانِ نَافِيَةٌ وَ لِلْغَفْلَةِ مُعَالِجَةٌ شَافِيَةٌ. ”اس لیے کہ رضا مرادِ خدا کو اندوہ و غم سے آزاد کر دیتی ہے اور غفلت سے چھڑا دیتی ہے اور اندیشہ غیر کو دل سے زائل کر دیتی ہے اور قید و بند مشقت سے آزاد کر دیتی ہے۔“ اس لیے کہ رضا کی صفت ”رہانیدن“ ہے یعنی بری و آزاد کر دینا۔ لیکن معاملہ رضا کی حقیقت یہ ہے کہ بندہ علمِ الہی کے ساتھ منع و عطا کو سمجھ کر اسی کے علم پر قانع اور شاکر ہو جائے اور اس کا عقیدہ اس حال میں یہ ہو کہ تمام حالات کا دانا و بیانا وہی ربِ جل مجدہ ہے۔

اس مسئلہ میں صوفیا کرام کی چار اقسام ہیں:

☆ ایک گروہ وہ ہے جو راضی بحق ہے عطاءً محبوب پر اور یہ درجہ معرفت ہے۔

☆ ایک گروہ وہ ہے جو راضی ہے نعماءِ الہی پر اور یہ درجہ دنیا ہے۔

☆ ایک گروہ وہ ہے جو راضی ہے بلا پر اور یہ درجہ محنت و مجاہدہ ہے۔

☆ ایک گروہ تو وہ ہے جو راضی ہے اصطفاء پر اور یہ درجہ محبت ہے۔

وہ گروہ جو معطلی سے عطا کو دیکھ کر بجان و دل قبول کر رہا ہے، اس کے دل سے کلفت و مشقت قطعی زائل ہو جاتی ہے۔ اور وہ گروہ جو عطا کو بمعنی عطا دیکھ رہا ہے اور عطا کنندہ پر نظر رکھتا ہے وہ عطا پر رہ جاتا ہے اور بتکلف راہِ رضا کو عبور کرتا ہے۔

اس رضا میں سب رنج و تعب مستولی ہوتے ہیں اور معرفت اس وقت حقیقت بنتی ہے جب بندہ معرفتِ الہی میں مکاشف ہوتا رہے، اور جب معرفت اس کے لیے جس و حجاب ہو تو وہ معرفت ناشناسائی ہوتی ہے، اور نعمت، نعمت ہو جاتی ہے اور عطاء، عطا بن جاتی ہے۔ اور جو خدا تعالیٰ سے دنیا پر راضی ہوتا ہے، وہ ہلاکت و زیاں کاری میں ہے اور بندہ کی یہ رضا سبب بے نصیبی ہے بلکہ یہ رضا جہنم ہے، اس لیے کہ دنیا راز ہائے حق کے مقابلے میں کوئی قیمت نہیں رکھتی پھر اپنے دل کی دوستی کو اس میں ضائع کرے اور قسم قسم کے اندوہ اس کے ضمیر پر گزر کریں۔

نعمت اس وقت نعمت ہوتی ہے جس وقت راہِ منعم کی راہنمائی کرے اور یہ نعمت، منعم سے حجاب بنے تو وہ نعمت بلاءِ محض ہے، اور وہ اس ربِّ مجید کی بلا پر راضی ہے، وہ وہ گروہ ہے کہ ہر بلا میں مُہلبی کو دیکھتا ہے تو ہر قسم کی مشقت و تکلیف مشاہدہٴ جمالِ یار کی مسرت میں وہ برداشت کر لیتا ہے، بلکہ وہ رنج اس مسرت سے جو مشاہدہٴ جمالِ دوست سے حاصل ہوتی ہے رنج نہیں رہتا۔

اور وہ گروہ جو اصطفاء حق سے راضی ہے وہ مجانِ حق ہیں۔ یہ حالتِ رضا میں اور سخط و غضب میں بھی راضی رہتے ہیں۔ اس لیے کہ ان کی ہستی عاریت ہوتی ہے۔ یہ اپنی منازلِ دل کو سوائے حضرت جلت و مجد عز اسمہ کے کہیں نہیں دیکھتے اور اپنی سراپردہٴ اسرار کو سوائے روضہٴ الفتِ محبوب کہیں نہیں پاتے۔ یہ حاضر ہوتے ہیں اور بظاہر غائب۔ یہ عرشِ ہوتے ہیں اور بظاہر فرشی۔ روحانی ہوتے ہیں اور بظاہر جسمانی۔ لوگوں میں ہوتے ہیں مگر درحقیقت ربّانی تجلیات میں رہتے ہیں۔ مقامات و حالات میں ہوتے ہیں مگر ان کا دل منقطع ہوتا ہے۔ مخلوقات سے قطع تعلق کیے ہوئے دوستی کے لیے کمر بستہ اور سر بکف حاضر۔

﴿وَلَا يَمْلِكُونَ لِنَفْسِهِمْ ضَرًّا وَلَا نَفْعًا وَلَا يَمْلِكُونَ مَوْتًا وَلَا حَيَوَةً وَلَا

نُشُورًا﴾ (۱)

”وہ اپنے نفسوں کے لیے ضرر اور نفع کے مالک نہیں ہوتے اور نہ موت و حیات اور نثر کے۔“
تو خدا کے سوا غیر پر راضی ہونا خالص زیاں کاری ہے اور اس کی ذات کے ساتھ رضا میں خالص
رضوان حق ہے، اس لیے کہ راضی ہونا مملکت و دنیا اور ہدایت و عافیت ہے۔

رسول اکرم ﷺ نے فرمایا:

مَنْ لَمْ يَرْضَ بِاللَّهِ وَبِقَضَائِهِ شَغَلَ قَلْبُهُ وَتَعَبَ بَدَنُهُ.

”جو خدا اور خدا کی قضا پر راضی نہیں، اس کا دل مشغول بہ اسباب و نصیب ہے
اور اس کا بدن اس کی طلب میں غمگین۔“

فصل:

احادیث میں وارد ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا:

اللَّهُمَّ ذَلَّنِي عَلَى عَمَلٍ إِذَا عَمِلْتُ رَضِيَتْ عَنِّي فَقَالَ اللَّهُ تَعَالَى
إِنَّكَ لَا تُطِيقُ ذَلِكَ يَا مُوسَى فَخَرَّ مُوسَى عَلَيْهِ السَّلَامُ سَاجِدًا
مُتَضَرِّعًا فَأَوْحَى اللَّهُ إِلَيْهِ يَا ابْنَ عِمْرَانَ إِنَّ رَضَائِي لِي فِي رِضَاءِكَ
لِقَضَائِي.

”الہی! مجھے وہ عمل کرنے کی راہنمائی فرما جسے جب میں کروں، تو مجھ سے
راضی ہو جا، جناب باری تعالیٰ کی طرف سے ارشاد ہوا: اے موسیٰ! تم اس کی
طاقت نہیں رکھتے، تو موسیٰ علیہ السلام سجدے میں گر پڑے اور تضرع و زاری
شروع کی۔ پھر جناب باری عزوجل نے آپ کو وحی فرمائی کہ اے ابن عمران!
میری رضا و خوشنودی اسی میں ہے کہ تو میری قضا پر راضی رہے۔“

یعنی جب بندہ قضا و قدر الہی کے ساتھ راضی ہو جاتا ہے تو یہ اس امر کی علامت ہے کہ
اللہ تعالیٰ اس سے راضی ہے۔

حضرت بشر حافی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت فضیل بن عیاض رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا کہ زہد
اعلیٰ درجہ ہے یا رضا۔ حضرت فضیل نے فرمایا: الرِّضَاءُ أَفْضَلُ مِنَ الزُّهْدِ لِأَنَّ الرَّاغِبِينَ لَا يَتَمَنَّى
فَوْقَ مَنْزِلَتِهِ. ”رضا کا درجہ زہد سے بلند ہے، اس لیے کہ راضی برضا کی کوئی تمنا نہیں ہوتی اور زہد
میں تمنا ہوتی ہے۔“

یعنی منزل زہد پر ایک اور منزل ہے جس کی تمنا زہد کرتا ہے اور رضا پر کوئی منزل نہیں جس
کی تمنا راضی برضا کرے۔ تو پیش گاہ اس سے افضل ہے جو ابھی پایگاہ ہے (یعنی حاضر دربار اس

سے افضل ہے جو ابھی حاضر ہونے کی سعی میں ہے۔)

یہ حکایت اس امر کی دلیل ہے کہ حضرت محاسبی رحمۃ اللہ علیہ کا قول صحیح ہے کہ ”رضا از حجلۃ احوال است۔“ یعنی رضا منزل نہیں ہے بلکہ ایک حال ہے اور یہ حال وہی ہے جو مواہب الہیہ سے عطا ہوتا ہے نہ کہ کسی، کہ مکاسب کے ذریعہ منازل پر پہنچا اور یہ بھی واضح ہو گیا کہ راضی برضا کی کوئی تمنا نہیں ہوتی۔

حضور ﷺ کے متعلق روایت ہے کہ حضور ﷺ اپنی دعاؤں میں فرمایا کرتے تھے: **أَسْأَلُكَ الرِّضَاءَ بَعْدَ الْقَضَاءِ (۱)** ”الہی میں تجھ سے سوال کرتا ہوں کہ مجھے راضی رکھ اُس حال پر جو تیری قضا کے ذریعے مجھ پر آئے۔“ یعنی مجھے ایسی صفت سے متصف کر کہ جب تیری طرف سے وہ قضا وارد ہو جو میرے لیے مقدر تھی، تو تو مجھے راضی پائے۔

اس حدیث سے یہ امر بھی ثابت ہو گیا کہ رضا قبل ورودِ قضا صحیح نہیں ہے اس لیے کہ قبل ورودِ قضا جو رضا ہے وہ محض عزم ہے اور عزمِ رضا، عین رضا نہیں ہے۔

حضرت ابوالعباس بن عطار رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

الرِّضَاءُ نَظَرُ الْقَلْبِ إِلَى قَدِيمِ اخْتِيَارِ اللَّهِ لِلْعَبْدِ.

”بندہ کے لیے رضایہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اختیارِ قدیم کے ساتھ اپنے دل

کی نگہداشت کرے۔“

یعنی جو کچھ اُسے پہنچے اس میں یقین رکھے کہ مختارِ کائنات ربِ مجید کے اختیارِ قدیم اور مقدرِ حکم کے ساتھ پہنچا ہے۔ اس سے نہ مضطرب ہو نہ خرم و شاد۔

حضرت حارث محاسبی رضی اللہ عنہ صاحبِ مذہب فرماتے ہیں:

الرِّضَاءُ سُكُونُ الْقَلْبِ تَحْتَ مَجَارِي الْأَحْكَامِ.

”رضا سکونِ قلب کا نام ہے جو احکام کے راستوں کی طرف سے دل میں ہو۔“

اس تعریف کے تحت بھی حارث محاسبی ”کا مذہب قوی ہے۔ اس لیے کہ سکون و طمانینتِ قلب بندہ کے کسب سے نہیں بلکہ مواہب الہیہ کے ساتھ ہے۔ جب تک وہ سکون منجانب اللہ عطا نہ ہو، ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اور حضرت محاسبی رحمۃ اللہ علیہ دلیل کرتے ہیں کہ رضا حالِ بندہ کا نام ہے نہ مقام کا۔

۱۔ اسے امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی ”مسند“ میں ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے:

حضرت عتبہ الغلام ایک رات نہ سوئے اور صبح تک عرض کرتے رہے:

إِنْ تُعَذِّبْنِي فَأَنَا لَكَ عَبْدٌ مُحِبٌّ وَإِنْ تَرْحَمْنِي فَأَنَا لَكَ مُحِبٌّ.

”اگر تو مجھے عذاب دے تو بھی میں تیرا بندہ و محبت فرمان بردار ہوں اور اگر رحم

فرمائے تو مطیع فرمان و محبت ہوں۔“

اگر بخشے زہے قسمت، نہ بخشے تو شکایت کیا

سر تسلیم خم ہے، جو رضائے یار میں آئے

یعنی الم، عذاب و لذت نعمت تن پر ہے اور قلق دوستی دل میں۔ تو یہ الم و لذت اُسے

نقصان نہیں دے سکتا۔ یہ بھی حضرت محاسبیؒ کے دعویٰ کی تائید ہے۔ اس لیے کہ رضاء نتیجہ محبت ہے

کہ محبت اس کام سے ہر حال میں راضی ہے جو محبوب کرے۔ اگر عذاب میں رکھے تو محبوب محبت نہ

ہو بلکہ خرم رہے اور اگر نعمت میں رکھے تو بھی دوستی سے محبوب نہ ہو اور اپنے اختیارات کو اختیارات

حق کے مقابلہ میں علیحدہ کرے۔

حضرت ابو عثمان خیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

مُنْذُ أَرْبَعِينَ سَنَةً مَا أَقَامَنِي اللَّهُ عَلَى حَالٍ فَكِرِهَتْهُ وَمَا نَقَلَنِي إِلَيْهِ

غَيْرَ فَسَخَطْتُهُ.

”چالیس سال سے اللہ تعالیٰ نے مجھے اس حال میں رکھا، میں نے اسے مکروہ

نہ سمجھا اور جب اس حال سے کسی حال کی طرف مجھے منتقل کیا تو میں اس

حالت میں غصہ نہ ہوا۔“

اس مضمون میں دوامِ رضا و کمالِ محبت کی طرف اشارہ ہے۔

ایک حکایت میں ہے کہ ایک درویش دریائے دجلہ میں پھنس گئے اور تیراکی نہیں جانتے

تھے۔ ایک نے کنارے سے کہا اگر آپ چاہیں تو میں کسی کو بلاؤں تاکہ وہ تمہیں دریا سے نکالے،

آپ نے کچھ جواب نہ دیا تو اس شخص نے کہا: تو پھر آپ کیا چاہتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: جو میرا

رب چاہے وہ ہوگا مجھے چاہنے سے کیا کام۔

غرضیکہ مسئلہ رضا میں مشائخ کرام کے بہت سے کلام ہیں جو اختلاف عبارت کے ساتھ

اس مفہوم کے مونسید ہیں اور سب کے فرامین کے یہی دو مفہوم ہیں جو ہم نے بیان کیے مگر ترک تطویل

کر کے اس مختصر میں بیان کیا گیا۔ اب ہمیں ضروری ہے کہ حال و مقام کے فرق کی تشریح کریں

تاکہ اس کی حدود اور اس کے معنی کا ادراک آسانی سے ہو سکے اور اچھی طرح سمجھ میں آجائے۔

مقام و حال

اچھی طرح یاد رکھو! یہ دو لفظ صوفیاء کے طبقہ میں مستعمل و جاری ہیں اور ان کی عبارتوں میں بولے جاتے ہیں اور محققین صوفیاء ان دو لفظوں کے ساتھ ایک طویل عبارت کا مفہوم حاصل کرتے ہیں۔ لہذا فنِ تصوف کے حاصل کرنیوالوں کو ان کے سمجھے بغیر چارہ نہیں۔ اگرچہ یہ باب اس بحث کے بیان کا نہیں لیکن اس جگہ ان دو لفظوں کو سمجھے بغیر چارہ نہیں۔ سب توفیق، ہمت اور پاکیزگی اللہ کی طرف سے ہے۔

یاد رکھو! (مقام) عام طور پر برقعِ میم ”بندہ کی اقامت“ کو کہتے ہیں اور (مقام) بہ نصبِ میم، ظرف یعنی ”اقامت کی جگہ“ کے معنی میں مستعمل ہے۔ لیکن یہ تفصیل لفظ کے معنی میں جو کی گئی، وہ سہو ہے بلکہ غلط۔ درحقیقت (مقام) میم کے پیش سے اقامت اور جائے اقامت کے معنی میں مستعمل ہے اور (مقام) میم کے زبر سے قیام اور قیام کی جگہ کے معنی دیتا ہے۔ اور بندہ کی اقامت کی جگہ خدا کی راہ میں ہوتی ہے اور اس مقام میں حق الہی کی رعایت رکھنے اور اس کے ادا کرنے کا خیال کرنا لازمی ہے تاکہ جس قدر ہو سکے وہ اس کی کمال ذات کا ادراک کرے اور جب تک خدا ہی وہاں سے نہ گزارے اسے روا نہیں کہ اپنے مقام سے گزرے۔

پھر مقاموں کی ابتدا توبہ سے ہوتی ہے۔ اس کے بعد انابت یعنی حق کی طرف لوٹنا، پھر زہد، اس کے بعد توکل اور مثل اس کے اور درجات بعد میں ملتے ہیں لیکن بندہ کو ہرگز روا نہیں کہ بلا توبہ دعویٰ انابت کرے، اور بلا انابت دعویٰ زہد کرے اور بے زہد دعویٰ توکل کرے اور اللہ تعالیٰ نے ہمیں زبانِ جبرائیل علیہ السلام سے خبر دی جیسا کہ جبرائیل علیہ السلام نے حضور ﷺ کے سامنے عرض کی:

”وَمَا مِنَّا إِلَّا لَهُ مَقَامٌ مَّعْلُومٌ.“

”ہم میں کوئی ایسا نہیں جس کے لیے ایک مقام معلوم نہ ہو۔“

بہر حال اس کے معنی ہیں کہ کیفیت کا حق کی طرف سے دل میں پیدا ہونا۔ اُسے بندہ اپنے کسب کے ذریعہ دفع نہیں کر سکتا اور جب وہ کیفیت جاتی ہے تو بندہ اُسے اپنے کسب و تکلیف سے حاصل نہیں کر سکتا۔ تو مقام وہ راستہ ہے جس میں طالب کوشش کرے اور اپنی سعی و جہد کے ساتھ قدم رکھے اور اس کے لیے حضرت حق جل مجدہ نے طالب کے لیے کسب کرنے اور مجاہدہ سے تقرب حاصل کرنے کی ایک مقدار کا درجہ رکھا ہے اور حال، بلا تعلق مجاہدہ بندہ کے دل میں فصلِ الہی اور لطفِ محض کے ساتھ ایک کیفیت کا پیدا ہونا ہے۔

تو خلاصہ یہ ہوا کہ مقام، اعمال کے ذریعے حاصل ہوتا ہے اور حال تمام کا تمام افضال حق سے دلی طلب میں آتا ہے۔ تو مقام مکاسب عبد سے ہوا اور حال مواہب حق سے۔ تو صاحب مقام اپنے مجاہدہ و ریاضت کے ساتھ قائم ہوگا جو حق تعالیٰ شانہ اس کے دل میں پیدا فرمائے۔ مشائخ کرام رحمہم اللہ اس جگہ مختلف ہیں۔ ایک جماعت تو وہ ہے جو حال کو دواماً روا رکھتی ہے۔ ایک جماعت وہ ہے جو حال کو دواماً ناروا مانتی ہے۔

فرقہ محاسبیہ

حضرت محاسبی رحمۃ اللہ علیہ اسی گروہ کے امام ہیں جو حال کو دواماً روا رکھتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں: محبت و شوق، قبض و وسط، یہ تمام احوال ہیں اگر ان کا دوام روانہ ہو تو نہ محبت، محبت ہوگا، نہ مشتاق، مشتاق۔ تو جب تک حال بندہ کی صفت نہ ہو جائے تو اسم محبت اور مشتاق اس پر صحیح نہ ہوگا۔ اس لیے آپ نے رضا کو حال فرمایا اور حضرت ابو عثمان رحمۃ اللہ علیہ نے جو فرمایا ہے: مُنْذُ اَرْبَعِيْنَ سَنَةٍ مَا اَقَامَنِي اللّٰهُ عَلٰى حَالٍ فَكِرِهْتُهُ يَه اسی طرف مشدّد و موید ہے۔

اور دوسرا گروہ جو حال کی بقاء دوام روا نہیں مانتا۔ جیسا کہ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: اَلْاَحْوَالُ كَالْبُرُوقِ فَاِنْ بَقِيَتْ فَحَدِيْثُ النَّفْسِ.

”احوال مثل بجلیوں کے ہے جو نظر آتا ہے اور ٹھہرتا نہیں اور جو باقی رہتا ہے،

وہ حال نہیں ہے بلکہ وہ حدیثِ نفس ہے جو محض ہوسِ طبع ہے۔“☆

اور ایک گروہ کہتا ہے: حال باس معنی ہے: ”اَلْاَحْوَالُ كَالسَّمِيْمَا يَعْنِي اَنَّهَا كَمَا تَحِلُّ بِاَلْقَلْبِ تَزُوْلُ.“ حال مثل ایک نام کے ہے یعنی حال حلول کر کے ایک وقت دل میں ملتا ہے اور دوسرے وقت وہ حال زائل ہو جاتا ہے۔“ اور جو باقی رہتا ہے وہ صفت ہو جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ قیام صفت موصوف پر ہے اور یہ امر بھی لازم ہے کہ موصوف کامل تر از صفت ہو اور یہ سب محال ہے، محال ہے۔

یہ تمام فرق ہم اس لیے بیان کر رہے ہیں تاکہ صوفیاء کی عبارات اس کتاب میں جہاں نقل ہوں وہاں حال و مقام کا لفظ جب نظر آئے تو بہ آسانی سمجھ میں آسکے کہ یہاں حال و مقام سے کیا مراد ہے۔ فی الجملہ اب واضح طور پر سمجھ لینا چاہیے کہ رضا نہایت مقامات کا نام ہے اور حال ابتداء مقام کو کہتے ہیں۔ اور یہ وہ محل ہے کہ اس کی ایک طرف کسب و سعی میں ہے اور ایک طرف محبت حق اور جوش میں ہے۔ اس کے اوپر پھر کوئی مقام نہیں اور انقطاع مجاہدہ اسی جگہ ہو جاتا ہے، تو

ابتداء کسب سے ہے اور انتہا بخششوں سے ہے۔ اب ایک احتمال پیدا ہوتا ہے کہ جس نے ابتداء میں اپنی رضا کو اپنے سے دیکھا، اس نے کہا مقام ہے اور جس نے انتہاء رضا کو اپنے رب سے دیکھا تو کہا حال ہے۔ یہی مذہب محاسبی کا حکم اصول تصوف میں ہے۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

مگر اعمال میں سے کسی نے اختلاف نہیں کیا سوا اس کے کہ مریدوں کو اُن عبارات و معاملات سے منع کیا گیا جن میں ابہام، خطا و شبہ ہو۔ ہر چند کہ وہ دراصل درست ہی کیوں نہ ہوں۔

چنانچہ ایک روز حضرت ابو حمزہ بغدادی رحمۃ اللہ علیہ جو مرید محاسبی رحمۃ اللہ علیہ ہیں حضرت محاسبی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے، یہ مستمعین میں سے تھے (مستمع اصطلاح

صوفیاء میں صاحب وجد و حال کو کہتے ہیں)۔ حضرت حارث محاسبی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک سمرغ پالا تھا جو اکثر بانگ کہا کرتا تھا۔ اتفاقاً حضرت ابو حمزہ کی حاضری کے موقع پر اس نے بانگ دی۔

حضرت ابو حمزہ نے ایک نعرہ مارا۔ حضرت حارث چھری لے کر اُٹھے اور حضرت ابو حمزہ سے فرمایا۔

كَفَرْتُ "تو نے کفر کیا"۔ اور حضرت حمزہ کے ذبح کرنے کا عزم فرمایا۔ حاضرین جلسہ میں جو

خدام خاص تھے وہ حائل ہوئے اور آپ کے قدموں میں گر گئے اور عذر و معذرت کر کے حضرت حارث محاسبی کو ان سے علیحدہ کیا۔ مختصر یہ کہ حضرت حارث نے ابو حمزہ کو فرمایا: اَسْلِمُ يَا مَرْدُودُ

"اے مردود اسلام قبول کر۔" لوگوں نے عرض کی حضور! ہم تمام لوگ انہیں خواص اولیاء سے جانتے ہیں اور خاص موحّد سمجھتے ہیں، حضور نے انہیں مردود فرمادیا تو ایسی کیا بات ان سے ظاہر ہوئی؟ آپ

نے فرمایا کہ مجھے اس پر کوئی شبہ نہیں اور میں اس کے ظاہر و باطن کو مستغرق توحید جانتا ہوں لیکن اس نے ایک ایسی حرکت کی ہے جو حلولیوں کے افعال کے مشابہہ تھی، یعنی مرغ حیوان ہے اور اس کی

عادت میں بانگ دینا ہے، اپنی مرضی و خواہش سے بانگ دیتا ہے، انہوں نے اس کی آواز پر کیوں نعرہ مارا، کیا انہوں نے اللہ تعالیٰ کو متجزی سمجھا، حالانکہ اس کی تجزی محال ہے اور جو موحّد حق ہے اُسے

سوائے محبوب کی آواز کے اور اس کی اطاعت کے سکون و آرام نہیں ملتا، اس نے اُس جلوہ کا حلول اس مرغ میں سمجھ کر نعرہ مارا با آنکہ اس کی ذات کو حلول و نزول نہیں، وہ اپنی صفات میں قدیم ہے۔

حضرت ابو حمزہ نے شیخ کی طرف دیکھا اور عرض کی: حضور ہر چند کہ میں دراصل صحیح تھا لیکن چونکہ میرا فعل مشابہہ کسی قوم کے ہو گیا میں توبہ کرتا ہوں اور آئندہ کے لیے عہد کرتا ہوں۔

حضرت حارث محاسبی رحمۃ اللہ علیہ کا بہت ستودہ ہے اور اس میں سلامتی ہے اور کمال صحو پر

دال ہے۔

حضور سید یوم النشور ﷺ نے فرمایا:

مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَلَا يَقْفَنُ مَوَاقِفَ
التُّهْمِ. (۱)

”جو اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھے اور قیامِ قیامت کو مانے اُسے تہمت کے مقام پر
ٹھہرنا نہیں چاہئے۔“

اور میں (یعنی حضرت علی بن عثمان جلابی رحمۃ اللہ علیہ) چاہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مجھے ایسا
ہی معاملہ عطا فرمائے جو آج کل کے رسمی مکار پیروں کے مشابہ نہ ہو۔ حالانکہ یہ اتنے سخت ہیں کہ
اگر اُن کی معصیت شعاری کی موافقت نہ کی جائے تو یہ سخت مخالف ہو جاتے ہیں اور دشمن ہو جاتے
ہیں۔ فَتَعُوذُ بِاللَّهِ مِنَ الْجَهْلِ وَاللَّهِ التَّوْفِيقُ .

فرقہ قصاریہ

صوفیاء کے فرقوں میں ایک فرقہ قصاریہ ہے۔ اس کا تعلق حضرت ابوصالح بن حمدون بن
عمارة القصار رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہے۔ آپ بڑے پایہ کے بزرگ علماء اور ساداتِ طریقہ مانے
گئے ہیں۔

آپ کا طریقہ اظہار و نشر، ملامت تھا۔ فنونِ معاملات میں آپ کا کلام بہت بلند ہے۔
آپ فرماتے ہیں: باید تا علم حق تعالیٰ نیکو تر ازاں باشد کہ علم خلق۔ ”یعنی
لازم ہے کہ تنہائی میں اپنے رب کے ساتھ نیک معاملہ اس سے زیادہ رکھا جائے جتنا اعلانیہ لوگوں
کے سامنے رکھا جاتا ہے“، کہ وہ حجابِ اعظم ہے حق تعالیٰ سے اور وہ مشغول ہے دل کے ساتھ مخلوق
میں۔ اور باب معاملات میں ہم نے اس بحث کو اول اس کتاب میں لکھ دیا ہے اسی وجہ سے یہاں
اس بحث کو مختصر کر دیا ہے۔

ان کے عجیب و غریب واقعہ میں سے ایک حکایت ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ میں ایک روز
نیشاپور کے لیے شہر حیرہ پر جا رہا تھا کہ نوح نامی ایک بزرگ جو فتوت و زہد میں مشہور تھے اور تمام
نیشاپور کے عباد و زاہدان کے تابع و فرمان تھے، میں نے انہیں راستہ میں دیکھا۔ میں نے اُن سے
پوچھا: نوح جو انمردی کیا چیز ہے؟ کہنے لگے: میری جو انمردی بتاؤں یا آپ کی۔ میں نے کہا: دونوں
فرمائیں۔ نوح نے فرمایا: میری جو انمردی تو یہ ہے کہ میں قبائلا تار کر مرقعہ پوش بنوں اور احکام و اعمال

۱۔ مذکورہ الفاظ تو نہیں ملے مگر اس کی ہم معنی روایات وارد ہوئی ہیں۔ مثلاً: اتقوا مواضع التہم، من قام نفسه

مقام التہم فلا یلو من من اساء الظن بہ. من سلک مسالک التہم اتہم.

حوالہ کے لیے: الاسرار المعروفۃ لعلی القاری، ص: ۳۹۔ حدیث ۱۵۱

میں سعی کرتا رہوں حتیٰ کہ صوفی بن جاؤں اور اللہ تعالیٰ کی شرم سے اس فرقہ کے اندر ہر قسم کی معصیت سے اجتناب کروں۔ اور آپ کی جو انمردی یہ ہے کہ مرقعہ اتار کر اتنی علیحدگی اختیار کرو کہ لوگ آپ سے اور آپ لوگوں سے فتنہ میں نہ پڑیں۔ تو گویا میری جو انمردی ظاہر احکام شریعت کا اتباع ہے اور آپ کی جو انمردی اسرار دین پر حقائق کا نگاہ میں رکھنا ہے اور یہ بڑی قوی دلیل واصل ہے۔

فرقہ طیفوریہ

یہ فرقہ ابو یزید طیفور بن عیسیٰ بن سر و شان بسطامی رحمۃ اللہ علیہ سے تعلق و توالی رکھتا ہے۔ یہ رؤساء متصوفہ سے تھے اور قوم کے اندر کبرائے قوم سے مانے جاتے تھے۔ ان کا مسلک غلبہ سکرو فرط شوق الی اللہ ہے اور ان کا یہ مسلک ہے کہ سکرو محبت کسب انسان کی جنس سے نہیں ہوتا اور جو چیز دائرہ اکتساب سے خارج ہو اس پر دعویٰ کرنا باطل ہے اور اس کی تقلید محال۔ تو لامحالہ صاحبی کی صفت سکرنہیں ہو سکتی اور انسان جلب سکری اپنے اندر کوئی طاقت نہیں رکھتا ("کیف صحہ" اصطلاح تصوف میں ہوشداری کو کہتے ہیں اور صاحبی ہوش میں رہنے والا ہے) اور اس کا سکرو خود مغلوب ہوتا ہے، اسے مخلوق کے ساتھ التفات نہیں ہوتا کہ وہ کسی صفت کے ساتھ اوصاف انسانی میں ظاہر ہو سکے اور مشائخ تصوف کی رائے اس طرف ہے کہ اقتداء صرف اسی شخص مستقیم کی درست ہے جو گردش احوال سے آزاد ہو چکا ہے۔ اور ایک گروہ مشائخ کا اس طرف ہے کہ اقتداء صاحبی اور صاحب سکرو دونوں کی روا ہے تاکہ انسان بتکلف غلبہ اور سکری کی راہ پر چل سکے۔

اسی وجہ سے حضور سید عالم ﷺ نے فرمایا: اِبْکُوْا فَاِنَّ لَکُمْ تَبْکُوْا فَتَبَاکُوْا۔ (۱) "تم رویا کرو اور اگر نہ رو سکو تو رونے والوں کی مانند رونے کی صورت بناؤ۔" اور اس کی دو وجہ ہیں: ایک یہ کہ اپنے آپ کو گروہ باکی کی صورت بنا کر دکھانا ہو جو محض ریا ہے اور صوفیاء کے یہاں یہ شرک صریح ہے اور دوسرے اس ارادہ پر رونی شکل بنانا ہو کہ اللہ تعالیٰ اسے بھی اس درجہ پر

۱۔ یہ عبد اللہ بن سائب بن ابی نھیک کی روایت کردہ حدیث کا ایک حصہ ہے۔ راوی کہتے ہیں کہ میں حضرت سعد کے پاس آیا تو انہوں نے پوچھا: اے بھتیجے آپ کون ہیں؟ میں نے اپنے بارے بتایا تو فرمانے لگے: خوش آمدید، آپ تجارت پیشہ ہیں، سنائیں آپ قرآن کریم کی تلاوت کس کیفیت میں کرتے ہیں۔ میں نے عرض کیا عمدہ طریقے سے۔ فرمایا میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ قرآن پاک کو پڑھتے ہوئے رویا کرو اور اگر رونانا آئے تو رونے والی شکل بنا لیا کرو اور قرآن کریم کی تلاوت مترنم انداز میں کیا کرو۔ جو قرآن کریم کی تلاوت مترنم آواز میں نہیں کرتا یا ترنم کی کوشش نہیں کرتا وہ ہمارے طریقہ پر نہیں ہے۔ (مسند شہاب ۸۱۲-۲ حدیث نمبر ۱۱۹۸)

پہنچا دے جس درجہ وہ ان کی سی صورت بنا رہا ہے۔ اگر یہ خیال ہے تو حدیث سرور عالم ﷺ کی موافقت ہو جائے گی اور حضور نے دوسری جگہ فرمایا: مَنْ تَشَبَهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ . (۱) ”جو جس قوم کے ساتھ مشابہت کرے وہ انہیں میں سے ہے۔“ تو جو کچھ انواع مجاہدات سے ہم نے بیان کیا ان پر عمل کرنا چاہیے اور درگاہِ واہب المراد سے اُمید رکھے تاکہ مبداءِ فیاض سے اس کے لیے درمعانی کشادہ ہوں۔

مشائخ کرام میں سے ایک فرماتے ہیں: الْمُشَاهِدَاتُ مَوَارِثُ الْمُجَاهِدَاتِ . ”مشاہدات، مجاہدات کا ورثہ اور نتیجہ ہیں۔“ میں کہتا ہوں: مجاہدات ہر حال میں اچھے ہیں لیکن سکر اور غلبہ میں کسبِ انسانی کا کوئی ایسا دخل نہیں کہ اس جدوجہد کے ذریعہ کیفیتِ سکر و غلبہ کا جلب ہو سکے۔

اور مجاہدات کبھی علتِ حصولِ سکر نہیں ہوں گے، اس لیے کہ مجاہدہ بحالتِ صحو یعنی ہوش میں انسان کر سکتا ہے اور صاحبِ صحو کو سکر کی طرف التفات نہیں ہو سکتا۔ (اسی وجہ میں صاحبی کا سکر میں بذریعہ مجاہدہ آنا محال ہے)۔

اب ہم حقیقتِ سکر و صحو کو باختلاف بیان مشائخ سناتے ہیں تاکہ اشکالِ سامع رفع ہو۔
ان شاء اللہ .

سکر اور صحو

یاد رکھو! اللہ تمہیں نیکی دے، سکر و غلبہ یہ دو لفظ اربابِ معانی میں استعمال ہوتے ہیں۔ غلبہ سے مراد محبتِ جل شانہ ہوتی ہے اور صحو ایک ایسا لفظ ہے کہ ”حصولِ مراد“ اربابِ معانی کے معنی میں مستعمل ہے مگر اہلِ معانی کے اس میں سبب سے کلام نہیں۔ ایک جماعت تو صحو پر سکر کو فضیلت دیتی ہے اور وہ ابو یزید ہیں اور ان کی جماعت۔ وہ کہتے ہیں کہ صحو تمکین و اعتدال پر صفتِ آدمیت کی صورت پکڑ لیتا ہے اور یہ حجابِ اعظم ہے حق تعالیٰ شانہ سے، اور سکر زوالِ آفات اور نقصِ صفات بشریت اور تدابیر دنیا و اختیار ذاتی کو دور کر دیتا ہے۔ اور صاحبِ سکر کے تمام تصرفات خیارِ حق کے ساتھ فنا ہو جاتے ہیں اور تمام تدابیر و اختیارات کی قوتیں زائل ہو جاتی ہیں اور وہ معنی جو اس کے وجود میں بصورتِ قوی اور خلافِ جنس ہیں، وہ اقویٰ ابلغ اتم و اکمل اُس کے حال میں ہوتے ہیں۔

جیسا کہ داؤد علیہ السلام جب بحالتِ صحو تھے اُن کے تمام افعال ان کی طرف سے وجود میں آئے تھے اور اس وقت تک ان کے فعل کو اللہ تعالیٰ نے اُن کی طرف ہی مضاف فرمایا تھا جیسا

۱۔ اس حدیث مبارکہ کی مکمل تفصیل پیچھے گزر چکی ہے۔

کہ ارشاد ہے: ﴿وَقَتَلَ دَاوُدُ جَالُوتَ﴾ (۱) ”اور قتل کیا داؤد علیہ السلام نے جالوت کو۔“ اور ہمارے آقا و مولیٰ حضور ﷺ حالتِ سُکر میں تھے تو آپ کا ہر وہ فعل جو آپ کی طرف سے ظہور میں آیا، اللہ تعالیٰ نے اس کی اضافت اپنی طرف فرمائی اور کہا: ﴿وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ﴾ (۲) ”اور وہ کنکریاں تم نے اے محبوب نہیں پھینکیں، جب تم نے پھینکیں، وہ اللہ تعالیٰ نے پھینکی تھیں۔“ فَشَتَّانَ مَا بَيْنَ عَبْدٍ وَعَبْدٍ تو جو بندہ اپنی ذات کے ساتھ قائم تھا اور اپنی صفات میں ثابت، اسے فرمایا تو نے کیا منصبِ کرامت کے ساتھ، اور جو بندہ ^{معظم} اپنے رب کے ساتھ قائم اور اپنی صفات کے ساتھ فانی تھا اسے فرمایا: ہم نے کیا، جو کچھ تو نے کیا۔ تو اضافتِ فعلِ بندہ ذاتِ مستجمع الصفات کی طرف بہترین ہے، اس اضافت سے جو بندہ اپنی طرف قائم رکھے۔ تو جب فعلِ حق مضاف ہو بندہ کی طرف تو بندہ خود بخود قائم ہوتا ہے اور جب بندہ کا فعلِ حق کی طرف مضاف ہو تو بندہ بحق قائم ہوتا ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ داؤد علیہ السلام کی نظر وہاں پڑی جہاں پڑنی نہ چاہیے تھی یعنی ایک عورت پر جو اوریبا کی عورت تھی جسے دیکھا، وہ ان پر حرام تھی اور جب بندہ بحق قائم ہو گیا جیسے حضور ﷺ کہ نظر تو آپ کی بھی پڑی اس طرح زید (رضی اللہ عنہ) کی بیوی پر مگر وہ بیوی زید پر حرام ہو گئی۔ اس لیے کہ وہ نظر جو داؤد علیہ السلام کی تھی وہ محلِ صحو میں تھی اور یہ نظر جو حضور ﷺ کی تھی، یہ محلِ سُکر میں تھی۔

پھر جو لوگ صحو کو سُکر پر فضیلت دیتے ہیں وہ حضرت جنید رضی اللہ عنہ اور ان کے قبعین ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ سُکر محلِ آفت ہے کیونکہ وہ احوالِ تشویش اور ذہابِ صحت خود ہے اور اپنے سرشتہ کا گم کر دینا ہے اور طالب کے ہر پہلو میں قاعدہ یہ ہے کہ وہ فنا ہو یا برائے بقا رہے، جو ہو یا برائے اثبات قائم ہو، جب وہ صحیح الحال ہے۔ نہیں رہا تو تحقیق کا فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا۔

اس لیے کہ دلِ اہلِ حق مجرد ہونا چاہیے تمام موجودات سے، اور بینائی کی بنیاد قیدِ اشیاء میں کبھی راحت نہیں پاتی اور آقا سے رستگاری نہیں ملتی اور مخلوق کا ما سوائے اللہ میں پھنسا رہنا اسی وجہ سے ہوتا ہے کہ وہ اشیاء کو جیسی کہ وہ نہیں دیکھ سکتے اور اشیاء کا ملاحظہ جیسی کہ وہ ہیں، دو طرح پر ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ دیکھنے والا ہر شے کو پچشم بقا دیکھے۔ دوسرے یہ کہ اس شے کو پچشم فنا دیکھے۔ اگر وہ پچشم بقا میں دیکھے گا تو کل اشیاء اپنی بقا میں ناقص نظر آئیں گی کیونکہ اشیاء باقی رہنے کے حال میں اپنے سے باقی نہیں پاتا اور اگر پچشم فنا دیکھے گا تو کل اشیاء پہلے بقا واجب تعالیٰ میں فانی نظر آئیں گی۔ تو یہ دونوں نظریں موجودات کے دیکھنے والے کو اعراض پر مجبور کر دیتی ہیں۔

اس لیے حضور ﷺ نے بحالتِ دعا فرمایا: اَللّٰهُمَّ اَرِنَا الْاَشْيَاءَ كَمَا هِيَ (۱) ”اے اللہ ہمیں اشیاء کو اس حال میں دکھا جیسی کہ وہ ہیں۔“ اس لیے کہ جس نے حقیقت اشیاء کما ہی کو دیکھ لیا، وہ آسودہ ہو گیا اور یہی معنی فرمانِ جل مجدہ کے ہیں جو فرمایا: ﴿فَاعْتَبِرُوا يَا اُولِيَ الْاَبْصَارِ﴾ (۲) ”تو عبرت حاصل کرو اے آنکھ والو۔“ اس لیے کہ جب تک حقیقت شے نہیں دیکھی جائے عبرت نہیں لی جاتی۔

تو یہ تمام کیفیت صحو میں آئے بغیر درست نہیں ہوتی اور اہلِ سکر کو اس معنی میں کچھ آگاہی نہیں۔ جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام بحالتِ سکر تھے تو ایک تجلی کے ظہور کی تاب نہ لاسکے اور ہوش سے بے ہوش ہو گئے۔ ﴿وَخَرَّ مُوسٰی صَعِقًا﴾ (۳) اس امر کا مظہر ہے۔

اور ہمارے حضور ﷺ جب بحال صحو تھے تو مکہ سے قاپِ قوسین تک عینِ تجلی میں گئے اور ہر لمحہ ہوشیار و بیدار تر رہے۔ واللہ اعلم بالصواب (۴)

اور میرے شیخ فرماتے ہیں جو مذہبِ جنیدی کے تابع تھے کہ سکر بازِ یگاہ کو دکان ہے اور صحو و فنا گاہِ مردان۔ اور میں (یعنی حضرت علی بن عثمان جلابی رضی اللہ عنہ) کہتا ہوں کہ اپنے شیخ کی موافقت پر کمال صاحبِ سکر و صحو ہے اور کمترین درجہ صحو کا یہ ہے کہ صاحبِ صحو صفاتِ بشریہ کے دیکھنے سے دور ہو جاتا ہے۔ تو وہ صحو جو آفت دکھاتا ہے اس سکر سے بہتر ہے جو عینِ آفات ہے۔

اور حضرت ابو عثمان مغربی رحمۃ اللہ علیہ سے ایک حکایت ہے کہ آپ نے ابتداءِ حال میں بیس سال عزلت نشینی فرمائی اور ایسے جنگلوں میں رہے جہاں انسان کا حس بھی نہ ہو۔ حتیٰ کہ بوجہ مشقت و مجاہدہ آپ کا جسم گھل گیا اور چشمہائے مبارک سوئی کے ناکہ کی رہ گئیں اور شبیہ انسانی بدل گئی۔ بیس سال کے بعد حکم آیا کہ اب انسانوں میں صحبت کرو۔ آپ نے اپنے دل میں کہا کہ ابتداءً صحبت، اللہ کے بندوں اور اس کے محبوبوں سے کرنی چاہیے تاکہ برکت حاصل ہو۔ آپ نے مکہ معظمہ کا قصد کر لیا۔ مشائخِ مکہ کو اپنے کشف سے آپ کی تشریف آوری کا حال معلوم ہو گیا۔

۱۔ یہ الفاظ تو نہیں ملے لیکن الحاف السادة المتقين، ۳۲۱/۹ میں یہ الفاظ آئے ہیں۔ اللہم ارنی الدنيا

۲۔ سورة الحشر: ۲

کما تریہا صالح عبادک

۳۔ سورة الاعراف: ۱۴۳

۴۔ موسیٰ زہوش رفت بیک جلوة صفات تو عین ذات می نگری در تبسمی

شربتُ الرّاح کما ساء بعد کاسٍ لَمَّا نَفَدَ الشَّرَابُ وَمَا رُوِيَتْ

ترجمہ۔ میں نے پے در پے شراب کے جام پئے۔ تو نہ شراب نے مجھ میں نفوذ کیا اور نہ میں سیراب ہوا۔

استقبال کے لیے شہر سے باہر آئے۔ آپ کو بالکل مبدل پایا، سوائے اس کے کہ رقی جان نظر آتی تھی اور کچھ نہیں۔ سب نے کہا ابو عثمان! آپ بیس سال اس حالت میں جیئے ہیں کہ آدم اور اس کی ذریت اس زندگی سے عاجز ہے، ہمیں بتاؤ کہ تم کیوں گئے اور وہاں کیا دیکھا اور اس موت میں کیا حاصل کیا اور اب کس لیے واپس آئے؟

آپ نے جواب دیا کہ میں سکر میں گیا تھا اور آفات سکر دیکھ کر نا امید ہوا اور عاجز آ کر واپس آیا۔ مشائخ کرام نے کہا کہ ابو عثمان! آپ کے بعد اب سب معروں پر حرام ہے کہ وہ صحو و سکر کی عبارت پر آئیں، اس لیے کہ آپ نے اس کا انصاف پورا کر دیا اور آفات سکر کو واضح طور پر دکھا دیا۔ تو خلاصہ یہ ہوا کہ سکر تمام کا تمام مقتضی فنا ہے۔ عین بقا ضعف ہیں اور یہ حجاب ہے اور صحو تمام کا تمام فناضعت میں دیدار بقا ہے اور یہ عین کشف ہے اور اگر کسی کو یہ خیال ہو کہ سکر بہ نسبت صحو نزدیک فنا ہے تو یہ محال ہے۔

اس لیے کہ سکر ایک ایسی صفت ہے جو صحو پر زیادہ ہے اور جب تک بندہ کی صفتیں زیادتی کی طرف رجوع ہوتی ہیں اس وقت تک وہ بے خبر رہتا ہے اور جب نقص کی طرف ہو جاتی ہے تو اس وقت اس کی حالت امید افزا ہوتی ہے اور صحو و سکر میں یہ حال کی انتہا وغایت ہے۔

حضرت ابو یزید رحمۃ اللہ علیہ سے حکایت ہے۔ جب کہ مغلوب الحال ہو کر یحییٰ بن معاذ رضی اللہ عنہ نے آپ کو خط لکھا۔ اس شخص کے حال میں کیا حکم ہے جس نے ایک قطرہ بحرِ محبت سے نہ لیا اور مست ہو گیا۔ حضرت ابو یزید رحمۃ اللہ علیہ نے جواب لکھا کہ اس شخص کے معاملے میں آپ کیا فرماتے ہیں جس کے لیے تمام دریا علم شرابِ محبت بن گیا اور اس نے تمام کا تمام پی لیا اور ابھی تشنگی میں تڑپ رہا ہے۔ اس پر لوگوں کا خیال ہے کہ یحییٰ بن معاذ رحمۃ اللہ علیہ نے سکر سے عبادت کی اور حضرت با یزید رحمۃ اللہ علیہ نے صحو سے۔ اور اس میں خلاف یہ ہے کہ صاحبِ صحو وہ ہوتا ہے کہ اُسے ایک قطرہ کی تاب نہیں ہوتی اور صاحبِ سکر وہ ہوتا ہے کہ مستی میں وہ سب کچھ پی سکتا ہے اور پھر پیسا رہتا ہے۔ اس لیے کہ شراب آگہ سکر ہے اور جنس اپنی ہم جنس کے لیے بہتر ہوتی ہے اور صحو اس کی ضد ہے کہ وہ پینے سے آرام ہی نہیں پاتا۔

لیکن سکر دو قسم کا ہے۔ ایک سکر شرابِ مودت، دوسرا سکر کا سِ محبت۔ سکر محبت بلا علت ہوتا ہے اور محض رویتِ منعم سے پیدا ہوتا ہے۔ جس نے نعمت دیکھی تو گویا اپنے کو رنجور دیکھا، اگرچہ وہ سکر میں ہو۔ تو اس اصول سے صحو بھی دو قسم پر ہے۔ ایک صحو بر غفلت دوسرا صحو بر محبت و اقامت۔ تو وہ صحو جس میں غفلت ہو وہ حجابِ عظیم ہے اور صحو جس میں محبت کی طرف راہ ملے وہ

کھنک مبین ہے۔

تو وہ شخص جو مقرون غفلت ہے اگرچہ صحو ہو، سکر ہے اور وہ جو محبت تک پہنچائے اگرچہ سکر ہو، صحو ہے۔ غرضیکہ جب اصل مستحکم ہو تو صحو مثل سکر ہو جاتا ہے اور سکر مثل صحو۔ اور جب اصل مستحکم نہ ہو، صحو اور سکر دونوں بے فائدہ ہیں۔

فی الجملہ صحو و سکر مردان الہی کے قدم رکھنے کی جگہ میں باختلاف علت معلوم ہوتے ہیں اور جب سلطان حقیقت اپنا جمال بے حجاب فرمادیتا ہے تو صحو و سکر دونوں طفیلی رہ جاتے ہیں۔ اس لیے کہ صحو و سکر دونوں رخ معنی میں ایک دوسرے کے موصول ہیں۔ اور ہر ایک کی نہایت دوسرے کی ہدایت ہے اور یہ ہدایت و نہایت بھی سوائے اختلاف نظر کے اور کچھ نہیں ہے۔

اور جس کی نسبت تفرقہ کے ساتھ ہو وہ حکم تساوی کا رکھتا ہے۔ اور ان کا جمع کرنا تفریقوں کا جمع کرنا ہے۔ اس مفہوم کو کسی شاعر نے خوب ادا کیا ہے۔

إِذَا طَلَعَ الصَّبَاخُ بِنَجْمِ رَاحٍ تُسَاوِي فِيهِ سُكْرَانٌ وَصَاحٍ

”جب صبح دل کے خوش کرنے والے ستاروں سے طلوع ہو تو اس میں بیہوش

اور مدہوش والے برابر ہوتے ہیں“۔

مقام سرخس میں دو پیر تھے۔ ایک لقمان دوسرے ابوالفضل حسن رضی اللہ عنہما۔ ایک دن حضرت لقمان حضرت ابوالفضل کے پاس آئے تو دیکھا کہ آپ اپنے ہاتھ میں کاغذوں کا ایک جز لیے ہوئے ہیں۔ لقمان نے پوچھا: حضرت ان جزوں میں کیا ڈھونڈ رہے ہیں۔ حضرت ابوالفضل نے جواب دیا: وہی جو تم ترک اوراق میں ڈھونڈ رہے ہو۔ عرض کی پھر اختلاف کیوں؟ (یعنی میں ترک اوراق میں جو ڈھونڈ رہا ہوں آپ اُسے اوراق میں ڈھونڈ رہے ہیں) فرمایا: لقمان! تم خلاف دیکھتے ہو جب ہی مجھ سے پوچھ رہے ہو ”لقمان“ مستی سے ہوشیار ہو جاؤ اور ہوشیاری سے بیدار ہو۔ تاکہ خلاف کا جھگڑا ہی اٹھ جائے۔ خبر بھی ہے، میں اور تم ڈھونڈ رہے ہیں۔

تو طیفوری اور جنیدیوں میں صرف یہ اختلاف ہے جو ہم بیان کر چکے اور اعمال میں ان کا مذہب بالکل ترک صحبت اور گوشہ نشینی اختیار کرنا ہے اور سب نے مریدوں میں یہی حکم جاری کیا ہے اور یہ طریق محمود سیرت اور ستودہ صفت ہے۔ اگر خدا توفیق دے۔

فرقہ جنیدیہ

اس فرقہ کا تعلق حضرت ابوالقاسم جنیدی بن محمد رحمۃ اللہ علیہ سے ہے۔ یہ وہ بلند ہستی ہے کہ انہیں کے ہم چشم اور ہمعصر ”طاؤس العلماء“ کہتے ہیں۔ اپنی جماعت کے سردار اور امام الاممہ

تھے۔ آپ کا مسلک صحو تھا اور یہ طیفوری مسلک کے خلاف ہے اور اس اختلاف کے دلائل ہم بیان کر چکے ہیں اگرچہ اس کے علاوہ بہت سے اختلافات ہیں۔ مگر ہم نے بخوف طوالت اختصار کیا ہے۔ صوفیاء کرام میں معروف ترین مسلک جنیدی ہے اور ہمارے تمام مشائخ جنیدی مسلک ہی سے گزرے ہیں۔

اگر کوئی اس سے زیادہ معلومات حاصل کرنا چاہے تو دوسری کتابوں میں دیکھے تاکہ اُسے اس سے بہتر معلومات حاصل ہو سکیں۔ مگر میرا طریقہ اس کتاب میں اختصار ہے اسی وجہ سے طوالت کو ترک کیا گیا۔

حکایتوں میں ملتا ہے کہ حضرت حسین بن منصور حلاج اپنے غلبہ حال میں عمرو بن عثمان سے بیزار ہو کر حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں آئے تو آپ نے ان سے پوچھا: کس لیے آئے ہو؟ عرض کی، فیضِ صحبت سے مستفیض ہونے کے لیے۔ آپ نے فرمایا: ہمارے یہاں مجانبین کے لیے صحبت نہیں ہے، صحبت کے لیے صحت چاہیے، اگر تم آفتوں میں رہ کر ہماری صحبت میں رہو گے تو سہل بن عبد اللہ تستری کی سی صحبت ہوگی جو انہوں نے حضرت عمرو اکروی سے حاصل کی تھی۔ حسین بن منصور بولے:

أَيُّهَا الشَّيْخُ الصَّحْوُ وَالسُّكْرُ صِفَتَانِ لِلْعَبْدِ وَمَادَامَ الْعَبْدُ مَحْجُوبًا
عَنْ رَبِّهِ حَتَّىٰ فَنِيَ أَوْ صَافَهُ.

”حضور! صحو و سکر کی دو صفتیں ہیں، جب تک بندہ میں یہ صفتیں باقی ہیں وہ اپنے رب سے محجوب ہے اور جب اوصافِ عبد فنا ہو گئے (تو مشاہدہ و جمال حاصل ہو گیا)۔“

حضرت جنید رضی اللہ عنہ نے فرمایا: يَابْنَ مَنْصُورٍ أَخْطَأْتُ فِي الصَّحْوِ وَالسُّكْرِ ”اے ابن منصور! تم صحو اور سکر کے بارے میں غلطی پر ہو۔“ صحو اور سکر میں اختلاف نہیں ہے۔ بلکہ صحو سے مراد صحت حال ہے اپنے رب کے ساتھ اور سکر سے مراد فرطِ شوق اور غایتِ محبت ہے اپنے رب کے ساتھ۔ اور یہ دونوں کیفیتیں صفت کے ماتحت اور اکتسابِ خلق کے ساتھ صحیح نہیں ہوتیں اور ابن منصور: ہمیں تمہارے کام میں زیادہ فضول نظر آتا ہے اور تمہاری عبادات بے معنی ہیں۔ وَاللَّهِ تَعَالَىٰ أَعْلَمُ

فرقہ نوریہ

فرقہ نوریہ کا تعلق حضرت ابوالحسن احمد بن نوری رحمۃ اللہ علیہ سے ہے۔ یہ زبردست عالم اور صدر علماء متصوفہ تھے اور بوجہ مناقب روشن اور دلائل واضح کے آپ ”نور“ کے نام سے مشہور

ہو گئے تھے۔ آپ کا مسلک تصوف میں پسندیدہ ہے اور آپ کے مسلک میں فقر پر تصوف کو فضیلت دینا ہے اور باقی تمام معاملات موافق مذہب جنیدیہ کے ہیں اور آپ کے طریقوں میں سے نادر و عجیب۔ طریقہ یہ ہے کہ صحبت میں صاحب صحبت کے حق پر ایثار کیا جائے اور اپنے حق کو قربان کرے اور اس کے بغیر صحبت اختیار کرے تو یہ حرام ہے اور فرماتے ہیں کہ صحبت درویشوں کے لیے فرض ہے اور عزلت نشینی بری چیز ہے، اور ایثار حق صاحب صحبت پر کرنا ہی فرض ہے۔ چنانچہ مروی ہے کہ فرمایا: **إِيَاكُمْ وَالْعُزْلَةَ فَإِنَّ الْعُزْلَةَ مُقَارَنَةُ الشَّيْطَانِ وَعَلَيْكُمْ بِالصُّحْبَةِ فَإِنَّ فِي الصُّحْبَةِ رِضَاءَ الرَّحْمَنِ** ”عزلت نشینی سے پرہیز کرو کہ اس میں شیطان کے ساتھ مقارنت ہو جاتی ہے اور صحبت صاحب صحبت سے لازم رکھو کہ صاحبان بارگاہ کی صحبت میں اللہ کی رضا ہے۔“ (۱)

اب ہم حقیقت ایثار بیان کرتے ہیں اور جب باب صحبت و عزلت میں پہنچیں گے تو وہاں اس کے رموز و شرح بیان کریں گے تاکہ عام طور پر فائدہ ہو۔ **إِنْ شَاءَ اللَّهُ تَعَالَى**

حقیقت ایثار

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَيُؤْتُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ﴾ (۱)

”اور ایثار کرتے ہیں اگرچہ اس چیز کے وہ حاجت مند ہوں۔“

اس آیت کریمہ کی شان نزول فقراء صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں ہے۔ اور حقیقت ایثار یہ ہے کہ صحبت حق میں اپنے پیشوا اور مالک کا حق ملحوظ رکھے اور اپنے حصہ میں اس کا حصہ ضرور نکالے۔ خود تکلیف برداشت کرے مگر اپنے پیشوا اور صاحب کی راحت کا خیال رکھے۔

لَإِنَّ الْإِيثَارَ الْقِيَامُ بِمُعَاوَنَةِ الْأَغْيَارِ مَعَ اسْتِعْمَالِ مَا أَمَرَهُ الْجَبَّارُ لِرَسُولِهِ الْمُخْتَارِ قَالَ اللَّهُ تَعَالَى خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِينَ.

”اس لیے کہ ایثار نام ہے امداد و اعانت اغیار پر قائم رہنے کا، معہ اس حکم کی پیروی کے ساتھ جو اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب کو دیا اور ارشاد فرمایا درگزر فرمانا

۱۔ مثنوی رومی از مترجم:

بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

یک زمانہ صحبت با اولیاء

۲۔ سورۃ الحشر: ۹

اختیار کرو اور بھلائی کا حکم فرماؤ اور جاہلوں سے اعراض کرو۔“

اور یہ مسئلہ باب آدابِ صحبت میں زیادہ وضاحت سے بیان کیا جائے گا۔

یہاں مقصود بیان محض ایثار ہے۔ یہ دو قسم کا ہوتا ہے: ایک صحبت میں اس طرح جیسے کہ ذکر کیا گیا ہے، دوسرے محبت میں۔ اور ایثارِ حق صاحب میں ایک گونہ رنج و اندوہ بھی ہے لیکن دوست کے حق میں ایثار کرنے سے تمام راحت ہی راحت ہے۔

ایک حکایت میں ہے کہ جب غلام الخلیل نے حضرت ابوالحسن نوری رحمۃ اللہ علیہ سے اپنی عداوت ظاہر کی اور ہر قسم کی خصومت اس سے ظاہر ہو گئی تو حضرت نوری اور رقام اور ابو حمزہ رحمہم اللہ علیہم کو حکومت نے گرفتار کر لیا اور دار الخلافت میں لے گئے۔ غلام الخلیل بکنے لگا کہ یہ قوم زنادقہ سے ہیں، اگر امیر المؤمنین ان کے قتل کا حکم صادر فرمائیں تو زندیقوں کی جڑ پود کا پتہ چل جائے اس لیے کہ یہ سرگروہ زنادقہ ہیں اور جس کے ہاتھ سے یہ امر خیر ہو جائے، اس کی حکومت و عزت کا میں ضامن ہوں۔ خلیفہ نے اسی وقت ان مشائخ کے قتل کا حکم دے دیا۔ جلاد آ گیا اور ان مردانِ خدا کے ہاتھ باندھے گئے۔ جلاد نے بموجب حکم حضرت رقام کے قتل کا ارادہ کیا کہ حضرت نوری اٹھے اور بڑے سرور سے رقام کی جگہ پر بیٹھ گئے، لوگوں کو تعجب ہوا۔ جلادوں نے کہا: اے جوانمرد! کیا تلوار بھی ایسی چیز ہے کہ اس سے اس قدر رغبت ہو جس رغبت سے تم آئے ہو حالانکہ ابھی تمہاری باری نہیں آئی۔

آپ نے جواب دیا: ہاں! ہمارے لیے تلوار ایسی ہی چیز ہے کہ میرے طریق ایثار کے ماتحت وہ مجھے مرغوب ہو اس لیے کہ دنیا میں سب سے زیادہ عزیز چیز زندگی ہے، میں چاہتا ہوں کہ یہ چند سانس ان بھائیوں کی خدمت میں ایثار کروں اس لیے کہ دنیا کا ایک سانس آخرت کے ہزار سال سے زیادہ محبوب ہے، کیونکہ دنیا سرائے خدمت ہے اور آخرت مقامِ قربت، تو مقامِ قربت میں یہ خدمت نہیں کی جاسکتی۔ جلاد نے یہ سب باتیں خلیفہ کو پہنچادیں، خلیفہ نے اتنے بلند حوصلہ اور رقتِ سخن پر سخت تعجب کا اظہار کیا اور کسی کے ذریعہ کہلا بھیجا کہ ان کے قتل کو سردست موقوف رکھو اور ابوالعباس بن علی قاضی القضاة کو بلا کر تینوں کو ان کے سپرد کر دیا۔ قاضی القضاة نے تینوں کی مشکلیں کسی ہوئی رکھیں اور اپنے یہاں بلایا۔ پھر ان سے احکام شریعت کے متعلق سوال کیے۔ جواب سن کر ان میں عرفانی شان کی حقیقت پائی اور وہ مذہبی اتباع میں مکمل نکلے۔ قاضی بہت متاثر ہوا اور ان کے حالات سے بے خبر رہنے پر شرمسار۔ حضرت نوری نے فرمایا: قاضی تو نے جو کچھ دریافت کیا ہے یہ کچھ نہیں ہے جو پوچھنے کی بات تھی وہ تو تو نے نہیں پوچھی۔ فَإِنَّ لِلَّهِ عِبَادًا يُكَلِّفُونَ بِاللَّهِ وَيَشْرَبُونَ بِاللَّهِ وَيَجْلِسُونَ بِاللَّهِ وَيَقُولُونَ بِاللَّهِ ”اللہ کے بندوں کی ایسی جماعت بھی ہے کہ

ان کا کھانا اللہ کے لیے اور پینا اللہ کے واسطے اور بولنا اللہ کے لیے ہے۔“ وہ ایسے مردانِ خدا ہیں کہ ان کا قیام اللہ کے ساتھ اور قعود و نطق، حرکت و سکون سب اسی کے ساتھ ہے اور ان کی زندگی اس کے ساتھ ہے اور وہ قائم بمشاہدہ ہیں، اگر ایک لحظہ مشاہدہ حق ان سے حجاب میں آجائے تو ان کی دنیائے جسم میں جوش و خروش پھیل جائے۔

یہ سن کر قاضی متعجب ہوا اور ان کے کلام کی باریکی اور صحت حال کو پا کر خلیفہ کو لکھا کہ اگر یہ جماعت ملاحظہ ہے تو فَمَنْ الْمُوَحِّدُ فِي الْعَالَمِ. ”پھر کون دنیا میں موحد ہو سکتا ہے“۔ میں گواہی دیتا ہوں اور اپنے حکم سے فیصلہ کرتا ہوں کہ (ان کے مقابلہ کا) روئے زمین پر کوئی موحد نہیں ہو سکتا۔

خلیفہ نے قاضی القضاة کا یہ محاکمہ پڑھ کر ان بزرگوں کو بلایا اور عرض کی (کہ مجھ سے غلطی ہوگئی اور میں دھوکہ میں آ گیا) اب آپ اپنی حاجت ظاہر کریں۔ حضرت نوریؒ وغیرہ مشائخ جو گرفتار تھے انہوں نے فرمایا کہ خلیفہ ہماری حاجت تجھ سے بس اتنی سی ہے کہ تو ہمیں بھلا دے اور ہم تیرے مقبول کرنے کو اپنی مردودیت سمجھتے ہیں اور اگر تو ہمیں اپنی بارگاہ سے مطرود کر دے گا تو ہم اسے عین مقبولیت جانیں گے۔ خلیفہ حضرت نوری رحمۃ اللہ علیہ کے اس دردناک جواب کو سن کر اس قدر متاثر ہوا کہ روپڑا اور نہایت احترام کے ساتھ انہیں واپس کر دیا۔

ایک روایت نافع سے ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کو ایک روز مچھلی کی خواہش ہوئی۔ تمام شہر میں تلاش کی مگر نہ ملی۔ چند روز بعد وہ مجھے (یعنی حضرت نافع کو) ملی فرماتے ہیں: میں نے وہ مچھلی بنوائی اور حضرت ابن عمرؓ کی خدمت میں حاضر کی۔ میں نے دیکھا کہ اس مچھلی کے پیش کرنے سے آپ مسرور ہوئے۔ اتنے میں ایک سائل نے باب عالی پر کھڑا ہو کر صدادی۔ آپ نے حکم دیا کہ یہ مچھلی اس سائل کو دے دو۔ غلام نے عرض کی: حضور اتنی دیر میں تو یہ مچھلی میسر آئی ہے اب آپ سائل کو عطا فرما رہے ہیں، اس کی بجائے کچھ اور بخشش کر دی جائے۔ فرمایا: اے غلام! یہ مچھلی کھانا مجھ پر حرام ہے اس لیے کہ میں نے ایک حدیث کے موافق اس مچھلی کو اپنے دل کی خواہش سے باہر کر دیا ہے۔ وہ حدیث یہ ہے جو میں نے حضور ﷺ سے سنی ہے: أَيَّمَا أَمْرٍ يُسْتَهَيَّ شَهْوَةٌ فَرَدَّ شَهْوَتَهُ وَآثَرَ الْآخِرَةَ عَلَى نَفْسِهِ غُفِرَ لَهُ (۱) ”جو انسان کسی چیز کی خواہش کرے پھر اس

۱۔ امام دارقطنی نے حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مرفوعاً روایت کیا ہے۔ امام ابو نعیم، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے غلام ابو عبداللہ نافع دیلی تابعی کے تعارف میں ”حلیۃ الاولیاء“ میں لائے ہیں اور اسے امام شوکانی نے ”القوائد المجموعہ“ (ص: ۲۳۹)، حدیث نمبر ۶۶ میں ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ: یہ موضوع ہے اور راوی عمر بن خالد، ابو خالد الواسطی متہم بہ ہے۔

چیز کی طرف سے دست بردار ہو کر آخرت کو نفس کی خواہش پر ترجیح دے تو لامحالہ اللہ تعالیٰ اس کے گناہ معاف کر دے۔“

ایک حکایت میں ہے کہ جنگل بیابان میں راہ بھول کر دس درویش ٹھہرے اور پیاس نے انہیں ستایا اور ان کے پاس ایک قدح پانی سے زائد نہ تھا اور دس کے دس پیاسے تھے۔ جب ایک کو وہ قدح آب دیا جاتا وہ دوسرے کی طرف ایثار کر دیتا۔ دوسرے کا خیال اپنے رفیق کی پیاس پر جاتا وہ اُسے دے دیتا۔ غرضیکہ اسی طرح پیالہ پانی کسی نے نہ پیا اور شدت تشنگی سے سب مر گئے، صرف ایک بچے تھے۔ جب انہوں نے اپنے نور رفیق مرے ہوئے دیکھے تو وہ قدح آب پی لیا اور راستہ طے کرنا شروع کر دیا۔ کسی کے پاس یہ قصہ انہوں نے کہا تو اس نے کہا اگر وہ پانی تو بھی نہ پیتا تو بہتر تھا۔

انہوں نے کہا: عقلمند! کیا حکم شرعی اتنا ہی جانتا ہے؟ تجھے معلوم نہیں کہ نو آدمیوں کے مرجانے کے بعد بھی اگر میں وہ پیالہ نہ پیتا تو خودکشی کا مجرم بنتا اور عتابِ الہی میں ماخوذ ہوتا۔ تو وہ کہنے لگا کہ آپ کے خیال میں وہ نو آدمی بھی خودکشی کے مجرم ہوئے۔ انہوں نے کہا نہیں، اس لیے کہ وہ ایثار کر رہے تھے۔ اپنی حاجت کے مقابلہ میں دوسرے کی ضرورت کو ترجیح دیتے تھے۔ یہاں تک کہ عمل پر ایثار کرتے کرتے ہلاک ہو گئے۔ پھر جب کہ میں تمہارا گیا تو اب موقع ایثار نہیں تھا۔ اس لیے ایسے موقع پر وہ پانی مجھے پینا واجب تھا۔

دیکھو! جب امیر المومنین مولا علی کرم اللہ وجہہ حضور ﷺ کے بستر پر سوئے اور ہجرت میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ حضور کی معیت میں گئے اور مکہ سے باہر آ کر غار میں ٹھہرے۔ اس شب کفار کا قصد حضور ﷺ کے شہید کرنے کا تھا تو جناب باری تعالیٰ عزاسمہ نے جبرائیل و میکائیل علیہم السلام کو فرمایا کہ میں نے تمہارے مابین بھائی چارہ رکھا ہے اور تمہاری زندگی بھی ایک دوسرے سے دراز کی ہے۔ بتاؤ تم میں سے کون ہے جو اپنے بھائی پر اپنی زندگی کا ایثار کرے اور مرنے کو تیار ہو۔ دونوں اپنی اپنی زندگی بارگاہِ الہی سے طلب کرنے لگ گئے۔ جناب باری تعالیٰ کی طرف سے ارشاد ہوا کہ اے جبرائیل و میکائیل دیکھو علی کی بزرگی و شرافت! کہ وہ تم سے بلند ہے، ہم نے علی کے اور اپنے حبیب ﷺ کے مابین مواخاۃ کی تھی تو علی اپنے قتل و مرگ کو قبول کر کے ہمارے حبیب کی خواہ گاہ پر سو گیا اور اپنی جان ہمارے حبیب پر فدا کر دی ہے۔ اب تم دونوں جاؤ اور اس کی محافظت دشمنوں سے کرو۔

چنانچہ جبرائیل و میکائیل (علیہما السلام) حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خدمت میں آئے۔

ایک سرہانے بیٹھ گیا اور ایک پائنتی کی طرف بیٹھ گیا اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خدمت میں زبان حال سے کہنے لگے: بَخْ بَخْ مَنْ مِثْلِكَ يَا ابْنَ أَبِي طَالِبٍ إِنَّ اللَّهَ يُبَاهِي بِكَ عَلِيَّ مَلَأَ نِكْتَيْهِ "زندہ باداے علی! تمہارے مثل اس ایثار میں کون ہے، بے شک اللہ تعالیٰ آپ کے اس ایثار کو ملائکہ میں پیش فرما کر اظہارِ خوشنودی فرما رہا ہے اور آپ اپنی خواب میں بے فکر سو رہے ہیں۔"

اسی وقت یہ آیت کریمہ نازل ہوئی جس میں شانِ مولائے کائنات کرم اللہ وجہہ ظاہر ہے۔ ارشاد ہوا: ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَشْرِي نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ وَاللَّهُ رَءُوفٌ بِالْعِبَادِ﴾ (۱) "اور بعض اللہ کے بندے وہ ہیں جو اس کی رضا جوئی میں اپنی جان بیچتے اور قربان کرتے ہیں اور اللہ اپنے بندوں پر شفقت کرنے والا ہے۔" اور جب جنگِ احد کے موقع پر حرب میں اللہ تعالیٰ نے اپنے مقرب بندوں پر ابتلا فرمایا۔ ایک صحابیہ انصار میں سے آئیں۔ وہ فرماتی ہیں کہ میں ایک کٹورا پانی لے کر اس نیت سے چلی کہ مجروحینِ احد میں سے کسی کی بھی خدمت کروں۔ جب میں میدانِ رزم میں پہنچی، ایک صحابی کو دیکھا کہ مجروح پڑے ہوئے اپنے لمحاتِ زندگی کے آخری سانس لے رہے ہیں۔ مجھے انہوں نے اشارہ کیا کہ پانی پلاؤں۔ میں ان کی طرف پانی لے کر گئی تو ایک دوسرے زخمی صحابی نے آواز دی کہ مجھے پانی پلاؤ۔ یہ آواز سنتے ہی وہ پہلے مجروح فرمانے لگے: جاؤ انہیں پلاؤ اور خود پانی نوش نہ فرمایا۔ جب وہ پانی ان کی طرف لے گئی تو ایک اور مجروح پکارے کہ مجھے پانی دو تو انہوں نے پانی نہ پیا اور مجھے فرمایا: جاؤ انہیں پانی دو۔ غرضیکہ اسی طرح سات صحابی تک وہ پانی لے کر چلی اور سب نے دوسرے کی آواز پر خود نہ پیا اور دوسرے کی طرف بھیج دیا۔ جب کہ ساتویں صحابی کی خدمت میں پانی لے کر میں پہنچی، وہ شہید ہو گئے۔ واپس لوٹی اور چھٹے کے پاس آئی تو وہ بھی جان بحق تسلیم فرما چکے تھے۔ غرضیکہ جب واپس آئی تو چھ کے چھ شہید تھے۔ آیت کریمہ حضور ﷺ پر ان شہداءِ احد کی شان میں نازل ہوئی جس میں ارشاد تھا کہ:

﴿وَيُؤْتِرُونَ عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ﴾ (۱)

"وہ محبوبانِ بارگاہِ اپنی جانوں کا ایثار کرتے ہیں اگرچہ انہیں سخت تنگی ہو رہی ہو۔"

بنی اسرائیل میں ایک عابد تھا، جس نے چار سو برس عبادت کی تھی۔ ایک دن وہ بارگاہِ رب العزت میں عرض کرنے لگا: الہی! اگر تو ان پہاڑوں کو پیدائہ فرماتا تو تیرے بندوں کو چلنے اور سفر کرنے میں آسانی رہتی، تو پیغمبر وقت صلوات اللہ علیہ وسلم کی طرف فرمان آیا کہ اس عابد کو فرما دو کہ جناب باری کا ارشاد ہے کہ تو نے بندہ ہو کر ہماری ملک میں تصرف کیا لہذا ہم نے تیرا نام

دیوانِ سعد سے نکال دیا اور اور فہرستِ اشقیاء میں تجھے داخل کر دیا ہے۔
اس عابد نے یہ سنتے ہی اظہارِ مسرت کیا اور سجدہ شکر کے لیے بحضورِ الہی جھک گیا۔
پیغمبرِ وقت علیہ السلام نے فرمایا: اے عظیم شقاوت کے درجے میں پہنچنے پر سجدہ شکر ادا کر رہا ہے، یہ
کونسا قانون ہے۔ عابد نے عرض کی حضور! اپنی شقاوت پر سجدہ نہیں کر رہا ہوں بلکہ اس امر پر سجدہ
شکر ادا کر رہا ہوں کہ خواہ کسی فہرست میں میرا نام ہو، مگر ہے تو اسی کے دفتر میں۔

اب میں ایک آرزو رکھتا ہوں، وہ حضور ﷺ اپنے رب کے دربار میں عرض کر دیں۔
آپ نے فرمایا: وہ آرزو کیا ہے؟ عابد نے عرض کی وہ یہ عرض ہے کہ جب مجھے جہنم میں ڈالا جائے تو
مجھے اتنا عظیم الجحیم اور عریض و طویل کر کے ڈالا جائے کہ تمام موحدین کی جگہ مجھ سے بھر جائے تاکہ
مجھ ایک کے جہنم جانے سے اتنا فائدہ ہو کہ باقی تمام موحدین بہشت میں جائیں۔ (اس ایثار اور
خلوص پر دریائے رحمت جوش زن ہوا) ارشاد ہوا کہ: (اے پیغمبرِ وقت ہمارے بندہ کو) بشارت دو
کہ یہ ابتلاء و امتحان تیرے ذلیل کرنے کے لیے نہ تھا بلکہ تیرے ایثار و اخلاص کے ظاہر فرمانے کے
لیے تھا۔ اب تیرا یہ مرتبہ ہے کہ قیامت کے دن تو اور جس کی تو شفاعت کرے گا، وہ سب تیرے
ساتھ بہشت میں ہوں گے۔

میں نے ایک بار حضرت احمد حماد سرخسی رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا کہ آپ کی ابتداء تو بہ
کیوں کر ہوئی تھی۔ فرمایا: میں سرخس سے ایک بار چلا اور ایک جنگل میں پہنچا۔ وہاں ایک مدت تک
رہا اور اپنے اونٹ چراتا رہتا۔ میرے دل میں آہ کریمہ: ﴿وَيُؤْتِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ
بِهِمْ خَصَاصَةٌ﴾ (۱) کے ماتحت اس چیز کی بہت تڑپ تھی کہ اپنی ضرورت کے مقابلہ میں
دوسرے کی حاجت پوری کروں اور میرا عقیدہ بھی صوفیائے کرام میں سے اسی جماعت کے اوپر تھا
جو ایثار کو اولیٰ تر مانتی ہیں۔

ایک روز ایک بھوکا شیر نظر آیا اور اُس نے میرا اونٹ شکار کیا اور بلندی کی طرف چڑھ گیا
اور ایک آواز ماری جس پر تمام درندے جنگل کے آگے۔ شیر نے اونٹ کو چیر پھاڑ کر ڈال دیا اور خود
کچھ نہ کھایا اور بالائے کوہ چلا گیا۔ اس شکار پر جس قدر درندے، لومڑی بھڑیے اور بگھڑے تھے،
سب نے ہلہ بول دیا اور خوب کھاپی کر چل دیئے۔ اسی وقت شیر اتر اتر اور ارادہ کیا کہ ایک ٹکڑا اس
میں سے خود بھی کھائے کہ اتنے میں ایک لومڑی لنگڑی لولی دور سے آتی ہوئی نظر آئی۔ شیر پھر وہاں
سے ہٹ گیا اور بالائے کوہ چلا گیا تاکہ وہ لومڑی بھی شکم سیر ہو جائے۔ چنانچہ جب وہ بھی کھا کر چلی

گئی تو شیر نے آکر ایک ٹکڑا اس میں سے لے کر کھایا۔

میں دور سے بیٹھ کر یہ منظر دیکھ رہا تھا کہ شیر نے واپس جاتے ہوئے بزبان فصیح مجھے کہا:

”یا احمد! ایثار بر لقمہ کارِ سگان بود و مردانِ خدا جان و

زندگانی ایثار کنند“

اے احمد! لقمہ کا ایثار کرنا کتوں کا کام ہے اور مردانِ خدا جان اور زندگی کا

ایثار کیا کرتے ہیں۔“

بس یہ سنتے ہی مجھ پر ایسا اثر ہوا کہ اسی وقت میں نے تمام اشغال دنیا و دینیہ سے

دستبرداری کی۔ یہ ہے میری توبہ کی ابتداء۔

حضرت ابو جعفر غلدی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک روز حضرت ابوالحسن نوری رحمۃ اللہ

علیہ اپنی خلوتِ خاص میں مشغولِ مناجات تھے۔ میں پوشیدہ طور گیا تاکہ اُن کی فصیح و بلیغ مناجات

سنوں۔ آپ فرما رہے تھے: ”بارِ خدایا! اہلِ دوزخ را عذابِ کُنی و جملہ آفریدگان

تواند بعلم و قدرت و ارادتِ قدیم و اگر ناچار دوزخ را از مردم پُرخواہی کرد

قادری بدانکہ بمن آن دوزخ و طبقاتِ آن پُر کنی و مرا ایشان را بہ بہشت

فرستی“۔ ”اے اللہ! تو اہلِ دوزخ کو عذاب دے دے گا، حالانکہ سب تیرے علم اور قدرت

و ارادہ سے تیرے پیدا کردہ ہیں۔ اگر تو لازمی طور پر دوزخ کو آدمیوں سے بھرنا چاہتا ہے تو اس پر بھی

قادر ہے کہ دوزخ اور اس کے تمام طبقات صرف مجھ سے بھر دے اور باقی سب کو جنت میں داخل

فرمادے۔“

حضرت جعفر فرماتے ہیں کہ میں ان کی اس دعا سے حیران ہو گیا۔ شب کو خواب میں دیکھتا

ہوں کہ کوئی آنے والا آیا اور کہتا ہے کہ جعفر! جا اور ابوالحسن کو کہہ دے کہ ہم نے تجھے اس شفقت

و محبت کی وجہ سے جو تجھے ہمارے بندوں سے اور ہم سے ہے، بخش دیا۔ اور حضرت ابوالحسن کو

’نوری‘ اس وجہ سے کہا جاتا تھا کہ اگر کوئی تاریک گھر میں کچھ بات کرتا تو آپ نورِ باطن کی روشنی

میں اس سے خبردار ہوتے تھے اور نورِ حق کی ضیاء باری سے آپ اپنے مریدوں کے تمام راز جانتے

تھے۔ چنانچہ حضرت جنید بغدادی رضی اللہ عنہ نے انہیں فرمایا: ابوالحسن جاسوسِ قلوبست۔

”ابوالحسن جاسوسِ قلوب ہے۔“ یہ ہے تخصیصِ اُن کے مسلک کی اور اہلِ بصیرت کی نظر میں یہ بہت

قوی اصل ہے اور بڑا عظیم معاملہ ہے اور انسان پر بذلِ روح سے زیادہ سخت تر کوئی چیز نہیں۔

چنانچہ اپنے حبیبِ پاک ﷺ کو تمام نیکیوں کی کنجی انفاق و ایثار بتایا گیا اور صاف بتایا

گیا کہ تمام نیکیوں کی کنجی محض بذل و انفاق ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّى تُنْفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ﴾ (۱) ”بھلائیاں تم ہرگز حاصل نہیں کر سکتے جب تک محبوب ترین شے اللہ کی راہ میں خرچ نہ کرو“۔ اور جب کوئی اپنی روح اور جان کو اس کی راہ میں مبذول کرنا گوارا کر لے تو اسے مال و حال و فرقہ و لقمہ کا کیا خطرہ ہو سکتا ہے اور اس طریقہ کا اصلی اصول یہی ہے۔

چنانچہ ایک شخص حضرت رویم رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی، حضور! مجھے کوئی وصیت فرمائیں۔ آپ نے فرمایا: يَا ابْنَ لَيْسَ الْأَمْرُ غَيْرَ بَدَلِ الرُّوحِ إِنْ قَدَرْتَ عَلَى ذَلِكَ وَالْأَفْلا تَشْتَغِلْ بِتَرْهَاتِ الصُّوفِيَّةِ. ”صاحب زادے! یہ طریقہ تصوف بغیر بذل روح و جان کے نہیں ہے، اگر تو اس پر قدرت ہے تو (اس راستہ میں آ، ورنہ) صوفیوں کی ان سخت باتوں میں نہ پڑ۔“ اس لیے کہ صوفیاء کے یہاں اس کے سوا جو کچھ ہے وہ سب لغو و بیہودہ ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتًا بَلْ أَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ﴾ (۲) ”ان لوگوں کی طرف مرنے کا دل میں گمان بھی نہ کرنا جو راہ مولیٰ میں شہید ہوئے بلکہ وہ زندہ ہیں اور اپنے رب کے پاس رزق دیئے جاتے ہیں“۔ اور فرمایا: ﴿وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ بَلْ أَحْيَاءٌ﴾ (۳) ”جو اللہ کی راہ میں شہید ہوئے انہیں مرا ہوا مت کہو بلکہ وہ زندہ ہیں۔“ تو نتیجہ یہ نکلا کہ حیاتِ قرب صرف سرمدی بذلِ روح کے بعد ملتی ہے اور اپنے حصہ کا ترک کر دینا امثالِ امرالہی اور اتباعِ محبوبانِ بارگاہی ہے۔

لیکن ایثار و اختیار رویت و معرفت میں اختلاف ہے اور صوفیاء کے یہاں حقیقتِ ایثار اپنے نصیب کا ترک کر دینا ہی اصل نصیب ہے۔ اس لیے کہ جب تک طالب کی روش متعلق بہ کسب رہتی ہے، تمام کی تمام اس کی ہلاکت کا پیش خیمہ ہے اور جب جذبِ حق اپنے تصرف و ولایت کو ظاہر کر دیتا ہے تو اس کے احوال و افعال تمام کے تمام اتنے منتشر ہو جاتے ہیں کہ اس کے لیے وہ عبارت ہی نہیں رہتی جس سے کچھ ظاہر کیا جاسکے اور نہ اُس کے وقت و زمانہ کے لیے کوئی لفظ ملتا ہے جس سے اُس کی کیفیت ظاہر کی جاسکے یا کسی چیز سے اس کی مثال دی جائے۔ اس حقیقت کو حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ نے خوب واضح کیا ہے:

غَيْبَتْ عَيْنِي فَمَا أَحْسُ بِنَفْسِي وَتَلَّاشْتُ بِهِ صِفَاتِي الْمَوْصُوفَةَ
فَإِنَّا الْيَوْمَ غَائِبٌ عَنْ جَمِيعٍ لَيْسَ إِلَّا الْعِبَارَةُ الْمَلْهُوفَةُ

ترجمہ: تو مجھ سے غائب ہوا تو میں ایسا بیہوش ہوا کہ اپنے آپ کو نہیں پہچانتا اور میری صفات موصوفہ بھی اس کے ساتھ بکھر گئیں، تو آج کے دن سب سے ایسا غائب ہوں کہ عباراتِ مہوفہ کے سوا کچھ نہیں ہوں۔“

فرقہ سہیلیہ

فرقہ سہیلیہ کا تعلق حضرت سہل بن عبداللہ تستری رحمۃ اللہ علیہ سے ہے۔ یہ محتشان اہل تصوف سے ہیں اور کبرائے قوم میں مانے جاتے ہیں۔ ان کا ذکر پہلے ہو چکا۔ غرضیکہ اپنے وقت کے سلطان اور اربابِ حل و عقد طریقت تھے اور آپ کی براہین اس قدر زیادہ ہیں کہ ہر ادراک ان کے بیان سے عاجز ہے اور آپ کا طریقہ اجتہاد و مجاہدہ نفس و ریاضت ہے اور آپ مریدوں کو مجاہدہ میں کمال درجہ پہنچا چکے ہیں۔

آپ کی ایک حکایت مشہور ہے کہ ایک مرید کو حکم ملا کہ تمام دن اللہ اللہ کرے۔ اس کے بعد تین روز تک یہی ورد رکھے کہ خوگر ذکر ہو جائے۔ پھر فرمایا: اب جس طرح دن اللہ اللہ میں گزارا ہے، راتیں بھی اسی طرح گزارو۔ مرید حسب الحکم کرتا رہا۔ غرضیکہ مرید کا یہ حال ہو گیا کہ اگر اپنے کو خواب میں دیکھتا تو ذکر کرتا پاتا۔ یہاں تک کہ وہ ذکر مرید کی عادت سے طبع ثانی بن گیا۔ اب حکم ہوا کہ ذکر لسان سے لوٹ کر قلبی میں جا۔ چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا۔ حتیٰ کہ وہ ذکر اتنا غالب آیا کہ ایک روز وہ اپنے گھر میں تھا کہ ہوا سے لکڑی گری اور اس کا سر پھوڑ دیا۔ تو جو قطرات خون چکیدہ ہوئے تو ان سے بھی اللہ اللہ ہی منقش نظر آیا۔

غرضیکہ تربیت مریدان مجاہدات و ریاضات سے کرنا خاص طریقہ سہیلیہ ہے اور خدمت درویشاں اور تعظیم، حمد و بیان اور مراقبہ، طریقہ جنیدی کا (یہ بھی ان کے یہاں لازمی ہے) اور ریاضت و مجاہدہ میں تمام کی تمام مخالفتِ نفس کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ یہاں تک کہ اگر کوئی نفس کو نہ پہچانے تو اس کے لیے مجاہدہ و ریاضت بے سود ہے۔

اب ہم نفس کی حقیقت اور اس کی تعریف بیان کریں تاکہ معلوم ہو کہ (یہ کیا بلا ہے) پھر مجاہدات اور مذاہب و مسلک صوفیاء ظاہر کریں گے تاکہ طالب علم پر ان کی تعریف روشن ہو جائے۔ ان شاء اللہ وباللہ التوفیق۔

حقیقتِ نفس و معنی ہوی

یاد رکھو! نفس کے لغوی معنی وجودِ شے کے ہوتے ہیں یا حقیقت و ذات کے معنی میں مرؤج

ہے۔ لیکن عادتِ عوام و عباراتِ مردمان میں اس کے بہت سے معنی لیے جاتے ہیں حتیٰ کہ اس کا معنوی استعمال برخلاف یک دیگر ہی نہیں ہوتا بلکہ متضاد معنی میں استعمال کرتے ہیں۔

پھر باعتبار عرف ایک گروہ بمعنی ”روح“ کہتا ہے۔ ایک گروہ کے نزدیک ”مروت“ کے معنی میں نفس آتا ہے۔ ایک گروہ ”جسد و جسم“ کے معنی لیتا ہے۔ ایک گروہ ”خون“ کے معنی کرتا ہے۔ لیکن محققین صوفیاء کے نزدیک مذکورہ معنی سے کوئی معنی نفس کے صحیح نہیں بلکہ ان کی تحقیق نفس کے متعلق (مندرجہ ذیل ہے) اس امر پر سب تو متفق ہیں کہ نفس نام ہے ”متبع شر“ اور ”قائدِ سوء“ کا۔ ایک جماعت کہتی ہے کہ نفس ایک ایسی عین شے ہے جو دل میں رکھی گئی ہے اور وہ انسان میں مثل روح کے لازم ہے۔ ایک جماعت کہتی ہے کہ نفس ایک ایسی صفت کا نام ہے جو قالب انسان میں مثل حیوۃ کے موجود ہے۔

لیکن تمام محققین صوفیاء اس امر پر متفق ہیں کہ نفس وہ ہے جس کے ذریعے اخلاقِ رذیلہ اور افعالِ خبیثہ کے ارادے پیدا ہوں اور یہ اُن افعالِ رذیلہ خبیثہ کا سبب ہے اور افعالِ رذیلہ خبیثہ دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک معاصی، دوسرے اخلاقِ رذیلہ جیسے تکبر، حسد، بخل، خشم، حسد اور مثل اس کے تمام ایسے ناستودہ افعال جو شرع و عقل بُرے بتائے۔

تو ریاضت و مجاہدہ سے صوفی ان اوصاف کو اپنے سے دفع کرتا ہے۔ جیسے توبہ کرنے سے معصیت سے اجتناب۔ تو فعلِ معصیت اوصاف سے ظاہر ہے اور اس معصیت شعاری کے اوصاف باطن سے ہے اور ریاضتِ افعال ظاہر سے ہے اور توبہ اوصاف باطن سے۔ تو جو بُرے وصف باطن سے ظاہر ہوں ظاہری روش و صفوں سے پاک ہو جاتے ہیں۔ اور جو ظاہر میں جلوہ گر ہوں، باطنی اوصاف پسندیدہ سے دور ہو جاتے ہیں۔

اور نفس و روح دونوں لطیفہ ہیں جو قالبِ انسان میں موجود ہیں۔ جیسے کہ دنیا میں شیاطین و ملائکہ اور بہشت و دوزخ۔ ان میں سے ایک محلِ خیر ہے اور ایک محلِ شر۔ جس طرح آنکھ محلِ نظر ہے اور کان محلِ سمع ہے اور زبان محلِ ذائقہ اور مثل اس کے تمام اعیان (ان کے لیے بھی ایک مقام اور محل ہے) اور بہت سے وصف ایسے ہیں جو قالبِ انسان میں ودیعت کیے گئے ہیں۔

چنانچہ نفس کی مخالفت میں تمام عبادات کا راز ہے اور کمالِ مجاہدہ بھی اسی مخالفتِ نفس کے لیے ہے اور بندہ بجز مخالفتِ نفس واصل نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ نفس کی موافقت ہلاکتِ انسان ہے اور مخالفتِ نفس میں بندہ کی نجات۔ چنانچہ حضرت رب العزت جل مجدہ نے اس کی مخالفت کا حکم فرمایا اور ان کی تعریف کی جو اس کی مخالفت کرنے والے ہیں اور اس کی مذمت کی جو موافقتِ نفس

میں چل رہے ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہوا: ﴿وَكَلَّمْنَا النَّفْسَ مِنَ الْهَوَىٰ ۖ فَإِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْبَاوِي ۗ﴾
 (۱) ”جنہوں نے نفس کی خواہشات کو روکا تو ان کی آرام گاہ جنت ہے۔“ اور فرمایا: ﴿وَأَفْكَلَمَا
 جَاءَكُمْ رَسُولٌ بِمَا لَا تَهْوَىٰ أَنْفُسُكُمْ اسْتَكْبَرْتُمْ ۗ﴾ (۲) ”کیا پس جب تمہارے پاس رسول
 تمہاری خواہشات نفسانی کے خلاف حکم لائے تو تم نے سرکشی کی اور تکبر کیا۔“

اور حضرت یوسف صدیق علیہ السلام کی زبان سے ہمیں قرآن کریم میں خبر دی: ﴿وَمَا
 أَبْرَأُ نَفْسِي ۚ إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوءِ إِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّي ۗ﴾ (۳) ”اور میں اپنی جان کو پاک
 نہیں کرتا، بیشک نفس برائی کا حکم کرنے والا ہے مگر جو اللہ کے رحم سے بچ سکے۔“

اور حضرت سید یوم النشور ﷺ نے فرمایا: إِذَا أَرَادَ اللَّهُ بِعَبْدٍ خَيْرًا بَصُرَهُ بِعُيُوبِ
 نَفْسِهِ (۴) ”جب اللہ تعالیٰ اپنے بندے کے ساتھ بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے تو چشم و بصیرت عطا
 فرماتا ہے کہ وہ اس سے اپنے نفس کے عیوب دیکھتا ہے۔“

اور احادیث میں وارد ہے کہ اللہ جل علائہ نے حضرت داؤد علیہ السلام کو وحی فرمائی
 اور حکم دیا: يَا دَاوُدُ عَادِ نَفْسَكَ فَإِنَّ وُدِّي فِي عَدَاوَتِهَا. ”اے داؤد! اپنے نفس سے دشمنی
 کر اس لیے کہ میری دوستی اس کی عداوت میں ہے۔“

یہ جو کچھ ہم نے بیان کیا یہ تمام اوصاف ہیں اور لامحالہ حقیقت کے لیے موصوف لازمی
 ہے تاکہ وہ اس صفت کے ساتھ قائم ہو۔ اس لیے کہ صفت قائم بالذات نہیں ہو سکتی اور معرفت
 صفت بغیر علم و شناختِ قالب حاصل نہیں ہو سکتی اور طریق شناخت ابدان و اجسام یہی ہے کہ
 اوصاف انانیت کو سمجھے کہ یہ انسانیت کا جز ہے اور یہی سر انسان ہے۔

اور حقیقت انسان کی تشریح میں بہت سے اقوال ہیں۔ یہاں تک کہ اس میں بھی بہت
 سے قول ہیں کہ اسم انسان کیا چیز ہے اور انسان کہلانے کا کون سا اور ہے اور اس کا علم ہر طالب
 حقیقت پر فرض ہے۔ اس لیے کہ جو اپنے سے ہی جاہل ہے وہ غیر سے جاہل تر ہوگا اور جب کہ بندہ
 معرفت حق اور معرفت خود کے لیے مکلف ہے تاکہ وہ اپنے حدود اور ذات واجب تعالیٰ شانہ کے
 قدم کو جانے اور اپنی فنا اور ذات حق کی بقا کو سمجھے۔

اور قرآن کریم کی نص بھی اس امر پر ناطق ہے کہ رپ جل مجدہ نے کفار کو اپنی طرف

۱۔ سورۃ النازعات: ۴۰-۴۱ ۲۔ سورۃ البقرۃ: ۸۷ ۳۔ سورۃ یوسف: ۵۳

۴۔ اس حدیث پاک کو امام دیلمی نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی سند کے ساتھ روایت کیا ہے (کتاب اللمع،

سے جاہل فرمایا اور ارشاد ہوا: ﴿وَمَنْ يَّرْغَبْ عَن مِّلَّةِ اِبْرٰهِيْمَ اِلَّا مَن سَفِهَ نَفْسَهُ﴾ (۱) ”اور کون ہے جو ابراہیم (علیہ السلام) کے دین سے منہ پھیرے سوا اس کے جس نے اپنے آپ کو نادانی اور جہالت کے حوالے کر دیا۔“

اور ایک مشائخ کرام میں سے فرماتے ہیں: مَنْ جَهَلَ نَفْسَهُ فَهُوَ بِالْغَيْرِ اَجْهَلُ: ”جو اپنے نفس کے ساتھ جاہل ہے وہ غیر سے جاہل تر ہے۔“ اور حضور سید یوم النشور ﷺ نے فرمایا: مَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهُ. (۲) اَيُّ مَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ بِالْفَنَاءِ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهُ بِالْبَقَاءِ وَيُقَالُ مَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ بِالذَّلِّ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهُ بِالْعِزِّ وَيُقَالُ مَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ بِالْعُبُودِيَّةِ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهُ بِالرُّبُوبِيَّةِ .

۱۔ سورة البقرة: ۱۳۰

۲۔ اسے امام سخاوی المقاصد الحسنہ (ص ۲۱۹ حدیث: ۱۱۳۹) میں لائے ہیں اور کہا ہے: کہ امام ابوالمنظر ابن السمعانی ”الكلام على التحسين والتقيح العقلي من القواطع“ میں کہتے ہیں کہ اس کا مرفوع ہونا معروف نہیں ہے بلکہ اسے محیی بن معاذ رازی کے قول سے حکایت کیا گیا ہے۔ اسی طرح امام نووی کہتے ہیں کہ یہ ثابت نہیں ہے اور میرے سامنے اس کی یہ تاویل بیان کی گئی: مَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ بِالْحَدُوثِ عَرَفَ رَبَّهُ بِالْقَدَمِ، وَمَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ بِالْفَنَاءِ، عَرَفَ رَبَّهُ بِالْبَقَاءِ. امام ابن تیمیہ نے اسے موضوع کہا ہے جبکہ امام نووی نے اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے غیر ثابت کر دیا ہے لیکن جہاں تک اس کے مفہوم و معنی کا تعلق ہے تو وہ ثابت شدہ ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے: مَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ بِالْجَهْلِ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهُ بِالْعِلْمِ وَمَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ بِالْفَنَاءِ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهُ بِالْبَقَاءِ وَمَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ بِالْعِزِّ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهُ بِالْعُبُودِيَّةِ وَالضَّعْفِ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهُ بِالْقُدْرَةِ وَالْقُوَّةِ۔ مذکور روایت کا مفہوم مندرجہ ذیل آیات سے مستعار ہے، وَمَنْ يَّرْغَبْ عَن مِّلَّةِ اِبْرٰهِيْمَ اِلَّا مَن سَفِهَ نَفْسَهُ (البقرة: ۱۳۰) ای جہلہا حیث لم یعرف ربہا، ابن غرس کہتے ہیں: لیکن کتب صوفیہ اس حدیث سے بھری پڑی ہیں اور وہ اسے حدیث کا درجہ دیتے ہیں جیسے شیخ محی الدین وغیرہ۔ اور صاحب کشف الخفاء کہتے ہیں: بعض حضرات نے ذکر کیا ہے کہ شیخ محی الدین ابن عربی نے کہا ہے کہ اگرچہ یہ حدیث بطریق روایت صحیح نہیں ہے مگر ہمارے نزدیک بطریق کشف صحیح ہے، ابن النجم کہتے ہیں: کہ یہ روایت ادب دلیا والدين للماوردی میں بطریق سیدۃ عائشہ رضی اللہ عنہا موجود ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوال کیا گیا: من اعرف الناس بربه؟ فقال اعرافهم بنفسه، حوالہ کے لیے: التذكرة للزرکشی (ص: ۱۲۹) المقاصد الحسنہ للسخاوی (ص: ۲۱۹، حدیث: ۱۱۳۹) کشف الخفاء ۲/ ۳۶۵ (ص: ۲۵۳۲)، تمیز الطیب من الخبیث (۱۳۲۰) الا سرار المر فوعة (۵۰۶، ۹۳۷) الغماز علی اللماز للسمهودی (حدیث: ۲۸۹) الدرر المنتشرة للسیوطی (۳۹۳)، اللؤلؤ المصنوع (ص: ۸۶) الحاوی للفتاویٰ ۲/ ۲۱۲

”جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا، یقیناً اس نے رب کو بھی پہچان لیا، شرح فرماتے ہیں یعنی جس نے اپنے نفس کی فناء کو سمجھ لیا، اس نے یقیناً ذات باقی کی بقاء کو جان لیا۔ بعض نے کہا: جس نے اپنے نفس کو ذلت کے ساتھ جان لیا، اس نے اپنے رب کی عزت مان لی۔“
تو سب کا خلاصہ یہ ہوا کہ جو اپنے کو نہ جانے وہ کل کی معرفت سے محبوب ہے۔
ان تمام تشریحات سے مراد معرفتِ انسانیت ہے اور اس حقیقت میں محققین کے اختلافات پر بہت سے اقوال ہیں:-

۱۔ ایک جماعت کہتی ہے کہ انسان کی حقیقت سوائے روح کے کچھ نہیں ہے۔ یہ جسم تو محض اُس روح کے راہ و مکان ہیں یا اس کی آرام گاہ۔ تاکہ اس جسم میں رہ کر خللِ طبائع سے محفوظ رہے اور حس و عقل یہ صفات روح ہیں۔ مگر یہ تعریف بالکل باطل ہے۔

اس لیے کہ اگر روح کا نام انسان ہے تو جب جسم سے روح نکل جائے تو اسے انسان نہ کہنا چاہیے حالانکہ انسان کہتے ہیں۔ مردہ جسم سے نام انسان نہیں اٹھتا۔ مذکورہ اصول کے ماتحت جب تک اس مکان میں روح ہے انسان کہنا چاہیے مگر جب وہ روح پرواز کر جائے تو انسان نہ کہنا چاہئے۔ حالانکہ زندہ انسان جب تک بولا جاتا ہے جب تک اس میں روح ہے اور جب روح نہ رہے تو مردہ انسان کہلاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ رُوح قالبِ ستور (۱) یعنی گھوڑے میں بھی ہوتی ہے حالانکہ اُسے انسان نہیں کہا جاتا۔ اگر اسم انسان کی علت روح ہوتی تو یہ ضرور تھا کہ جہاں روح کا وجود ہوتا وہاں ہی اطلاق اسم انسان صحیح ہوتا۔ تو ثابت ہوا کہ مذکورہ قول بالکل باطل ہے۔

۲۔ ایک جماعت کہتی ہے کہ انسان روح و بدن پر یکجا واقع ہوتا ہے اور ایک دوسرے سے جدا ہوتا ہے تو پھر یہ نام ساقط ہو جاتا ہے۔ جس طرح ایک گھوڑے پر دو رنگ مجتمع ہوں ایک سیاہ ایک سپید تو اُسے ”اس“ کہتے ہیں اور اگر فقط سپید رنگ ہو تو سپید کہتے ہیں۔ یہ بھی قرآن کریم کے حکم کے ماتحت بالکل باطل ہے۔

جیسا کہ ارشاد ہے: ﴿هَلْ آتَى عَلَى الْإِنْسَانِ حِينٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكَورًا﴾ (۱)
”کیا انسان پر وہ وقت آیا ہے کہ جب کوئی شے مذکور نہ تھا۔“ حالانکہ آدمی بے جان مٹی کو بھی

۱۔ زُئْمٌ سَعُودَانِ دِرَانِ پَهِنِ دَشْتِ زَمِينِ شَمَشِ شَدِّ وَ آسْمَانِ گَشْتِ پَشْتِ
”ستور“ کا ترجمہ بعض مترجمین نے ”بیل“ کیا ہے حالانکہ ستور فارسی میں ”گھوڑے“ کو کہتے ہیں جیسا کہ ”سکندر نامہ“ کے شعر سے واضح ہے اور اگر ”ثور“ سمجھ کر ”بیل“ معنی کیے تو بھی غلط۔ اس لیے کہ یہ سین سے

انسان کہا گیا۔ با آنکہ ابھی تک اس کے قالب میں جان پیوستہ نہیں ہوئی۔

۳۔ ایک جماعت کہتی ہے کہ انسان ایک ”بجزو لا یتجزی“ ہے اور اس کا مقام دل ہے اور یہی قاعدہ اوصاف انسانی ہے حالانکہ یہ بھی محال ہے۔ اس لیے کہ اگر انسان کو مار ڈالیں اور اس کے اندر سے دل نکال لیں تو اسم انسان اس سے نہیں جاتا اور روح سے قبل بالاتفاق محققین قالب انسان میں دل نہیں ہوتا۔

۴۔ ایک جماعت جو متصوفہ سے ہے اسے بھی حقیقت حق کی تحقیق میں غلطی واقع ہوئی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ انسان آکل و شارب اور محل تغیر نہیں ہے۔ وہ درحقیقت اسرار الہی میں سے ایک سر ہے اور یہ جسم لباس انسانی ہے اس میں امتزاج طبع اور اتحاد جسد و روح ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ بالاتفاق جملہ عقلاء اسم انسان کا اطلاق مجانبین و کفار و فساق سب پر ہے اور ان کے اندر اسرار الہیہ کے معنی میں سے کچھ نہیں۔ سب کے سب متغیر آکل و شارب ہیں اور اس کے قالب اور وجود میں ایسی شخصیت مخصوص کہیں نہیں، جسے ان کی تعریف کے مطابق انسان کہا جائے۔

بلکہ حضرت رب العزت جل مجدہ نے انسان اس مجموعہ کا نام رکھا جس سے کہ انسان

مرکب ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ سَلْمَةٍ مِّنْ طِينٍ ۖ ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نُطْفَةً فِي قَرَارٍ مَّكِينٍ ۖ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظْمًا فَكَسَوْنَا الْعِظْمَ لَحْمًا ۖ ثُمَّ أَنشَأْنَاهُ خَلْقًا آخَرَ ۖ فَتَبَارَكَ اللَّهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ ۝﴾ (۱)

”اور بے شک ہم نے پیدا کیا انسان کو گندھی ہوئی صاف مٹی سے۔ پھر کیا ہم نے اس میں قطرہ منی کو ایک خاص جگہ ٹھہرنے والا۔ پھر کیا ہم نے نطفہ کو جما ہوا خون۔ پھر بنایا ہم نے جسے خون کو مضغہ گوشت۔ پھر بنائے ہم نے مضغہ سے ہڈیاں۔ پھر چڑھایا ہم نے ہڈیوں پر گوشت، پھر نشوونما فرمائی ہم نے دوسری پیدائش میں، تو بڑی برکت والا ہے اللہ تعالیٰ بہترین خالق ہے۔ تو حضرت رب العزت جل مجدہ نے جو اصدق الصادقین سے ہے، خاک سے اس صورت کو پیدا فرمایا اور جملہ تغیرات اس پر ہوئے مگر ہر زمانہ میں اس کا نام انسان ہی رکھا۔

چنانچہ ایک جماعت اہل سنت و جماعت کی کہتی ہے کہ انسان ”حسی“ ہے اور اس کی صفات محمودہ ایسی ہیں کہ موت اس اسم کو اس سے نہیں اٹھا سکتی۔ حتیٰ کہ صورت معبودہ اس اسم کو آلات موسوم ظاہر و باطن سے علیحدہ نہیں کر سکتی اور مراد صورت سے تندرستی و بیماری ہے اور آلات سے مراد موسوم انسان سے انسان کا مجنون و عاقل ہونا ہے۔

غرضیکہ با تفاق عقلاء انسان جس قدر صحت کی طرف ہوگا، کامل تر ہوتا چلا جائے گا اور مخلوق میں یہ سب سے کامل ہے۔ اب سمجھ لینا ضروری ہے کہ ترکیب انسانی جو کامل تر ہوتی ہے وہ محققین کے نزدیک تین معنی سے ہوتی ہے۔ (i) ایک روح (ii) دوسرے نفس (iii) تیسرے جسم۔ اور اس کے ہر عین میں ایک صفت ہوتی ہے جو اس عین کے ساتھ قائم ہے۔

چنانچہ روح کے لیے عقل اور نفس کے لیے ہوا اور بدن کے لیے حس۔ انسان نمونہ عالم ہے۔ اور عالم دو جہان کا نام ہے اور دونوں جہانوں کے نشانات کا مجموعہ انسان ہے۔ اس جہان کے نشان تو انسان میں پانی، خاک، ہوا، آگ ہے اور ان کی ترکیب بلغم، خون، صفرا، سودا سے ہے اور اس جہان کے نشان بہشت، دوزخ اور عرصاتِ محشر ہیں۔

تو جان بہشت کی بجائے اپنی لطافت سے بنتی ہے اور دوزخ کی بجائے نفس اور آفات وحشت ہو جاتے ہیں اور جسم بجائے عرصاتِ محشر کے ہے، اور عرصہ محشر میں جو جمال یار ہوگا وہ بھی دو معنی میں ہے۔ قہر کے ساتھ یا موانست کے ساتھ۔ تو بہشت نتیجہ رضاء دوست ہے اور دوزخ نتیجہ سخط و غضب یار ہے۔

اسی طرح روح مومن کو معرفتِ روح سے راحت ہے اور نفس کی وجہ میں حجاب و ضلالت۔ حتیٰ کہ مومن دوزخ سے اس وقت تک خلاصی نہ پائے گا اور بہشت نہ پہنچ سکے گا جب تک حقیقتِ رویت نہ پائے اور محبت کی صفائی کو حاصل نہ کر لے۔ اسی طرح جب تک بندہ دنیا میں نفس سے نجات نہ پائے۔ تحقیق ارادۃ تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس لیے اس کی قائدِ روح ہے اور جب تک تحقیق ارادۃ حاصل نہ ہو قربت و معرفتِ ذات کو نہیں پہنچ سکتا۔

تو خلاصہ یہ ہوا کہ جو دنیا میں اس ذات کو پہچان لے گا، غیروں سے اعراض کرے گا اور صراطِ شریعت پر قائم ہوگا تو قیامت کے دن دوزخ و پل صراط کو دیکھے گا۔

مختصر یہ کہ روح مومن وہ ہے کہ جس کو بہشت پکارتا اور بلاتا ہے، اس لیے کہ دنیا میں وہ نمونہ بہشت تھا، اور نفس وہ ہے کہ اس کو بلانے اور پکارنے والا دوزخ ہے۔ اس لیے کہ دنیا میں وہ نمونہ دوزخ تھا۔ تو مومن وہ ہے کہ جو کامل مدبر عقل ہے اور دوسرا وہ ہے جس کی قائدِ حرص و ہوی

ناقص ہے۔ تو ایک کی تدبیر صواب ہے، دوسرے کی تدبیر ناقص۔ اور محض خطا ہے۔ تو طالبِ درگاہِ احدیت پر واجب ہے کہ ہمیشہ مخالفتِ نفس کرے تاکہ اُس کی مخالفت سے روح اور عقل کو مدد ملتی رہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

فصل:

جو کچھ مشائخ کرام نے نفس کے بارے میں لکھا ہے، وہ یہ ہے:

حضرت ذوالنون مصری قدس سرہ فرماتے ہیں:

أَشَدُّ الْحِجَابِ رُؤْيَةَ النَّفْسِ وَتَدْبِيرَهَا.

”سخت ترین بندہ کا حجاب نفس کا دیکھنا ہے اور ان کی تدبیر کا اتباع۔“ اس لیے کہ

مطابقتِ نفس، مخالفتِ حق عزوجل ہے اور مخالفتِ حق تمام حجابوں کا سرچشمہ ہے۔

اور حضرت ابو یزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

النَّفْسُ صِفَةٌ لَا تَسْكُنُ إِلَّا بِالْبَاطِلِ.

”نفس ایک ایسی صفت ہے جسے سکون، بغیر باطل پرستی نہیں“ اور حق سے اس کی سیری

ہرگز نہیں ہوتی۔

حضرت محمد بن علی ترمذی قدس سرہ فرماتے ہیں:

تُرِيدُ أَنْ تَعْرِفَ الْحَقَّ مَعَ بَقَاءِ نَفْسِكَ فَيُكِّفُكَ وَنَفْسُكَ لَا تَعْرِفُ

نَفْسَهَا فَكَيْفَ تَعْرِفُ غَيْرَهَا.

”اگر تو چاہتا ہے کہ اپنے رب کو پہچانے اور نفس کو سلامت رکھے تو تجھ میں

تیرا نفس اپنے کو باقی رکھنے کی صورت میں تجھ کو نہیں پہچاننے دیتا۔ تو پھر تو غیر یا

ذاتِ باقی کو کیسے پہچان سکتا ہے۔“

یعنی جب تک تیرا نفس باقی ہے تجھے خود بخود مجبور رکھے گا اور جب تو مجبور ہوگا تو کس

طرح کشفِ جمال حاصل کر سکتا ہے۔

حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

أَسَاسُ الْكُفْرِ قِيَامُكَ عَلَى مُرَادِ نَفْسِكَ.

”کفر کی جڑ تیرا قیام ہے مراد مقصودِ نفس پر۔“

اس لیے کہ نفس کو لطیفہٴ اسلام سے مقارنت نہیں تو لامحالہ نفس ہمیشہ اعراضِ اسلام

پر کوشاں رہے گا اور معرضِ منکر ہوتا ہے اور جو منکر ہوتا ہے وہ بے گانہ ہوتا ہے۔

حضرت ابوسلیمان دارانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

النَّفْسُ خَائِنَةٌ بِالْأُلْفَةِ مَانِعَةٌ مِنَ الرِّضَاءِ وَأَفْضَلُ الْأَعْمَالِ خِلَافُهَا.

”نفس خائن ہے امانت ایمان میں اور مانع ہے اعمالِ صالحہ سے اور طلبِ رضا

کا مخالف ہے۔ لہذا بہترین اعمال سے مخالفتِ نفس ہے۔“

اس لیے کہ خیانتِ امانت میں مقتضی بیگانگی ہے اور ترکِ رضا اپنا گم کرنا اور تباہ ہونا ہے۔

علاوہ اس کے بہت سے مشائخِ کرام کے بہت سے ارشادات ہیں جن کا احصاء وحصرا اس مختصر میں

مشکل ہے۔ اب ہم اپنی مقصود کی طرف آتے ہیں اور مذہبِ سہل میں جو صحتِ مجاہدہٴ نفس وریاضت

پر بڑا ثبوت ہیں، وہ بیان کرتے ہیں۔ وباللہ التوفیق .

مجاہدہٴ نفس

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (۱)

”وہ لوگ جنہوں نے ہمارے معاملہ میں مجاہدہ کیا البتہ ہم انہیں اپنی راہ دکھا

دیں گے۔“

اور حضور ﷺ نے فرمایا:

الْمُجَاهِدُ مَنْ جَاهَدَ نَفْسَهُ فِي اللَّهِ. (۲)

اور فرمایا:

رَجَعْنَا مِنَ الْجِهَادِ إِلَّا صَغِيرًا إِلَى الْجِهَادِ الْأَكْبَرِ قِيلَ يَا رَسُولَ اللَّهِ

وَمَا الْجِهَادُ إِلَّا كَبْرُ قَالَ مُجَاهِدَةُ النَّفْسِ. (۳)

۱۔ سورۃ العنکبوت: ۶۹

۲۔ اسے امام اوزاعی نے مسند الشہاب ۱/۱۳۹ حدیث: ۱۸۳ میں بطریق عمرو بن مالک نقل کیا ہے اور ان

سے فضالہ بن عبید نے بیان کیا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر ارشاد

فرمایا۔۔۔ اس کے بعد خطبہ ذکر کیا ہے۔ الخ۔

مزید حوالہ کے لیے: مسند امام احمد بن حنبل (۲۰/۶، ۲۱، ۲۲) جامع الترمذی (۱۶۷۱) مسند

البخاری (۱۱۳۳)، کتاب المجر وحین لابن حبان (۲۵، ۱۶۲۳) المعجم الکبیر للطبرانی

(۱۷۹۶، ۷۹۷، ۱۸/، المستدرک للحاکم ۱/۱۰، ۱۱، سنن، ابن ماجہ (۲۹۳۳)

۳۔ امام سیوطی اسے ”الجامع الصغیر“ ۲/۸۵ میں اور امام غزالی احیاء علوم الدین ۳/۶ میں ان الفاظ

کے ساتھ لائے ہیں۔ ”قَدِمْتُمْ مِنَ الْجِهَادِ الْأَصْغَرِ إِلَى الْجِهَادِ الْأَكْبَرِ، مُجَاهِدَةُ الْعَبْدِ هَوَاهُ.“

”مجاہدہ کرنے والا وہ ہے جس نے اللہ کی راہ میں اپنے نفس کا مقابلہ اور اس کی مخالفت کی۔“

”کوٹے ہم چھوٹے جہاد یعنی غزوات سے بڑے جہاد کی طرف۔ صحابہ نے عرض کی: حضور بڑا جہاد کیا ہے۔ فرمایا نفس کا مقابلہ۔“

اس حدیث میں حضور ﷺ نے غزوات پر جہادِ نفس کی فضیلت ظاہر فرمائی اس لیے کہ نفس کے جہاد میں رنج زیادہ ہے اور وہ خواہشِ نفسانیہ کو دفع کرنا ہے اور جہادِ نفس یہ ہے کہ نفس کی خواہشات پر قابو کرنا۔

تو اب اچھی طرح یاد رکھو! خدا تمہیں عزت دین و دنیا عطا فرمائے! طریقِ مجاہدہِ نفسِ ظاہر اور واضح ہے اور تمام ادیان و ملل میں اسے پسند کیا ہے اور صوفیوں کے طریقہ میں مجاہدہِ نفس کا ملحوظ رکھنا مختصر ہے اور صوفیاء عوام و خواص مجاہدہِ نفس کو خاص طور پر لازم جانتے ہیں اور اس میں مشائخ کرام کے رموز اور ارشادات بہت زیادہ ہیں۔

حضرت سہل بن عبداللہ تستری رحمۃ اللہ علیہ اس مجاہدہِ نفس کو اصل اصول تصوف قرار دیتے ہیں اور اس میں خاص مبالغہ فرماتے ہیں اور دلائلِ مجاہدہ ان کے بہت زیادہ ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ حضرت سہل رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی یہ عادت بنا رکھی تھی کہ پندرہ روز بعد ایک بار کھانا تناول فرماتے اور اس قدر تکلیل غذا کرنے کے باوجود آپ کی عمر مبارک بہت طویل تھی۔ چنانچہ حضرت سہل رحمۃ اللہ علیہ نے بھی مشاہدہ کے لیے مجاہدہ کو علت فرمایا اور عرفانِ حق کی طلب کے لیے مجاہدہ کو خاص طور پر موثر قرار دیا ہے۔ حضرت سہل رحمۃ اللہ علیہ ایسی حیاتِ دنیا کو جو طلبِ مشاہدہ میں ہو، اس حیاتِ آخری پر جزاءِ عمل کے لیے ہے بہتر ہو بزرگ فرماتے ہیں۔ اس لیے کہ جزاءِ اس حیات کے اعمال کا ثمرہ ہے۔ تو جب حیاتِ دنیا میں عمل کرے گا تو عاقبت میں ثمرِ قرب پائے گا بغیر خدمتِ مجاہدہِ قربت حاصل نہیں ہو سکتی۔ تو انسان کو چاہیے کہ واصلِ بحق ہونے کی جو علت ہے یعنی مجاہدہ، اس میں اتنی سعی کرے جتنی اللہ تعالیٰ اُسے توفیق دے۔ الْمُشَاهِدَاتُ مَوَارِثُ الْمُجَاهِدَاتِ۔

”مشاہداتِ مجاہدوں کی میراث ہیں۔“

ایک کہتے ہیں کہ مجاہدہ وصولِ الی اللہ کی علت ہے، اس لیے کہ یہ تقربِ عطاءِ الہی سے ہے اور عطاءِ الہی کو کسی عمل اور مجاہدہ سے سروکار نہیں (۱)۔

تو مجاہدہ ضروری ہے تو صرف تہذیبِ نفس کی غرض سے، نہ کہ حقیقتِ قرب حاصل کرنے کے لیے۔ اس لیے کہ مجاہدہ کی طرف رجوع ہونا بندہ کی طرف سے ہے اور مشاہدہِ فضلِ الہی سے تو

اندریں صورت مجاہدہ کا سبب بننا مشاہدہ کے لیے محال ہے یا مجاہدہ آگے مشاہدہ بنے یہ بھی ناممکن۔
حضرت سہل رحمۃ اللہ علیہ اپنے دعوے کے ثبوت میں یہ آئیہ کریمہ پیش کرتے ہیں:

﴿وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا﴾ (۱)

”جن لوگوں نے ہمارے لیے مجاہدہ کیا یقیناً ہم انہیں اپنی راہیں دکھا دیں گے۔“

اور حقیقت واقعہ یہی ہے کہ جدوجہد مشاہدہ باری کرتا ہے وہ مشاہدہ حاصل کر لیتا ہے (۲) اور ورود جملہ انبیاء کرام علیہم السلام اور احقاق شریعت اور نزول کتب سماویہ اور بندوں کو مکلف احکام کرنا، یہ سب مجاہدہ ہے۔ اگر مجاہدہ علت مشاہدہ نہ ہو تو ان تمام امور کی حقانیت باطل ہو جاتی ہے۔ اور یہ بھی حقیقت واقعہ ہے کہ دین اور احوال عاقبت اور اس کے تمام احکام کسی علت کے ماتحت ہیں۔ تو جو علل احکام کی نفی کرتا ہے اس سے شرع اور رسوم سب اٹھ جاتی ہے۔ تو اصل میں مکلف باحکام ہونے کا ثبوت ہو گا نہ فرع میں۔

پھر ظاہر ہے کہ بھوک کے دفع کرنے کو کھانا اور کپڑا سردی گرمی دور کرنے کے لیے علت ہے اور نفی علت تمام معانی میں معلول کے معطل کرنے کو لازم ہے، تو افعال میں اسباب دیکھنا توحید ہے اور اس کا اٹھا دینا ترک افعال کرنا اور معطل ہو جانا ہے۔

چنانچہ مشاہدہ میں جو دلائل ہوتے ہیں تو دلائل کا انکار مشاہدہ کا انکار ہے اور صاف طور پر اسے ”مکابره“ کہا جاسکتا ہے۔ (مکابره کہتے ہیں اس گفتگو کو جس میں احقاق حق ملحوظ نہ ہو بلکہ اپنی شخصیت اور بڑائی دکھانی مطلوب ہو)

عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ سرکش گھوڑے کو ریاضت کرا کر اس کی بہیمیت دور کر دی جاتی ہے۔ ریاضت کے بعد وہی سرکش گھوڑا آدمی کی صفات حاصل کر لیتا ہے اور اس کی حیوانی اور بھیگی صفات انسانیت سے بدل جاتی ہیں۔

چنانچہ بعد ریاضت گھوڑا چابک اٹھا کر اپنے سوار کو دیتا ہے، پولو میں گیند اٹھا کر سوار کو دیتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ پھر ایک بے عقل جمبی لڑکے کو ریاضت کر کے عربی زبان میں ”فصح الفصحاء“ بنا لیتے ہیں اور اس کی گنوار زبان جو طبعی تھی ایسی بلیغ ہو جاتی ہے کہ باید و شاید۔

ایک وحشی جانور بعد ریاضت اتنا سدھا لیا جاتا ہے کہ جب اُسے چھوڑ دیا جائے اور جب بلاؤ فوراً آجائے۔ حتیٰ کہ اُسے وہ آزادی جو پہلے تھی، اب ریاضت کے بعد اس سے زیادہ قید پسند ہو جاتی ہے۔

۱۔ سورۃ العنکبوت: ۶۹،

۲۔ عربی میں ضرب المثل بھی ہے۔ مَنْ جَدَّ وَجَدَّ۔ جس نے کوشش کی پالیا۔ (از مترجم)

گندے کتے کو دیکھو کہ ریاضت و مجاہدہ کے بعد اس درجہ پر پہنچ جاتا ہے کہ اس کا مارا ہوا حلال ہو جاتا ہے اور بلا ریاضت و مجاہدہ کے اگر انسان بھی مارے تو وہ شرعاً حرام ہوتا ہے، وغیرہ وغیرہ۔ (۱)

تو ثابت ہوا کہ شرع اور رسم کا مدار بھی مجاہدہ و ریاضت پر ہے۔
پھر حضور سید یوم النشور ﷺ نے باوجود حصول قرب اور وصل مطلوب کے اور عاقبت کی طرف سے بے فکر کئے جانے کے اور عصمت و پاک دامنی محقق ہوتے ہوئے، دن بھر کی عبادتیں اور راتوں کی شب بیداریاں اس قدر زیادہ کیں جو مجاہدہ سے بھی آگے بڑھ گئیں۔ حتیٰ کہ قرآن کریم میں حکم باری تعالیٰ نازل ہوا: ﴿مَا أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْآنَ لِتَشْقَىٰ ۝﴾ (۲) ”اے محبوب ہم نے تم پر قرآن پاک اس لیے نازل نہیں فرمایا کہ آپ کو اس قدر مشقت میں ڈال دیں۔“

(نکتہ عجیبہ) طہ میں ط اور ہ جو ہے اس کے عدد باعتبار اعداد ابجد چودہ ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ ط کے عدد ۹ ہوتے ہیں اور ہ کے عدد پانچ۔ دونوں کو جمع کرنے سے ۱۴ کا عدد حاصل ہوتا ہے اور چودھویں رات کا چاند چونکہ کامل ہوتا ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب پاک ﷺ کو اپنے کرم خاص سے فرمایا: اے ہمارے ماہ کامل! ہم نے یہ قرآن تجھ پر مشقت بڑھانے کے لیے نازل نہیں فرمایا۔ (از مترجم)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جناب سرور عالم ﷺ تعمیر مسجد کے وقت پتھر اٹھا رہے تھے اور میں دیکھ رہا تھا کہ اس میں حضور ﷺ کو تکلیف ہو رہی ہے۔ میں نے عرض کی! حضور یہ خدمت میرے سپرد فرمادیجئے تاکہ حضور کی جگہ یہ کام میں کروں۔ حضور ﷺ نے فرمایا: خُذْ غَيْرَ هَا فَإِنَّهُ لَا عَيْشَ إِلَّا عَيْشُ الْآخِرَةِ. (۳) ”تم اور پتھر اٹھاؤ اس لیے کہ آرام دنیا کا کچھ نہیں، آرام تو آخرت کا ہے۔“ اور یہ مقام مشقت و ریاضت ہے۔

اور حبان بن خارجہ راوی ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا کہ غزوہ یعنی جہاد کے بارے میں کیا حکم ہے؟ فرمایا:

۱۔ جیسا کہ قرآن پاک میں ارشاد ہے۔ قُلْ أَجَلُ لَكُمْ الطَّيِّبَاتِ وَمَا عَلَّمْتُمْ مِنَ الْجَوَارِحِ مُكَلَّبِينَ تُعَلِّمُونَهُنَّ: ”فرمادیجئے کہ حلال کی گئیں تمہارے لیے پاک چیزیں اور جو شکاری جانور تم نے سدھالیے ہوں، انہیں شکار پر دوڑاتے ہو جو تمہیں علم خدا نے دیا ہے۔ (از مترجم)

۲۔ سورۃ طہ: ۲

۳۔ امام سخاوی نے اسے القاصد الحسنہ (ص ۹۱، حدیث: ۱۷۷) میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے طریق سے بیان فرمایا ہے۔

إِبْدًا بِنَفْسِكَ فَجَاهِدْهَا وَإِبْدًا بِنَفْسِكَ فَأَغْزُهَا فَإِنَّكَ إِنْ قَتَلْتَ
فَارًا بَعَثَكَ اللَّهُ فَارًا وَإِنْ قَتَلْتَ مُرَائِيًا بَعَثَكَ اللَّهُ مُرَائِيًا وَإِنْ
قَتَلْتَ صَابِرًا مُحْتَسِبًا بَعَثَكَ اللَّهُ صَابِرًا مُحْتَسِبًا.

”اپنے نفس کے ساتھ جہاد شروع کر اور پھر اپنے نفس سے ہی جنگ کر، اس لیے کہ اگر تو نے اسے قتل کر لیا، بھاگتے ہوئے تو اللہ تجھے بروز قیامت اس کے بھگانے والوں میں اٹھائے گا اور اگر تو نے اُسے قتل کیا دیکھ کر، قیامت کے دن اللہ تجھے نفس کی نگرانی کرنے والوں میں اٹھائے گا اور اگر تو نے اُسے قتل کیا صبر کر کے آخرت کے اجر کی امید پر، تو اللہ تجھے قیامت کے روز صابر و محتسب اٹھائے گا۔“

غرضیکہ جس قدر الفاظ و عبارات میں مجاہدہ کی تعریف کی گنجائش ہے اسی قدر مجاہدات کا اثر اصول تصوف میں ہے۔ جس طرح کہ یہاں عبارات اور تالیف بغیر تصریح کے مفید نہیں، ویسے ہی اصول تصوف میں مجاہدہ بغیر کسی قسم کا عمل درست نہیں اور جو اس کے سوا دعویٰ کرے وہ خاطی ہے۔ اس لیے کہ جہان اور اس کے حدوث کا ثبوت اس کے خالق کی معرفت پر دلیل ہے اور معرفت نفس اور اس سے مجاہدہ معرفت خدا کے لیے اصل الاصول ہے۔

اور وہ دوسری جماعت جو مجاہدہ کو سبب تقرب و عرفان نہیں مانتی اس کی یہ دلیل ہے کہ یہ آیت کریمہ باعتبار تفسیر مقدم موخر ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے: ﴿وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا﴾ (۱) اس کی تفسیر یوں ہے: ﴿وَالَّذِينَ هَدَيْنَا لَهُمْ سُبُلَنَا جَاهَدُوا فِينَا﴾ ”جنہوں نے ہماری راہ میں مجاہدہ کیا، ہم نے انہیں اپنی راہ دکھا دی۔“ یعنی جنہیں ہم نے راہ دکھائی، انہوں نے ہماری راہ میں مجاہدہ کیا۔ اور حضور ﷺ نے فرمایا: لَنْ يَنْجُوَ أَحَدُكُمْ بِعَمَلِهِ. (۲) ”کوئی تم سے

۱۔ سورۃ العنکبوت: ۶۹

۲۔ امام بخاری نے اسے اپنی صحیح ۷/ ۱۵۷ (کتاب المرضی) میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے: سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم يقول لا يدخل احد اعملة الجنة، قالوا: ولانت يا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، قال: ولا انا الا ان يتفمدنى اللہ بفضله ورحمة، فيسدوا و قاربوا، ولا يتمين احدكم الموت اما محسنا فلعله ان يزدا د خيرا، واما مسينا فلعله ان يستعب. اور اسی طرح امام بخاری ہی نے اپنی صحیح ۱۲۳/۸ (کتاب الرقاق) میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے طریق سے (بقیہ حوالہ اگلے صفحہ پر۔۔۔)

اپنے عملوں کے بدلہ نجات نہیں پاسکتا۔“ قِيلَ وَلَا أَنْتَ يَا رَسُولَ اللَّهِ. عرض کیا گیا اور حضور آپ بھی؟

قَالَ وَلَا أَنَا إِلَّا أَنْ يَتَغَمَّدَنِي اللَّهُ بِرَحْمَتِهِ. فرمایا ہاں! اور میں بھی نجات نہیں پاسکتا

مگر یہ کہ اللہ اپنی رحمت سے مجھے ڈھانپ لے۔ (۱)

تو معلوم ہوا کہ مجاہدہ و ریاضت بندہ کا فعل ہے اور یہ مجال ہے کہ بندہ کا فعل بندہ کی نجات کا سبب ہو۔ تو بندہ کی خلاصی اور نجات ارادت اللہ سے متعلق ہے نہ کہ مجاہدہ سے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿فَمَنْ يُرِدِ اللَّهُ أَنْ يَهْدِيَهُ يَشْرَحْ صَدْرَهُ لِلْإِسْلَامِ وَمَنْ يُرِدْ أَنْ يُضِلَّهُ يَجْعَلْ صَدْرَهُ ضَيِّقًا حَرَجًا﴾ (۲) ”جس کے ساتھ اللہ ارادہ فرمائے ہدایت کا، تو اس کا سینہ کھول دیتا ہے اسلام کے نور کی طرف اور جس کے ساتھ اللہ ارادہ فرمائے گمراہ کرنے کا، اس کا سینہ تنگ فرما دیتا ہے اور شکوک کی طرف مائل کر دیتا ہے۔“ اور یہ بھی فرمایا: ﴿تُوْتِي الْمَلِكَ مَنْ تَشَاءُ

(بقیہ حواشی گزشتہ صفحہ سے)

روایت کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سد دوا وقاربوا وا ابشروا ، فاله لا يدخل احدا الجنة عمله ، قالوا : ولا انت يا رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم ؟ قال : ولا انا الا ان يتغمدني الله بمغفرة ورحمة اور امام مسلم نے اپنی صحیح ۲۱۶۹/۳ (کتاب صفات المنافقین و احکامہم : باب لن يدخل احد الجنة بعمله) میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے طریق سے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے : لن ينجى احد منكم عمله الخ اسی طرح اسی حدیث کو مختلف الفاظ و عبارات کے ساتھ روایت کیا ہے اور وہ ساری روایات معنی کے اعتبار سے ایک ہیں ، (حوالہ کے لیے : مذکور باب کی حدیث نمبر ۱ سے ۷۸ تک کا مطالعہ کریں)۔ اسی طرح ابن ماجہ نے اپنی سنن (کتاب الزهد : باب التوقى على العمل ۱۴۰۵/۲ حدیث : ۴۲۱۰) میں روایت کیا ہے اور اس کے حسن اسناد ہونے کی طرف اشارہ کیا ہے ، اسی طرح امام بیہقی نے مجمع الزوائد میں ، امام دارمی نے اپنی سنن ۳۰۵/۲ (باب لا ينجى احدكم عمله) میں حضرت جابر سے روایت کیا ہے۔ امام احمد بن حنبل نے اسے اپنی مسند میں حضرت ابو ہریرہ ، حضرت ابوسعید خدری ، حضرت جابر بن عبد اللہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہم سے متقارب معنی الفاظ کے ساتھ اور تھوڑے اضافہ کے ساتھ پچیس مرتبہ روایت کیا ہے۔ حوالہ کے لیے :

مسند الامام احمد بن حنبل ۲۳۴/۲ ، ۲۵۶ ، ۲۶۴ اور الرسائل القشيرية (ص : ۳۲)

۱۔ یعنی کوئی نبی درجات نبوت بغیر معصوم نہیں اور منصب نبوت اللہ تعالیٰ کا سایہ رحمت ہے اور یہ سایہ ہر نبی پر چھایا ہوا ہے۔ بالخصوص حضور ﷺ کی ذات اقدس ہر لمحہ اپنا سایہ رحمت ہے کہ ذات اقدس مجسم رحمۃ اللعالمین ہے۔ از مترجم

۲۔ سورۃ الانعام : ۱۲۵

وَتَنْزِعُ الْمَلِكَ مِمَّنْ تَشَاءُ ﴿۱﴾ ”جس کو اللہ چاہے ملک ایمان عطا فرمائے اور جس سے چاہے مملکت ایمانی سلب فرمائے۔“ ان آیات سے اپنے ارادہ کے مقابلے میں مخلوق کے ارادہ اور مجاہدہ کی نفی فرمائی ہے۔ تو گویا اگر مجاہدہ ہی حصول اور قرب ذات کی علت ہوتا تو شیطان بڑا مردود نہ ہوتا اور اگر مجاہدہ قرب الہی سے رذ ہونے کی علت ہوتا تو آدم علیہ السلام ہرگز مقبول و مصطفیٰ نہ ہوتے۔

تو ہر معاملہ مسابقتِ الہیہ پر موقوف ہے نہ کہ کثرتِ مجاہدہ پر۔ جو زیادہ زہد و ریاضت کرنے والا ہے وہ مامونِ غضب جبار نہیں بلکہ جو مستحقِ عنایاتِ الہی ہے، وہی نزدیک تر ہے ذاتِ حق سے۔

ایک صومعہ میں مقرونِ اطاعت ہے مگر قربِ حق سے بعید و مردود ہے اور ایک رندِ خراباتی، مرتکبِ معاصی ہے، مگر ذاتِ حق سے نزدیک ہے۔ تو اب سب سے بہترین پہلو یہ ہے کہ جس کا ایمان قوی ہے وہی مقرب ہے اور بس۔ جو لڑکا مکلف باحکام نہیں اس پر حکم ایمان کا ہے اور ایک شخص مجنون ہے لیکن مجنون ہونا اس کے ایمان کے خلاف نہیں۔ اس پر بھی حکم ایمان کا ہوگا۔ تو سب سے بڑی چیز عطاءِ الہی ہے اور مجاہدہ و ریاضت ہرگز علتِ نجات و تقرب نہیں۔

اور میں (حضرت داتا گنج بخش علی بن عثمان الجلابی رحمۃ اللہ علیہ) کہتا ہوں کہ یہ سب چیزیں جو مذکور ہوئیں عبارت میں تو ٹھیک ہیں لیکن حقیقت معنی اس کے خلاف ہے۔ اس لیے کہ ایک کہتا ہے: مَنْ طَلَبَ وَجَدَ۔ ”جو طلب کرتا ہے پالیتا ہے۔“ دوسرا کہتا ہے: مَنْ وَجَدَ طَلَبَ ”جو پالیتا ہے وہ طالب ہو جاتا ہے۔“ تو کہیں پانا سبب طلب کا ہے۔ کہیں طلب کرنا سبب پانے کا کہا جاتا ہے۔ تو گویا ایک کے نزدیک مجاہدہ کرنے سے مشاہدہ ہوتا ہے۔ ایک کے نزدیک مشاہدہ کے بعد مجاہدہ کیا جاتا ہے۔

اور ان سب باتوں کی حقیقت یہ ہے کہ مجاہدہ، مشاہدہ میں بجائے توفیقِ اطاعت کے ہے اور وہ محض عطاءِ الہی ہے۔ تو جب حصولِ طاعت بے توفیقِ الہی محال ہے تو توفیق بھی بغیر اطاعت محال ہوگی۔ اور جب مشاہدہ بلا مجاہدہ موجود نہیں تو بے مجاہدہ مشاہدہ بھی محال ہوگا۔

تو ہر معاملہ میں لمعاتِ جمالِ جمیل کی ضرورت ہے تاکہ بندہ کو مجاہدہ کی راہنمائی ہو تو جب علتِ وجودِ مجاہدہ اس لمحہ کی تابانی کو ظاہر کر دے تو ہدایتِ حق مسابقت کرے گی مجاہدہ پر۔ لیکن جو جماعت سہل یہ حجت پیش کر رہی ہے کہ جو مجاہدہ کو سببِ مشاہدہ نہیں مانتا وہ جملہ انبیاء کرام و کتب و احکام شرائع کا منکر ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ تکلیف کا دار و مدار مجاہدہ پر رکھتی ہے۔ بہتر یہ تھا کہ

وہ تکلیف کا دار و مدار ہدایت حق پر رکھتی۔ اس لیے کہ ثبوت حجت کے لیے ہے نہ کہ حقیقت وصل کے واسطے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿وَلَوْ أَنَّا نَزَّلْنَا إِلَيْهِمُ الْمَلَكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتَىٰ وَحَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا مَّا كَانُوا لِلْيُؤْمِنُوا إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ وَلَكِنَّ أَكْثَرَهُمْ يَجْهَلُونَ﴾ (۱) ”اگر ہم فرشتوں کو ان کی طرف نازل فرمائیں اور مردے ان سے کلام کر لیں اور قبروں سے نکل آئیں اور سب چیزیں ان پر ظاہر ہو جائیں تو جب تک اللہ نہ چاہے وہ ایمان نہ لائیں گے اور ان میں سے اکثر جاہل ہیں۔“ کیونکہ علتِ ایمان ہماری مشیت ہے نہ کہ روایتِ دلائل اور ان کی کوشش۔ اور پھر فرمایا:

﴿إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَسَاءَ عَلَيْهِمْ أَنْ نَذِرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ﴾ (۲)

”وہ لوگ جو کافر ہیں، برابر ہے ان کے نزدیک اظہارِ حجت اور بیانِ دلائل ہوں قیامت اور ان سے اعراض اور ترک ہدایتِ ایمان والوں کے ساتھ وہ کبھی مومن نہ ہوں گے۔“

اس لیے کہ ان کے دلوں کو ہم نے مختوم بشقاوت کیا ہوا ہے۔

تو ورودِ انبیاء علیہم السلام اور نزولِ کتب اور ثبوتِ شرائع اسبابِ وصول الی اللہ ہیں نہ کہ علتِ وصول۔ اس لیے کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ مکلف باحکام اسی قدر تھے جس قدر کہ ابو جہل۔ مگر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ انصاف کی روشنی میں فضیلتِ خلافت پر پہنچ گئے اور ابو جہل جہالت کی تاریکی میں اس فضیلت سے محروم رہ گیا۔

تو وصول کی علت عین وصول ہے نہ وصول کی طلب۔ کیونکہ اگر طالب و مطلوب دونوں ایک ہوتے تو طالب واجد ہوتا اور جب طالب واجد ہوتا تو طالب نہ رہتا۔ اس لیے کہ رسیدہ آسودہ ہوتا ہے اور طالب پر آسودگی و آرام درست نہیں اور حضور ﷺ نے فرمایا: مَنْ اسْتَوَى يَوْمَئِذٍ فَهُوَ مَغْبُورٌ. (۳) ”جس کے دو روز مساوی گزریں وہ نقصان میں ہے۔“ اس لیے کہ طالب کا ہر

۲۔ سورۃ البقرۃ: ۶

۱۔ سورۃ الانعام: ۱۱۱

۳۔ اسے امام سخاوی نے المقاصد الحسنیة (ص: ۴۰۲، حدیث: ۱۰۸۰) میں، امام عجلونی نے کشف الخفاء ۲/۳۲۳ (حدیث: ۲۳۰۶) میں، امام سیوطی نے الدرر المنثورة (۳۷۷) میں، امام غزالی نے احیاء علوم الدین ۴/۳۲۶ میں اور امام زبیدی نے التحاف السادة المتقين، ۱/۱۵۰، ۱/۱۵۹، ۲۳۱/۹، ۶۲۸/۹، ۴۳۹/۱۰ میں نقل کیا ہے، ملا علی قاری نے الاسرار المرفوعہ، (۸۶۳) میں اس کے متعلق سوائے عبدالعزیز بن رواد کے خواب کے کچھ معلوم نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ انہوں نے خواب ہی میں مجھے اس کے بارے میں نصیحت کی اور آخر میں ان الفاظ کا اضافہ کیا: ومن لم یکن فی زیادة فهو فی نقصان، اسے امام بیہقی نے بھی روایت کیا ہے۔ (بقیہ حواشی اگلے صفحہ پر۔۔۔)

روز اول روز سے بہتر ہونا چاہیے۔ اور یہ درجہ طالبان کا طغریٰ امتیاز ہے۔ پھر ارشاد فرمایا:

اِسْتَقِيْمُوا وَلَنْ نُّحْصُوا. (۱)

”استقامت حاصل کرو مگر ایک حال پر۔“

نہ ہو تو مجاہدات کو سبب تو فرمادیا (مگر علت نہ بتایا) اور سبب کو تحقیق الہیہ کی وصولی سے الگ کیا اور جو یہ کہتے ہیں کہ ہم گھوڑے کو ریاضت مجاہدہ سے دوسری صفت کی طرف پھیر لیتے ہیں، اس کے متعلق یہ اچھی طرح یاد رکھو کہ گھوڑے میں ایک پوشیدہ صفت اطاعت و فرمانبرداری کی ہوتی ہے۔ اس کے ظاہر کرنے کے لیے ریاضت سبب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گھوڑا بغیر پھرائے اور ریاضت کرائے اپنی صفت باطنی کو ظاہر نہیں ہونے دیتا۔

لیکن گدھے میں یہ صفت نہیں، یہی وجہ ہے کہ وہ کسی ریاضت سے گھوڑا نہیں بن سکتا اور ریاضت سے گھوڑے کو گدھا نہیں بنا سکتے اس لیے کہ اگر ایسا ہو جائے تو ذات کا بدلنا مجاہدہ سے لازم آتا ہے۔

تو جو چیز عین ذات کو بدلنے پر قادر نہیں وہ حضور حق تعالیٰ میں اپنا اثر نہیں دکھا سکتی۔

(بقیہ حاشی گزشتہ صفحہ سے)

خطیب بغدادی نے القضاء العلم (ص: ۱۱۲) میں اسے سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔ اخیر نا ابن رزاق محمد بن احمد قال نا عثمان بن احمد، لنا محمد بن احمد ابن البراء لنا داؤد بن رشید، لنا انولید بن صالح، عن رجل قال: رایت النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فی النوم فقال لی: من استوی یوماہ فهو مغبون، ومن کان غدہ شر یومیہ فهو ملعون، ومن لم یعرف النقصان من نفسه فهو الی النقصان ومن کان الی النقصان فالموت خیر لہ۔ امام سخاوی نے المقاصد الحسنہ میں ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے: من استوی یوماہ فهو مغبون، ومن کان آخر یومیہ شر فهو ملعون، ومن لم یکن فی الزیادۃ فهو فی النقصان، ومن کان فی النقصان فالموت خیر لہ، ومن اشتاق الی الجنة سارع فی الخیرات، ومن اشفق من النار لہی عن الشهوات ومن ترقب الموت هانت علیہ الذات، ومن زهد فی الدنیا هانت علیہ المصیبات، امام ویلمی نے بطریق محمد بن سوقہ، حارث بن عبد اللہ الہمدانی الا عور سے اور انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے لیکن اس کی سند ضعیف ہے۔

۱۔ یہ امام احمد بن حنبل اور امام حاکم کی روایت کا ایک حصہ ہے۔ مکمل حدیث یوں ہے: استقیمو اولن تحصوا واعلموا ان خیرا عمالکم الصلاة ولا یحافظ علی الوضوء الا مومن، حوالہ کے لیے دیکھیں: مسند الامام احمد بن حنبل (۵/۲۷۷، ۲۸۲)، المستدرک للحاکم ۳۰/۱، کنز العمال

حضرت سہل بن عبد اللہ تستری رحمۃ اللہ علیہ پر مجاہدہ اتنا وارد تھا کہ وہ اس سے آزاد تھے اور ان کی ذات سے اس کا بیان منقطع تھا۔ یعنی وہ خالص مجاہد تھے نہ لسان یعنی زبانی خرچ کرنے والے۔ وہ اس گروہ کی طرح نہ تھے جس نے بغیر عمل اس عبادت کو مذہب بنا لیا اور یہ امر بھی محال ہے کہ عمل و اعتقاد صرف بیان پر موقوف ہو جائیں۔

مختصر یہ ہے کہ اہل طریقت کے لیے بالا تفاق مجاہدہ اور ریاضت لازمی ہیں لیکن مجاہدہ میں رویت مجاہدہ آفت ہے۔ تو جو مجاہدہ کی نفی کر رہا ہے اس سے عین مجاہدہ مراد نہیں ہے بلکہ رویت مجاہدہ مراد ہے تا کہ عجب و نخوت نہ پیدا ہو، اپنے عمل سے محل قدس میں، کیونکہ مجاہدہ فعل عبد ہے اور مشاہدہ کا وصول فعل معبود۔ تو جب تک خدا عز اسمہ کا وصل نہ ہو، فعل عبد کی کوئی قیمت ہی نہیں۔ خدا کی قسم! ایک دن تو خود انصاف سے کہے گا کہ باایں آراستگی و مشاطگی کے تو نے فضل حق نہ پایا اور اس پر تو اس قدر اپنے عمل کی تعالیٰ مار رہا ہے۔

تو خلاصہ یہ نکلا کہ اعمال و افعال محبوبانِ اہل ہوتے ہیں اور خود اس میں محض بے اختیار ہیں۔ صرف گزارش اور قہر بر نفس ان کا ہے اور گزارش تمام کی تمام نوازش ہے اور غافلوں کا مجاہدہ غافلوں کا ہر فعل ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افعال و اعمال میں بوجہ ان کے اختیار کے، تشویش و پریشانی اور پراگندہ دلی ہوتی ہے اور پراگندہ دلی کی آفت ان پر استیلا کرتی ہے۔ تو جہاں تک ہو سکے اپنے عمل کو اپنا فعل نہ بنا اور کسی حالت میں اتباع نفس و ہوئی نہ کر۔ اس لیے کہ تیرا وجود تیرے لیے ایسا حجاب ہے کہ اگر ایک فعل سے مجھوب ہوگا تو دوسری طرف کے فعل سے اٹھ جائے گا تو پھر جب تیرا تمام وجود ہی حجاب ہے تو جب تک کلیۃً فنا نہ ہو، شاہدہ بقا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ (۱) لَانِ النَّفْسَ كَلْبٌ بَاغٍ وَجِلْدُ الْكَلْبِ لَا يُطَهَّرُ اِلَّا بِالِدِّ بَاغٍ ”اس لیے کہ نفس ایک سرکش کتا ہے اور کتے کی جلد بغیر دباغت اور رنگائی کے پاک نہیں ہوتی۔“

ایک حکایت میں ہے کہ حضرت حسین بن منصور حلاج رحمۃ اللہ علیہ کوفہ میں محمد بن حسین علوی رحمۃ اللہ علیہ کے گھر جا کر اترے، اور حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ بھی کوفہ تشریف لائے۔ جب انہیں حضرت حسین بن منصور رحمۃ اللہ علیہ کی خبر پہنچی، خدمت میں تشریف لائے۔ حضرت منصور نے فرمایا: ابراہیم! آپ کو اس کوچہ طریقت میں رہتے ہوئے چالیس سال گزر گئے، اس میں آپ نے کیا چیز ایسی پائی جسے بالخصوص تسلیم کیا جائے۔ عرض کی: حضرت! مجھے تو سب سے بڑی چیز توکل نظر

۱۔ جیسا کہ حافظ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ (از مترجم غفرلہ)

حجاب چہرہ جاں می شود غبار تنم خوشادھے کہ زایں چہرہ پردہ ہر فنکم

آتی ہے۔

حضرت منصور نے فرمایا:

أَفْنَيْتَ عُمَرَكَ فِي عِمْرَانِ بَاطِنِكَ فَأَيْنَ الْفَنَاءُ فِي التَّوْحِيدِ.
 ”ابراہیم نے اپنی عمر باطن کی طرف سے ضائع کی، توحید میں فنا ہونا کب
 ہوگا۔“

یعنی توکل ایک عمل ہے جو اپنی طرف سے اپنے رب کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے۔ جس کا مقصد یہ ہے کہ اللہ کی محبت میں اللہ کے ساتھ پردہ غیب سے ظہور میں آئے، اس پر بھروسہ رکھنا۔ تو جب تمام عمر معالجتِ باطنی میں گزار دی تو اب وہ ایک دوسری عمر کی ضرورت ہے جس میں علاج ظاہر کیا جائے۔ اس لیے کہ اس طرز عمل میں تو تقرب حق کے بعد بھی حاصل نہیں ہوتی۔

حضرت شیخ ابوعلی سیاہ مروزی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے نفس کو دیکھا، اپنی صورت کے مماثل کہ کسی نے اس کے بال پکڑ رکھے ہیں۔ جب میں نے اُسے دیکھا تو اس شخص نے وہ بال میرے ہاتھ میں دے دیئے۔ میں نے اسے درخت سے باندھ کر مارنے کا عزم کیا تو نفس مجھ سے بولا: اے ابوعلی! محنت نہ کرو، میں شکر الہی سے ہوں، تم مجھے مٹا نہیں سکتے۔

حضرت محمد بن علیان نسویؒ سے مروی ہے، یہ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ کے بڑے مصاحبوں میں سے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ مجھے ابتداء میں ہی آفاتِ نفس پر آگاہی ہو چکی تھی اور میں نے اپنے کنجِ قلب میں اس کی کمین گاہ معلوم کر لی تھی۔ مجھے اس سے سخت دشمنی تھی۔ ایک دن بلی کی صورت میں کوئی چیز میرے حلق سے نکلی۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے اس کی شناخت کرائی۔ میں نے جانا کہ یہ نفس ہے۔ میں نے اُسے زمین پر ڈال کر لاتوں سے روندنا شروع کر دیا۔ مگر جوں جوں میں اُسے لاتیں مارتا تھا توں توں وہ بڑھتا جاتا تھا۔ میں نے کہا: او خبیث! ہر چیز مار پیٹ سے گھٹتی ہے تو کس لیے بڑھ رہا ہے: نفس بولا۔ حضرت! میری آفرینش مخلوق کے برعکس ہے۔ جو چیزیں آپ کے لیے رنج دہ ہیں میرے لیے وہ موجبِ راحت ہیں اور جو چیزیں آپ کے لیے سببِ راحت ہیں میرے لیے موجبِ رنج ہیں۔

حضرت ابوالحسن شتقانی رحمۃ اللہ علیہ امام وقت گزرے ہیں۔ فرماتے ہیں: میں ایک رات اپنے گھر آیا۔ ایک چھوٹا سا کتا زرد نظر آیا کہ ایک جگہ سو رہا ہے۔ میں سمجھا کہ محلہ میں سے کسی طرح یہاں آکر سو گیا ہے۔ میں نے اُسے نکالنا چاہا تو وہ میرے دامن کے نیچے آیا اور غائب ہو گیا۔

حضرت ابوالقاسم گرگانی رحمۃ اللہ علیہ جو آج کے دن قطبِ مدار ہیں اَبْقَاهُ اللَّهُ تَعَالَى،

وہ اپنے ابتدائی حالات سناتے ہوئے فرماتے ہیں کہ میں نے نفس کو سانپ کی شکل میں دیکھا۔ ایک اور بزرگ فرماتے ہیں کہ میں نے نفس کو چوہے کی صورت میں دیکھا۔ میں نے کہا: تو کون ہے؟ کہنے لگا میں غفلوں کی ہلاکت ہوں۔ اس لیے کہ برائی کی طرف بلانے والا اور شر و سوء کا داعی میں ہوں اور محبوبانِ خدا کے حق میں نجات ہوں، اس لیے کہ میرا وجود آفت ہے، اگر میں محبوبانِ خاص کے ساتھ نہ ہوتا تو وہ اپنی پاک بازی پر مغرور ہو جاتے اور اپنے اعمال پر تکبر کرتے کیونکہ جب وہ دلوں کی پاکی اور اسرار کی صفائی اور ولایت کے انوار اور اطاعت پر استقامت دیکھتے ہیں تو ہوئی و حرص ان میں پیدا ہو جاتی ہے اور جب مجھے دونوں پہلوؤں پر دیکھتے ہیں تو ان کے تمام عیوب فنا ہو جاتے ہیں اور وہ ہر عیب سے پاک ہو جاتے ہیں۔ یہ تمام باتیں اس امر پر دلیل ہیں کہ نفس ایک عین ہے نہ کہ صفت اور اس نفس کے لیے صفت علیحدہ ہے اور ہم صرف نفس کی صفتوں کا مشاہدہ کرتے ہیں۔

حضور ﷺ نے فرمایا:

أَعْلَىٰ عَدُوِّكَ نَفْسُكَ الَّتِي بَيْنَ جَنْبَيْكَ. (۱)

”تیرا سب سے بڑا دشمن تیرا نفس ہے جو تیرے پہلو میں ہے۔“

تو جب معرفتِ نفس حاصل ہو گئی تو سمجھ لے کہ اب اسے ریاضت و مجاہدہ سے اپنے قبضہ میں لاسکے گا۔ لیکن نفس کا مایہ اور اس کی اصل نابود نہیں ہو سکتی۔ لیکن جب نفس کی شناخت صحیح ہو جاتی ہے، تو طالبِ حق کو اس کے باقی رہنے سے خوف نہیں ہوتا۔ لَانِ النَّفْسَ كَلْبٌ نَبَاحٌ وَاُمْسَاكُ الْكَلْبِ بَعْدَ الرِّيَاضَةِ مُبَاحٌ. ”اس لیے کہ نفس ایک بھونکنے والا کتا ہے اور ریاضت و اصلاح کے بعد کتے کا باندھ رکھنا مباح ہے۔“ تو مجاہداتِ نفس فناءِ اوصافِ نفس کے لیے ہیں، نہ کہ اس کے عیب کو فنا کرنے کے لیے۔

اگرچہ مشائخِ کرام رضی اللہ عنہم نے اس بحث میں بہت کچھ فرمایا ہے لیکن بخوفِ طوالت کتابِ اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔ اب حقیقتِ ہوی اور ترکِ شہوات میں بیان شروع کرتے ہیں۔

حقیقتِ ہوی

قارئین! اللہ تمہیں عزت عطا فرمائے۔ اچھی طرح سمجھ لو کہ ہوا ایک جماعت کے نزدیک اوصافِ نفس میں ایک صفت کا نام ہے اور ایک گروہ کے نزدیک ہوی اس ارادہ کا نام ہے جو نفس

۱۔ اسے امام بیہقی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے طریق سے کتاب الزہد میں اور امام غزالی نے احیاء علوم

الدین (۱۱۴/۳) میں روایت کیا ہے۔

میں مدبر اور متصرف ہے، جیسے عقل روح سے اور ہر وہ روح جس میں عقل سے کوئی قوت نہ ہو وہ ناقص ہے اور ہر وہ نفس کہ اس میں ہوا کی کوئی قوت نہ ہو وہ بھی ناقص ہے۔

تو نقص روح قربت ہے اور نقص نفس عین قربت، اور ہمیشہ ہر بندہ کے لیے عقل اور ہوا کی طرف سے دعوت رہتی ہے۔ لیکن جو عقل کی دعوت کا پیرو ہو وہ ایمان حاصل کر لیتا ہے اور جو ہوا کی دعوت قبول کر لے وہ گمراہی اور کفر پر ہو گیا۔ تو ہوا واصلین کے لیے حجاب ہے اور مختوشوں، نامردوں کے حق میں ان کا بجا و ماویٰ ہے۔

طالب اس جگہ سے ہمیشہ اعراض کرتے ہیں اور بندہ مخالف نفس پر مامور ہے اور خواہشات نفس کا مرتکب مجرم ہے۔ لَآنَ مَنْ رُكِبَهَا هَلَكَ وَمَنْ خَالَفَهَا مَلَكَ۔ ”اس لیے کہ جو نفس کی پیروی پر لگ گیا ہلاک ہو گیا اور جس نے اس کے خلاف کیا وہ ملکی صفات کو پہنچ گیا۔“ جیسا کہ حضرت رب العزت جل مجدہ نے فرمایا: ﴿وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوَىٰ﴾ (۱) ”جو اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے سے خائف رہا اور نفس کو اس کی خواہش و ہویٰ سے منع کرتا رہا۔“ ﴿فَإِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَأْوَىٰ﴾ (۲) ”اس کے لیے جنت آرام گاہ ہے۔“ حضور ﷺ نے فرمایا: أَخَوْفُ مَا أَخَافُ عَلَىٰ أُمَّتِي إِبْتِغَاءَ الْهَوَىٰ وَطُولُ الْأَمَلِ (۳) ”میری امت پر سب سے زیادہ خوفناک امر اتباع ہویٰ و حرص اور امید طویل ہے۔“

اور حضرت سید المفسرین ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں: رَأَى الْهَوَىٰ إِلَٰهًا مَعْبُودًا ”یعنی کیا تو نے نہیں دیکھا اس کو جس نے اپنی خواہش نفس اور ہویٰ و حرص کو معبود پکڑا۔“ یعنی وہ شخص جس کا خدا اور معبود ہوا ہے اور شب و روز اس کی ہمتیں اپنی ہویٰ کے پورا کرنے میں صرف ہو رہی ہیں ان پر صرف افسوس ہے۔ اور ہویٰ کی دوستیں ہیں: ایک ہوائے لذت و شہوت، دوسری ہوائے جاہ و ریاست۔ وہ شخص جو متبع ہوائے لذت و شہوت ہے وہ شغل خرابات کے لیے شراب خوری اور قمار خانہ میں ہے۔ اس سے مخلوق ہر قسم کے فتنہ کی طرف سے مامون ہے اور وہ جو متبع جاہ و ریاست ہے

۱۔ سورۃ النازعات: ۴۰

۲۔ سورۃ النازعات: ۴۱

۳۔ حوالہ کے لیے ملاحظہ کیجیے: العلیل المتناہیة ۳۲۸/۲، فتح الباری ۲۳۲/۱۱ صحیح البخاری

۱۱۰/۸ (باب الرقاق)، مشکاة المصابیح (ص ۴۴۴)، تخریج إحياء العلوم للعراقی

۳۵۳/۴، سراج الطالبین للکدیری ۴۲۷/۱، لہج البلاغہ ۷۲/۱ (شرح محمد عبدہ)

۴۔ سورۃ الجامیۃ: ۲۳۔

وہ صوامع اور دیر میں عجلت نشینی کرتا ہے۔ اس کا فتنہ خلق لازمی ہے کہ اپنے کو راہ ہدایت سے گرا کر مخلوق کو گمراہ راستہ پر بلا رہا ہے۔ فَتَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنْ مُتَابَعَةِ الْهُوٰی۔ تو جس کی تمام حرکات میں حرص و ہوا اور اتباع ہوا کی عین رضا، وہ خواہ آسمان پر ہی کیوں نہ پرواز کرے تقرب حق سے بعید و محروم رہے گا ☆ اور وہ جس کو ہوا و حرص سے برأت ہو اور اس کی اتباع سے اعراض، وہ اگرچہ بت خانہ میں کیوں نہ ہو مقرب بحق تعالیٰ ہوگا۔

حضرت ابراہیم خواص رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے سنا کہ روم میں ایک راہب ستر سال سے رہبانیت میں گرجا گھر کے اندر بیٹھا ہوا ہے۔ میں نے کہا کہ تعجب ہے کہ رہبانیت کی انتہائی مدت چالیس سال ہے، یہ کس لیے ستر سال سے اس گرجا میں پڑا ہوا ہے۔ میں نے اس سے ملنے کا ارادہ کیا۔ جب اس کے پاس پہنچا تو اس نے دریچہ کھول کر مجھ سے کہا: ”ابراہیم! مجھے معلوم ہے جس کام کے لیے تم میرے پاس آئے ہو۔ میں ستر سال سے اس جگہ رہبانیت کے لیے نہیں بیٹھا ہوں بلکہ میرے پاس ایک کتا ہے جو حرص و ہوا سے شوریدہ ہے۔ میں اس جگہ اس لیے بیٹھا ہوں کہ اس کتے کی نگہبانی کروں اور اس کے شر سے لوگوں کو دور رکھوں۔ ورنہ میں وہ نہیں جو تمہارا اتنا بڑا اعتراض اپنے اوپر آنے دیتا۔“

جب میں نے اس سے یہ بات سنی تو میں نے بارگاہ الہی میں عرض کی کہ مولا تو قادر علی الاطلاق ہے کہ اس راہب کو اس کی عین ضلالت میں طریق صواب و راست عطا فرمائے (۱) راہب مجھ سے کہنے لگا، ابراہیم! کب تک لوگوں کو ڈھونڈے گا، جا اپنے آپ کو تلاش کر، جب تو اپنے آپ کو پالے گا تو اسی کی نگرانی کر، کیونکہ ہر روز یہ ہوا کا کتا تین ساٹھ بار لباس الوہیت پہن کر بندہ کو گمراہی کی طرف بلاتا ہے۔

اور یہ حقیقت واقعہ ہے کہ جب تک بندہ کے باطن قلب میں معصیت کی جرأت نہ ہو، ہوئے معصیت ظاہر نہیں ہوتی اور جب ہوئے عصیاں ظاہر ہو جاتی ہے تو شیطان اُسے اپنے جال میں لے کر انواع و اقسام کی دلاویز معصیت کی طرف لاتا ہے اور اس کے دل میں اپنی ظلمت کی تجلی کرتا ہے اور اسی کو وسوسا کہتے ہیں۔

☆ بقول شخصے ہم تو ڈوبے ہیں صنم تم کو بھی لے ڈوبیں گے۔

۱۔ رہبانیت مذہب عیسوی میں تارک دنیا ہونے کو کہتے ہیں اور وہ ترک دنیا اتنے مبالغہ کا ہوتا ہے کہ اس کی ممانعت حضور ﷺ نے ہر مسلمان کو فرمائی اور حکم دیا: ”لا رہبالیۃ فی الاسلام“۔ اسلام میں عیسائیوں کی سی ترک دنیا نہیں۔

تو ابتداءِ معصیت ہوئی سے ہوتی ہے۔ وَالْبَادِي أَظْلَمُ ”اور ابتدا کرنے والا بڑا ظالم ہے“ اور اسی حقیقت کو فرمانِ الہی میں ظاہر کیا ہے، جب کہ ابلیس نے جناب باری میں عرض کی کہ اب میں تیرے بندوں کو اغوا کروں گا تو ارشاد ہوا: ﴿إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَنٌ﴾ (۱) ”تجھے میرے خاص بندوں پر کچھ غلبہ حاصل نہیں ہو سکتا“ تو ثابت ہوا کہ شیطان درحقیقت نفس اور بندہ کی ہوئی ہے۔

اس لیے سرورِ عالم ﷺ نے فرمایا: مَا مِنْ أَحَدٍ إِلَّا وَقَدْ غَلَبَهُ الشَّيْطَانُ إِلَّا عُمَرُ فَإِنَّهُ غَلِبَ شَيْطَانَهُ (۲) ”تم میں سے کوئی نہیں مگر یقیناً شیطان اس پر غالب ہے مگر عمر فاروق رضی اللہ عنہ کہ وہ شیطان پر (یعنی اپنی ہوئی پر) غالب ہیں۔“

تو یہ امر واضح ہے کہ ہوئی و حرص اور شہوات ابنِ آدم کی طینت و سرشت میں داخل ہیں اور اس کی راحت و جان ہو چکی ہیں۔ چنانچہ حضور سید یوم النور ﷺ نے یہ بھی ارشاد فرمایا: الْهَوَى وَالشَّهْوَةُ مَعْجُونَتَانِ بِطِينَةِ ابْنِ آدَمَ. (۳) ”حرص و ہواے اور شہوت، ابنِ آدم کی طینت میں گوندھی گئی ہے۔“

تو ہمیشہ یاد رکھو! ترکِ ہوئی بندہ کو امیر کرتی ہے اور اس کا اتباع اسیر بناتا ہے۔ جیسا کہ حضرت زلیخا نے اولِ ہوئی کے اتباع کا ارتکاب کیا، امیر تھی، اسیر ہو گئی۔ یوسف علی نبینا وعلیہ السلام نے ترکِ ہوئی فرمایا: اسیر تھے، امیر ہو گئے۔ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا گیا: مَا الْوَصْلُ قَالَ تَرَكَ ارْتِكَابِ الْهَوَى. ”وصل کیا ہے۔ کہا ہوئی کے اختیار کرنے کی ترک۔“ جو یہ چاہتا ہے کہ وہ وصلِ جمیل کے ساتھ اپنے کو معظم و اکرام بنائے وہ کیا کرے۔ فرمایا! اس سے کہہ دو

۱۔ سورۃ بنی اسرائیل: ۶۵

۲۔ یہ الفاظ تو نہیں ملے لیکن اس کے ہم معنی روایات موجود ہیں۔ ان میں سے ایک وہ طویل حدیث ہے جو حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے ان الفاظ کے ساتھ مروی ہے: ایہ یابن الخطاب، والذی نفسی بیدہ مالقیک الشیطان سالکا فجاء فط الا سلك فجاء غیر فجک. یہ بھی متفق علیہ روایت ہے اور حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا سے بھی ایک طویل حدیث ان الفاظ کے ساتھ مروی ہے: ان الشیطان لیخاف منک یا عمر اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت کردہ حدیث کے الفاظ یہ ہیں: وانی لا نظر الی شیاطین الجن والانس قد فروا من عمر (مشکاۃ المصابیح ۳/۳۰۳، ۱۷۰۵/۳) ۳۔ امام سیوطی نے اسے اللالی المصنوعہ (ص: ۶۶) میں بطریق ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ ان الفاظ کے ساتھ مرفوعاً روایت کیا ہے: الهوی والبلاء والشهوة معجونة بطین آدم۔ مزید حوالہ کے لیے: العلیل المتناهیة لابن الجوزی ۳/۲۸۹، تنزیہ الشریعہ ۲/۳۹۳، میزان الاعتدال ۱/۹۰.

کہ ہوائے تن کی مخالفت کرے، اس لیے کہ پہاڑ کا ناخن سے کھود ڈالنا اس سے آسان ہے کہ مخالفت ہوائی کرے۔

ایک حکایت میں ہے جو حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے۔ فرماتے ہیں: میں نے ایک شخص کو دیکھا کہ ہوا پر اڑ رہا ہے۔ میں نے اس سے پوچھا یہ درجہ کس عمل کے بدلے میں پایا۔ بولا: میں نے حرص و ہوائی کے راستے پر قدم نہ رکھا تو ہوا میں اڑ رہا ہوں۔ حضرت محمد بن فضل بلخی رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ فرمایا مجھے اس شخص پر تعجب ہے کہ قبیح ہوائی ہو کر جمال جمیل حاصل کر رہا ہو۔ (اگر وہ طالب جمیل حقیقی ہے تو) ہوا پر اپنا قدم کیوں نہیں رکھتا کہ مقصود تک پہنچے اور دیدارِ یار حاصل کرے اور نفس کی زیادہ ظاہر جو صفت ہے وہ شہوت ہے، اور شہوت ان کی ایسی قوت کا نام ہے جو اجزائے جسم میں پراگندہ ہے اور تمام حواس اس کے ساتھ ہیں اور بندہ ان کی نگہبانی پر مکلف ہے اور انسان ہر حس کے فعل کے ساتھ مسئول ہے۔

آنکھ کی شہوت دیکھنا ہے اور کان کی شہوت سننا اور جسم کی شہوت چھونا اور دل کی شہوت سوچنا تو طالب کے لیے لازم ہے کہ اپنی شہوات پر نگہبان اور حاکم ہو اور رات دن اسی کی نگرانی و نگہبانی میں گزارے تاکہ وہ دوائی ہوائی جو حواس میں پیدا ہوتے ہیں از خود منقطع ہو جائیں اور اپنے رب حقیقی سے دست بدعا رہے کہ وہ تجھے ایسی صفت پر قائم کر دے کہ ایسے ارادے اور وساوس تیرے باطن قلب سے مدفوع ہو جائیں۔

اس لیے کہ جو شخص اس شہوت و ہوائی کی دلدل میں پھنس گیا، وہ تمام وصال و جمال سے محجوب ہو گیا۔ تو اگر بندہ اس کو بتکلف اپنے سے دفع کرتا ہے تو اس کا رنج و محنت دراز ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہ اجناس ہوائے شہوت کا ورود متواتر جاری ہے۔ لیکن اس ارادہ اور اس طرح دفع کرنے کا جو طریقہ ہے وہ مسلم و مقبول ہے اور بعد کامیابی ضرور مراد حاصل ہوتی ہے۔

حضرت ابوعلی سیاه مروزی رحمۃ اللہ علیہ سے ایک حکایت ہے: فرماتے ہیں میں حمام میں گیا ہوا تھا اور سنت کے مطابق استرہ لے رہا تھا کہ دل میں خیال آیا کہ یہ عضو منبع شہوت ہے اور یہی تجھے آفتوں میں مبتلا رکھتا ہے، اسے اپنے آپ سے جدا کر دے تاکہ شہوات سے آزادی مل جائے کہ غیبی ندا آئی کہ اے ابوعلی! ہماری ملکیت میں تصرف تو کرتے ہو لیکن ہماری موزوں کی ہوئی دنیا سے جسم سے کسی عضو سے دوسرا عضو اولیٰ تر نہیں ہے، ہماری عزت و جلال کی قسم! اگر تم نے یہ عضو اپنے سے جدا کر دیا تو تمہارے ہر بن مومنین اس موجودہ شہوت میں سوگنا شہوت اور ہوائے نفسانی رکھ دیں گے۔ اسی مضمون کی تائید میں کسی نے خوب کہا ہے:

أَلَا يَا حَسَّانُ دَعِ إِحْسَانَكَ اَتْرُكْ بِنَحْشِ اللَّهِ بَادَ نَجَانِكَ

ترجمہ: ”اے حسان! چھوڑ اپنا احسان اور ترک کر اللہ تعالیٰ کی قوتِ باطن کے ساتھ اپنے باذنجانِ جسم کے تصرف کو۔“

غرضیکہ بندہ کو جسم کے خراب کرنے کی ولایت حاصل نہیں اور کسی قسم کے تصرف کا اُسے حق نہیں پہنچتا لیکن تبدیلی صفت میں بتوفیقِ الہی اُسے اختیار ہے اور وہ احکام کی تسلیم اور اپنی قوتِ ارادی سے بہتری حاصل کر سکتا ہے کہ یہ صفتیں کیسی ہیں۔

درحقیقت جب تسلیمِ امر کی توفیق ہوگئی، عصمت حاصل ہوگئی اور عصمتِ الہی بندہ کو حفظ اور فنا کے نزدیک تر کر دیتی ہے کہ یہ مجاہدہ ہے۔ لَإِنَّ نَفْسَ الدُّبَابِ بِالْمِكْنَسَةِ أَيْسَرُ مِنْ نَفْسِهَا بِالْمَذْبِئَةِ۔ ”یعنی مکھی کو جھاڑو سے دور کر دینا آسان ہے بہ نسبت اس کے کہ اُسے اشارے سے دور کریں جو مکھی بیٹھنے کے وقت اشارہ کرتا ہے۔“ تو محافظتِ حق تمام آفات کو زائل کرنے والی اور تمام علتوں کو دفع کرنے والی ہے اور بندہ کو اس کے ساتھ کسی صفت میں مشارکت نہیں سوائے اس کے کہ بندہ کو جتنا اختیار و تصرف عطا فرمایا ہے وہ ظاہر ہے مگر اس کی ملکیت میں تصرف نہیں۔ جب تک اس کی تقدیر میں عصمتِ حق نہ ہو بندہ اپنی کوشش سے کسی مقدر سے بچ نہیں سکتا۔ اس لیے کہ کوشش بظاہر قوتِ الہی کوشش ہے۔ یعنی جب تک بجانب اللہ بندہ کو قوت عطا نہ ہو، کوئی کوشش اُسے سود مند نہیں اور قوتِ طاعت کوشش سے حاصل ہونے کی بجائے ساقط ہو جاتی ہے اور ہر قسم کی کوشش و قوت دو جگہ کوئی حیثیت رکھتی ہیں: یا تو اتنی کوشش و جہد کرے کہ تقدیرِ الہی اس کے لیے بدل جائے یا خود تقدیرِ الہی کے خلاف کسی قوت کو حاصل کرے اور ظاہر ہے کہ یہ دونوں ناممکن ہیں۔ یعنی کوشش سے تغیرِ تقدیر ہرگز نہیں ہو سکتا اور کوئی کام بغیر تقدیر کے وجود میں نہیں آ سکتا۔

اس کی تائید میں ایک واقعہ ہے کہ شبلی رحمۃ اللہ علیہ بیمار ہو گئے۔ آپ کی خدمت میں طبیب حاضر ہوا۔ عرض کرنے لگا: حضور پرہیز کریں۔ آپ نے فرمایا: کس چیز سے پرہیز کروں؟ اس سے جو اللہ تعالیٰ نے میرے لیے روزی میں مقدر فرما دیا ہے، یا اس سے جو میرے لیے مقسوم ہی نہیں ہے۔ تو اگر اس سے پرہیز کرانا چاہتا ہے جو میری قسمت میں مقدر ہے تو اس کی قوت مجھ میں نہیں اور اگر اس سے پرہیز کرانا چاہتا ہے جو میرے لیے روزی میں مقسوم نہیں تو وہ مجھے پہلے ہی نہیں مل سکتی۔ لَإِنَّ الْمُشَاهِدَ لَا يُجَاهِدُ۔ ”جس کو خدا نے مشاہدہ عطا فرمایا ہے وہ مجاہدہ نہیں کرتا۔“ اب اس مسئلہ کو باحتیاط تمام ان شاء اللہ دوسری جگہ بیان کیا جائے گا۔

فرقہ حکیمیہ

فرقہ حکیمیہ کا تعلق حضرت ابو عبد اللہ بن علی الحکیم ترمذی رضی اللہ عنہ سے ہے۔ یہ اپنے وقت کے یکتا امام گزرے ہیں اور تمام علوم ظاہری و باطنی میں فرد تھے۔ آپ کی بہت سی تصنیفات ہیں۔ آپ کا کلام اور طریق عمل ولایت و تصوف کے رنگ میں تھا اور اولیاء کملہ صوفیاء کے مراتب کی خاص رعایت رکھتے تھے اور آپ کے مضامین میں بڑے بڑے عجوبہ مضمون مذکور ہیں۔ آپ کے اصول میں کشف ابتدائی درجہ میں ہے اور بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ایسے دوست بھی دنیا میں ہیں کہ انہیں اللہ تعالیٰ نے مخلوق سے برگزیدہ فرمایا ہے اور ان کی ارادت و خواہشات سب ان سے قطع کر کے اپنے قبضے میں کر لیے ہیں اور ان کے دعاوی نفس اور ہوائے دل سب اپنے قبضہ میں لیے ہوئے ہیں اور ان میں سے ہر ایک کو ایک درجہ پر متمکن کیا ہے اور ان پر دروازہ معافی کھول دیا ہے۔ غرضیکہ یہ بحث بہت طویل ہے۔ اس کی تشریح کے لیے بہت اصول اول بیان کرنے ضروری ہیں تاکہ معلوم ہو کہ وہ کون ہستیاں ہیں۔

اب ہم برسبیل اختصار اس امر کی تحقیق بیان کرتے ہیں اور اس میں ان کے خلاف اوصاف اور مردان خدا کے بیانات بھی نقل کریں گے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اثبات ولایت

اچھی طرح جان لو کہ طریقہ تصوف اور اصول معرفت کی بنیاد تمام ولایت اور اس کے ثبوت پر موقوف ہے اور تمام مشائخ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اس امر پر متفق ہیں۔ لیکن ہر ایک کا طرز بیان علیحدہ علیحدہ ہے۔

محمد بن علی رضی اللہ عنہ اس کی حقیقت بیان فرمانے میں مخصوص طرز اختیار فرماتے ہیں۔ (چنانچہ ان کا ارشاد ہے) کہ ولایت ”واو“ کے ”زیر“ سے لغت میں تصرف و ملکیت حق کے معنی دیتا ہے اور ولایت ”واو“ کے ”زیر“ سے ”آمارت“ کے معنی میں مستعمل ہے اور دونوں ”ولی“ کے مصدر ہیں۔

اس صورت میں یہ دونوں لغت ایسے ہیں جیسے دلالت اور ذلالت۔ اور ولایت بمعنی ربوبیت بھی مستعمل ہے۔ جیسے قرآن کریم میں ارشاد ہے۔ ﴿هُنَالِكَ الْوَلَايَةُ لِلَّهِ الْحَقِّ﴾ (۱) یعنی اس وقت تمام قبضہ و تصرف اللہ تبارک و تعالیٰ کے لیے ہی ہے۔ یعنی بروز قیامت کفار بھی

اللہ کی ذات کے ساتھ تولی کر کے اپنے دنیاوی معبودوں سے تیری ظاہر کریں گے اور ولایت بمعنی محبت بھی مستعمل ہے۔

اور ہو سکتا ہے کہ ولی بروزن ”فَعِيلٌ“ بمعنی مفعول ہو۔ جیسے قرآن کریم میں فرمایا: ﴿وَهُوَ يَتَوَلَّى الصَّالِحِينَ﴾ (۱) ”وہی ذات اپنے نیک بندوں کی حمایت کرنے والی ہے۔“ گویا اللہ تعالیٰ نے اپنے بندہ کو اس کے افعال و اوصاف پر نہیں چھوڑا اور اپنے سایہٴ حمایت میں رکھنے کی خوشخبری دی۔ اور ہو سکتا ہے کہ ”فَعِيلٌ“ کے وزن پر بمعنی مبالغہ استعمال ہو اور فاعل کے معنی دے کہ بندہ تولی بطاعت حق کرے اور اس کے حقوق مدعی رکھ کر اس کے اتباع میں مداومت رکھے اور اس کے غیر سے اعراض کرتا رہے تو پہلا جو بمعنی مفعول ہے وہ مرید ہوگا۔ اور دوسرا جو بمعنی فاعل بطریق مبالغہ ہے وہ مراد ہوگا اور یہ تمام پہلو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندہ کی طرف یا بندہ کی طرف سے اللہ تعالیٰ کی طرف روا ہوتے ہیں۔

اس لیے کہ اللہ تعالیٰ ہی ناصر و مددگار محبوبانِ خاص ہوتا ہے اور اس کا وعدہ بھی فرمایا ہے۔ چنانچہ صحابہ کرام کو ارشاد ہوا: ﴿الْآنَ نَصَرَ اللَّهُ قَرِيبًا﴾ (۲) ”خبردار رہو اللہ کی نصرت قریب ہے۔“ اور کافروں کو فرمایا: ﴿وَأَنَّ الْكٰفِرِيْنَ لَا مَوْلٰى لَهُمْ﴾ (۳) ”ای لا ناصر لہم“ اور بیشک کافروں کا کوئی مولیٰ نہیں، یعنی ان کا مددگار نہیں۔ توجہ کفار کا وہ ناصر نہیں تو لامحالہ مومنین کا ناصر ہوا۔ تو کہیں عاقلوں کی مدد فرماتا ہے کہ وہ بنصرۃ الہی استدلالِ آیات و بیانِ معانی اپنے دلوں میں محسوس کرتے ہیں اور ان پر کشفِ براہین و اسرار ہوتا ہے اور کبھی نصرت فرماتا ہے مخالفتِ نفس اور شیطان پر اور نصرت فرماتا ہے موافقتِ امورِ خیر میں۔

اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اپنے بندگانِ خاص کو اپنی محبت اور دوستی کے لیے مخصوص فرما کر محلِ عداوت سے محفوظ رکھے۔ جیسا کہ فرمایا: ﴿سَيُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَہُمْ﴾ (۴) ”انہیں اللہ محبوب رکھتا ہے وہ اللہ سے محبت کرتے ہیں، حتیٰ کہ وہ اللہ تعالیٰ کی محبت کے لیے اللہ کو محبوب رکھتے ہیں اور مخلوقات کے لطف کی طرف اُن کی نظر نہیں جاتی، جب ہی وہ ولی حق ہوتے ہیں اور یہی اولیاءِ الہی کہلاتے ہیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اقامتِ براطاعت حاصل کرانے کے لیے ایک کو منصبِ ولایت عطا ہو اور وہ اس منصب پر پہنچ کر اقامت حاصل کرے اور ہر قسم کی مخالفتِ حق سے پرہیز رکھے اور شیطان اس کے حس سے بھاگے۔

۲۔ سورۃ البقرۃ: ۲۱۳

۱۔ سورۃ الاعراف: ۱۹۶

۳۔ سورۃ المائدہ: ۵۳

۴۔ سورۃ محمد: ۱۱

اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک کو ولایت عطا ہو، تاکہ اس کا حل (کشائش) مملکتِ الہی میں ہو اور اس کا عقد (بندش) عقد ہو (گویا ہر قسم کے سیاہ و سپید کا وہی مختار کر دیا جائے) اور اس کی دعا مستجاب ہو اور اس کے نفاس و اقوال مقبول بارگاہ۔ جیسا کہ حضور ﷺ نے فرمایا: رَبُّ اشْعَثِ اَغْبَرَ ذِي طَمْرَيْنٍ لَا يِعْبَاءُ بِهِ لَوْ اَقْسَمَ عَلَيَّ اللهُ لَا بَرَّةَ . (۱) ”اکثر ایسے لوگ ہیں کہ ژولیدہ اور غبار آلودہ بال والے، پھٹے ہوئے کپڑوں میں کہ لوگ اس کو تین میں سمجھیں، نہ کہ تیرہ میں۔ مگر (اس کا یہ مرتبہ ہے کہ) اگر وہ خدا کی قسم کسی معاملہ میں کھائے تو اللہ اسے پوری فرما دیتا ہے۔“

روایت ہے کہ عہد فاروقی میں دریائے نیل اپنی پرانی رسم کے مطابق خشک ہو گیا۔ اس لیے کہ زمانہ جاہلیت میں یہ رسم تھی کہ ہر سال ایک آراستہ خوبصورت لونڈی اس میں بھینٹ چڑھایا کرتے تھے تو دریا جاری ہوتا تھا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ایک کاغذ کے ٹکڑے پر لکھ دیا کہ: اے پانی اگر تو خود رکتا ہے اور خشک ہوتا ہے تو ہرگز جاری نہ ہو اور اگر خدا کے حکم سے ٹھہرا ہے تو عمر کہتا ہے کہ رواں ہو جا۔ چنانچہ جب رقعہ دریا میں ڈالا گیا فوراً پانی جاری ہو گیا اور درحقیقت حکومتِ حقیقی میں حکومت ہے۔

تو میری مراد ولایت اور اس کے ثبوت سے یہی ہے کہ انسان سمجھ بوجھ لے کہ ولایت کس کا حق ہے اور ولی کس کو کہا جاتا ہے اور کس کے لیے یہ نام موزوں ہے۔ مذکورہ صفات جب تک انسان میں موجود نہ ہوں وہ ولی نہیں ہو سکتا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا یہ حال تھا جو ان کی تحریر سے ظہور میں آیا نہ کہ قال سے۔

اس سے قبل مشائخ کرام نے بہت سی کتابیں لکھی ہیں (اور وہ میرے پاس تھیں) مگر میرے ایک عزیز کے ہاتھ وہ گم ہو گئیں۔ اب میں مذہب حکیمیہ کے پیشوا حضرت ابو عبد اللہ حکیم ترمذی کے مذہب کو روشنی میں لاتا ہوں۔ کیونکہ میرا عقیدہ اس بزرگ رضی اللہ عنہ کے ساتھ بہت ہے۔ تاکہ پڑھنے والے کو اور اسے جو اس کتاب کے مطالعہ کی سعادت حاصل کرنے کا طالب ہے، اس طریقہ میں فائدہ پہنچے، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

۴۔ امام طوسی نے اسے کتاب اللمع (ص: ۱۶) میں انہی الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے جبکہ امام احمد بن حنبل نے اپنی مسند ۱۳۸/۳ میں، امام اوزاعی نے مسند الشہاب ۱۱۶/۲ (۱۰۰۲) میں امام بخاری نے اپنی صحیح (۲۷۰۳، ۲۸۰۶، ۳۳۹۹، ۳۵۰۰، ۳۶۱۱، ۶۸۹۳) میں امام مسلم نے اپنی صحیح (۱۶۷۸) میں، امام داؤد نے اپنی سنن (۳۶۹۵) میں اور امام الطبرانی نے المعجم الکبیر (۷۲۸) میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کے طریق سے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے: ان من عباد اللہ من لو اقسام علی اللہ لا برہ .

فصل:

یہ اچھی طرح سمجھ! اللہ تجھے توفیق عطا فرمائے کہ یہ لفظ (یعنی ولی) مخلوقات میں متداول ہے اور کتاب و سنت میں اس لفظ کے ساتھ ناطق ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ عز اسمہ ہے ﴿الْآنَ اَوْلِيَاءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ﴾ (۱) ”خبردار رہو بیشک اللہ کے محبوبوں اور ولیوں پر کوئی خوف اور غم نہیں۔“ اور فرمایا: ﴿تَحَنُّنٌ اَوْلِيَوكُمُ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ﴾ (۲) ”ہم تمہارے مددگار ہیں حیات دنیا و آخرت میں۔“ اور فرمایا: ﴿اللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ (۳) اللہ ان کا مددگار ہے جو ایمان لائے۔“ اور حضور ﷺ نے فرمایا:

اِنَّ مِنْ عِبَادِ اللّٰهِ لَعِبَادًا يُغْبِطُهُمُ الْاَنْبِيَاءُ وَالشُّهَدَاءُ قِيْلَ مَنْ هُمْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صِفْتُهُمْ لَنَا لَعَلَّنَا نُحِبُّهُمْ قَالَ قَوْمٌ تَحَابُّوْا بِرُوْحِ اللّٰهِ مِنْ غَيْرِ اَمْوَالٍ وَّاكْتِسَابٍ وَّجُوْهُهُمْ نُورٌ عَلٰى مَنَابِرٍ مِنْ نُورٍ لَا يَخَافُوْنَ اِذَا خَافَ النَّاسُ وَلَا يَحْزَنُوْنَ اِذَا حَزَنَ النَّاسُ ثُمَّ تَلَا اِلَّا اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفَ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ . (۴)

”اللہ کے بندوں میں ایسے بندے بھی ہیں جن پر انبیاء و شہداء غبط کرتے ہیں۔ صحابہ نے عرض کی: یا رسول اللہ وہ کون ہیں؟ ان کی صفات بیان فرمائیں شاید ہم ان سے محبت کریں: فرمایا وہ ایک قوم ہے جو خوش رہتی ہے اپنے رب کی خوشنودی میں بغیر مال و منال کے حاصل کیے۔ ان کے چہرے منور ہیں اور نوری منبروں پر بے فکر بیٹھے ہیں۔ وہ خائف نہیں ہوتے جب کہ انہیں لوگ ڈرائیں اور نہیں گھبراتے اور غمگین نہیں ہوتے جبکہ لوگ انہیں غمگین کرتے ہوں اور عوام گھبرارے ہوں۔“

پھر آیہ کریمہ تلاوت فرمائی:

۱۔ سورۃ یونس: ۶۲ ۲۔ سورۃ فصلت: ۳۱ ۳۔ سورۃ البقرۃ: ۲۵۷

۴۔ یہ الفاظ تو نہیں ملے لیکن خطیب ترمذی نے مشکاة المصابیح (ص: ۷۲۶، باب الحب فی اللہ) میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے اس طرح روایت کی ہے: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: ان من عباد اللہ لا ناسا ما هم بانبياء ولا شهداء يغبطهم الانبياء، والشهداء يوم القيامة بمكالمهم من اللہ قالوا: يا رسول اللہ تخبرنا من هم قال هم قوم تحابوا بروح اللہ.

﴿الْآيَاتُ أَوْلِيَاءُ اللَّهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ﴾ (۱) اور حضور ﷺ نے فرمایا کہ رب فرماتا ہے: مَنْ اَذَى لِيْ وَوَلِيًّا فَقَدْ اسْتَحَلَّ مُحَارَبَتِيْ (۲) ”جس نے میرے کسی ولی کو ایذا دی اس نے اپنے لیے میری جنگ جائز کر لی۔“ اس سے مراد واضح ہے کہ اولیاء اللہ کا اللہ تعالیٰ ناصر و مددگار ہے اور اس نے اپنی ان پاک ہستیوں کو اپنی دوستی اور ولایت کے لیے مخصوص کر لیا ہے اور وہ اللہ کی ملک کے والی بنائے گئے ہیں اور ان کو اپنے افعال و قوت کا مظہر بنایا ہے اور انواع و اقسام کی کرامتیں ان کی ذات کے ساتھ مخصوص کر دی گئی ہیں اور آفات طبع و ہوی سے ان کو پاک کر دیا ہے اور نفس کی پیروی سے انہیں آزاد کر دیا ہے۔ ان کی ہمت و ارادے سوائے قوتِ الہی کے ظہور میں نہیں آتے اور ان کے انس و محبت کا رابطہ سوائے اس فعالِ مطلق کے کسی کے ساتھ نہیں۔ یہ لوگ ہم سے قبل موجود تھے۔ زمانہ گزشتہ میں تھے اور وہ فرامینِ مصطفیٰ علیہ التحیۃ و التثانی کے ساتھ ایسے مجرد ہیں کہ متابعتِ نفس کی راہ ان پر مسدود ہے۔ حتیٰ کہ بارانِ رحمت جو آسمان سے نازل ہو رہی ہے، وہ ان کے دم قدم کے صدقہ سے ہے اور زمین سے جو سبزہ اُگ رہا ہے وہ ان کی صفاء و حال کی برکت سے اُگ رہا ہے اور کافر پر مومن کو غلبہ انہیں کی ہمت سے حاصل ہے، اور اس قسم کے اولیاء کرام چار ہزار کی تعداد میں لوگوں سے مکتوم و مخفی ہیں اور ایسے مخفی ہیں کہ ایک دوسرے کو نہیں پہچانتے اور وہ خود اپنے جمالِ حال سے بے خبر ہیں۔ اور اپنے تمام احوال میں اپنے سے اور مخلوق سے مستور ہیں اور اس دعوے کے ثبوت میں احادیث و وارد بھی موجود ہیں اور اب سے قیامت تک رہیں گے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اس امتِ مرحومہ کو یہ شرف عطا فرمایا ہے اور اس امت کی شرافت کو تمام امتوں پر فائز کر کے یہ وعدہ فرمایا ہے کہ میں شریعتِ مطہرہ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی نگرانی رکھوں گا۔ (۳)

تو جب براہینِ حدیث و حج عقلی آج تک موجود ہیں اور علماء میں وہ عام طور پر شائع ہیں تو یہ بھی ضروری ہے کہ براہینِ عین بھی موجود ہوں جو اولیاء کرام میں اور خاصانِ بارگاہ میں مخصوص ہوتے ہیں۔

اور اس بحث میں ہمارے مخالف دو گروہ ہیں ایک معتزلہ اور دوسرے عام خشویہ۔ معتزلہ،

۱۔ سورۃ یونس: ۶۲۔

۲۔ حوالہ کے لیے: اتحاف السادة المتقين للزبيدي: ۴۷۷/۳، ۱۰۲/۸

۳۔ جیسا کہ ارشاد ہے نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَآنَالَهُ لِحَافِظُونَ۔ یعنی ہم نے اس ذکر شریعت کو نازل فرمایا اور ہم ہی اس کے حفاظت کرنے والے ہیں۔

اولیاء میں اولیاء پر ایک دوسرے کی تخصیص کے منکر ہیں اور دوسرے عام خشویان کہتے ہیں کہ ایسے لوگ تھے، اور اولیاء میں باہم تخصیص (فضیلت) کی نفی گویا باہم انبیاء کی نفی ہے جو کفر ہے اور عام خشویان (خشویہ) تخصیص (فضیلت باہمی) جائز رکھتے ہیں البتہ یہ کہتے ہیں کہ ایسے لوگ ہوئے ہیں لیکن آج کل نہیں ہیں اور ان کا انکار ماضی و مستقبل دراصل ایک جیسا ہے اور اس لیے کہ مستقبل کی نفی، ماضی کی نفی سے زیادہ بڑی ہے۔ اللہ تعالیٰ عزوجل شانہ نے برہان نبوی کو آج تک باقی رکھا ہوا ہے اور اولیاء اللہ کے ذریعہ اس برہان کا اظہار ہوتا رہتا ہے تاکہ حجت و صداقت محمدی علیہ الصلوٰۃ والسلام سے تعلق و پیہم نسب کا روشن اظہار ہوتا رہے اور ان اولیاء کو عالم (جہاں) والی کا حاکم فرمایا ہے تاکہ وہ اتباع سنت میں مشغول رہیں اور اسی راہ پر چل کر نفس کی پیروی کے راستے سے بچیں..... اس بارے میں بہت سی احادیث وارد ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ نفی تخصیص ولی تخصیص نبی کو مستلزم ہے اور یہ صریح کفر ہے۔

اور عام خشویہ تخصیص کو تو روار کھتے ہیں لیکن یہ کہتے ہیں کہ اولیاء تھے اب نہیں رہے (اور اس خیال کا بھی یہی نتیجہ ہے کہ) انکار ماضی و مستقبل دونوں انکار ہیں۔ اس لیے کہ ایک طرف کا انکار دوسری طرف سے بدتر نہیں۔

اور اللہ تعالیٰ نے برہان نبوت کو آج تک باقی رکھا ہے اور اولیاء کرام کو اس برہان کے اظہار کا سبب بنا لیا ہے تاکہ مسلسل آیات و حجت صداقت محمدی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام پیوستہ طریق پر ظاہر و باہر ہیں اور ان ہستیوں کو خصوصیت سے والیان عالم بنایا ہے، اور اولیاء کرام کے اقوال اس کی تائید میں ناطق ہیں اور مجھے خود بھی اس بحث میں بحمد اللہ تعالیٰ بہت احادیث واضح طور پر پہنچی ہیں۔

لیکن ان چار ہزار اولیاء کرام میں جو ارباب حل و عقد ہیں، جنہیں سرہنگان درگاہ حق تعالیٰ کہا جاتا ہے، وہ تین سونفوس قدسی ہیں جنہیں اصطلاح تصوف میں ”اخیار“ کہتے ہیں اور چالیس وہ ہستیاں ہیں جنہیں ”ابدال“ کہتے ہیں اور سات وہ ہیں جنہیں ”ابرار“ کہتے ہیں۔ چار وہ ہیں جنہیں ”اوتاد“ کہتے ہیں۔ تین وہ ہیں جنہیں ”نقیب“ کہتے ہیں۔ ایک وہ ہے جو ”قطب“ کہلاتا ہے اور اسے ”غوث“ بھی کہتے ہیں اور یہ تمام ایک دوسرے کو جانتے اور پہچانتے ہیں اور نظام معاملات و امور تصرف میں ایک دوسرے کے اذن و اجازت کے محتاج ہیں اور اس پر احادیث ناطق ہیں اور ارباب حقیقت اس کی صحت پر متفق ہیں۔ اس کی مزید شرح و بسط کے لیے یہ جگہ موزوں نہیں، اس لیے کہ یہاں مقصود یہ نہیں ہے، اس جگہ عام طور پر عوام یہ اعتراض کرتے ہیں کہ یہ کیا کہا گیا ہے وہ

خاصانِ بارگاہِ ایک دوسرے کو نہیں پہچانتے اور وہ ہر ایک ولی ہوتا ہے۔

لازم تو یہ ہے کہ ہر ایک ولی اپنی عاقبت کی طرف سے امن میں ہو اور یہ محال ہے کہ معرفتِ ولایت امن کی مقتضی ہو۔ اس لیے کہ جب یہ ممکن ہے کہ مومن اپنے ایمان سے عارف ہو مگر یہ ضروری نہیں کہ عرفانِ ایمان کے ساتھ مامون بھی ہو تو پھر یہ بھی ضرور ممکن ہے کہ ولی اپنی ولایت سے عارف ہو کر مامون نہ ہو۔ ہاں! یہ ہو سکتا ہے کہ بوجہ کرامتِ حق تعالیٰ ولی کو اس کی صحتِ حال اور محافظتِ نفس کی وجہ سے نگاہ میں رکھے اور انہیں امنِ عاقبت کا بھی عارف فرمائے۔ اس میں مشائخِ کرام کا اختلاف ہے اور اس اختلاف کی علت میں نے پیدا کی ہے۔ یعنی جو چار ہزار اولیاءِ مکتوم ہیں وہ اپنی ولایت کی معرفت بھی اپنے لیے روا نہیں رکھتے اور جو ان چار ہزار کے علاوہ اور ہیں وہ اپنے لیے معرفتِ ولایت روا رکھتے ہیں۔

فقہاءِ کرام میں سے بہت وہ ہیں جو پہلے گروہ کے موافق ہیں اور بہت سے وہ بھی ہیں جو دوسرے گروہ کے موافق ہیں اور متکلمین کا بھی یہی حال ہے۔

چنانچہ ابواسحاق اسفرانی اور ایک جماعت متقدمین اسی پر ہے کہ ولی اپنے آپ کو نہیں پہچانتا کہ وہ ولی ہے۔ تو ہم نے اُن سے پوچھا کہ اس معرفت میں ولی کے لیے کیا نقصان و آفت ہے تو ان کا یہ جواب ہے کہ ولی اگر اپنے آپ کو ولی جاننے لگتا ہے تو معجب و متکبر ہو جاتا ہے اور سمجھنے لگتا ہے کہ میں ولی ہوں۔ اس کا جواب میں دیتا ہوں کہ شرطِ ولایت میں یہ چیز بھی ہے کہ اس کی نگہداشت اللہ تعالیٰ کے سپرد ہو تو پھر آفاتِ عجب و تکبر سے محفوظ ہونا لازمی ہے اور ایسی صورت میں اس کا متکبر ہونا جائز نہیں ہو سکتا۔

لہذا یہ کہنا محض عامیانہ اور مبنی بر جہل ہے کہ ایک شخص ولی ہو اور اس سے خوارقِ عادات کرامتیں سرزد ہوں اور وہ یہ نہ جان سکے کہ میں ولی ہوں یا اُسے اس امر کا علم نہ ہو کہ یہ خرقِ عادت جو امر ظہور میں آیا وہ کرامت ہے۔

ان تخیلات پر عوام میں سے ایک گروہ پہلی جماعت کا مقلد ہے اور ایک گروہ دوسری جماعت کا پیرو ہے لیکن ان کی بات کا کوئی اعتبار نہیں۔ اب رہے معتزلہ، یہ کلیۃً تخصیصِ ولایت و کرامت دونوں کے منکر ہیں اور درحقیقت ولایت میں تخصیص و کرامت ہی مخصوص ہے۔

وہ کہتے ہیں کہ تمام مسلمان اللہ کے دوست ہیں۔ جو مطیعِ الہی ہے، وہی ولیِ الہی ہے اور جو احکام اور ایمان پر قائم ہے اور صفات و روایتِ الہی کا منکر ہو اور مومن کے خلودِ جہنم کو روا رکھے اور اس امر کا مقرر ہو کہ انبیاء و رسل اور نزولِ کتب نہ بھی ہوں تو عقلاء مکلف باطاعت ہیں، پس وہ

ولی ہے اور مسلمان اُسے ولی مانتے ہیں۔ لیکن درحقیقت ایسے عقیدہ والا شیطان ہے (ولی نہیں) اور کہتے ہیں کہ اگر ولایت و کرامت ولی کے لیے واجب ہے تو سب مسلمانوں میں کرامت ضروری تھی۔ اس لیے کہ سب مسلمان ایمان میں مشترک ہیں اور چونکہ سب اصل اصول میں مشترک ہیں تو لازم آتا ہے کہ فرع میں بھی مشترک ہوں۔

اور یہ بھی کہتے ہیں کہ مومن و کافر دونوں میں کرامت ہونا جائز ہے۔ اور وہ اس بھوکے کی طرح ہے جو سفر میں ہے اور میزبان کا متلاشی ہے، یا اس مسافر کی طرح ہے جو تھک کر یہ چاہتا ہے کہ مجھے کوئی سواری پر بٹھالے وغیرہ وغیرہ۔ اور بہت سی ایسی ہی باتوں میں سے ایک بات یہ بھی جو کہتے ہیں کہ اگر بڑی دراز مسافت کو کوئی ایک رات میں طے کر لیتا تو حضور ﷺ کے لیے بھی یہ روا ہوتا۔ مگر جب انہوں نے مکہ معظمہ کا قصد فرمایا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَتَحْمِلُ أَثْقَالَكُمْ إِلَىٰ بَلَدٍ لَّمْ تَكُونُوا بِلَيْغِهِ إِلَّا بِشِقِّ الْأَنْفُسِ﴾ (۱)

”اور اٹھالے جاتے ہیں تمہارے بوجھ اس شہر تک جہاں تم نہیں پہنچ سکتے تھے مگر جسمانی تکلیف سے۔“

اس کے جواب میں ہم کہتے ہیں کہ ان کا قول باطل و عاقل ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿سُبْحَانَ الَّذِي أَسْرَىٰ بِعَبْدِهِ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ إِلَى الْمَسْجِدِ الْأَقْصَا﴾ (۲)

”پاک ہے وہ جو لے گیا اپنے بندے کو تھوڑی سی رات میں مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک۔“

تو معنی حمل اٹھال اور سفر مکہ میں اجماع صحابہ ہے کہ مکہ سے مسجد اقصیٰ جانا یہ کرامت خاص تھی نہ کہ عام اور مکہ سے ہجرت میں جانا، اگر یہاں بھی وہی کرامت ہوتی تو کرامتیں عام ہو جاتیں اور ایمان بالغیب کے تمام احکام اٹھ جاتے۔ اس لیے کہ ایمان اپنے مقام پر عموم کے درجہ پر ہے مطیع و عاصی کے لیے اور ولایت مختص ہے مطیع کے لیے۔ تو اللہ تعالیٰ کا وہ حکم جس میں حمل اٹھال فرمایا، وہ محل عموم میں تھا اور حضور ﷺ کو عمومی درجہ کے ساتھ مخاطب کیا۔ (۳) اور جہاں تخصیص ذات مصطفیٰ ﷺ کے ساتھ حکم فرمایا وہاں بتا دیا کہ تھوڑی سی شب میں اپنے محبوب کو مکہ

۱۔ سورۃ النحل: ۷۔ ۲۔ سورۃ الاسراء: ۱

۳۔ جیسا کہ اصول ہے کہ مورد آیت خاص ہوتا ہے مگر حکم عام ہوتا ہے۔ مترجم

سے بیت المقدس پہنچا دیا اور وہاں سے قاب قوسین اور زوايات و خوابائے عالم کا مشاہدہ کرا دیا (اور اس قدر سرعت سے یہ سب کچھ ہوا) کہ جب واپس تشریف لائے تو شب کا بہت سا حصہ باقی تھا۔ غرض کہ خلاصہ یہ ہے کہ حکمِ ایمان عوام کے لیے عام ہے اور حکمِ کرامت خاص ہے۔ خواص کے لیے، اور نفی تخصیص کرنا مکابرة عیان ہے۔ جیسے کہ نوکر کا حکم بادشاہ کے دربار میں، دربان، حاجب اور ان کے افسر اور وزراء سلطنت سب کے لیے یکساں ہے، اگرچہ نوکر سب ہیں مگر ہر ایک کا منصب و مرتبہ علیحدہ علیحدہ ہے۔

اسی طرح اگرچہ بارگاہِ الہی میں ایمان لانے کی حیثیت میں سب یکساں ہیں لیکن ایک مومن عاصی ہے ایک مومن مطیع، ایک مومن عالم ہے ایک مومن عابد، ایک مومن جاہل ہے ایک مومن متورع۔ تو ثابت ہوا کہ انکار تخصیص مناصب و مراتب کرنا انکار کُل معافی ہے۔

واللہ اعلم بالصواب

فصل

لفظ ”ولایت“ کی تحقیق میں مشائخ کرام نے بہت سے رموز بیان فرمائے ہیں۔ ہم اس مقام پر حتی الامکان ان کے مختار اقوال نقل کریں گے، ان شاء اللہ۔ تاکہ مطالعہ کرنے والوں کو فائدہ مند ثابت ہوں۔ حضرت ابوعلی جرجانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: **الْوَلِيُّ هُوَ الْفَائِي فِي حَالِهِ وَالْبَاقِي فِي مُشَاهَدَةِ الْحَقِّ لَمْ يَكُنْ لَهُ عَنْ نَفْسِهِ اَخْبَارٌ وَلَا مَعَ غَيْرِ اللَّهِ قَرَارٌ.** ”ولی وہ ہے کہ اپنے حال سے فانی اور مشاہدہ حق کے ساتھ باقی ہو، اس کے لیے ناممکن ہے کہ وہ اپنے حال کی کچھ خبر کسی کو دے سکے اور سوائے ذاتِ حق کے غیر سے آرام پائے۔“ اس لیے کہ خبر بندہ کے اپنے حال سے ہوتی ہے اور جب حال فانی ہو گیا تو پھر اسے اپنے حال کی خبر دینا درست نہیں اور غیر حق سے آرام نہ پانا بھی صحیح ہے۔ اس لیے کہ اپنے حال کی غیر کو خبر دینا رازِ محبوب کا غیر کے سامنے منکشف کرنا ہے اور کشفِ رازِ حبیب، غیر حبیب پر محبت کے لیے محال ہے اور یہ بھی ہے کہ جب رویتِ غیر ہی مشاہدہ جمالِ یار میں محال ہے تو رویتِ غیر نہ ہونے کی شکل میں خلق کے ساتھ قرار کس طرح ممکن ہو سکتا ہے۔

حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

الْوَلِيُّ اَنْ لَا يَكُوْنَ لَهُ خَوْفٌ لِاَنَّ الْخَوْفَ تَرْقُبُ مَكْرُوْهُ يُحِلُّ فِي الْمُسْتَقْبَلِ وَالتَّنْظَارُ مَحْبُوْبٌ يَفُوْثُ فِي الْمُسْتَأْنِفِ وَالْوَلِيُّ اِنْ اَلْوَقْتُ لَيْسَ لَهُ وَقْتُ مُسْتَقْبَلٍ فَيَخَافُ شَيْئًا وَكَمَا لَا خَوْفَ لَهُ لَا

رَجَاءَ لَهُ لَآنَ الرَّجَاءِ اِنْتِظَارُ مَحْبُوبٍ يُحْصَلُ اَوْ مَكْرُوهُ يَكْشِفُ
وَذَالِكَ فِى الشَّيْءِ مِنَ الْوَقْتِ وَكَذَالِكَ لَا حُزْنَ لَآنَ الْحُزْنَ مِنْ
حُزْنِ وَنَةِ الْوَقْتِ وَمَنْ كَانَ فِى ضِيَاءِ الرِّضَاءِ وَرَوْضَةِ فَاِنَّ الْمُوَافَقَةَ
يَكُونُ لَهُ حُزْنَ قَالَ اللهُ تَعَالَى اِلَّا اِنْ اَوْلِيَآءَ اللهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا
هُمُ يَحْزَنُوْنَ .

مراد اس قول سے یہ ہے جو فرمایا کہ: ”ولی وہ ہے جس کو خوف نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ خوف اس چیز سے ہوتا ہے جس کے آنے سے دل کراہت محسوس کرتا ہے کہ یہ آئندہ زمانہ پر وارد ہو یا اس سے خائف ہے کہ زمانہ آئندہ میں وہ جو محبوب اس وقت موجود ہے، چلا جائے گا۔ ولی ابن الوقت یعنی صاحب الوقت ہوتا ہے۔ اس کو آئندہ ایسا وقت نہیں جس سے وہ ڈرے۔ (اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: خبردار رہو بے شک اللہ کے ولیوں کو نہ خوف ہے نہ غم) اور جس طرح ولی کو خوف نہیں ہوتا، امید بھی نہیں ہوتی۔ اس لیے کہ رجا وہ امید ہے جس میں آئندہ محبوب کے ملنے کی امید ہو یا اس امر کی امید کہ جو سختی آرہی ہے وہ اس سے ٹل جائے اور ولی کا وہ وقت ہوتا ہے کہ اس میں اسے غم نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ غم کدورت سے ہوتا ہے۔ تو جو رضا کی روشنی میں آگیا اور موافقت کے باغ میں متمکن ہو گیا، اُسے کب غم ہو سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿اِلَّا اِنْ اَوْلِيَآءَ اللهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ﴾ (۱)

ہاں! عوام کو اس بحث میں یہ وہم پیدا ہو جاتا ہے کہ جب ولی کو خوف ورجا نہیں رہتا اور نہ ہی اندوہ و غم تو لامحالہ انہیں امن ہوگا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ وہ امن سے بھی مبرا ہوتے ہیں اس لیے کہ امن غیب کے نہ دیکھنے اور وقت سے اعراض کرنے میں ہوتا ہے اور یہ صفت اس میں ہوتی ہے جسے نہ رویت بشریت ہو نہ صفت پر آرام، نہ خوف ورجا۔ اور امن و حزن، نفس کے نقیب ہیں۔ جب نفس فانی ہو گیا تو بندہ کی صفت رضا ہو جاتی ہے اور جب رضا حاصل ہو گئی تو وہ اپنے حال میں مستقیم ہو گیا اور رویت محبوب میں محول اور باقی تمام احوال سے اعراض پیدا ہو جاتا ہے۔ اس وقت ولایت کا دل پر کشف ہوتا ہے اور اس کے معنی کہ تمام اسرار اس پر ظاہر ہوتے ہیں۔

حضرت ابو عثمان مغربی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: الْوَلِيُّ قَدْ يَكُونُ مَشْهُورًا وَلَا يَكُونُ مَفْتُونًا. ”ولی مخلوق میں مشہور ہوتا ہے لیکن مخلوق کے ساتھ بتلا نہیں ہوتا۔“ ایک اور فرماتے ہیں: الْوَلِيُّ قَدْ يَكُونُ مَسْتُوْرًا وَلَا يَكُونُ مَشْهُورًا. ”ولی مستور ہوتا ہے اور مشہور نہیں ہوتا۔“

اور یہ احترامِ شہرت اس وجہ سے ہے کہ اس کی شہرت میں فتنہ ہوتا ہے۔ اور حضرت ابو عثمان رحمۃ اللہ علیہ نے جو یہ فرمایا کہ ولی کا شہرہ ممکن ہے مگر اس شہرت میں فتنہ اور ابتلاء نہیں، اس کی وجہ ظاہر ہے کہ فتنہ کذب میں ہوتا ہے اور جب ولی اپنی ولایت میں صادق ہے اور ایسا ولی کاذب پر واقع نہیں ہو سکتا اور اظہارِ کرامت بھی کاذب کے ہاتھ سے محال ہے، تو لازم آتا ہے کہ ہر قسم کا فتنہ اس کے لیل و نہار سے ساقط ہو جائے۔ اور یہ دونوں قول اس اختلافی مضمون کی طرف جاتے ہیں کہ ولی اپنے آپ کو نہیں پہچانتا کہ ولی ہے اور اگر پہچانتا ہے تو لازمی طور پر مشہور ہوگا اور اگر نہ پہچانے تو مفتون ہوگا۔ اور اس کی شرح طوالت کی مقتضی ہے اور طوالت مقصود نہیں۔

ایک حکایت میں ہے کہ حضرت ابراہیم ادہم رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو فرمایا کہ کیا تو چاہتا ہے کہ اللہ کے ولیوں میں سے ولی ہو۔ عرض کی: ہاں، میں چاہتا ہوں۔ آپ نے فرمایا: لَا تَرْغَبْ فِي شَيْءٍ مِنَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَأَفْرِغْ نَفْسَكَ لِلَّهِ وَأَقْبِلْ بِوَجْهِكَ عَلَيْهِ. ”دنیا اور عقبیٰ کی کسی شے سے رغبت نہ کر اس لیے کہ دنیا سے رغبت کرنا اپنے رب سے اعراض کر کے فانی کی طرف راغب ہونا ہے اور عقبیٰ کی طرف رغبت کرنا اپنے رب سے اعراض کر کے شے باقی کی طرف جانا ہے۔“

تو جب اعراض شے سے فانی ہوگا تو فانی فنا ہو جائے گا اور اعراض نیست ہو جائے گا اور اعراض شے باقی سے ہوگا تو بقا پر فنا روا نہیں ہوتی تو اس سے اعراض ہی درست رہے گا۔ تو اس کا مضمون یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی طلب دنیا و عقبیٰ کے ساتھ نہ رکھو، فرمانا کہ اپنے دل کو اللہ کی محبت کے لیے دنیا و عقبیٰ سے خالی کر کے دل کو اپنے رب کی طرف رجوع کر تو حاصل یہ ہے کہ جب یہ اوصاف تیرے اندر موجود ہو جائیں گے، ولی ہو جائے گا۔

حضرت بایزید بسطامی رضی اللہ عنہ سے کسی نے پوچھا کہ ولی کون ہوتا ہے۔ آپ نے فرمایا:

الْوَلِيُّ هُوَ الصَّابِرُ تَحْتَ الْأَمْرِ وَالنَّهْيِ

”ولی وہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے امر و نہی پر صبر کرے۔“

اس لیے کہ جس کے دل میں اللہ کی دوستی جتنی ہوگی، اس کے حکم کی عظمت اتنی زیادہ ہوگی اور اس کی نہی سے اس کا جسم اتنا ہی بعید ہوگا۔

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ سے ایک حکایت ہے۔ فرماتے ہیں: مجھے بتایا گیا کہ

فلاں شہر میں اللہ کے ولیوں میں سے ایک ولی ہے۔ میں اٹھا اور ان کی زیارت کا قصد کر کے چلا۔ جب ان کی مسجد میں پہنچا تو وہ گھر سے باہر تشریف لائے اور مسجد میں آ کر قبلہ کی طرف رخ کر کے مسجد میں کھلی کر دی، میں اسی وقت بغیر سلام کیے وہاں سے پلٹ آیا اور میں نے کہا کہ ولی کو چاہئے کہ احکام شریعت پر پابند ہو، تاکہ اس پر اللہ تعالیٰ نظر رحمت فرمائے۔ اگر یہ شخص ولی ہوتا تو مسجد میں قبلہ رو ہو کر کبھی کھلی نہ کرتا یا اللہ تعالیٰ اس کی حرمت ولایت پر نگاہ رکھتا۔ فرماتے ہیں: اس شب میں نے حضور سید یوم النشور ﷺ کے جمال جہاں آراء سے شرف حاصل کیا۔ دیکھا کہ حضور ﷺ فرما رہے ہیں: ابو یزید! تم نے وہ کیا کام کیا جس کی برکت سے تم اس درجہ پر پہنچے، دوسرے روز میں اس درجہ پر پہنچ گیا جو تم دیکھ رہے ہو۔

ایک روایت سنی ہے کہ ایک شخص ابو سعید رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور مسجد میں بایاں قدم رکھ کر داخل ہوا۔ آپ نے فرمایا، واپس ہو (اور دایاں قدم رکھ کر مسجد میں آ) اس لیے کہ جو دوست کے گھر میں آنے کے قاعدہ کو نہیں جانتا وہ ہمارے کام کا آدمی نہیں۔

ایک جماعت لمحدین لعنہم اللہ کی ہے جو صوفیاء کے طریقہ پر تعلق رکھ کر کہتی ہے کہ اتنی خدمت حق کرے کہ ولی ہو جائے اور جب ولی ہو جائے تو پھر اس پر سے تکلیف خدمت کا بار اٹھ جاتا ہے۔ حالانکہ یہ صریح گمراہی ہے اور صوفیاء کے یہاں ایسا کوئی مقام نہیں کہ جس پر صوفی کے آجانے کے بعد کوئی رکن اور کام خدمت کا اٹھ جائے۔ اس کی مفصل شرح مکمل ان شاء اللہ اپنے مقام پر کی جائے گی۔

اثبات کرامت

اچھی طرح یاد رکھو کہ ظہور کرامت ولی کی طرف سے اس کی صحت حال اور مجاہدہ میں قطعی ممکن و روا ہے اور صوفیائے لرام اہلسنت وجماعت کا اس پر مکمل اتفاق ہے اور عقل بھی اسے ممکن مانتی ہے۔ اس لیے کہ یہ ایک قسم ہے جو قوت الہی کی مظہر ہے اور اس کا اظہار کہ اصل شرع و دلیل سے منافی نہیں اور عقل و اوہام بھی اس کے خلاف نہیں۔

کرامت درحقیقت صداقت ولایت پر دلیل ہے اور کاذب سے اس کا صدور ناممکن۔ ہاں! کاذب سے علامات کذب و عمل ظہور پذیر ہوں گے اور کرامت نام ہے ایک ایسے فعل کا جو عقل و اوہام کا ناقض ہوتا ہے اور صوفی پر تمام تکلفات شرع باقی ہوتے ہیں اور اگر تعریف حق پر وجہ استدلال کذب کے مقابلہ میں صدق جان لے تو وہ بھی ولی ہے۔ اور ایک جماعت اہل سنت و جماعت کہتی ہے کہ کرامت صحیح ہے مگر حد معجزہ تک نہیں بلکہ وہ ایسے ہے جیسے قبول دعایا تصرف ولی

سے کسی کی مراد حاصل ہونا اور وہ جو نقص عادات کی حد تک نہ ہو۔

ہم کہتے ہیں کہ تمہیں ظہورِ فعل، ناقص عادات سے جو ولی صادق کے ہاتھ سے زمانہ تکلیف میں ہو، کیا صورت فساد نظر آئی۔ اگر وہ جواب میں کہیں کہ (معاذ اللہ) اتنی قوت عطا فرمانے کی خدا میں قدرت و قوت نہیں تو یہ خود ایک ضلالت و گمراہی ہے اور اگر کہیں کہ یہ ایک قسم کی قوت الہی ہے اور اللہ قادر تو ہے تو ولی کو ایسی قوت عطا فرمادے مگر ولی کے ہاتھ سے اس کا ظہور ابطالِ نبوت کو مستلزم ہے تو نفی تخصیصِ انبیاء یہ بھی محال ہے۔ اس لیے کہ ولی مختص بکرامت ہے اور نبی مختص بمعجزہ۔ الْمُعْجِزَةُ لَمْ تَكُنْ مُعْجِزَةً بِعَيْنِهَا اِلَّا مَا كَانَتْ مُعْجِزَةً لِحُضُورِهَا وَمِنْ شَرْطِهَا اِقْبِرَانُ دَعْوَةِ النَّبُوَّةِ بِهَا وَالْمُعْجِزَاتُ تَخْتَصُّ بِالْاَنْبِيَاءِ وَالْكَرَامَاتُ تَكُونُ لِلْاَوْلِيَاءِ۔ ”معجزہ ہرگز معجزہ بعینہ نہیں ہو سکتا، اس لیے کہ معجزہ اسی وجہ میں معجزہ ہوتا ہے کہ اس کی شرط میں دعویٰ نبوت لازمی ہے اور معجزہ انبیاء کرام کے لیے مخصوص ہے اور کرامات اولیاء کرام کے لیے۔“

تو جب ولی، ولی ہے اور نبی نبی، ان دونوں میں کسی قسم کی ایسی مشابہت نہیں کہ ان کے اندر احترام کیا جائے۔ نبی کے شرف و مرتبت پیغمبری علیہ السلام، علوی مرتبت و صفائے عصمت سے ہے نہ کہ فقط معجزہ یا کرامت سے یا خارق عادات امور کے ظاہر کرنے پر۔ اور بالاتفاق تمام انبیاء کرام کو وہ معجزے عطا ہوئے ہیں جو خارق عادات ہیں اور اصل میں وہ تمام معجزات مساوی ہیں لیکن درجات کے اعتبار سے ایک کو دوسرے پر بزرگی عطا ہوئی ہے۔ تو جب فضیلت درجات میں ایک ایک پر شرف و فضیلت رکھتا ہے تو یہ کیوں نہ ممکن ہو کہ خارق عادات امور و افعال میں بھی کسی کو دوسرے پر فضیلت ہو اور پھر کیوں زور نہ ہو۔ کیا انبیاء کے بعد اولیاء کرام کو بھی ایک درجہ خارق عادات امور کا عطا ہو اور اس کا نام کرامت رکھا جائے۔ اس پر لازمی طور پر یہ امر علم ہوگا کہ انبیاء کرام ان سے فاضل تر بلکہ اشرف ترین خلایق ہیں۔ تو جب یہ افعال ناقص عادات علت تفصیل و تخصیص انبیاء نہیں تو یقیناً خارق عادات امور علت تخصیص ولی بھی نہیں ہو سکتے، اور نبی ولی یکساں بھی نہیں ہو سکتے اور ہر عاقل جو اس دلیل کو سمجھ لے گا وہ نبی ولی کے مابین اس شبہ کو اپنے سے اٹھا دے گا۔

اور اگر کسی کو یہ وہم پھر رہے کہ ولی کو بذریعہ کرامت خارق عادات امور عطا ہوئے تو وہ نبوت کا دعویٰ کیوں نہیں کرتا۔ یہ محال ہے۔ اس لیے کہ شرط ولایت میں تصدیق قول ہے اور معنی کے خلاف دعویٰ کرنا کذب صریح ہے اور کذاب ولی نہیں ہو سکتا تو اگر ولی نبوت کا دعویٰ کرے تو یہ معجزہ کا توڑنا ہے اور وہ کفر صریح ہے۔ اور کرامت مومن مطیع کے سوا کسی کو نہیں ملتی اور کذب

معصیت شعاری ہے نہ کہ اطاعت۔ تو جب یہ امر واضح ہو گیا کہ ولی کی کرامت محبت نبی کے ثبوت کے لیے ہے تو پھر کرامت اور معجزہ میں اشتباہ تساوی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ پیغمبر علیہ السلام معجزہ سے اپنی نبوت کا ثبوت دیتے ہیں اور ولی کرامت کے ذریعہ بھی انبیاء کرام کی نبوت کا ثبوت دیتے ہیں اور اپنی ولایت کے ذریعہ بھی ثبوتِ نبوت دیتے ہیں۔ اور ولی کی کرامت، معجزہ انبیاء کا عین ہوتی ہے اور مومن کے لیے ولی کی کرامت کا مشاہدہ انبیاء کرام کی تصدیق میں زیادہ موثق درجہ پیدا کر کے یقین پیدا کرتی ہے۔

اس میں کسی قسم کا کوئی شبہ مشابہت نہیں۔ اس لیے کہ ان کا دعویٰ آپس میں مخالفت نہیں ہوتا جو ایک دوسرے کی نفی کرے بلکہ ولی کا دعویٰ نبی کے دعویٰ کا عین ہوتا ہے۔ جیسا کہ شریعتِ مطہرہ میں جب ایک گروہ وراثہ کا مدعی ہو تو جب ایک وارث کی دلیل ثابت ہو گئی تو یہی دلیل تمام ورثاء کے لیے ثبوتِ دعویٰ کی دلیل ہو جائے گی اور جب دعویٰ ایک دوسرے کے خلاف ہو تو ایسی صورت میں ایک دلیل دوسرے کے لیے دلیل نہیں ہو سکتی۔ تو جب نبی معجزہ کے دلائل سے مدعی نبوت ہوتا ہے اور ولی نبی کے دعویٰ پر تصدیق کے لیے کرامت سے خصم کو تسلیم کراتا ہے تو پھر اس میں شبہ شبہ کا شبہ ناممکن ہے۔

معجزہ اور کرامت

یہ بات تو واضح و واضح ہو چکی ہے کہ معجزہ اور کرامت جھوٹے کے ہاتھ سے ناممکن ہے مگر اس سے زیادہ واضح فرق ظاہر ہونا ضروری ہے تاکہ جو واہمہ تھوڑا یا اقل قلیل بھی باقی ہے، وہ بھی رفع ہو جائے۔ لہذا اب سنو! اور اچھی طرح سمجھ لو کہ معجزات میں اظہار کرنا شرطِ معجزہ ہے اور کرامت میں ولی کی طرف سے کتمانِ کرامت شرط ہے۔ اس لیے کہ معجزہ کا فائدہ اور ثمر غیر (کی ہدایت و اصلاح) کے لیے ہے اور کرامت خاص صاحبِ کرامت کے لیے ہے۔

پھر معجزہ کو صاحبِ معجزہ قطع بھی کر سکتا ہے اور یہ اس کا عین اعجاز ہے۔ (۱)

اور ولی بذریعہ کرامت جو چیز بصورتِ عذاب نازل کرادے تو پھر اُسے دفع نہیں کر سکتا کیونکہ وہ کرامت ہے یا استدراج۔ پھر صاحبِ معجزہ شرع شریف میں تصرف کر سکتا ہے اور اس کی

۱۔ یعنی نبی بذریعہ معجزہ۔ اگر کسی پر اس کے پاداش جرم میں دعا کر کے عذاب نازل کرادے تو پھر بذریعہ دعا اُسے روک لیتا ہے جیسے موسیٰ علیہ السلام کی دعا سے اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر عذاب نازل کیے جیسا کہ ارشاد ہے: فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوفَانَ وَالْجَرَادَ وَالْقُمَّلَ وَالضَّفَادِعَ وَالدمَّ آيَاتٍ مُّفَصَّلَاتٍ فَاسْتَكْبَرُوا وَكَانُوا قَوْمًا مُّجْرِمِينَ ﴿۱۳۳﴾ (الاعراف: ۱۳۳) (از مترجم غفرلہ)

ترتیب اور دنیا ہی میں کرنے کا مجاز ہے اور اللہ تعالیٰ نے اُسے اس امر کا مجاز بنایا ہے۔
 برخلاف صاحبِ کرامت کے کہ اسے بجز تسلیم و قبول کے چارہ نہیں۔ حتیٰ کہ ولی کسی وجہ اور
 کسی مشکل میں حکمِ شریعت اور احکامِ اسلامیہ اور شرعِ مصطفیٰ علیہ التحیۃ والسلام کے منافی کچھ کرنے
 کا مجاز ہی نہیں۔ اگر کوئی کہے کہ جب معجزہ خارقِ عادات ہے اور دلیلِ صدقِ نبی، تو جب اس کی
 جنسِ غیرِ غیرِ نبی کے لیے جائز رکھی تو یہ معتاد ہو جائے گی اور عینِ حجتِ اثباتِ معجزہ تمہارے لیے
 اثباتِ کرامت کو باطل کرتی ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو یہ کہنا خلاف واقعہ ہے۔ اس لیے معجزہ ناقصِ عاداتِ خلق
 ہے اور کرامتِ ولی غیر معجزہ انبیاء ہے اور وہ اس امر پر دلیل ہے کہ معجزہ نبی کی یہ شان ہے تو پھر معجزہ
 معجزہ کا ناقص کیسے ہو سکتا ہے۔ تو نے دیکھا نہیں جب حضرت خیب رضی اللہ عنہ کو کافرانِ مکہ نے
 سولی پر چڑھا دیا تو حضور سید عالم ﷺ مدینہ منورہ میں تھے اور مسجد نبوی میں جلوہ افروز۔ مگر مدینہ
 سے مکہ کا یہ تمام ماجرا ملاحظہ فرما رہے تھے اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کو یہ سب کچھ بتا رہے تھے جو
 حضرت خیب رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہو رہا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت خیب رضی اللہ عنہ کی آنکھوں
 سے بھی حجاب اٹھا دیئے۔ انہوں نے برسرِ دار اپنے ولی نعمت، جسمہ رحمت جناب سرورِ عالم ﷺ
 کا جمالِ جہاں آراء دیکھا اور نہایت مسرت و انبساط سے آدابِ درباری بجالاتے ہوئے مودبانہ
 سلام عرض کیا۔ حضور ﷺ نے ان کا سلام سنا۔ حضور ﷺ نے جواب سلام دیا۔ وہ اللہ تعالیٰ
 نے گوشِ خیب رضی اللہ عنہ تک پہنچایا۔ حضور ﷺ نے روبرو ہو کر ان کے لیے دعا فرمائی۔
 تو یہ معاملہ کہ حضور ﷺ خیب رضی اللہ عنہ کو مدینہ سے ملاحظہ کریں اور خیب رضی
 اللہ عنہ مکہ سے مدینہ میں حضور ﷺ کو دیکھیں۔ ایک ایسا فعل ہے جو خارقِ عادت ہے اور
 معجزہ ہے حضور ﷺ کے لیے اور وہ جو حضرت خیب رضی اللہ عنہ سے مکہ سے مدینہ میں حضور
 ﷺ کے جمالِ جہاں آراء کا مشاہدہ کر رہے تھے، وہ کرامت تھی اور خارقِ عادت تھی۔

اس لیے بالاتفاق غائب کی رویت عادت کے خلاف ہے اور پھر زمان و مکان کی غیوبت
 میں کچھ فرق نہیں۔ چنانچہ خیب رضی اللہ عنہ کی کرامت حضور ﷺ سے مکان کی غیوبت میں
 متقدمین کی کرامت کی طرح ایک کرامت تھی۔

یہ ایک فرق بین ہے اور برہانِ واضح جو ثابت کر رہا ہے کہ کرامت و معجزہ دونوں علیحدہ
 نہیں اس لیے کہ کرامت بغیر تصدیق صاحبِ معجزہ نہیں ہوتی اور ایسے مومن کے سوا جو مصدق و مطیع
 ہو، ظہور میں نہیں آتی اور وہ امتی سے ظہور پذیر ہوتی ہے اور جو کرامت امتی سے سرزد ہوتی ہے وہ

درحقیقت معجزہ انبیاء کرام ہے۔ اس لیے کہ ان کی شریعت باقی ہے اور ان کی حجت و برہان بھی باقی ہیں۔ تو اولیاء کرام صدق رسالتِ رسل پر گواہ ہیں اور سوا ان کے کسی غیر امتی سے ظہورِ کرامت روا نہیں۔ اس کی تائید میں ایک حکایت مروی ہے جو حضرت ابراہیم خواص رحمۃ اللہ علیہ سے مشہور ہے۔ فرماتے ہیں کہ میں ایک بار اپنی عادت کے مطابق جنگل میں اپنی تجرید و توحید کے ساتھ تھا کہ بعد چندے ایک گوشہ سے ایک شخص اٹھا اور میرے ساتھ ہم نشین ہونے کی خواہش ظاہر کرنے لگا۔ میں نے اس کے باطن پر نگاہ ڈالی تو مجھے اس سے نفرت پیدا ہوئی۔ میں نے سوچا کہ یہ کون ہے جو اس سے نفرت پیدا ہو رہی ہے۔ تو وہ کہنے لگا۔ ابراہیم! فکر نہ کریں، میں نصاریٰ میں سے صابی ہوں اور اقصائے بلادِ روم سے صرف آپ کی ہم نشینی کی نیت سے آیا ہوں۔ جواب سن کر مجھے اطمینان ہوا کہ نفرت یوں ہوئی تھی کہ بیگانہ ہے۔ میں نے اسے اپنی ہم نشینی کی اجازت دے دی اور کہا کہ اے راہب! (راہب نصاریٰ میں جو زاہد اور تارک الدنیا ہوتے تھے انہیں کہتے ہیں) ہمارے پاس اکل و شرب کا انتظام نہیں ہے، ہمیں اس امر کا خطرہ ہے کہ کہیں تمہیں اس جنگل میں ہماری معیت سے تکلیف نہ ہو۔ راہب کہنے لگا: حضرت! آپ کی اتنی زبردست شہرت عالم میں ہے مگر ابھی تک آپ طعام و شراب کے غم میں ہیں۔ مجھے اس کا یہ جواب پسند آیا۔ میں نے امتحاناً اُسے ہمراہ لیا کہ دیکھیں اپنے دعویٰ میں کہاں تک سچا ہے۔ سات شبانہ روز بادیہ پیائی کرتے رہے۔ ساتویں روز اُسے بھوک پیاس نے اتنا تنگ کیا کہ کہنے لگا: ابراہیم! آپ کی کرامات و عرفان کا ڈھول دنیا میں لوگ بجاتے ہیں لیکن اب میں مجبور ہوں کہ آپ کی ولایت کا انکار کر دوں، اس لیے کہ اب بھوک پیاس نے میری تمام طاقت سلب کر لی ہے۔ میں نے سرعجز بارگاہِ بے نیاز میں جھکایا، اور عرض کی: الہی! مجھے اس کافر کے سامنے رسوا نہ کر، اب تک اس کا خیال باوجود بیگانہ ہونے کے، میرے ساتھ اچھا ہے، تیرے کرم سے بعید نہیں کہ ایک کافر کے حسنِ ظن کو جو میرے ساتھ حسنِ اعتقاد تک پہنچا دے۔ فرماتے ہیں: جب میں نے سر اٹھایا تو ایک طبق دیکھا جس میں دو روٹیاں اور دو پیالے پانی کے رکھے تھے۔ ہم دونوں نے وہ کھاپی کرتازگی حاصل کی اور چل دیئے۔

جب سات روز گزر گئے تو میں نے اپنے دل سے کہا کہ آج میں اس راہب کا بھی تجربہ کروں۔ قبل اس کے کہ یہ میرا امتحان کرے اور کچھ مجھ سے مانگے۔ میں نے کہا: اے راہب! کچھ لا کہ آج تیری باری ہے، اپنے مجاہدہ کا پھل دکھلا۔ اس نے بھی سر زمین پر رکھا اور کچھ کہا کہ ایک طبق ظاہر ہوا جس میں چار روٹی اور چار پیالے پانی کے موجود تھے۔ مجھے اس پر سخت تعجب ہوا اور اپنے گزشتہ ایام کی یاد میں رنجیدہ ہو کر میں نے یہ فیصلہ کیا کہ مجھے یہ کھانا نہیں ہے، اس لیے کہ کافر کے

لیے آیا ہے۔ اگر میں اس میں سے کھاؤں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ میں کافر سے مدد لوں۔
 راہب کہنے لگا: ابراہیم کھاؤ۔ میں نے کہا: نہیں۔ کہنے لگا کیوں؟ میں نے کہا: اس لیے کہ تو اس امر کا
 اہل نہیں اور اسے میں کرامت نہیں مانتا، اس لیے کہ کرامت تیرے حال سے بعید ہے مگر مجھے تعجب
 ضرور ہے اور میں فکر میں ہوں کہ اس کو میں کیا کہوں۔ اگر تیری کرامت کہتا ہوں تو کافر سے کرامت
 محال ہے اور اگر معونت کہوں جو کافر کے ساتھ ہو سکتی ہے تو بھی مدعی کو شبہ ضرور ہوتا ہے۔

راہب کہنے لگا: ابراہیم! نوش فرمائیں۔ میں آپ کو دو بشارتیں دیتا ہوں: پہلے یہ کہ میں
 مسلمان ہوں۔ اَشْهَدُ اَنْ لَا اِلَهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُوْلُهُ۔ دوسرے یہ کہ آپ
 کا مرتبہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں بہت بلند ہے۔ میں نے کہا: وہ کیسے! کہنے لگا: حضرت میرے پاس
 اس قسم کی کوئی قوت نہ تھی جو آپ نے دیکھی۔ مگر میں نے آپ کے وسیلہ سے سر زمین پر رکھا اور عرض
 کی: الہی! اگر دین محمد ﷺ حق ہے اور تیرا پسندیدہ ہے تو مجھے بھی دو قرص اور دو پیالہ پانی کے
 عطا فرما اور اگر ابراہیم خواص تیرا ولی ہے تو اس کی ولایت کے صدقے دو روٹی اور دو پیالہ پانی عطا
 فرما۔ جب سر اٹھایا تو یہ طبق میرے سامنے رکھا تھا۔ حضرت ابراہیم خواص رضی اللہ عنہ نے یہ سب
 قصہ سن کر اس طبق سے تناول فرمایا اور وہ راہب اس کے بعد اسلامی مشائخ کرام میں شمار ہوا۔ اور
 یہ نبی کریم ﷺ کا عین معجزہ ہے، جو کرامت ولی کے پردہ میں چھپا ہوا ہے اور بالخصوص یہ بہت
 نادر امر ہے کہ نبی کی غیبت میں غیر برہان دکھائے اور وہ بھی ایک ولی کی موجودگی میں غیر کے
 ذریعے کرامت ظاہر ہوئی۔

اور یہ بھی حقیقت واقعہ ہے کہ ملتہی ولایت کو مبتدئی ولایت کے سوا کوئی نہیں جان سکتا اور
 یہ راہب کے لیے ولایت ابراہیم خواص نہایت پوشیدہ چیز تھی اور (علم اللہ میں اسے ولی ہونا تھا) تو
 اللہ تعالیٰ نے اس پر مرتبہ ابراہیم خواص اور دین حق کی حقانیت اس صورت میں ظاہر فرمادی جیسے جادو
 گران فرعون پر کہ انہوں نے اسلام لانے سے قبل موسیٰ علیہ السلام کا مرتبہ جان لیا تھا تو حضرت
 ابراہیم رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ کے معجزہ کی سچائی کا ثبوت دیا اور اس نے صداقت ولایت
 وحقانیت اسلام کا۔ اور معجزہ اور کرامت کے مابین فرق بین ہے۔

اس بحث میں بہت زیادہ مضامین ہیں۔ لیکن یہ کتاب ان سب کے بیان کی متحمل نہیں۔
 اتنا یاد رکھو کہ کرامت اولیاء کرام میں یہ اور کرامت ہے کہ وہ اسے مخفی رکھیں کہ رفقاء کرامت میں
 شرط ولایت ہے۔

چنانچہ کوئی ولی اپنی کرامت بالا راہہ تکلیف ظاہر نہیں فرماتا اور نہ انہیں ایسا کرنا زیبا ہے۔

میرے شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ اگر ولی اپنی ولایت ظاہر کر دے اور اس سے اپنی صحتِ حال کا دعویٰ قائم رکھے تو نقصان نہیں لیکن مظاہرہ ولایت کے لیے بالارادہ تکلف اگر ظاہر کرے تو اس سے رعوت پیدا ہوتی ہے اور یہ مضر ہے۔ وَاللّٰهُ تَعَالٰی اَعْلَمُ۔

مدعی الوہیت سے ظہورِ معجزہ

مشائخِ صوفیہ اور تمام اہلسنت وجماعت اس امر پر متفق ہیں کہ کافر کے ہاتھ سے بھی کوئی ایسا فعل ظاہر ہو سکتا ہے جو خارقِ عادت ہو اور مثل معجزہ یا کرامت کے ظاہر ہو اور تمام اسبابِ شبہ اس کے ظہور سے منقطع ہو جائیں اور کسی کو اس کے کذاب ہونے میں شک نہ ہو اور اس فعل کا ظہور اس کے کاذب ہونے کے لیے مغائر ہو۔

یہ ایسے ہی ہے جیسے کہ فرعون لعین (کہ اس کا نام رقیون تھا جو موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ میں تھا) اس نے چار سو برس کی عمر پائی اور اسی مدتِ العمر میں اسے کوئی بیماری اور مرض نہ ہوا اور پانی اس کے پیچھے پیچھے چلتا۔ جب یہ کھڑا ہو جاتا، پانی بھی کھڑا رہ جاتا، لیکن باوجود اس کے عقلاء کی نظر میں یہ جھوٹا تھا اور اس کے خدائی دعویٰ کی تصدیق سمجھ داروں نے نہیں کی۔ وہ جانتے تھے کہ اللہ تعالیٰ مجسم و مرکب نہیں۔ علاوہ ازیں اگر اور بھی ایسے خارقِ عادت افعال اس سے ظہور میں آتے تو عقلاء اس کے کذبِ دعویٰ میں کبھی شک نہ کرتے۔

اور ایسے ہی شداد، صاحبِ ارم (یعنی جس نے دنیا میں ارم کے نام سے بہشت بنایا تھا) اس کا حال ہے اور ایسے ہی نمرود کے بہت سے واقعات ہیں اور اس پر قیاس کر لو، اور اسی قسم کے واقعات سے ہمارے منبر صادق ﷺ نے خبر دی اور بتایا کہ آخر زمانہ میں دجال خارج ہوگا اور خدائی کا دعویٰ کرے گا اور اس کی چپ و راست میں دو پہاڑ ہوں گے۔ داہنی طرف والا پہاڑ نمونہ بہشت ہوگا اور بائیں طرف والا نمونہ جہنم۔ مخلوق کو اپنی الوہیت تسلیم کرانے پر دعوت دے گا۔ جو اس پر ایمان نہ لائے گا اس پر عذاب کرے گا اور اللہ تعالیٰ اس کے ہاتھ سے لوگوں کو موت و حیات کا مشاہدہ کرائے گا وہ اپنی گمراہی و ضلالت میں جسے چاہے گا مار دے گا، جسے چاہے گا زندہ کر دے گا۔ دنیا میں دجال کا حکم مطلق ہوگا۔ لیکن اس کے علاوہ اگر اس سے سوگنا افعال بھی وہ دکھائے تو عقلاء اس کے کاذب ہونے میں شک نہ کریں گے۔ عاقل یقینی طور پر سمجھ لے گا کہ اللہ تعالیٰ گدھے سوار نہیں ہے اور وہ ذات ہے کہ کبھی متغیر و متلون نہیں ہو سکتی، وہ اندھا نہیں۔ غرضیکہ ایسے امور جو اس قسم کے آدمی سے صادر ہوں، اسے استدراج کہتے ہیں (اس کا نام کرامت یا معجزہ رکھنا ہی غلط ہے)۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ مدعی نبوت کاذب سے بھی ایسے افعال ظاہر ہو جائیں مگر یہ اس

کے کذب کی دلیل ہوتے ہیں۔ اگرچہ ایسے ہی امور خارق عادات ایک سچے نبی کے ہاتھ سے بھی ظاہر ہوتے ہیں مگر وہ اس کے صدق کی دلیل ہوتے ہیں۔

لیکن یہ ہرگز ممکن نہیں کہ جھوٹے سے کوئی ایسا فعل بھی ظاہر ہو سکے جس میں دیکھنے والوں کو نبوتِ صادقہ کا شبہ ہو جائے اور اگر ایسا بھی ہونا ممکن ہوتا تو پھر سچے کو جھوٹے سے پہچاننا مشکل تھا اور حقیقت بھی یہی ہے کہ ایسی صورت میں طالبِ حق کے سچا سمجھتا اور کسے جھوٹا۔ اس حالت میں حکمِ نبوتِ صادقہ ہی باطل تھا۔ (۱)

ہاں! یہ روا ہے کہ مدعی ولایت سے کرامت کی مثل کوئی ایسی بات ظاہر ہو جائے جو دین میں درست ہو، اگرچہ اس کا عمل اچھا نہ ہو۔ اس لیے کہ وہ رسول کی صداقت کا ثبوت ہے اور اپنے رب کا فضل ظاہر کرتا ہے، نہ یہ کہ وہ اس فعل کو اپنی قوت کی طرف نسبت کرے اور اصلیتِ ایمان میں بلا دلیل راست گو ہو۔ وہ تمام حالات میں اعتقاد کے ساتھ ولایت میں راست گو ہوتا ہے کیونکہ جب اس کا اعتقاد تمام حالات میں ولی کے اعتقاد کی صفت سے ہوتا ہے، تو اگرچہ اس کے عمل اس کے اعتقاد کے موافق نہ ہوں، مگر ترک عمل کی وجہ میں دعویٰ ولایت اس سے ضبط نہیں ہوتا۔ جیسے دعویٰ ایمان (کہ وہ بلا عمل بھی درست ہے) اور درحقیقت منصبِ ولایت و کرامت کسی نہیں۔ (۲)

تو خلاصہ یہ ہے کہ کسب و عمل انسان ہدایت کے لیے علت نہیں ہے۔ جیسا کہ اس سے قبل ہی ہم بتا چکے ہیں کہ اولیاء کرام معصوم نہیں ہوتے اس لیے کہ عصمت شرطِ نبوت ہے نہ کہ شرطِ ولایت۔ مگر اولیاء الہی ہر قسم کے آفاتِ معصیت سے محفوظ ضرور ہوتے ہیں۔

اس لیے کہ وجودِ معصیت نفی ولایت کی مقتضی ہے اور نفی ولایت، نفی ایمان کی مقتضی نہیں اس لیے کہ نفی ایمان ردت ہے نہ کہ معصیت۔ یہ حضرت حکیم ترمذی محمد بن علی رضی اللہ عنہ کا مسلک ہے۔

اور اسی پر حضرت جنید بغدادی اور حضرت ابوالحسن نوری اور حضرت حارث محاسبی اور دیگر اہل حقائق رضوان اللہ علیہم اجمعین کا اتفاق ہے۔ لیکن جو اربابِ عمل ہیں حضرت سہل بن عبد اللہ تستری اور حضرت ابوسلیمان دارانی اور حضرت ابو حمدون قصار وغیرہ رضی اللہ عنہم اجمعین ان کا

۱۔ مثلاً وحی کا نزول، ملائکہ کا درود وغیرہ (از مترجم)

۲۔ کہ جسے انسان اپنے مجاہدہ و ریاضت سے حاصل کر سکے۔ بقول سعدی علیہ الرحمۃ:

ایں سعادت بزورِ بازو نیست تانہ بخشند خدائے بخشندہ

یعنی جب مبداءِ فیاض سے افاغہ ولایت و کرامت ہو بلکہ مواہبِ حق سے اس کا تعلق ہے تو ولی ولی ہو سکتا ہے۔

مسک ہے کہ شرط ولایت مداومت اطاعت ہے۔ حتیٰ کہ اگر ولی کے دل پر کسی کبیرہ کا خطرہ بھی گزرتا ہے تو وہ ولایت کے منصب سے معزول ہو جاتا ہے۔

مگر ہم اس سے پہلے بھی لکھ چکے ہیں کہ اس امر پر اجماع امت ہے کہ بندہ کبیرہ کے ارتکاب سے بھی خارج از ایمان نہیں ہوتا اور کوئی ولایت سے افضل نہیں ہے تو جب درجہ معرفت جو اصل جمیع کرامات ہے، معصیت سے زائل نہیں ہوتا (تو محض ولایت کیونکر زائل ہو سکتی ہے) بلکہ محال ہے کہ جو چیز معرفت سے درجہ میں کمتر ہے وہ معصیت سے زائل ہو اور یہ اختلاف مشائخ کرام میں بہت لمبا ہے۔ اس مقام پر میرا مقصود اس بحث میں کسی کے دعویٰ کا ثبوت دینا نہیں ہے بلکہ میرا مقصد اس مقام پر اس اہم حقیقت کا سمجھانا ہے کہ ولی پر کرامت کس حال میں ظاہر ہوتی۔ صحو میں، سکر میں، غلبہ میں یا تمکین میں۔

صحو اور سکر کی شرح تو ہم حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کے مسک کے بیان میں مفصل کر چکے ہیں۔ مگر حضرت بایزید اور ذوالنون مصری اور محمد بن خفیف اور حسین بن منصور اور یحییٰ بن معاذ رحمہم اللہ اور ایک جماعت کہتی ہے کہ ولی پر اظہار کرامت کا بہت سکر ہوتا ہے، اس کے سوا نہیں اور جو بحالت صحو ظاہر ہو وہ کرامت نہیں بلکہ ولی کے پردہ میں نبی کا معجزہ ہے۔ ان کے مذہب کے مطابق معجزہ اور کرامت میں بھی فرق ہیں ہے کہ کرامتوں کا اظہار ولی کی حالت سکر میں ہوتا ہے جب کہ وہ مغلوب الحال ہو اور اس کے لیے دعوت نہیں ہوتی اور نبی پر اظہار معجزہ بحالت صحو ہوتا ہے تاکہ وہ لوگوں پر اپنی تصدیق نبوت میں ظاہر کرے اور قوم کو طلب معارضہ کے لیے بلائے۔ صاحب معجزہ حکم کی دونوں اطراف پر مختار ہوتا ہے۔

چنانچہ ایک اس کے ظاہر کرنے پر معارضہ چاہتا ہے دوسرا اس کے پوشیدہ کرنے پر۔ پھر ولیوں کے لیے یہ بات نہیں بلکہ وہ کبھی کرامت دکھانا بھی چاہیں تو ممکن ہے نہ دکھا سکیں اور کبھی وہ نہ دکھانا چاہیں اور ظاہر ہو جائے۔ اس لیے کہ ولی دعوت کرنے والا نہیں ہوتا کہ اس کا حال بقاء اوصاف سے منسوب ہو بلکہ وہ پوشیدہ ہوتا ہے اور اس کا حال صفت کی فنا سے موصوف ہوتا ہے۔

تو خلاصہ یہ نکلا کہ ایک صاحب شرع ہے دوسرا صاحب سر۔ تو چاہیے کہ کرامت کا اظہار حال غیبت و وحشت کے سوا کسی حال میں ظاہر نہ ہو اور اس کے تمام تصرفات تصرف حق کے ساتھ ہوں اور اس کے کسی قسم کے حال میں تمام بول چال تالیف حق سے ہو۔ اس لیے کہ صفت بشریت کا تحقق یا لایہی (۱) کو ہوتا ہے یا سہی (۲) کو یا عام بندگان الہی کو اور انبیاء کرام لایہی و سہی نہیں

ہوتے۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ انبیاء کرام (علیہم السلام) کے سوا مطلق عبد الہی نہیں ہوتے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اولیاء کرام کے سوا (جرم عوام کی طرف خاص صورت کے سوا لاحق بھی نہیں ہوتا) تو اس جگہ اولیاء ہی رہے کہ جب تک ان پر اقامت حال بشریت ہو وہ باخود ہوتے ہیں اور جب ان پر (تجلیات الہی کا انکشاف ہوتا ہے) تو وہ مکاشف ہو کر بحالت بیخودی متحیر ہو جاتے ہیں اور الطاف حق کے حقیقت و نتیجہ کو نہ پاتے ہوئے دریائے تحیر میں مستغرق رہتے ہیں۔ یہی وہ مقام ہے جس کے اندر اظہار کرامت ہوتا ہے، اس کے سوا نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ یہی درجہ تقرب ہے اور یہی وہ مقام اور وقت ہے کہ عارف کی نظر میں حجر و ذہب سب یکساں ہوں۔

علاوہ اس کے کسی حال میں انبیاء کرام کے سوا کسی انسان کو یہ حقیقت نہیں ملتی۔ مگر اسے جس میں عاریتہ یہ کیفیت پیدا ہو جائے اور یہ کیفیت عاریتہ سوائے سکر کے نہیں ہوتی۔ جیسے حضرت حارث بن زید رضی اللہ عنہ ایک روز دنیا سے علیحدہ ہو گئے اور دنیا و عاقبت کے مکاشف بن گئے اور کہنے لگے: عَرَضْتُ نَفْسِي عَنِ الدُّنْيَا فَاسْتَوَىٰ عِنْدِي حَجْرَهَا وَذَهَبَهَا وَفِضَّتْهَا وَمَدَّرَهَا. ”میں نے اپنے نفس کو دنیا سے معرض کر لیا تو میرے نزدیک دنیا کا پتھر اور سونا چاندی اور کنکر سب یکساں ہو گئے۔“ دوسرے روز آپ کو دیکھا کہ خرما کا کام کر رہے تھے۔ لوگوں نے پوچھا، حارث کیا کر رہے ہو؟ فرمایا: روزی تلاش کر رہا ہوں، اس لیے کہ اس کے بغیر چارہ نہیں، وہ ساعت وہ تھی، یہ ساعت یہ ہے۔

تو مقام صحو میں اولیاء کرام کو درجہ عوام ملتا ہے اور مقام سکر میں ان کو درجہ انبیاء سے وابستہ کیا جاتا ہے۔ جب اس مقام پر اتر کر باخود ہوتے ہیں تو اپنے کو عوام کی حیثیت میں جانتے ہیں اور جب بیخود ہو کر اپنے سے منحنی ہو جاتے ہیں تو بحق راجع ہوتے ہیں۔

اور ان کا یہ سکر اتنا مہذب ہوتا ہے کہ اپنے کو سوائے ذات حق کے کسی سے وابستہ نہیں رکھتے اور تمام عالم کو اپنے حق میں مثل سونے کے سمجھتے ہیں۔ شبلی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں:

ذَهَبٌ أَيْنَمَا ذَهَبْنَا وَدُرٌّ حَيْثُ دُرْنَا وَفِضَةٌ فِي الْفَضَاءِ

”جہاں ہم گئے سونا ہی تھا اور جہاں ہم نے دورہ کیا موتی ہی ملے اور میدانوں میں چاندی ہی چاندی تھی۔“ میں نے استاذ ابو القاسم قشیری سے سنا۔ فرماتے تھے کہ میں نے ایک بار طائرانی سے پوچھا کہ آپ اپنا ابتدائی حال سنائیں۔ فرمایا: ایک وقت مجھ پر وہ تھا کہ ایک پتھر کی ضرورت پڑی، رودخانہ سرخس میں جو پتھر میں نے اٹھایا وہی جوہر بن گیا۔ میں نے اُسے پھینک دیا۔ یہ اس لیے نہیں کہ ان کی نظر میں جوہر اور پتھر یکساں تھے، بلکہ اس لیے کہ انہیں پتھر کی ضرورت

تھی، جو ہر درکار نہ تھا۔

حضرت خواجہ امام خزری رحمۃ اللہ علیہ سے میں نے سنا ہے۔ فرماتے تھے کہ میں سرخس میں لڑکوں کی عمر کا تھا اور قرمز کے لیے شہتوت کے درخت کے پتے جھاڑنے کو ایک محلہ میں گیا اور پتے جھاڑ رہا تھا کہ شیخ ابوالفضل بن حسین رحمۃ اللہ علیہ اس کو چے سے گزرے۔ میں درخت پر تھا۔ آپ نے مجھے نہ دیکھا، میں نے ان کی طرف سے کوئی شک نہ کیا بلکہ میں نے اس امر پر یقین کیا کہ وہ از خود غائب اور بدل بارگاہِ حق میں حاضر ہیں اور اس حال میں خوش ہیں، کہ یکا یک آپ نے سر مبارک اٹھایا اور فرمایا: الہی! ایک سال سے زائد ہو گیا کہ تو نے مجھے ایک وانگ بھی نہ دیا کہ سر کے بال تو درست کر لیتا، کیا اپنے دوستوں کے ساتھ ایسا ہی کرتے ہیں! امام خزری فرماتے ہیں کہ اسی وقت شہتوت کے تمام پتے اور ڈالیاں، تنا اور جڑ سب زریں ہو گئے۔

آپ نے یہ دیکھ کر فرمایا: تعجب ہے، آپ کی بارگاہ میں کنا یہ کرنا بھی موجب اعراض ہے۔ مقصد تو میرا یہ تھا کہ کشائشِ قلب کے لیے کوئی نعمت ملے اور یہ ظاہر یہ فرمایا۔ بے شک آپ کے حضور زبان ہلانا ہی جرم ہے۔

حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ آپ نے چار ہزار دینار دجلہ میں پھینک دیئے۔ لوگوں نے کہا: شبلی کیا کر رہے ہو۔ فرمایا پتھروں کو پانی میں ہی رہنا بہتر ہے۔ لوگوں نے کہا کہ حضرت! بجائے اس کے کہ دریا میں پھینکے لوگوں کو کیوں نہ دے دیئے۔ فرمایا: تم لوگ بھی خوب ہو۔ میں اپنے رب سے یہ چاہوں کہ میرے دل سے حجاب اٹھ جائے اور اس حجاب کو اپنے مسلمان بھائیوں پر ڈال دوں۔ یہ شرطِ دیانت نہیں کہ اپنے بھائی کے لیے وہ چیز پسند کروں جو اپنے لیے بدتر جان رہا ہوں (۱) اور یہ تمام کیفیت بحالتِ سکر ہوتی ہے۔

اس کی شرح ہم بیان کر چکے ہیں۔ یہاں تو اس کے بیان سے مقصود صرف اثباتِ کرامت ہے۔

پھر حضرت جنید بغدادی اور حضرت ابوالعباس سیاری اور حضرت ابو بکر واسطی اور حضرت محمد بن علی ترمذی رضی اللہ عنہم اجمعین اس امر پر متفق ہیں کہ کرامت بحالتِ صحو و تمکین ظاہر ہوتی ہے، نہ کہ حالتِ سکر میں، اور یہ تمام کے تمام اصحابِ مذہب ہیں۔

اس لیے کہ اولیاءِ الہی مدیرانِ ملک اور احوالِ عالم کے خبردار اور تمام عالم کے والی ہوتے ہیں اور نظامِ عالم ان کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ ہر قسم کے حل و عقدان سے وابستہ ہوتے ہیں اور احکام

عالم میں ان کا تصرف ہوتا ہے۔ بنا بریں یہ ضروری ہے کہ ان کی رائے تمام اہل الرائے پر فائق ہو اور تمام قلوب کے مقابلے میں مخلوق کے ساتھ ان کا دل شفیق تر ہو کیونکہ یہ لوگ خدا رسیدہ ہوتے ہیں اور ان کی ابتداءِ حال میں تلوین و سکر ہوتا ہے۔

اور جب ان کے حال کا بلوغ ہوتا ہے تو وہی تلوین تمکین کے ساتھ متبدل ہو جاتی ہے اور پھر وہ ولی حقیقتا ولی ہوتا ہے اور اس کی کرامتیں صحیح ہوتی ہیں۔

اہل طریقت میں مشہور ہے کہ اوتاد ہر شب میں تمام جہان کی سیر کرتے ہیں اور اس سیر میں جو جگہ ان کی سیر سے رہ جاتی ہے وہاں لازمی طور پر خلل واقع ہوتا ہے۔ تو وہ اسی وقت قطب مدار کو حکم کرتے ہیں تاکہ وہ اپنی توجہ اور ہمت اس طرف مبذول کرے اور وہ خلل و نقصان ان کی برکت سے اللہ تعالیٰ زائل فرمادے۔

اور جو یہ کہتے ہیں کہ عرفاء کے نزدیک سونا اور پتھر یکساں ہیں، یہ درحقیقت کیفیت سکر ہے اور دیدارِ یار نہیں نقصان اور کمی کے اندر ہوتا ہے اور یہ کوئی بڑا کمال نہیں، بلکہ کمال یہی ہے کہ عارف کی نظر میں سونا سونا ہو اور پتھر پتھر، مگر ان کی آفات پر ان کی نظر ہو اور وہ صاف کہہ سکیں: **يَا صَفْرَاءُ يَا بَيْضَاءُ غَيْرِي غَيْرِي لَا نَبِيَّ لَا أَمُوتُ مَعَكُمْ**۔ ”اے سونے چاندی! میرے سوا کسی اور کو مغرور بنا، میں تیرے ساتھ مغرور نہیں ہو سکتا۔“ (جیسا کہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے بیت المال میں مال کی فراوانی ملاحظہ فرما کر کہا تھا) تو جس پر سیم و زر کی آفت منکشف ہے اس کے لیے یہ سیم و زر آفت محل نہیں اور اس سے ان پر حجاب نہیں آتا بلکہ حقیقتاً وہ اسے ترک کرتے ہیں اور اس کا ثواب پاتے ہیں۔

اور جس کی نظر میں زر و کلوخ یکساں ہیں انہیں ترک کرنے سے کیا فائدہ اور ان کی طرف سے حکم ترک بھی بیکار ہے۔ تم نے دیکھا نہیں کہ حضرت حارث جب تک صاحب سکر رہے فرماتے تھے کہ میرے نزدیک زر و سنگ، کلوخ و نقرہ سب یکساں ہیں اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ صاحب صحت تھے اور آفات فیض دنیا دیکھ چکے تھے اور اس کے ترک میں جو ثواب تھا وہ آپ پر روز روشن کی طرح عیاں تھا۔ جب دنیا اور مال دنیا سے ہاتھ اٹھایا تو حضور ﷺ نے فرمایا: صدیق! بیوی بچوں کے لیے کیا چھوڑ کر آئے ہو۔ عرض کی: اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) کو۔

حضرت ابو بکر و راق ترمذی رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ ایک روز حضرت محمد بن علی رحمۃ اللہ علیہ نے مجھے فرمایا کہ اے ابو بکر و راق! ہم تجھے آج ایک جگہ لے جائیں گے۔ میں نے عرض کی کہ حضور کا جہاں حکم ہو میں وہاں چلوں گا۔ چنانچہ حضرت محمد بن علی رحمۃ اللہ علیہ کے

ساتھ چلا اور تھوڑی دیر چلا تھا کہ ایک جنگل نظر آیا جو بکٹ اور دشوار گزار تھا اور اس کے اندر ایک زڑیں تخت بچھا ہوا دیکھا اور ایک سبز درخت کے نیچے ایک چشمہ جاری نظر آیا اور ایک بزرگ دیکھے جو اس تخت پر نہایت شاندار لباس میں تشریف فرما تھے۔

جب حضرت محمد بن علی رحمۃ اللہ علیہ اُن کے نزدیک پہنچے تو وہ بزرگ اُٹھے اور آپ کو اس تخت پر بٹھالیا۔ تھوڑی دیر گزری تھی کہ ہر طرف سے لوگ آنے لگے۔ حتیٰ کہ چالیس آدمی اس جگہ جمع ہو گئے۔ پھر اُنہوں نے، جو تخت زڑیں افروز تھے، آسمان کی طرف اشارہ کیا، یکا یک کچھ کھانے کی چیز آگئی۔ ہم سب نے اُسے کھایا۔ پھر حضرت محمد بن علی ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے ان سے کوئی سوال کیا۔ اُنہوں نے بہت تفصیل سے اس کا جواب دیا مگر میں ان کی گفتگو کو بالکل نہ سمجھ سکا۔ اس کے بعد سب نے اجازت لی اور رخصت ہوئے۔ مجھے بھی حکم ہوا کہ تو بھی جا، اب تو نیک اور سعید ہو گیا۔ کچھ عرصہ کے بعد جب ہم ترمذ سے واپس آئے تو میں نے حضرت محمد بن علی رحمۃ اللہ علیہ سے دریافت کیا کہ حضور وہ کون سا مقام تھا اور وہ تخت پر جو تشریف فرما تھے کون تھے۔ فرمایا وہ مقام ”تیبہ بنی اسرائیل“ تھا اور وہ بزرگ قطب مدار تھے۔

میں نے عرض کی حضور اتنی سی مدت میں ترمذ سے بنی اسرائیل کے جنگل میں ہم کیونکر پہنچ گئے۔ فرمایا، ابو بکر تجھے پہنچنے سے کام تھا، پوچھنے سے غرض نہیں ہونی چاہیے۔ یہ علامت صحت حال کی ہے نہ کہ سکر کی۔

اب ہم اس بحث کو مختصر کرتے ہیں۔ اس لیے کہ اگر ہم اس کی تفصیل کی طرف مشغول ہو گئے تو کتاب طویل ہو جائے گی اور مقصود بیان رہ جائے گا۔

اب ہم بعض دلائل اور کرامات و حکایات بیان کریں گے تاکہ پڑھنے والا متنبہ ہو جائے اور علماء کے لیے ان کے بیان میں قوت دے اور محقق لوگوں کے لیے بہترین تذکرہ ہے اور عوام کو یقین حاصل کرنے میں مدد ملے اور ان کے شبہات رفع ہوں۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

کراماتِ اولیاء

یاد رکھو کہ جب کرامتوں کا ثبوت دلیل عقلی سے ثابت ہو گیا تو اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دلیل نقلی سے بھی اس کا ثبوت واضح ہو جائے اور جو صحیح احادیث میں آیا ہے اور کتاب و سنت سے اس کی صحت ثابت ہے تو اس کا انکار کرنا نص کا انکار کرنا ہے۔ اس لیے کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَوَضَّلْنَا عَلَيْكُمْ الْغَمَامَ وَأَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّانَ وَالسَّلْوٰی ط﴾ (۱) ”تم پر ہم نے بادلوں

کا سایہ کیا اور تمہارے لیے تم پر من و سلویٰ نازل فرمایا۔“ منکروں میں سے کوئی اگر کہے کہ وہ موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ تھا اور ہم معجزہ کے قائل ہیں، تو ہم کہتے ہیں کراماتِ اولیاء درحقیقت حضور ﷺ کا معجزہ ہے۔ اگر منکرین کہیں کہ یہ کرامتیں غیبت میں ہیں، ہم پر واجب نہیں کہ ہم اسے حضور ﷺ کا معجزہ تسلیم کریں ان کا معجزہ وہی تھا جو ان کے وقت میں تھا۔

ہم کہتے ہیں کہ جب موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل سے غائب ہوئے اور کوہ طور پر تشریف لے گئے تو ان کی غیبت میں جو کچھ ظاہر ہوا وہ سب ان کی ہی طرف منسوب ہے۔ تو زمان اور مکان کی غیبت مساوی ہے۔ تو جب غیبت مکان میں یعنی موسیٰ علیہ السلام کے غائب ہونے کے بعد ان کا معجزہ روا ہے تو اس مقام پر صرف غیبتِ زمانی حضرت محمد ﷺ کی ہے اور اولیاء کرام کا موجود ہونا ان کے زمانہ کی دلیل ہے تو ایسی صورت میں حضور ﷺ کے معجزات کا ظہور پردہ اولیاء میں کیوں ناروا ہوا۔

دوسرے حضرت آصف بن برخیا کی جو کرامت ہے، وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی موجودگی میں ہے۔ چنانچہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے چاہا کہ تختِ بلقیس اس کے آنے سے پہلے آئے اور فرمایا: تم میں کون ہے جو اس تخت کو بلقیس کے آنے سے پہلے ہمارے سامنے پیش کرے۔ تو قرآن کریم میں ارشاد ہے: ﴿قَالَ عِفْرِيتٌ مِّنَ الْجِنِّ اَنَا اَتِيكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ تَقُوْمَ مِنْ مَّقَامِكَ﴾ (۱) ”ایک جن نے عرض کی، میں اس تخت کو آپ کے دربار سے اٹھنے سے پہلے حاضر کر سکتا ہوں۔“ سلیمان علیہ السلام نے فرمایا: اس سے بھی پہلے وہ پیش کیا جائے۔ تو حضرت آصف بن برخیا نے عرض کی: ﴿اَنَا اَتِيكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّرْتَدَّ اِلَيْكَ طَرْفُكَ﴾ فَلَمَّا رَاَهُ مُسْتَقِرًّا عِنْدَهَا ﴿۲﴾ ”میں آپ کے پلک جھپکنے سے پہلے وہ تخت حاضر کیے دیتا ہوں۔“ تو جب سلیمان علیہ السلام نے اس تخت کو اپنے پاس دیکھا تو فرمایا: ﴿هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّي﴾ (۳) ”یہ میرے رب کا فضل ہے“ اور اس دعوے سے حضرت سلیمان علیہ السلام نے انکار نہ فرمایا بلکہ وہ کرامتِ آصف دیکھ کر خوش ہوئے۔ اور فرمایا: ﴿هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّي﴾ (۴) اور یہ حقیقت واقعہ ہے کہ تخت کا ملکِ سبا سے طرفہ العین میں حاضر کر دینا کسی صورت سے معجزہ سے کم نہ تھا بلکہ یہ کرامت تھی۔ اس لیے کہ آصف بن برخیا ہرگز پیغمبر نہ تھے اور معجزہ پیغمبر کے سوا جائز نہیں۔ لامحالہ ماننا پڑے گا کہ یہ معجزہ نہ تھا بلکہ کرامت تھی۔ اگر معجزہ ہوتا تو حضرت سلیمان علیہ السلام کے دستِ حق پرست سے اس کا مظاہرہ ہوتا۔

۱۔ سورۃ النمل: ۳۹

۲۔ ایضاً: ۴۰

۳۔ ایضاً

۴۔ ایضاً

دوسرے ہمیں قرآن کریم نے قصہ مریم علیہا السلام میں خبر دی ہے کہ جب زکریا علیہ السلام حضرت مریم علیہا السلام کے پاس تشریف لائے تو ان کے پاس تیز گرمی کے موسم میں، سردی کے موسم کے میوے دیکھے اور تیز سردی میں گرمی کے۔ حتیٰ کہ آپ نے ان سے دریافت فرمایا: ﴿أَتَىٰ لَكَ هَذَا﴾ (۱) ”اے مریم! یہ میوے تمہارے پاس کہاں سے آتے ہیں۔“ حضرت مریم علیہا السلام نے جواب میں عرض کی: ﴿قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ﴾ (۲) ”کہا یہ سب میرے رب کی طرف سے آتے ہیں۔“ حالانکہ یہ ناقابل انکار حقیقت ہے کہ حضرت مریم علیہا السلام پیغمبر نہ تھیں اور حضرت جلت مجد عز اسمہ نے ہم کو غیر مبہم الفاظ میں دوسری جگہ خبر دی اور ان کے حالات سے مطلع فرمایا۔ جیسا کہ ارشاد ہے: ﴿وَهَؤُتَىٰ إِلَيْكَ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسْقِطُ عَلَيْكَ رَطْبًا جَنِيًّا﴾ (۳) ”اے مریم! اپنی طرف سے اس خرمہ کے درخت کی ڈالی ہلاؤ یہ تمہیں تازہ خرمہ گرائے گا۔“ علاوہ ازیں قصہ اصحاب کہف میں اس کتے کا اصحاب کہف کے ساتھ مکالمہ کرنا اور ان کا اس غار میں ایک مدت مدید تک سونا۔ پھر بحالت خواب ان کا کروٹیں بدلنا اور دائیں بائیں پلٹنا۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَنَقَلْنَاهُمْ ذَاتَ الْيَمِينِ وَذَاتَ الشِّمَالِ ۗ وَكَلْبُهُم بَآئِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيدِ﴾ (۴) ”اور ہم انہیں دائیں بائیں کروٹ پر بدلتے ہیں اور ان کا کتا اپنے بازو پھیلائے غار کے دہانہ پر ہے۔“ یہ تمام باتیں خارق عادات امور میں سے ہیں۔

اور یہ ناقابل انکار حقیقت ہے کہ یہ معجزہ نہیں تو لازمی طور پر ماننا پڑے گا کہ یہ کرامت ہے۔ ہاں یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ کرامت بمعنی استجاب دعوات ہو کہ شے موہوم و معدوم اس کے ذریعہ حاصل ہوتی اور ایسی شان سے کہ بعد مسافت سے ساعتوں میں تخت آگیا اور کیا کیا ہوا۔ غیر مقرر مقام پر اچانک کسی چیز کا آجانا۔ یہ ایسی باتیں ہیں جو انسان کے وہم و گمان سے بالاتر ہیں اور اسی کے موافق مضامین احادیث صحیحہ میں حضور ﷺ سے وارد ہیں۔ چنانچہ حدیث الغار کا واقعہ بھی ایسا ہی ہے کہ ایک دن صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم بارگاہ رسالت میں عرض پیرا ہوئے کہ حضور! ہمیں عجائبات امم ماضیہ کا کچھ فرمائیں۔

۱۔ چنانچہ حضور ﷺ نے فرمایا: تم سے قبل تین آدمی کہیں جا رہے تھے۔ جب شام ہو گئی تو شب باشی کی غرض سے کسی غار کی تلاش کی اور رات وہاں سو گئے۔ کچھ رات گزری تھی کہ اچانک ایک بھاری پتھر اس غار کے منہ پر لڑھک آیا اور اس سے غار کا منہ بند ہو گیا۔ یہ تینوں سخت پریشان

۲۔ ایضاً۔

۱۔ سورة آل عمران: ۳۷۔

۳۔ سورة الكهف: ۱۸۔

۴۔ سورة مریم: ۲۵۔

ہوئے۔ ایک دوسرے سے کہنے لگے، اب یہاں سے ہمیں کوئی چیز ایسی نہیں جو نجات دلا سکے، سو اس کے کہ اپنی عمر کے کسی نیک کام کو اللہ تعالیٰ کی خدمت میں پیش کر کے اسے نجات کا ذریعہ بنایا جائے۔

ایک ان میں سے بولا: میرے ماں باپ تھے اور میں مال و منال دنیاوی سے کچھ نہیں رکھتا تھا بجز ایک بکری کے، تو میں ہمیشہ اُس بکری کا دودھ انہیں پلا دیتا تھا اور لکڑیوں کا گٹھا جو جنگل سے لاتا اُسے فروخت کر کے اس کی قیمت سے سب کی پرورش کرتا۔ ایک روز مجھے دیر ہو گئی۔ جب میں آیا تو میں نے دیکھا کہ والدین سو چکے ہیں۔ میں نے بکری کا دودھ نکال کر اس میں روٹی بھگوئی اور ان کے سونے کی جگہ آ کر ان کے پیروں کی طرف وہ پیالہ لیے کھڑا رہا اور خود بھی کچھ نہ کھایا کہ جب تک انہیں نہ کھلاؤں میں کیسے کھالوں۔ ان کے بیدار ہونے کا انتظار کرتے کرتے صبح ہو گئی۔ جب وہ بیدار ہوئے اور کھانا کھالیا تو میں بیٹھا۔ تو میں عرض کرتا ہوں الہی! اگر میں اس خدمت میں سچا ہوں تو مجھ پر کشادگی فرما اور میری فریادرسی کر۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ وہ پتھر اس تو سل کی برکت سے ہلا اور کچھ کشادگی ہو گئی۔

دوسرا کہنے لگا: میرے چچا کی لڑکی حسینہ جمیلہ تھی جس پر میں فریفتہ تھا۔ میں اسے اپنی طرف بلاتا تو وہ رجوع نہ ہوتی تھی۔ حتیٰ کہ میں نے اسے ایک سو بیس دینار بھیجے کہ وہ ایک شب میرے ساتھ خلوت کرے۔ جب وہ میرے پاس آ گئی تو میرے دل میں خوفِ خدا پیدا ہوا اور میں نے اس سے پرہیز رکھا اور وہ سنہری دینار بھی اُسے دے دیئے۔ یہ کہہ کر اس نے بارگاہِ متعال میں عرض کی: الہی! اگر میں اس بات میں سچا ہوں تو مجھ پر اس پتھر سے فراخی عطا کر۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ وہ پتھر یک لخت ہلا اور غار پہلے سے کچھ زیادہ فراخ ہو گیا۔ مگر ابھی اتنا فراخ نہیں ہوا تھا کہ آسانی سے باہر نکل سکیں۔

تیسرا بولا کہ میرے پاس مزدور کام کرتے تھے۔ دن گزرنے پر سب اپنی اپنی مزدوریاں لے جاتے تھے۔ ایک دن ایک مزدور غائب ہو گیا اور اس کی مزدوری میرے پاس رہ گئی۔ میں نے اس سے گو سپند خرید لیا۔ دوسرے سال وہ دو گو سپند ہو گئے۔ پھر وہ تیسرے سال چار ہو گئے۔ اسی طرح ہر سال بڑھتے رہے۔ جب چند سال گزر گئے تو یہ ایک مالِ عظیم بن گیا کہ وہ مزدور بھی آ گیا اور اس نے مجھ سے کہا میں نے آپ کی مزدوری کی تھی، شاید آپ کو بھی یاد ہو، اب مجھے اس کی ضرورت ہے مجھے دے دو۔ میں نے کہا جاؤ وہ تمام گو سپند اور مالِ ملک تیرا ہی ہے، تو لے لے۔ تو مزدور کہنے لگا: کیا آپ کو ناگوار گزرا۔ میں نے کہا نہیں درحقیقت وہ سب مال تیرا ہے، میں سچ کہہ

رہا ہوں۔ چنانچہ وہ سب مال میں نے اُسے دے دیا۔ الہی! اگر میرا یہ بیان صحیح ہے تو مجھے اس بلا سے نجات دے۔ حضور ﷺ نے فرمایا وہ پتھر درِ غار سے ہلا اور نیچے گر گیا اور یہ تینوں آدمی وہاں سے باہر آگئے۔

یہ حال بھی ناقص عادت تھا۔ (اور اسے بھی کرامت کہا جائے گا)

۲۔ اور حضور ﷺ سے ایک حدیث جرتِ راہب کی ہے جس کے راوی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا: طفولیت کے ایامِ رضاعت میں اپنے گہوارہ میں کسی نے بات نہ کی مگر تین آدمیوں نے:

ایک عیسیٰ علیہ السلام نے جس کا تمہیں علم ہے۔ ﴿قَالَ إِنِّي عَبْدُ اللَّهِ ؕ آتَنِي الْكِتَابَ نَبِيًّا ۖ وَجَعَلَنِي مُبْرَكًا ۖ﴾ (۱)

دوسرا بنی اسرائیل کا ایک راہب جس کا نام جرتِ مجتہد تھا۔ اس کی والدہ ایک گہوارہ رکھتی تھی۔ ایک دن اپنے بیٹے کو دیکھنے آئی۔ جرتِ اپنے صومعہ میں مصروف نماز تھے، دروازہ نہ کھولا، دوسرے روز پھر ایسا ہی ہوا، تیسرے روز آئیں، اس دن بھی صومعہ نہ کھولا۔ چوتھے روز بھی اسی طرح آئیں اور درِ صومعہ نہ کھولا۔ تو ان کی والدہ نے تنگ آ کر کہا: الہی! اسے رسوا کر، میرا بیٹا ہو کر میرے حقِ مادریت کی بھی پرواہ نہیں کرتا، یعنی میرے حق کے معاملہ میں اس کی گرفت کر۔ اس زمانہ میں ایک بدچلن عورت تھی، اس نے کسی گروہ سے وعدہ کیا کہ میں جرتِ کو گمراہ کر دوں گی۔ چنانچہ وہ صومعہ یعنی عبادت خانہ جرتِ میں داخل ہو گئی مگر جرتِ نے اس کی طرف اصلاً التفات نہ کیا۔

اس نے کسی چرواہے کے ساتھ حرام فعل کرایا اور حاملہ ہو گئی۔ جب بیٹا ہوا تو اس نے کہہ دیا کہ یہ بچہ جرتِ کا ہے۔ لوگوں نے جرتِ کی طرف انبوہ کثیرہ کے ساتھ دھاوا بول دیا حتیٰ کہ انہیں گرفتار کر کے عدالت لایا، میں پیش کر دیا۔ جب پیشی ہوئی تو جرتِ نے اس کے گود کے بچے سے فرمایا: اے بچے! تیرا باپ کون ہے؟ وہ شیر خوار مہدِ مادر میں گویا ہوا۔ ”اے جرتِ میری والدہ تجھ پر جھوٹا اتہام لگا رہی ہے، میرا باپ ایک چرواہا ہے۔“

تیسرا مہدِ مادر میں بولنے والا ایک عورت کا شیر خوار بچہ ہے جس کا یہ واقعہ ہے کہ:

ایک عورت اپنی گود میں بچہ لیے اپنے گھر کے دروازے پر بیٹھی تھی کہ ایک سوار حسین و جمیل جوان اور خوش پوشاک ادھر سے گزرا۔ عورت کہنے لگی: الہی! میرے اس بچے کو اس سوار جیسا رعنا کر دے۔ تو بچہ ماں کی گود سے کہنے لگا: الہی! مجھے اس سوار جیسا نہ کر۔ جب ایک مدت گزر گئی

تو ایک عورت بدنام ادھر سے گزری۔ عورت کہنے لگی: الہی! میرے بچے کو اس عورت جیسا بدنام نہ کرنا۔ تو بچہ کہنے لگا: الہی! مجھے مثل اس عورت کے کر دے۔

بچہ کی ماں متعجب ہوئی اور کہنے لگی اس بچے نے ایسی دعا کیوں کی۔ بچہ کہنے لگا، یہ دعا میں نے اس لیے کی کہ وہ سوار ظالم و جابر لوگوں میں سے تھا اور یہ عورت نہایت نیک خصلت ہے مگر لوگ اسے بُرا کہتے ہیں اور عوام جانتے نہیں، میں نہیں چاہتا کہ میں ظالم و جابر بنوں۔ (۱)

۳۔ ایک حدیث زائدہ کنیز کی امیر المؤمنین عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق ہے کہ ایک روز حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور سلام عرض کیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا: اے زائدہ میرے پاس دیر سے کیوں آتی ہے، میں تجھے محبت کی نظر سے دیکھتا ہوں۔ زائدہ نے عرض کیا: حضور آج میں ایک عجیب و غریب بات لے کر حاضر ہوئی ہوں۔ حضور ﷺ نے فرمایا: وہ کیا ہے۔ عرض کیا: حضور! میں نے ایک لکڑیوں کا گٹھا باندھ کر ایک پتھر پر رکھا کہ اسے اٹھاؤں کہ ایک سوار دیکھا جو آسمان سے زمین پر آیا اور مجھے سلام کر کے کہنے لگا: محمد ﷺ کی خدمت میں میرا سلام عرض کرنا اور عرض کرنا کہ رضوان خازن بہشت نے عرض کیا ہے کہ حضور کو بشارت ہو کہ بہشت بریں آپ کی امت کے لیے تین طرح تقسیم کیا گیا ہے۔ ایک تو اس گروہ کے لیے ہے جو بلا حساب و کتاب جنت میں داخل ہوگا۔ دوسرا حصہ اس گروہ کا ہے جو آسان حساب و کتاب سے جنت میں داخل ہوگا۔ تیسرا گروہ وہ ہے جو حضور کی شفاعت سے داخل جنت ہوگا۔ یہ کہا اور آسمان کی طرف چلا گیا۔

مجھ سے یہ گفتگو اس نے میان زمین و آسمان معلق رہ کر کی۔ پھر اس نے مجھے اس حال میں پایا کہ وہ گٹھا پتھر سے نہ اٹھا سکی تو اس سوار نے آواز دی، زائدہ گٹھا کو پتھر پر چھوڑ دے اور پتھر کو کہا: اے پتھر یہ گٹھا حضرت عمر تک لے جا۔ پتھر نے وہ گٹھا لیا اور میرے ساتھ آکر درخانہ عمر تک پہنچا گیا۔ یہ سن کر حضور ﷺ نے قیام فرمایا اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے ہمراہ خانہ عمر رضی اللہ عنہ پر تشریف لائے اور اس پتھر کے آنے کا اثر راہ میں ملاحظہ فرمایا اور اس پتھر کو بھی دیکھا اور فرمایا الحمد للہ کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اس دنیا سے باہر نہ فرمایا (اگر ایسا ہوتا اور دنیا سے الگ ہوتے تو) رضوان میری امت کو بشارت نہ دیتا اور اللہ تعالیٰ میری امت سے کسی کو درجہ مریم تک نہ پہنچاتا (مگر چونکہ ہم بھی تمہاری دنیا میں ہیں اور امت بھی اس لیے یہ عجائب و غرایب مشاہدہ میں ہے)۔

۱۔ چوتھا بچہ جس کا واقعہ کشف المحجوب میں نقل نہیں فرمایا، وہ حضرت یوسف علیہ السلام اور حضرت زینبہ کے مقدمہ میں بولنے والا بچہ ہے جس کا ذکر قرآن کریم میں ہے۔

وَشَهِدَ شَاهِدًا مِنْ أَهْلِهَا إِنْ كَانَ قَمِيضُهُ . (از مترجم)

گویا حضرت زائدہ کنیزہ فاروق کو مثل مریم علیہا السلام یہ مشاہدہ ہو گیا۔

۴۔ مشہور ہے کہ حضور سید المرسلین علیہ الصلوٰۃ والسلام نے علاء بن الحضرمی کو کسی غزوہ میں بھیجا۔ راستہ میں دریا کا کچھ حصہ پڑتا تھا۔ آپ جب وہاں پہنچے تو سطح آب پر قدم رکھ کر پار ہو گئے اور آپ کا پائے مبارک بھی تر نہ ہوا۔

۵۔ اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ تشریف لے جا رہے تھے کہ جنگل میں آپ نے دیکھا کہ ایک گروہ رُکاکھڑا ہے اور شیر نے اُن کا راستہ روک رکھا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے آگے بڑھ کر فرمایا: اکتے! اگر تو بحکم الہی راستہ روکے کھڑا ہے تو کھڑا رہ ورنہ ہٹ جا اور ہمیں راستہ دے تاکہ ہم گزر سکیں، وہ شیر دم ہلانے لگا اور راہ سے ہٹ گیا۔

۶۔ حضرت قطب الانبیا سیدنا ابراہیم علیہ السلام سے ایک روایت مشہور ہے کہ آپ نے ایک آدمی کو ہوا پر بیٹھا ہوا دیکھا۔ فرمایا: اے خدا کے بندے یہ درجہ تو نے کیسے پایا۔ اس نے عرض کیا: تھوڑی بات سے۔ آپ نے فرمایا: وہ کیا بات تھی۔ عرض کیا: حضور: دنیا سے تفر اور اللہ تعالیٰ کے حکم کا اتباع۔ پھر مجھ سے کہا: آپ کیا چاہتے ہیں؟ میں نے کہا: میں بھی ہوا میں ٹھہرنے لگوں تاکہ میرا دل جہان سے آزاد ہو جائے۔

۷۔ جب ایک جوان مرد مدینہ آیا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت حاضر ہونے کا ارادہ کیا۔ تو بتایا گیا کہ آپ اس خراب خانہ سے اپنی جان کو بے خبر کیے ہوئے ہیں۔ وہ چلا اور حضرت امیر المومنین سے ملا، دیکھا کہ آپ سو رہے ہیں زمین پر اور اپنا درہ سر کے نیچے رکھے ہوئے ہیں تو اس نے اپنے دل سے بات کی اور کہا اے محمدی! یہ تمام فتنہ اس جہان میں اس شخص سے ہی ہے، اب اس کا قتل میرے نزدیک آسان ہے۔ یہ سوچ کر اس نے تلوار سونتی کہ اچانک دو شیر ظاہر ہوئے جو اس جوان کی طرف جھپٹ رہے تھے۔ جوان یہ دیکھ کر پکارا اور فریاد کرنے لگا کہ حضرت امیر المومنین رضی اللہ عنہ بیدار ہو گئے۔ آپ نے اس سے حال دریافت کیا۔ اس نے سب سرگزشت سنائی اور شرف اسلام سے مشرف ہو گیا۔

۸۔ روایت ہے کہ عہد خلافت صدیقی میں جب حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سواد عراق میں تھے تو بادشاہ کی طرف سے ایک پہلوان جو تحفے لے کر آیا اس میں ایک شیشی بھی تھی جس میں سخت زہر تھا اور کہا کہ اس سے زیادہ قیمتی چیز اس بادشاہ کے خزانے میں نہیں۔ حضرت خالد نے وہ شیشی کھولی اور کف دست پر اس میں سے ڈالا اور بسم اللہ پڑھ کر منہ میں ڈال لیا۔ آپ کو اس سے کچھ بھی نقصان نہ پہنچا۔ لوگ متحیر ہو گئے اور اکثر راہ راست پر آ گئے۔

۹۔ حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ عبادانِ خاص میں سے ایک سیاہ فام جنگل میں رہتے تھے۔ ایک دن آپ نے ان کے لیے کچھ بازار سے خریدا اور ان کے پاس لے گئے۔ انہوں نے فرمایا: یہ کیا ہے۔ فرماتے ہیں: میں نے کہا: حضرت! کچھ کھانا ہے، آپ کے لیے لایا ہوں کہ شاید آپ کو ضرورت ہو، تو وہ میری طرف اشارہ کر کے بنے۔ میں نے دیکھا کہ جنگل کے پتھر روڑے سب سونے کے ہیں۔ میں شرمندہ ہوا اور جو کچھ لے گیا تھا وہ سب وہیں چھوڑ کر ان کی ہیبت سے بھاگا۔

۱۰۔ حضرت ابراہیم ادھمؒ فرماتے ہیں کہ میں ایک چرواہے کے پاس سے گزرا۔ میں نے اس سے پانی مانگا۔ اس نے مجھ سے کہا یہاں تو دودھ ہے اور پانی کہاں سے چاہتا ہے۔ میں نے کہا مجھے پانی چاہیے۔ تو وہ چرواہا اٹھا اور اپنی لکڑی ایک پتھر پر ماری تو پانی کا چشمہ بہ نکلا۔ میں یہ دیکھ کر متحیر ہو گیا تو وہ مجھ سے کہنے لگا تعجب نہ کر، جب بندہ اپنے رب کا مطیع فرمان ہو جاتا ہے تو عالم اس کا مطیع ہو جاتا ہے۔ (۱)

۱۱۔ حضرت ابو درداء اور سلیمان پاری رضی اللہ عنہما آپس میں بیٹھے کھانا کھا رہے تھے کہ پیالہ سے تسبیح کی آواز آنے لگی۔

۱۲۔ حضرت ابو سعید خراز رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ آپ فرماتے ہیں کہ تین روز میں ایک وقت میں کھانا کھاتا تھا۔ ایک دن میں جنگل میں جا رہا تھا مجھے ضعف محسوس ہوا اور کھانا نہ ملا۔ طبیعت نے حسب عادت کھانا مانگا۔ میں ایک جگہ بیٹھ گیا۔ غیب سے آواز آئی کہ اے ابو سعید! نفس کو آرام دینے کو کھانا چاہتا ہے یا کھانے سے اپنی جسمانی سستی کو دور کرنا چاہتا ہے۔ میں نے جواب دیا، الہی! میں چلنے پھرنے کی قوت چاہتا ہوں۔ فوراً مجھ میں ایسی قوت آئی کہ بارہ منزل تک میں چلا گیا۔ حالانکہ میں نے کھایا کچھ بھی نہ تھا اور نہ کچھ پیا تھا۔

۱۳۔ مشہور ہے کہ حضرت سہل بن عبد اللہ تبری رحمۃ اللہ علیہ کے گھر کو تستر میں ”بیت السباع“ کہتے تھے۔ اس لیے کہ اہالیانِ تستر متفقہ طور پر کہتے ہیں کہ سہل بن عبد اللہ کے پاس درندے شیر وغیرہ آتے تھے اور آپ انہیں کھلاتے اور رکھوالی فرماتے تھے بآنکہ تستر میں کافی آبادی تھی۔

۱۴۔ حضرت ابو القاسم مروزی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں ابو سعید خراز کے ساتھ جا رہا تھا۔ کنارہ دریا پر ایک جوان دیکھا کہ گدڑی پہنے ہوئے ایک حجرہ پہاڑ میں بنا کر رہتا تھا۔ حضرت

۱۔ مَنْ كَانَ لَهُ الْمَوْلَىٰ فَلَهُ الْكُلُّ... مَنْ كَانَ لِلَّهِ كَانَ اللَّهُ لَهُ. جو اللہ کا ہو جائے تو اس کا سب کچھ ہو جاتا ہے۔ جو اللہ کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دے تو اللہ اس کے لیے ہو جاتا ہے۔ (از مترجم)

ابوسعید نے فرمایا: اس جوان کی پیشانی عیاش معلوم ہوتی ہے اور اس کا عجیب حال ہے کہ جب سے دیکھتا ہوں تو کبھی سمجھتا ہوں کہ شاید یہ رسیدگان کمال سے ہے اور کبھی دیکھتا ہوں تو سمجھتا ہوں کہ یہ طالب حق ہے۔ آؤ اس سے باتیں کریں۔ چنانچہ خراز رحمۃ اللہ علیہ اس کے پاس پہنچے اور فرمایا: خدا تک پہنچنے کا کون سا راستہ ہے؟ اس جوان نے جواب دیا: دو راستے ہیں، ایک راہِ عوام ہے ایک راہِ خواص، اور تم کو راہِ خواص کی کچھ خبر نہیں۔ البتہ راہِ عوام یہ ہے کہ جس پر تو چل رہا ہے اور اسے واصلِ حق ہونے کی علت جانتا ہے اور حجرہ کو آکھ حجاب سمجھتا ہے۔

۱۵۔ حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں ایک جماعت کے ساتھ کشتی میں سوار ہو کر مصر سے جدہ روانہ ہوا۔ ہمارے ساتھ ایک جوان خرقہ پوش بھی سوار ہوا۔ میرے دل میں اس کے پاس بیٹھنے کی خواہش ہوئی مگر اس کی ہیبت سے ہمت نہ پڑتی تھی۔ اس وجہ سے میں اس سے کلام بھی نہ کر سکا اس لیے کہ وہ بڑا بزرگ تھا۔ اس کی ایک ساعت بھی یاد الہی سے غفلت نہ تھی۔ ایک روز کشتی میں لوگوں سے کسی کی تھیلی سے ایک جوہر گم ہو گیا۔ تھیلی والے نے اس جوہر کا الزام اس جوان خرقہ پوش کے سر لگایا اور اس کے ساتھ بدسلوکی کرنے پر آمادہ ہوئے۔ میں نے لوگوں کو روکا اور اس بہانے سے میں ان کے قریب ہو گیا اور گفتگو شروع کی۔ جب میں نے لوگوں کی بدگمانی ان پر ظاہر کی اور بتایا کہ ان کا گمان یہ ہے کہ وہ جوہر تھیلی سے آپ نے لیا ہے، اب فرمائیں کیا کرنا چاہیے۔ یہ سن کر اس جوان با خدا نے آسمان کی طرف منہ کر کے کچھ فرمایا کہ میں نے دیکھا سمندر کی تمام مچھلیاں سطحِ سمندر پر آگئیں اور ایک ایک جوہر منہ میں لیے ہوئے تھیں۔ آپ نے ایک جوہر لے کر اس کو دے دیا جس کی تھیلی کا جوہر گم ہوا تھا۔ کشتی کے سب لوگوں نے یہ کمال دیکھ کر آپ کی طرف عقیدت مندی کا مظاہرہ شروع کرنا چاہا۔ انہوں نے اس کشتی سے پاؤں دریا میں ڈال دیا اور سطحِ آب پر چلنے لگا۔ یہ جوہر چرانے والا ملاحوں میں سے ایک تھا۔ اس نے گھبرا کر وہ جوہر دے دیا اور اہالیانِ کشتی شرمندہ ہوئے۔

۱۶۔ حضرت ابراہیم وقی رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے۔ فرماتے ہیں کہ میں نے ابتدائی عمر میں حضرت مسلم مغربی کی زیارت کا ارادہ کیا۔ جب میں ان کی مسجد میں آیا تو میں نے دیکھا کہ وہ امامت کر رہے ہیں اور الحمد للہ پڑھ رہے ہیں۔ مجھے اس سفر پر ملال ہوا اور میں نے دل میں کہا کہ یہ محنت ضائع ہوگئی۔ رات تو میں رہا۔ صبح بغرض غسل میں دریائے فرات کے کنارے پر گیا۔ وہاں دیکھا کہ راہ میں ایک شیر سو رہا ہے۔ میں اُسے دیکھ کر واپس ہوا تو شیر نے میرا تعاقب کیا۔ میں گھبرایا اور پکارنے لگا کہ میں عاجز ہو گیا ہوں، کہ مسلم مغربی اپنے حجرے سے نکلے تو شیر انہیں دیکھ کر دم

ہلانے لگا۔ آپ نے اس کا کان پکڑا اور فرمایا: اے خدا کے کتے! میں نے تمہیں نہیں کہا تھا کہ تم میرے مہمانوں کو نہ چھیڑا کرو۔ پھر مخاطبہ کرتے ہوئے فرمایا: اے ابواسحاق! (یہ ابراہیم وقی کی کنیت ہے) تم لوگوں کا ظاہر درست کرنے میں مشغول ہو اس لیے مخلوقات الہی سے خوف زدہ ہو اور ہم باطن حال مخلوق کی اصلاح کرتے ہیں۔ اس لیے خلقت الہی ہم سے ڈرتی ہے۔

۱۔ ایک روز میرے شیخ رضی اللہ عنہ (یعنی حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کے پیر و مرشد) ”بیت الجن“ دمشق کا قصد فرما رہے تھے کہ بارش کی وجہ سے اتنی کچھڑ تھی کہ مشکل سے چلا جاتا تھا اور میں چلنے کی ہمت نہیں رکھتا تھا۔ میں نے اپنے شیخ قدس سرہ کو دیکھا کہ ان کے کپڑے اور نعلین مبارک بالکل خشک اور صاف تھے۔ فرمایا: ہاں! جیسے ہم نے اپنی ہمت توکل کی راہ سے اٹھالی ہے اور دل کو وحشت و حرص سے صاف کر لیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے ہر قسم کے غل و غش اور کچھڑ سے محفوظ کر لیا ہے۔

اور میں (یعنی حضرت علی بن عثمان جلابی رحمۃ اللہ علیہ) نے ایک وقت جب کہ مجھے مشکل پڑی اور اس کا حل مجھ پر دشوار تھا تو میں نے زیارت شیخ ابوالقاسم گرگانی رحمۃ اللہ علیہ کا ارادہ کر کے طوس جانے کا قصد کیا تو میں نے دیکھا کہ آپ اپنے گھر کی مسجد میں تنہا تشریف فرما ہیں اور میرے اس حال کا تذکرہ مسجد کے ستون سے فرما رہے ہیں جس کی وجہ سے میں حاضر ہوا تھا اور میں اپنے معاملے کا اسی گفتگو میں جواب پارہا تھا۔ میں نے عرض کیا: حضور! یہ گفتگو کس سے فرمائے جا رہے ہیں۔ فرمایا: بیٹا! اس ستون کو اللہ تعالیٰ نے اس گھڑی ناطق کر دیا ہے تاکہ یہ مجھ سے سوال کرے اور فرغانہ سے سلا تک پہنچا دے۔ فرغانہ سے سلا تک وہ سرزمین ہے جس پر ایک ضعیف العمر منصب اولاد الارض پر فائز رہتے ہیں۔ انہیں ”بابِ عمر“ کہتے ہیں اس لیے کہ اس ملک میں بابِ درویش اور با خدا کو کہا جاتا ہے۔

اور ان کی ایک عجوزہ بڑھیا ہیں جن کا نام فاطمہ ہے۔ میں نے آذرکند سے اس کی زیارت کا قصد کیا۔ جب میں ان کے پاس گیا تو مجھ سے پوچھا: کیوں آیا ہے؟ میں نے عرض کی: شیخ کی زیارت کو تاکہ ان کی شفقت سے میں بھی فیض یاب ہو سکوں۔ تو انہوں نے فرمایا: بیٹے میں خود فلاں روز سے تجھے دیکھ رہا ہوں تاکہ مجھ پر غائب نہ ہو جائے اور میں تجھے چاہتا ہوں کہ دیکھتا رہوں۔ جب میں نے اس دن سے حساب لگایا تو وہ ابتدائی دن میری توبہ کا تھا۔ فرمایا: بیٹا سفر کرنا اور طے مراحل میں پڑنا بچوں کا کام ہے۔ اس زیارت کے بعد ارادہ کر کہ جسم کے روبرو ہونے میں کچھ تعلق نہیں بڑھتا۔ پھر فرمایا: فاطمہ! جو موجود ہے لاؤ تاکہ یہ درویش کھائے۔ ایک طبق تازہ

انگور کالایا گیا۔ حالانکہ وہ موسم انگوروں کا نہ تھا اور کچھ چھوہارے بھی لائے گئے حالانکہ فرغانہ میں تازے چھوہارے ملنا ناممکن تھا۔

۱۸۔ ایک بار میں تربت حضرت شیخ ابوسعید رضی اللہ عنہ پر تنہا حاضر تھا کہ ایک کبوتر سفید دیکھا کہ آیا، زیر غلاف جا کر غائب ہو گیا۔ میں نے غلاف ہٹا کر دیکھا مگر وہ کبوتر غائب تھا دوسرے روز بھی ایسا ہی دیکھا۔ میں متعجب تھا کہ یہ راز کیا ہے! حتیٰ کہ ایک شب خواب میں بھی دیکھا تو میں نے حضرت سے استفسار کیا۔ فرمایا وہ کبوتر ہمارے صفاءِ معاملات ہے ہر روز ہماری قبر میں آتا ہے۔

اگر اس کے علاوہ اور حکایتیں پیش کروں تو بھی سیری نہ ہو اور کتاب پڑ ہو جائے اور اثبات اصولِ طریقت فروغ میں اور معاملات و مقالات میں ناقلانِ طریقت نے خود کئی کتابیں تصنیف کیں اور جمع کی ہیں اور مبلغین منبروں پر جو نشر کرتے ہیں سب ہی میں جی بھر کر اس کتاب میں لاتا ہوں تاکہ طالبِ معنی کو اور جگہ تلاش کی ضرورت نہ رہے۔

علاوہ اس کے مترجم کشف المحجوب میں یہاں ایک روایت زائد ملی ہے جسے شمس الہند مترجم کشف المحجوب نے نقل کیا ہے۔ وہ بھی ہم یہاں نقل کرتے ہیں۔ اگرچہ یہ روایت سمرقندی کشف المحجوب میں بھی ہے۔

حضرت ابو بکر وراق رحمۃ اللہ علیہ روایت فرماتے ہیں کہ ایک روز محمد بن علی حکیم ترمذی نے اپنی تصانیف سے چند جز مجھے دیئے اور فرمایا: یہ دریائے جیحوں میں ڈال دے۔ جب میں باہر آیا تو میں نے دیکھا وہ جز نہایت عجیب علمی جوہر پارے تھے۔ میرا دل نہ چاہا کہ میں بہ تمیل حکم دریا برد کروں۔ میں نے بجائے دریا برد کرنے کے وہ جز اپنے پاس محفوظ کر لیے اور واپس آ کر عرض کر دیا کہ حسب حکم وہ اجزا دریا برد کر آیا ہوں۔ مجھ سے سوال ہوا کہ جب تو نے وہ جز دریا میں ڈالے تو کیا دیکھا۔ میں نے جواب دیا۔ کچھ نہیں۔ فرمایا: پھر تو نے وہ جز دریا برد نہیں کیے۔ میں حیران تھا کہ دریا میں ڈالنے کے بعد کیا نظر آتا تھا جس کی وجہ سے مجھ پر حکم لگا دیا کہ تو نے وہ اجزاء دریا برد نہیں کیے۔ آخرش بادلِ نحواستہ میں وہ اجزاء لے کر جیحوں پہنچا اور وہ جزیں دریا میں ڈال دیں۔ اُن اجزاء کا دریا میں ڈالنا تھا کہ دریا پھٹا اور اس سے ایک صندوق برآمد ہوا اور اس کا ڈھکنا کھلا اور اس میں وہ اجزاء داخل ہو گئے، پھر صندوق کا منہ بند ہوا اور وہ دریا میں بہ گیا اور پانی کی سطح ہموار ہو گئی۔

میں حاضر ہوا اور اطلاع دی کہ وہ اجزاء اب ڈال کر آیا ہوں۔ اس کے بعد جو میں نے دیکھا تھا سب سنا دیا۔ فرمایا: ہاں اب تو نے یقیناً وہ اجزاء دریا برد کر دیئے۔ میں نے عرض کی، حضور! اس راز سے مجھے بھی مطلع فرمائیں۔ آپ نے فرمایا ہم نے علم

طریقت پر ایک کتاب لکھی تھی جو عقول انسانی کے فہم سے بالاتھی تو میرے بھائی حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا وہ کتاب ہمیں دے دو۔ چنانچہ انہیں کے حکم سے وہ صندوق آیا تھا اور بحکم الہی وہ اسی راستے سے حضرت خضر علیہ السلام تک پہنچ گیا۔ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ وَ عَلِمَهُ اَحْكَمُ وَ اَتَمُّ۔

انبیاء کی اولیاء پر فضیلت

اچھی طرح یاد رکھو کہ ہر وقت ہر حال میں بالاتفاق جمیع مشائخ طریقت اولیاء، متعابعتِ انبیاء میں ہیں اور ان کی دعوت کے مصداق۔ اور یہ بھی ناقابل انکار حقیقت ہے کہ انبیاء کا رتبہ اولیاء سے فاضل و افضل ہے۔ اس لیے کہ نہایت وایت ابتداء منصب نبوت ہے۔ اسی بناء پر ہر نبی کا ولی ہونا لازمی ہے لیکن کوئی ولی نبی نہیں ہو سکتا۔

انبیاء کرام علیہم السلام نفی صفات بشری کے اندر متمکن ہوتے ہیں اور اولیاء کرام کا ہر حال عارضی ہوتا ہے۔ (۱) اولیاء کرام کا جو مقام اعلیٰ ہے وہ انبیاء کرام علیہم السلام کا ایک مقام حجاب ہے۔ اس تفصیل سے تمام محققین طریقت متفق ہیں۔ کسی نے اس کے خلاف نہیں کہا۔ سوائے گروہِ حشویہ کے، جو خراسانی ہے۔ ان کا کلام متکلمین کے کلام سے متناقض ہے اصول توحید میں، کہ انہوں نے اصل توحید کو نہیں سمجھا اور بر خود غلط وہ اپنے کو ولی کہلاتے ہیں اور اس میں شک بھی نہیں کہ وہ ولی ہیں مگر ولی شیطان۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ اولیاء معاذ اللہ انبیاء سے فاضل تر ہیں اور یہ دعویٰ ان کے لیے خالص گمراہ کرنے والا ہے۔ اس لیے کہ ایک جاہل کو فاضل تر جناب مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثناء سے ماننا ضلالت ہے۔

دوسرا ایک گروہ مشبہ سے ہے۔ وہ بھی ایسے ہی گمراہ راستہ پر ہے۔ وہ حلول و نزول حق بمعنی ائصال روارکھتا ہے اور ذات واحد تعالیٰ شانہ کی تجزی روارکھتا ہے اور یہ دونوں گروہ مذہب میں مذموم ہیں۔

ہم وعدہ کرتے ہیں کہ اس کتاب میں ان کا مفصل حال بیان کریں گے ان شاء اللہ۔ یہ دونوں گروہ مدعی اسلام بھی ہیں اور نفی تخصیص انبیائے کرام بھی کرتے ہیں اور جو نفی تخصیص انبیاء کرام کا عقیدہ رکھے وہ کافر ہے۔ اس لیے کہ انبیاء کرام صلوٰۃ اللہ والسلام علیہم داعی الی اللہ ہیں اور اولیاء عظام تمام کے تمام ان کے تابع ہیں اور یہ مجال ہے کہ ماموم امام سے فاضل تر ہو، تمام صفات میں سے کسی صفت میں۔

۱۔ گہ بر فارم اعلیٰ نشینند گہ بر پشت پائے خود نہ بینند (مترجم)

اچھی طرح سمجھ لو کہ اگر احوال و انفاس جملہ اولیاء کو انبیاء کے ایک قدم صدق کے پہلو میں لایا جائے تو وہ تمام احوال و انفاس اس مقام کے متلاشی نظر آئیں گے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ تمام اولیائے کرام گروہ انبیاء کے آستانہ کے طالب ہیں اور یہ راہ متعین پہ چل رہے ہیں اور اپنا مقصود پا چکے ہیں۔

اب ان کا ہم میں اور اولیاء میں تشریف لانا بحکم دعوت ہے کہ قوم کو ہانکیں اور منزل کی طرف چلائیں اور اگر کوئی ملحد ملاحظہ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ سے کہے کہ یہ عادت قدیم ہے کہ جو رسول کسی طرف آتا ہے وہ ملک ہی ہوتا ہے تاکہ مبعوث الیہ اس سے فاضل تر ہو۔ جیسے کہ پیغمبران اولوالعزم صلوٰۃ اللہ علیہم اجمعین جبرائیل علیہ السلام سے افضل ہیں، یہ تمام صورتیں مبنی برخطا ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ اگر کوئی بادشاہ کسی کو پیامبر کر کے بھیجے کسی کی طرف تو اس اصول کے تحت لازم ہوگا کہ مرسل الیہ اس قاصد سے افضل ہو۔ جیسے کہ جبرائیل علیہ السلام کسی رسول کی طرف آئیں تو ہر رسول کا جبرائیل (علیہ السلام) سے افضل ہونا لازمی ہے۔ لیکن جب خود رسول من جانب اللہ کسی قوم یا جماعت کی طرف مبعوث ہو تو لامحالہ اس قوم سے وہ رسول افضل ترین ہوگا۔ جس طرح کہ پیغمبران اولوالعزم امتوں سے افضل ہوتے ہیں اور اس حقیقت میں کسی عقلمند کو بموجب احادیث صحیحہ کوئی اشکال واقع نہیں ہو سکتا بلکہ نفس نفیس انبیاء کرام کا تمام عالم سے افضل ہونا مسلم ہے۔

اولیاء کرام اگرچہ عرف و عادت میں نہایت عرفان کو پہنچے ہوئے ہیں اور اپنے مشاہدات سے خبر دیتے ہیں اور حجاب بشریت سے خلاصی پا چکے ہیں، لیکن باوجود ان تمام فضائل کے وہ عین بشر ہوتے ہیں اور پھر رسول کو جو اول قدم صدق پر مشاہدہ ہو جاتا ہے، وہ بہ ہدایت رسول ولی کا درجہ نہایت ہوتا ہے۔ اسے پہلے نظریات پر قیاس کرنا صحیح نہیں۔

کیا تو نہیں دیکھتا کہ طالبان حق از اولیاء سے اس امر پر متفق ہیں کہ مقام جمع تقارین کمال ولایت سے ہے اور اس کی صورت اس طرح ہے کہ جب بندہ ایک کسی درجہ کو پہنچتا ہے تو غلبہ دوستی کی وجہ سے اس کی عقل نظر کرنے سے مغلوب ہو جاتی ہے اور شوق فاعل حقیقی سے حیرت میں آ کر کہہ دیتا ہے کہ تمام عالم وہی ہے اور وہ اپنی نظر باطن سے دیکھتا بھی ایسا ہی ہے۔ جیسا کہ ابوعلی رودباری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: لَوْ زَالَتْ عَنَّا رُوَيْتُهُ مَا عَبَدْنَاہُ۔ ”اگر جمال جمیل دیدہم سے زائل ہو جائے تو اسم عبودیت ہم سے ساقط ہو جائے اور شرف عبادت بغیر دیدار یار میسر نہیں۔“ اور یہی معنی انبیاء کرام کے ہدایت حال کے ہیں کہ ان کے لیل و نہار تفرقہ صورت نہیں پکڑتے۔ اس لیے کہ ان کی نفی و اثبات اور مسلک و مقطوع و اقبال و اعراض و ہدایت و نہایت تمام عین جمع میں ہیں۔ جیسے

کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب آفتاب کو دیکھا فرمایا: ﴿هَذَا رَبِّي﴾ (۱) اور چاند ستارے کو دیکھا تو فرمایا: ﴿هَذَا رَبِّي﴾ اس کی وجہ صرف غلبہ تھا، جو اُن کے دل اور ان کی اجماع کے اندر عین صحیح تھا تو وہ اپنی نظر میں کسی کو غیر نہیں دیکھتے تھے۔

جب سب کا ملاحظہ فرمایا تو اپنے عین دیدار میں سب سے تبریٰ فرما کر کہہ دیا: ﴿لَا أَحِبُّ الْأَفْلِينَ﴾ (۲) تو ان کی ابتدا جمع کے ساتھ تھی اور انتہا بھی جمع کے ساتھ۔ اس لیے کہ ولایت کے لیے ہدایت و نہایت ہے اور نبوت کے لیے نہیں۔ جب علم اللہ میں تھے نبی تھے، جب ظاہر ہوئے نبی ہوئے۔

حضرت ابو یزید رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا گیا کہ انبیاء کرام علیہم السلام کے حال کس طرح ہیں۔ آپ نے فرمایا: معاذ اللہ ہمیں ان کے حال پر کوئی تصرف حاصل نہیں جس کی تصویر ہم تمہیں دکھاسکیں جو ہم ہیں وہ ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے ان کی نفی و اثبات ایک ایسے درجے میں رکھی ہے کہ چشم مخلوق وہاں تک نہیں پہنچ سکتی۔ تو جس طرح مراتب اولیاء ادراکِ خلق سے پنہاں ہیں، تمام تر انبیاء تصرف و ادراکِ اولیاء سے پنہاں ہیں۔

حضرت ابو یزید رحمۃ اللہ علیہ با آنکہ محبت روزگار ہیں۔ فرماتے ہیں:

أَوَّلُ مَا سِرْتُ إِلَى الْوَحْدَانِيَّةِ فَصِرْتُ طَيْرًا جِسْمُهُ مِنَ الْأَحْدِيَّةِ
وَجَنَاحُهُ مِنَ الدُّنْيَا فَلَمْ أَزَلْ أَطِيرُ فِي هَوَاءِ التَّنْزِيهِ ثُمَّ أَشْرَفْتُ
عَلَى مَيْدَانِ الْأَزَلِيَّةِ وَرَأَيْتُ شَجَرَةَ الْأَحْدِيَّةِ فَنَظَرْتُ فَعَلِمْتُ أَنَّ
هَذَا كُلُّهُ لَيْسَ غَيْرِي.

”میں نے دیکھا کہ میرا سر آسمان پر لے گئے اور کسی چیز پر نگاہ نہ کی اور بہشت و دوزخ اُسے دکھائے تو اُس نے بھی اس کی کسی چیز پر التفات نہ کیا تو مکتومات و حجابات سے اُسے عبور کرا کے دیکھا تو میں ایک پرند مرغ ہو گیا۔ جس کا جسم احدیت تھا اور پر و بال دیہومیت سے تھے۔ وہ اُڑتا رہا حتیٰ کہ ہوا ہویت سے گزر کر تا ہوا میدانِ ازلیت میں پہنچ کر مشرف ہوا۔ وہاں میں نے درخت احدیت کو دیکھا۔ تو جب میں نے اس پر نظر کی تو سب کچھ میں ہی نظر آیا۔“

تو میں نے عرض کی: الہی! تو میرے ساتھ ہے مگر مجھے تجھ تک پہنچنے میں کوئی راہ نہیں ملتی

اور مجھے اپنی خودی سے گزرنا ممکن نہیں تو مجھے کیا کرنا چاہیے۔ فرمانِ الہی آیا، کہ اے بایزید! تیری خلاصی تجھی سے ہے، تو میرے دوست کی متابعت میں رہ اور اس کی خاکِ قدم کا سرمہ آنکھوں میں ڈال اور اس کی اطاعت پر مداومت کر۔

یہ حکایت بہت طویل ہے۔ اسے اہل طریقت ”معراجِ بایزید“ کہتے ہیں اور معراج سے قربِ خاص مراد لیتے ہیں۔ تو معراج النبی الانبیاء ﷺ بطور ظہور معہ شخصیت و جسم تھی اور معراج اولیاء کرام از روئے صرف ہمت اور اسرارِ تن۔ انبیاء علیہم السلام صفا و پاکیزگی سے مقرب بہ بارگاہِ تھے مثل دلِ اولیاء اور یہ ان کا سرِ خاص تھا اور فضلِ ظاہر۔

اسے یوں سمجھو کہ ان کے دل کو حال میں مغلوب کر دیا گیا تا کہ مست ہو جائیں اور درجاتِ سر میں اتنے غائب ہوں کہ قربِ حق میں پہنچ کر آرام کریں اور جب حالتِ صحو میں ہوں تو وہ تمام براہین ان کے دل پر صورت بن کر سامنے ہوں اور وہ علم انہیں حاصل ہو۔ تو ثابت ہوا کہ فرق بہت ہے اس شخص میں جسے وہاں لے جایا جائے کہ اس میں دوسرے کا فکر ساتھ ہوتا ہے۔

وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ .

انبیاء و اولیاء کی فرشتوں پر فضیلت

اہلسنت و جماعت اور جمہور مشائخ طریقت کا اس پر اتفاق ہے کہ انبیاء کرام اور جو محفوظ ہیں، وہ ملائکہ سے افضل ہیں۔ بخلاف معتزلہ، کہ یہ ملائکہ کو انبیاء پر فضیلت دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ملائکہ بلحاظ رتبہ رفیع تر ہیں اور من حیث التخلیق لطیف تر ہیں اور اطاعتِ الہی میں ایسے مطیع کہ لَا یَعْصُونَ اللّٰهَ مَا اَمَرَهُمْ وَیَفْعَلُونَ مَا یُؤْمَرُونَ۔ ان کی تعریف قرآن کریم میں ہے۔ (۱) میں (یعنی حضور داتا صاحب گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ) کہتا ہوں کہ حقیقتاً تمہارا یہ دعویٰ خلاف حقیقت ہے، اس لیے کہ تنِ مطیع مرتبہ رفیع اور تخلیق لطیف یہ سب فضیلت میں حق تعالیٰ کی علت نہیں ہو سکتے۔ درحقیقت فضیلت اسے ہے کہ حق تعالیٰ اس میں رکھے اور اگر انہی علت و اسباب کو ملحوظ رکھ کر فضیلت تسلیم کی جائے تو شیطان لعین کو بھی افضل ماننا پڑے گا حالانکہ وہ بالاتفاق ملعون و معزول ہو چکا ہے۔

تو فضیلت اس کے لیے مختص مانی جائے گی، جسے حق تعالیٰ شانہ افضل فرمائے اور مخلوق میں سے برگزیدہ کرے اور ملائکہ پر افضلیت انبیاء کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو حکم دیا کہ

۱۔ تو ان کا سب سے افضل ہونا ضروری ہے۔ (مترجم)

حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کریں۔ (۱) اور یہ حقیقت ہے کہ حالی مسجودۃ عالی ہونا چاہیے حالِ ساجد سے، اور اگر کہیں کہ خانہ کعبہ پتھر اور بے جان مصالحہ کا ہے اور مومن اس سے فاضل تر ہوتا ہے تو اسے سجدہ نہیں کرنا چاہیے مگر انسان اسے سجدہ کرتا ہے۔ تو اسی طرح روا ہو سکتا ہے کہ ملائکہ افضل بھی ہوں اور سجدہ بھی کر لیں۔

میں کہتا ہوں کہ دنیا میں کوئی یہ نہیں کہے گا کہ میں خانہ کعبہ کو یا محراب یا دیوار کو سجدہ کرتا ہوں مگر یہ سب ضرور کہیں گے کہ سجدہ ہمارا اللہ تعالیٰ کو ہے (اور سمت کعبۃ اللہ ہے)۔ تو اسی طرح سب یہی کہتے ہیں کہ ملائکہ نے حضرت آدم علیہ السلام کو جو سجدہ کیا وہ بہ امتثال امر الہی کیا۔ جب اللہ تعالیٰ نے حکم دیا: ﴿اسْجُدْ وَاقْبُدْ لِلْآدَمِ﴾ (۲) ”یعنی ہم نے ملائکہ کو حکم دیا کہ حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرو“ مگر ذکرمومنین کیا تو فرمایا: ﴿وَاسْجُدْ وَاقْبُدْ وَارْكَعْ وَارْكَعُوا خَيْرٌ﴾ (۳) ”یعنی سجدہ کرو اللہ تعالیٰ کو اور اسی کی بندگی کرو۔“ تو خانہ کعبہ مثل آدم تھا۔ تو اکثر ایسا ہوتا ہے کہ مسافر گھوڑے پر سوار ہو کر اللہ تعالیٰ کی پرستش کر سکتا ہے، اگرچہ اس کا منہ کعبۃ اللہ کی طرف نہ ہو تو وہ معذور ہوگا اور اگر دلائل سمت قبلہ جنگل بیابان میں گم ہو جائیں تو جدھر منہ کر کے عبادت کرے، کر سکتا ہے اور ملائکہ کو سجدہ کرنے میں آدم علیہ السلام کی طرف کوئی عذر نہ تھا اور وہ ابلیس جب اپنی طرف سے عذر رکھ کر سجدہ سے منحرف ہو گیا تو ملعون و رذیل ہو گیا۔ یہ دلائل واضح ہیں کہ انہیں جن کو بصیرت تھی اور انہیں جو ملک مقرب تھے، دونوں کس طرح حق معرفت میں برابرہ سکتے ہیں۔

اس لیے کہ انہیں عام مخلوق کی سی شہوت نہیں تھی اور وہ اپنے دل میں حرص و آفت نہیں رکھتے تھے۔ ان کی غذا اطاعت حق تعالیٰ، ان کا مشرب امتثال امر الہی۔ اور ہر آدم کے خمیر میں من حیث الانسان شہوت کا مرکب ہونا ضروری اور اس سے ارتکاب گناہ ممکن اور خواہش دنیا و حرص اس کی طبیعت کا جز۔ پھر شیطان کو اس کے وجود میں اس قدر تصرف حاصل ہے کہ اس کے تمام دنیائے جسم میں خون کے ساتھ جاری و ساری ہے۔ (۴) اس کے ساتھ وہ نفسِ امارہ، جو تمام شرارتوں کا داعی ہے اس کے وجود میں مضمحل ہے۔

تو غور کرو! جس کے وجود میں یہ سہ صفتیں موجود ہوں اور وہ باوجود احکام غلبہ شہوت، ہر فسق و فجور سے اجتناب کرے اور باوجود حرص و ہوا کے دنیا سے انحراف کرے اور باوجود کہ اس کے

۱۔ حَيْثُ قَالَ وَادْفُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدْ وَاِلٰدَمَ فَسَجَدُوْا اِلَّا اِبْلِیْسَ ؕ (سورة البقرہ: ۳۴) (مترجم)

۲۔ سورة البقرہ: ۳۴ ۳۔ سورة الحج: ۷۷

۴۔ كَمَا قَالَ عَلَيْهِ السَّلَامُ: الشَّيْطَانُ يَجْرِي فِي الْاِنْسَانِ مَجْرَ الدَّمِ (مترجم)

دل میں وساوسِ شیطان ہر آن پیدا ہوں، گناہ سے بچے اور آفتِ نفسانی سے اعراض رکھے اور عبادت پر قائم اور اطاعت پر دائم رہ کر مجاہدہٴ نفس کرے اور شیطان سے مجادلہ میں مشغول ہو، وہ بہر حال افضل ہوگا، اس سے جس کے وجود میں شہوانیات نہ ہوں۔ جس کی طبیعت میں نہ لذات و شہواتِ غذا ہوں، جو عورت اور اولاد سے بے تعلق ہو، آلہ اور سبب کا محتاج نہ ہو، نہ حرص و آفاتِ نفس میں مبتلا ہو۔ مجھے اپنی جان کی قسم! کہ مجھے تعجب ہے کہ اُن پر جو فضیلتِ افعال میں دیکھتا ہے یا جمال و مال میں عزت و بزرگی جانتا ہے، اسے چاہیے کہ مالکِ اعیان کے فضل و انضال کو دیکھے۔ پھر اُسے ظاہر و باہر ہو جائے گا اور وہ سمجھ لے گا کہ رضائے حق میں عزت ہے اور معرفتِ ایمان میں بزرگی ہے۔ پھر اس پر یہ نعمتِ الہی دوام رہے گی اور دونوں جہان میں اس کا دل خوش رہے گا اور وہ سمجھ لے گا کہ وہ جبرائیل علیہ السلام جو کئی ہزار سال سے انتظارِ خلعت میں عبادت کر رہا تھا، وہ صرف غاشیہ برداری جنابِ مصطفیٰ ﷺ چاہتا تھا، تاکہ لیلۃ المعراج میں حضور ﷺ کے براق کی باگ تھامے۔ وہ کس طرح افضل ہو سکتا ہے اس سے جو دنیا میں نفس کو ریاضت سے مغلوب کر چکا ہو۔ شب و روز مجاہدہ کر کے فضلِ الہی کے ساتھ دیدارِ حق سے مشرف ہوا ہو اور تمام خطرات سے سلامت رہا ہو، اگرچہ ملائکہ نے جب اپنی ذات میں صفا و نور دیکھا تو انہوں نے اپنی فضیلت کی دلیل دی اور مخلوقِ انسان پر زبانِ ملامت دراز کی۔ (۱)

پھر اللہ تعالیٰ نے ان کا حال ظاہر فرمانے کو انہیں حکم دیا۔ تم میں سے تین فرشتے جو سب سے زیادہ تمہاری نظر میں بزرگ ہوں، انہیں پیش کرو تاکہ وہ زمین پر جائیں اور زمین کے خلیفہ بنیں، ہماری مخلوق کی اصلاح کریں اور ان میں اپنے عدل و انصاف کا سکہ بٹھائیں۔ غرضیکہ تین منتخب ہوئے۔ ایک تو زمین پر اترنے سے پہلے ہی فسادِ نفس کا شکار ہو گیا، اسے تو واپس کیا گیا۔ دو جو رہے، وہ زمین پر آئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی خلقتِ ملکی بدل کر انہیں جبلتِ انسانی دی، جس سے وہ خورد و نوش کی طرف مائل ہوئے، رگِ شہوانی نے بھی انہیں خراب کیا۔ (۲)

مختصر یہ کہ جو ہوا وہ ہوا اور اللہ تعالیٰ نے انہیں شہوانیات کے بدلے سزا دی۔ اس سے ملائکہ پر انسانی فضیلت کا مظاہرہ فرمایا۔ غرض کہ خاص مومن، خاص فرشتوں پر فضیلت رکھتا ہے اور

۱۔ اور عرض کیا: اَتَجْعَلُ فِيهَا مَنْ يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ
تو اجمالاً جواب دیا۔ قَالَ اِنِّي اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ. (البقرہ: ۳۰) (مترجم)

۲۔ یہ وہی فرشتے ہیں جنہیں ہاروت، ماروت کہا جاتا ہے۔ جن کا تذکرہ بے ایل ہاروت و ماروت.
(البقرہ: ۱۰۲) آیہ کریمہ میں ہے۔ (مترجم)

عام مومن، عام ملائکہ سے افضل ہے۔ تو جو انسان معصیت شعاری سے اجتناب کرے اور ارتکاب منہیات سے بچا رہے، وہ جبرائیل و میکائیل سے افضل ہے اور جو معصوم تو نہیں مگر گناہ سے بچنے میں کوشاں رہے وہ کرامتا کاتبین اور حفظہ سے افضل ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

غرض کہ اس بحث میں بہت سے کلام ہیں اور ہر ایک شیخ محقق نے علیحدہ علیحدہ بیان دیئے ہیں، بہر حال جسے اللہ تعالیٰ چاہے فضیلت دے۔ وَ بِاللّٰهِ التَّوْفِیْقُ

یہ نیک مذہب حکماء نے تصوف سے متعلق جو کہا ہے اور صوفیوں نے اس سے جو اختلاف کیا ہے، وہ مختصر بیان کر دیا گیا اور حقیقت تو یہ ہے کہ ولایت اسرار الہی سے ایک ستر ہے، اس پر چلنے کے بغیر کچھ ظاہر نہیں ہوتا۔ اور ”ولی دا ولی می شناسد“ اسی لیے کہا گیا۔ اس لیے کہ اسرار اولیاء کا اظہار اگر عقول انسانی پر روا ہوتا تو دوست اور دشمن، واصل و غافل میں تمیز کرنا مشکل ہو جاتی۔ بنا بریں مشیت الہی کا مقتضی ہی یہ ہے کہ اس کوچہ میں آنے والا دوستی کے جوہر جان ”کر بلا“ کے دریا میں غوطہ زنی کرے اور طلب حق میں اپنی عزیز جان دینے سے بھی خائف نہ ہو۔ (۱)

اس جاں ستاں بحر عمیق میں غوطہ لگا کر اس کی تہہ میں پہنچ کر (عروج و نزول کے نشیب فراز دیکھ کر) جب واپس ہو تو بامراد واپس ہو یا جان سپرد جاناں کر کے جان سے گزر جائے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس بحث کو طول نہ دوں، اس لیے کہ مجھے اس کتاب کے پڑھنے والے کی علالت طبع اور سیری کے بعد عدم توجہی کا خطرہ ہے۔ یوں میرا قلم رک گیا ہے اور یہ بھی بات ہے کہ مرید صادق کے لیے طریقت میں اتنا ہی کافی ہے۔

اور خرازیوں کے طبقہ کو حضرت ابو سعید خراز ”کی طرف نسبت کرتے ہیں۔ ان کی اس طریقت میں بہت تصانیف ہیں۔ وہ مجرد ہونے اور خلقت سے علیحدہ رہنے میں بہت دسترس رکھتے ہیں۔ انہوں نے فنا و بقا کے تمام طریقہ کو صرف دو عبارتوں میں مخفی کیا ہے۔ لہذا اب ہم ان عبارتوں کے صحیح معنی اور اس گروہ کی غلطیاں اب اس باب میں لاتے ہیں تاکہ سائل سمجھ سکے کہ ان کا مذہب کیا ہے اور ان عبارات متداولہ سے اس گروہ کا کیا مقصود ہے۔

۱۔ اور بقول اقبال:

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق

عقل ہے جو تماشا لے لب بام ابھی

کے مطابق اس جاں ستاں بحر عشق سے گزر جانے تک۔

فنا و بقا

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللَّهِ بَاقٍ ط﴾ (۱) ”یعنی جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ کم ہوتا جائے گا اور جو اللہ تعالیٰ کے پاس ہے وہ ہمیشہ باقی رہنے والا ہے۔“ اور دوسری جگہ فرمایا: ﴿كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ۖ وَيَبْقَىٰ وَجْهَ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ ۗ﴾ (۲) ”جو کچھ زمین پر ہے وہ سب کچھ فنا ہونے والا ہے اور تیرے رب کی ذات باقی رہے گی جو صاحب جلال و اکرام ہے۔“

اب یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ از روئے علم، فنا و بقا کسے کہتے ہیں اور اربابِ حال کی زبان میں اس کے کیا معنی ہیں، اور ظاہر یہ ہے کہ اربابِ ظواہر اس لغت کی کسی عبارت سے اتنے متحیر نہیں جتنے اس گروہ کے لوگ تحیر میں ہیں۔ بقا از روئے لغت تین قسم پر ہے: ایک وہ کہ ایک طرف بقا ہو تو اس کے دوسری طرف فنا ہو اور اس کی پہلی طرف بھی درحقیقت فنا ہو۔ جیسے یہ جہان کہ اس کی ابتداء کتمِ عدم میں تھی اور انتہا بھی منصفہ شہود پر آنے کے بعد عدم ہی ہے، اس کے مابین اس وقت باقی ہے۔

دوسری قسم یہ کہ بقا درحقیقت اول نہ ہو اور جو ہو وہ فنا نہ ہو۔ جیسے جنت دوزخ اور جہانِ عقبیٰ اور یہ جہان۔ تیسری قسم وہ بقا ہے جو حق ہے۔ جیسے بقائے حق تعالیٰ اور اس کی صفات لم یزل ولا یزال کہ وہ بھی اس کی ذات کے ساتھ قدیم ہیں۔ اس بقا سے مراد دوام اور ابدیت وجود ہے اور اس میں کسی کو اس کے ساتھ مشارکت نہیں، تو وہ علم فنا ہے جسے تو دیکھ رہا ہے کہ وہ فانی ہے اور علم بقا وہ ہے کہ جو عقبیٰ میں ہے کہ وہ باقی ہے۔ جیسے ذات حق تعالیٰ شانہ اور ﴿وَالْآخِرَةُ خَيْرٌ وَأَبْقَىٰ ط﴾ (۳)، اس جگہ عقبیٰ بصدیغہ مبالغہ فرمایا، اس لیے کہ اس جہان کی وہ بقا ہے جسے فنا نہیں ہے۔

لیکن فنا و بقا کا یہ حال ہے کہ جب جہل فانی ہو جائے تو علم لامحالہ باقی ہوتا ہے اور جب معصیت فانی ہو جائے، اطاعت باقی رہتی ہے اور جب بندہ علم طاعت اپنے میں حاصل کر لیتا ہے، غفلت فنا ہو جاتی ہے، تو بقا کا ذکر یہ ہے کہ جب بندہ بحق عالم ہوتا ہے تو اس کا علم باقی ہو جاتا ہے اور جہل اس سے فانی ہو جاتا ہے، اور جب غفلت فانی ہو جاتی ہے تو وہ ذکر کے ساتھ باقی ہو جاتا ہے اور یہ استقاظ اوصاف مذموم ہے، قیام اوصاف محمود کے ساتھ۔

لیکن اس قصہ میں خاص لوگوں کی اس عبارت سے وہ مراہ نہیں جو ہم نے بیان کی اور

۲۔ سورۃ الرحمن: ۲۶-۲۷

۱۔ سورۃ النحل: ۹۶

۳۔ سورۃ الاعلیٰ: ۱۷

اس اصل میں ان کا اشارہ علم اور حال سے نہیں ہے۔ یہ طائفہ جو اہل ولایت سے ہے بقا و فنا کو ولایت کا درجہ کمال جان کر اسے اس مقام کے سوا استعمال نہیں کرتا۔ جو لوگ مشقت و مجاہدہ سے نکل چکے ہیں اور مقامات کے تغیر حال کی قید سے رہائی پا چکے ہیں اور طلب کے بعد فنا کو پہنچ چکے ہیں، وہ ہر دیکھنے کی چیز کو اور کانوں سے سننے والی آواز کو بھی دل سے سننے کے بعد سب سے منہ موڑ کر قصدِ مراد میں فنا ہو کر انجام اور دعویٰ سے بیزار اور معنی سے علیحدہ ہو کر کرامتوں کو بھی حجاب جانتے ہیں اور دیکھے ہوئے تمام مقامات کو لباسِ آفت میں ملبوس پا کر چھوڑ دیتے ہیں اور عین مراد پر پہنچ کر مراد سے بھی بے مراد ہو کر تمام مشرب ساقط کر کے اُفت و اُنس سے بھی آگے نکل جاتے ہیں۔ جیسا کہ قرآن پاک میں ارشاد ہے: ﴿لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَن بَيِّنَةٍ وَيَحْيَىٰ مَنْ حَيَّ عَن بَيِّنَةٍ ۗ﴾ (۱) یعنی ”تا کہ ہلاک ہو جو ہلاک ہو ا دلائل میں اور زندہ ہو جو زندہ ہو ا مکاشفہ سے۔“ اور اس معنی کی تفسیر ہم اس رباعی میں ظاہر کرتے ہیں:

فَنَيْتُ فَنَائِي بِفَقْدِ هَوَائِي فَصَارَ هَوَائِي فِي الْأُمُورِ هَوَاكَ
فَإِذَا فَنَى الْعَبْدُ عَن أَوْصَافِهِ أَذْرَكَ الْبَقَاءَ بِتَمَامِهِ
”میں نے فنا کو اپنی خواہش کے کم کرنے سے فنا کیا تو اب ہو گئی میری خواہش
تمام امور میں تیری خواہش، تو جب بندہ فنا کر دے اپنے اوصاف کو تو پالیتا
ہے بقا تام کو۔“

”یعنی جب بندہ اپنے اوصاف کی کیفیت سے، اوصاف کی آفت سے فنا ہو جاتا ہے تو فنا
ء مراد میں بقا مراد کے ساتھ باقی ہو جاتا ہے تا کہ اُ سے قُرب و بُعد اور اُنس و مؤذت اور صحو و سکر،
فراق و وصل، طمس و اصلاح اور علم و ارتقام کچھ نہ ہو اور سب سے بے خبر ہو۔ اس حقیقت کے اظہار
کے لیے مشائخ رحمہم اللہ کی یہ رباعی خوب ہے:

وَطَاخَ مَقَامِي وَالرُّسُومُ كِلَاهُمَا فَلَسْتُ أَرَىٰ فِي الْوَقْتِ قُرْبًا وَلَا بُعْدًا
أَفْنَيْتُ بِهِ عَنِّي فَبَانَ لِي الْهُدَىٰ فَهَذَا ظُهُورُ الْحَقِّ عِنْدَ الْفَنَاءِ قَصْدًا
”میرا مقام اور رسوم دونوں فنا ہو گئے تو میں کسی وقت میں قُرب و بُعد نہیں
دیکھتا۔ میں اپنے آپ سے اس میں فنا ہوا تو مجھے ہدایت ملی تو یہ ظہورِ حق ہی
ہے۔ جو فنا بالقصد سے حاصل ہوتا ہے۔“

جب فنا کا قصد کر لیا اور تمام فنا کی چیز سے رویت کی آفت اور اس کی نفی ارادت ہو

درست نہیں ہوتی، جو کوئی بسہ صورت ہے اور اس کا یہ خیال ہے کسی چیز سے فنا ہونا بدون اس کے کہ اب چیز سے حجاب ہوتا ہے وہ غلطی پر ہے۔ ایسا نہیں کہ جب آدمی کسی چیز کو دوست رکھے اور کہے کہ میں اس سے باقی ہوں اور کسی چیز کو دل میں رکھے اور کہے کہ میں اس سے فانی ہوں، کیونکہ یہ دونوں صفتیں طالب کی ہیں اور فنا میں محبت اور عداوت نہیں اور بقا میں جمع اور تفریق کو دیکھا نہیں جاتا۔ ایک گروہ ان معانی میں غلطی پر ہے جو خیال کرتا ہے کہ فنا ذات کا گم ہونا اور شخص کا نیست ہونا ہے اور بقا وہ ہے کہ بقاء حق سے بندہ کو ملے کیونکہ دو امر محال ہیں۔

میں نے ہندوستان میں ایک مرد کو دیکھا کہ وہ تفسیر، وعظ اور علم کا دعویٰ کرتا تھا۔ اُس نے اس بارے میں مجھ سے بحث کی۔ جب میں نے دیکھا اور اس پر نظر کی تو وہ فنا و بقا کو جانتا ہی نہ تھا۔ ایسے بہت سے جاہل ہیں کہ فنا کلی کو روار کھتے ہیں اور یہ خالص مکابرہ عیاں ہے کیونکہ فنا کے واسطے اجزاء طینت اور ان کا جدا ہونا کبھی جائز نہیں ہوتا۔

میں ان غلط کار جاہلوں کو کہتا ہوں کہ اس فنا سے تمہاری کیا غرض ہے؟ اگر وہ کہیں کہ فنا عین مراد ہے تو یہ محال ہے اور اگر کہیں کہ فنا میں وصف تو ہم ہم روار کھتے ہیں اس لیے کہ فنا ایک ایسی صفت ہے جس سے دوسری صفت بقاء پائے اور یہ دونوں صفتیں بندہ کے حوالے ہوتی ہیں، اور رومی اور نصاریٰ نسطوریوں کا یہ مذہب ہے کہ حضرت مریم علیہا السلام بہ برکت مجاہدہ تمام اوصاف ماسویٰ اللہ سے فانی ہو چکی ہیں، بقاء لا ہوتی سے مل گئی ہیں اور اوصاف ماسویٰ فنا کر چکی ہیں۔ اسی وجہ میں انہوں نے وہ بقا پائی جو بقاء الہی ہے اور اسی کے ساتھ وہ باقی ہیں اور یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ان سے ظاہر ہونا اس کا نتیجہ سمجھتے ہیں، جو مایہ انسانی نہیں بلکہ ان کی بقاء، بقاء الہی سے ہے، تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی والدہ اور خدائے تعالیٰ یہ تینوں ایک صفت بقاء پر ہیں، معاذ اللہ۔ گویا اللہ تعالیٰ اور عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت مریم علیہا السلام تینوں قدیم ہیں اور ان کی صفات، صفات الہی کے مماثل ہیں اور یہی عقیدہ جماعت حشویہ کا ہے، بلکہ وہ مجسمہ و مشبہ بھی ذات واجب تعالیٰ شانہ مان کر حادث بھی تسلیم کرتے ہیں، اور ظاہر ہے کہ صاحب صفات قدیمہ کو صفت محدث میں تسلیم کرنا قدیم کو حادث کہنا ہے۔

میں کہتا ہوں: کہ یہ تمام محدث کیا محل قدیم میں ہوں، اور قدیم کیا محل محدث میں، اور کیا قدیم کا وصف محدث ہو، اور کیا محدث کا وصف قدیم۔ اس مذہب دہریہ کا جواز دلیل حدوت عالم کو باطل کرتا ہے اور اس سے صفت مصنوع صانع کو لازم آتا ہے کہ قدیم کہا جائے، اور مخلوق کو نامخلوق سے ملانا اور نامخلوق کا مخلوق میں حلول ہونا لازم آتا ہے اور یہ اُن کی جہالت کا خسارہ ہے۔

اس لیے کہ جب قدیم کو حادث کہیں یا حادث کو قدیم تو صنعت اور صنایع کو قدیم کہنا چاہیے۔ پھر اس اصول کے مطابق صنایع محدث ہوگی اور جب صنایع محدث ہوئی تو صنایع بھی محدث ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ ایک چیز کا محل، عین چیز کے مثل ہوتا ہے۔ جب محل محدث ہو تو چاہیے کہ حال بھی محدث ہو۔ تو اس سبب سے لازم آتا ہے کہ محدث کو قدیم کہیں یا قدیم کو محدث اور یہ دونوں باتیں خالص گمراہی ہیں۔

مختصر یہ کہ جو چیز کسی کے ساتھ ملی ہوئی ہو تو وہ دونوں چیزیں ایک ہی ہوں گی۔ تو ہماری بقاء جب ہماری صفت ہے تو ہماری فنا بھی ہماری صفت ہے اور ہمارے اوصاف کی تخصیص میں ہماری فنا ہماری بقاء کے مثل ہے اور ہماری بقاء ہماری فنا کی مثل ہے۔ تو فنا ایک صفت ہے دوسری صفت کی بقاء سے۔ پھر اگر کوئی فنا سے وہ مراد لے کہ بقاء کو اس سے تعلق نہ ہو تو جائز ہے اور وہ بقاء سے یہ مراد لے کہ فنا کو اس سے تعلق نہ ہو تو بھی جائز ہے۔ اس لیے کہ اس فنا سے ذکر غیر کی فنا مراد ہوتی ہے۔ اور بقاء سے بقاء ذکر حق۔ مَنْ فَنِيَ مِنَ الْمُرَادِ بَقِي بِالْمُرَادِ ”یعنی جو اپنی مراد سے فانی ہو جائے وہ مراد بحق کے ساتھ باقی ہوتا ہے۔“ اس لیے کہ وہ مراد فانی ہے اور مراد بحق باقی۔ تو جو اپنی مراد پر قائم ہو جائے تو اس کی مراد فانی ہو جاتی ہے اور اس کے فنا کے ساتھ وہ قائم ہو جاتا ہے۔ اس کی مثل ایسی ہے جیسے کسی بادشاہ کی آتش غضب و قہر ظہور میں آئے تو یہ اس کی صفت ہو جاتی ہے۔ تو جب وہ بادشاہ اپنے وصف غضب و آتش قہر کو بدلنا چاہے تو بدل لیتا ہے۔ ایسے ہی حق تعالیٰ اس سلطان آتش و قہر سے اولیٰ تر ہے۔ لیکن یہ تصرف آتش قہر اپنے وصف میں لوہا ہے مگر وہ سلطان وہی ہے جو تھا۔ لوہا اور آگ ہرگز نہیں ہو جاتا۔ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ (۱)

فصل:

حضرت ابو سعید خزار رحمۃ اللہ علیہ جو صاحب مذہب ہیں، فرماتے ہیں:

الْفَنَاءُ فَنَاءُ الْعَبْدِ عَنْ رُؤْيَةِ الْعُبُودِيَّةِ وَالْبَقَاءُ بَقَاءُ الْعَبْدِ بِمُشَاهَدَةِ الْاِلَهِيَّةِ.

۱۔ جو بحث فنا و بقاء آپ کے سامنے پیش ہوا۔ یہ اتنا مغلط اوداق ہے کہ اس کے سمجھنے کے لیے اہل بصیرت ہی اہل ہیں۔ عامۃ الناس اس کے سمجھنے سے قاصر ہیں۔ لہذا عوام کے لیے تو کشف المحجوب شریف کا وہی حصہ مفید اور دلچسپ ہے جس میں حالات اولیاء کرام و مشائخ عظام ہیں، یا کرامات خاصان حق کا جہاں تذکرہ ہے، یہ مضمون انحصار الخصوص کے لیے ہے اور یہ بحث ابھی آئندہ فصل میں بھی آرہی ہے اور مشائخ کرام رضی اللہ عنہم نے اس معنی میں لطیف رموز ظاہر فرمائے۔ (وہ اب یہاں بیان کیے گئے ہیں) مترجم

”یعنی فنا، عبد کا فانی ہونا ہے اپنی رویت عبودیت سے اور بقا بندے کا باقی رہنا ہے مشاہدہ الہیہ کے ساتھ۔“

یعنی اپنے کام میں بندگی کا دیکھنا بندے کے لیے آفت ہے اور بندہ بندگی کی حقیقت تک جب ہی پہنچتا ہے جب اپنے فعل کی طرف نگاہ نہ کرے اور اپنے عمل و عبادت کے دیکھنے سے فنا ہو جائے اور فعل ذات سبحانہ کے مشاہدہ میں باقی رہے، تاکہ اس کے تمام اعمال و عبادات منسوب بقا عمل ہوں نہ کہ وہ اس کے ارادہ اور طاقت کی طرف۔ اس لیے کہ بندہ کا ہر فعل ناقص ہوتا ہے، اور جو فعل حقیقی کی طرف سے بندہ کو بہ توفیق و فضل الہی پہنچے، وہ کامل ہوتا ہے۔ چنانچہ جب بندہ تعلقات سے فانی ہو جاتا ہے تو جمال الوہیت کے ساتھ باقی ہو جاتا ہے۔

حضرت ابو یعقوب نہر جوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

صِحَّةُ الْعُبُودِيَّةِ فِي الْفَنَاءِ وَالْبَقَاءِ .

”عبودیت و بندگی کی صحت فنا و بقا میں ہے۔“

اس لیے کہ جب تک بندہ اپنے ہر حصہ نصیب سے تہمتی و بیزاری نہ کر لے، اس وقت تک مرد سے خدمت و عبادت باخلاص کی اہلیت ہی نہیں ہوتی، تو پہلے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے ہر قسم کے نصیب و حصہ سے بیزاری کرے تاکہ وہ خدمت و عبادت باخلاص کے قابل ہو سکے، تو انسان کا اپنے ہر قسم کے نصیب و حصہ سے بیزار ہونا فنا ہے اور جب اس طرح فنا ہو جائے تو بندگی میں باخلاص ہو سکتا ہے جو حقیقتاً بقا ہے۔

حضرت ابراہیم بن شیبان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

عِلْمُ الْفَنَاءِ وَالْبَقَاءِ يَدُورُ عَلَى الْإِخْلَاصِ وَالْوَحْدَانِيَّةِ وَصِحَّةِ

النُّزُؤِيَّةِ وَمَا كَانَ غَيْرُ هَذَا فَهُوَ الْمَغَالِيطُ وَالزُّنْدِيقَةُ .

”علم فنا و بقا کا قاعدہ اخلاص اور وحدانیت ہے اور یہی صحیح عبودیت ہے اور جو

کچھ اس کے علاوہ ہے وہ غلو ط اور زندقہ ہے۔“

یعنی جب بندہ وحدانیت حق کا مقرر ہوتا ہے اور اپنے آپ کو مقہور حکم الہی سمجھ لیتا ہے اور ہر پہلو سے اپنے آپ کو مغلوب و عاجز جان لیتا ہے، تو یہی فنا ہے، اور جب اس کا فنا ہونا اس پر صادق آجاتا ہے تو اس کا اقرار بجز واکنسار کے سوا چارہ ہی نہیں ہوتا، پھر وہ حلقہ بارگاہ متعال پر پنچہ مار کر حقیقی بندہ ہو جاتا ہے اور جو فنا و بقا سے اور معنی مراد لیتا ہے یعنی فنا کو فنا عین سمجھتا ہے اور بقا کو بقا حق قرار دیتا ہے، وہ زندیق اور مذہب نصاریٰ کا پیرو ہوتا ہے، ایسے اغلو طے اور زندقہ ان کے اندر ہیں۔

جیسا کہ ہم پہلے بیان کر آئے ہیں اور میں (یعنی حضرت علی بن عثمان جلابیؓ) سمجھتا ہوں کہ یہ سب قول باعتبار معنی ایک دوسرے کے نزدیک ہیں۔ اگرچہ بقاء کو عبادت میں مخالف کہے مگر اصل اس کی یہی ہے کہ بندہ جلالتِ حق دیکھنے سے فنا ہوتا ہے۔ مگر جب اس کے دل پر کشفِ عظمتِ حق ہوتا ہے اور ایسا ہوتا ہے کہ غلبہٴ جلالت میں وہ دنیا و عقبیٰ کو اپنے دل سے محو کر دیتا ہے اور حالات و مقامات اس کی نظر میں ہمت حقیر اور ہیچ ہو جاتے ہیں اور کرامات کی اہمیت اس کے حال میں پراگندہ ہو جاتی ہے تو عقل اور نفس سے فارغ ہو کر فنا سے بھی فنا ہو جاتا ہے۔

پھر اس فنا کی فنا میں اس کی زبان حق کے ساتھ ناطق ہوتی ہے اور دل و تن محض عاجز و فروتن ہو جاتے ہیں۔ جیسا کہ ابتدا میں ذریتِ آدمِ پُشتِ آدم علیہ السلام سے نکلنے کے وقت عہدِ عبودیت کی آفات سے مرکب نہ تھی، عربی کے کسی بزرگ نے خوب فرمایا ہے:

لَكُنْتُ إِذَا كُنْتُ أَذْرِي كَيْفَ السَّبِيلُ إِلَيْكَ
أَلْفَيْتَنِي عَنْ جَمْعِي فَصِرْتُ أَبِكِي عَلَيْكَ

”اگر میں جانتا کہ تیرا راستہ کون سا ہے تو میں اپنی تمام ہستی سے فنا ہو جاتا اور

تیری یاد میں روتا رہتا۔“

ایک اور شیخ فرماتے ہیں:

فَفِي فَنَائِي فَنَاءُ فَنَائِي وَفِي فَنَائِي وَجَدْتُكَ أَنْتَ
مَحَوْتُ إِسْمِي وَاسْمَ جِسْمِي سَأَلْتُ عَنِّي قُلْتُ أَنْتَ

”میرے فنا ہونے میں میری فنا کا فنا ہونا ہے اور میں نے اپنی فنا میں تجھے

پایا۔ میں نے اپنا نام اور اپنے جسم کا نام مٹایا تو تو نے مجھ سے پوچھا، میں نے

کہا تو ہی تو۔“

فقر اور تصوف کے باب میں فنا و بقاء کے یہ حکم ہیں، جو ہم نے کچھ بیان کیے اور اس کتاب میں جہاں بھی فنا و بقاء کا ذکر ہوگا وہاں یہی مراد ہوگی۔ یہ خزار یوں کا اصل مذہب ہے اور تمام لوگ اس نیک اصل کے پیروکار ہیں۔ جو تفریق و صل کی دلیل ہو وہ بے اصل نہیں۔ اس گروہ میں یہ عبارت گروہِ صوفیہ میں زبانِ زو عام ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

فرقہ خفیفیہ

خفیفیوں کا واسطہ حضرت ابو عبد اللہ محمد بن خفیف شیرازی رحمۃ اللہ علیہ سے ہے۔

ابو عبد اللہ اس طائفہ کے کبریٰ سادات اور اپنے وقت کے عالمِ علوم ظاہر و باطن گذرے ہیں۔ آپ

کی تصانیف علمِ طریقت میں بہت مشہور ہیں۔ مردانِ خدا میں محبوب اور عقیف النفس تھے اور شہواتِ نفسانیہ سے معرض و محترز تھے۔ اور یہ بھی سنا ہے کہ ایک زمانہ آپ کا ایسا بھی گذرا کہ آپ نے چالیس نکاح کیے، چونکہ آپ شہزادگانِ ملوک سے تھے۔ جب تائب ہوئے تو اہل شیراز جتنے آپ سے متنفر تھے، توبۃ النصوح کے بعد اتنی تعظیم اور محبت کرنے لگے۔ شیرازی شہزادیاں اور رئیسوں کی لڑکیاں یہ آرزو کرنے لگیں کہ ابو عبد اللہ ہمیں اپنے عقد میں لے لیں تاکہ ہم مشرف بانسب زوجیت ہو جائیں۔

چنانچہ آپ نے ان کی آرزو اس طرح پوری فرمائی کہ عقد تو کیا اور ایجاب و قبول کے بعد قبل از خلوت صحیحہ انہیں طلاق دے دی۔ مگر چالیس خواتین مختلف وقت کے ساتھ آپ کی عمر میں دو دو تین تین، ایک وقت آپ کے حوالہ عقد میں رہ کر خادم فراش رہیں۔

ایک وزیرِ زادی پورے چالیس سال آپ کی صحبت میں رہی۔ شیخ ابو الحسن علی بن بکران شیرازی اپنے عہد حکومت کا حال بیان فرماتے ہیں کہ ایک بار ان خواتین کو مجتمع کر کے پوچھا گیا کہ ابو عبد اللہ کا کچھ حال سناؤ۔ سب نے متفقہ بیان کیا کہ حضرت ابو عبد اللہ میں ہم نے شہوانی شان قطعی نہیں دیکھی اور سب متعجب تھیں۔ اور یہ بھی بیان کرتی تھیں کہ شیخ ابو عبد اللہ کا ہر ایک کے ساتھ برتاؤ ایسا تھا کہ ہم میں سے ہر ایک یہ سمجھتی تھی کہ شیخ ہمارے ساتھ زیادہ ملتفت ہیں۔ ان میں وہ خاتون جو دختر وزیر تھیں انہوں نے چالیس سال آپ کی خدمت کی تھی، ان سے پوچھا گیا کہ تمہارے ساتھ تو کافی شیخ عبد اللہ کی صحبت رہی ہے۔ تم ان کے اندرونی راز سے ہمیں مطلع کرو۔ تو وزیرِ زادی کا بیان یہ تھا کہ میں جب شیخ عبد اللہ کی زوجیت میں آئی ایک دن مجھے اطلاع ملی کہ آج شیخ میرے یہاں رونق افروز ہوں گے۔ میں نے اعلیٰ اعلیٰ کھانے تیار کیے، خود زیب و زینت کی۔ شیخ جب تشریف لائے تو میں نے کھانا سامنے رکھا۔ شیخ نے کھانوں کی طرف نگاہ ڈالی اور تھوڑی دیر میری طرف نگاہ ڈالی۔ پھر میرا ہاتھ تھاما اور اپنے گریبان میں ڈالا۔

میں نے دیکھا کہ سینے سے ناف تک شکم مبارک میں پندرہ گھانٹھیں پڑی تھیں۔ فرمایا: اے وزیرِ زادی! تو نے گرہ تو دیکھ لیں اور یہ نہ پوچھا کہ یہ کیسی گرہ ہیں۔ میں نے عرض کی فرمائیں: تو آپ نے فرمایا یہ تمام گرہ سوزشِ صبر اور مجاہدۂ نفس سے ہیں، ان کے ذریعے میں طعام و شہوات سے محفوظ ہوں۔ یہ فرمایا اور کھڑے ہو گئے۔ اس سے زائد میرا ان کا معاملہ جو ہوا وہ یہ کہ میں نے انہیں مشاہدہ عین میں پایا اور حضوری حضور کی جو شان تھی اس کے بیان کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں۔ لہذا میں (یعنی حضور و اتا صاحب) اسے بیان کرتا ہوں۔ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ تَعَالٰی

غیبت و حضور

غیبت و حضور: یہ ایسی عبادت ہے کہ جب اس کا عکس کیا جائے تو عین معنی میں باعتبار مقصود مفہوم متضاد نظر آتی ہیں۔ اور اہل زبان و اہل معنی میں یہ مستعمل و متداول ہے۔ تو فنِ تصوف میں حضور سے مراد حضورِ دل ہے بہ دلالت یقین۔ یعنی جب تک حکم عین کو غائب نہ کر دے، حضور ممکن نہیں اور غیب سے مراد غیبتِ دل ہے جو ما سوا اللہ سے اس حد تک غائب ہو کہ صفتِ غیبت سے بھی اپنے کو غائب کر لے تاکہ وہ غیب میں خود نظارہ اپنا کرے اور اس کی علامت یہ ہے کہ حکم رسوم سے روگرداں ہو جائے۔ جیسے جملہ انبیاء کرام، حرام و جملہ معاصی سے معصوم ہوتے ہیں۔ تو طالب اسی طرح غائب ہو کر حضورِ حق میں حاضر رہے اور ظاہر ہے کہ جو حضورِ حق میں حاضر ہوگا وہ خود سے لازمی غائب ہوگا۔ اس کے دل کا مالک بمعنی حقیقی حق تعالیٰ شانہ ہے۔ تو جب جذبہ حق جل علا کی کشش طالب کو مقہور کر لے تو اس کے نزدیک غیبتِ دل حضور کی طرح ہوتی ہے اور پھر شرکت اور تقسیم اٹھ جاتی ہے۔ پھر کسی حرکت و فعل کا اپنی طرف منسوب کرنا قطع ہو جاتا ہے اور یہی فرمان حق تعالیٰ کا مفہوم واضح ہے: ﴿وَلَقَدْ جِئْتُمُونَا فَرَادَىٰ كَمَا خَلَقْنَاكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ﴾ (۱) ”یعنی تم ہمارے حضور فرد ہی آؤ گے جیسے ہم نے تمہیں فرد و تنہا پہلی بار پیدا فرمایا تھا۔“

چنانچہ حضرت حارث محاسبی، جنید، سہل بن عبد اللہ، ابو حفص حداد، ابو حمدون، قضا، ابو حریری، حصری اور صاحب مذہب محمد بن خفیف رضی اللہ عنہم اور دوسری جماعتوں نے متفقہ طور پر فرمایا: حضور کو مقدم از غیب کہتے ہیں۔ اس لیے کہ تمام جمالِ جمیلِ حضوری میں ہے اور غیبت خود بخود سے جاتی رہتی ہے اور جب حضور حق تعالیٰ کی پیش گاہ تک پہنچ جائے جو آفت کی راہ ہوتی ہے تو جو از خود غائب ہوگا وہ لامحالہ دربار حق میں حاضر ہوگا۔ اور غیبت کے فنا کا فائدہ حضور ہے اور غیبت بے حضور میں کیا نور ہو سکتا ہے۔ تو ہر طالب کو چاہیے کہ تارکِ غفلت ہو، تاکہ مقصود غیبتِ حضور حاصل ہو جائے اور جب مقصد موجود ہو تو علت ساقط ہو جائے گی۔

لَيْسَ الْغَائِبُ مَنْ غَابَ مِنَ الْبِلَادِ اِلْمَا الْغَائِبُ مَنْ غَابَ مِنَ الْمُرَادِ
وَلَيْسَ الْحَاضِرُ مَنْ لَيْسَ لَهُ مُرَادٌ اِلْمَا الْحَاضِرُ مَنْ لَيْسَ لَهُ فُؤَادٌ
حَتَّى اسْتَقَرَّ فِيهِ الْمُرَادُ

”وہ غائب نہیں ہے جو شہر و ولایت سے غائب ہو۔ غائب وہی ہے جو کہ مراد سے غائب ہو جائے۔ وہ حاضر نہیں جس کی کوئی مراد نہ ہو۔ حاضر وہی

ہے جس کے دل ہی نہ ہو۔ حتیٰ کہ وہ تیری فکر میں دنیا و عقبیٰ سے بے تعلق ہو جائے اور اس کا مستقر وہ ہے جہاں اس کی مراد ہو۔“

ایک خادم مریدان ذوالنون مصری حضرت بایزید رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت کو روانہ ہوئے۔ جب وہ عبادت خانہ کے در پر دستک دینے لگے تو حضرت بایزید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کون ہے اور کسے چاہتا ہے؟ مرید نے عرض کیا: بایزید کو۔ آپ نے فرمایا: وہ کون ہے اور کہاں ہے اور وہ کیا ہے؟ مجھے مدت ہو گئی کہ بایزید کو ڈھونڈ رہا ہوں۔ میں نے اُسے اب تک نہیں پایا۔

جب وہ واپس ہو کر خدمت ذوالنون میں آیا اور بایزید کا حال سنایا تو آپ نے فرمایا: ”اِخِي ذَهَبَ فِي الدَّاهِيَيْنِ فِي اللّٰهِ“۔ ”بھائی بایزید جانے والوں کے ساتھ چلا گیا حق تعالیٰ کی حضوری میں۔“

ایک شخص حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ فرمایا کچھ مدت میرے ساتھ رہ تاکہ چند باتیں تجھ سے کروں۔ پھر فرمایا اے جوان مرد! تو مجھ سے کچھ مانگ رہا ہے۔ مجھے دیر ہو گئی کہ وہی چیز میں طلب کر رہا ہوں۔ بلکہ مجھے سالہا سال گزر گئے ہیں کہ میں چاہتا ہوں کہ ایک نفس خود بخود حاضر ہو سکوں مگر نہ ہو سکا۔ اب اس گھڑی تیرے ساتھ حاضر ہو سکا ہوں۔ تو جب غیبت میں وحشت و حجاب ہے (تو محبوب کسی کو کیا دے) اس معنی میں شیخ ابو سعید رحمہ اللہ نے فرمایا ہے:

تَقْشَعُ غَيْمُ الْهَجْرِ عَنْ قَمَرِ الْحُبِّ
وَأَسْفَرَ نُورَ الصُّبْحِ عَنْ ظُلْمَةِ الْغَيْبِ

”محبت کے چاند سے جدائی کا بادل پھٹ گیا اور غیب کے اندھیرے سے صبح کا نور روشن ہو گیا۔“

اور ان معنی میں مشائخ کرام کے بہت سے لطائف حامی ہیں اور از روئے ظہور سب قافی ہیں اور یہ عبارتیں آپس میں نزدیک معلوم ہوتی ہیں۔ یعنی حاضر بحق ہونا اور از خود غائب رہنا۔ کیونکہ خود کے غائب ہونے سے حضور حاصل ہوتا ہے اور جو آپ سے غائب نہیں وہ حاضر بحق نہیں ہو سکتا اور جو حق میں حاضر ہے وہ غائب اور یقیناً غائب ہے۔

جیسا کہ حضرت ایوب علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ بلا میں بے قرار ہوئے۔ اس حال میں بھی آپ یقیناً از خود غائب تھے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے آپ کے جزع کو صبر سے جدا نہ

فرمایا اور جب آپ نے بارگاہِ حق میں ﴿ اِنِّیْ مَسْنِیْ الضُّرِّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرَّحِیْمِیْنَ ۙ ﴾ (۱) عرض کیا تو فرمایا: ﴿ فَاسْتَجِبْنَا لَهٗ فَكَشَفْنَا مَا بِهٖ مِنْ ضُرِّ ۙ ﴾ (۲) ”ہم نے اُسے قبول کیا اور جو اُسے رنج تکلیف تھی دور کر دی۔“ اور یہ حکم بعینہ اس قصہ میں عیاں ہے۔ اسے بغور دیکھو۔

حضرت جنید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں: ایک وقت ہم پر ایسا ہوتا ہے کہ زمین آسمان والے میری حیرت پر روتے ہیں اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ میں ان کی آرزوئے عنایت پر روتا ہوں اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ میں ان سے باخبر ہوتا ہوں نہ اپنے سے، اور یہ درجہ کمال کی طرف اشارہ ہے اور یہی حضوری خاص ہے۔ یہاں تک معنی غیبت و حضور کو مختصر بیان کیا گیا۔ بہر حال اس بیان سے مسلک خفیہان تیری سمجھ میں آگیا ہوگا کہ اس جماعت کی مراد غیبت و حضور سے کیا ہے اور اس کی شرح و وسط چونکہ کتاب کو طویل کر دے گی۔ اس لیے اسی پر اکتفا کرتا ہوں اور جو میرا مذہب ہے وہ اس کتاب میں مختصر ہے۔ وباللہ التوفیق۔

فرقہ سیاریہ

اب سیاریہ کا مذہب بھی سمجھنا چاہئے۔ جماعت سیاریان حضرت ابو العباس سیاری سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ مروی کے امام تھے اور تمام علوم میں عالم کامل اور حضرت ابو بکر واسطی کے ہم عصر ہیں۔ مقام نسا اور مرو میں ان کے اصحاب اور مرید کافی ہیں۔ اگرچہ مذہب تصوف میں کوئی بھی بحال نہیں رہا مگر ان کا مذہب قائم ہے۔ اس لیے مرو اور نسا کے لوگ ان کی پیروی سے منحرف نہیں ہیں اور جو لوگ ان کے مذہب پر قائم ہیں وہ مرو اور نسا میں ہی ہیں بلکہ اہالیان مرو کے بعض اصحاب نے تو نہایت بحث پر رسالے لکھے ہیں۔ بذریعہ خط و کتابت مسائل طے کرتے رہے ہیں اور بعض خطوط میں نے خود بھی مرو میں دیکھے ہیں۔ جو نہایت تفسیر مضمون سے مملو تھے۔ ان میں ”جمع و تفریق“ پر اچھی بحث تھی اور یہ لفظ اہل علم میں مشترک ہے اور ہر گروہ اس لفظ کو اپنے کام میں لاتا ہے تاکہ ان کی عبارتیں سمجھی جائیں۔ مگر اس سے ہر گروہ کی مراد علیحدہ ہوتی ہے۔

اہل حساب جمع و تفریق کا لفظ ضرور استعمال کرتے ہیں۔ مگر اس سے ان کی مراد کسی چیز کے اعداد کا جمع کرنا یا فرق کرنا ہوتی ہے۔ ارباب نحو اتفاقاً اسامی لغوی اور افتراق معنی مراد لیتے ہیں۔ ارباب فقہ جمع قیاس اور تفرقہ صفات یا جمع معنی اور تفرقہ قیاس اس سے مراد لیتے ہیں۔ ارباب اصول جمع صفات ذات اور تفرقہ صفات فعل مراد لیتے ہیں۔ لیکن اس طائفہ صوفیاء میں اس سے جو مراد ہے، اس میں اختلاف مشائخ کی تفصیل بیان کرتا ہوں تاکہ ان کی مراد کی جو حقیقت ہے وہ تم پر منکشف ہو اور جمع اور تفرقہ سے مشائخ جو مراد لیتے ہیں وہ معلوم ہو۔ ان شاء اللہ

جمع تفرقہ

اللہ تعالیٰ نے اپنی دعوت میں خلقت کو جمع فرما کر ارشاد کیا: ﴿وَاللَّهُ يَدْعُو إِلَىٰ دَارِ السَّلَامِ ۗ﴾ (۱) ”یعنی اللہ تعالیٰ بلاتا ہے سلامتی کے گھر کی طرف (یعنی جنت کی طرف)۔“ پھر ہدایت کے ساتھ تفریق کی اور فرمایا: ﴿وَاللَّهُ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ۝﴾ (۲) ”اور اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے سیدھے راستے کی طرف لے جاتا ہے۔“

گویا تمام مخلوق کو از روئے دعوت دارالسلام کی طرف بلا کر اپنی مشیت ظاہر کرنے کے لیے ایک گروہ کو دور کر دیا اور ایک گروہ کو دارالسلام کی طرف جمع فرمایا۔ یعنی ایک گروہ کو عصمت عطا کی اور ایک گروہ کو آفت کی طرف مائل کر دیا۔ تو اس معنی میں جمع کا راز مراد حق تعالیٰ معلوم ہوئی اور تفریق میں اظہار امر ونہی واضح فرمادی۔ جیسے کہ ابراہیم علیہ السلام کو فرمایا کہ سر اسماعیل کاٹ اور چاہا کہ سر نہ کٹے اور آدم علیہ السلام کو حکم ہوا کہ گندم نہ کھانا اور مشیت یہ ہوئی کہ وہ کھائیں اور مثل اس کی بہت سی مثالیں ہیں۔ ”الْجَمْعُ مَا جَمَعَ بِأَوْصَافِهِ وَالتَّفْرِيقُ مَا فَرَّقَ بِأَفْعَالِهِ۔“ اور یہ سب کچھ انقطاع اور وہ خودی اور ترک تصرف خلق ہے اثبات ارادہ حق میں اور اس حد تک جمع و تفریق میں اجماع ہے اہل سنت کا۔ سوائے معتزلہ کے کہ وہ مشائخ طریقت سے مختلف ہیں۔

اس کے علاوہ اس عبارت جمع و تفریق کے استعمال میں مختلف جماعتیں ہیں۔ ایک گروہ اسے توحید کی طرف لے جاتا ہے۔ ایک گروہ اوصاف حق کی طرف، ایک گروہ اوصاف عہد کی طرف ایسے کہ جو اوصاف بندہ میں ہوں وہ توحید سے ہوں، اس کے صدق عقیدہ اور صحت عزیمت سے۔ اور یہ قول حضرت ابوعلیٰ رودباری رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔

ایک گروہ اور ہے جو کہتا ہے کہ اوصاف بندہ میں ہوں وہ تمام صفت حق تعالیٰ سے ہوں اور اس میں فرق یہ ہو کہ کسب بندہ کا اس سے منقطع ہو اور جو مشیت الہی میں ہو اس سے وہ متنازع نہ ہو تو جمع ذات و صفات اس کے اندر ہو۔ اس طرح کہ ”الْجَمْعُ تَسْوِيَةٌ فِي الْأَصْلِ“ اور سوا اس کی ذات و صفات کے کوئی اس کا مساوی نہ ہو اور اس کے فرق کرنے میں عبارت اور تفصیل خلقت کے جمع نہیں۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ حق تعالیٰ کی صفات قدیم ہیں اور وہی اس سے خاص ہے اور صفات کا قیام اس سے ہے اور اس کے وجود کی خصوصیت اسی سے ہے اور وہ اور اس کی صفات دو ہیں۔ اس لیے کہ وحدانیت میں فرق وعدد روا نہیں اور اس صورت میں سوا اس معنی کے حکم جمع روا نہیں (لیکن تفرقہ فی الحکم)۔

یہ افعال حق تعالیٰ ہیں کہ تمام حکم میں متفرق ہیں۔ ایک گروہ کو حکم وجود کا ہے، دوسرے کو حکم عدم کا۔ لیکن عدم ممکن الوجود ہوتا ہے۔ تو ایک کو حکم فنا کا اور ایک کو حکم بقا کا۔ پھر ایک گروہ اور ہے کہ اسے علم پر لے جا کر کہتا ہے: **الْجَمْعُ عِلْمُ التَّوْحِيدِ وَالتَّفْرِيقَةُ عِلْمُ الْأَحْكَامِ** ”جمع علم توحید کا نام ہے اور تفریق علم احکام کو کہتے ہیں۔“ تو علم اصول جمع ہے اور علم فروع تفرقہ اور اس کے معنی بھی وہی ہوئے کہ حق تعالیٰ کی صفات قدیم ہیں اور وہ بھی قدیم جو اس ذات کے ساتھ مخصوص۔ چنانچہ مشائخ رحمۃ اللہ علیہم میں سے ایک فرماتے ہیں: **الْجَمْعُ مَا اجْتَمَعَ عَلَيْهِ أَهْلُ الْعِلْمِ وَالْفَرْقُ مَا اخْتَلَفَ فِيهِ**۔ ”یعنی جمع وہ ہے جس پر اہل علم اجماع کر لیں اور تفریق وہ ہے جس پر اہل علم نے اختلاف کیا۔“ پھر سب محققین تصوف **نَصَرَ اللَّهُ وَجُوهَهُمْ** کی عبارتیں اس طرف ہیں کہ مکاسب تفریق ہے اور مواہب جمع ہے، یعنی مجاہدہ و مشاہدہ۔ تو جب تک بندہ مجاہدہ سے راہ بنا رہا ہے، تفریق میں ہے اور جب بندہ پر عنایت و ہدایت حق ہونے لگے وہ مقام جمع ہے اور بندہ کی وہ قربت ہے کہ اس میں بندہ اپنے افعال اور احکام میں مجاہدہ بہ جمال حق میں ہر آفت سے اپنے فعل سے بچا ہوتا ہے اور اپنے کو حق تعالیٰ شانہ کے فضل میں مستغرق جانتا ہے اور مشاہدہ کو ہدایت کے پہلو میں منفی سمجھتا ہے تو اس کا قیام حق سے ہوتا ہے۔ پھر وہ اس ذات حق کے ساتھ ایسا محو ہوتا ہے کہ اس کی ذات حق بمعنی وکیل حقیقی ہوتی ہے اور اس کا ہر فعل ذات حق کی طرف منسوب ہو جاتا ہے اور بندہ اپنے کسب کی نسبت سے نکل جاتا ہے۔ چنانچہ پیغمبر آخر الزمان علیہ السلام نے فرمایا کہ ہمیں جبرائیل نے آ کر کہا! کہ حق تعالیٰ فرماتا ہے: **لَا يَزَالُ عَبْدِي يَتَقَرَّبُ إِلَيَّ بِالنَّوَافِلِ حَتَّىٰ أُحِبَّهُ فَإِذَا أَحْبَبْتُهُ كُنْتُ لَهُ سَمْعًا وَبَصْرًا وَيَدًا وَفُؤَادًا وَلِسَانًا فَبِي يَسْمَعُ وَبِي يُبْصِرُ وَبِي يُبْطِشُ**۔ (۱)

یعنی جب میرا بندہ بہ مجاہدہ میرے ساتھ تقرب کرتا ہے تو میں اُسے محبوب بنا لیتا ہوں اور اس کی ہستی کو اس میں فنا کر دیتا ہوں اور اس کی نسبت افعال سے اٹھا لیتا ہوں یہاں تک کہ وہ میرے ساتھ سُنتا ہے اور مجھ سے ہی وہ بات کرتا ہے، جو کچھ کہتا ہے میری ہی قوت سے کہتا ہے، جو دیکھتا ہے میری قوت سے دیکھتا ہے اور جو پکڑتا ہے میری قوت سے پکڑتا ہے۔ یعنی میری یاد میں اتنا مغلوب ہو جاتا ہے کہ میری ہی یاد باقی رہتی ہے اور اس کا ہر فعل میرے ذکر میں فنا ہو جاتا ہے اور میری یاد اُس کی سلطان ذکر ہو جاتی ہے اور اُس کی نسبت آدمیت میرے ذکر سے منقطع ہو جاتی ہے

۱۔ الفاظ کے اختلاف کے ساتھ اسے امام بخاری نے روایت کیا ہے: حوالہ کے لیے صحیح البخاری مع فتح

اور اس کا ذکر میرا ذکر ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ غلبہٴ حال میں اس صفت تک پہنچ جاتا ہے جیسے ابو یزید نے کہا: سُبْحَانِي مَا أَعْظَمَ شَانِي. ”میں پاک ہوں میرا کتنا بڑا درجہ ہے“۔ اور یہ کہنا اُن کی گفتار کا نشانہ ہے اور درحقیقت یہ کہنے والا حق تعالیٰ ہی پردہٴ عبد میں ہے اور حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: الْحَقُّ يَنْطِقُ عَلَى لِسَانِ عُمَرَ. (۱) ”حق زبان عمر (رضی اللہ عنہ) پر کلام کرتا ہے۔“

اس کی حقیقت یہ ہے کہ قہریت حق انسان پر اپنی سلطانت ظاہر کرتی ہے اور اسے اس کی ہستی سے اپنی طرف لے لیتا ہے تاکہ اس کا بولنا اس کے رب کا بولنا ہو۔ اس وقت حق تعالیٰ شانہٴ اپنی شان اس میں مخروج کرتا ہے۔ اس سے یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ کو دوسرے میں حلول مانا جائے یا صنایع اپنی مصنوع میں ایک ہو جائے یا وہ معاذ اللہ کسی میں حلول کرے۔ تَعَالَى اللَّهُ عَنِ ذَالِكَ عَمَّا يَصِفُهُ الْمَلَاحِدَةُ عَلُوًّا كَبِيرًا.

تو یہ جائز ہے کہ حق تعالیٰ کی دوستی بندہ کے دل پر غالب ہو جائے اور اس کے غلبہٴ محبت اور افراطِ حال سے عقل اور طبیعت اس کی برداشت سے عاجز ہو جائے۔ پھر ہر امر اس کے کسب اور فعل سے ساقط ہو۔ اس وقت کے اس درجہ کا نام جمع ہے۔ چنانچہ حضور ﷺ مستغرق اور مغلوب تھے۔ ان سے جو فعل ظہور میں آتا تھا اللہ تعالیٰ نے اس فعل کو حضور ﷺ کی نسبت سے اٹھا کر اپنی طرف منسوب فرمایا اور فرمادیا کہ جو تیرا فعل ہے اے محبوب وہ میرا فعل ہے، جیسے فرمایا: ﴿وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ﴾ (۲) ”یعنی اے محبوب وہ مٹی یا کنکریاں تو نے نہیں پھینکیں جو تو نے پھینکیں لیکن وہ اللہ تعالیٰ نے پھینکیں۔“ جیسا اس قسم کا فعل حضرت داؤد علیہ السلام سے ظاہر ہوا۔ اسے فرمایا: ﴿وَقَتَلَ دَاوُدُ جَالُوتَ﴾ (۳) ”یعنی داؤد علیہ السلام نے جالوت کو قتل کیا۔“ یہ حال بحال تفریق تھا۔ اور ظاہر ہے جو فعل بندے کی طرف سے منتسب ہو وہ محلِ آفت

۱۔ حدیث پاک کے مذکورہ الفاظ تو نہیں مل سکے مگر اس کی ہم معنی روایات موجود ہیں جنہیں امام ترمذی نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ان اللہ جعل الحق علی لسان عمر و قلبہ۔ حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ کی روایت کردہ حدیث شریف کے الفاظ یوں ہیں کہ رسول اللہ صلی علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ان اللہ وضع الحق علی لسان عمر یقول بہ۔ جبکہ امام بیہقی نے دلائل النبوة میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے طریق سے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے: ما کنا نبعث ان السکینتہ تنطق علی لسان عمر۔ حوالہ کے لیے ملاحظہ کریں:

مشکوٰۃ المصابیح، کتاب المناقب: باب مناقب عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ (حدیث

۶۰۳۳، ۶۰۳۴، ۶۰۳۵)

۳۔ سورۃ البقرۃ: ۲۵۱۔

۲۔ سورۃ الانفال: ۱۷۔

اور حوادث کے پہنچنے کا موجب ہے اور فعل بندہ اللہ تعالیٰ کی طرف منتسب ہو وہ قدیم اور آفت سے مبرا ہوتا ہے۔ تو اگر ایسا فعل آدمی سے سرزد ہو جو جنس افعال انسانی سے نہ ہو تو ضرور اس کا فاعل حق تعالیٰ شانہ ہوتا ہے اور معجزات و کرامات سب اسی جنس سے ہیں اور جو فعل مطابق عادت ہو وہ تفریق ہے اور جو خلاف عادت ہو وہ جمع ہے۔ اسی وجہ سے بحساب جمع ایک رات کے ادنیٰ حصہ میں قاب قوسین ہو جانا اگرچہ عادت نہیں مگر اس کا فاعل حق تعالیٰ شانہ ہوتا ہے جس میں عقل انسان کی رسائی نہیں۔ یہ منصب اللہ تعالیٰ اپنے انبیاء اور اولیاء کو عنایت فرماتا ہے اور اپنا فعل ان کی طرف منسوب کرتا ہے اور ان کے افعال کو اپنی طرف منتسب کرتا ہے اور بات بھی یہ ہے کہ اس کے دوستوں کے افعال اسی کے ہونے چاہئیں۔

یہی وجہ ہے خاصہ حق کی بیعت اس کی بیعت ہوتی ہے اور محبوب خاص کی اطاعت اس کی اطاعت جیسا کہ فرمایا: ﴿إِنَّ الَّذِينَ يُبَايِعُونَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُونَ اللَّهَ﴾ (۱) ”پیشک جو آپ سے بیعت کرتے ہیں وہ ضرور اللہ تعالیٰ سے بیعت کرتے ہیں“ اور اطاعت پر حکم لگایا ﴿مَنْ يُطِيعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ﴾ (۲) ”جو رسول کا قبیح ہو وہ یقیناً اللہ کی اطاعت کرنے والا ہے۔“ تو خلاصہ یہ ہوا کہ حق تعالیٰ شانہ کے اولیاء اسرار سے جمع اور اظہار میں تفریق کے ساتھ جدا، تاکہ اسرارِ موڈت کے جمع ہونے میں مضبوط ہوں اور فرقِ صحت اقامتِ عبودیت کے ظاہر کرنے میں صحیح ہے۔

چنانچہ مشائخ رضی اللہ عنہم سے ایک بڑے شیخ فرماتے ہیں:

قَدْ تَحَقَّقْتُ بِسِرِّي فَتَنَّا جَاكَ لِسَانِي
فَاجْتَمَعْنَا لِمَعَانٍ وَافْتَرَقْنَا لِمَعَانٍ
فَلَيْسَ غَيْبِكَ التَّعْظِيمُ عَن لِحْظِ عَيَانِي
فَلَقَدْ صِيرَكَ الْوَجِدُ مِنَ الْأَحْشَاءِ أَمَانِي

”تو میرے باطن میں محقق ہو گیا تو میری زبان نے تجھ سے سرگوشیاں کیں۔ پس کتنے ہی امور میں ہم جمع ہوئے اور کتنے ہی امور میں ہم میں تفریق ہوئی۔ اب اگر تیری عظمت نے تجھے میری آنکھوں سے غائب کر دیا ہے تو میرا شوق اس حد تک پہنچ چکا ہے کہ یہ غیبت بھی میرے لیے ”حضور“ کی پناہ گاہ ہے۔“

خلاصہ یہ کہ اجتماع اسرار کو جمع کہتے ہیں اور مناجات لسانی کو تفریق اور جب جمع اور تفریق ایک جگہ جمع ہو کر دل میں مرکوز ہو جائیں تو پھر اس کیفیت کا اس حال والا خود ہی قاعدہ ہو جاتا ہے۔
 نہایت لطیف بات ہے۔ وَاللّٰهِ التَّوْفِیْقُ

فصل:

اب رہا وہ خلاف گروہ جو کہتا ہے کہ اظہار جمع تفرقہ ہے۔ اس لیے یہ متضاد ہے کیونکہ جب سلطان ہدایت مستولی ہوتا ہے تو ولایت کسب و مجاہدہ ساقط ہو جاتا ہے اور محض تعطل ہے۔ اس لیے کہ جب تک امکان عمل اور طاقت کسب و مجاہدہ تھا، ہرگز وہ بندہ سے ساقط نہیں ہوتا۔ اس وجہ میں کہ تفرقہ سے جدا نہیں ہے۔ جیسے نور آفتاب سے اور عرض جوہر سے اور صفت موصوف سے، تو مجاہدہ ہدایت سے اور شریعت حقیقت سے اور طلب حاصل ہونے سے اسما جدا نہیں لیکن یہ ہو سکتا ہے کہ مجاہدہ مقدم ہو یا موخر لیکن یہ بہتر ہے کہ مجاہدہ مقدم ہو۔ اس پر مشقت زیادہ ہو اور اس پر کہ مجاہدہ موخر سے رنج و کلفت نہیں ہوتی۔ اس لیے کہ حضوری حضور میں ہوتا ہے اور اسے کہ نفی مشقت اعمال ہو تو نفی عین عمل نظر آتی ہے اور وہ عظیم غلطی میں ہے اور جائز نہیں کہ بندہ ایسے درجہ میں پہنچے کہ کل اپنے اوصاف کو معیوب اور معلولی جانے۔ جب اوصاف محمود کو اپنی نظر سے عیب دار نہیں کر سکتا تو ناقص بھی دیکھنا چاہئے تاکہ اوصاف مذموم معیوب تر نظر آئیں۔

یہ اس معنی میں میں لا رہا ہوں کہ ایک قوم جہاں سے اس معنی میں غلطی پڑ گئی ہے اور وہ بیگانگی کے قریب ہو گئی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ پانا کسی مجاہدہ سے وابستہ نہیں اور ہمارے اعمال و اطاعت معیوب ہیں اور ناقص مجاہدات نہ کرنے ہی بہتر ہیں ایسے کرنے سے۔ میں انہیں کہتا ہوں کہ ہمارے کردار کو بالاتفاق مقرر کرتے ہو اور فعلوں کو محل مشقت اور شر اور آفت کا منبع کہتے ہو تو ضرور نہ کرنے کو بھی ایک فعل کہنا پڑ گیا تو جب کرنا اور نہ کرنا دونوں فعل ہوئے اور فعل محل علت ہے تو کیوں نہ کرنے کو کرنے سے اولیٰ تر جانتے ہو۔ یہ تو خسران ظاہر اور غبن واضح ہے۔

تو یہ کفر اور ایمان میں اچھا فرق ہے اس لیے کہ مومن اور کافر میں اتفاق ہے کہ ان کے فعل محل علت ہیں تو مومن حکم سے کچھ کر کے نہ کرنے سے اچھا جانتا ہو اور کافر بیکاری کے حکم سے نہ کرنے کو کرنے سے اچھا جانتا ہے۔ تو جمع اسے کہتے ہیں کہ آفت دیکھنے میں تفریق کا حکم اس سے ساقط ہو جائے اور تفریق یہ ہے کہ جمع میں حجاب ہو تو تفریق کو ہی جمع جانے۔ زین کبیر کہتے ہیں
 الْجَمْعُ الْخُصُوصِيَّةُ وَالتَّفْرِيقَةُ الْعِبُودِيَّةُ مَوْصُولٌ أَحَدُهُمَا بِالْآخِرِ غَيْرَ مَفْصُولٍ عَنْهُ
 ”یعنی حق تعالیٰ شانہ کی خصوصیت کے لیے جمع ہوتی ہے اور بندہ کی عبودیت اس کیلئے تفرقہ ہوتا ہے

اور یہ اس سے جدا نہیں ہوتا اس لیے کہ نشانِ خصوصیت حفظِ عبودیت ہے۔ ”جب مدعی معاملہ میں اپنے عمل پر قائم نہ رہے تو وہ اپنے دعوے میں جھوٹا ہوتا ہے۔ تو جائز ہے کہ بار مجاہدہ ورنج و کلفت میں وقت گزارنا حق مجاہدہ و تکلیف اس کے بندہ سے اٹھ جاتی ہے لیکن یہ جائز نہیں کہ عین مجاہدہ و تکلیف میں انھیں عین جمع میں سوا کسی عذر کے۔ واضح رہے کہ یہ حکم اس کیلئے ہے جو احکام شرع میں عالم ہو اور اب میں اس کے معنی بیان کرتا ہوں تاکہ تجھے معلوم ہو جائے۔

سمجھ لو کہ جمع دو قسم کی ہے۔ ایک جمع سالم اور ایک جمع تکسیر۔ جمع سالم وہ ہے کہ حق تعالیٰ کی طرف سے غلبہ حال اور قوتِ عمل اور وجد و قلق میں شوق ظاہر ہو اور حق تعالیٰ ہی اپنے بندہ کا محافظ ہو اور اپنے حکم اس کے ظاہر پر جاری فرمائے اور بندہ کی اس کی تعمیل میں نگاہ رکھنے والا وہی ہو اور اسے مجاہدہ میں نہ ڈالے جیسا کہ سہل بن عبداللہ اور ابو حفص حداد اور ابو العباس سیاری مروزی امام مروصاحب مذہب اور ابو یزید بسطامی اور ابو بکر شبلی اور ابو الحسن حسری اور ایک جماعت کبار مشائخ قدس اللہ ارواحہم اس سے وابستہ اور مغلوب الحال تھے۔ جب نماز کا وقت آتا تو اپنے حال میں آکر نماز ادا کرتے جب فارغ ہو جاتے پھر مغلوب ہو جاتے۔

اس لیے کہ جب تو محل تفرقہ میں ہوگا تو ٹوٹو تو ہی ہوگا اور تعمیل احکام کرے گا اور جب اس طرف تجھے جذب کیا جائے گا تو حکم سے جو اولیٰ تر ہے وہ تجھ پر نگاہ رکھے گا۔ باعتبار جہت دو معنی کے لیے ایک یہ کہ نشان بندگی تجھ سے نہ اٹھیں، دوسرے یہ کہ حکم وحد پر قیام کرے کہ میں ہرگز شریعت محمدی علیہ السلام منسوخ کرنا نہیں چاہتا۔

اور جمع تکسیر یہ ہے کہ بندہ حکم اور اس کے متعلقات سے مدہوش ہو۔ اس کا حکم مثل مجاہدین کے ہوگا۔ تو ایک ان میں معذور ہوتا ہے اور ایک مشکور، مشکور کا حال معذور سے قوی تر ہوتا ہے اور تمام ان حالوں میں جمع کا کوئی مقام مخصوص نہیں ہوتا۔ حال مفرد نہ کہ جمع۔ جمع ہمت اس معنی میں اپنا مطلوب ایک گروہ کا کشف معنی مقامات میں ہوتا ہے اور ایک گروہ کشف اندر احوال چاہتا ہے اور یہ دونوں وقت صاحب مراد کے لیے جمع بھی کے حاصل ہوتے۔ لَإِنَّ التَّفْرِقَةَ فَضْلٌ وَالْجَمْعَ وَصْلٌ۔ ”اس لیے کہ تفرقہ فصل ہے اور جمع وصل“ اور یہ بہر صورت درست ہے جیسے ہمت یعقوب علیہ السلام، یوسف علیہ السلام کی طرف جمع ہوئی۔ اس لیے کہ ان کے لیے سوائے ارادہ یوسفی اور کوئی ارادہ باقی نہ رہا تھا اور مجنوں کی ہمت لیلیٰ میں اتنی جمع ہوئی کہ مجنوں کو سوائے لیلیٰ کے کچھ نظر نہ آیا۔ تمام عالم اس کی نظر میں لیلیٰ ہی تھا اور اس قسم کی بہت سی مثالیں ہیں۔ جیسا کہ ابو یزید رضی اللہ عنہ ایک روز اپنے عبادت خانے میں تھے کہ کوئی شخص آیا اور پکارا: هَلْ أَبُو يَزِيدَ فِي الْمَيْتِ؟ فَقَالَ أَبُو

يَزِيدُ مَا فِي الْبَيْتِ إِلَّا اللَّهُ ” کیا بایزید گھر میں ہیں؟ تو حضرت بایزید نے جواب دیا۔ گھر میں سوائے خدا کے، کوئی نہیں۔“

مشائخ رضی اللہ عنہم میں سے ایک کہتے ہیں کہ ایک درویش مکہ معظمہ آئے اور اپنی قیام گاہ میں مشاہدہ خانہ میں ایک سال رہے۔ نہ کچھ کھایا نہ پیا، نہ سوئے، نہ غسل کیا۔ اپنی اجماع ہمت کہ جو تھی رویت خانہ میں اسے اپنی طرف مضاف کرتے رہے، اور یہی ہمت ان کی غذائے تن اور مشرب جاں رہی۔

ان تمام (مغلق) باتوں کی اصل یہ ہے کہ جب خداوند تعالیٰ کو اپنا مایہ محبت بنا لیا جائے تو ایک جوہر سے ہو جاتا اور اپنے آپ کو اس سے متجزی و مقسوم کر لیتا ہے اور ہر ایک محبان خاص بقدر گرفتاری اس جُز سے اجزا کل کے ساتھ مخصوص کر لیتا ہے۔ اس وقت جوشِ انسانیت اور لباسِ طبیعت اور غاشیہ خراج اور حجابِ روح اس سے فرو گذاشت ہو جاتے ہیں حتیٰ کہ وہ اجزاء اپنی قوت سے اس جُز میں مل کر اپنی صفت میں متصف کر لیتے ہیں۔ تاکہ کل محبت، محبت ہی ہو اور تمام حرکات و لفظات اس کی شرط ہو جائیں اور اس حال کو تمام اربابِ معانی اور اہل لسان جمع کہتے ہیں اور اس معنی میں حضرت حسین بن منصور رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

لَبَّيْكَ لَبَّيْكَ يَا سَيِّدِي وَمَوْلَائِي
يَا عَيْنَ عَيْنِي وَجُودِي يَا مُنْتَهَى هِمَّتِي
لَبَّيْكَ لَبَّيْكَ يَا مَقْصِدِي وَمَعْنَائِي
يَا مَنْطِقِي وَإِشَارَاتِي وَإِيمَائِي
يَا كُلُّ كَلِمِي وَيَا سَمْعِي وَبَصْرِي
وَيَا جُمْلَتِي وَيَا غُنْصِرِي وَأَجْزَائِي

”میں حاضر ہوں، حاضر ہوں، اے مرے سردار! مرے مولا! میں حاضر ہوں

، حاضر ہوں، اے میرے مقصد! اے میرے معنی! اے میری عین! عین وجود

کے، اے میری ہمت کی انتہا! اے میرے کلام! اے میرے اشارہ! اے

اپہاء! اے میرے کل کے کل! اے میری سماعت و بصارت! اے میرے کل!

اے میرے عنصر! اے میرے اشارہ دل!!“

تو وہ جو اپنے اوصاف میں مستعار ہوتا ہے، وہ اس کی اثبات ہستی مستعار ہوتا ہے اور اس

کا التفات کونین کے ساتھ زتار ہے اور موجودات اس کی ہمت میں خوار ہوتی ہے۔

پھر ایک گروہ ارباب لسان اپنے دقیق کلام میں نفیس و پسندیدہ عبارت کہتا ہے کہ ”جمع

الجمع۔“ یہ کلمہ بطریق عبارت اچھا ہے۔ لیکن بمعنی بہتر یہ ہے کہ جمع کو جمع نہ کہا جائے۔ اس لیے کہ

تفریق لازمی ہے تاکہ جمع اُس پر درست کرے، اور کس طرح جمع جمع ہو سکتی ہے جب کہ خود جمع

تفریق ہے اور جمع ایک حال سے نہیں ہوتی اور یہ عبارت محلِ تہمت ہے۔ اس لیے کہ مجتمع کو فوق و تحت سے باہر دیکھنا نہیں ہو سکتا۔

کیا تو نہیں دیکھتا کہ کونین اور تمام عالم شبِ معراج حضور ﷺ نے ملاحظہ فرمائے اور کسی چیز کی طرف کچھ التفات نہ فرمایا اس لیے کہ وہ جمع کے ساتھ جمع تھے۔ اور مجتمع کا تفرقہ آپ نے مشاہدہ نہ فرمایا۔ حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغَىٰ﴾ (۱)

اور میں نے اس موضوع پر بحالتِ ہدایت کتاب لکھی ہے اور اس کا نام ”کتاب البیان لاهل العیان“ ہے اور بحر القلوب میں جہاں باب جمع ہے کافی فصول بیان ہو چکی ہیں۔ اب ہم بخيال اختصار اسی کو کافی سمجھتے ہیں اور یہ طریقہ مذہب ساریان کا ہے جو متصوفہ سے ہیں اور طبقہ صوفیاء میں مقبول محقق ہیں۔

اب اس گروہ ملاحظہ کی طرف رجوع کرتے ہیں جو صوفیاء سے متعلق بنتے ہیں اور ان کے مضامین اظہار الحاد کا آلہ ہیں اور ان کی گمراہی اور ذلت پر پردہ اعزاز ڈالتے ہیں تاکہ ان کی گمراہی ظاہر نہ ہو سکے اور مریدان کی باتوں سے پرہیز کریں اور اپنے کو ایسے لوگوں سے بچائیں۔ انشاء اللہ عزوجل وَالْأَمْرُ كُلُّهُ بِيَدِهِ۔

بیان فرقہ حلولیہ لعنہم اللہ

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿فَمَاذَا بَعَدَ الْحَقِّ إِلَّا الضَّلٰلُۃُ ۗ فَأَنَّىٰ تُصِرُّوۡنَ ۗ﴾ (۲) ”تو کیا ہے حق کے بعد مگر گمراہی تو کیا بھٹکتے پھرتے ہو۔“ ان دو مردود گروہ سے جو اس جماعت سے اتباع کرتے ہیں اور گمراہی میں انہیں اپنا یار جانتے ہیں۔ ایک نو روہ ابو حلمان دمشقی سے تعلق رکھتا ہے اور اس کی روایتیں لاتا ہے، جس کے خلاف کتب مشائخ میں اس سے مسطور ہے اور روایت کرنے والے اس قصہ کو اس کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ یہ ملاحظہ اس ابو سلیمان دمشقی کو حلول و امتزاج و نسخ ارواح کے عقیدہ کے ساتھ منسوب کرتے ہیں اور میں نے بھی ایک کتاب مقدس میں دیکھا کہ اس میں طعن کی ہے اور عالمانِ اصول کو بھی اس کا خیال ہے۔ حقیقت حال کو اللہ ہی جانتا ہے۔ ایک جماعت اپنے کو فارس سے منسوب کرتی ہے اور اس کا دعویٰ ہے کہ یہ مذہب حسین بن منصور کا ہے، اس جماعت کے سوا اور حسین بن منصور کی جماعت والے یہ مذہب نہیں رکھتے۔

میں نے ابو جعفر صیدلانی کو دیکھا ہے۔ ان کے مرید چار ہزار کے قریب عراق میں تھے اور وہ سب خلاجی تھے اور سب فارس کے اس کلام پر لعنت کرتے تھے اور ابو حلمان دمشقی کی کتابوں

میں جو ان کی تصنیف ہیں تحقیق کے سوا (حشو و زوائد) نہیں۔

اور میں (یعنی حضرت علی بن عثمان جلابی رحمۃ اللہ علیہ) کہتا ہوں کہ میں نہیں جانتا کہ فارس اور ابو حلمان کون ہے اور انہوں نے کیا کہا ہے۔ لیکن جو شخص ایسا کلام کرے جو توحید و تحقیق کے خلاف ہو، اسے دین سے کچھ واسطہ نہیں۔ اس لیے کہ جب دین کی اصل ہی محکم نہ ہو تو تصوف جو فرع اور نتیجہ ہے، بدرجہ اولیٰ خلل پذیر ہوگا۔ اس لیے کہ کرامات اور کشف اہل دین کے نشان کے سوا صورت پذیر نہیں اور اس امر کے قائلوں کو حقیقتاً روح میں غلطی واقع ہوئی ہے۔

اب میں سنت کے طور پر سب کلام اور احکام روح کے بیان کرتا ہوں اور ملحدوں کی گفتگو اور غلطیاں اور شبہات بیان کرتا ہوں تاکہ تجھے اللہ تعالیٰ قوتِ فہم بخشے کیونکہ اس بحث میں بہت مفاسد ہیں۔ وَبِاللَّهِ التَّوْفِیْقُ

روح کی بحث

اچھی طرح سمجھ لو کہ ہستی روح کا علم ضروری ہے اور اس کی کیفیت سے عقل عاجز ہے اور عالموں حکیموں نے اگرچہ اپنے قیاس کے مطابق اس کے بارے میں سب نے کچھ نہ کچھ کہا ہے اور کافروں کے طبقات نے بھی اس میں کلام کیا ہے۔ جب یہودیوں کی تعلیم سے کفار قریش نے نضر بن حارث کو حضور ﷺ کی خدمت میں بھیجا کہ وہ حضور ﷺ سے روح کے متعلق سوال کرے تو اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب پاک کو اس کے عین ثابت کرنے کو فرمایا: ﴿وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ ط﴾ (۱) ”یعنی اے محبوب آپ سے روح کی ماہیت پوچھ رہے ہیں۔“ تو اس وقت روح کی قدامت کی نفی فرمانے کا حکم دیا: ﴿قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي﴾ (۲) ”فرمادیتے روح امرِ رب ہے“ اور حضور ﷺ نے فرمایا: الْأَرْوَاحُ جُنُودٌ مُجَنَّدَةٌ فَمَا تَعَارَفَ مِنْهَا اِتْتَلَفَ وَمَا تَنَاكَرَ مِنْهَا اخْتَلَفَ. (۳) ”یعنی ارواح ایک جمع شدہ لشکر ہیں جو ان میں آپس میں آشنا ہیں وہ محبت و مراد سے ملے ہوئے ہیں اور جو ناواقف ہیں، وہ مختلف ہیں۔“

۱۔ سورۃ الاسراء: ۸۵ ۲۔ ایضاً۔

۳۔ اسے امام بخاری نے ”الادب المفرد“ میں سلیمان بن بلال سے، انہوں نے سہیل سے روایت کیا ہے۔ جبکہ بدء الخلق میں امام بخاری نے اسے لیث اور یحییٰ بن ایوب سے اور ان دونوں نے یحییٰ بن سعید سے، انہوں نے عمرہ سے، انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے، انہوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے اور الادب المفرد میں امام بخاری نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے موصولاً بھی روایت کیا ہے، امام مسلم نے ”صحیح مسلم“ میں عبدالعزیز بن محمد الدر اور دی کے طریق سے، انہوں نے سہیل سے، (بقیہ حواشی اگلے صفحہ پر۔۔۔۔۔)

اور اس کی مانند بہت سے دلائل ہیں مگر اس کی کیفیت پر کسی کا تصرف نہیں ہوا۔ ایک گروہ کہتا ہے:

(بقیہ حواشی گزشتہ صفحہ سے)

انہوں نے اپنے والد سے روایت کیا ہے۔ اس کے علاوہ امام مسلم نے جعفر بن زبرقان کے طریق سے، انہوں نے یزید بن الاصم سے روایت کیا ہے اور ان دونوں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے۔ امام ابو یعلیٰ نے یحییٰ بن ایوب اور زبیر بن بکار کے طریق سے روایت کیا ہے اور ان دونوں نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے، امام ابو داؤد نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ امام عسکری نے ابراہیم الجری کی سند سے، انہوں نے احوص سے انہوں نے حضرت ابن مسعود سے مرفوعاً روایت کیا ہے: *الا رواح جنود مجندة، تلتقى فتشائم كما تشائم الخيل، فما تعارف منها ائتلف وما تناكر منها اختلف، فلو ان رجلا مو منا جاء الى مجلس فيه مئة منافق، وليس فيهم الا مومن واحد لجا حتى يجلس اليه، ولو ان منافقا جاء الى مجلس فيه مئة مومن وليس فيه الا منافق لجا حتى يجلس اليه.*

اسی طرح امام دیلمی نے بغیر کسی سند کے حضرت معاذ سے مرفوعاً روایت کیا ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں۔ *لو ان رجلا مومنا دخل مدينة فيها الف منافق ومومن واحد لشم روح ذلك المومن وعكسه.*

امام دیلمی نے اس روایت کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ ایک مرتبہ حضور اکرم ﷺ نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے پاس ایک عورت دیکھی تو آپ نے پوچھا یہ کون ہے؟ عرض کی مکہ کی مزاحیہ عورت۔ پوچھا کس کے پاس آئی ہے؟ عرض کی: مدینہ کی مزاحیہ عورت کے پاس، تو آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: *الا رواح جنود مجندة۔* امام طحاوی کہتے ہیں کہ اس مضمون کی روایات حضرت سلمان، ابن عباس، ابن عمر، ابن مسعود، علی المرتضیٰ، عمر فاروق اور ابو طفیل رضی اللہ عنہم سے مروی ہیں۔ اس حدیث شریف کو امام سیوطی، "الجامع الصغير" میں لائے ہیں اور امام بخاری علیہ الرحمۃ کی طرف منسوب کیا ہے کہ انہوں نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے جبکہ امام احمد بن حنبل، امام مسلم اور امام ابو داؤد نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے اور امام طبرانی نے "المعجم الكبير" میں حضرت ابن مسعود سے روایت کیا ہے اور اسے صحیح کہا ہے۔ حوالہ کے لیے ملاحظہ فرمائیں:

صحیح مسلم کتاب الادب و کتاب البر (ص: ۱۵۹) صحیح البخاری، کتاب الانبياء، ۴، ۱۶۲/۱، والادب المفرد للبخاری (ص: ۹۰۰) سنن ابی داؤد، کتاب الادب (ص: ۱۹) المقاصد الحسنة للسخاوی (ص: ۹۵) مسند الامام احمد ۲/۲۹۵، ۵۳۷، ۵۳۹، حلیۃ الاولیاء لابی نعیم ۱/۱۹۸، ۲/۱۱۰، ۵/۶۷، تاریخ بغداد ۳/۳۲۹، ۳/۳۵۲ تمییز الطیب من الخبیث (ص: ۱۱۷) الجامع الصغير (حدیث: ۳۰۵۰). كشف الخفاء للعجلونی (ص: ۳۱۵) فیض القدير للمناوی ۳/۸۲، الجامع الا زهر للمناوی ۱/۱۹۲، الدرر المنتشرة للسيوطی (ص: ۱۵) مسند الشهاب ۱/۱۸۵، امثال ابی الشیخ (ص: ۱۰۰) مسند ابی یعلیٰ ۱/۳۰۲، تاریخ اصبهان لابی نعیم ۱/۲۳۸، ۲/۹۲، احیاء علوم الدین ۲/۱۱۱

الرُّوحُ هُوَ الْحَيَوةُ الَّتِي يُحْيِي بِهَا الْجَسَدُ. ”روح وہ ایک زندگی ہے کہ جسم اس سے زندہ ہوتا ہے۔“

ایک گروہ متکلمین کا بھی یہی کہتا ہے اور اس معنی سے روح عرض ہوئی کہ حیوان اس سے بفرمان الہی زندہ ہوتا ہے اور اس سے تالیف و حرکت اور اجتماع ہے اور اس طرح اعراض سے ہے کہ اس سے ہر جاندار ایک حال سے دوسرے حال میں جاتا ہے۔

دوسری جماعت والے کہتے ہیں کہ:

هُوَ غَيْرُ الْحَيَوةِ وَلَا يُوجَدُ الْحَيَوةُ إِلَّا مَعَهَا كَمَا لَا يُوجَدُ الرُّوحُ إِلَّا مَعَ الْجَسَدِ وَأَنْ لَا يُوجَدُ أَحَدُهُمَا دُونَ الْآخَرِ كَمَا لَا لَمْ وَالْعِلْمُ بِهَا لِأَنَّهُمَا شَيْئَانِ لَا يَفْتَرِقَانِ .

”یعنی روح ایک جوہر ہے بلا حیوة، جس کے سوا زندگی کا وجود روا نہیں ہوتا جیسے روح بلا جسم معتدل نہیں ہوتی اور ایک دوسرے کے بغیر نہیں، وجود نہیں ہوتا اور احساس بھی معدوم ہوتا ہے۔ جیسے درد اور درد کا علم تو جسم و روح دونوں ایسی چیزیں ہیں کہ ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوتے۔“

اور اس معنی میں بھی یہ امر ثابت ہوتا ہے کہ روح بغیر حیوة کے، اپنے وجود میں غیر محسوس ہے۔ جیسے بغیر شخصیت معتدلہ روح علیحدہ محسوس نہیں ہو سکتی۔ جیسے کہ درد اور اس کا احساس۔ تو اس کے معنی بھی عرض ہی ہوئے جیسے حیات۔ پھر جمہور مشائخ اور اکثر اہلسنت و جماعت اس طرف گئے ہیں کہ روح عینی جوہر ہے۔ نہ کہ وصفی کہ قالب سے موصول ہو۔ اجرائے عادت اللہ کے موافق حیوة کو پیدا کرتی ہے اور حیوة انسان صفت ہے اور اسی کے ذریعہ اسے زندہ جانا جاتا ہے۔ لیکن روح من جانب اللہ جسد انسانی میں ودیعت ہوتی ہے۔ اگرچہ یہ بھی جائز ہے کہ روح انسان سے جدا ہو جائے اور وہ حیات کے ساتھ رہے جس طرح سوتے ہوئے انسان سے روح نکل جاتی ہے اور حیات باقی رہتی ہے۔ مگر یہ جائز نہیں کہ روح کے چلے جانے کے بعد علم و عقل باقی رہے۔ اس لیے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ ارواح شہداء طیور جنت میں رہتی ہیں۔ اس بناء پر لامحالہ ماننا پڑے گا کہ وہ عین جوہر ہو اور سرور عالم ﷺ نے فرمایا: الْأَرْوَاحُ جُنُودٌ مُجَنَّدَةٌ. ”روحیں جمع کیے ہوئے لشکر ہیں“ اور یہ عرض پر باقی نہیں رہ سکتے اور عرض خود بخود قائم نہیں ہوتا تو روح ایک جسم لطیف ہے کہ فرمان الہی سے آتا ہے اور اسی فرمان سے جاتا ہے۔

حضور ﷺ نے فرمایا کہ ہم نے ایک ہی رات میں معراج والی شب آدم صغی اللہ،

یوسف صدیق اللہ، موسیٰ کلیم اللہ، ہارون کلیم اللہ، عیسیٰ روح اللہ اور ابراہیم خلیل اللہ علی نبینا وعلیہم الصلوٰۃ والسلام کو آسمانوں پر دیکھا تو لامحالہ ان کی روئیں تھیں اور اگر روح عرضی ہوتی، بخود قائم ہوتی حتیٰ کہ بحالت اسے دیکھ نہیں سکتا۔ اگر عرض ہوتا تو اس کے وجود کے لیے کوئی محل ہوتا جہاں وہ عارضی ہوتی اور اس کا محل جو ہر ہوتا اور جو ہر مؤلف اور کثیف ہوتا ہے۔ تو معلوم ہوا کہ اگر روح لطیف جو ہر اور جسم ہے تو اس کا دیکھنا جائز بھی ہونا چاہیے۔ لیکن دل کی آنکھ سے دیکھ لی جاتی ہے اور بستہ پروں میں وہ جنت میں ہوتی ہے اور اسے اپنی قبر اور قنادیل عرش میں آنے کی راہ ہے۔ جیسا کہ اس کے ثبوت میں اخبار و احادیث ناطق ہیں اور ان کا آنا جانا حکم الہی ہوتا ہے۔ جیسا کہ فرمایا: ﴿قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي﴾ (۱) ”اے محبوب فرما دیجئے کہ روح میرے رب کے امر میں سے ایک امر ہے۔“

یہاں ملاحظہ کا اختلاف ہے۔ اس لیے کہ وہ روح کو قدیم کہتے ہیں اور اسے پوجتے ہیں۔ اسے فاعل اشیاء اور مدبر بھی اس حد تک مانتے ہیں کہ اسے بغیر تدبیر امور نہیں ہو سکتی۔ اسے ارواح آلہ اور لم یزل کہتے ہیں۔ اس عقیدہ پر نصاریٰ بھی ہیں اور تبت اور چین، چین کے تمام ہندو یہی عقیدہ رکھتے ہیں۔ اور ادھر سے شیعہ اور قرامطہ اور فرقہ باطنیہ بھی اس عقیدہ پر ہے۔ ہر گروہ کے متعلق ہم ذکر کریں گے۔ اس میں سوال طلب جو چیز ہے وہ یہ کہ روح قدیم کس معنی میں مانتے ہیں۔

محدث مقدم مانتے ہیں جو وجود میں ہے۔ یا ایسا قدیم مانتے ہیں کہ ہمیشہ باقی رہے۔ اگر وہ کہیں کہ ہماری مراد محدث مقدم ہے وجود سے۔ تو ایسی صورت میں اصل کے اندر خلاف پیدا ہو گا۔ اس لیے کہ ہم بھی روح کو محل ضرور کہتے ہیں۔ اس لیے کہ تقدم وجود روح کو وجود شخصی پر تسلیم کیا گیا ہے۔ اس لیے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: **إِنَّ اللَّهَ خَلَقَ الْأَرْوَاحَ قَبْلَ الْأَجْسَادِ بِمِائَتِي أَلْفِ عَامٍ**. (۱) ”بیشک اللہ نے ارواح کو اجسام سے دو لاکھ سال قبل پیدا فرمایا۔“ تو جب اسے محدث مانا جائے تو لامحالہ محدث کو محدث کے ساتھ محدث ماننا پڑے گا اور یہ ایک قسم ہوگی مخلوق حق سے جسے دوسری جنس کے ساتھ ملایا گیا ہو اور اس ملانے سے لازم آئے گا کہ اللہ تعالیٰ حیوۃ سے

۱۔ سورۃ الاسراء: ۸۵

۲۔ یہ الفاظ اس حدیث شریف کا حصہ ہیں جسے امام ازدی نے حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے اور امام ابن جوزی نے ”الموضوعات“ میں اور امام شوکانی نے الفوائد المجموعہ (ص: ۳۸۲) میں ذکر کیا ہے اور کھل حدیث شریف یوں ہے: **ان الله خلق الارواح قبل الاجساد بالفی عام ثم جعلها تحت العرش، ثم امرها بالطاعة لی فاؤل روح سلمت علی روح علی،**

حاصل نہیں لایا اپنی تقدیر سے۔ یعنی ارواح ایک ایسی جنس ہیں کہ خلق کے اندر ہیں اور اجساد دوسری ایک جنس ہے۔ تو جب تقدیرِ حیوۃ، حیوۃ پیدا کرتی ہے تو اللہ تعالیٰ کا صرف یہ حکم رہ جاتا ہے کہ وہ حیات روح جسد انسانی میں پیوستہ ہوتا کہ اس میں زندگی حاصل ہو اور وہ جو کہ ایک شخص سے کسی شخص میں اس اصول کو روا نہیں رکھتے جیسے کہ ایک شخص کو دو حیوۃ روا نہیں ہوتی اور ایک روح دو شخصوں میں روا نہیں ہوتی۔

اگر اخبار میں یہ تصریح نہ ہوتی اور رسول اکرم ﷺ اپنی صادق خبروں میں اس کی خبر نہ دیتے تب بھی از روئے عقل یہی روح بدون حیات کے نہ ہوتی اور وہ صفت ہونہ کہ عین۔ اگر کہیں کہ اس قول سے ہماری مراد ہمیشہ قدیم ہے تو میں کہتا ہوں کہ وہ خود بخود قائم ہے یا غیر سے۔ پھر اگر کہیں کہ قدیم اور بنفسہ قائم ہے تو میں کہتا ہوں کہ خداوند عالم وہ ہے یا نہیں۔ اگر کہیں کہ خداوند عالم وہ نہیں تو دوسرا قدیم ثابت ہوگا۔ اور یہ معقول نہیں کیونکہ قدیم معدوم نہیں ہوتا اور ایک ذات کا وجود دوسری کی ضد ہوتا ہے اور یہ محال ہے۔

اور اگر کہیں کہ خداوند عالم ہے، تو میں کہتا ہوں کہ وہ قدیم ہے اور حادث کو قدیم سے ملانا یا ایک کر دینا یا ایک ہو جانا یا طول کرنا حادث کا مکان قدیم میں ہونا یا قدیم کا اسے حاصل ہونا محال ہوتا ہے۔ کیونکہ جو چیز کسی سے ملتی ہے وہ اس کی مثل ہوتی ہے اور وصل یا فصل کے سوا حادث روا نہیں ہوتا۔ تَعَالَى اللَّهُ عَنِ ذَالِكِ غَلْوًا كَبِيرًا .

اور اگر کہیں کہ بہ نفس خود قدیم اور دوسرے سے قائم ہے تو وہ حال سے خالی نہیں یا صفت ہوگا یا عرض۔ اگر عرض کہیں تو ضرور اس کے لیے محل ہوگا یا لا محل ہوگا۔ اگر محل میں کہیں تو محل اس کا کس کے مثل ہوگا۔ تو اسم قدیم باطل ہو جائے گا اور اگر لا محل کہیں تو اس کا وجود عقل نہیں مانتی اور اگر کہیں کہ صفت قدیم ہے جیسا کہ حلولی اور تاشخی کہتے ہیں اور اس صفت کو صفت حق بتاتے ہیں تو یہی محل ہے کہ حق کی صفت قدیم مخلوق کی صفت ہو جائے گی۔

اور اگر جائز رکھیں کہ حیات صفت خلق ہو تو بس روا نہیں۔ اس لیے کہ پھر قادر کی صفت مخلوق و مقدور کی صفت ہو جائے گی۔ اور پھر صفت موصوف سے قائم ہوگی تو پھر قدیم کی صفت کے لیے حادث کی صفت کی طرح جائز ہوگی۔ اور ناقابل انکار حقیقت ہے کہ حادث کو قدیم سے کچھ تعلق نہیں۔ اور اقوالِ ملحدہ اس صورت میں باطل ہیں اور روح چونکہ امر حق سے ہے اس کے سوا جو کہے وہ علانیہ مکابرہ ہے اور حادث و قدیم سے جہل ہے۔ اور یہ ممکن نہیں کہ ولی اپنی ولایت کی صحت میں اوصاف حق سے جاہل ہو۔

یہ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ ہم کو خطرہ سے محفوظ رکھا ہے اور عقل دی ہے جس سے ہم دلیل دے سکتے ہیں اور ایمان دیا ہے کہ اس کی روشنی میں اُسے پہچانتے ہیں اور وہ حمد جس کا انجام وحد نہ ہو، کرتے ہیں۔ اس لیے کہ محدود حمد بے حد نعمتوں کے مقابل مقبول نہیں۔ جب ظاہر داروں نے یہ بات اہل اصول کی سنی تو انہوں نے خیال کیا کہ سب صوفیوں کا یہی عقیدہ ہے تو وہ خسران و نقصان میں پڑ کر محجوب ہو گئے اور ولایت حق کا لطیفہ اور چمک اور تجلی ربانی اُن سے پوشیدہ ہو گئی۔ اس لیے بزرگوں نے فرمایا کہ عامتہ خلق کی تردید ان کے قبول کے برابر ہوتی ہے اور ان کا قبول رُذ کے برابر ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

فصل:

مشائخ کرام میں سے ایک حضرت فرماتے ہیں رحمۃ اللہ علیہ الرُّوحُ فی الجسدِ کالنَّارِ فی الفَحْمِ فَالنَّارُ مَخْلُوقَةٌ وَالْفَحْمُ مَصْنُوعَةٌ۔ ”جان جسم میں مثل اس آگ کے ہے جو کونلوں میں ہے تو آگ مخلوق ہے اور کونکہ مصنوع۔“ اور عقیدہ قدامت سوائے ذات و صفات حق تعالیٰ روا نہیں۔ اور حضرت ابو بکر واسطی نے روح میں بہت کچھ فرمایا ہے اور اُن سے جو روایتیں آئی ہیں وہ یہ ہیں کہ: اَلَا رُوحٌ عَلٰی عَشْرَةِ مَقَامَاتٍ۔ ”روح دس مقامات پر قائم ہے۔“ اول لازمی طور پر خطا کاروں کی رو میں جو مقید ہیں ظلمت کدہ عذاب میں، وہ نہیں جانتیں کہ ان کے ساتھ کیا ہوگا۔ دوسرے روح پارساوزہاد جو آسمانوں میں اپنے اپنے عمل کے بدلے میں خوش و خرم رہ رہے ہیں اور بطاعت الہی مسرور ہیں اور اسی قوت سے وہ جارہے ہیں۔ تیسرے ارواح مریدان کہ آسمان چہارم میں لذت صدق اعمال کے ساتھ سایہ اعمال میں ملائکہ کے ساتھ ہیں۔ چوتھے ان کی رو میں جو اہل من سے ہیں، وہ قنادیل عرش میں رہتی ہیں، ان کی غذا رحمت اور ان کا پینا لطف و قربت ہے۔ پانچویں وہ ارواح اہل وفا ہیں جو حجاب صفا و مقام اصطفا میں باعیش و طرب ہیں۔ چھٹے ارواح شہداء ہیں جو مرغان بہشت کے اجسام میں ریاض خلد میں ہیں وہ جہاں چاہیں سیر کریں اُن کے لیے وقت بے وقت کی قید نہیں۔

ساتویں ارواح مشتاقان ہیں کہ وہ پردہ ہائے انوار صفات میں بساط ادب پر مقیم ہیں۔ آٹھویں ارواح عارفان ہیں کہ وہ کوشک قدس میں رات دن کلام الہی سننے میں مست ہیں اور وہ اپنے اماکین و مقام بہشت اور دنیا دونوں دیکھتے ہیں۔ نویں ارواح دوستان خاص ہیں کہ وہ مشاہدہ جمال و مقام کشف میں مستغرق ہیں اور وہ سوائے جمال و جمیل کے کسی کو نہیں جانتے (۱) یہ

۱۔ بقول شاعر۔ پکارا دیکھ کر میں حور کی شکل خداوندیہ وہ صورت نہیں ہے۔ (مترجم)

محبوب کے جلوے کے سوا کسی سے نیاز مندی نہیں رکھتے۔

دسویں ارواحِ درویشاں ہیں کہ وہ مقامِ فنا میں مقرب ہیں ان کے اوصاف متبدل اور ان کے حال متغیر ہوتے ہیں۔

بعض مشائخ فرماتے ہیں کہ انہیں ہم نے دیکھا کہ ہر ایک اپنی علیحدہ صورت میں ہے اور یہ جائز نہیں جو ہم نے کہا کہ ان کا وجود ہے اور جسم لطیف ہے۔ یہ حقیقت بغیر دیکھے سمجھ میں نہیں آسکتی، البتہ جب اللہ تعالیٰ دکھانا چاہے تو بندہ دیکھ سکتا ہے۔ اور میں (علی بن عثمان جلابی) کہتا ہوں کہ ہماری زندگی کا خلاصہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔ اور ہماری بقا و فنا اور حیات و ممات اسی کی قوت سے قائم ہے۔ ہمیں زندہ رکھنا اسی کا ایک فعل ہے اور ہماری زندگی اس کی تخلیق کے ماتحت ہے نہ کہ اس کی ذات و صفات کی بقا کے ساتھ، اور طبقہ رومیوں کا وہ قول باطل ہے اور سخت گمراہی، جو کہتا ہے کہ روح قدیم ہے اگرچہ انہوں نے عبارتیں بہت کچھ بدلی ہیں۔

ایک گروہ اُسے نص اور ہیولی کہتا ہے۔ ایک گروہ نور اور ظلمت۔ اور اس طرح وہ طریقت کے مشائخ کے اصول باطل کرنا چاہتے ہیں۔ کوئی فنا و بقا کہتا ہے یا جمع اور تفرقہ۔ ایسی بیہودہ عبارتیں انہوں نے بنا رکھی ہیں اور ان کے ذریعہ اپنے کفر کو سراہتے ہیں اور صوفی لوگ ان کی باتوں سے بیزار ہیں۔ اس لیے کہ مقام ولایت کا ثابت کرنا بغیر محبت الہی اور اس کی معرفت کے ظاہر ہو ہی نہیں سکتا (۱) اور جو قدیم و حادث کا فرق نہیں سمجھتا وہ جاہل ہے اور اہل بصیرت و عقل ایسے جاہلوں کی طرف مائل نہیں ہوتے۔ یہاں تک اس گروہ باطل کا مقصد جو کچھ تھا بیان ہو چکا ہے۔ اب اس سے زیادہ وضاحت مطلوب ہو تو ہماری دوسری کتابوں میں دیکھئے۔ (۲) اب میں کشف حجاب اور معاملات کے حالات اور اہل تصوف کی حقیقتیں بہ دلائل ثابت کرتا ہوں تاکہ تجھے زیادہ آسانی رہے اور منکروں میں سے جسے بصارت حاصل ہو گئی وہ گمراہی سے راستے پر آجائے اور مجھے اس کا اجر ملے۔ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ تَعَالٰی (۳)

۱۔ صفت بادہ عشقش زمن مست مہرس ذوق این مے نشناسی بخدا تانچشی (مترجم)

۲۔ حضور داتا صاحب رحمۃ اللہ علیہ تو فرمائے کہ ہماری دوسری کتابوں میں دیکھئے لیکن آج نو سو سال کے اندر حضرت کی دوسری کتابوں کی زیارت ہمارے لیے عنقا ہو چکی ہے (مترجم)

۳۔ اقول وباللہ التوفیق۔ حضرت وحید العصر فرید الدہر حضور داتا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا بیان بحث تفصیل انبیاء

و اولیاء سے لے کر یہاں تک جو ادق مضمون ہے اور عوام کے فہم سے بہت بالا ہے، بلکہ میرا خیال تو یہ تھا کہ

وہاں سے یہاں تک تمام مضمون اصل فارسی میں ہی رکھوں لیکن چونکہ ترجمہ کر رہا تھا اس بنا پر ترجمہ ہی کیا

اگرچہ میں سمجھتا ہوں کہ اتنا ترجمہ ہو جانے کے باوجود عوام کے لیے یہ مفید نہیں۔ اب کشف الحجاب شروع

ہے۔ خدا کرے کہ اس میں وہ ادق اور مغلق مضامین کے پردے بھی کھل جائیں اور عوام استفادہ کر سکیں۔

وَمَا تَوْفِیْقِیْ اِلَّا بِاللّٰهِ. (ابوالحسنات قادری)

کشفِ حجابِ اوّل:

معرفتِ الہی کی شرائط میں

یعنی معرفتِ الہی کی جو شرائط ہیں اور اس کے جو مفاد ہیں ان پر مفصل بیان

اللہ تعالیٰ جل و علا فرماتا ہے: ﴿وَمَا قَدَرُوا اللَّهَ حَقَّ قَدْرِهِ﴾ (۱) ”تم نے نہ جانا اللہ تعالیٰ کو حق جاننے کا۔“ اور حضور ﷺ نے فرمایا: لَوْ عَرَفْتُمْ اللَّهَ حَقَّ مَعْرِفَتِهِ لَمَشَيْتُمْ عَلَيِ السُّحُورِ وَ لَزَالَتْ بِدَعَائِكُمُ الْجِبَالُ (۲) ”اگر تم اللہ تعالیٰ کا عرفان حاصل کرو حق عرفان تک تو یقیناً تم دریا پر چلنے لگو اور تمہاری دعا سے پہاڑ متزلزل ہو جائیں۔“

اب معرفتِ الہی کی دو قسمیں ہیں ایک علمی، ایک حالی۔

معرفتِ علمی تمام نیکیوں کی جڑ ہے جو دنیا و آخرت میں حاصل ہوتی ہے اور بندہ کے لیے عرفان میں اہم ترین چیز یہ ہے کہ وہ اوقاتِ احوال میں حق تعالیٰ شانہ، کو دنیا و آخرت کے اندر پہچانے اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ﴾ (۳) ”ہم نے آدمی اور جن پیدا نہیں کیے مگر اس لیے کہ اسے پہچان کر پوجیں۔“

تو اکثر مخلوق میں سے بہت سے وہ ہیں کہ عرفانِ حق میں قاصر ہیں سوائے اس کے کہ اتنا سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان و جن مخلوق کو اپنے لیے برگزیدہ کر رکھا ہے اور ظلمتِ دنیا سے آزاد رکھا ہے اور اس کے دل کو زندہ کر دیتا ہے۔ جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے حالِ عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے ہمیں خبر دی اور فرمایا: ﴿وَجَعَلْنَا لَهُ نُورًا يَشِيءُ بِهِ فِي النَّاسِ﴾ (۴) ”یعنی اور کیا ہم نے اس کے لیے نور جس سے وہ لوگوں میں چلتا ہے۔“ یعنی عمر فاروق رضی اللہ عنہ۔ (كَمَنْ مَثَلُهُ فِي الظُّلُمَاتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِنْهَا)۔ ”کیا اس شخص کی مثل ہے جو اندھیروں میں ہے اس سے نہیں نکل سکتا۔“ یعنی ابو جہل لعین۔ تو معرفتِ حیاتِ دل کا نام ہے، اللہ تعالیٰ شانہ کے ساتھ ہے اور ما سوا اللہ سے اعراض رکھنا اور یہ درجہ معرفتِ حق سے ہوتا ہے اور جسے معرفتِ حق نہ ہو وہ ذلیل و بے قدر ہے۔ تو آدمیوں میں سے علماء فقہاء وغیرہ جو علم کی صحت کو اپنے رب کی معرفت پر سمجھتے ہیں وہ عارف ہیں اور ایسے ہی مشائخ اس طائفہ کی اپنی صحتِ حال کو عرفانِ حق پر موقوف رکھتے ہیں اور اسی

۱۔ سورۃ الانعام: ۹۱

۲۔ حلیۃ الاولیاء ۱۵۶/۸، اتحاد سادۃ المتقین ۴۷۶/۹ کنز العمال ۱۳۶/۳ (حدیث: ۵۸۹۳)

۳۔ سورۃ الانعام: ۱۲۲

۴۔ سورۃ الذاریات: ۵۶

وجہ میں عرفانِ حق کو محض علم پر فضیلت دیتے ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ صحتِ حال بغیر صحتِ علم نہیں اور صحتِ علم بغیر صحتِ حال نہیں۔ یعنی وہ عارف عارف نہیں جو اپنے رب کا عارف نہ ہو۔ اور وہ عالم جو عارف نہیں اگرچہ عالم ہوگا مگر بغیر عرفان ہوگا۔ اور وہ لوگ جو اس معنی سے جاہل ہیں ان سے وہ اس مقام پر بے فائدہ مناظرہ کرتے پھرتے ہیں اور جانبین میں ایک دوسرے کو اس مسئلہ سے انکار کرتا پاؤ گے۔

فصل:

اب میں اس مسئلہ کا راز ظاہر کرتا ہوں تاکہ دونوں گروہ پر فائدہ حاصل ہو سکے۔ ان شاء اللہ۔ اللہ تمہیں سعادتِ دارین عطا فرمائے۔ لوگوں میں معرفتِ الہی اور صحتِ علم پر بہت اختلاف ہے۔ معتزلہ کہتے ہیں کہ معرفتِ حق تعالیٰ عقل سے ہے اور سوا عقل معرفتِ حق روا نہیں۔ اور یہ قول محض باطل ہے اس لیے کہ وہ دیوانے جو اول دارالسلام میں تھے، ان پر حکم معرفت کا لگایا جاتا ہے۔ دوسرے وہ بچے جو عاقل نہیں ہوتے ان پر حکم ایمان لگایا جاتا ہے۔ تو اگر معرفتِ حق عقل پر ہوتی تو انہیں عقل نہیں ہوتی تو ان پر ایمان و عرفان کا حکم لگانا صحیح نہیں ہوگا اور کافروں پر کہ ان میں عقل ہے حکم کفر کا نہیں چاہئے اور اگر عقل معرفتِ حق کی علت ہے تو چاہئے کہ جس میں عقل ہو وہ عارف ہو اور جتنے بے عقل ہوں سب کو جاہل کہا جائے اور یہ علانیہ مکابرہ ہے۔

ایک گروہ کہتا ہے کہ معرفتِ حق کی علت استدلال ہے اور بلا استدلال معرفت نہیں ہو سکتی۔ یہ بھی دعویٰ باطل ہے اس لیے کہ شیطان وہ ہے جس نے بہت سے دلائل دیکھے مثل بہشت، دوزخ، عرش و کرسی وغیرہ۔ تو یہ دیکھنا اس کے لیے دلیل ہے اور دلیل علت معرفت ہے تو اسے عارف کہنا پڑے گا۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَلَوْ أَنَّا نَزَّلْنَا إِلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتَىٰ وَحَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ قَبْلًا مَا كَانُوا يُوْمِنُونَ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ﴾ (۱) ”اگر ہم فرشتوں کو نازل کرتے ان کافروں کی طرف تاکہ وہ گفتگو کرتے اور مردے ان سے کلام کر لیتے تو وہ ایمان لانے والے نہ ہوتے مگر جسے اللہ چاہے۔“ تو اگر آیت و استدلال عرفان کی علت ہوتے تو اللہ تعالیٰ ان باتوں کو علت گردانتا ”إِلَّا أَنْ يَشَاءَ“ فرما کر اپنی مشیت کو۔ اہل سنت و جماعت صحتِ عقل و رویتِ آیت کو بھی معرفت کہتے ہیں نہ کہ علت معرفت۔ اس لیے کہ اس کی علت عنایت و مشیتِ حق کے سوا کچھ نہیں۔ بغیر

عنایت الہی عقل نابینا ہوتا ہے۔ اس لیے کہ عقل خود جاہل ہے اور کسی کی عقل حق تعالیٰ شانہ کی حقیقت نہیں جان سکتی۔ جب عقل خود جاہل ہے تو اپنے غیر کو وہ کس طرح عارف بنا سکتی ہے اور بلا عنایت حق جل جلالہ استدلال اور آیت الہیہ میں فکر کرنے سے خطا ممکن ہے۔ اہل ہوئی اور جماعتِ ملحدین اکثر دلائل رکھتے ہیں مگر بہت سے عارف نہیں ہوتے اور وہ جو عنایتِ حق کے اہل ہو گئے ان کی تمام حرکات معرفت ہوتی ہیں اور ان کا استدلال طلب و ترکِ استدلال میں مسلم ہوتا ہے اور وہ صحت معرفت میں تسلیم کو طلب سے اولیٰ تر نہیں سمجھتے اس لیے کہ طلب وہ چیز ہے کہ اس کے ترک کرنے کی کوئی راہ نہیں اور تسلیم وہ ہے کہ اس کی اصل میں اضطراب کی کوئی راہ نہیں، اور وجود کے لیے عقل و دلائل کو موجب ہدایت نہیں کہہ سکتے اور کوئی دلیل اس سے واضح تر نہیں جو اللہ تعالیٰ نے فرمائی: ﴿وَلَوْ رُدُّوا لَعَادُوا لِمَا نُهُوا عَنْهُ﴾ (۱) ”یعنی اگر کافر لوٹائے جائیں قیامت کے بعد دنیا میں تو اپنے اس کفر پر واپس لوٹیں۔“ جیسے امیر المؤمنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے معرفت کے متعلق سوال ہوا، فرمایا: عَرَفْتُ اللَّهَ بِاللَّهِ وَعَرَفْتُ مَا ذُوْنَ اللّٰهِ بِنُورِ اللّٰهِ ”اللہ تعالیٰ کو میں نے اس سے پہچانا اور ما سوا اللہ کو نورِ الہی سے جانا۔“

تو اللہ تعالیٰ نے جسموں کو پیدا فرمایا اور زندگی کو روح عطا کی اور دل کو پیدا فرمایا اور زندگی کا تمام اختیار اپنے قبضہ میں رکھا۔ تو جب عقل و آلات و آیات قدرت کو زندگی بغیر تن میں نہیں رکھا تو محال ہے کہ دل کو زندہ کرے۔ جیسا کہ فرمایا: ﴿أَوْ مَنْ كَانَ مَيِّتًا فَأَحْيَيْنَاهُ﴾ (۲) ”یعنی جو مردہ تھا پھر ہم نے اسے زندہ کیا۔“ یہاں قدرت حیات اپنی طرف رکھی۔ پھر فرمایا: ﴿وَجَعَلْنَا لَهُ نُورًا يَّشِيءُ بِهِ فِي النَّاسِ﴾ (۳) ”اور ہم نے اس کے لیے نور رکھا کہ چلتا ہے اس نور سے لوگوں میں۔“ تو آفریدگارِ نور اللہ تعالیٰ ہے جس میں بندہ چلتا ہے۔ اور فرمایا: ﴿يَّشِيءُ بِهِ فِي النَّاسِ لِلْإِسْلَامِ فَهُوَ عَلَىٰ نُورٍ مِّنْ رَبِّهِ﴾ (۴) ”کیا جس کا سینہ اللہ نے کھولا اسلام کے لیے اپنے رب کی طرف سے تو وہ ایک نور پر ہے۔“ اس آیہ کریمہ میں بھی شرح صدر کا فعل اپنی طرف منسوب کیا اور اس کا باندھنا بھی اپنی طرف منسوب فرمایا اور فرمایا: ﴿خَتَمَ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ وَعَلَىٰ سَمْعِهِمْ وَعَلَىٰ أَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ﴾ (۵) ”اللہ تعالیٰ نے مہر کر دی ان کے دلوں پر اور کانوں پر اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے۔“ پھر فرمایا: ﴿وَلَا نَطِغُ مَنْ أَغْفَلْنَا قَلْبَهُ عَنْ ذِكْرِنَا﴾ (۶) ”اس کا اتباع نہ کرو جس کے دل کو ہم نے غفلت میں ڈال دیا ہے اپنے ذکر سے۔“

۳۔ سورۃ الانعام: ۱۲۲

۲۔ سورۃ الانعام: ۱۲۲

۱۔ سورۃ الانعام: ۲۸

۶۔ سورۃ الکہف: ۲۸

۵۔ سورۃ البقرۃ: ۷

۴۔ سورۃ الزمر: ۲۲

تو جب قبض و بسط اور شرح و حتم دل اللہ تعالیٰ کے قبضہ میں ہے تو محال ہے کہ راہنمائی بغیر حق تعالیٰ ہو سکے اور جو کچھ اللہ تعالیٰ کے سوا امور ہیں وہ سب سبب علت ہو سکتے ہیں اور علت و سبب بلا عنایت مسبب راہ نہیں پاسکتے۔ بلکہ تمام حجاب راہبر ہوں گے اور نہ راہبر۔ اور اللہ تعالیٰ نے اسی وجہ میں فرمایا: ﴿وَلَكِنَّ اللَّهَ حَبَّبَ إِلَيْكُمُ الْإِيمَانَ وَزَيَّنَهُ فِي قُلُوبِكُمْ﴾ (۱) ”لیکن اللہ تعالیٰ نے پسند فرمایا تمہاری طرف ایمان اور اس میں تمہارے دلوں کو مزین کیا۔“ تزئین و تحسیب کو اپنی طرف مضاف کیا اور لزوم تقویٰ جو عین معرفت ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، اور عارف کو اپنے الزام میں دفع و جلب کا اختیار اس حال میں نہیں ہوتا۔ تو ثابت ہوا کہ بغیر عرفان حق مخلوق میں نصیب معرفت بغیر معجزہ نہیں ہو سکتا۔

حضرت ابوالحسن نوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: لَا دَلِيلَ عَلَى اللَّهِ سِوَاهُ إِنَّمَا الْعِلْمُ يَطْلُبُ لِأَدَابِ الْعِبَادَةِ. ”کوئی دلیل سوائے حق تعالیٰ کے اس عرفان میں دل کے لیے نہیں اور علم محض آداب خدمت کو طلب کرتا ہے۔“ نہ کہ صحت معرفت کو اور مخلوقات میں سے کسی کو یہ قدرت نہیں کہ وہ خدا تک پہنچا سکے۔

دلائل لانے والوں میں ابوطالب سے زیادہ کوئی عقلمند نہ تھا اور حقانیت کی دلیل حضور ﷺ سے بزرگ تر کچھ نہیں ہو سکتی تھی۔ مگر جب کہ جریان حکم شقاوت ابوطالب پر ہو چکا تھا، لا محالہ حضور ﷺ کی ذات اقدس بھی اسے فائدہ نہ پہنچا سکی۔ تو خصوصیت سے ماننا پڑے گا کہ درجہ استدلال محض اعراض ہے جل علا شانہ سے۔ اس لیے کہ استدلال نام ہے غیر میں تامل کرنے کا اور معرفت کی حقیقت غیر سے اعراض کرنا ہے اور عادتاً تمام مطلوبات کا وجود دلیل سے ہے اور حق تعالیٰ شانہ کی معرفت عادت کے برخلاف ہے۔

تو جب یہ ثابت ہو گیا کہ معرفت عقل جبروت دوامی کے سوا نہیں اور اس کا ملنا بندہ کے کسب سے نہیں تو اس کی وجہ کیا ہے کہ خلقت کے کسب کا اس میں راستہ نہیں اور بدون حق تعالیٰ بندہ کا کوئی راہنما نہیں۔ وہ دلوں کی کشائش اور غیبی خزانوں سے ہے۔ اس لیے کہ جو اس ذات کے سوا ہے سب حادث ہے اور یہ جائز ہے کہ حادث کو حادث پہنچے اور یہ کسی طرح روا نہیں کہ آفریدگار عالم جو قدیم ازلی سرمدی کو بھی پہنچے۔ با آنکہ حق تعالیٰ اس کا کسب کنندہ ہو اور جو کسب کنندہ کے کسب کے ماتحت ہو تو سب کا کسب غالب ہوتا ہے اور حاصل شدہ مغلوب و مقہور۔

اسی وجہ میں کرامت وہ نہیں کہلاتی جو عقل کی دلیل سے قائل کو ثابت کرے بلکہ کرامت

وہ ہوتی ہے کہ ولی الہی نور حق تعالیٰ شانہ سے اپنی ہستی کی نفی کر لے تو معرفت قوی ہو جائے اور دوسرے معرفتِ حال۔ اور جس چیز کو ایک گروہ معرفت کی علت سمجھتا ہے وہ عقل ہے۔ اسے کہنا چاہیے کہ دل میں عین معرفت سے کیا چیز ثابت ہوتی ہے اور جو کچھ عقل ثابت کرتی ہے معرفت اس کی نفی کرتی ہے۔ یعنی جو کچھ دل میں بدالالت عقل صورت آتی ہے وہ اسے خدا کہتا ہے اور حقیقتاً وہ اس کے خلاف ہے۔ اگر اس کے خلاف کوئی اور صورت آتی ہے تو وہ برخلاف حقیقت ہے۔ کیا عقل کی مجال نہیں کہ استدلال سے معرفت حاصل ہو۔ اس لیے کہ عقل دو ہم دونوں ایک جنس ہیں اور جب کہ جنس ثابت ہو، معرفت کی نفی ہو جائے گی۔ تو اثبات با استدلال عقل سے تشبیہ میں آئے گا اور نفی استدلال سے عقل میں تعطیل ہوگی اور اس کی گنجائش ان دو اصل سے باہر نہیں اور یہ دونوں معرفت میں زبوں ہیں اس لیے کہ مشبہ اور معطلہ ایک نہیں ہوتے۔ تو عقل جب اپنے مقدر کے موافق چلتی ہے اور اس سے جو ظہور پذیر ہوتا ہے وہ سب عقل ہی کا ہوتا ہے۔

اور دل ہائے دوستان کو طلب بغیر چارہ نہیں ہوتا۔ وہ درگاہِ عجز میں بے آلہ آرام کرتے ہیں اور اس آرام میں جب اپنے کو بے آرام دیکھتے ہیں تو اپنے ہاتھ زاری کے ساتھ اٹھاتے اور اپنے دل کے لیے مرہم ڈھونڈتے ہیں اور یہ انواع طلب و قدرت سے اس تک پہنچتے ہیں۔ پھر قدرتِ حق اس جگہ اُن کی قدرت میں آتی ہے، یعنی اس ذات کو دور استوں سے پاتے ہیں اور رنجِ غیبت سے آسودہ ہو کر روضہ انس میں جگہ لیتے ہیں اور وہاں آرام کرتے ہیں اور روح سرور میں قرار پاتے ہیں۔

جب عقل دلوں کو مراد تک پہنچا دیتی ہے تو اپنے تصرف سے اس حاصل شدہ مقام سے روکتی ہے۔ جب اس کا تصرف نہیں چلتا تو بعالمِ تحیر معزول ہو جاتی ہے۔ جب معزول ہو جاتی ہے تو اس وقت حق تعالیٰ لباسِ خدمت اسے پہنا دیتا ہے اور فرماتا ہے کہ جب تک تو اپنی خودی میں تھا تو اپنے آلات و تصرف سے مجھوب تھا اور جب کہ آلات فانی ہو گئے تو اب رہ گیا وہاں جہاں پہنچا۔ تو دل کو منصبِ قرب مل جاتا ہے اور عقل کو خدمت اور اس کی معرفت کو عرفانِ تام۔ پھر اللہ تعالیٰ اس بندہ کو اپنی تعریف اور تصرف سے آشنا کر دیتا ہے تاکہ وہ پہچان لے اُسے بھی جس کا نہ پہچاننا موصول آلہ سے تھا، بلکہ وہ پہچان جو بندہ میں عاریتاً تھی تاکہ پھر وہ تمام وجوہات سے عارف کو انانیت و خیانت سے محفوظ کر کے اُسے بے نسیان کر دے اور اس کے لیل و نہار بے تقصیر ہو جائیں اور اس کی معرفت حالی ہو جائے نہ کہ قالی۔ ایک گروہ نے یہ بھی کہا کہ ایسے درجہ پر اس کی معرفت، معرفت الہی ہے۔ اور یہ بھی محال ہے، اس لیے کہ معرفت کو برہانِ باطل و حق ہوتے ہیں اور اہل الہام

خطرے میں رہتے ہیں، ان کا وہ الہام برہان نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ اگر کوئی یہ کہے کہ مجھے الہام ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس مکان میں ہے اور ایک کہے کہ میرا الہام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے مکان نہیں۔ لامحالہ دونوں اپنے دعوے میں متضاد ہیں اور ان میں ایک مقبرون بہ حق ہے۔ اور دونوں دعوے کر رہے ہیں تو لامحالہ اس کے لیے دلیل چاہیے تاکہ اس کے ذریعے فرق کیا جائے صدق و کذب میں دونوں مدعیوں کے، اور اس وقت دلیل سے جانا جائے گا اور حکم بالہام باطل ہو جائے گا۔ اور برہمنوں اور الہامیوں کو میں نے اپنے زمانہ میں دیکھا کہ ان کے ساتھ ایک قوم بہت غلو کرتی ہے اور وہ اپنے زمانہ کا انہیں پارسا سمجھتی ہے اور تمام کے تمام حقیقت میں گمراہ ہیں اور ان کا قول تمام عقل والوں کے بھی خلاف ہے۔ عقلائے اہل کفر اور اہل اسلام دونوں ہی ان کے خلاف ہیں۔ اور اس قسم کے مدعیوں میں مدعیان الہام کے دس قول متناقض ہیں جن کا وہ دعویٰ کرتے ہیں، اور ہر ایک اپنے اپنے دعوے میں باطل ہے اور کوئی حق پر نہیں، اور اگر کہیں کہ کہنے والا اگر خلاف شرع کہے تو وہ الہام نہیں ہوگا۔

میں کہتا ہوں کہ اصل میں وہی خطا پر ہے جو قیام شریعت کو الہام پر موقوف کرے۔ اور اگر کوئی کہے کہ الہام کا ثبوت معرفت شریعت پر ہونا چاہئے اور اس کا ثبوت صحیح ہونے پر اسے الہام کہا جاسکتا ہے تو سمجھ لو کہ حکم الہام مقام معرفت میں بہ ہمہ وجود باطل ہے۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ معرفت حق ضروری ہے، اور یہ بھی محال ہے، اس لیے کہ جو چیز بندہ کے علم میں ضروری ہے وہ لازمی طور پر عقل کی شرکت سے ہوگی اور جب ہم دیکھتے ہیں کہ عاقلوں کی ایک جماعت اس سے انکاری ہے اور تشبیہ و تعطیل روارکتی ہے تو بھی کہنا صحیح ہوگا کہ عرفان از جانب خود ضروری نہیں اور اگر ضروری ہوتا تو اس پر تکلف نہ آتا۔ اس لیے کہ کسی چیز کے جاننے نہ جاننے میں تکلف محال ہے۔ جیسے کہ اپنا جاننا، آسمان وزمین، روز و شب کا آلام و لذات اور مثل اس کے جو چیزیں ہیں ان کے جاننے میں عقل وجود انسان کو شک میں ایسے نہیں ڈال سکتی کہ اس کے دیکھنے کے لیے مضطر ہو اور اگر چاہے کہ نہ پہچانے تو ہو سکتا ہے تصدأ نہ جانے۔

لیکن ایک جماعت متصوفین کی وہ ہے کہ اپنے یقین کی صحت پر نگاہ کرتی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ ہم اسے بہ ضرورت جاننے پر مجبور نہیں اور ایسے جانتے ہیں کہ دل میں بھی کوئی شک نہیں پاتے اور اس یقین کا نام ضرورت رکھتے ہیں اور وہ اس معنی میں مصیب ہیں، لیکن اس عبارت کے اندر وہ غلطی پر ہیں کہ علم ضروری میں صحت کی تخصیص روا نہیں ہوتی۔ اس لیے کہ تمام عقلاء یکساں عقلاء ہیں۔ اور اس میں بھی کہ علم ضروری علم ہوتا ہے کہ دوستوں کے دل میں سبب اور دلیل پیدا کرتا ہے

اور خداوند اور اس کی معرفت کو حاصل کرنا سبب ہے۔

لیکن استاد علی دقاق اور شیخ ابو سہل صعلو کی اوزان کے والد ماجد ابو سہل نیشاپور میں امام قوم ہیں، اس پر ہیں کہ معرفت کی ابتداء استدلال سے ہے اور انتہا علم ضروری سے ہے۔ جیسے صنعتوں کا جاننا ابتداء میں کسب ہوتا ہے اور انتہا میں ضروری۔ اہلسنت وجماعت کے ایک قول سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ کیا تجھے معلوم نہیں کہ حق تعالیٰ شانہ کا جاننا ضروری ہے اور علم ضروری روا ہوا تو ضرورت جائز ہوگی۔

اس دنیا میں انبیا کرام علیہم السلام کلام الہی سنتے ہیں اور یہ سننا بے واسطہ بھی تھا تا کہ بضرورت وہ پہچانے اور بواسطہ بھی جیسے کسی فرشتہ کے ذریعے یا بطریق وحی۔ اور ہم بھی یہی کہتے ہیں کہ بہشتی بہشت میں اللہ تعالیٰ کو بضرورت پہچانیں گے اور اس لیے کہ بہشت دار تکلیف نہیں اور پیغمبران اولوالعزم مامون العاقبت ہوتے ہیں اور انقطاع سے ایمن۔ تو وہ بضرورت پہچانتے ہیں۔ اسی وجہ میں وہ قطعیت کے خوف سے مامون ہوتے ہیں۔ اور جس نے اسے بالضرورت پہچانا اسے بھی خوف نہیں۔ اس لیے وہ ذات حق سے منقطع نہیں۔ اسی وجہ میں ایمان اور معرفت اس سبب سے فضیلت ہے کہ غیب سے جب عین ہو گیا تو ایمان اس سے غیر ہوگا اور اس کے عین میں اختیار نہ ہوگا اور اصول شرع بیقرار ہوں گی اور حکم رویت باطل ہوگا اور بلعم باعور اور ابلیس اور برصیصا کو کافر کہنا درست نہ ہوگا۔ کیونکہ بالاتفاق یہ عارف گزرے ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں خبر دی کہ مردود ابلیس کیا گیا اور برصیصا سنگسار ہوا۔ اس کی بھی اطلاع نبی اکرم ﷺ سے مل چکی ہے۔ ﴿فَبِعِزَّتِكَ لَا تُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ﴾ (۱) ”تیری عزت کی قسم البتہ میں ان سب کو گمراہ کر دوں گا۔“ اور حقیقت میں کہنا اور جواب سننا مقتضای معرفت ہے اور عارف جب تک عارف ہے، بے غم ہے اور جب جدائی اور انقطاع ہوتا ہے تو معرفت میں زوال آتا ہے، اور ضرورت یعنی امر بدیہی کے علم میں زوال نہیں ہو سکتا اور یہ مسئلہ خلقت کے اندر آفت ہے۔ اسی بنا پر عارف کے عرفان کی یہ شرط رکھی گئی کہ اس کا عرفان آفت سے محفوظ ہو اور بندہ کو جب صحیح عرفان حاصل ہو جائے گا تو وہ ہدایت ازلی کا محور کبھی نہیں ہو سکتا۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ درجہ عرفان کبھی زیادہ ہو کبھی کم۔ اور اس عرفان میں تقلید نہ ہو بلکہ عرفان کا کامل صفتوں کے ساتھ اس کا عرفان حاصل ہو اور یہ درجہ منجانب اللہ محض عنایت حق سے حاصل ہوتا ہے اور دلائل عقلیہ سب حق تعالیٰ شانہ کے تصرف و اختیار میں ہیں۔ اگر چاہے تو دنیا کے کسی فعل کو ہی رہنما بنا کر بندہ کو اس سے راہ دکھا دے اور اگر چاہے تو اس فعل کو

اس کے لیے حجاب بنا دے تو وہ اس فعل کے سبب محروم رہ جائے۔ جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایک قوم کے حق میں موجب رہنمائی ہوئے اور دوسری قوم کے لیے حجاب۔ ایک گروہ جسے آپ کی ذات سے ہدایت ہوئی تو وہ کہنے لگا کہ یہ مقبول حق اور عبد الہی ہیں۔ اور جس گروہ کے حق میں آپ حجاب ہوئے اس نے آپ کو ”ابن اللہ“ کہہ ڈالا۔ ایسے ہی بت اور آفتاب و قمر نے ایک گروہ کو راہ حق بتائی اور دوسرا گروہ رہ گیا۔ تو ثابت ہوا کہ اگر دلیل علت معرفت ہوتی تو لازم تھا کہ اتنی دلیل لانے والا بھی عارف ہوتا اور بظاہر مکابرہ ہے۔ تو نتیجہ یہ نکلا کہ جسے اللہ تعالیٰ پسند فرمائے اس کے لیے تمام اشیاء اس کی راہر بنا دیتا ہے اور وہ مقام معرفت تک پہنچ جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کو جان لیتا ہے۔ تو یہاں دلیل بندہ کے حق میں سبب ہوئی نہ کہ علت اور سبب دوسرے سبب سے اچھا نہیں ہوتا۔ سبب کے لیے سبب کے حق میں وارد ہے:

﴿لَعَمْرُكَ إِنَّهُمْ لَفِي سَكْرَتِهِمْ يَعْبَهُونَ﴾ (۱) ”اے محمد ﷺ! تیری حیاتی کی قسم ہے کہ تحقیق تیری قوم کے کافر لوط کی طرح اپنی گمراہی میں حیران و سرگرداں ہیں۔“

تیری قسم یہ ہے کہ عارف کو معرفت میں سبب کا ثابت کرنا ایک زنا ہے اور غیر معرفت کی طرف متوجہ ہونا شرک۔ ﴿مَنْ يُضِلِلِ اللَّهُ فَلَا هَادِيَ لَهُ﴾ (۲) ”جسے اللہ گمراہ کرے اُسے کوئی ہدایت کرنے والا نہیں۔“ تو جب لوح محفوظ میں بلکہ علم و ارادہ حق میں شقاوت کسی کے نصیب میں ہو تو دلیل کسی طرح اس کی ہادی نہیں ہو سکتی، مَنِ التَّفَّتْ إِلَى الْأَغْيَارِ فَمَعْرِفَتُهُ زُنَارٌ. ”جو غیروں کی طرف توجہ کرے تو اس کی معرفت زنا ہے۔“ یعنی جو اللہ تعالیٰ کے غیر میں پراگندہ اور غرق ہو تو وہ سوا اللہ تعالیٰ کی اعانت کے کس طرح غیر پر قابو کر سکتا ہے۔

جب حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام غار سے تشریف لائے تو دن کو کچھ نہ دیکھا۔ حالانکہ دن میں دلائل وجود زیادہ تھے۔ جب رات ہوئی تو ”زای کوا کبنا“ یعنی ستارہ دیکھا (اور اس کے مظاہرہ سے توحید الہی کی طرف چلے)، تو اگر معرفت ذات کی علت دلیل ہوتی تو دن میں دلائل کا ظہور زیادہ تھا اور اس قادر قیوم کے عجائبات روشن تر تھے۔

تو ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے اور جس طرح چاہتا ہے بندہ کو اپنی طرف رہنمائی فرما دیتا ہے اور اس پر در معرفت کشادہ کر دیتا ہے اور اس قدر تقرب بخشتا ہے کہ عین معرفت بھی اُسے غیر معلوم ہوتی ہے اور اس کے لیے وہ معرفت آفت ہوتی ہے اور معرفت سے معروضات محبوب ہو جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ اس کی معرفت اس درجہ تک پہنچتی ہے کہ معرفت پر اس کا دعویٰ ہو جاتا

ہے۔ حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ اِيَّاكَ اَنْ تَكُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ مُدْعِيًا.
شعر۔

يَدْعِي الْعَارِفُونَ مَعْرِفَةَ اَقْرُبُ بِالْجُهْدِ ذَاكَ مَعْرِفَتِي

”تجھے چاہیے کہ دعویٰ معرفت نہ کرے کہ اس سے ہلاک ہو جائے گا تو اپنا
تعلق اس کے معنی سے رکھتا کہ نجات پائے۔“

جو کشف جلالی ذات کے ساتھ اکرام حاصل کر لیتا ہے اس کی ہستی وبال ہو جاتی ہے اور
جمع صفات آفت ہو جاتی ہے اور جو حق سے وابستہ ہو جائے تو حق اس کی طرف ہو جاتا ہے۔ پھر
اسے دنیا و مافیہا سے بے خبری ہو جاتی ہے۔ جسے یہ نسبت مل جائے تو حق کا یہ مقام ہے کہ وہ سوائے
ذات حق، سب سے خبردار ہو جاتا ہے اور ہر حرکت و سکون کو ملک الہی سمجھتا ہے۔ تو جب بندہ سب
ملک ملک خدا سمجھ لے، اسے خلق سے کوئی واسطہ نہیں رہتا اور وہ تمام موجودات کو ملک حق سے
سمجھنے لگتا ہے تو وہ مخلوق سے محبوب ہو جاتا ہے اور وہ حجاب جو بوجہ جہل تھا وہ فنا ہو جاتا ہے اور اس کی
دنیا بھی بمنزلہ عقبی ہو جاتی ہے۔

فصل:

اور مشائخ رحمۃ اللہ علیہم کو اس بحث میں بہت سی رموز ہیں۔ ان میں سے بعض احوال میں
یہاں بیان کرتا ہوں۔

حضرت عبداللہ مبارک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: الْمَعْرِفَةُ اَنْ لَا تَتَعَجَّبَ مِنْ شَيْءٍ .
”معرفت یہ کہ کوئی شے تجھے حیرت میں نہ ڈالے۔“ اس لیے کہ تعجب اور حیرت اس فعل سے ہوتی
ہے جو اپنے مقدر سے زیادہ ہو۔ اور جب وہ قادر اپنے کمال قدرت میں کامل ہو تو عارف کو اس
میں تحیر و تعجب محال ہوتا ہے۔ اگر تعجب ہی کرتا تو جب کرتا کہ اس نے ایک مشت خاک کو کیا کیا درجہ
عطا فرمایا اور ایک قطرہ خون کس بلند مقام پر پہنچایا کہ اس کی دوستی اور معرفت اور طلب و رویت
ذات کرنے لگا اور قصد قربت و وصل کی آرزو کرتا ہے۔

حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: حَقِيْقَةُ الْمَعْرِفَةِ اِطْلَاعُ الْحَقِّ عَلٰى
الْاَسْرَارِ بِمُوَاصِلَةِ لَطَائِفِ الْاَنْوَارِ. ”معرفت کی حقیقت یہ ہے کہ اسرار حق پر مطلع ہو اور
لطائف انوار اس پر کھل جائیں۔“ یعنی جب تک اللہ تعالیٰ اپنی عنایت سے بندہ کے دل کو انوار عقل
سے آراستہ نہ کرے اور تمام آفتوں سے اسے دور نہ رکھے حتیٰ کہ موجودات اس کے سامنے رائی کے

دانے کے برابر بھی نہ رہے، تو جب اس مقام پر بندہ آجاتا ہے تو تمام معانی مشاہدات ہو جاتے ہیں۔ حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: **الْمَعْرِفَةُ ذَوَامُ الْحَيْرَةِ**. ”معرفت نام ہے ہمیشہ متحیر رہنے کا۔“ اور حیرت دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک ہستی میں، دوسری اس میں کہ اس کی ہستی میں جو کچھ ہے۔ حیرت اندر ہستی شرک ہے اور کفر۔ اور چگونگی وجود میں حیرت کرنا عین معرفت ہے۔ اس لیے کہ اس کی ہستی میں عارف کو شک نہیں ہو سکتا اور اس کی کیفیت میں عقل کو گنجائش نہیں۔ باقی رہا ہستی باری تعالیٰ کا یقین اور حیرت۔ اس کی کیفیت میں، اس پر ایک عارف فرماتے ہیں: **يَا ذَلِيلَ الْمُتَحَيِّرِينَ زِدْنِي تَحِيرًا**۔ ”اے حیرانوں کی دلیل! مجھے میری حیرت زیادہ دے۔“

یہاں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ وہی ذات مقصود خلق اور قبول کنندہ اس کی دعا کا ہے اور متحیرین کو اس کے سوا کوئی حیرت نہیں۔ اور جب کہ متحیر اس کے وجود میں اپنے اندر تحیر چاہتا ہے اور جانتا ہے کہ معاملہ مطلوب میں عقل کو بجز حیرت و سرگردانی اور کسی قسم کا دخل نہیں اور اس کی وہاں کچھ وقعت ہی نہیں اور حقیقت میں یہ معنی بھی نہایت لطیف ہیں۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ ہستی حق کی معرفت اپنی ہستی میں حیرت ہی کا تقاضا کرتی ہے اس لیے کہ جب بندہ نے حق تعالیٰ کو پہچانا اور اپنے وجود کو اس کے قہر و تصرف کی قید میں پایا تو سمجھا کہ اس کا وجود بھی اس سے ہے اور عدم بھی اس سے۔ تو جان لیا کہ میں کیا ہوں اور خود کون ہوں۔ اس حقیقت آشنائی کو حضور ﷺ نے فرمایا: **مَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهُ**۔ (۱) ”جو اپنے نفس کو پہچان لیتا ہے یقیناً وہ اپنے رب کو جان لیتا ہے۔“ تو پھر عقل فنا ہو کر صفت باطل ہو جاتی ہے اور ظاہر ہے کہ جب عین عقل میں نہ آئے تو اس کی معرفت سوائے تحیر کے ممکن نہیں۔

حضرت بایزید رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: **الْمَعْرِفَةُ أَنْ تَعْرِفَ أَنَّ حَرَكَاتِ الْخَلْقِ وَسَكْنًا بِهِمْ بِاللَّهِ**۔ ”معرفت یہی ہے کہ بندہ جان لے کہ مخلوقات کی تمام حرکتیں اور جملہ سکون حق تعالیٰ شانہ کی طرف سے ہیں۔“ اور کسی کو اس کے اذن کے بغیر اس کی ملک میں حق تصرف نہیں۔ عین اس سے عین ہے اور اثر اس سے اثر ہے اور صفت اس سے صفت ہے اور متحرک اس سے متحرک ہے اور ساکن اس سے ساکن ہے اور وہ وجود عبد میں توفیق پیدا نہ فرمائے اور دل میں قوت ارادہ نہ ڈالے، تو بندہ کوئی کام نہیں کر سکتا۔ تو بندہ کا ہر فعل مجازی ہے حقیقتاً فعل اللہ تعالیٰ کا ہے۔

حضرت محمد بن واسع رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ عارف میں یہ صفات ہونی چاہئیں: **مَنْ عَرَفَ اللَّهَ قَلَّ كَلَامُهُ وَدَامَ تَحِيرُهُ**۔ ”جو عارف حق ہو جائے وہ کم سخن اور دائم التحیر ہوگا۔“ اس

لیے کہ بولا اس کے معاملے میں کرتے ہیں جس کا بیان احاطہ بیان میں آسکے اور اصول عبارت میں حد ہو اور وہ احاطہ بیان میں آسکے اور جب اس کی تعریف کسی حد میں ہی نہ ہو تو اسے کسی عبارت کے تحت لانا کیونکر ممکن ہے۔ تو بندہ کو سوا اس کے چارہ ہی نہیں کہ اس کی قدرت میں متخیر رہے۔ اس حیرت کے سوا اس کے پاس کوئی تدبیر نہیں۔

حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

حَقِيقَةُ الْمَعْرِفَةِ الْعِجْزُ عَنْ مَعْرِفَةِ اللَّهِ .

”حقیقت معرفت یہ ہے کہ معرفت حق سے بندہ خود کو عاجز سمجھے۔“

اور ہمیشہ بندہ اس راہ میں سوا عجز کے کوئی اور پتہ دے۔ (۱) بندہ کے لیے یہ روا نہیں کہ ادراک ذات میں خود دعویٰ کرے۔ اس لیے اس کا عجز عین طلب ہے اور طالب اپنے ارادہ طلب میں جب تک ہے، اسے اپنے کو عاجز کہنا صحیح نہیں۔

ایک گروہ مدعیان حال سے کہتا ہے کہ اثبات صفت آدمیت اور بقاء تکلف بصحت خطاب و قیام حجت معرفت کرنے والا وہ ہے جو کہ معرفت میں عجز ہی ہے اور میں عاجز ہوں اور تمام مدارج سے رہ چکا ہوں۔ یہ کھلی گمراہی ہے اور نقصان و خسران ہے۔

میں کہتا ہوں کہ تم طلب میں کہاں عاجز ہوئے۔ اس عاجزی کے دو نشان ہیں۔ دونوں تم میں نہیں۔ ایک نشان تو یہ ہے کہ آگہ طلب فنا ہو جائے۔ دوسرا یہ کہ اظہار تجلی اس درجہ تک کہ جہاں آگہ طلب فنا ہو، جو عبارت ہے متلاشی سے، تو اگر عجز سے عاجزی کرتے ہو تو بجز عجز کے کچھ نہیں۔ اور اس جگہ کا جہاں اظہار تجلی ہے، کوئی نشان نہیں دے سکتا اور وہاں تمیز صورت بھی نہیں۔ جس سے عاجز اپنے کو عاجز کہہ سکے یا آنکہ وہ عاجز ہوتا ہے اور جسے عجز کہتے ہیں وہ بھی صورت پذیر نہیں۔ اس لیے عجز غیر ہے اور معرفت کا ثابت کرنا معرفت کے سوا کچھ نہیں البتہ عجز کو دل میں جگہ نہیں کہ وہ غیر ہے اور غیر سے کنارہ نہ کرے وہ عارف ہو نہیں سکتا۔

حضرت ابو حفص رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: قَدْ عَرَفْتُ اللَّهَ مَا دَخَلَ فِي قَلْبِي حَقٌّ وَلَا بَاطِلٌ . ”جب سے میں نے اللہ کو جانا میرے دل میں اندیشہ حق ہے نہ باطل۔“ اس لیے کہ خلقت کی مراد اور خواہش تو دل کی طرف رجوع کرتی ہے۔ جب تک دل اس کو نفس کی طرف رہنمائی کرتا ہے وہ دل دل ہی نہیں محض باطل ہے۔ اور جب ہمیشہ کی عزت پاتا ہے تو ذلت کی طرف رجوع کرتا ہے، جب اُسے روح کی طرف رہنمائی کرتا ہے جو منبع حق اور حقیقت ہے۔ جب دل میں غیر آیا تو

عارف کا رجوع بڑھتا ہے تو جب خلقت برہان معرفت اور طلب دلیل سے کی اور مقصود و خواہش کی طلب بھی دل سے کی تو ان سے مراد حاصل نہ ہوئی۔ آخرش وہ دل سے علیحدہ ہو کر حق کے سوا سے آرام نہ ملا تو حق دل سے طلب کیا۔ جب نشان اور دلیل یہاں سے نہ ملا تو حق کی طرف رجوع ہوا اور دل سے التفات ہٹا لیا۔ اس سے اس بندہ جس کا دل روح کی طرف ہو اور جس کا رجوع حق کی طرف ہو، فرق ظاہر ہو گیا۔

حضرت ابو بکر واسطی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

مَنْ عَرَفَ اللَّهَ انْقَطَعَ مِنَ الْكُلِّ بَلْ خَرَسَ وَانْقَمَعَ
 ”جس نے اللہ کو پہچانا سب سے منقطع ہو گیا بلکہ گونگا ہو کر سب سے جدا ہو گیا۔“

نبی ﷺ نے فرمایا:

لَا أُحْصِي ثَنَاءَ عَلَيْكَ (۱)

”میں تیری ثناء کا احصا نہیں کر سکتا۔“

تو خلاصہ یہ نکلا کہ جس نے اللہ کو جان لیا وہ سب چیزوں سے جدا ہو گیا بلکہ تمام عبارتوں کے بیان سے گونگا ہوا اور اپنے سب اوصاف سے فانی۔ جیسے حضور ﷺ جب تک عالم غیبت میں تھے فصیح العرب تھے۔ جیسا کہ فرمایا: ”أَنَا أَفْصَحُ الْعَرَبِ وَالْعَجَمِ“ جب آپ ﷺ حضور ﷺ حضور میں پہنچے تو عرض کی میری زبان میں تیری ثناء کی قوت نہیں، میں کیا ہوں، بے زبان، اور تو وہی ہے جو ہے، میری زبان میں قوت احصا ثناء کمال نہیں، میں کیا کہوں، کہنے میں نہ کہنے والا ہوں اور حال سے بے حال اور تو وہ ہے تو ہی ہے۔ میری گفتار میری طرف سے ہو یا تیری طرف سے، اگر میں خود سے بولوں تو فنا سے محبوب ہوتا ہوں۔ اگر تیری قال سے بولوں تو قرابت ذات کے منصب میں معیوب ہوں۔ لہذا میں قال کو ہی چھوڑتا ہوں۔ تو فرمان آیا کہ اے محمد ﷺ اگر تو نہیں کہتا تو میں کہتا ہوں۔ لَعَمْرُكَ إِذَا سَكَّتْ عَنْ ثَنَائِي فَأَلْكُلُ مِنْكَ ثَنَائِي ”تیری جان پاک کی قسم! جب تو میری ثناء سے ساکت ہے تو جو کچھ تو فرمائے گا وہ میری ثناء ہوگی۔“ جب تو اپنے کو میری ثناء کا اہل نہیں کہتا تو میں تمام اجزاء عالم کو تیرا نائب مقرر کرتا ہوں تاکہ وہ میری ثناء کریں اور تمام ثنائیں تیرے حوالے کریں۔ واللہ تعالیٰ اعلم

۱۔ اس حدیث کی تخریج گزر چکی ہے۔

کشفِ حجابِ دوم: توحید

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿وَالْهَكْمُ إِلَهُ وَاحِدٌ﴾ (۱) اور یہ بھی کہا ہے ﴿قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ﴾ (۲) ”کہہ اے نبی! وہ واحد ہے کوئی اس کا شریک نہیں۔“ اور فرماتا ہے: ﴿لَا تَتَّخِذُوا إِلَهَيْنِ اثْنَيْنِ ۚ إِنَّمَا هُوَ إِلَهُ وَاحِدٌ﴾ (۳) اور حضور ﷺ نے فرمایا: بَيْنَا رَجُلٌ فِيمَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ لَمْ يَعْمَلْ خَيْرًا قَطُّ إِلَّا التَّوْحِيدَ فَقَالَ لِأَهْلِهِ إِذَا مِتُّ فَأَحْرِقُونِي ثُمَّ اسْتَحْقُونِي ثُمَّ ذَرُونِي نِصْفِي فِي الْبَرِّ وَنِصْفِي فِي الْبَحْرِ فِي يَوْمٍ رَائِحٍ ففَعَلُوا فَقَالَ اللَّهُ عَزَّوَجَلَّ لِلرِّيحِ احْفَظِي مَا أَخَذْتَ فَإِذَا هُوَ بَيْنَ يَدَيْهِ فَقَالَ لَهُ مَا حَمَلَكَ عَلَى مَا صَنَعْتَ فَقَالَ اسْتَحْيَاءُ مِنْكَ فَغَفِرَ لَهُ. (۴)

”تم سے پہلے ایک مرد تھا اس نے کبھی نیک کام نہیں کیا مگر توحید پر قائم تھا تو مرتے ہوئے اس نے اپنے پسماندوں سے کہا کہ جب میں مر جاؤں تو جلا دینا، پھر میری خاک لے کر آندھی کے روز آدھی جنگل میں اڑا دینا اور آدھی دریا میں بہا دینا۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا تو اللہ تعالیٰ نے ہوا کو حکم دیا کہ تمام خاک پیش کرے اور دریا کو حکم دیا کہ یہ سب خاک محفوظ رکھو تو وہ مجسمہ

۱۔ سورۃ البقرۃ: ۱۶۳ ۲۔ سورۃ الاخلاص: ۱ ۳۔ سورۃ النحل: ۵۱

۴۔ یہ شفاعت سے متعلق طویل حدیث شریف کا جز ہے جسے امام احمد، امام ہشمی، امام منذری اور امام ابن جوزی نے ابوحنیدہ براء بن نوفل سے، انہوں نے والان عدوی سے، انہوں نے حضرت حذیفہ سے انہوں نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہم سے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے۔ ثم یخرجون من النار رجلاً، لیسقول له عزو جل هل عملت خیراً قط؟ لیسقول: لا غیر الی قد امرت ولدی إذا مت فاحرق قونی بالنار، ثم اطحنونی حتی اذا کنت مثل الکحل فاذهبوا بی الی البحر فذرونی فی الریح، فواللہ لا یقدر علی رب العلمین ابداً فقال عزو جل لم فعلت ذلک قال عن مخالفتک۔ امام ابو حاتم رازی اور ابن جوزی کہتے ہیں کہ والان مجہول الحال ہے لیکن امام براز کہتے ہیں: ابوحنیدہ اور والان نے ہمارے علم کے مطابق اس حدیث کے علاوہ کسی اور کو روایت نہیں کیا۔ لیکن امام معین اور ابن حبان نے اس کو ثقہ قرار دیا ہے جیسا کہ امام عسقلانی نے ”لسان المیزان“ میں ذکر کیا ہے۔ امام ہشمی کہتے ہیں کہ: اس کے رجال ثقہ ہیں اور اسے کئی حضرات نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کیا ہے جن میں حضرت حذیفہ، حضرت ابوسعود، حضرت ابوہریرہ اور دیگر حضرات رضی اللہ عنہم شامل ہیں۔ حوالہ کے لیے ملاحظہ کریں: مسند الامام احمد ۱/۴۱، مجمع الزوائد للہشمی ۱۰/۳۵۷ (۲۶۶) الترغیب والترہیب للمندری ۳/۲۳۹، العلل المتناہیۃ لابن الجوزی ۲/۴۳۸، ۴/۴۴۰، لسان

بارگاہِ حق میں پیش کیا گیا تو اسے ارشاد ہوا: کس چیز نے تجھے اس کام پر آمادہ کیا تو وہ عرض کرتا ہے: الہی! تجھ سے شرم کرتے ہوئے ایسا کرنے پر آمادہ ہوا تھا۔ تو اسے بخش دیا گیا۔“

اور حقیقت توحید یہ ہے کہ کسی کے ایک ہونے پر یقین کیا اور اس کے بعد ایک ہونے پر یقین اور علم صحیح ہو۔ اور ظاہر ہے کہ جب حق تعالیٰ شانہ اپنی ذات اور صفات میں ایک اور لاثانی ہے اور اپنے افعال میں بے مثل ہے تو وہی ایک ہے۔ موجدوں نے اسے اسی صفت پر جانا ہے اور عقل نے اسی کا نام ”توحید“ رکھا ہے۔

توحید کی تین اقسام ہیں: ایک توحیدِ حق۔ اور یہ وہ توحید ہے جو اللہ کی ذات کے ساتھ مختص ہے۔ اس نے اپنے یگانہ ہونے کی تصدیق کی اور اسے اپنی وحدانیت کا علم ہے۔ دوسری توحید خلق کے لیے، اور وہ حکم باری تعالیٰ ہر بندے کے لیے۔ تو اس پر بندے کے دل میں علمِ توحید اور یقین وحدانیت ہونا لازمی ہے۔ تیسری توحید خلقت کی حق کے لیے اور اس کا وحدانیت حق تعالیٰ کو جاننا، یقین کرنا۔ تو جب بندہ عارفِ حق ہو تو وہ اس کی وحدانیت پر حکم کر سکتا ہے۔

یہاں یہ جاننا ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک ہے اور ایسا ایک ہے اس میں وصل و فصل کی گنجائش نہیں۔ اس پر دوسرا جائز نہیں۔ اس کا ایک ہونا ایسا عدد نہیں کہ جس کے ساتھ دوسرا عدد ہو سکے۔ وہ محدود نہیں کہ اس کے لیے جہتیں ہوں اور وہ بے نہایت حدوں کا خالق ہے اس کے لیے مکان نہیں اور وہ مکان کا محتاج بھی نہیں۔ (۱)

وہ عرض اور جوہر سے منزہ ہے۔ وہ حال نہیں کہ اپنے محل میں موجود ہے۔ جوہر اس لیے نہیں کہ اس کا مثل ہوتا ہے اور حق تعالیٰ کا مثل نہیں۔ طبعی نہیں کہ حرکت و سکون کے لیے میدان کا محتاج ہو۔ روحی نہیں کہ جسم کا محتاج ہو۔ جسم نہیں کہ اجزاء سے مرکب ہو۔ وہ کسی چیز سے مرکب نہیں۔ جمیع نقصانات سے مبرا و منزہ ہے۔ تمام آفات سے پاک اور تمام عیوب سے بلند ہے۔ کوئی اس کا مثل و مانند نہیں۔ لیس کمشلہ شنی۔ اس کا کوئی فرزند نہیں کہ اس کی نسل اصل کے متقاضی ہو۔ اس کی ذات اور صفات میں تغیر و تبدل نہیں۔ لَا ضَدَّ وَلَا نِدَّ وَلَا مِثْلَ لِرَبِّيَ أَلَا نَ كَمَا كَانَ وَلَمْ يَلْقَ زَوَالًا .

اس کی تمام صفات کامل ہیں حتیٰ کہ وہ صفتیں جنہیں مؤمن اور موحد بصارت کے حکم سے ثابت کرتے ہیں، ان سے وہ متصف ہے۔ ملحدین جو جو صفات اس کے سوا بیان کرتے ہیں اور اپنی ناقص رائے سے اختراع کرتے ہیں ان سے مبرا و منزہ ہے۔ زندہ اور جاننے والا ہے، مہربان رحمن و رحیم ہے۔ ارادہ کرنے والا قادر علی الاطلاق ہے۔ سننے والا، دیکھنے والا، کلام کرنے والا ہے۔ باقی،

ازلی وابدی ہے۔ عالم ہے، اس کا علم اس میں حلول نہیں کرتا۔ اس کے کلام میں جزو اور تحدید نہیں۔ وہ اپنی صفات میں قدیم ہے۔ معلومات اس کے علم سے باہر نہیں۔ موجودات کو اس کا ارادہ ضروری ہے۔ وہ کرتا ہے جو اس کے ارادہ میں ہے۔ وہی کرتا ہے جو اسے معلوم ہے۔ اس کے دوستوں کو تسلیم کے سوا اور کوئی سبیل نہیں۔ اس کا امر انجام کے سوا نہیں۔ اس کے بندوں کو اس کا حکم بجالانے کے سوا چارہ نہیں۔ نیکی بدی کا اندازہ اس کے علم میں ہے، اس کے سوا امید و خوف نہیں۔ خالق کل ہے اسی کا حکم ہے۔ اس کے سوا کسی کا حکم حقیقی نہیں۔ اس کا ہر فعل اور ہر حکم سب حکمت ہے۔ اس کی قضا حق ہے۔ کوئی اس تک نہیں پہنچ سکتا۔ اسی کا دیدار خاص بہشتیوں کو روا ہے۔ تشبیہ و صورت سے بالا ہے۔ سامنے اور رو برو ہونا اس کے وجود واجب الوجود میں نہیں۔ دنیا میں اولیاء اللہ کو اس کا جمال دیکھنا جائز ہے اور اس بحث میں اصولی و صولی بہت سی باتیں ہیں۔ بخوف طوالت اسی پر اختصار کیا گیا۔

میں کہ علی، عثمان جلابی کا بیٹا ہوں۔ میں نے اس فصل کی ابتداء میں لکھا ہے کہ کسی چیز کی وحدانیت پر حکم کرنا، وحدانیت توحید ہوتا ہے اور حکم بدون علم کے نہیں ہو سکتا۔ یہ اس لیے کہ اہلسنت نے حکم کیا ہے اس کی یگانگت پر۔ اس لیے کہ انہوں نے اس کی صفت لطیف دیکھی اور افعال عجیب کا معائنہ کیا۔ اس کی صنعت عجیبہ و لطیفہ پر کافی نظر کی اور ان کا خود بخود ہونا محال جانا اور ہر چیز میں حدوث و تغیر کی علامت پائی۔ تو ضرور یہ صحیح سمجھا کہ اس کے لیے فاعل کی ضرورت ہے تاکہ وہ نیست سے ہست کرے۔ یعنی جہان میں زمین، آسمان، سورج، چاند خشکی، تری، پہاڑ، جنگل اور ان کی حرکات و سکنات اور علم و کلام، موت و حیات یہ سب بلا صانع وجود میں آنے ممکن نہیں اور پھر دو تین صانع کا بھی یہ محتاج نہیں بلکہ ایک صانع کامل حتی و قادر، مختار اور شریکوں کی شرکت سے بے نیاز لازمی ہے۔ جب فعل کو ایک فاعل کا ہونا ضروری ہے اس لیے کہ ایک فعل کے دو فاعل اگر ہوں تو ایک دوسرے کا محتاج ضرور ہوگا۔

علم و یقین سے بے شک و شبہ یہی ضروری ہے کہ ایک ہی فاعل ہو مگر اس اعتقاد میں طبقہٴ مہویاں نے ہم سے اختلاف کیا۔ انہوں نے نور و ظلمت ثابت کیا۔ دوسرے گبریاں، کہ انہوں نے یزدان و اہرمن مقرر کر ڈالے۔ تیسرے طبایعان کہ انہوں نے طبیعت و قوت ثابت کر ڈالی اور

۱۔ امام اہلسنت فرماتے ہیں: (مترجم)

وہی لامکاں کے مکین ہوئے، سر عرش تخت نشین ہوئے

یہ نبی ہیں جن کے ہیں یہ مکاں، وہ خدا ہے جس کا مکاں نہیں

چوتھے نجومی کہ انہوں نے سات ستارے تسلیم کر لیے۔ پانچویں معتزلہ نے خالق و صانع بے نہایت مان لیے۔ میں نے سب کے رد میں مختصر سی بات کہہ دی۔ اس لیے کہ یہ کتاب ان کے ان وانی خیال کے رد کرنے کو نہیں ہے۔ یہ مسئلہ اور کتابوں سے دیکھنا چاہئے۔ جہاں میں نے بیان کیا ہے۔ اس کتاب کا نام ”الرَّعَايَةُ بِحَقُوقِ اللَّهِ“ رکھا ہے، یا مقتدین کی اصول کی کتابیں دیکھنا چاہئے۔

اب وہ رموز بیان کرتا ہوں جو مشائخ کرام نے توحید میں لکھے ہیں۔ اِنْ شَاءَ اللَّهُ
وَبَيِّدِ الْأَمْرُ.

فصل:

حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: التَّوْحِيدُ إِفْرَادُ الْقَدَمِ عَنِ الْحَدِيثِ. توحید، قدیم کو جدا کرنا حادث سے ہے۔ یعنی توحید نام ہے قدیم کو محل حادث نہ جانے اور حادث کو محل قدیم نہ سمجھے اور یہ جانے کہ حق قدیم ہے تو محدث اور محدث کی جنس سے کوئی چیز قدیم نہیں ملتی اور اس کی صفات سے کوئی چیز تجھ سے نہیں مل سکتی اس لیے کہ قدیم اور محدث میں کوئی مجانست نہیں۔ اس لیے کہ قدیم حادث سے پہلے ہے تو جب وجود حادث سے قبل قدیم تھا تو وہ حادث کا محتاج نہیں تھا تو بعد وجود حادث بھی اس کا محتاج نہیں ہو سکتا

یہ بات ان لوگوں کے خلاف ہے جو ارواح کو قدیم کہتے ہیں۔ ان کا ذکر ہو چکا اور جب کوئی قدیم کو محدث میں نازل کہے یا محدث کو قدیم سے متعلق جانے تو حق کے قدیم ہونے اور جہان کے حادث ہونے پر دلیل نہیں رہتی اور یہ مذہب دہریہ ہے۔ نَعُوذُ بِاللَّهِ مِنْ إِعْتِقَادِ السُّوءِ غرضیکہ حادثات و حرکات، توحید کے دلائل اور قدرت الہی کے گواہ ہیں اور اس کی قدامتی کو ثابت کرتے ہیں لیکن بندہ اس سے زیادہ عقل مند ہے کہ اس کے سوا اور سے مراد نہیں چاہتا اور اس کے ذکر کے سوا آرام نہیں کرتا جب کہ تیری نیست اور ہست کرنے میں اس کو شرکت کی ضرورت نہیں تو محال ہے کہ تیری پرورش میں اس کا شریک ہو۔

حسین بن منصور رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: اَوَّلُ قَدَمٍ فِي التَّوْحِيدِ فَنَاءٌ فِي التَّفْرِيدِ. ”پہلا قدم توحید میں تفرید کا فنا کرنا ہے۔“ اس لیے کہ تفرید نام ہے کسی آفت سے جدا ہونے پر حکم کرنا، وحدث شے پر حکم کرنا۔ تو جدا کرنے میں غیریت ثابت ہو جاتی ہے اور غیر حق کے لیے نہیں چاہئے کہ اس صفت پر ہو جائے کہ وحدانیت میں غیر کا ثابت روانہ رہے اور غیر حق کو اس صفت میں

نہ جاننا چاہیے۔ تو التفرید مشترک عبارت ہے اور توحید نام ہے شرک کو دور کرنا تو توحید کا پہلا قدم شرکت کی نفی کرنا ہے اور راستہ کے مزاج کا دور کرنا۔ کیونکہ مزاج راستہ میں مثل چراغ ہوتا ہے کہ راستہ اس کے ذریعے دیکھا جائے۔

حضرت حصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: "أَصُولُنَا فِي التَّوْحِيدِ خَمْسَةُ أَشْيَاءَ رَفَعُ الْحَدِيثِ وَ اثْبَاتِ الْقِدَمِ وَ هِجْرَةَ الْأَوْطَانِ وَ مَفَارِقَةَ الْأَخْوَانِ وَ نِسْيَانِ عِلْمٍ وَ جَهْلٍ" "ہمارے اصول توحید میں پانچ چیزیں ہیں: حدیث کا اٹھا دینا، قدم کا ثابت کرنا، وطن کا ترک کرنا، برادری سے علیحدگی اور علم و جہل کو بھول جانا۔" لیکن رفع حدیث نفی محدثات ہے مقارنت توحید و استحالة حوادث سے ذات باری تعالیٰ شانہ میں اور اثبات قدیم یہ ہے کہ عقیدہ رکھے کہ ذات حق ابدی و ازلی ہے۔

اس کی شرح اس سے قبل حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ کے قول میں ہو چکی ہے اور ہجر وطن سے مراد یہ ہے مالوفاتِ نفس اور آرام گاہِ دل اور قرار گاہِ طبیعت سے علیحدہ ہو اور رسومِ دنیا سے مریدوں کو خاص طور پر علیحدہ کرے اور مقاماتِ بنی اور احوال کی خوبی اور کراماتِ رفیع سے مراد کو دور رکھے اور مفارقتِ اخوان سے مراد اعراض کرنا ہے صحبتِ خلق سے اور صحبت قبول کرنا اس لیے کہ اگر اس کے دل میں اندیشہ غیر گزر کرنے لگے تو موحد کے لیے یہ بھی ایک حجاب ہے اور جتنا اس کے دل میں غیر کی صحبت کا اثر ہوگا اتنا ہی وہ توحید میں محبوب ہوگا۔ اس لیے کہ امتِ موحدین کا اتفاق ہے کہ ہمتیں جمع کرنا توحید ہے اور غیر سے آرام لینا تفرقہ، اور علم و جہل سے بے نیاز ہونے کے یہ معنی ہیں کہ علم، یا صفت یا کیفیت یا جنس یا طبع سے ہوتا ہے اور جس چیز کو خلقت کا علم توحید حق سے ثابت کرے، توحید حقیقی اس کی نفی کرتی ہے۔

جو خلقت کی جہالت ثابت کرے وہ ان کے علم کے خلاف ہے اس لیے کہ جہالت توحید نہیں اور تحقیق توحید کا علم نفی تصرف کے سوا درست نہیں ہوتا اور علم وہی ہے جس پر جہل کا اثبات ہو، یہی وجہ ہے کہ جہل توحید نہیں اور علم و جہل میں سوائے تصرف کچھ نہیں۔ ایک بصیرت پر متصرف ہے تو دوسرا غفلت پر۔

ایک مشائخ میں سے فرماتے ہیں کہ میں مجلسِ حصری رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں تھا کہ نیند آ گئی۔ دو فرشتے دیکھے کہ آسمان سے زمین پر آئے اور تھوڑی دیر ان کا کلام سنا۔ ایک دوسرے سے کہنے لگا یہ مرد جو کچھ کہہ رہا ہے وہ علمِ توحید ہے نہ کہ عینِ توحید۔ جب بیدار ہوا تو وہ توحید بیان کر رہا تھا۔ اس نے میری طرف رخ فرما کر کہا کہ اے شخص توحید سے بجز علم کہا نہیں جاتا۔

حضرت جنید رضی اللہ عنہ کا ذکر ہے انہوں نے فرمایا: التَّوْحِيدُ أَنْ يَكُونَ الْعَبْدُ
 شَخْصًا يَنْ يَدِي اللَّهِ تَعَالَى تَجْرِي عَلَيْهِ تَصَارِيفُ تَذْبِيرِهِ فِي مَجَارِي أَحْكَامِ قُدْرَتِهِ لِيُ
 لَجَجَ بِحَارِ تَوْحِيدِهِ بِالْفَنَاءِ عَنْ نَفْسِهِ وَ عَنِ دَعْوَةِ الْخَلْقِ لَهُ وَ عَنِ اسْتِجَابَةِ لَهُمْ بِحَقَائِقِ
 وَجُودِ وَحْدَانِيَّتِهِ فِي حَقِيقَةِ قُرْبِهِ بِدِهَابِ حِسِّهِ وَ حُرُوكَتِهِ لِقِيَامِ الْحَقِّ لَهُ فِيمَا أَرَادَ مِنْهُ
 وَهُوَ أَنْ يَرْجِعَ أَخِرَ عَبْدٍ إِلَى أَوَّلِهِ فَيَكُونُ كَمَا كَانَ قَبْلَ أَنْ تَكُونَ. ”حقیقت توحید یہ ہے
 کہ بندہ مثل ہیکل ہو جریانِ تصرفِ تقدیرِ حق میں اور اس کی قدرت اس پر ایسا تصرف کرے کہ وہ
 اپنے اختیارِ ارادہ سے خالی ہو اور دریائے توحید اسے فناءِ نفسِ خود اور انقطاعِ دعوتِ خلق کر کے ارادہ
 حق پر اپنے کو بے حس کر دے۔ اس مقام پر آجانے کے بعد بندہ کا آخرِ مثلِ اول ہوتا ہے جو اس
 ہستی سے پہلے تھا۔“

اس سے مراد یہ ہے کہ موحد کو اپنے اختیار میں کچھ تصرف نہ رہے اور حق تعالیٰ شانہ کی
 وحدانیت میں ایسا گم ہو جائے کہ اپنے آپ کو بھی نہ دیکھے اور محلِ قربت میں اس کا نفسِ فانی ہو
 جائے اور اس کی حس جاتی رہے اور احکامِ حق اس پر جاری ہوں اور ایسا ہو جائے جیسا ازل
 میں بحالتِ توحید تھا کہ کہنے والا بھی حق تھا اور جواب دینے والا بھی حق تھا اور جو ایسا ہو خلقت کو اس
 سے آرام نہیں ہوتا اور اسے کسی شے سے انس نہیں ہوتا کہ ان کی دعوت قبول کرے اور اس بات میں
 اشارہ فناءِ صفت اور صحتِ سلیم سے ہے۔

جبکہ کشفِ جلالت بحالتِ قہر ہو کہ بندہ اپنے اوصاف سے فنا ہو جائے تو آلہ اور جوہر
 لطیف ہو جاتا ہے۔ حتیٰ کہ اگر جگر میں خنجر لگے تو یہ حالت بے حسی گذر جائے اور پشت پر لگے تو بے
 اختیار کٹ جائے اور ہر حال میں سب سے فناء ہو اور اس کا وجود مظہر اسرارِ حق ہو، تا کہ اس کا کلام
 حق کے حوالے ہو اور اس کا ہر فعل اس کی طرف منتسب ہو اور حجت ثابت کرنے کے لیے حکم
 شریعت اس پر باقی ہو اور وہ کل کے معائنہ سے فناء ہو۔

یہ صفت حضور ﷺ کی تھی کہ معراج کی شب جب آپ کو مقامِ قرب میں پہنچایا تو
 مقام کا فاصلہ تھا مگر قرب میں فاصلہ نہ تھا۔ آپ کا حال عوام کے فہم سے بالا ہے اور اوہام سے جدا۔
 اس حد تک دنیا نے اسے گم کیا، وہ آپ سے گم ہوا اور صفت بے صفت کی فناء میں حیران۔ طبیعت کی
 ترتیب اور اعتدالِ مزاج پریشان ہوا، نفسِ دل کے مقام پر پہنچا اور دل جان کے درجہ تک اور جان سر
 کے مقام پر اور سر قرب کی صفت میں اور سب میں سب سے جدا ہوا۔ چاہا کہ وجود خراب ہو جائے
 اور جسم کو چھوڑے، اس سے مراد حجت قائم کرنا تھا۔ حکم ہوا کہ بحال ہو، تا کہ قوت پائے اور وہ قوت

اس کی قوت ہو اور اس کی ہستی سے ذات ظاہر ہو۔ چنانچہ فرمایا: اِنِّي لَسْتُ كَمَا حَدِّثُكُمْ اِنِّي اَبِيْتُ
عِنْدَ رَبِّي فَيُطْعِمُنِي وَيَسْقِينِي (۱) ”میں تم جیسا نہیں، میں اپنے رب کے پاس شبِ باش ہوتا
ہوں، وہ مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے (جس سے میں زندہ اور قائم ہوں)“ اور یہ بھی فرمایا: لِسِيَ مَعَ اللّٰهِ
وَقْتُ لَا يَسْعُنِي فِيهِ مَلَكٌ مُّقْرَبٌ وَلَا نَبِيٌّ مُّرْسَلٌ۔ ”میرے لیے اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایک
وقت خاص ہے جس میں ملکِ مقرب اور نبی مرسل بھی وسعت نہیں پاتا۔“

حضرت سہل بن عبد اللہ تستری رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ فرمایا: ذَاتُ اللّٰهِ
مَوْصُوفَةٌ بِالْعِلْمِ غَيْرُ مُدْرَكَةٍ بِالْاِحَاطَةِ وَلَا مَرْتَبَةٌ بِالْاَبْصَارِ فِي دَارِ الدُّنْيَا وَهِيَ
مَوْجُودَةٌ بِحَقَائِقِ الْاِيْمَانِ مِنْ غَيْرِ حُدٍّ وَلَا اِحْلُوْلٍ وَتَرَاهُ الْعِيُوْنُ فِي الْعُقْبَى ظَاهِرًا وَ
بَاطِنًا فِي مُلْكِهِ وَقُدْرَتِهِ وَقَدْ حُجِبَ الْخَلْقُ عَنْ مَعْرِفَةِ كُنْهِ ذَاتِهِ وَ دَلَّهْمُ عَلَيْهِ بِاَيَاتِهِ
وَالْقُلُوْبُ تَعْرِفُهُ وَالْعُقُوْلُ لَا تُدْرِكُهُ يَنْظُرُ اِلَيْهِ الْمُؤْمِنُوْنَ بِالْاَبْصَارِ مِنْ غَيْرِ اِحَاطَةٍ
وَلَا اِدْرَاكٍ نِهَآيَةٍ ”نہایت توحید یہ ہے کہ بندہ جان لے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات موصوف بہ علم
ہے۔ وہ نہ حس میں آتا ہے، نہ دیکھنے میں، نہ دنیا میں آنکھ سے دیکھ سکتی ہے اور ایمان میں وہ
موجود ہے اس کی حد و نہایت نہیں اور بغیر کسی آنے جانے کے اسے دریافت کیا اور وہ ظاہر ہے
اپنے ملک میں اپنی صفتوں سے اور اپنی قدرت سے اور سب کنہ ذات کی معرفت سے محبوب
ہیں۔ اس نے اظہارِ عجائب و آیات سے راہ دکھائی ہے اور وہ لوگوں کو جانتا ہے اور بیگانگی و عقل اس
کا ادراک نہیں کر سکتے اور مومنین پچشمِ سرعقبی میں اسے دیکھیں گے۔“ اور یہ لفظ جامع ہے توحید کو۔

اور حضرت جنید رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اَشْرَفُ كَلِمَةٍ فِي التَّوْحِيدِ قَوْلُ اَبِي بَكْرٍ
رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ : سُبْحَانَ مَنْ لَّمْ يَجْعَلْ لِخَلْقِهِ سَبِيْلًا اِلَى مَعْرِفَتِهِ اِلَّا بِالْعَجْزِ عَنْ مَعْرِفَتِهِ۔
”بہترین کلمہ توحید میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کا کلمہ ہے۔ پاک ہے وہ جو اپنی مخلوق کو اپنی معرفت
میں۔ راہ نہیں دیتا بجز اس کے کہ عاجز ہو اس کی معرفت میں۔“ اور علماء اس کلمہ میں غلطان ہیں اور

۱۔ امام بخاری نے اپنی صحیح ۱۱۸/۳، ۱۲۳، ۱۳۴ میں ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے :
نہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عن الوصال ، فقال رجل من المسلمين : فانك يا
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تواصل ؟ فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم :
وايكم مثلي ، اني ابیت يطعمني ربي و يسقيني . حوالہ کے لیے دیکھیں : مسند الامام احمد
(۲۱/۲، ۲۳، ۱۰۲، ۲۳۱) الجامع الصغير ۱/۱۵ الموطا للامام مالک ۲/۱۳۰ سنن
الدارمی ۱/۳۰۲، جامع الترمذی ۱/۱۶۳، سنن ابی داؤد ۲/۲۷۹ صحیح مسلم ۳/۱۳۲
(کتاب الصیام)

سمجھتے ہیں کہ معرفت سے عجز بے معرفتی ہے اور یہ محال ہے اس لیے کہ عجز اپنی حالت میں ایک صورت رکھتا ہے اور بحالت معدوم عجز کی کوئی صورت نہیں۔ جیسے مردہ حیات سے عاجز نہیں اس لیے کہ موت میں موت سے عاجز ہوتا ہے اس لیے عجز کا نام اس کی قوت کو محال کر دینا اور اندھا بصارت سے عاجز نہیں ہوتا۔ بلکہ بیٹھنے میں کھڑا ہونے سے عاجز ہوتا ہے جیسا کہ عارف معرفت سے عاجز نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ معرفت موجود ہوتی ہے اور جب اسے ضرورت ہوتی ہے۔

چنانچہ ہم قول صدیق اکبر رضی اللہ عنہ پر کہ ابو سہل تضرعوا کی اور ابو علی دقاق نے کہا کہ معرفت ابتداء میں کسی ہوتی ہے اور انتہا میں ضروری۔ اور علم ضروری ہوتا ہے کہ اس علم کا عالم اس کے ہوتے ہوئے اس کے دور کرنے اور کشش سے بے قرار اور عاجز ہو۔ تو مطابق اس قول کے، توحید بندہ کے دل میں فعل حق ہوتا ہے۔ پھر حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: التَّوْحِيدُ حِجَابٌ الْمُوَحِّدِ عَنْ جَمَالِ أَحَدِيَّتِهِ ”یعنی توحید موحد کے لیے جمال احدیت سے حجاب ہوتا ہے۔“ اس لیے کہ توحید کو بندہ کا فعل کہتے ہیں اور بندہ کشف حق کی علامتیں ہوتا اور عین کشف میں جو چیز کشف کی علت نہ ہو وہ حجاب ہے اور بندہ مع اپنے کل اوصاف کے غیر ہوتا ہے اس لیے کہ جب اپنی صفت کو حق سمجھے تو ضرور موصوف صفت کو بھی کہنا پڑے گا اور وہ بندہ ہے۔

پھر موحد اور توحید اور احد، تینوں ایک دوسرے کے وجود کی علت ہوتے ہیں اور یہ بقیہ ثالث ثلاثہ نصاریٰ کا ہوتا ہے اور جو صفت کہ طالب کو توحید میں اپنی فنا سے مانع ہے، ابھی اس صفت میں محبوب ہے اور جب تک محبوب ہے موحد نہیں لَانْ مَا سِوَاهُ مِنَ الْمَوْجُودَاتِ بَاطِلٌ۔ اس لیے ما سوا موجودات جو کچھ بھی ہے وہ باطل ہے۔ اس لیے ثابت ہوا کہ بدون حق جو کچھ بھی ہے سب باطل ہے اور طالب بھی اس کا غیر ہے اور تفسیر لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ یہ ہے کہ صفت طالب کشف جمال حق میں باطل ہو جائے۔

ایک حکایت مشہور ہے کہ حضرت ابراہیم خواص حضرت حسین بن منصور رضی اللہ عنہ کی زیارت کے لیے کوفہ حاضر ہوئے تو حسین بن منصور نے فرمایا: ابراہیم! تو نے اپنی عمر کس بات میں بسر کی۔ آپ نے جواب دیا میں نے اپنے کو توکل میں درست کیا ہے۔ حسین بن منصور نے فرمایا: يَا اِبْرَاهِيمُ ضَيِّعَتْ عُمْرُكَ فِي عِمْرَانِ بَاطِلِكَ فَآيِنَ أَنْتَ مِنَ الْفَنَاءِ فِي التَّوْحِيدِ۔ ”ابراہیم! تو نے اپنی عمر ضائع کر دی، تو نے اپنی عمر آبادانی باطن میں خرچ کر ڈالی تو اب تیری فنا توحید میں کہاں۔“

توحید میں مشائخ کے بہت سے اقوال ہیں۔ ایک گروہ نے اس کو بقا کہا ہے۔ اس لیے کہ

بقاء صفت کے سوا توحید درست نہیں ہوتی۔ ایک گروہ نے کہا کہ فنا کے سوا توحید کی صفت حاصل نہیں ہوتی اور اس کا قیاس جمع اور تفرقہ کرنا چاہئے تاکہ معلوم ہو جائے۔

اور میں علی بن عثمان جلابی (رضی اللہ عنہ) کہتا ہوں کہ توحید حق سے بندہ کو اسرار حاصل ہوتے ہیں اور عبارت میں ظاہر نہیں ہوتے۔ اب چاہیے کہ کوئی اس کو بیہودہ عبارت سے آراستہ نہ کرے اس لیے کہ عبارت اور معنی میں بے حد فرق ہے۔ اور توحید میں غیر کا ثابت کرنا شرکت ہوتا ہے اس وقت وہ ہویدہ ہوتی ہے اور موحد الہی ہوتا ہے نہ کہ ایک لاہی۔ یہ ہے توحید کا حکم اور مسلک ارباب معرفت یہاں پر سبیل اختصار بیان کیے گئے۔ واللہ اعلم

کشف حجاب سوم: ایمان

جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا آمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ﴾ (۱) اور دوسرے چند مقامات پر بھی فرمایا: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا﴾ اور حضور ﷺ نے فرمایا: الْإِيمَانُ أَنْ تُؤْمِنَ بِاللَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَكُتُبِهِ (۲) اور ایمان لغت میں تصدیق کو کہتے ہیں، اور اس بحث پر مردان الہی کے بہت اقوال ہیں اور شرعی احکام یہی کافی ہیں اور اختلاف کرنے والے معتزلہ اور خوارج بھی بہت سے ہیں۔

چنانچہ معتزلہ تو کہتے ہیں کہ علمی عملی اطاعت پر ایمان ہے اور گناہ کرنے سے بندہ خارج از ایمان ہو جاتا ہے۔ ایسے ہی خارجی ہیں کہ بندہ کو گناہ کے سبب کافر مانتے ہیں۔ ایک گروہ ایمان کو قول فرد کہتا ہے۔ ایک گروہ معرفت کو ایمان کہتا ہے اور متکلمین کا ایک گروہ مطلق تصدیق کو ایمان کہتا ہے اور میں نے اس بیان میں علیحدہ کتاب تصنیف کی ہے۔ یہاں تو متصوفہ مشائخ کرام کا اعتقاد بیان کرنا مقصود ہے۔ صوفیوں میں دو قسم ہیں: جیسے فقہاء میں دو فریق ہیں :-

ایک کہتا ہے اِقْرَارٌ بِاللِّسَانِ تَصْدِيقٌ بِالْجَنَانِ اور عَمَلٌ بِالْأَرْكَانِ کا نام ایمان ہے۔ جیسے فضیل بن عیاض، بشر حافی، خیر النساج، سمون الحب، ابو حمزہ بغدادی، محمد حریری اور مثل ان کی، کافی لوگ ہیں۔ رضوان اللہ علیہم اجمعین۔

ایک گروہ کہتا ہے ایمان نام ہے اقرار باللسان اور تصدیق بالجنان کا۔ جیسے ابراہیم بن اوسم، ذوالنون مصری، بایزید بسطامی، ابوسلیمان دارانی، حارث محاسبی، جنید بغدادی، اہل بن عبد اللہ تسری، شفیق بلخی اور سوا ان کے رحمہم اللہ علیہم۔ اور ایک جماعت فقہاء امت کی ہے جیسے امام مالک،

۱۔ سورۃ النساء: ۱۳۶

۲۔ یہ امام مسلم کی صحیح (۸) میں روایت کردہ طویل حدیث کا ایک جز ہے۔

امام شافعی، احمد احمد بن حنبل رحمہم اللہ اور ان کے سوا ایک جماعت اسی پہلے قول پر ہے۔ پھر امام ابو حنیفہ، حسن بن فضل بلخی اور امام صاحب کے اصحاب جیسے محمد بن حسن داؤد طائمی، امام ابو یوسف رحمہم اللہ علیہم اجمعین اس پہلے قول پر ہیں اور حقیقت میں یہ اختلاف عبارت ہے معنی میں نہیں۔

میں اس کا مختصر بیان کرتا ہوں تاکہ معلوم ہو جائے کہ اس اختلاف میں کسی کو ایمان میں مخالف الاصل نہیں کہنا چاہئے۔ وَ بِاللّٰهِ التَّوْفِیْقُ .

فصل:

اہلسنت و جماعت میں اس امر کا اتفاق ہے کہ ایمان کے لیے اصل اور فرع ہے۔ ایمان کی اصل تصدیق بالقلب ہے اور اس کی فرع یہ ہے کہ مراعات اور امر و نواہی کی جائے اور عرف و عادت میں ہے کہ ایک چیز کی فرع کو بصورت استعارہ اصل کے نام سے بولتے ہیں۔ جیسے آفتاب کے نور کو عام طور پر آفتاب ہی کہتے ہیں۔ اس معنی میں اطاعت کو ایمان کہا گیا اور اس ذات کے فضل سے بندہ بغیر عمل، عذاب سے بے غم نہیں ہو سکتا اور صرف تصدیق مقتضی امن نہیں جب تک حکم بجا نہ لائے۔ تو جس کی اطاعت زیادہ ہوگی اسے عذاب سے بھی زیادہ امن ہوگی۔ چونکہ اطاعت علت امن ہے اور اس میں شرط اقرار باللسان اور تصدیق بالقلب ہے، اسی کو ایمان کہتے ہیں۔

پھر ایک گروہ نے کہا ہے کہ امن کی علت معرفت ہے نہ کہ اطاعت۔ اگرچہ اطاعت ہو اور معرفت نہ ہو تو اطاعت سے فائدہ نہیں۔ لیکن اگر معرفت ہو اور اطاعت نہ ہو تو نجات ہو سکتی ہے، اگر اس کا حکم ارادہ الہی میں ہوتا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ اپنے فضل خاص سے معاف فرمائے گا یا حضور شفیع المذنبین ﷺ کی شفاعت سے بخش دے گا یا اس کے گناہ کے اندازہ پر اسے عذاب کرے گا۔ پھر دوزخ سے نکال کر بہشت عطا فرمائے گا۔ تو ارباب معرفت اگرچہ گناہ گار ہوں، بہ سبب معرفت ہمیشہ دوزخ میں نہ رہیں گے اور اگر معرفت نہ ہو اور عمل ہی عمل ہو اس سے وہ داخل جنت نہ ہوں گے۔

تو اس سے ثابت ہوا کہ اطاعت علت امن نہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا: لَنْ يَنْجُوَ أَحَدُكُمْ بِعَمَلِهِ قَبْلَ وَلَا أَنْتَ يَا رَسُولَ اللَّهِ قَالَ وَلَا أَنَا إِلَّا أَنْ يَتَغَمَّدَنِي اللَّهُ بِرَحْمَتِهِ.

”تم میں سے کوئی عمل کے سبب نجات نہ پائے گا۔ لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! آپ بھی؟ فرمایا: میں بھی رہائی نہ پاؤں گا مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت میں مجھے ڈھانپ لے۔“

تو بطریق تحقیق بلا اختلاف امت ایمان معرفت ہے اور اقرار پذیرائی عمل ہے، جو شخص حق تعالیٰ کو پہچانے گا بہر حال کسی وصف سے پہچانے گا۔ اور اوصاف کی تین اقسام ہیں۔ بعض تو جمال سے تعلق رکھتے ہیں اور بعض جلال سے اور بعض کمال سے، اور خلقت کو اس کے کمال کی طرف راہ نہیں سوا اس سے کہ اسے کمال سے ثابت کریں اور نقص اس سے دور کریں۔ باقی رہا جمال اور جلال۔ یہ اس کے لیے ہے جس کا معشوق جمال حق ہو۔ معرفت جمال میں طالب ہمہ اوست کا مشتاق رہتا ہے اور جو عاشق جلال حق ہو وہ ہمیشہ اپنے اوصاف سے متنفر رہتا ہے اور اس کا دل مقام حیرت میں ہوتا ہے۔ تو شوق تاثیر محبت کا نام ہے اور ایسا ہے اوصاف بشریت سے متنفر ہوتا ہے اس لیے کہ کشف حجاب اور صفت بشریت عین محبت کے سوا نہیں، تو ایمان اور معرفت محبت ہے اور محبت کی علامت اطاعت ہے۔

اس لیے کہ جب دل دوستی کا مقام ہو اور آنکھیں دیکھنے کا مقام ہوں اور جائے عبرت اور دل جائے مشاہدہ تو تن تارک امر نہ ہونا چاہئے اور جو اس کے سوا کچھ اور کہے وہ تارک امر ہے اور معرفت سے بے خبر۔ اس زمانہ میں یہ فساد صوفیوں کے مابین عام ہے۔ ملحدوں کے ایک گروہ نے ان کا جمال دیکھا اور اس کا مرتبہ معلوم کیا تو خود بھی ان کی صورت اختیار کی اور کہا کہ یہ اس وقت تک رائج ہے کہ تو نے نہیں پہچانا اور جب تو نے جان لیا تو تکلیف طاعت تن سے اٹھ گئی۔ لیکن یہ غلط ہے۔

میں کہتا ہوں کہ جب تو نے حق تعالیٰ کو پہچانا تو دل جائے شوق ہو اور حکم کی عظمت زیادہ ہوئی اور یہ تسلیم کرتے ہیں کہ مطیع اس درجہ کو پہنچ جائے کہ طاعت کا رنج اس سے اٹھالیں اور طاعت گزاری کی اسے زیادہ توفیق ہو، تا کہ جو طاعت خلقت تکلیف جان کر کرتی ہے وہ تکلیف اسے نخوس نہ ہو اور یہ بات تب حاصل ہوتی ہے جب شوق طاعت بے چین کرنے والا پیدا ہو جائے۔ پھر ایک گروہ کی طرف سے یہ اختلاف عام ہے، خاص کر ماوراء النہر میں۔ وہ کہتے ہیں جو کچھ ذات حق کے متعلق کہتے ہیں وہ محض جبر ہے اس لیے بندہ اس میں مضطر چاہئے اور جو اپنے سے کہتے ہیں وہ سب محض قدر ہے۔ کیونکہ جب تک اللہ تعالیٰ معلوم نہ کرے بندہ اسے جان نہیں سکتا اور طریقہ توحید جبر سے کم اور قدر سے زیادہ ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ بندہ کا فعل بہ ہدایت حق ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿مَنْ يُرِدِ اللَّهُ أَنْ يَهْدِيَهُ يَشْرَحْ صَدْرَهُ لِلْإِسْلَامِ وَمَنْ يُرِدْ أَنْ يُضِلَّهُ يَجْعَلْ صَدْرَهُ ضَيِّقًا حَرَجًا﴾ (۱) ”یعنی جس کو اللہ ہدایت کرنا چاہتا ہے اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے اور جسے گمراہ رکھنا چاہتا ہے اس کا سینہ احساس تکلیف سے تنگ کر دیتا

ہے۔“ اس آیہ کریمہ کے ماتحت یہ ثابت ہوتا ہے کہ گردشِ ہدایتِ حق ہو اور ہونا بندہ کا فعل ہو تو ہونے کی علامتِ دل پر اعتقادِ توحید کا ہونا ہے اور آنکھوں پر منہیات سے بچنا اور علامت و نشان سے عبرت پانا اور کانوں پر اس کا کلام سننا، معدہ پر اس کے حرام سے خالی رہنا اور زبان پر سچ بولنا اور جسم پر منہیات سے پرہیز کرنا تاکہ معنی اور دعویٰ موافق ہو جائے۔

اس سبب سے اس گروہ نے معرفتِ ایمان میں کمی بیشی رکھی ہے اور سب کا اس پر اتفاق ہے کہ معرفتِ ایمان میں کمی بیشی جائز نہیں کیونکہ اگر معرفت میں زیادتی اور نقصان ہوتا تو معرفت بھی کم زیادہ ہوتی۔ جب معارف پر زیادتی اور نقصان روا نہیں تو معرفت پر بھی کمی زیادتی روا نہیں۔ کیونکہ معرفت ناقص نہیں ہوتی۔ تو لازم آیا کہ فرع اور عمل میں زیادتی اور نقصان نہ ہو اور اطاعت پر بالاتفاق زیادتی اور نقصان روا ہے، اور حشو یوں کو دو فریق جو کہتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا ایک گروہ طاعت کو ایمان کہتا ہے۔ دوسرا گروہ ایمان کو صرف قول کہتا ہے۔

غرضیکہ حقیقت میں بندہ کے کل اوصافِ حق تعالیٰ کی طلب میں مستغرق ہوں اور ہر ایمان والے کو اس پر اتفاق کرنا چاہئے۔ اس لیے کہ سلطانِ معرفت کا غالبہ منکرِ اوصاف کو مغلوب کر دیتا ہے اور جہاں ایمان ہو وہاں اسبابِ انکار دور ہو جاتے ہیں۔ جیسا کہ کہا گیا: **اِذَا طَلَعَ الصَّبَاخُ عَطَلَ الْمِصْبَاخُ**. ”جب دن نکل آتا ہے تو چراغِ معطل ہو جاتا ہے۔“

کسی عارف نے فرمایا کہ روشن دن کے واسطے دلیل کی حاجت نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: **وَإِنَّ الْمُلُوكَ إِذَا دَخَلُوا قَرْيَةً أَفْسَدُوهَا** (۲) ”جب بادشاہ کسی بستی میں داخل ہوئے اسے تباہ کر دیتے ہیں۔“

چنانچہ جب حقیقتِ معرفتِ عارف کے دل پر گزرے تو پھر ظن اور شک اور انکار دفع ہو جاتا ہے اور شہنشاہِ معرفت اس ہوئی و ہوس کو اپنی تسخیر میں لاتا ہے تاکہ جو کچھ کہے یا دیکھے یا کرے سب دائرہٴ امر میں ہو۔ میں نے سنا ہے کہ لوگوں نے حضرت ابراہیم خواصؑ سے پوچھا کہ حقیقتِ ایمان کیا ہے؟ آپؑ نے فرمایا کہ اس وقت میں اس کا جواب نہیں رکھتا، اس لیے کہ جو کچھ میں کہوں صرف کہنا ہی ہوگا اور مجھے چاہیے کہ معاملہ سے جواب دوں لیکن میں مکہ شریف کو جانے والا ہوں، تو بھی اس ارادہ سے اس راستے پر میرے ساتھ چل تاکہ تو اپنے مسئلہ کا جواب پائے۔

انہی کا بیان ہے کہ میں نے ایسا ہی کیا۔ جب میں اس کے ساتھ جنگل پہنچا۔ ہر روز دو روٹی اور دو پیالہ پانی غیب سے آتے۔ وہ ایک میرے آگے رکھتے، ایک خود اٹھا لیتے۔ حتیٰ کہ ایک

روز جنگل میں ایک ضعیف العمر آ رہا تھا۔ اس نے جب ابراہیم خواصؑ کو دیکھا، گھوڑے سے اتر اور سلام کے بعد کچھ دیر آپس میں اس سے گفتگو ہوئی۔ پھر وہ بوڑھا گھوڑے پر سوار ہو کر چل دیا۔ میں نے عرض کی اے شیخ! یہ بوڑھا کون تھا؟ آپ نے فرمایا، وہ تیرے سوال کا جواب تھا۔ میں نے عرض کی، یہ کس طرح؟ فرمایا: وہ حضرت خضر علیہ السلام تھے۔ انہوں نے میری مصاحبت چاہی، میں نے منظور نہ کی۔ میں نے عرض کی حضور کیوں منظور نہیں کی۔ آپ نے فرمایا میں اس بات سے ڈرا کہ اس کی مصاحبت غیر اللہ پر بھروسہ ہے، اس سے کہیں میرا توکل تباہ نہ ہو جائے اور حقیقتِ ایمان توکل کی حفاظت ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿وَعَلَى اللَّهِ فَتَوَكَّلُوا إِن كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ﴾ (۱) ”اور اللہ پر بھروسہ کرو اگر تم ایمان والے ہو۔“

اور حضرت محمد بن حنفیہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: اَلْاِيْمَانُ تَصْدِيقُ الْقَلْبِ بِمَا عَلِمَ بِهِ الْغُيُوبُ۔ ”یعنی ایمان یہ ہے کہ جو کچھ اس پر غیب سے مکاشفہ ہو اس پر یقین رکھے۔“ اس لیے کہ ایمان غیب پر ہے کہ خداوند تعالیٰ سر کی آنکھوں سے نظر نہیں آتا۔ اور جب تک معنی میں قوت نہ ہو بندہ کا یقین ظاہر نہیں ہوتا اور وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے۔ جب شناخت کرنے والا اور معلوم کرنے والا عارف اور عالم کا اللہ تعالیٰ ہے جس نے ان کے دلوں میں معرفتِ علم پیدا کی تو علم اور معرفت ان کے کسب کے قبضہ میں نہیں رہی۔ تو جو شخص اپنے دل کو اللہ تعالیٰ کی معرفت یقین دیتا ہے وہ مومن و اصل باللہ ہوتا ہے۔ میں نے اس بحث پر اور جگہ بہت کچھ بیان کیا ہے۔ یہاں اس پر اکتفا کرتا ہوں تاکہ کتاب طویل نہ ہو اور اہل بصیرت کے لیے اس قدر کافی ہے۔ اب میں اسرارِ معاملات بیان کرتا ہوں، اس کے پردے کھولتا ہوں۔ اِنَّ ذٰلِكَ اللّٰهُ الْعَزِيزُ۔

کشف حجاب چہارم: طہارت

ایمان کے بعد بندہ پر خصوصی فرض یہ ہے کہ نماز ادا کرنے کو طہارت حاصل کرے اور وہ بدن کو نجاست اور جنابت سے پاک کرتا ہے۔ بموجب حکمِ شریعت تین عضووں کا دھونا سر کا مسح کرنا ہے۔ اور پانی نہ ہونے یا ایسی بیماری جو پانی سے بڑھ جائے اس کے بجائے تیمم کرنا اور اس کے احکام سب کو معلوم ہیں۔

یہاں یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ طہارت دو قسم کی ہے: ایک طہارتِ باطن، دوسری طہارتِ ظاہری۔ بدون طہارتِ ظاہر نماز درست نہیں۔ ایسی بدون طہارتِ باطن جس کا تعلق دل پاک کرنے سے ہے، معرفت درست نہیں ہوتی۔ بدن کی طہارت کے لیے پانی ظاہر و مطہر ہونا

چاہئے۔ مستعمل اور مقید پانی نہ ہو۔ دل کی طہارت کے لیے آبِ توحید کی ضرورت ہے جس میں اعتقاد مذہب اور مشکوک نہ ہو۔

چنانچہ صوفیا کرام ہمیشہ طہارتِ ظاہری کے پابند رہتے ہیں اور اپنا باطن توحید سے مملو رکھتے ہیں۔

حضور ﷺ نے اپنے ایک صحابی کو فرمایا: دُمُّ عَلَى الْوُضُوءِ يُجِبُّكَ حَافِظُكَ .
 ”ہمیشہ با وضو رہنا تیرا محافظ تجھے محبوب رکھے گا“ اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِينَ﴾ (۱) ”اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں اور پاک رہنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔“

تو جو ہمیشہ با طہارت رہے، فرشتے اس سے محبت کرتے ہیں اور جو باطن کو توحید پر قائم رکھے، اللہ اسے محبوب رکھتا ہے۔ حضور ﷺ ہمیشہ اپنی دعا میں فرماتے تھے: اَللّٰهُمَّ طَهِّرْ قَلْبِيْ مِنْ النِّفَاقِ . (۲) ”الہی میرا دل نفاق سے پاک رکھ۔“ حالانکہ حضور ﷺ کے دل میں کسی حالت میں بھی نفاق نہیں تھا۔ لیکن اپنی کرامت کا دکھانا اثباتِ غیر نفاق لاتا ہے اور یہ مقام توحید نہیں ایک نفاق ہے۔ ہر چند کہ ذرہ بھر کرامت مشائخ سے سرمہ دیدہ مریدان ہوتا ہے آخرش وہ محل کمال ہیں اس بلند مرتبہ حجاب پر ہوتا ہے اس لیے کہ جو غیر ہو اس کی رویت آفت ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔ نِفَاقُ الْعَارِفِيْنَ اَفْضَلُ مِنْ اِخْلَاصِ الْمُرِيْدِيْنَ . ”یعنی خدا رسیدہ عارفوں کا نفاق، اخلاصِ مریدان سے بہتر ہے۔“ یعنی وہ مقام جو مرید کا ہے، کامل کے لیے حجاب ہے۔ مرید کی توجہ اس پر ہوتی ہے کہ وہ کرامت کو پائے اور عارفِ کامل کی توجہ اس پر ہوتی ہے کہ وہ کرامت دینے والے کو پائے۔ غرضیکہ کرامت کا ظاہر کرنا اہل حق کے لیے نفاق ہے۔ اس واسطے کہ وہ غیر کا دیکھنا ہے۔ ایسے ہی جسے خاصانِ حق آفت جانتے ہیں اس میں عام سیہ کار اپنی نجات سمجھتے ہیں، اس لیے کہ آفت جو عارف اپنے لیے جانے، وہ گمراہی سے نجات ہوتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اگر کافر یہ سمجھ لیں کہ ہمارے گناہ اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں جیسے سیہ کار اپنی سیہ کاری کو برا سمجھتا ہے تو سب کفر سے نجات پاتے اور اگر گنہگار یہ جانتے کہ ہمارے تمام اعمال محلِ علت ہیں تو سب گناہ سے نجات پا جاتے اور تمام آفتوں سے پاک ہو جاتے۔ تو چاہیے کہ ظاہری طہارت باطنی طہارت کے موافق ہو یعنی:

ہاتھ دھوئیں تو اس کے ساتھ ہی دل کو دنیا کی محبت سے پاک کر لے۔

۱۔ سورۃ البقرۃ: ۲۲۲

۲۔ اسے علی متقی ہندی نے کنز العمال ۱۸۳/۲ (حدیث نمبر ۳۶۶۰) میں خطیب نے تاریخ بغداد ۱۵/۲۶۷ میں

اور امام زبیدی نے التحاف السادة المتقين ۵۱۳/۷ میں ذکر کیا ہے۔

جب استنجا کریں تو جس طرح نجاست ظاہر سے پاکی حاصل کی ویسے ہی باطن کو غیر کی دوستی سے پاک کر لے۔

جب ناک میں پانی ڈالے تو خواہشات کو بھی اپنے اوپر حرام کرے۔
جب منہ دھوئے تو ساتھ ہی تمام خواہشات نفسانی کی چیزوں سے منہ پھیر لے اور حق کی

طرف متوجہ ہو۔

جب کہنیوں تک ہاتھ صاف کرے تو اپنے تمام نصیبوں سے علیحدہ ہو جائے۔

جب سر کا مسح کرے تو اپنے تمام کام اللہ تعالیٰ کے حوالے کر دے۔

جب پاؤں دھوئے تو تمام مناہی راہ چلنے سے باز رہنے کی نیت کرے۔

اس طرح اسے ہر دو طہارتیں حاصل ہوں گی اس لیے کہ امور شرعی باطن کے ساتھ ملے

ہوئے ہیں۔ جیسے اقرار باللسان، تصدیق قلب سے ہی ہوا ہے اور نیت، دل سے اور طاعت

بموجب شریعت تن سے ہوتی ہے۔

چنانچہ دل کی طہارت کا طریقہ یہی ہے کہ آفات دنیا میں تدبر و تفکر کر کے اس بات کے

اوپر غور کرے کہ دنیا بے وفا ہے اور یہ جگہ خالص فنا ہے اس سے دل خالی کر کے یک سو ہو۔ مگر یہ کافی

مجاہدہ کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا اور مجاہدہ میں اہم کام آداب ظاہری کی حفاظت ہے اور ہر حال میں

اس کا التزام۔

حضرت ابراہیم خواص رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر ہے کہ انہوں نے فرمایا: میں اللہ تعالیٰ سے دنیا

میں ابدی عمر چاہتا ہوں تاکہ تمام دنیا نعمتوں میں مشغول ہو کر جب حق تعالیٰ کو بھلائے تو میں آداب

شریعت کی حفاظت کروں اور یاد حق میں رہوں۔

کہتے ہیں کہ ابو طاہر خرمی رحمۃ اللہ علیہ چالیس سال مکہ معظمہ میں رہے۔ مگر آپ نے ارض

حرم میں طہارت نہ کی۔ جب آپ کو حاجت ہوتی حد و حرم سے باہر جاتے اور فرماتے جس زمین کو

اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب فرمایا میں اس پر مستعمل پانی ڈالنا مکروہ سمجھتا ہوں۔

اور حضرت ابراہیم خواص رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ آپ ”رے“ کی جامع مسجد میں

مرض اسہال سے بیمار ہوئے تو آپ رات دن میں ساٹھ بار غسل فرماتے۔ آخر اسی میں رحلت

فرما گئے۔

اور حضرت ابو علی رودباری رحمۃ اللہ معاملہ عبادت میں وسواس و توہم کے مریض تھے۔

آپ فرماتے ہیں کہ میں صبح دریا میں گیا اور طلوع آفتاب تک اسی میں رہا۔ اس پر میں آزر وہ دل ہوا

اور بارگاہِ الہی میں عرض کرنے لگا: اَللّٰهُ الْعَالَمِيْنَ الْعَافِيَهُ الْعَافِيَهُ. ہاتھ غیبی نے دریا سے جواب دیا: الْعَافِيَةُ فِي الْعِلْمِ. ”ابوعلی! عافیت علم میں ہے۔“

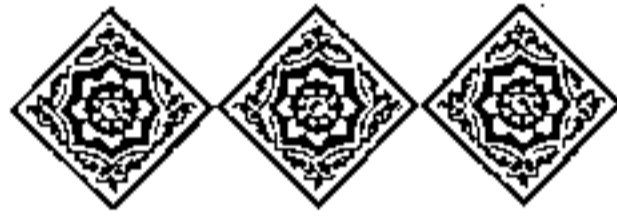
حضرت سفیان ثوری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ نے ایک نماز کے لیے ساٹھ بار طہارت کی۔ اس حال میں آپ تھے کہ انتقال کا وقت آگیا۔ آپ نے عرض کی: الہی! میں حکم موت آنے تک باطہارت ہوں۔

حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ کے واقعہ میں ہے کہ آپ ایک روز مسجد جانے کے لیے طہارت فرما رہے تھے کہ غیبی آواز آئی: شبلی! ظاہری طہارت تو کر لی، باطنی طہارت کہاں ہے؟ آپ واپس تشریف لائے اور تمام جائیداد، مال و دولت راہِ خدا میں خرچ کر کے ایک سال تک صرف ایک کپڑے میں رہے جس سے نماز ادا ہو سکے۔ پھر حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں آئے۔ جنید نے کہا: اے ابو بکر شبلی! جو طہارت تم نے اختیار کی ہے وہ بہت مفید ہے، اللہ تعالیٰ تمہیں ہمیشہ باطہارت رکھے۔ چنانچہ حضرت شبلی! وقتِ رحلت تک بے طہارت نہ رہے۔ جب وقتِ انتقال آیا تو آپ کی طہارت نہ رہی۔ ایک مرید کو اشارہ کیا کہ مجھے طہارت کرائے۔ مرید نے طہارت کرائی مگر ریش مبارک میں خلل کرنا بھول گیا۔ اس وقت آپ میں کلام فرمانے کی قوت نہ تھی۔ آپ نے مرید کا ہاتھ پکڑ کر داڑھی کی طرف اشارہ کیا اس نے خلل کیا۔ یہ بھی روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: میں نے کسی رات بے طہارت شب نہ گزاری اور اگر سہواً طہارت نہ رہی تو مجھے میرے باطن نے یاد دلایا۔

حضرت بایزید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب میرے دل میں اندیشہ دنیا گزرتا ہے تو میں طہارت کر لیتا ہوں اور جب اندیشہ عاقبت گزرتا ہے تو غسل کر لیتا ہوں۔ اس لیے کہ دنیا محدث ہے اور اس کا اندیشہ حدت ہے اور عقبی محل غیبت و آرام ہے اور اس کا اندیشہ جنابت ہے۔ تو حدت سے طہارت واجب ہے اور جنابت سے غسل۔

اور حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ ایک روز آپ نے طہارت کی۔ جب مسجد کے دروازہ پر آئے تو آواز آئی اے ابو بکر شبلی! تیری وہ طہارت ہے جو ہمارے گھر میں گستاخ طہارت کر کے آتے ہیں۔ یہ سن کر آپ واپس لوٹے تو آواز آئی۔ شبلی! ہمارے در سے واپس جا کر کہاں جائے گا۔ آپ نے ایک نعرہ مارا۔ آواز آئی شبلی! ہم پر طعن کرتا ہے۔ آپ وہیں خاموش کھڑے رہ گئے۔ تو آواز آئی تحمل بلا کا دعویٰ کرتا ہے۔ تو آپ نے عرض کی: الْمُسْتَفَاتُ بِكَ مِنْكَ. ”تیرے حضور تحمل سے فریاد ہے۔“

مشائخ صوفیہ کی تحقیق طہارت میں بہت سی باتیں ہیں اور وہ ہمیشہ ظاہری باطنی طہارت کا مریدوں کو حکم دیتے رہے ہیں اور بارگاہِ حق میں جانے کے ارادہ پر جب کوئی قصد کرے تو طہارت ظاہری پاکی کے لیے پانی سے ہوتی ہے اور باطنی طہارت توبہ اور درگاہِ الہی میں رجوع کرنے سے۔ اب میں توبہ اور اس کے لوازمات کا بیان کرتا ہوں۔



توبہ اور متعلقاتِ توبہ

اچھی طرح سمجھ لو کہ رہروانِ طریقہ حق کا پہل مقام توبہ ہے۔ جیسے طالبانِ خدمت کا پہلا درجہ طہارت ہے۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا تَوْبُوا إِلَى اللَّهِ تَوْبَةً نَّصُوحًا﴾ (۱) ”اے ایمان والو! توبہ کرو اللہ کے حضور توبۃ النصوح“۔ اور فرمایا: ﴿تَوْبُوا إِلَى اللَّهِ جَمِيعًا آيَةً الْمُؤْمِنُونَ لَعَلَّكُمْ تَفْلِحُونَ﴾ (۲) ”توبہ کرو اے ایمان والو! اللہ کی طرف سب، تاکہ تم فلاح پاؤ۔“ اور حضور ﷺ نے فرمایا: مَا مِنْ شَيْءٍ أَحَبُّ إِلَى اللَّهِ مِنْ شَابٍ تَائِبٍ إِلَى اللَّهِ تَعَالَى. (۳) ”اللہ تعالیٰ کے نزدیک جو ان توبہ کرنے والے سے زیادہ محبوب کچھ نہیں۔“ اور فرمایا: أَلْتَائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَا ذَنْبَ لَهُ (۴) ”گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہے گویا اس کے ذمہ کوئی گناہ نہیں۔“ پھر حضور ﷺ نے فرمایا: إِذَا أَحْبَبَ اللَّهُ عَبْدًا لَنْ يُضْرَهُ ذَنْبٌ (۵) ”جب اللہ

۲۔ سورۃ النور: ۳۱

۱۔ سورۃ التحریم: ۸

۳۔ اسے ابن عدی نے الکامل فی ضعفاء الرجال ۴/ ۱۳۳۹ میں روایت کیا ہے جبکہ علی المرتضیٰ الہندی نے کنز العمال (حدیث: ۴۳۱۰۸) میں ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے: ما من شئ احب الی من شاب تائب۔

۴۔ اسے ابن ماجہ، امام طبرانی نے، المعجم الکبیر میں اور امام بیہقی نے ”شعب الایمان“ میں ابو عبیدہ بن عبداللہ بن مسعود کے طریق سے، انہوں نے اپنے والد سے روایت کیا ہے۔ امام بیہقی نے اسے مرفوعاً روایت کیا ہے اور اس کے رجال (راوی) ثقہ ہیں بلکہ امام عسقلانی نے کئی دیگر شواہد کی بنا پر اسے حسن کہا ہے۔ امام ابو نعیم نے حلیۃ الاولیاء میں اور امام طبرانی نے المعجم الکبیر میں حضرت ابن ابی سعید انصاری سے انہوں نے اپنے والد سے ان الفاظ کے ساتھ مرفوعاً روایت کیا ہے: الندم توبۃ، والتائب من الذنب کمن لا ذنب له۔ امام سخاوی نے اسے المقاصد الحسنۃ میں اور امام سیوطی نے الجامع الصغیر میں روایت کیا ہے۔ حوالہ کے لیے دیکھیں: سنن ابن ماجہ (۴۲۵۰)، المعجم الکبیر للطبرانی (۱۰۲۷۱)، حلیۃ الاولیاء لابن نعیم ۳/ ۱۷۲۱، احياء العلوم للغزالی (۳/ ۲۲۰، ۱۵، ۳/ ۱۳۳۱). المقاصد الحسنۃ للسخاوی (ص: ۱۵۲) ۵۔ امام ویلی نے اسے حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے طریق سے روایت کیا ہے (تحاف السادة المتقين

۲۲۰/۵ احياء علوم الدين ۲۸۳/۲، ۵۰۶/۸، ۲۲۰/۵)

کسی بندے کو محبوب بنالے تو اُسے کوئی گناہ نقصان نہیں دیتا۔“ پھر حضور ﷺ نے تلاوت فرمایا:
﴿إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِينَ﴾ (۱) ”اللہ توبہ کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے
اور پاک رہنے والوں کو محبوب بناتا ہے۔“

لوگوں نے حضور ﷺ سے توبہ کی دریافت کی۔ فرمایا: نادم ہونا۔ اور یہ جو فرمایا کہ
گناہ اللہ کے دوستوں کو نقصان نہیں دیتا اس سے یہ مطلب ہے کہ گناہگار کافر نہیں ہوتا اور اس
کے ایمان میں خلل نہیں آتا۔ تو جب گناہ سے سرمایہ کا نقصان نہیں تو اس گناہ کا نقصان کہ جس کا
انجام نجات ہو، کچھ نقصان نہیں۔

واضح رہے کہ ”توبہ“ لغت میں رجوع کے معنی دیتی ہے۔ جیسے کہتے ہیں تائب ای رجوع
”توبہ کی یعنی رجوع ہو گیا۔“ تو اللہ تعالیٰ کی منع کی ہوئی بات سے توبہ کرنا یہ ہے کہ امر الہی کے
خلاف کرنے سے خائف ہو۔ یہ اصل توبہ ہے

اور حضور ﷺ نے فرمایا: أَلْنُدْمُ تَوْبَةٍ (۳) ”گناہ پر نادم ہونا توبہ ہے۔“ اور یہ ایسی
جامع تعریف ہے کہ اس میں توبہ کی تمام شرطیں آجاتی ہیں۔ اس لیے توبہ کی پہلی شرط یہ ہے کہ مخالف
حکم عمل پر افسوس کرے، دوسرے ترک کرتے ہوئے منفعل ہو، تیسرے عہد کرے کہ پھر ایسا نہ
کرے گا اور یہ تینوں شرائط ندامت میں آجاتی ہیں۔ اس لیے کہ جب دل میں ندامت پیدا ہوئی تو
بقیہ دو شرطیں اس کے ضمن میں آگئیں۔ اور ندامت کے تین سبب ہوتے ہیں جیسے توبہ کی تین شرطیں
ہیں۔ ایک یہ کہ جب خوف عذاب دل پر غالب ہو تو اعمالِ سیدہ کا غم دل پر آتا ہے اور ندامت پیدا

۱۔ سورۃ البقرۃ: ۲۲۲

۲۔ امام طبرانی نے المعجم الصغیر (۳۳/۱) میں، امام ابو نعیم نے حلیۃ الاولیاء (۲۵۱/۸، ۳۱۲) میں بطریق ابن ابی سعید انصاری، انہوں نے اپنے والد سے ان الفاظ کے اضافہ کے ساتھ مرفوعاً روایت کیا
ہے: والتائب من الذنب کمن لا ذنب لہ۔ اور یہی حدیث سنن ابن ماجہ (ابواب الزہد، باب
ذکر توبۃ حدیث: ۴۲۵۲) میں ابن ماجہ نے بطریق عبدالکریم الحدادی، انہوں نے زیاد بن ابی مریم
سے، انہوں نے عبداللہ بن معقل سے روایت کیا ہے اور اسے امام طحاوی نے اپنی مسند میں بطریق زیادہ
ذکر کیا ہے اور مستدرک میں امام حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ مزید حوالہ کے لیے مسند الإمام احمد
بن حنبل (۳۵۶۸، ۴۰۱۲، ۴۰۱۴، ۴۰۱۶، ۴۱۲۴) مسند الحمیدی (۱۰۵) صحیح
ابن حبان ۶/۲ (حدیث: ۶۰۱) المستدرک للحاکم ۲/۲۳۳، تاریخ الکبیر للبخاری
۳/۲۷۴، تاریخ بغداد ۹/۳۰۵ المواہب اللدنیۃ للقسطلانی ۱/۲۶۰، المقاصد الحسنۃ
(ص: ۴۴۵، حدیث ۱۲۴۵)۔ صفحہ ۲۸۵

ہوتی ہے۔ دوسرے یہ کہ حصولِ نعمت کا ارادہ جب دل پر غالب ہوتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ برے کام اور نافرمانی سے یہ حاصل نہیں ہوتی تو پریشان ہوتا ہے۔ تیسرے یہ کہ اس پر بارگاہِ حق سے شرم غالب آئے اور مخالفتِ حکم سے پشیمان ہو تو پھر تائب ہو جاتا ہے۔ اور توبہ کے تین مقام ہیں: اول تائب، دوسرا عاجز، تیسرا اذاب۔ تو توبہ خوفِ عذاب کے سبب ہوتی ہے اور انابت طلبِ ثواب کے لیے اور اذاب رعایتِ فرمان کے واسطے۔

اس لیے کہ توبہ عام مومنوں کا مقام ہے اور وہ ارتکابِ کبائر سے ہوتی ہے۔ جیسے کہ ارشادِ الہی ہے: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا تَوْبُوا إِلَى اللَّهِ تَوْبَةً نَّصُوحًا﴾ (۱) ”اے ایمان والو! اللہ کی طرف خالص توبہ کرو“۔ اور انابت، خالص اولیاء اور مقربانِ خاص کا مقام ہے۔ جیسے فرمایا: ﴿مَنْ خَشِيَ الرَّحْمَنَ بِالْغَيْبِ وَجَاءَ بِقَلْبٍ مُنِيبٍ﴾ (۲) ”جو اللہ تعالیٰ سے ڈرا اور آیا عاجز دل۔ لے کر“۔ اور اذاب، یہ انبیاء و مرسلین کا مقام ہے۔ جب کہ فرمایا: ﴿نِعْمَ الْعَبْدُ إِنَّهُ أَوَّابٌ﴾ (۳) ”بہت اچھا بندہ رجوع کرنے والا ہے۔“

تو پھر گناہِ کبیرہ سے باز آنا اور اطاعتِ الہی کی طرف جھکنا، یہ ایک درجہ ہے اور صفائی سے توبہ کرنا اور محبتِ الہی کی طرف رجوع ہونا یہ ایک درجہ ہے اور انانیت سے منحرف ہو کر اپنے اختیاراتِ خیار ذات میں دے دینا، یہ ایک درجہ ہے۔ تو ان میں فرق یہ ہوا کہ ایک شخص خواہش سے علیحدہ ہو کر اتباعِ امر کی طرف رجوع کرے اور اصل توبہ ممنوعاتِ حق سے باز رہنے کا نام ہے، دوسرا قصور اور اندیشہِ فاسد سے باز آنا، تیسرا اپنے آپ کو حق تعالیٰ کی طرف رجوع کرنا، غفلت سے دل بیدار کرنا اور غیبتِ عالی کا دیکھنا۔

اور جب بندہ اپنے بُرے حال اور برے افعال پر غور و فکر کرے اور اس سے نجات چاہے تو اللہ تعالیٰ اس پر اسبابِ توبہ آسان کر دیتا ہے۔ پھر اسے اس کے گناہوں کی شامت سے رہائی دیتا ہے اور اسے اطاعت کی حلاوت عطا فرماتا ہے۔ اہلسنت و جماعت اور تمام مشائخ کے نزدیک یہ مسلم ہے کہ اگر ایک شخص گناہ سے توبہ کر کے دوبارہ گناہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے توبہ کا ثواب دیتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے اس کی توبہ کی برکت سے اور گناہوں کی بھی معافی ہو جائے، جیسے ایک شخص شرابی، زانی ہو تو وہ اگر زنا سے توبہ کرے اور شراب نوشی سے باز نہ آئے تو اس کے گناہوں کی توبہ درست ہے بآنکہ وہ دوسرے گناہ کا مرتکب ہے۔

اور معتزلہ کا ایک گروہ کہتا ہے کہ جب ایک گناہ کا مرتکب ہے اور ایک سے تائب، توبہ

توبہ صحیح نہیں جب تک تمام کبائر سے مجتنب نہ ہو، اور یہ محال ہے اس لیے کہ ہر گناہ پر جس کا بندہ مرتکب ہوتا ہے اس پر اسے عذاب ضرور ہے، تو جب بندہ ترکِ معصیت کرے تو اسے اس کے عذاب سے بے غم بھی ہونا ضروری ہے اور ترکِ معصیت اس کی طرف سے توبہ ہوتی ہے اور یہ بھی ہے کہ جب بندہ بعض فرض ادا کرے اور بعض ترک کر دے تو لازمی طور پر جو ادا کیے جائیں وہ ماجور ہے اور جو ترک کیا ہے اس میں ماخوذ۔ اور اگر کسی کو گناہ کرنے کے آلہ موجود نہ ہو اور اس پر اس گناہ کی طرف اصرار بھی نہ ہو اور پھر وہ اس کے ارتکاب سے توبہ کرے تو لازمی وہ تائب ہوگا۔

اس لیے کہ توبہ کا ایک رکن ندامت ہے۔ تو اگر اسے اپنے پہلے کیے پر ندامت ہوتی ہے تو یہ اس فعل سے روگردانی کے مترادف ہے اور اگر وہ کسی گناہ کا ارادہ کرتا ہے اور اس کے اسباب موجود ہیں تو وہ ایسی حالت میں عہد کرتا ہے کہ میں اس گناہ کی طرف نہ جاؤں گا تو یہ بھی بڑی توبہ ہے اور توبہ کے اوصاف اور صحت میں مشائخ کا اختلاف ہے۔

اہل بن عبد اللہ رحمۃ اللہ علیہ اور ایک جماعت کہتی ہے کہ: التَّوْبَةُ أَنْ لَا تَنْسَى ذَنْبَكَ ”توبہ یہ ہے کہ تائب اپنے کیے ہوئے گناہ کو نہ بھولے“۔ اور اس سے ہمیشہ پریشان رہے حتیٰ کہ اگر اس کے عمل صالح زیادہ ہوں تو ان پر غرور بھی نہ کرے اس لیے کہ برے کام پر افسوس کرنا اعمال صالح پر مقدم ہے۔ اور جو شخص گناہ نہیں بھولتا وہ کبھی نیکیوں پر غرہ بھی نہیں کرتا۔

اور جنید رحمۃ اللہ علیہ اور ایک جماعت اس طرف ہے کہ: التَّوْبَةُ أَنْ تَنْسَى ذَنْبَكَ . ”توبہ یہ ہے کہ تائب اپنے گناہ کو بھی بھول جائے“۔ اس لیے کہ تائب محبت ہوتا ہے اور محبت مشاہدہ میں ہوتا ہے اور مشاہدہ کی حالت میں گناہ کا تصور برا ہوتا ہے اور پھر عرصہ وفا میں گناہ کا ذکر وفا سے حجاب ہوتا ہے اور یہ مشاہدہ اور مجاہدہ میں نہیں ہونا چاہیے۔ اس کی تفصیل مذہب سہیلیہ میں دیکھنی چاہیے۔ ان کے مذہب میں تائب کو بذات خود قائم کہتے ہیں اور اس کے گناہ کو فراموش کر دینے کو غفلت مانتے ہیں اور جو تائب کو قائم بحق مانتے ہیں وہ گناہ کے ذکر کو بھی شرک بتاتے ہیں۔ مختصر یہ کہ اگر تائب باقی الصفیۃ ہو تو اس سے عقیدہ اسرار حل نہیں ہوتا اور اگر فنا فی الصفیۃ ہو تو ذکر صفت اس کے لیے جائز نہیں۔

موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: ﴿تَبَّتْ إِلَيْكَ﴾ (۱) ”میں نے تیرے حضور توبہ کی“۔ یہ قول حضرت موسیٰ علیہ السلام کا بحالت بقاء صفت تھا۔ اور حضور ﷺ نے فرمایا: لَا أُخْصِي لِنَاءٍ عَلَيْكَ (۲) ”تیری ثناء کا احصا نہیں ہو سکتا۔“ یہ بیان فنا فی صفیۃ کی حالت میں تھا۔

غرض کہ مقامِ قربت میں ذکرِ وحشت، وحشت ہوتا ہے اور تائب کو چاہیے کہ اپنے آپ سے گناہ کا تصور نہ لائے اور جب وہ تصورِ معصیت بھی نہ آنے دے گا تو اسے گناہ کس طرح یاد آسکتے ہیں۔ درحقیقت اس مقام پر اپنے گناہ یاد کرنا بھی گناہ ہے اس لیے کہ یہ مقام روگردانی ہے۔ جیسے گناہ روگردانی کا مقام ہے اور اس کے غیر کا ذکر بھی ویسا ہی ہے جیسے ذکرِ جرم خود جرم ہوتا ہے بنا بریں گناہ بھولنا بھی جرم ہے اس لیے کہ ذکر اور فراموشی کا تعلق توبہ سے ہے، اور جنید رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے بہت کتابیں پڑھیں لیکن مجھے کسی سے اتنا فائدہ نہ ہوا جتنا اس بیت سے ہوا۔

إِذَا قُلْتُمْ مَا أَذْنَبْتُ قَالَتْ مُجِيبَةٌ

حَيَاتِكَ ذَنْبٌ لَا قِيَاسَ بِهِ ذَنْبٌ

”جب میں نے کہا میں نے گناہ نہیں کیا، تو مجھے جواب ملا تیری زندگی ایسا

بے گناہ ہے جس پر کسی گناہ کا قیاس نہیں ہو سکتا۔“

جب دوست کا وجود ہی حضورِ دوست میں گناہ ہے تو اس کے وصف کی کیا قدر ہو

سکتی ہے۔

غرضیکہ توبہ تائیدِ ربانی سے ہوتی ہے اور گناہ افعالِ جسمانی سے۔ جب دل پر ندامت ہو تو

بظاہر کوئی ذریعہ نہیں ہوتا کہ دل کی ندامت کو دور کرے اور جب ابتداءِ فعل میں اس کی ندامت کو

روک نہیں سکتی تو انتہا میں کیونکر روک سکتی ہے نہ اس کا فعل توبہ کا نگہبان ہوتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ

فرماتا ہے: ﴿فَتَابَ عَلَيْهِ ۗ إِنَّهُ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ۝﴾ (۱) ”تو توبہ کی آدم نے اس پر، بے شک

وہ توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔“ اور قرآن کریم کی نصوص میں اس کی بہت نظیریں ہیں کہ ان

کے بیان کی ضرورت نہیں۔ توبہ تین طریق پر ہوتی ہے: ایک خطا سے صواب کی طرف۔ ایک صواب

سے دوسرے صواب کی طرف۔ ایک اپنی ہستی سے حق تعالیٰ کی طرف۔

خطا سے صواب کی طرف یہ ہے جو ارشاد ہوا:

﴿وَالَّذِينَ إِذَا فَعَلُوا فَاجِشَةً أَوْ ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللَّهَ فَاسْتَغْفَرُوا

لِذُنُوبِهِمْ ۗ﴾ (۲)

”وہ لوگ جو کر بیٹھے بے شرمی یا ظلم کر گزرے اپنے نفسوں پر اور اللہ کی یاد کر

کے گناہ معاف کرائیں۔“

اور صواب سے صواب کی طرف وہ توبہ ہے جو موسیٰ علیہ السلام نے کی:

﴿تُبْتُ إِلَيْكَ﴾ (۱) ”میں نے تیری طرف رجوع کیا“۔

اور اپنی ہستی سے حق تعالیٰ کی طرف وہ توبہ ہے جو حضور ﷺ نے خود کی اور فرمایا:

وَأَنَّهُ لِيُغَانُ عَلَى قَلْبِي وَإِنِّي كُنْتُ لَا سَتَغْفِرُ اللَّهُ فِي كُلِّ يَوْمٍ سَبْعِينَ

مَرَّةً (۲)

”بیشک میرا دل حجاب میں آجاتا ہے اور میں ہر دن میں اپنے رب سے ستر

بار استغفار کرتا ہوں“۔

اور ارتکابِ خطا مذموم ہے اور خطا سے رجوع بصواب محمود ہے۔ یہ توبہ عام ہے اور اس کا

حکم ظاہر ہے اور راہِ صواب میں رہ کر اس پر قائم رہنے کی آرزو کرنا صواب سے ثواب کی طرف

رجوع کرنا ہے۔ اسے اہل ہمت نے پسند کیا ہے یہ خاص توبہ ہے۔

اور یہ محال ہے کہ خواص آدمی گناہ سے توبہ نہ کریں۔ عام طور پر سب جانتے ہیں کہ جہان

رویتِ حق کی حسرت کرتا ہے اور موسیٰ علیہ السلام اس آرزو کو پیش کر کے توبہ کر رہے ہیں۔ اس کی

وجہ یہ ہے کہ انہوں نے یہ آرزو اپنے اختیار سے کی۔ اور محبت کے رابطہ میں اختیار بھی آفت ہے تو

اس اختیار کے ترک کے لیے آپ نے توبہ کی اور اپنی ہستی سے رجوع بحق کرنا یہ محبت کا درجہ اتم

ہے۔ جیسے اونچے مقام کی آفت کے باعث اونچے مقام پر کھڑا ہونے سے توبہ کرنا ہوتا ہے۔ یہ مرتبہ

حضور ﷺ کا ہے کہ آپ ﷺ کا تعلق ترقی پر تھا تو جس مقام پر تھے اسے بلند ہی سمجھ رہے

تھے، جب اس سے آگے بڑھے تو پہلے مقام سے استغفار فرمائی۔ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِالصَّوَابِ

فصل:

جب بندہ مستقل عہد کر لے کہ پھر گناہ کی طرف رجوع نہ کرے گا تو اس کی توبہ کے لیے

تائید شرط نہیں۔ اگر تائب پر کوئی آفتِ نفس آجائے کہ پھر گناہ کی طرف رجوع کر لے بعد اس کے

کہ پہلے صحیح عہد کر چکا ہو تو صواب توبہ کے حکم میں آجائے گا اور یہ تائبوں میں مبتدی ایسے ہوتے

۱۔ سورۃ الاعراف: ۱۳۳

۲۔ امام مسلم نے اسے اپنی صحیح ۱/۸ (کتاب الذکر: باب استجاب الاستغفار) میں ان الفاظ

کے ساتھ ذکر فرمایا ہے: إِنَّهُ لِيُغَانُ عَلَى قَلْبِي فَاسْتَغْفِرُ اللَّهَ وَأَتُوبُ إِلَيْهِ فِي الْيَوْمِ مِثْلَ مَرَّةٍ. قاضی

عیاض نے مشارق الانوار علی صحاح الآثار ۲/۲۴۲ میں، قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے تفسیر

مظہری ۲۳۱/۸ میں سورۃ محمد کی آیات: فاعلم انه لا إله الا الله واستغفر للذنبك کی تفسیر کے

تحت ابن اثیر نے النہایہ ۳/۱۸۰ میں اور امام سیوطی نے الجامع الصغیر ۲/۱۹۵ میں ذکر کیا ہے۔

ہیں کہ توبہ کرتے ہیں پھر خواہشِ نفسانی کا فساد غالب آتا ہے اور برائی کی طرف رجوع ہو جاتے ہیں۔ (۱)

اور یہ ایک واقعہ بھی ہے کہ ستر بار توبہ کر کے رجوعِ بفساد ہوا اور اکہتر ہویں بار توبہ پر قائم ہوا۔ حضرت ابو عمر نے جنید رضی اللہ عنہ کو کہا کہ میں نے ابتداء میں ابو عثمان حیرئی کی مجلس میں توبہ کی اور کچھ دن اس پر قائم رہا کہ دل میں معصیت کی خواہش غالب ہوئی تو ابو عثمان حیرئی کی صحبت سے علیحدہ ہو کر گناہ کی طرف مائل ہو گیا۔ جب مجھے حیرئی نظر آتے، میں ان سے نظر چرا کر بھاگ جاتا۔ اتفاقاً ایک روز ان سے ملا۔ انہوں نے مجھے فرمایا: بیٹا! دشمنوں کی صحبت اچھی نہیں، جب تو دشمن کی عیب جوئی سے آنکھ بند کر کے خود عیب کرنے لگتا ہے، دشمن خوش ہوتا ہے اور جب تو اس سے بچتا ہے وہ غمگین ہوتا ہے۔ اگر تو گناہ سے بچنا چاہتا ہے تو میرے پاس آ، تاکہ میں تیری آفتِ مصیبت اٹھاؤں اور دشمن کو ذلت جب ہی ہو سکتی ہے جب تو اس کا دم نہ بھرے۔ تو میں نے عرض کیا حضور! اب میرا دل گناہ سے سیر ہو چکا ہے اور توبہ کی طرف اب صحیح طور پر آتا ہوں۔

یہ بھی مشہور ہے کہ ایک شخص نے گناہ سے توبہ کی پھر اسی گناہ کا مرتکب ہوا۔ پھر نادام ہوا۔ ایک روز اس نے اپنے جی میں کہا کہ اگر میں پھر توبہ کر کے ادھر جاؤں تو میرا حال کیا ہوگا۔ تو اس کے مکان میں ہاتفِ غیبی کی آواز آئی: اَطَعْنَا فَشَكَرْنَا كَ لَمْ تَرَ كُنَّا فَاْمَهْلْنَا كَ فَاِنْ عُدْنَا اِلَيْنَا قَبْلْنَا كَ۔ ”تو نے ہماری اطاعت کی ہم نے تجھے پسند کیا، پھر تو نے بیوفائی کی اور ہمیں چھوڑ دیا، ہم نے تجھے مہلت دی اگر پھر توبہ کرے تو ہم قبول کریں گے۔“

اب ہم اقوالِ مشائخ کی طرف رجوع کرتے ہیں

فصل:

حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

تَوْبَةُ الْعَوَامِ مِنَ الذُّنُوبِ، تَوْبَةُ الْخَوَاصِّ مِنَ الْغَفْلَةِ

”عوام کی توبہ گناہ سے ہوتی ہے اور خواص کی توبہ غفلت سے۔“

اس لیے کہ عوام کی باز پرس ان کے ظاہری اعمال پر ہوگی اور خواص سے ان کے باطنی

معاملہ سے۔ اس لیے کہ غفلت عوام کے لیے نعمت ہے اور خواص کے لیے حجاب۔

۱۔ بقول شاعر۔

گناہوں سے مری اب معصیت بھی عار کرتی ہے

مری توبہ سے توبہ، توبہ استغفار کرتی ہے

مترجم

حضرت ابو حفص حداد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

لَيْسَ لِلْعَبْدِ فِي التَّوْبَةِ شَيْءٌ إِلَّا أَنَّ التَّوْبَةَ إِلَيْهِ لَا مِنْهُ.

”بندہ کو توبہ سے کچھ فائدہ نہیں اس لیے کہ توبہ حق کی طرف سے بندہ کو ہے نہ

بندہ کی طرف سے حق کو۔“

اس قول کے مطابق چاہئے کہ توبہ مکتسب نہ ہو بلکہ وہی ہو، مواہب الہی سے۔ اس قول کا

تعلق مذہب جنیدیاں سے ہے۔

اور حضرت ابوالحسن بوشجہ فرماتے ہیں:

التَّوْبَةُ إِذَا ذَكَرْتَ الذَّنْبَ لَمْ لَا تَجِدْ خَلَاوَتَهُ عِنْدَ ذِكْرِهِ فَهُوَ

التَّوْبَةُ.

”توبہ یہ ہے کہ جب گناہ یاد آئے تو اس کی لذت دل میں نہ پائے (بلکہ

نفرت آئے)۔“

اس لیے کہ گناہ کا ذکر یا اس کی حسرت کے ساتھ ہو گا یا اس کی طرف ارادہ کے ساتھ۔ تو

جو کسی کو حسرت و ندامت معصیت سے ہو تو وہ تائب ہے اور اگر با ارادہ معصیت و گناہ یاد کرے تو

عاصی ہے۔ اس لیے کہ گناہ کے ارتکاب میں اتنی آفت نہیں ہوتی جتنی اس گناہ کی خواہش میں

ہے۔ اس لیے کہ وہ گناہ کرنا ایک وقت پر ہے اور اس کی خواہش ہمیشہ رہتی ہے۔ تو جو ایک ساعت

جسم کے ساتھ ارتکاب گناہ کرے وہ اسی وقت تک محدود ہے اور اس کی خواہش اگر کرے تو وہ مستمر

ہوتی ہے۔

حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

التَّوْبَةُ تَوْبَتَانِ تَوْبَةُ الْإِنَابَةِ وَتَوْبَةُ الْإِسْتِحْيَاءِ فَتَوْبَةُ الْإِنَابَةِ أَنْ يُتُوبَ

الْعَبْدُ خَوْفًا مِنَ الْعُقُوبَةِ وَتَوْبَةُ الْإِسْتِحْيَاءِ أَنْ يُتُوبَ حَيَاءً مِنْ كَرَمِ.

” توبہ دو طرح پر ہے: ایک توبہ انابت، دوسری توبہ استحياء۔ توبہ انابت وہ

ہے کہ بندہ خوف عذاب حق تعالیٰ سے توبہ کرے اور توبہ استحياء یہ ہے کہ اللہ

تعالیٰ کے حضور شرم سے توبہ کرے اور اس کے کرم کی امید رکھے۔“

تو خوف کے ذریعہ جو توبہ ہے اس میں جلالت حق کھل جاتی ہے اور حیاء کی توبہ نظارہ

جمال سے ہوتی ہے۔ تو ایک توبہ جلالت شان کے خوف سے ہوتی ہے اور ایک جمال کے مشاہدہ

میں نور حیاء سے مستنیر ہو کر ہوتی ہے۔ ان دونوں میں سے ایک سکر میں ہوتا ہے دوسرا مجنس

مدہوش۔ چنانچہ اہل حیا سکر میں ہوتے ہیں اور اہل خوف صحو میں۔ اس بحث میں بہت سی باتیں ہیں جسے میں اسی پر ختم کرتا ہوں۔ **وَبِاللّٰهِ التَّوْفِیْقُ**

کشفِ حجاب پنجم: نماز

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَأَقِمْوَالصَّلٰوةَ﴾ (۱) ”نماز قائم رکھو“۔ اور حضور ﷺ نے فرمایا: الصَّلٰوةُ وَمَا مَلَكَتْ اَیْمَانُکُمْ (۲) ”اور نماز بمعنی ذکر و انقیاد ہے“۔ از روئے لغت اور فقہاء کی اصطلاح میں عبادت مخصوص مراد ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ پانچ نمازیں وقت میں ادا کرو۔ اس میں داخل ہونے سے پہلے اس کی شرائط ہیں۔ اول طہارت نجاستِ ظاہری سے اور طہارتِ باطنی شہوت سے، دوسرے کپڑا پاک ہونا نجاستِ ظاہر سے اور باطن یعنی حرام سے، تیسرے جگہ کا پاک ہونا ظاہر میں حادثات اور آفات سے اور باطن میں فساد اور گناہ سے۔ چوتھے رو بقبلہ ہونا قبلہ ظاہر یعنی کعبہ کی طرف اور قبلہ باطن عرش اور قبلہ سے مشاہدہ مقصود۔ پانچویں قیام ظاہر میں بحالتِ استطاعت اور قیام باطن باغِ قربت میں بشرطیکہ ظاہر شریعت سے وقت میں داخل ہو اور باطن درجہ حقیقت میں ہو۔

چھٹے جنابِ حق میں خلوص نیت سے متوجہ ہونا۔ ساتویں تکبیر ہیبت و فنا کے مقام میں کہنا اور محلِ وصل میں قرأتِ آہستہ ترتیل و عظمت سے کرنا اور رکوع بخشوع اور سجدہ عاجزی و فروتنی سے ادا کرنا اور تشہد جمعیت خاطر سے پڑھنا اور فنا کی صفت سے پورا کرنا۔ حدیث میں آیا ہے: **كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يُصَلِّيْ وَفِيْ جَوْفِهِ اَزِيْرٌ كَا زِيْرِ الْمُرْجَلِ**. (۳) ”حضور ﷺ جب نماز ادا فرماتے تو آپ کے جوف مبارک سے دیگ کے جوش کی آواز آتی۔“ اور جب امیر المومنین سیدنا علی کرم اللہ وجہہ الکریم نماز کا ارادہ فرماتے تو آپ کے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے اور چادر سے سر نکالتے ہوئے کانپتے اور فرماتے کہ یہ امانت ادا کرنے کا وقت ہے، جس کی برداشت سے زمین و آسمان عاجز ہوئے۔

ایک شیخ فرماتے ہیں کہ میں نے حاتمِ اصم سے پوچھا کہ آپ نماز کس طرح ادا کرتے ہیں

۲۔ مجمع الزوائد (ص: ۹۸)

۱۔ سورۃ البقرہ: ۴۳

۳۔ اسے امام ترمذی نے الشمائل المحمدیہ (حدیث: ۳۰۷، باب ماجاء فی بکاء رسول ﷺ) میں مطرف بن عبد اللہ بن الشخیر سے انہوں نے اپنے والد سے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے: اتیبت رسول اللہ ﷺ وهو یصلی ولجوفه ازیر کا زیر المرجل من البکاء ابن الیر اسے النہایہ فی غریب الحدیث ۳/۵۱۳ (تحت المادة رجل) میں لائے ہیں۔

فرمایا؟ جب وقت نماز آتا ہے ایک ظاہری وضو کرتا ہوں اور ایک باطنی۔ ظاہری پانی سے اور باطنی توبہ سے۔ پھر میں مسجد میں جاتا ہوں تو خانہ کعبہ میرے سامنے ہوتا ہے اور مقام ابراہیم دونوں ابروؤں کے درمیان اور داہنے بازو پر بہشت کرتا ہوں اور بائیں پر دوزخ اور پل صراط زیر قدم لاتا ہوں اور ملک الموت کو اپنے پیچھے تصور کرتا ہوں۔ پھر تکبیر بالتعظیم کہتا ہوں اور باادب قیام کرتا ہوں اور قرأت خوفناک حالت میں۔ اور رکوع با تواضع اور سجود بتمضغ اور جلسہ حلم اور وقار سے اور سلام شکر کے ساتھ۔ وَ بِاللّٰهِ تَوَفِّیْقُ۔

فصل:

جاننا چاہیے کہ نماز ایک ایسی عبادت ہے کہ مرید ابتداء تا انتہاء اس سے راہِ حق پاتا ہے اور نماز ہی میں اُسے اُس کے مقامات کا کشف ہوتا ہے۔ جیسے مرید کو اس سے بجائے طہارت توبہ ملتی ہے۔ اور اطاعت کی بجائے قبیلہ شناسی۔ اور مجاہدہ نفس کی بجائے قیام و دوام اور ذکر بجائے قربت اور تواضع بجائے رکوع۔ اور معرفت نفس بجائے سجود اور امن بجائے تشہد اور تَجَنُّبِ عَنِ الدُّنْيَا بجائے سلام اور بند مقامات سے باہر آنا۔

اسی وجہ سے معمول تھا کہ جناب حضور ﷺ تمام اکل و شرب سے تجنب فرماتے اور کمال حیرت سے محل شوق کے طالب ہوتے اور صرف ایک مذہب سے متعلق ہوتے تو فرماتے:

اِرْحَنَا يَا بِلَالُ بِالصَّلَاةِ. (۱) ”اے بلال! ہمیں نماز و اذان نماز سے خوش کر۔“

اور مشائخ کرام رضی اللہ عنہم کے اس میں بہت کلام ہیں اور ہر ایک گروہ اپنے اپنے درجہ پر اپنا مقام بیان کرتا ہے۔ ایک گروہ کہتا ہے نماز آگہ حضور ہی ہے۔ ایک گروہ کہتا ہے نماز آگہ غیبت ہے۔ اور بعض غائب ہو کر نماز میں حاضر ہوئے ہیں اور جو حاضر ہوئے ہیں وہ نماز میں غائب ہوئے۔ جس طرح عالم عقبیٰ میں رویت کے وقت جو لوگ اللہ تعالیٰ کو دیکھیں گے غائب سے حاضر ہو جائیں گے اور جو حاضر ہوں گے، وہ غائب ہو جائیں گے۔

۱۔ اسے امام احمد بن حنبل نے اپنی مسند میں حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے اور امام ابو داؤد نے اپنی سنن میں ذکر کیا ہے۔ ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں: قم یا بلال فارحنا بالصلاة: دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں: کان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یقول: یا بلال روحنا۔

حوالہ کے لیے دیکھیں: مسند الامام احمد ۳۶۲/۵، سنن ابی داؤد ۴۵۳/۴ (کتاب الادب: باب صلاة العتمة)، العلل المتناہیة للدار قطنی ۱۳۰/۴ (حدیث لمبر ۳۶۱) کنوز الحقائق. (ص: ۱۶۹)

اور میں علی، عثمان جلابی (رضی اللہ عنہ) کا بیٹا کہتا ہوں کہ نماز امر حق تعالیٰ ہے، نہ آکہ حضور ہے، نہ آکہ غائب۔ اس لیے کہ امر کسی چیز کا آکہ نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ حضور کی علت میں حضور ہے اور غیبت کی علت میں غیبت ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا حکم کسی چیز سے تعلق کا سبب نہیں کیونکہ اگر نماز آکہ حضور ہے تو چاہیے تھا کہ بدکار نمازی بدکاری نہ کرتے اور اگر نماز علت غیبت ہوتی تو لازمی تھا کہ غائب اس کے ترک سے حاضر ہوتے اور غائب کو اس کی ادا اور ترک سے عذر نہ ہوتا تو نماز کو بذات خود غلبہ ہے اور غیب و حضور میں وہ محدود نہیں۔

چنانچہ اہل مجاہدہ و استقامت اکثر نماز پڑھتے ہیں اور فرماتے ہیں جیسے مریدوں کو حکم دیتے ہیں کہ رات دن میں چار سو رکعت ادا کر، تاکہ بدن کو عبادت کا خوگر بنا لے اور اہل استقامت بھی بارگاہ حق میں عبادت قبول ہونے کے شکرانہ میں بہت نماز ادا کرتے رہے ہیں۔ باقی رہے اصحاب حال، یہ دو طرح پر ہیں: ایک گروہ وہ ہے جس کی نماز کمال مشرف میں بجائے مقام جمع کے ہوتی ہے اور وہ اس کے ذریعے مجتمع ہوتے ہیں اور دوسرا گروہ وہ ہے جس کی نماز انقطاع مشرف میں بجائے مقام تفرقہ کے ہوتی ہے اور وہ اس کے ذریعے متفرق ہوتے ہیں۔ تو جو لوگ مقام جمع میں رہ کر نماز ادا کرتے ہیں وہ دن رات نماز میں رہتے ہیں، علاوہ فرائض و سنن، ان کی طرف سے نقلیں ادا ہوتی رہتی ہیں۔ اور جو لوگ تفریق میں ہوتے ہیں، فرائض و سنت کے سوا اور زائد نہیں پڑھتے اور حضور ﷺ نے فرمایا:

جُعِلَتْ قُرَّةُ عَيْنِي فِي الصَّلَاةِ.

”میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں رکھی گئی۔“

گویا فرمایا میری تمام خوشی نماز میں ہے۔

اس لیے کہ مشرب اہل استقامت نماز میں ہی ہے اور وہ ایسے ہے جیسے حضور ﷺ کو معراج میں لے گئے اور مقام جمع و تقرب پر پہنچایا تو آپ ﷺ کا نفس دنیا کے بند سے چھڑایا گیا اور دل کے مقام پر پہنچایا اور دل جان کے درجہ پر اور جان سر کے درجہ پر اور سر درجہ فنا سے مقام محویت میں تھا اور نشانہ بے نشان اور مشاہدہ ذات میں مشاہدہ سے غائب ہوا اور معائنہ سے دور ہوئے اور مشرف انسانی پر آگندہ ہوا اور مادہ نفسانی حل اور قوی طبعی نابود ہوئے تو مشاہدات ربانی اپنی ولایت میں ظاہر ہوئے اور آپ سے آپ میں رہے اور معنی معنی کو پہنچے اور مکاشفہ لم یزل میں محو ہوئے اور اپنے اختیار سے باہر ہو کر راہ شوق اختیار کر کے عرض کیا: الہی! مجھے اس بلاخانہ میں واپس نہ لے جا اور قید ہوئی میں نہ ڈال۔ حکم ہوا کہ ہمارا فرمان یہی ہے کہ آپ دنیا میں واپس

جائیں اور قانونِ شرع قائم کریں اور جو کچھ آپ کو ہم نے یہاں دیا ہے وہاں بھی ملے گا۔ چنانچہ جب حضور ﷺ واپس تشریف لائے تو آپ ﷺ کے دل میں اس مقامِ معلیٰ کا شوق بار بار آتا تو آپ ﷺ ارشاد فرماتے: اِرْحَنَا يَا بِلَالُ بِالصَّلَاةِ. ”اے بلال! ہمیں اذان اور صلوٰۃ کی آواز سے مسرور کر۔“ چنانچہ ہر نماز حضور ﷺ کے لیے معراج اور تقرب تھی۔ خلقت کی نگاہیں آپ ﷺ کو نماز میں دیکھتیں۔ درحقیقت آپ ﷺ کی جان پاک معہ دل کے، نیاز میں اور سرراز میں ہوتے تھے اور بدن مبارک سوز و گداز میں۔ اسی وجہ سے آپ کی آنکھ کی ٹھنڈک نماز ہوئی اور تن پاک ملک میں اور جان پاک ملکوت میں۔ اس لیے کہ تن انس ہے اور جان انس۔

حضرت سہل بن عبد اللہ تستری فرماتے ہیں:

عَلَامَةُ الصِّدْقِ أَنْ يَكُونَ لَهُ تَابِعٌ مِنَ الْحَقِّ إِذَا دَخَلَ وَقْتُ الصَّلَاةِ
يَبْعَثُ عَلَيْهَا وَيُنَبِّئُ إِنْ كَانَ نَائِمًا.

”علامتِ صدق یہ ہے کہ منجانب اللہ اس پر فرشتہ بطورِ گماشتہ مقرر ہو، جب وقت نماز آئے تو وہ بندہ کو ادائے نماز کے لیے ذکر بیدار کر دے اگر وہ سو رہا ہو۔“

اور یہ علامت سہل بن عبد اللہ میں تھی۔ اسی وجہ میں وہ پیر زمانہ ہوئے آپ کا یہ حال تھا کہ نماز کے اوقات میں آپ تندرست ہو جاتے اور جب فارغ ہوتے تو وہیں رہ جاتے۔ مشائخ میں سے ایک صاحب فرماتے ہیں:

يَحْتَاجُ الْمُصَلِّيُّ إِلَى أَرْبَعَةِ أَشْيَاءَ فَنَاءُ النَّفْسِ وَذِهَابُ الطَّبَعِ وَصَفَاءُ
السِّرِّ وَكَمَالُ الْمَشَاهِدَةِ.

”نماز کے لیے چار باتیں ضروری ہیں بغیر ان کی خاطر جمع نہیں ہوتا۔ فناءِ النفس، ذہابِ طبع، صفاءِ السر، مشاہدہ کمال۔“

جب خاطر جمع ہو جاتی ہے ولایتِ نفس تک پہنچ جاتا ہے۔ اس لیے کہ اس کا وجود تفریق ہے، وہ عبارت میں نہیں آسکتا۔ جب طبیعت دفع ہو جائے تو اثباتِ جلال حاصل ہوتی ہے اس لیے کہ اثباتِ جلال حق زوالِ غیر کے بغیر نہیں۔ صفاءِ سر بغیر محبت کے نہیں ہو سکتا اور کمالِ مشاہدہ بجز صفاءِ سر نہیں۔

مروی ہے کہ حسین بن منصور رحمۃ اللہ علیہ رات دن میں چار سو رکعت فرائض مقررہ کی

طرح ادا فرماتے تھے۔ لوگوں نے عرض کیا: حضور! اتنی محنت آپ کیوں کرتے ہیں آپ تو مقرب خاص ہیں۔ فرمایا: یہ تمام رنج و راحت تمہارے حال میں ہے اور جو فانی الصفت ہو گیا ہو اس میں رنج و راحت کا کچھ اثر نہیں ہوتا۔ کاہلی اور سستی کا نام کمال نہیں اور عرض کو طلب کہنا صحیح نہیں۔ ایک نے کہا کہ میں نے اقتداء ذوالنون میں نماز گزاری۔ جب پہلی تکبیر اللہ اکبر کہی تو ایسا بیہوش ہو کر گرا گویا تن میں جان ہی نہیں۔

حضرت جنید رضی اللہ عنہ جب ضعیف ہوئے تو جوانی کے اوراد سے ایک ورد بھی ترک نہ کیا۔ لوگوں نے عرض کیا: حضور! آپ ضعیف ہو گئے ہیں لہذا بعض عبادات نافلہ ترک فرما دیجئے۔ فرمایا جو چیزیں ابتداء میں اللہ کے فضل سے میں نے حاصل کیں، محال ہے کہ اب انتہا میں چھوڑ دوں۔

مشہور ہے کہ فرشتے ہمیشہ عبادت میں ہیں اور ان کا مشرب ہی اطاعتِ حق ہے۔ ان کی غذا عبادت ہے اس لیے کہ وہ روحانی ہیں اور ان کا نفس نہیں جو انہیں طاعت سے منحرف کرے۔ اس لیے کہ مانع عبادت نفس ہوتا ہے، جس قدر وہ مقہور کر دیا جائے، بندگی کا راستہ اتنا ہی آسان ہو جاتا ہے۔ جب نفس فانی ہو جاتا ہے تو بندہ کی غذا، اس کا مشرب صرف عبادت ہو جاتا ہے۔ جیسے فرشتوں سے فناء نفس کی وجہ سے عبادت کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔

حضرت عبد اللہ بن مبارک فرماتے ہیں کہ مجھے یاد ہے کہ میں نے بچپن کے زمانہ میں ایک عورت عابدہ کو دیکھا کہ نماز میں اس کے جسم پر بچھونے چالیس جگہ ڈنک مارا مگر اس کے چہرے پر تغیر نہیں آیا۔ جب وہ نماز سے فارغ ہوئیں تو میں نے کہا: اماں جان! آپ نے اسے دور کیوں نہ کر دیا؟ وہ فرمانے لگیں: صاحبزادے! تم بچے ہو، تمہیں معلوم نہیں اللہ تعالیٰ کے کام میں اپنا کام کرنا ناجائز ہے۔

حضرت ابو الخیر قطع کے پائے مبارک میں مرض آکله ہو گیا (یہ ایسا خبیث مرض ہے کہ گوشت گل کر گرتا ہے اور اس کا علاج سوائے قطع کے نہیں ہوتا) طبیبوں نے پاؤں کا ثنا تجویز کیا۔ آپ نے منظور نہ فرمایا۔ مریدوں نے کہا جب شیخ ابو الخیر نماز میں ہوں اس وقت پاؤں کا ثنا جائے اس لیے کہ اس حال میں آپ کو اپنی خبر نہیں ہوتی۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ جب آپ نماز سے فارغ ہوئے تو پیر کٹا ہوا پایا۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے متعلق مروی ہے کہ جب آپ نماز پڑھتے تو قرأت ہلکی آواز سے کرتے اور فاروق اعظم رضی اللہ عنہ بلند آواز سے قرأت کرتے۔ حضور ﷺ نے

دونوں سے اس کا سبب پوچھا۔ صدیقؑ نے جواب دیا۔ یَسْمَعُ مَنْ أَنَا جِی "وہ سننے والا ہے جس کے حضور میں مناجات کرتا ہوں"۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا۔ اَوْ قِطُّ الْوَسْطَانِ وَ اطْرُدُ الشَّيْطَانَ "سوتوں کو جگانا چاہتا ہوں اور شیطان کو بھگانا"۔ اس پر حضور ﷺ نے فرمایا: صدیق! تم کچھ اونچی کرو اور عمر! تم کچھ قرأت ہلکی کر دو۔ یعنی میانہ آواز میں قرأت کیا کرو۔

تو بعض گروہ جو نوافل پوشیدہ کرتا ہے اور فرائض ظاہر کر کے پڑھتا ہے اس میں ان کی فشاءِ ریا سے بچنا ہوتا ہے۔ جب کسی عمل میں ریاکاری آجائے تو وہ عمل ضائع ہو جاتا ہے۔ چنانچہ بعض کہتے ہیں کہ ہماری عبادات و ریاضات اگر ایسی صورت میں ہوں کہ خلق دیکھے تو یہ بھی ریا ہے۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ ریا باطل ہے اور اطاعتِ حق میں محض باطل کے خوف سے حق پوشیدہ کرنا محال ہے تو ریا کو دل سے دور کرنا چاہئے اور عبادت سراپا اعلانیہ جب چاہے کرنی چاہئے:

ایک شیخ فرماتے ہیں کہ میں نے چالیس سال سفر کیا۔ کوئی نماز جماعت کے بغیر نہیں گذاری۔ اور ہر جمعہ کو قصبہ میں رہا۔

غرضیکہ اس کے حکم شمار میں نہیں آتے اور جو نماز میں ہے وہ مقامِ محبت میں ہوتا ہے، اب ہم اس کے حکم کا بیان کرتے ہیں۔ اِنْ شَاءَ اللَّهُ الْعَزِيزُ



محبت اور متعلقاتِ محبت

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَنْ يَرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِينِهِ فَسَوْفَ يَأْتِي اللَّهَ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ﴾ (۱) ”اے ایمان والو! جو کوئی تم میں سے اپنے دین سے پھر جائے گا تو اللہ تعالیٰ ایسی قوم کو لائے گا جو اللہ سے محبت کرے گی اور اللہ ان سے محبت کرے گا۔“ اور فرماتا ہے: ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَتَّخِذُ مِنْ دُونِ اللَّهِ أَنْدَادًا يُحِبُّونَهُمْ كَحُبِّ اللَّهِ﴾ (۲) ”اور کچھ لوگ وہ ہیں جو اوروں کو اللہ کا مد مقابل بناتے ہیں، محبت کرتے ہیں ان سے جیسے محبت کرنا چاہیے اللہ سے۔“ اور حضور ﷺ نے فرمایا کہ جبرئیل علیہ السلام نے مجھے کہا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

مَنْ أَهَانَ لِي وَلِيًّا فَقَدْ بَارَزَنِي بِالْمُحَارَبَةِ وَمَا تَوَدَّدْتُ فِي شَيْءٍ
كَتَرَدُّدِي فِي قَبْضِ نَفْسِ عَبْدِي الْمُؤْمِنِ يَكْرَهُ الْمَوْتَ وَآكْرَهُ مَسَاءَ
تَهُ وَلَا بُدْلَهُ مِنْهُ وَمَا يَتَّقَرُّبُ عَبْدِي بِشَيْءٍ أَحَبَّ إِلَيَّ مِنْ إِدَاءِ مَا
افْتَرَضْتُ عَلَيْهِ وَلَا يَزَالُ عَبْدِي يَتَّقَرُّبُ إِلَيَّ بِالنَّوَافِلِ حَتَّى أُحِبَّهُ فَإِذَا
أَحْبَبْتُهُ كُنْتُ لَهُ سَمْعًا وَبَصَرًا وَيَدًا وَمُؤَيِّدًا. (۳)

۲۔ سورۃ البقرۃ: ۱۶۵

۱۔ سورۃ المائدۃ: ۵۴

۳۔ اس حدیث کا پہلا جز امام قضاوی مسند الشہاب ۲/ ۳۲۷ میں لائے ہیں (حدیث: ۱۳۵۶) اور ابن ابی الدنیانے کتاب الاولیاء میں، ابو نعیم نے حلیۃ الاولیاء میں، امام قشیری نے الرسالہ (ص: ۱۳۲) میں اور امام طبرانی نے المعجم الاوسط میں اسے روایت کیا ہے۔ امام بیہقی نے مجمع الزوائد ۱۰/ ۲۷۰ میں بروایت ہشام کنانی حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا گیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جبرائیل علیہ السلام سے انہوں نے اللہ تعالیٰ سے بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: مَنْ أَهَانَ لِي وَلِيًّا فَقَدْ بَارَزَنِي بِالْمُحَارَبَةِ وَمَا تَوَدَّدْتُ فِي شَيْءٍ كَتَرَدُّدِي فِي قَبْضِ نَفْسِ عَبْدِي الْمُؤْمِنِ يَكْرَهُ الْمَوْتَ وَآكْرَهُ مَسَاءَ تَهُ وَلَا بُدْلَهُ مِنْهُ وَمَا يَتَّقَرُّبُ عَبْدِي بِشَيْءٍ أَحَبَّ إِلَيَّ مِنْ إِدَاءِ مَا افْتَرَضْتُ عَلَيْهِ وَلَا يَزَالُ عَبْدِي يَتَّقَرُّبُ إِلَيَّ بِالنَّوَافِلِ حَتَّى أُحِبَّهُ فَإِذَا أَحْبَبْتُهُ كُنْتُ لَهُ سَمْعًا وَبَصَرًا وَيَدًا وَمُؤَيِّدًا۔

اپنی ”مسند“ میں حکیم ترمذی نے النوادر (ص: ۱۵۰) میں امام قشیری نے الرسالہ (ص: ۱۱۷) میں، ابو نعیم نے ”حلیۃ الاولیاء“ ۵/ ۱۱ میں، امام بیہقی نے الزهد (ص: ۱۷۱) میں بطریق عبدالواحد، امام ذہبی نے خالد بن مخلد کے تعارف میں المیزان میں، امام ابن جوزی نے العلل المتناہیۃ ۱/ ۳۲۱ میں، حافظ عسقلانی نے فتح الباری ۱۱/ ۳۲۱ میں بطریق انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے اور کہا ہے اسے ابو یعلیٰ، بزار اور طبرانی نے نقل کیا ہے اور اس کی سند میں ضعف ہے۔

”جس شخص نے میرے ولی کی توہین کی اس نے میرے ساتھ اعلانِ جنگ کیا مجھے کسی شے میں اتنا تردد نہیں ہوتا جتنا کہ ایک مومن کامل کی روح نکالنے میں، کیونکہ وہ موت کو ناپسند کرتا ہے، میں تکلیف دینا ناپسند کرتا ہوں، اس کے لیے موت کے بغیر چارہ نہیں اس لیے اس پر موت طاری ہوتی ہے، میرے زیادہ قریب وہی بندہ ہوتا ہے جو میری فرض کی ہوئی چیزوں کو پابندی کے ساتھ ادا کرتا ہے اور نوافل کے ذریعے میرا بندہ میرے قریب ہوتا رہتا ہے یہاں تک کہ میں اسے محبوب بنا لیتا ہوں اور جب میں اُسے محبوب بنا لیتا ہوں تو میں اس کے کان، آنکھ، ہاتھ اور زبان بن جاتا ہوں اور اس کی تائید کرنے والا ہو جاتا ہوں۔“

اور فرمایا کہ جبریل علیہ السلام نے یہ بھی کہا:

”مَنْ أَحَبَّ لِقَاءَ اللَّهِ أَحَبَّ اللَّهُ لِقَائَهُ وَمَنْ كَرِهَ لِقَاءَ اللَّهِ كَرِهَ اللَّهُ لِقَائَهُ“
 ”جو اللہ سے ملنا پسند کرے اللہ اس سے ملنا پسند کرتا ہے اور جو اللہ سے ملنا پسند نہ کرے اللہ اس سے ملنا پسند نہیں کرتا۔“

اور فرمایا:

إِذَا أَحَبَّ اللَّهُ الْعَبْدَ قَالَ لِجِبْرِئِيلَ يَا جِبْرِئِيلُ إِنِّي أَحْبُّ فَلَانًا فَأَجِبْهُ
 فَيُجِبُّهُ جِبْرِئِيلُ ثُمَّ يَقُولُ جِبْرِئِيلُ لِأَهْلِ السَّمَاءِ إِنَّ اللَّهَ تَعَالَى قَدْ أَحَبَّ
 فَلَانًا فَأَجِبُوهُ أَهْلُ السَّمَاءِ ثُمَّ يَضَعُ لَهُ الْقُبُولَ فِي الْأَرْضِ فَيُجِبُّهُ
 أَهْلُ الْأَرْضِ وَفِي بَعْضِ الرُّوَايَاتِ مِثْلُ ذَلِكَ. (۱)

”اور جب اللہ تعالیٰ کسی کو دوست بناتا ہے تو جبریل علیہ السلام کو حکم دیتا ہے کہ میں فلاں کو اپنا دوست بناتا ہوں تو بھی اُسے اپنا دوست رکھ، تو جبریل علیہ

۱۔ امام بخاری اور امام مسلم نے اپنی اپنی صحیح میں حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے: مَنْ أَحَبَّ لِقَاءَ اللَّهِ أَحَبَّ اللَّهُ لِقَائَهُ وَمَنْ كَرِهَ لِقَاءَ اللَّهِ كَرِهَ اللَّهُ لِقَائَهُ۔ حوالہ کے لیے: صحیح البخاری (حدیث ۶۵۰۷) صحیح مسلم (حدیث: ۲۶۸۴، ۲۶۸۵) جامع الترمذی (حدیث: ۱۰۷۳) سنن النسائی (۹/۴، ۱۰) سنن ابن ماجہ (حدیث: ۴۲۶۳) من حدیث عبادة و حدیث ابی هريرة رضی اللہ عنہ (مسند احمد بن حنبل ۲/۳۳۶، ۳۳۶/۶، ۵۵، ۲۰۷، ۲۱۸، ۲۳۶، المقاصد الحسنة للسخاوی (ص: ۳۹۵) (حدیث: ۱۰۵۲) التذكرة للزرکشی (ص: ۱۰۵۲) مسند الشہاب ۶۵/۱ (حدیث: ۳۰۲)

السلام اسے محبوب کرتے ہیں اور آسمان والوں کو کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فلاں کو دوست رکھتا ہے پھر آسمان والے اُسے دوست رکھتے ہیں۔ پھر زمین بھر میں وہ مقبول ہو جاتا ہے، اور ایسی روایتیں چند جگہ ہیں۔“

اب سمجھ لو کہ محبتِ الہی بندہ کے حق میں، اور بندہ کی محبت اللہ تعالیٰ کے ساتھ، کتاب و سنت سے ثابت ہے اور امت کا اس پر اجماع ہے کہ اللہ تعالیٰ کے جو دوست ہیں انہیں اللہ تعالیٰ بھی دوست رکھتا ہے بلکہ اس کے دوستوں کے دوستوں کو بھی محبوب رکھتا ہے اور لغوی تحقیق یہ ہے کہ محبت ماخوذہ سے بکسر حاء، اور وہ ان بیجوں کو کہتے ہیں جو صحرا میں زمین پر گر جاتے ہیں، تو حُب کو حُب اسی لیے کہتے ہیں کہ اہل محبت انہیں میں سے ہیں، جیسے نبات صحرا انہیں دانوں میں ہوتی ہے۔

جس طرح تخم صحرا میں بکھیرا جاتا ہے اور خاک میں پنہاں ہو جاتا ہے۔ پھر بارشیں اس کی کوئلیں نکالتی ہیں اور آفتاب اسے گرم کر کے سرما و گرما کے موسم میں اسے سرسبز رکھتا ہے اور اس پر موسمی تغیرات اثر انداز نہیں ہوتے حتیٰ کہ ان کا موسم آتا ہے۔ وہ اُگتی ہے اور پھول پھل لاتی ہے۔ ایسے ہی محبت دل میں مسکن پکڑتی ہے اور حضور و غیبت، بلا و محنت، راحت و لذت، فراق و وصال سے متغیر نہیں ہوتی۔ اس معنی میں یہ شعر خوب ہے۔

يَا مَنْ سَقَامُ جُفُونِهِ لِسَقَامِ عَاشِقِهِ طَيْبُ

جَرَبِ الْمَوَدَّةِ فَاسْتَوَىٰ عِنْدِي حُضُورُكَ وَالْمَغِيبُ

”اے وہ ذات کہ اس کی پلکوں کی مستی اس کے عاشق کی پیاریوں کے لیے

طیب ہے۔ جاری ہو گئی دوستی تو برابر ہے میرے نزدیک حضور و غیب۔“

اور یہ بھی کہتے ہیں کہ حُب ایسی حب (جو ہڑ) سے مشتق ہے جس میں پانی بھرا ہوا ہو اور باہر کے چشمے کا پانی اس میں نہ آسکے اور اندر کا پانی اس کا مانع ہو۔ ایسے ہی دوستی ہے کہ جب طالب کے دل میں آجائے اور بھر جائے تو بجز حدیثِ دوست اس کے دل میں کسی غیر کی جگہ ہی نہ ہو۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے خلیل علیہ السلام کو خلعتِ خلت سے ایسا نوازا کہ انہیں خدمتِ حق تعالیٰ کے سوا کسی کی گنجائش نہ تھی اور تمام عالم ان سے محبوب تھا۔ حتیٰ کہ اس ایک ذات کی محبت میں دشمن بھی محبوب تھا اور حال گفتار نے ان کی ہم کو خبر دی اور فرمایا: ﴿فَالْتَمَسُوهُ لِيَّ إِلَّا رَبَّ الْعَالَمِينَ﴾ (۱) ”تحقیق وہ میرے دشمن ہیں مگر رب العالمین۔“

اور حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: سَمِيَّتِ الْمَحَبَّةُ لِأَنَّهَا تَمْحُو مِنَ الْقَلْبِ مَا

سَوَى الْمَحْبُوبِ۔ ”محبت کا نام محبت اس لیے رکھا گیا کہ وہ دلوں سے ماسوائے محبوب کے سب کو مٹا دیتی ہے۔“ اور یہ بھی کہتے ہیں کہ حب نام ان چار لکڑیوں کا ہے جو چوکھٹے کی شکل میں جوڑ کر اس پر پانی کا کوزہ رکھتے ہیں (گھڑوچی) اس لیے کہ محبت، عزت، ذلت، رنج، راحت، بلا، محنت، جفاء، وفا، دوست کے تحمل کا نام ہے اور وہ محبت کرنے والے پر گراں نہیں ہوتے تو اس کا کام وہ ہے جو لکڑی کے چوکھٹے کا کام ہے کہ چاروں جوڑ کر بوجھ کوزے کا اٹھاتی ہیں۔

تو محبت کی ترکیب اور پیدائش، دوست سے برداشت کرنے کو ہوتی ہے۔ اس پر کسی نے کہا ہے:

إِنْ شِئْتَ جُودِي وَإِنْ شِئْتَ فَمَا مَنَعِي

كَلَاهُمَا مِنْكَ مَنْسُوبٌ إِلَى الْكَرَمِ

اور یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ حب سے مشتق ہے اور اس کی جمع حبہ ہے اور حبہ دل محل لطیف ہے اور قوام دل اس کے ساتھ ہے اور اقامت محبت بھی اسی سے ہے۔ تو محبت کو اس کے نام کی جگہ حب کہتے ہیں اس لیے کہ اس کا قرار حبہ دل میں ہے اور عرب عموماً ہر چیز کا نام اس کے موضع کے نام پر کرتے ہیں اور یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ ماخوذ ہے: حَبَاءُ الْمَاءِ وَغَلْيَانُهُ عِنْدَ الْمَطَرِ الشَّدِيدِ ”پانی کے جوش سے اور اس کے اُبلنے سے تیز بارشوں کے وقت“۔ تو محبت کو حب اسی لیے کہتے ہیں: لِأَنَّهُ غَلْيَانُ الْقَلْبِ عِنْدَ الْإِشْتِيَاقِ إِلَى لِقَاءِ الْمَحْبُوبِ ”کہ اس کا جوش، دل میں اس اشتیاق پر ہوتا ہے کہ وہ محبوب سے ملے۔“ اور اشتیاق رویت دوست میں مضطرب ہوتا ہے جیسے اجسام ارواح کے لیے مشتاق ہوتے ہیں۔ یا جیسے قیام جسم روح پر ہوتا ہے اور قیام دل محبت کے ساتھ اور قیام محبت رویت و وصل محبوب سے۔ اس معنی میں کسی نے کہا ہے۔

إِذَا مَاتَمَنَى النَّاسُ رَوْحًا وَرَاحَةً

تَمَنَّى أَنْ أَلْقَاكَ يَا عَزُّ خَالِيَا

اور یہ بھی کسی نے کہا ہے کہ حب ایک وہ نام ہے جو دوستی کی صفائی پر موضوع ہے۔ جیسے عرب صفاء بیاض (۱) چشم انسان کو ”حَبَّةُ الْإِنْسَانِ“ کہتے ہیں۔ ایسے ہی صفائی سوادِ دل کو ”حَبَّةُ الْقَلْبِ“۔ تو یہ ایک محل محبت ہے اور وہ ایک محل رویت۔ اسی وجہ میں کہتے ہیں کہ دل اور دیدہ دوستی میں مقارن ہوتے ہیں اور اس معنی میں کسی نے کہا۔

الْقَلْبُ يَحْسُدُ عَيْنِي لِدَّةِ النَّظَرِ

وَالْعَيْنُ تَحْسُدُ قَلْبِي لِدَّةِ الْفِكْرِ

فصل:

اچھی طرح یاد رکھو کہ محبت کے لفظ کا استعمال علماء کے طبقہ میں چند معنی پر ہوتا ہے۔ ایک بمعنی ارادت جو محبوب کی طرف ہو جس سے سکونِ نفس اور آرزوئے دل اور ہوائے نفسانی کا میلان و انس اور تعلق پیدا کیا جائے۔ یہ تو قدماء سے ممنوع و ناروا ہے اور یہ عامہ مخلوق سے ایک دوسرے ابناء جنس میں ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس قسم کی محبت اور روابط سے برتر و بالا ہے۔ تَعَالَى اللّٰهُ عُلُوًّا كَبِيْرًا۔ دوسرے محبت بمعنی احسان ہے جو بندہ پر منجانب اللہ وارد ہوتی ہے اور اس سے بندہ برگزیدہ کر لیا جاتا ہے جس کی بدولت وہ کمال ولایت حاصل کر لیتا ہے اور گونا گوں کرامتوں سے مخصوص فرمایا جاتا ہے۔

تیسری قسم بمعنی ثناء جمیل ہے جو بندہ کی کی جائے۔

ایک گروہ متکلمین کا کہتا ہے کہ محبت حق کی ہمیں خبر دی گئی ہے۔ اگر کتاب و سنت کے ذریعہ وہ ہمیں نہ پہنچتی تو اس کا وجود حق تعالیٰ کے ساتھ معلوم کرنا بذریعہ عقل محال تھا۔ بہر حال ہم اُسے عقیدتاً تسلیم کرتے ہیں لیکن اس میں تصرف کرنے کے معاملہ میں ہم توقف کرتے ہیں اور درحقیقت محبت کا اطلاق حق تعالیٰ کی ذات کے ساتھ حقیقتاً صحیح نہیں بلکہ یہ صرف اقاویل ہیں کہ ہم انہیں یاد کر لیں اور میں تمہیں اس کی حقیقت بیان کرتا ہوں۔ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ تَعَالَى

اچھی طرح سمجھ لو کہ بندہ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی محبت کا جہاں بھی ذکر ہے یہ اس کی طرف سے ارادہ خیر اور رحمت کرنے کے معنی میں ہے، جو بندہ پر کی جائے۔ اور محبت ایک نام ہے ارادہ رضاء الہی کا۔ جیسے رضا اور سخط، رحمت اور رافت اور مثل اس کے جو الفاظ بھی اس قسم کے ہیں ارادہ حق کے سوا کسی جگہ اور معنی نہیں لینے چاہئیں اور ارادت بھی ایک صفت قدیم ہے کہ اسے مشیت حق کے ساتھ منتسب کر سکتے ہیں تو بطور مبالغہ اظہار مشیت حق میں اس قسم کے الفاظ مستعمل ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ محبت الہی بندہ کے لیے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بندہ پر نعمتیں کافی وافی نازل فرمائے اور اسے دنیا و عقبیٰ میں ثواب بے نہایت عطا فرمائے اور عذاب سے مامون کرے اور انتہاء اس کی یہ ہے کہ بندہ کو معصیت سے معصوم رکھے (جیسے انبیاء کرام) اور اس کے بلند احوال اور اعلیٰ مقامات کر دے اور اس کا راز سری اغیار سے پاک فرمائے اور عنایت ازلی اس کے لیے لازم فرمائے تاکہ وہ کُل سے مجرد ہو جائے اور طلبِ رضائے حق میں اُسے منفرد کر دے۔

جب اللہ تعالیٰ بندہ کو اس معنی میں مخصوص کر لیتا ہے اور وہ تخصیص اس پر خاص ہو جاتی ہے

تو اس کا نام مذہب محاسبی اور جنید میں ”محبت“ رکھا گیا ہے اور ایک جماعت اس کی موید ہے اور فقہا و متکلمین سنت بھی اس پر ہیں۔ اور جو کہتے ہیں کہ محبت حق جل مجدہ، بمعنی ثناء جمیل ہے جو بندہ کے لیے اس کے کلام حق نظام سے واضح ہو اور اللہ تعالیٰ کا کلام نا مخلوق ہے۔ اور جو کہتے ہیں کہ محبت بمعنی احسان الہی ہے وہ بندہ پر منجانب اللہ ہوتا ہے اور معنی کی رو سے یہ سب اقوال باہم قریب المعنی ہیں۔ لیکن بندہ کی محبت اللہ تعالیٰ سے وہ ہے جو مومن مطیع کے دل میں پیدا ہوتی ہے اور تعظیم و تکریم کے معنی میں مستعمل ہوتی ہے تاکہ بندہ محبوب کی رضا طلب کرے اور اس کی طلب رویت میں محو اور بے خبر ہو جائے اور آرزو کی قربت میں بے قرار ہو اور اس کے دل میں اس کے سوا کسی کی گنجائش نہ ہو اور اسی کے ذکر میں گم رہے اور اس کے ماسوا سب سے بیزار ہو اور اس کے تصور میں آرام اس پر حرام ہو اور تمام مالوفات و مستانسات منقطع ہو جائیں اور حرص و آرز سے اعراض ہونے لگے اور اپنے سلطان حقیقی سے دوستی رکھے اور اپنے دوست کے حکم کے آگے گردن اطاعت جھکائے رکھے اور اس کے اوصاف کمال کو پہچانے۔ اور یہ روا نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ شانہ کی محبت کو باہمی مخلوق کی محبت کی طرح جانے۔ اس لیے اس میں احاطہ ادراک محبوب کی طرف میلان ہوتا ہے اور یہ صفت اجسام سے ہے۔ مجاہد حق اس کے قرب کی آرزو میں رہتے ہیں نہ کہ طالبان کیفیت ذات۔ اس لیے کہ طالب بخود قائم ہوتا ہے دوستی میں، اور طالب فنا ہو کر محبوب کے ساتھ قائم ہیں۔ اور عموماً دوستان حق میدان محبت میں ہلاک و مقہور ہوتے ہیں۔ تو محبت دو طرح پر ہوتی ہے: ایک جنس کی جنس سے محبت اور میلان نفس کا وطن کی طرف ہے۔ دوسرے نا جنس کی محبت جس میں محبوب کے اوصاف سے کسی صفت کے ساتھ آرام و انس کرے۔ جیسے بدون کلام سننا، بدون آنکھ دیکھنا اور جو گردیدہ محبت حق ہیں وہ دو قسم ہیں:

ایک وہ کہ حق کا انعام اور احسان اپنے شامل حال دیکھے اور اس کے دیکھنے سے منعم اور محسن کی محبت کا تقاضا ہو۔ دوسرا وہ جو ہر انعام کو دوستی کے حق میں حجاب جانے اور نعمت کے دیکھنے سے اُن کی راہ منعم کی طرف ہو اور یہ راہ منعم سے زیادہ بلند ہے۔ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ

فصل:

لفظ محبت تمام اصناف خلق میں مروج اور تمام زبانوں میں مشہور ہے اور ارباب لغات سے بھی مذکور ہے اور عقلاء کی تمام صنفیں اپنے اندر محبت مخفی نہ کر سکے۔ اور اس گروہ کے مشائخ سے سمون الحب رضی اللہ عنہ ہیں، جو محبت کے مسئلہ میں خاص مذہب و مشرب مخصوص رکھتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں محبت راہ حق تعالیٰ میں اصل اصول ہے اور اس کے احوال و مقامات کی منزلیں ہیں اور

ہر منزل میں جبکہ طالب اس میں ہو، زوال روا ہو سکتا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کی محبت میں زوال جب تک طالب اس محل میں ہے، روا نہیں ہو سکتا۔ اور تمام مشائخ اس پر متفق ہیں۔

لیکن چونکہ لفظ محبت عام تھا اور ارباب ظاہر نے چاہا کہ اس کے معنی کا حکم خلقت میں چھپائیں تو اس کی تحقیق وجود معنی میں اس کے اسم کو بدل ڈالا۔ چنانچہ انہوں نے صفاء محبت کا نام صفوت رکھا اور محبت کو صوفی۔

ایک گروہ نے حبیب کا اختیار ثابت کرنے میں محبت کے اختیار کو ترک کرنا ہی فقر بتایا اور فقیر کا نام محبت رکھا۔ اس لیے کہ محبت میں درجات بہت کم درجہ موافقت ہے اور حبیب کی موافقت اور حب مخالفت کے برخلاف ہے۔ اور میں نے ابتداء کتاب فقر اور صفوت کا حکم بیان کر دیا ہے اور اسی بارہ میں پیر زکوٰۃ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے: **الْحُبُّ عِنْدَ الزُّهَادِ أَظْهَرُ مِنَ الْإِجْتِهَادِ**۔ ”حب زاہدوں کے نزدیک شہرت میں اجتہاد سے زیادہ ظاہر ہے۔“ **وَعِنْدَ السَّائِبِينَ أَوْجَدُ مِنْ أَيْنِ وَحَيْنٍ**۔ ”اور تائبوں کے نزدیک نالہ و فریاد سے زیادہ آسان ہے۔“ **وَعِنْدَ الْأَقْرَابِ أَشْهَرُ مِنَ الْفُتْرَاكِ**۔ ”اور ترکوں کے نزدیک ان کی آگے سواری سے زیادہ مشہور ہے۔“ **وَسَبِي الْمُحِبِّ عِنْدَ الْهُنُودِ أَظْهَرُ مِنْ سَبِي الْمَحْمُودِ وَزَخْمٍ وَنَهَبٍ**۔ ”اور محبت کی قید ہنود کے نزدیک محمود کی قید اور زخم اور لوٹ مار سے زیادہ مشہور ہے۔“ **وَقِصَّةُ الْحُبِّ وَالْمُحِبِّ عِنْدَ الرُّومِ أَشْهَرُ مِنَ الصَّلِيبِ**۔ ”اور قصہ حب و حبیب روم میں صلیب سے ظاہر تر ہے۔“ **وَقِصَّةُ الْحُبِّ فِي الْعَرَبِ آدَبٌ فِي كُلِّ حَيٍّ مِنْهُ طَرَبٌ أَوْ نَيْلٌ أَوْ هَرَبًا أَوْ حَزَنٌ**۔ ”اور قصہ محبت عرب میں ہر جماعت کے اندر یا خوشی کے اندر یا خوشی یا غم یا نیکی یا افسوس کے ساتھ موجود ہے۔“

ان تمام ضرب الامثال سے یہ مراد ہے کہ کوئی جنس انسان سے نہیں جسے غیب میں کام نہ پڑا ہو، کوئی دل ایسا نہیں جس میں فرحت محبت یا زخم محبت نہ ہو اور کوئی ایسا نہیں جس کا دل اس شراب سے مست نہ ہو یا اس کے غلبہ سے مخمور نہ ہو۔ اس لیے کہ دل مرکب ہی اطمینان و اضطراب سے ہے اور عقد دوستی کی شراب اس میں لازمی ہے، بلکہ دل کے لیے محبت طعام و شراب کے بجائے ہے اور جو دل خالی از محبت ہے وہ دل دل ہی نہیں بلکہ خراب اور ویرانہ ہے، اس کے حاصل کرنے یا دور کرنے میں کسی تکلیف کو راہ نہیں اور نفس کو ان لطائف سے جو دل پر گزرتے ہیں اطلاع نہیں۔

اور عمرو بن عثمان رضی اللہ عنہ نے محبت کے باب میں لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دل کو جسم سے سات ہزار سال پہلے پیدا فرمایا اور مقام قرب میں رکھا اور جانوں کو دلوں سے سات ہزار سال پہلے پیدا فرما کر درجہ وصل میں رکھ کر ہر روز تین سو ساٹھ بار ان پر ظہور جمال فرمایا اور انہیں تین

سوساٹھ بار نظر سے سرفراز کیا اور کلمہ محبت اسے سنایا اور تین سوساٹھ لطیفہ انس اس پر ظاہر و منکشف کیے۔ حتیٰ کہ کائنات پر نگاہ کر کے فیصلہ کیا کہ اپنے سے زیادہ کسی کو اس کا اہل نہ پایا تو اس میں فخر اور غرور پیدا ہوا تو اللہ تعالیٰ نے ان سب کا امتحان فرمایا اور سر کو جان میں مقید کیا اور جان کو دل میں اور دل کو تن میں رکھ کر عقل سے انہیں مرکب کیا۔ پھر انبیاء کرام معبود فرمائے اور اپنے احکام بھیجے تو ہر ایک اپنے اپنے مکان میں اسی کا متلاشی ہوا۔ حق تعالیٰ نے انہیں نماز کا حکم دیا تاکہ جسم نماز میں ہو اور دل محبت میں اور جان قربت میں اور سروصل میں۔

غرضیکہ محبت کے لیے الفاظ نہیں جو عبارت میں لائے جاسکیں۔ اس لیے کہ محبت حال ہے اور حال قال میں نہیں آسکتا۔ اگر سارا جہان مل کر محبت کو اپنی طرف کھینچنا چاہے تو ممکن نہیں اور کوشش کرے کہ اُسے دفع کر دے تو بھی جہان بھر کے قبضہ میں نہیں۔ کیونکہ وہ وہی چیز ہے، نہ مکاسب کے ذریعہ آتی ہے نہ دفع ہو سکتی ہے۔ وہ الہی ہے اور انسان لاءہی اور لاءہی، الہی کا ادراک نہیں کر سکتا۔

فصل:

لیکن عشق میں مشائخ کے بہت سے اقوال ہیں۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ بندہ کو عشق حق ہو سکتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کا کسی پر عاشق ہونا روا نہیں اور بندہ کو حق تعالیٰ سے روکا گیا ہے اور حق تعالیٰ بندہ سے نہیں روکا جاسکتا۔ تو عشق بندہ پر جائز ہے اور حق تعالیٰ پر نہیں۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ بندہ کا حق تعالیٰ پر عاشق ہونا بھی جائز نہیں ہے اس لیے کہ عشق نام ہے حد سے متجاوز ہونے کا اور حق تعالیٰ محدود نہیں کہ اس سے تجاوز ہو سکے۔ پھر متاخرین نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کا عشق دونوں جہانوں میں درست نہیں ہو سکتا۔ مگر ادراک ذات کا عشق ممکن ہے تو جو مدرک ہو وہ معشوق ہو سکتا ہے اور ذات حق تعالیٰ کا ادراک ممکن ہی نہیں۔ لہذا عشق بھی ممکن نہیں۔ اور یہ بھی قول ہے کہ عشق بلا دیدار صورت نہیں ہوتا اور محبت سننے سے بھی ہو سکتی ہے۔ تو جب عشق نظر سے ہوتا ہے تو حق تعالیٰ پر روا نہیں کیونکہ دنیا میں کوئی حق تعالیٰ کو دیکھ نہیں سکتا۔ جب یہ سمجھ لیا کہ وہ دیکھنے سے بالا ہے تو ہر ایک نے عشق بحق کو ممنوع کہہ دیا اس لیے کہ حق تعالیٰ شانہ ادراک وحس سے بالا ہے اس لیے اس کا عشق روا نہیں۔

جب اللہ تعالیٰ اپنے افعال و صفات سے احسان کرنے والا ہے اور وہ اپنے ولیوں پر احسان و اکرام فرماتا ہے تو اس کی محبت روا ہوئی اور عشق ممنوع۔ کیا تو نے نہیں دیکھا کہ جب یعقوب علیہ السلام یوسف علیہ السلام کی جدائی کے سبب مستغرق محبت ہوئے اور نظر جاتی رہی تو بچائے

فرقت ان کے پیرہن کی یو پا کر آنکھیں روشن ہو گئیں، اور جب زلیخا کو یوسف علیہ السلام کے عشق نے ہلاک کیا یا جب تک یوسف علیہ السلام کا وصل نہ پایا آنکھیں روشن نہ ہوئیں۔

یہ عجیب معاملہ ہے کہ ایک خواہش نفسانی کی پیروی کرتا ہے اور ایک خواہش نفسانی چھوڑتا ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے عشق کی ضد اور حق تعالیٰ کی ضد نہیں۔ اس لیے عشق اس پر جائز ہونا چاہئے اور اس پر بھی دلائل ہیں لیکن بوجہ اختصار اس پر کفایت کی گئی۔ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ

فصل:

اس گروہ کے مشائخ نے دوستی کی تحقیق میں بہت سی باتیں بیان کی ہیں۔ انہیں سے کچھ بیان کرتا ہوں، تمام کا احصاء تو نہیں ہو سکتا تا کہ تیر کا اس جگہ آجائے۔ ان شاء اللہ العزیز۔ حضرت اُستاد ابوالقاسم قشیری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: الْمَحَبَّةُ مَحْوُ الْمُحِبِّ بِصِفَاتِهِ وَاثْبَاتِ الْمَحْبُوبِ بِذَاتِهِ ”محبت یہ ہے کہ محبت اپنی صفتوں کو طلب محبوب میں محو کر دے اور محبوب کا اثبات اس کی ذات سے قائم کرے“۔ یعنی جب محبوب باقی ہوگا تو محبت لازمی فانی ہو جائے گا۔ اس لیے کہ بقاء ذات محبوب، غیر محبوب کی نفی کر کے اپنا تصرف مطلق کرے گا اور صفت محبت فنا ہو تو ذات محبوب کے سوا کچھ نہیں رہتا۔ اور یہ ہرگز روا نہیں کہ محبت اپنی صفت میں قائم رہے کیونکہ جو اپنی صفت سے قائم ہوتا ہے وہ جمال محبوب سے بے نیاز ہو جاتا ہے اور جب یہ جان لیتا ہے کہ اس کی حیات جمال محبوب سے ہے تو وہ بالضرور اسے اپنی صفات کی نفی اور محبوب کی ذات کا اثبات مطلوب ہوگا۔

اس لیے کہ وہ جانتا ہے کہ اپنی صفت ثابت ہونے سے محبوب عن المحبوب ہو جائے گا۔ اور مشہور ہے کہ حسین بن منصور رحمۃ اللہ علیہ کو جب سولی پر چڑھایا گیا تو ان کی زبان سے آخری جملہ یہ نکلے تھے: ”حُبُّ الْوَاحِدِ الْفَرَادُ الْوَاحِدِ“ یعنی ”ایک کی دوستی ایک کو یگانہ ماننا ہے۔“ محبت کے لیے یہ کافی ہے کہ اس کی ہستی دوستی کی راہ سے صاف ہو جائے اور نفس کا اختیار اس کی حالت شوق میں ہو اور وہ متلاشی رہے۔

ابویزید بسطامی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: الْمَحَبَّةُ اسْتِقْلَالُ الْكَثِيرِ مِنْ نَفْسِكَ وَ اسْتِكْثَارُ الْقَلِيلِ مِنْ حَبِيبِكَ۔ ”محبت یہ ہے کہ اپنی اکثر کو قلیل جانے اور دوست کی قلت کو کثرت سمجھے“۔ اور بندہ کو حق طریقہ سے یہ سمجھنا ضروری ہے۔ اس لیے نعمت دنیا کو جو بندہ کو ملتی ہے، قلیل فرمایا ہے: ﴿قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيلٌ﴾ (۱) ”فرمادے مجھے اے محمد ﷺ! دنیا کی متاع کم

ہے۔“ اور اس قلیل متاع میں تھوڑی عمر کے باوجود بندہ کی تھوڑی ذات کو بہت فرمایا ہے: ﴿وَالذَّكِرِينَ اللَّهُ كَثِيرًا وَالذَّكِرَاتُ﴾ (۱) ”یعنی ذکر کرنے والے اللہ کا بہت زیادہ، اور ذکر کرنے والیاں۔“ تاکہ سب کو معلوم ہو جائے کہ حقیقی دوست اللہ تعالیٰ ہے اور ایسی دوستی خلقت سے صحیح نہیں۔ اس لیے کہ جو چیز اللہ تعالیٰ سے بندہ کو ملے وہ کم نہیں اور خلقت سے جو کچھ ہو وہ بہت کم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے بندہ کی کم یاد کو بہت فرمایا اور اپنی بے حد نعمتوں کو کم کہا۔

حضرت سہل بن عبد اللہ تستری رحمۃ اللہ علیہ فرتے ہیں: الْمَحَبَّةُ مُعَانَقَةُ الطَّاعَاتِ وَمُبَايَنَةُ الْمُخَالَفَاتِ. ”محبت یہ ہے کہ محبوب کی اطاعت سے معانق رہے اور مخالف امور سے مجتنب رہے۔“ اس لیے کہ جب دل میں دوستی کی قوت زیادہ ہوتی ہے تو دوست کا حکم آسان ہو جاتا ہے۔ اور جو ملحدین کا یہ قول ہے کہ بندہ دوستی میں اس درجہ پر پہنچ جاتا ہے کہ اطاعت اسے معاف ہو جاتی ہے، یہ خالص زندقہ ہے۔

اس لیے کہ یہ محال ہے کہ صحتِ عقل کی حالت میں تکلیف کا حکم بندہ سے ساقط ہو جائے۔ اس امر پر سب کا اتفاق ہے کہ شریعت محمدیہ کبھی منسوخ نہیں ہوتی اور جب ایک شخص سے صحتِ عقل کی حالت میں اس شریعت کا حکم ساقط ہونا جائز ہو تو سب سے جائز ہوگا۔ یہ خیال خالص زندقیوں کا ہے البتہ مدہوش اور مغلوب العشق افراد کا اور حکم ہے (جیسے مجذوب) اور معتوہ العقل (پاگل مجنون) یا اس قسم کے دیگر امراض کا عذر۔ لیکن یہ ہرگز جائز نہیں کہ اللہ تعالیٰ بندہ کی دوستی میں یہ آزادی دے کہ اطاعت کی تکلیف سے اُسے مستثنیٰ کر کے حکمِ اطاعت اس پر ساقط کر دے بلکہ جتنی محبت زیادہ قوی ہوگی، اطاعت کرنے کی اتنی ہی توفیق اس پر آسان ہوگی۔

یہ حقیقت حضور ﷺ کی حالت میں ظاہر ہے کہ جب حق تعالیٰ نے لَعْمُوكَ فرما کر جان پاک کی قسم یاد فرمائی تو حضور ﷺ نے رات دن سب کام چھوڑ کر عبادت زیادہ فرمائی، حتیٰ کہ پائے اقدس متورم ہو گئے۔ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ﴿طَهَّرَهُ مَا أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْآنَ لِتَشْقَى﴾ (۲) ”اے ماہِ کامل! ہم نے قرآن کریم تم پر اس لیے نازل نہیں فرمایا کہ تمہیں مشقت میں ڈالے“ کا خطاب ہوا۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تعمیلِ حکم کرتے ہوئے بجا آوری حکم کا خیال نہ رہے۔ جیسا کہ حضور ﷺ نے فرمایا: إِنَّهُ لَيَغَانُ عَلَى قَلْبِي وَإِنِّي لَأَسْتَغْفِرُ اللَّهَ فِي كُلِّ يَوْمٍ سَبْعِينَ مَرَّةً (۳) ”بے شک میرا دل محبوب ہو جاتا ہے اور میں ہر روز ستر مرتبہ اللہ سے بخشش طلب کرتا

ہوں۔“ اور یہ بایں سبب ہوتا تھا کہ حضور ﷺ اپنے اعمال پر نظر نہیں فرماتے تھے تاکہ اپنی اطاعت پر کوئی گمان نہ ہو جائے بلکہ امر حق کی عظمت کی طرف نگاہ فرماتے اور یہ عرض کرتے کہ میرے اعمال اس جناب کے لائق نہیں۔

سنون محبت رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ذَهَبَ الْمُحِبُّونَ لِلَّهِ إِلَى شَرَفِ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ لِأَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: الْمَرْءُ مَعَ مَنْ أَحَبَّ. ”اللہ کے محبت دنیا و آخرت کے شرف کی طرف گئے ہیں کیونکہ حضور ﷺ نے فرمایا: انسان اس کے ساتھ ہوتا ہے جس سے وہ محبت رکھے۔“ تو یہ لوگ دنیا اور عاقبت میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہوتے ہیں اور اس میں خطار و انہیں مگر جو پہلے ہو گئیں تو دنیا کا شرف وہ ہے کہ حق تعالیٰ ان کے ساتھ ہے اور عاقبت کا شرف یہ کہ حق کے ساتھ ہوتے ہیں۔

اور حضرت یحییٰ بن معاذ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: حَقِيقَةُ الْمَحَبَّةِ مَا لَا يَنْقُصُ بِالْجَفَاءِ وَلَا يَزِيدُ بِالْبِرِّ وَالْعَطَاءِ ”محبت کی حقیقت یہ ہے کہ جفا، یار سے کم نہ ہو اور بخشش، عطا سے زیادہ نہ ہو۔“ یعنی اصلی محبت وہ ہے جو ظلم اور سختی سے کم نہ ہو۔ اس لیے کہ دونوں باتیں محبت میں سبب ہیں اور سبب وجود اعیان کی حکمت میں گم ہوتے ہیں اور دوست دوست کی بلا پر خوش ہوتا ہے اور محبت کی راہ میں جفا اور وفا برابر ہیں۔ جب محبت حاصل ہو جائے تو وفا مثل جفا اور جفا مثل وفا ہوتی ہے اور حکایتوں میں مشہور ہے کہ شبلی علیہ الرحمہ کو جنون کی تہمت سے شفا خانہ لے گئے اور آپ کو قابو کیا تو ایک گروہ آپ کی زیارت کو آیا۔ آپ نے فرمایا: مَنْ أَنْتُمْ قَالُوا أَحِبَّاءُكَ فَرَمَّا هُمْ بِالْحِجَارَةِ فَفَرُّوا. ”تم کون ہو؟ وہ بولے: ہم آپ کے دوست ہیں، آپ نے انہیں پتھروں سے مارا، وہ بھاگ گئے۔“ تو حضرت شبلیؒ نے فرمایا: لَوْ كُنْتُمْ أَحِبَّائِي لِمَ فَرَدْتُمْ مِنْ بَلَائِي فَاصْبِرُوا مِنْ بَلَائِي. ”اگر تم میرے دوست ہو تو میری بلا سے کیوں بھاگتے ہو، صبر کرو اور بلا سہو۔“ کیونکہ دوست دوست کی بلا سے نہیں بھاگتے۔ اس باب میں بہت سے اقوال ہیں، لیکن میں اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِالصَّوَابِ

کشف حجاب ششم۔۔۔ زکوٰۃ

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ﴾ (۱) اور اس کی مانند آیتیں ہیں یعنی نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو۔ اور احادیث بھی بہت ہیں اور احکام فرائض ایمان سے ایک زکوٰۃ واجب ہے اس پر، جس پر واجب ہو جائے اس سے اعراض جائز نہیں۔ لیکن زکوٰۃ اتمام نعمت پر

واجب ہے۔ جب ۲۰۰ درہم چاندی کی مقدار ہو کہ نعمت تمام ہو جاتی ہے اور وہ نعمت تصرف کسی آدمی کے آجائے تو اس پر پانچ درہم واجب ہیں، جب اس پر ایک سال گزر جائے۔ اور بیس دینار طلائی بھی نعمت تمام ہے۔ اس سے نصف ادا کر دینا واجب ہے اور پانچ اونٹ بھی کامل نعمت ہے اس پر ایک بکری واجب ہے۔ وقس علی ہذا۔ لیکن مرتبہ پر بھی زکوٰۃ ہوتی ہے۔

حضور ﷺ نے فرمایا ہے: **إِنَّ اللَّهَ تَعَالَى فَرَضَ عَلَيْكُمْ زَكَاةَ جَاهِكُمْ كَمَا فَرَضَ عَلَيْكُمْ زَكَاةَ مَالِكُمْ (۱)** ”اللہ تعالیٰ نے تم پر تمہاری وجاہت کی زکوٰۃ واجب کی ہے جیسے مال کی زکوٰۃ واجب ہے“۔ اور حضور ﷺ نے یہ بھی فرمایا: **إِنَّ لِكُلِّ شَيْءٍ زَكَاةً وَزَكَاةُ الْبَيْتِ الضِّيَافَةُ (۲)** ”ہر شے پر زکوٰۃ ہے اور گھر کی زکوٰۃ مہمان داری ہے“۔ اور اصل میں زکوٰۃ نام ہے ادائے شکر کا، جو اس نعمت کی جنس سے ہو۔

- ۱۔ یہ الفاظ تو نہیں ملے لیکن ابن حبان رضی اللہ عنہ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے: **اِذَا كَانَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ دَعَا اللّٰهُ عَبْدًا مِنْ عِبِيدِهِ فَيَقِفُ بَيْنَ يَدَيْهِ ، فَيَسْأَلُهُ عَنِ جَاهِهِ كَمَا يَسْأَلُ عَنِ مَالِهِ .** امام سیوطی نے اللؤلؤ المصنوع میں ان الفاظ کے ساتھ ذکر کیا ہے: **زَكَاةُ الْجَاهِ اغَاثَةُ اللَّهْفَانِ .** اسی طرح امام شوکانی نے الفوائد المجموعہ میں ان الفاظ کے ساتھ بیان کیا ہے: **مِنْ عَظَمَتِ حَوَائِجِ النَّاسِ إِلَيْهِ فَلَمْ يَحْتَمَلْ عَرَضَ تِلْكَ النِّعْمَةِ لِلزَّوَالِ .** امام ابن حبان نے کتاب البحر وحمین میں معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے ان الفاظ کے ساتھ بیان کیا ہے: **مَاعَظَمَتِ نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلٰى عَبْدِ الْاَعْظَمَتِ مَوْوَنَةِ النَّاسِ عَلَيْهِ ، فَمَنْ لَمْ يَحْتَمَلْ تِلْكَ الْمَوْوَنَةَ فَقَدْ عَرَضَ النِّعْمَةَ لِلزَّوَالِ .** امام ذہبی نے اسے میزان اعتدال میں ذکر کیا ہے۔ حوالہ کے لیے ملاحظہ کریں: **الفوائد المجموعہ (ص: ۷۱، ۸۱) اللؤلؤ المصنوع (ص: ۴۰) العلل المتناہیة لابن الجوزی ۲/۲، تاریخ بغداد للخطیب ۵/۱۸۱، کتاب المعجروحين لابن حبان ۱/۱۲۲، لسان المیزان للمحافظ العسقلانی ۱/۳۱۲۔**
- ۲۔ اسے امام ابن جوزی نے العلل المتناہیة ۸/۲ میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ اسے عبد الحمید نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے موقوفاً روایت کیا ہے جبکہ اس کی سند میں عبد اللہ بن عبد القدوس اور عبد الحمید مجہول الحال راوی ہیں، امام سیوطی نے اسے ”الجامع الصغير“ ۲/۱۲۴ میں ذکر کیا ہے اور امام رافعی کی طرف منسوب کیا ہے کہ انہوں نے حضرت ثابت رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے اور اسے ابن ابی شریح کی روایت سے موضوعات کے ذیل میں ذکر کیا ہے اور اس کے بارے میں کہا ہے کہ اسے احمد بن عثمان یا اس کے شیخ نے وضع کیا ہے اور اسی کی مثل امام ذہبی نے ”میزان الاعتدال“ ۱/۱۱۹ اور حافظ ابن حجر عسقلانی نے ”لسان المیزان“ میں احمد بن عثمان النہروانی کے تعارف میں کہا ہے۔ امام شوکانی نے ”تنزیہ الشریعة“ ۲/۱۴۱ امام مناوی نے ”فیض القدیور“ ۵/۲۸۵ میں اور شیخ البانی نے سلسلہ الاحادیث الضعیفة (۳۱۸) میں ذکر کیا ہے لیکن حضرت ثابتؓ سے اس کی ایک اور سند بھی ہے۔ ابن عساکر نے اسے (۲/۱۳/۳) ابو طالب عیسیٰ بن محمد الباقلائی سے صحیح سند کے ساتھ، انہوں نے حماد بن سلمہ سے، انہوں نے حضرت ثابت رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔

چنانچہ تندرستی بھی ایک نعمت ہے تو جسم کے ہر حصہ پر زکوٰۃ ہے۔ وہ اس طرح کہ اپنے تمام اعضاء کو عبادت میں مشغول رکھے اور لہو و لعب اور کھیل تماشہ میں ضائع نہ کرے تاکہ نعمت الہی کی زکوٰۃ ادا ہو جائے۔ پھر باطنی نعمت پر بھی زکوٰۃ لازم ہے۔ لیکن چونکہ یہ نعمت ایک ایسی بلند و بالا ہے کہ اس کی حقیقت کا شمار نہیں ہو سکتا لہذا اس کی زکوٰۃ ویسے ہو سکتی ہے کہ انسان نعمت کو پہچانے اور اسے نعمت جانے کہ وہ حد و شمار سے باہر ہے۔ تو اس کا شکر بھی حد و شمار سے زیادہ کرے اور وہ شکر گزاری ہے۔

غرضیکہ صوفیاء کرام کے یہاں دنیاوی نعمت کی زکوٰۃ دینا پسندیدہ نہیں۔ اس لیے کہ وہ بخل پسند نہیں کرتے اور بخل کامل سے جو بہت بڑی صفت ہے دو سو درہم ایک سال تک تحت تصرف لانے والا ہی پانچ درہم ادا کرے گا اور اہل کرم اتنا مال جمع ہی نہیں کرتے بلکہ جو کچھ پاس ہو سب خرچ کر ڈالتے ہیں، اور سخی کے پاس مال جمع نہیں ہو سکتا تو پھر وہ حد زکوٰۃ تک کیسے پہنچ سکتا ہے۔

حکایت:

ایک ظاہری عالم امتحاناً حضرت شبلیؒ سے سوال کرنے آیا کہ زکوٰۃ کیسے ادا کی جائے۔ آپ نے جواب دیا کہ جب بندہ میں بخل ہو اور مال جمع ہو جائے تو دو سو درہم چاندی سے پانچ درہم دینا چاہئے اور بیس دینار طلائی سے آدھا دینار۔ یہ تو تیرے مذہب کا مسئلہ ہے اور میرے مذہب میں تو کچھ ملک میں رکھنا ہی نہیں چاہیے تاکہ زکوٰۃ سے بچا رہے۔ عالم نے کہا اس مسئلہ میں آپ کا امام کون ہے۔ شبلی نے فرمایا کہ: ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اس مسئلہ میں میرے امام ہیں، کیونکہ ان کے پاس جو کچھ تھا سب اللہ کی راہ میں دے دیا اور حضور ﷺ نے جب فرمایا: مَا خَلَفْتُ لِعِيَالِكَ؟ ”ابو بکر! تم نے اپنے اہل و عیال کے لیے کیا چھوڑا؟ تو آپ نے عرض کیا: اَللّٰهُ وَ رَسُوْلُهُ (۱) ”اللہ اور اس کا رسول کافی ہیں“۔

اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اپنے قصیدہ میں فرمایا۔

۱۔ اسے امام ترمذی اور امام ابو داؤد نے بطریق سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے: امرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم ان نتصدق و الفق ذلك عندی مالا ، فقلت الیوم اسبق ابا بکر ان سبقتہ یوماً ، قال : فجننت بنصف مالی ، فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم : ما ابقیت لاهلک ؟ فقلت مثله و اتی ابو بکر بکل ما عنده فقال : یا ابا بکر ما ابقیت لاهلک ؟ فقال : ابقیت لهم اللہ و رسوله قلت : لا اسبقه الی شیء ابدأ (مشکوٰۃ المصابیح) ۱۷۰۰/۳ ، کتاب المناقب : باب مناقب ابی بکر رضی اللہ عنہ

فَمَا وَجِبَتْ عَلَى زَكَاةٍ مَالٍ وَهَلْ يَجِبُ الزَّكَاةُ عَلَى الْجَوَادِ

”مجھ پر زکوٰۃ واجب نہیں اور بخشش کرنے والے سخی پر زکوٰۃ کیا واجب ہو۔“

تو اہل جود و کرم کا مال خرچ ہو جاتا ہے اور ان کا خون بھی معاف ہوتا ہے۔ وہ نہ تو مال میں بخل کرتے ہیں اور نہ خون پر جھگڑتے ہیں، اس لیے وہ کسی چیز کو اپنی ملک نہیں جانتے۔ لیکن اگر کوئی جہالت سے یہ کہے کہ جب میرے پاس مال ہی نہیں تو میں علم زکوٰۃ کی کیوں پروا کروں۔ یہ اس کا کہنا صحیح نہیں اس لیے کہ علم حاصل کرنا فرض عین ہے اور علم سے بے پروائی کرنا کفر۔ فساداتِ زمانہ سے ایک یہ بھی فساد ہے کہ لوگ صلاحیت اور فقر کے مدعی ہیں اور اپنی جہالت سے علم چھوڑ دیتے ہیں۔

میں مبتدیانِ جماعت متصوفہ کو پڑھا رہا تھا۔ ایک جاہل بھی آکر بیٹھ گیا۔ میں زکوٰۃ میں اونٹ کا ذکر کر رہا تھا اور بنت لبون، بنت مخاص اور حقہ کے احکام بتا رہا تھا۔ اس جاہل کو ناگوار گزرا۔ وہ تنگ آ کر اٹھ گیا اور کہنے لگا میرے پاس اونٹ ہی نہیں تو بنت لبون وغیرہ کا علم میرے کس کام کا ہے!۔ میں نے کہا اوہ جاہل یہ اچھی طرح یاد رکھ کہ جس طرح زکوٰۃ دینے کے لیے علم کی ضرورت ہے اسی طرح لینے کے لیے بھی علم چاہیے۔ کیوں کہ اگر کوئی تجھے بنت لبون دے اور تو اسے لے تو اس وقت بھی تجھے علم کی ضرورت ہے۔ ترک علم سے یہاں بہت نقصان ہے۔

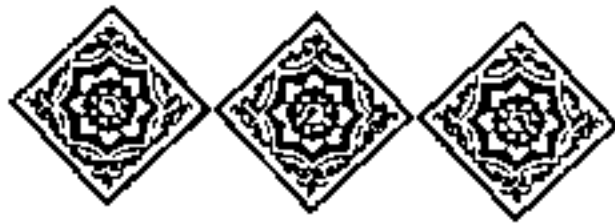
اسلام میں اگر کسی کے پاس مال نہ ہو اور اسے مال سے مناسبت نہ ہو تو بھی اس پر سے فرضیتِ علم ساقط نہیں ہوتی۔ فَتَعُوذُ بِاللَّهِ مِنَ الْجَهْلِ .

فصل:

مشائخِ صوفیاء (رحمہم اللہ) میں سے اکثر ایسے بھی گزرے ہیں جنہوں نے زکوٰۃ لی ہے اور ایسے بھی ہیں جنہوں نے زکوٰۃ نہیں لی۔ جنہوں نے خود فقرا اختیار کیا ہے وہ زکوٰۃ نہیں لیتے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم مال نہیں لیتے تاکہ ہم پر زکوٰۃ واجب نہ ہو جائے اور دنیا والوں سے بھی ہم زکوٰۃ نہیں لیتے کہ اس سے ان کا ہاتھ اونچا اور ہمارا ہاتھ نیچا ہوتا ہے اور جو فقراء اضطرار میں ہوتے ہیں تو وہ اگر لیتے ہیں تو اپنی ضرورت کے لیے نہیں لیتے بلکہ اس لیے لیتے ہیں کہ ہمارے یہاں مسلمان سے فرض ادا ہو جائے۔ تو اس صورت میں انہیں کا ہاتھ اونچا ہوتا ہے نہ کہ دینے والے کا اور اگر دینے والے کا ہاتھ اونچا ہوتا تو لینے والے کا نیچا تو اللہ تعالیٰ کا فرمان بے معنی ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿وَيَأْخُذُ الصَّدَقَاتِ﴾ (۱) ”اور لیتے ہیں زکوٰۃ۔“

تو چاہیے تھا کہ زکوٰۃ دینے والا لینے والے کی نسبت زیادہ فضیلت رکھتا، اور یہ اعتقاد میں گمراہی ہے تو اونچا ہاتھ وہی ہے جو مسلمان بھائی سے کچھ بحکم و جوہ لے تاکہ اس کا بوجھ اس کی گردن پر نہ رہے۔ یہ درویش عقبائی ہیں۔ اگر درویش عقبائی اہل دنیا سے نہ لیں تو ان پر فرض حکم بدستور ہے اور بروز قیامت گرفتار ہوں تو اللہ تعالیٰ نے عقبائی درویشوں کو تھوڑی سی ضروریات سے امتحان کیا تاکہ دنیا دار لوگ فرضیت کا بوجھ اپنی گردن سے اتار سکیں۔ تو ثابت ہوا کہ فقر کا ہاتھ اونچا ہے اور وہ بمطابق حکم شرع اپنا حق لیتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا حق اس پر واجب تھا۔

اگر لینے والے کا ہاتھ اونچا ہوتا جیسا کہ اہل ظواہر سمجھتے ہیں تو اس صورت میں پیغمبران اولوالعزم کے ہاتھ بھی نیچے ہوتے۔ بنا بریں ان کا یہ خیال بھی غلط ہے۔ وہ نہیں جانتے کہ انہوں نے جو لیا ہے وہ بامرحق لیا ہے اور ائمہ دین نے بھی یہی طریق جاری رکھا ہے، تو وہ غلطی پر ہیں۔ یعنی لینے والے کا ہاتھ نیچا اور دینے والے کا اونچا سمجھتے ہیں۔ اور یہ بحث چونکہ باب جو دوسخا سے متعلق ہے اس لیے میں کچھ بیان اس کے متعلق کرتا ہوں۔ وَ بِاللّٰهِ التَّوْفِیْقُ.



جو دوسخا

حضور ﷺ فرماتے ہیں:

السَّخِيُّ قَرِيبٌ مِّنَ الْجَنَّةِ وَبَعِيدٌ مِّنَ النَّارِ وَالْبَخِيلُ قَرِيبٌ مِّنَ النَّارِ
وَبَعِيدٌ مِّنَ الْجَنَّةِ (۱)

”سخی جنت کے قریب اور جہنم سے بعید ہے اور بخیل جہنم سے قریب اور جنت سے بعید ہے۔“

اور فرمایا: ”کافر سخی عند اللہ افضل من مومن بخیل“

”کافر سخی اللہ کے نزدیک مومن بخیل سے افضل ہے۔“

اور علماء کے نزدیک جو دوسخا مخلوق کی صفت میں ایک ہی معنی میں ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کو ”جواد“ کہہ سکتے ہیں ”سخی“ نہیں۔ اس لیے یہ نام اللہ تعالیٰ نے اپنا فرمایا نہ رسالت مآب ﷺ نے کسی حدیث میں بیان کیا۔ پھر اجماع اہل سنت نے کبھی یہ نام روانہ رکھا۔ یہ ایسے ہے جیسے اللہ تعالیٰ کے ناموں میں عالم آتا ہے، اسے عالم کہتے ہیں لیکن عاقل، فقیہ نہیں کہہ سکتے۔ اگرچہ یہ عالم، عاقل، فقیہ تینوں نام قریب قریب ایک ہی معنی رکھتے ہیں۔ ایسے ہی اللہ تعالیٰ جواد ہے تو اس میں

۱۔ اسے امام ترمذی نے، امام عقیلی نے ”کتاب الضعفاء“ میں، امام ابن حبان نے ”روضۃ العقلاء“ میں اور ابن عدی نے ”الکامل“ میں سعید بن محمد الوراق کے طریق سے، اس نے یحییٰ بن سعید سے، انہوں نے أعرج سے، انہوں نے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مرفوعاً روایت کیا ہے جبکہ امام ترمذی نے اسے ضعیف قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔ اسے امام سعید بن محمد کی سند کے علاوہ نہیں جانتے اور اس میں بھی مخالفت کی گئی ہے کہ یہ حدیث سعید بن محمد کی روایت کردہ ہے۔ اس نے یحییٰ بن سعید سے روایت کیا ہے لیکن بلاشبہ یحییٰ بن سعید عن عائشہ رضی اللہ عنہا کے طریق سے اسے مرسل روایت کیا ہے۔ امام عقیلی نے اس کے بارے میں کہا ہے کہ اس حدیث کی کوئی اصل نہیں۔ نہ یحییٰ کی سند سے اور نہ کسی اور کی سند سے۔ امام سیوطی نے ”اللاالی المصنوعۃ“ میں اس کے کچھ دوسرے طرق ذکر کر کے ابن جوزی کا تعقب کیا ہے۔

حوالہ کے لیے ملاحظہ کریں۔ سنن الترمذی ۱۲۳/۳، ضعفاء العقیلی (۱۵۴) روضۃ العقلاء (ص: ۲۴۶) الکامل لابن عدی ۱۸۳/۲، المعجم الأوسط للطبرانی ۹۱/۱ العلل لابن ابی حاتم ۲۸۳/۲، ۱۸۳، اللالی المصنوعۃ للسیوطی ۹۲/۲، ۹۳ الفوائد المجموعۃ للشوکانی (س: ۷۷) المقاصد الحسنۃ للسخاوی (۵۵۷)

توصیف ہے دوسرے نام سے، وہ پکارا نہیں جاسکتا کہ اس میں تو صیغ نہیں ہے۔ بعض نے جواد اور سخی کا یہ فرق بیان کیا ہے کہ سخی وہ ہے جو بخشش کرتے وقت خویش و بیگانہ میں تمیز کرے، دوست و دشمن میں امتیاز رکھے اور اس میں کوئی سبب یا غرض ملحوظ ہو اور یہ جواد کا ابتدائی مقام ہے۔ اور ”جواد“ وہ ہے کہ دیتے وقت اپنے بیگانہ میں فرق نہ کرے اور اس کا دینا بے غرض اور بے سبب ہو۔ اور یہ شان دو پینچمبروں میں خاص تھی، ایک حضرت ابراہیم علیہ السلام اور دوسرے حضرت محمد رسول اللہ ﷺ۔

احادیث میں ہے کہ حضرت خلیل اللہ علیہ السلام کے پاس جب تک کوئی مہمان نہ آجاتا، آپ علیہ السلام کھانا تناول نہ فرماتے۔ ایک دفعہ تین روز تک کوئی مہمان نہ آیا۔ اتفاقاً ایک کافر آپ کے دروازے سے گزرا۔ اس سے پوچھا تو کون ہے۔ اس نے عرض کیا کافر ہوں۔ آپ نے فرمایا چلا جا، تو میری مہمانی کے لائق نہیں۔ اسی وقت حق تعالیٰ کی طرف سے ارشاد ہوا: خلیل! جسے میں نے ستر سال پالا، تو نے ایک روٹی اسے نہ دی۔

حضور ﷺ کی خدمت میں حاتم کی اولاد سے ایک لڑکا آیا۔ حضور ﷺ نے اسے چادر بچھادی اور فرمایا: إِذَا آتَاكُمْ كَرِيمٌ قَوْمٌ فَأَكْرِمُوهُ. (۱) ”جب تمہارے پاس کسی قوم کا معزز

۱۔ مذکورہ بالا حدیث شریف کو ابن ماجہ نے محمد بن صباح سے، انہوں نے سعید بن مسلمہ سے، انہوں نے محمد بن عجلان سے انہوں نے نافع سے اور انہوں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً روایت کیا ہے۔ اسے بزار نے اور ابن خزیمہ نے اپنی ”صحیح“ میں، امام طبرانی نے ”المعجم الکبیر والصغیر“ میں، ابن عدی نے ”الکامل“ میں روایت کیا ہے۔ اور امام بیہقی نے السنن الکبریٰ میں جریری کے طریق سے روایت کیا ہے۔ جریری نے ”ابن بریدہ“ سے انہوں نے یحییٰ بن یحمر سے، انہوں نے جریر سے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے۔ لقیۃ النبی صلی اللہ علیہ والہ وسلم فبسط لی رداءہ وقال: اجلس علی هذا فقلت: اکرمک اللہ تعالیٰ کما اکرمتني: فقال صلی اللہ علیہ والہ وسلم: اذا آتاکم کریم قوم فأکرموہ۔ اس حدیث شریف کی اور بھی کثیر اسناد ہیں، اسے امام ابن عدی نے حضرت اہل سے انہوں نے معاذ بن جبل اور ابوقبادة أنصاری سے روایت کیا ہے اور امام حاکم نے ”المستدرک“ میں جابر بن عبد اللہ سے امام طبرانی نے ”المعجم الکبیر“ میں ابن عباس اور عبد اللہ بن ضمیر بن مالک السجلی سے روایت کیا ہے۔ ابن عساکر نے تاریخ ابن عساکر میں انس بن مالک سے روایت کیا ہے اور اسے ضعیف قرار دیا ہے اور ابوراشد نے ان الفاظ کے ساتھ بھی بیان کیا ہے۔ اذا آتاکم شریف قوم فأکرموہ۔ امام مناوی کہتے ہیں کہ امام ذہبی نے ”مختصر المدخل“ میں کہا ہے کہ اس کی ساری سندیں ضعیف ہیں مگر اس کا شاہد ایک مرسل روایت موجود ہے۔ امام ابن جوزی نے اسے موضوع قرار دیا ہے لیکن امام عراقی نے ابن جوزی پر گرفت کی ہے پھر ان کے شاگرد ابن حجر نے اس کے بارے میں کہا ہے کہ یہ ضعیف ہے لیکن موضوع نہیں۔ امام سخاوی نے کہا ہے کہ اس روایت کو عسکری نے ”جمہرة الأمثال“ میں ابن شامین، ابن سکین، ابو نعیم اور ابن مندہ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں اپنی اپنی کتب میں، (بقیہ حوالہ اگلے صفحہ پر۔۔۔۔۔)

آئے تو اس کی عزت کرو۔“

جس نے تمیز کی اور کافر مومن میں فرق کیا وہ خلیل علیہ السلام تھے، ان کا درجہ سخاوت تھا اور جنہوں نے کافر زادہ کے لیے چادر بچھائی، یہ مقام جو ہے۔ اس معنی میں بہترین یہ ہے جو کہا ہے کہ جو متابعت خاطر روی میں تھا۔ جب خاطر ثانی دل پر غالب آجائے تو وہ علامت بخل ہے اور ارباب تحصیل و تحقیق پہلی خاطر کو بزرگ رکھتے ہیں۔ بہر حال خاطر اول حق سے ہے۔ اور مجھے معلوم ہوا کہ نیشاپور میں ایک سوداگر مرد تھا جو ہر روز شیخ ابو سعید رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس میں حاضر ہوتا تھا۔ ایک روز شیخ نے کسی درویش سے کچھ سوال کیا۔ اس سوداگر نے عرض کیا، میرے پاس ایک دینار ہے اور سونے کا ٹکڑا۔ تو اس کے دل میں آیا کہ دینار دوں۔ پھر اس نے سوچا کہ ریزہ زرہی دے دوں۔ تو اس نے ریزہ زرہ دے دیا۔ پھر جب شیخ سے گفتگو ہوئی تو اس نے پوچھا، کیا اللہ تعالیٰ سے تنازعہ کرنا جائز ہے۔ شیخ نے فرمایا: تو نے حق تعالیٰ سے تنازعہ کیا ہے اس لیے کہ حق تعالیٰ نے فرمایا کہ دینار دے اور تو نے ریزہ زرہ دیا۔

(بقیہ حوالہ صفحہ گزشتہ سے)

میں اور حکیم ترمذی اور دیگر محدثین نے بیان کیا ہے، ان تمام نے صابر بن سالم بن حمید بن یزید بن عبد اللہ بن ضمیرہ کے طریق سے روایت کیا ہے۔ امام ابوداؤد نے اسے مراسیل میں ذکر کیا ہے اور اس کی سند صحیح ہے۔ طارق کے طریق سے انہوں نے اسے امام شعبی سے مرفوعاً مراسیل میں روایت کیا ہے: اذاتاکم..... الخ. اور امام ابوداؤد نے کہا ہے کہ یہ سند متصل روایت کی گئی ہے لیکن اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ حکیم ترمذی نے ”نوادراصول“ میں سعید بن سلمہ کے طریق سے روایت کیا۔ شیخ البانی نے ”سلسلہ الأحادیث الصحیحة“ میں کہا ہے کہ اس روایت کے رجال سعید بن سلمہ کے علاوہ سارے ثقہ ہیں جبکہ سعید بن سلمہ ان راویوں میں سے ہے جن کی حدیث کو ترک نہیں کیا جاتا اور ان کی روایت میں احتمال ہوتا ہے۔ بلاشبہ یہ قرب الصحیح روایات ہیں۔

حوالہ کے لیے دیکھیں: سنن ابن ماجہ (حدیث: ۳۷۱۲) کتاب الأدب، سنن البیہقی ۱۶۸/۸، المستدرک للحاکم ۲۹۲/۳، حلیۃ الأولیا ۱۰۵/۶، میزان الاعتدال (حدیث: ۳۲۷۳) المعجم الكبير للطبرانی ۳۸۰/۲، مجمع الزوائد للہیثمی ۱۵/۸، ۱۶، العلل المتناہیۃ لابن الجوزی ۲۵۸/۲، تاریخ بغداد ۱۸۸/۱، مسند الشہاب للقضاہی (۱۳۷) المقاصد الحسنیۃ للسخاوی (ص: ۵۰) کشف الخفاء للعجلونی (ص: ۱۸۰) تمییز الطیب من الخبیث (ص: ۵۷) الجامع الصغیر (ص: ۳۳۵) المعجم الصغیر للطبرانی ۱۲/۳، أسنی المطالب (ص: ۹۷) تذکرۃ الموضوعات (ص: ۶۶) الموضوعات لابن الجوزی ۹۱/۳، الجامع الأزهر للمناوی ۲۳/۱، فیض القدیر للمناوی ۳۳۱/۱، اللآلی المصنوعۃ للسیوطی ۲۹۹/۲، الدرر المنتشرة للسیوطی (ص: ۹) سلسلہ الأحادیث الصحیحة للالبانی ۲۰۳/۳، الکامل فی الضعفاء ۱۷۸/۱، تخریج الاحیاء للعراقی ۳۱۹/۲.

یہ بھی مروی ہے کہ شیخ ابو عبد اللہ رودباری رحمۃ اللہ علیہ ایک مرید کے یہاں تشریف لے گئے۔ وہ موجود نہ تھے۔ آپ نے حکم دیا کہ اس کے گھر کا سامان بازار میں لے جایا جائے۔ جب مرید گھر میں آیا تو دیکھا کہ سب سامان بازار جا چکا ہے تو وہ بہت خوش ہوا اور خاموش رہا۔ کیونکہ اسے شیخ کا خوش رکھنا منظور تھا۔

جب اس کی عورت گھر میں آئی اور یہ حال دیکھا تو گھر میں جا کر اپنے کپڑے بھی اتار دیئے اور کہا کہ یہ بھی گھر کا اسباب ہے، اس کا بھی وہی حکم ہے جو متاع خانہ کا تھا۔ گھر والے نے اس پر آواز کسی اور بولا یہ تکلف اختیاری ہے، جو تو نے کیا۔ عورت بولی جو کچھ شیخ نے کیا اس کی جود تھی، مجھے بھی اب چاہیے کہ میں بھی اپنی ملکِ نفس پر تکلف کر دوں تاکہ میرا جود بھی ظاہر ہو۔ مرد بولا، ہاں یہ ٹھیک ہے لیکن جب ہم نے شیخ کو اپنے جود پر تسلیم کر لیا تو وہ ہمارا شیخ کے حوالے کر دینا ہماری عین جود ہے اور جود آدمی کی صفت میں تکلف اور مجاز ہوتا ہے۔ اور مرید کو ہمیشہ چاہیے کہ اپنی ملک اور نفس کو حکمِ الہی کے متابعت میں خرچ کرے۔

حضرت اہل بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”الصُّوفِيُّ دَمُهُ هَدْرٌ وَمَلِكُهُ مُبَاحٌ“ ”صوفی وہ ہے کہ اس کا خون معاف ہو اور اس کی ملکِ مباح“۔ اور شیخ ابو مسلم فارسی سے میں نے سنا کہ فرماتے تھے کہ ایک دفعہ میں نے ایک جماعت سے مل کر حجاز کا ارادہ کیا اور نواحِ حلوآن میں قوم کرنے ہمارا راستہ روک لیا اور ہمارے تمام کپڑے چھین لیے۔ ہم نے اُن سے مقابلہ نہ کیا اور سوچا کہ اگر ہم مقابلہ نہ کریں تو یہ ہم سے خوش ہوں گے۔ ہمارے ساتھیوں میں سے ایک شخص بہت بے قرار ہوا۔ کرنے اس پر تلوار سونتی اور اُسے قتل کرنے کا ارادہ کیا۔ ہم سب نے اُس کو دس سفارش کی۔ مرد نے کہا کسی طرح جائز نہیں کہ میں اسے چھوڑ دوں۔ یہ جھوٹا ہے میں اسے ضرور قتل کروں گا۔

ہم نے کرد سے پوچھا یہ کیسے جھوٹا ہے۔ کرنے کہا یہ صوفی نہیں ہے اور صوفیوں میں رہ کر خباث کرتا ہے۔ ایسا آدمی نابود کر دینا لازمی ہے۔ ہم نے کہا اسے آپ نے کس طرح صوفی نہیں مانا۔ کرنے جواب دیا کہ صوفی مردوں کا خاصہ جود ہے اور اس کے لباس میں چند چھتھرے اور پیوند ہیں، یہ اس پر صبر نہیں کر سکتا، یہ کیونکر صوفی ہو سکتا ہے کہ اپنے یاروں میں اتنا جھگڑتا ہے۔ ہم مدتوں سے تمہارا کام کر رہے ہیں اور تمہارا راستہ لوٹ رہے ہیں اور تمہارے تعلقات قطع کرتے ہیں۔ تم کبھی ملال نہیں کرتے۔

روایت ہے کہ عبد اللہ بن جعفر ایک گروہ کی چراگاہ میں پہنچے اور حبشی غلام کو دیکھا کہ

بکریوں کی رکھوالی کر رہا ہے کہ ایک کتا آیا اور اس حبشی کے آگے بیٹھ گیا۔ اس نے روٹی نکالی اور کتے کے آگے ڈال دی۔ اس نے پھر چاہی۔ حبشی نے دوسری روٹی ڈال دی۔ پھر تیسری روٹی ڈال دی۔

عبداللہ فرماتے ہیں: میں اس کے پاس گیا اور کہا اے غلام! تیرا روزانہ کا کھانا کتنا ہوتا ہے؟ اس نے جواب دیا اتنا ہی ہوتا ہے جو تم نے دیکھا۔ آپ نے فرمایا: پھر تو نے سب کتے کو کیوں دے دیا۔ غلام نے کہا: اس لیے دے دیا کہ یہاں کتے نہیں ہیں اور یہ کہیں دُور سے آیا ہے۔ مجھے اچھا معلوم نہ ہوا کہ اس کی محنت ضائع کروں۔ آپ فرماتے ہیں مجھے اس کی یہ بات پسند آئی اور وہ چراگاہ اور بکریاں اور غلام خرید فرما کر اس غلام کو آزاد کیا اور اسے وہ چراگاہ اور بکریاں عطا فرمائیں۔ غلام نے آپ کو عادی اور بکریاں صدقہ کر دیں اور چراگاہ کی زمین وقف کر کے خود چل دیا۔

ایک مرد حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ کے گھر کے دروازے پر آیا اور سوال کیا۔ اے ابن رسول اللہ! چار سو درہم مجھ پر قرض ہیں۔ حضرت امام نے چار سو درہم اُسے عنایت فرما دیئے اور گھر میں روتے ہوئے تشریف لے گئے۔ لوگوں نے عرض کیا حضور رونے کی کیا وجہ ہے۔ فرمایا: میں نے اس سائل سے دریافت کرنے میں غلطی کی جس کی وجہ سے اسے سوال کرنا پڑا۔

حضرت ابوہل صعلو کی رحمتہ اللہ علیہ کبھی کسی درویش کے ہاتھ پر صدقہ نہ دیتے اور جو کسی کو بخشش فرماتے کسی کے ہاتھ میں دینے کی بجائے زمین پر رکھ دیتے تاکہ خود اٹھائے۔ لوگوں نے عرض کیا حضور! اس میں کیا حکمت ہے؟ فرمایا: دینار کی وہ قدر نہیں جو کسی مسلمان کے ہاتھ کی مجھے عزت ہے۔ اگر میں کسی کے ہاتھ میں دوں تو میرا ہاتھ اونچا اور محتاج کا ہاتھ نیچا ہوگا اور یہ مجھے گوارہ نہیں۔

روایت ہے کہ حضور ﷺ کو شاہ حبش نے دوسن مشک پیش کی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سب کا سب پانی میں ڈال دیا اور اپنے صحابہ کرام کے مل دی۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک سائل حضور ﷺ کی خدمت میں آیا۔ حضور ﷺ نے دو پہاڑوں کے درمیان ایک وادی تھی، وہ بکریوں سے بھر کر اُسے عطا فرمادیں۔ وہ اپنی قوم میں آیا اور پکارا: يَا قَوْمَا! اے میری قوم! جلدی مسلمان ہو جا کہ محمد ﷺ ایسی بخشش فرماتے ہیں کہ اپنے درویش ہونے کا خوف نہیں کرتے۔

اور حضرت انس رضی اللہ عنہ ہی سے یہ بھی مروی ہے کہ ایک روز حضور ﷺ کی خدمت میں ہزار درہم آئے۔ آنحضرت ﷺ نے انہیں کملی مبارک پر ڈالا اور جب وہاں سے اٹھے

تو سب تقسیم ہو چکے تھے۔ اس پر حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں: میں نے حضور کی طرف نظر ڈالی تو معلوم ہوا کہ بھوک کی وجہ سے شکم اقدس پر پتھر بندھا ہوا تھا۔

میں نے متاخرین سے ایک درویش دیکھا کہ بادشاہ نے اُسے تین سو درم زر خالص بھیجے۔ اس نے وہ لیے اور گرم آبہ میں چلا گیا۔ واپس آیا تو تمام کے تمام درم گرم آبہ والے کو دے کر چلے گئے۔

ایسی بہت سی روایتیں مذہب نوریاں کی ہیں جس سے ایسا واضح ہوتا ہے لیکن میں اس پر اختصار کرتا ہوں۔ وَاللّٰهُ تَعَالٰی اَعْلَمُ .

کشف حجاب ہفتم: روزہ

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ﴾ (۱)

”اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کیے گئے ہیں۔“

اور حضور ﷺ نے فرمایا کہ جبرائیل نے مجھے خبر دی کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

”الصَّوْمُ لِيْ وَاَنَا اَجْزِيْ بِهٖ“ (۲)

”روزہ میرے لیے ہے اور میں روزہ دار کا بدلہ ہوں۔“

روزہ ایک باطنی عبادت ہے جسے اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اس لیے کہ ظاہر سے اس کا کوئی تعلق نہیں اور کسی غیر کا اس میں کوئی حصہ نہیں۔ اس سبب سے اللہ تعالیٰ نے اس کی جزا بھی بے حد رکھی۔ اور کہتے ہیں کہ بہشت میں داخل ہونا رحمت سے ہے اور عبادت کا درجہ اور خلود بجزاء روزہ یہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے ”اَنَا اَجْزِيْ بِهٖ“ فرما کر بتایا۔

اور حضرت جنید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: الصَّوْمُ بِصِفِّ الطَّرِيقَةِ. ”روزہ نصف طریقت ہے۔“ اور اکثر مشائخ کرام کو دیکھا گیا کہ وہ ہمیشہ روزہ رکھتے اور بعض کو دیکھا کہ وہ صرف رمضان میں روزہ رکھتے ہیں اور صرف رمضان میں روزہ رکھنا ترک اختیار اور اجتناب ریا کے واسطے ہے۔ اور میں نے یہ بھی دیکھا کہ اکثر روزہ رکھتے ہیں اور کوئی نہیں جانتا۔ جب کھانا سامنے آیا، کھا لیتے ہیں اور یہ مطابق سنت ہے۔

اور حضرت عائشہ اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضور ﷺ ان کے پاس تشریف لائے۔ ہر دو ازواج المطہرات نے عرض کیا: اِنَّا قَدْ خَبَاْنَا لَكَ حَيْسًا قَالَ صَلَّى

اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَمَا إِنِّي كُنْتُ أُرِيدُ الصَّوْمَ وَلَكِنْ قَرِيبِيَّةً سَأَصُومُ يَوْمًا مَكَانَهُ. (۱) ”ہم نے حضور ﷺ کے لیے حبس تیار کیا ہے (حبس گوشت کے شوربہ میں روٹی بھگونے کو کہتے ہیں) حضور ﷺ نے فرمایا میں نے آج روزہ کا ارادہ کیا تھا لیکن لاؤ آج کی بجائے کل روزہ رکھ لیں گے۔“ اور ہم نے دیکھا کہ حضور ﷺ ایام بیض یعنی تیرہ، چودہ اور پندرہ قمری تاریخوں میں اور عشرہ محرم میں حضور ﷺ ہمیشہ روزہ رکھتے اور رمضان و شعبان میں بھی روزہ رکھتے اور میں نے دیکھا کہ صوم داؤد بھی رکھتے اور حضور ﷺ نے اُسے ”خیر الصیام“ فرمایا اور صوم داؤد کی اس طرح ہوتے ہیں کہ ایک روز روزہ، ایک روز افطار ہو۔

ایک بار میں حضرت احمد بن بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو حلوے کی رکابی ان کے سامنے پڑی تھی اور آپ کھا رہے تھے۔ انہوں نے مجھے بھی اشارہ فرمایا۔ میں نے لڑکپن کی عادت کے موافق عرض کیا کہ میں نے روزہ رکھا ہوا ہے۔ انہوں نے پوچھا کیوں۔ میں نے عرض کیا کہ فلاں صاحب جو روزہ رکھتے ہیں۔ انہوں نے فرمایا: خلقت کو ایک دوسرے کے مطابق کرنا درست نہیں۔ تو میں نے روزہ افطار کرنے کا ارادہ کیا۔ بخاری صاحب نے فرمایا، جب تو نے ان کی موافقت ترک کی ہے تو میری موافقت بھی نہ کر، میں بھی مخلوق میں سے ایک بندہ ہوں یہ دونوں ایک جیسے ہیں۔ اور حقیقت میں روزہ بند ہونے کو کہتے ہیں اور تمام طریقت اس میں پوشیدہ ہے اور بہت کم درجہ کا روزہ یہ ہے۔ بزرگوں کا قول ہے: الْجُوعُ طَعَامُ اللَّهِ فِي الْأَرْضِ. ”بھوک زمین میں خدا کا کھانا ہے۔“ اور بھوک کو تمام لوگ عقل و شرع کی رو سے پسند کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک ماہ تو سال بھر میں ہمیشہ روزہ فرض ہے اور ہر ایک عاقل بالغ مسلمان تندرست اور مقیم پر وہ جب فرض ہوتا ہے جب چاند ماہ رمضان کا دیکھ لے اور ہلال ماہ شوال تک رہتا ہے اور ہر روزہ کے واسطے نیت لازم ہوتی ہے۔

لیکن بند رہنے کے لیے بہت سی شرطیں ہیں: جیسے پیٹ کو شراب، طعام سے بند رکھنا۔

۱۔ یہ امام مالک کی روایت کردہ حدیث (کتاب الصوم باب جواز الصوم النافلة بنیتہ من النهار قبل الزوال) کا جز ہے جو انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے طریق سے روایت کی ہے۔ آپ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: قال لی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ذات یوم: یا عائشہ اهل عندکم شیء، فقلت: یا رسول اللہ! ما عندنا شیء قال: فلا لی صائم، ثم قالت فخرج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، فاهدیت لنا هدیة، او جاء نازور قالت: فلما رجع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قلت: یا رسول اللہ! اهدیت لنا هدیة او جاء نازور، وقد خبات لک شینا قال: ما هو؟ قلت: حیسا، قال: هاتیه، فجلست به، فاکل ثم قال: قد کنت اصبحت صائما.

آنکھوں کو شہوات سے بند رکھنا۔ کانوں کو غیبت سننے سے اور زبان کو فساد اور بے ہودہ بکنے سے، بدن کو متابعت دنیا سے اور مخالفت شرع سے، پھر یہ شخص جب دراصل روزہ دار ہوتا ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا:

إِذَا صُمْتَ فَلْيَضْمِ سَمْعَكَ وَبَصْرَكَ وَلِسَانَكَ وَيَدَكَ وَكُلَّ
عَضْوِ. (۱)

”جب تو روزہ رکھے تو چاہیے کہ اپنے کان اور آنکھ اور زبان اور ہر عضو کو منہیات سے بند کرے۔“

اور یہ بھی حضور ﷺ نے فرمایا:

رَبِّ صَائِمٍ لَيْسَ لَهُ مِنَ الصَّوْمِ إِلَّا الْجُوعُ وَالْعَطَشُ. (۲)

”بہت سے روزہ دار ایسے ہیں کہ جن کو بھوک اور پیاس کے علاوہ کچھ حاصل نہیں ہوتا۔“

اور میں علی بن عثمان جلابی عنہ ہوں۔ میں نے حضور ﷺ کو خواب میں دیکھا۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! مجھے کچھ ہدایت فرمائیے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: اِنْحَبِئْ سَـ حَاوِاسْكَ۔ ”اپنے حواس بند رکھ۔“ اور حقیقت بھی یہ ہے کہ حواس بند رکھنا پورا مجاہدہ ہے۔ اس

۱۔ حوالہ کے لیے ملاحظہ کریں: کتاب اللمع (ص: ۱۶۲)

۲۔ یہ الفاظ اس حدیث کا حصہ ہیں جسے امام طبرانی (۱۳۳۱۳) نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔ راوی کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: رب قائم لیس له من قیامہ الا السہر، ورب صائم لیس له من صیامہ الا الجوع والعطش۔ امام بیہقی نے مجمع الزوائد (۲۰۲/۳) میں کہا ہے اس کے راوی ثقہ ہیں۔ امام احمد بن حنبل نے اسے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے: رب صائم حظہ من صیامہ الجوع والعطش ورب قائم حظہ من قیامہ السہر (مسند احمد بن حنبل ۳۷۳/۲) امام احمد بن حنبل نے اپنی مسند ۴۴۱/۲ میں حضرت ابو ہریرہ سے مروی ایک اور روایت میں یہ الفاظ ذکر چکے ہیں: کم من صائم لیس له من صیامہ الا الجوع، و کم من قائم لیس له من قیامہ الا السہر۔ ابن ماجہ نے اسے اپنی سنن ۵۳۹/۱ (حدیث: ۶۹۰) میں امام داری نے اپنی سنن ۳۰۱/۲ میں، امام نسائی نے السنن میں اور امام حاکم نے المستدرک ۴۳۱/۱ میں اور امام بیہقی نے ۲۷/۳ میں ان الفاظ کے ساتھ ذکر کیا ہے: کم من صائم لیس له من صیامہ الا الظما، و کم من قائم لیس من قیامہ الا السہر۔ امام سیوطی نے الجامع الصغیر ۵۳۹/۱ میں دو متشابہ فی الفاظ روایتیں حضرت ابو ہریرہ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے ذکر کی ہیں۔ امام حاکم نے کہا ہے کہ یہ امام بخاری کی شرائط کے مطابق صحیح ہیں اور امام ذہبی نے بھی امام حاکم کو موافقت کی ہے۔

لیے کہ تمام علم انہیں حواسِ خمسہ سے حاصل ہوتا ہے۔ ایک دیکھنا، دوسرا سننا، تیسرا چکھنا، چوتھا سونگھنا، پانچواں چھونا۔ اور یہ ہی پانچوں علم اور عقل کے شاہسوار اور سالار ہیں اور انہیں پانچ کے واسطے جگہ خاص ہے۔ ایک تمام بدن میں پھیلا ہوا ہے۔ آنکھ تمام دیکھنے کے مقام پر ہے کہ وہ موجود چیز اور رنگت کو دیکھتی ہے۔ کان سننے کے مقام پر ہے جو خبر اور آواز سنتے ہیں اور زبان ذائقہ کا مقام ہے، مزہ بے مزہ معلوم کرتی ہے۔ ناک سونگھنے کا مقام ہے، خوشبو بدبو کو پہچانتی ہے اور چھونے کے لیے کوئی عضو مخصوص نہیں۔ یہ تمام بدن میں پھیلی ہوئی ہے جس سے نرم سخت، گرم سرد معلوم ہو سکتا ہے۔ اور علوم سے کوئی ایسا نہیں جسے آدمی حاصل نہ کر سکے اور ان حواسِ خمسہ کے ذریعے حاصل نہ ہو۔ مگر بدیہی اور الہامی جو منجانب اللہ عطا ہوتی ہیں، انہیں آفت روا نہیں۔

ان حواسِ خمسہ میں صفائی اور کدورت بھی ہے جیسے غیب کے علم اور عقل اور روح کو اس میں گنجائش ہے ویسے ہی نفس اور ہوا کو اس میں گنجائش ہے کیونکہ یہ آلت میں اطاعت و گناہ اور سعادت اور شقاوت میں مشترک ہیں۔ تو حق تعالیٰ کی ولایت کان، آنکھ اور دیکھنے سننے میں ہے۔ نفس کے لیے جھوٹ، سننے، شہوت، چھونے، ذائقہ اور سونگھنے میں اور اس امر کے موافق سنت کی متابعت ہے۔ نفس کے لیے فرمان اور شریعت حق کے خلاف۔

تو چاہئے کہ روزہ دار ان سب سے حواس کو قابو میں رکھے تاکہ جب تک روزہ ہو مخالفت سے موافقت میں آجائے اور محض کھانے پینے سے روزہ رکھنا بوڑھوں عورتوں اور بچوں کا کام ہے۔ نفسانی مشرب اور دنیاوی امور سے روزہ رکھنا مردوں کا کام ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَمَا جَعَلْنَاهُمْ جَسَدًا آلَا يَأْكُلُونَ الطَّعَامَ (۱)

”اور ہم نے انہیں جسم نہیں دیا تاکہ کھانا نہ کھائیں۔“

اور یہ بھی فرمایا:

أَفَحَسِبْتُمْ أَنبَا خَلَقْنَاكُمْ عَبَثًا (۲)

”کیا تم گمان کرتے ہو کہ ہم نے تمہیں بے فائدہ پیدا کیا ہے۔“

یعنی سب کو کھانے کا محتاج نہیں کیا اور مخلوق کو کھیل کود کے لیے پیدا نہیں کیا۔ تو حرام اور

کھیل سے روزہ رکھنا لازمی ہے، نہ کہ حلال کھانے سے۔

مجھے تعجب ہے اس پر جو نقلی روزہ رکھے اور فرض کو ترک کر دے۔ اس لیے کہ فرض کا ادا نہ

کرنا گناہ ہے اور دائی روزہ رکھنا سنت ہے۔ نَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنْ قَسْوَةِ الْقَلْبِ۔ پھر ہم دل کی سیاہی سے خداوند کریم سے پناہ چاہتے ہیں۔ اور اگر کوئی شخص گناہ سے بچ جائے تو وہ ہر حال میں روزہ دار ہے۔ کہتے ہیں کہ حضرت سہل بن عبداللہ تستریؓ جس روز سے پیدا ہوئے، روزہ دار پیدا ہوئے۔ اور جس دن دنیا سے رحلت فرمائی اس دن بھی روزہ سے تھے۔ لوگوں نے کہا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ (یعنی ان کا وقت ولادت سے وقت رحلت تک روزہ دار ہونا کیسے سمجھ میں آ سکتا ہے) تو بتایا کہ جس روز ان کی ولادت ہوئی صبح کا وقت تھا۔ انہوں نے مغرب کی نماز تک دودھ نہ پیا اور جب دنیا سے وداع ہوئے تو اس حال میں کہ بغیر خور و نوش تھے۔

یہ روایت ابو طلحہ مالکی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان فرمائی۔ لیکن روزہ وصال سے یعنی صائم الدہر ہونے کو حضور ﷺ نے منع فرمایا ہے۔ چنانچہ جب صحابہ کرامؓ نے حضور ﷺ کو صوم وصال رکھتے دیکھا تو خود بھی موافقت کرنی چاہی تو حضور ﷺ نے منع فرمایا اور کہا:

إِنِّي لَسْتُ كَمَا حَدِّثُكُمْ إِنِّي أَبِيْتُ عِنْدَ رَبِّي يُطْعِمُنِي وَيَسْقِينِي. (۱)

”میں تمہارے جیسا نہیں ہوں۔ میں اپنے رب کے پاس شب بائیں رہتا ہوں

اور وہ مجھے کھانے پینے کو دیتا ہے۔“

تو ارباب مجاہدہ کہتے ہیں یہ منع فرمانا شفقہ تھا۔ یہ حرمت تحریمی نہیں بنتی۔

ایک گروہ کہتا ہے صوم وصال کرنا خلاف سنت ہے لیکن حقیقت میں وصال خود محال ہے۔ اس لیے کہ جب دن گزر گیا تو رات کو روزہ نہیں ہوتا اور جب رات کو روزہ سے ملا دیا جائے تو بھی وصال نہیں ہو سکتا۔

۱۔ امام بخاریؒ نے اپنی ”صحیح“ (۳/۱۱۸، ۱۲۳، ۱۳۴) میں ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے:

”نَهَى رَسُولُ اللَّهِ (صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ وَسَلَّمَ) عَنِ الْوِصَالِ، فَقَالَ رَجُلٌ مِنَ الْمُسْلِمِينَ: فَإِنَّكَ يَا رَسُولَ اللَّهِ (صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ وَسَلَّمَ) تُوَصِّلُ؟ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ (صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ): وَأَيُّكُمْ مِثْلِي، إِنِّي أَبِيْتُ يُطْعِمُنِي رَبِّي وَيَسْقِينِي.“

ترجمہ: ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صوم وصال رکھنے سے منع فرمایا تو ایک مسلمان نے عرض کی: بلاشبہ آپ تو صوم وصال رکھتے ہیں، پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اور تم میں سے کون میری مثل ہو سکتا ہے؟ یقیناً میں تو اس حال میں رات گزارتا ہوں کہ میرا پروردگار مجھے کھلاتا بھی ہے اور پلاتا بھی۔“

حوالہ کے لیے دیکھیں:

مسند الإمام أحمد (۲/۲۱، ۱۰۲، ۲۳۱)، الجامع الصغير ۱/۱۵۱، المؤطا للإمام مالک ۱/۱۳۰، سنن الدارمی ۱/۳۰۴، جامع الترمذی ۱/۱۶۳، سنن ابی داؤد ۲/۲۷۹، صحیح مسلم ۳/۱۳۴ (کتاب الصیام).

حضرت سہل بن عبداللہ تستریؒ سے ایک حکایت ہے کہ آپؐ پندرہ روز کے بعد کھانا تناول فرماتے اور جب ماہ رمضان المبارک آتا تو عید تک کھانا تناول نہ فرماتے اور ہر رات چار سو رکعت نفل ادا کرتے۔ یہ آپؐ کی کرامت تھی اس لیے کہ یہ طریقہ طاقت بشری سے وراء ہے اور بغیر خدائی عطا کے یہ طاقت نہیں آسکتی۔ وہ ایک امداد غیبی ہے جو بمنزلہ غذا ہوتی ہے۔ ایک وہ ہے کہ جس کی غذا دنیا کا کھانا ہوتا ہے۔ ایک وہ ہے جس کی غذا اللہ تعالیٰ کی اعانتِ محض ہے۔

حضرت شیخ ابوالفراس، طاؤس الفقراء، صاحب اللمعة سے مشہور ہے کہ وہ رمضان المبارک میں بغداد میں پہنچے اور مسجد شوئیزہ میں انہیں ایک علیحدہ حجرہ دیا گیا اور وہاں کے درویشوں کی امامت ان کے سپرد کی گئی۔ آپ عید تک ان کی امامت فرماتے رہے اور تراویح میں روزانہ پانچ قرآن کریم ختم فرماتے۔ ہر رات ایک خادم حاضر ہوتا اور کوٹھری کے پاس ایک روٹی دے جاتا۔ جب عید کا دن ہوا تو وہ خادم آپ کے پاس آیا اور دیکھا کہ تیس روٹیاں ویسی ہی رکھی ہوئی ہیں۔ حضرت علی بن بکار رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ حضرت حفص مصعبیؒ کو میں نے دیکھا کہ رمضان المبارک میں پندرہویں روزے کے سوا کچھ تناول نہ فرمایا۔ حضرت ابراہیم ادہم رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق ایک روایت ہے کہ آپ نے رمضان میں شروع سے لے کر آخر تک کچھ نہ کھایا۔ مہینہ گرمی کا تھا اور آپ اسی حالت میں گندم کاٹتے اور اس کی مزدوری جو ملتی فقیروں کو تقسیم فرمادیتے اور تمام شب طلوع آفتاب تک نوافل میں مشغول رہتے۔ ایک روز ان کی نگرانی کی گئی تو انہوں نے کچھ نہ کھایا اور نہ شب میں سوئے۔

اور حضرت شیخ ابو عبداللہ خفیفؒ کے متعلق روایت ہے کہ جس روز آپ نے دنیا سے رحلت فرمائی اس وقت تک چالیس چلے لگا تا پورے کیے۔ اور میں نے بیابان میں ایک ضعیف العمر دیکھے کہ وہ سال میں دو چلے پورے کیا کرتے تھے۔ اور دانشمند حضرت ابو محمد بانویؒ جب دنیا سے وداع ہوئے میں ان کی خدمت میں تھا، اسی (۸۰) روز آپ نے کچھ نہ کھایا اور آپ کی نماز بے جماعت ادا نہ ہوئی۔

متاخرین سے ایک درویش تھے جو اسی (۸۰) روز شب کچھ نہ کھاتے اور ہر نماز باجماعت ادا کرتے۔ مرو میں دو ضعیف العمر تھے۔ ایک کا نام مسعود تھا اور دوسرے کا نام شیخ بوعلی سیاح تھا۔ رَحْمَةُ اللَّهِ عَلَيْهِمَا

کہتے ہیں مسعود رحمۃ اللہ علیہ نے شیخ بوعلی کی طرف آدمی بھیجا کہ کب تک یہ دعویٰ کرو گے۔ آؤ چالیس روز تک ایک جگہ بیٹھیں اور کچھ نہ کھائیں پئیں۔ انہوں نے فرمایا آؤ اور ان میں

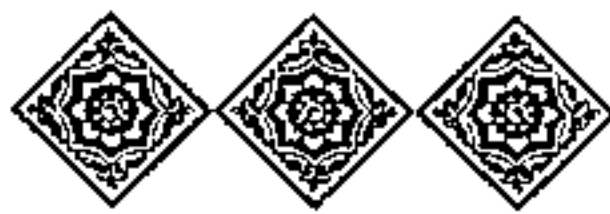
تین بار کھائیں پیئیں اور چالیس روز ایک وضو رکھیں۔

اس مسئلہ میں جو اشکال ہے وہ دونوں دعووں میں بحالہ قائم ہے۔ جہاں چالیس روز کھانا پینا مشکل ہے وہاں چالیس روز دن میں تین بار کھانا پینا اور ایک وضو سے چلہ پورا کرنا مشکل بلکہ محال معلوم ہوتا ہے۔ جاہل لوگ اس سے سند لے کر کہتے ہیں کہ صوم وصال اس سے روا معلوم ہوتا ہے اور طبیب لوگ اس سے انکار کرتے ہیں۔ لیکن میں اس کی تصریح بیان کرتا ہوں تاکہ اشتباہ صاف ہو جائے۔

اچھی طرح سمجھ لو کہ ایسا وصال جو فرمانِ حق تعالیٰ کی اتباع میں خلل انداز نہ ہو کرامت ہے اور کرامت کے لیے خاص محل ہوتے ہیں۔ یہ قوت و استعداد عام نہیں ہوتی۔ جب اس کا حکم عام نہیں تو عوام کو درست نہیں۔ اگر کرامت عام ہوتی تو ایمان بالجبر ہوتا اور عارفوں کو معرفت پر ثواب نہ ہوتا۔ تو جب حضور ﷺ صاحبِ معجزہ تھے، انہوں نے صوم وصال فرما کر اہل کرامت کو اس کے ظاہر کرنے سے منع کر دیا۔ اس کی یہی وجہ ہے کرامت کا چھپانا لازمی ہے اور معجزہ کا ظاہر کرنا لازمی ہے اور یہی فرق معجزہ اور کرامت کا ہے۔ مبتدی کے لیے اسی قدر بیان کافی ہے۔

ان کی چلہ نشینی کا اصول موسیٰ علیہ السلام کی حالت سے تعلق رکھتا ہے جو ہم کلامی کے مقام میں وارد ہوا۔ جب آپ نے چاہا کہ کلامِ حق تعالیٰ کانوں سے سنیں۔ حکم ہوا کہ چالیس روز بھوکے رہیں اور تیس روز گزر جانے کے بعد مسواک کریں اور دس روز ٹھہریں تو ضرور کلامِ الہی ان کے کان سنیں گے۔ اس لیے کہ جو چیز انبیاء کرام کو ظاہراً جائز ہوتی ہے، اولیاء کرام پر وہ خفیہ طور پر ہوتی ہے۔ تو طبیعت قائم رہنے کی حالت میں کلامِ حق سننا جائز نہیں ہوتا اور جہادِ طبع کے واسطے چالیس روز کھانے پینے کی ترک لازم ہے تاکہ وہ مقہور ہوں اور صفائیِ محبت اور لطائفِ روح کے واسطے یہ امور لازم ہیں اور ”باب الجوع“ اسی کے موافق ہے اور ہم اس کی حقیقت ظاہر کرتے ہیں۔

إِنْ شَاءَ اللَّهُ تَعَالَى



بھوک اور اس کے احکام

اللہ عزوجل فرماتا ہے ﴿وَلَنْبَلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ ۗ﴾ (۱) ”البتہ آزمائیں گے تمہیں خوف، بھوک اور نقصان مال اور جان اور ثمرات سے۔“ حضور ﷺ نے فرمایا: بَطْنٌ جَائِعٌ أَحَبُّ إِلَى اللَّهِ تَعَالَىٰ مِنْ سَبْعِينَ عَابِدًا عَاقِلًا. (۲) ”بھوکا پیٹ اللہ کو پیارا ہے ستر عابد عاقلوں سے۔“

واضح رہے کہ بھوک کو بڑا شرف ہے اور تمام امتوں اور مذہبوں میں پسندیدہ ہے۔ اس لیے کہ جب دیکھا جائے تو بھوک کے کا دل ذکی ہوتا ہے اور طبیعت مہذب اور تندرستی زیادہ۔ خاص کر جو پینا بھی کم رکھے وہ ریاضت میں سب سے زیادہ اپنے آپ کو آراستہ کر لیتا ہے۔ لِالنَّفْسِ خُضُوعٌ وَ لِلْقَلْبِ خُشُوعٌ اس لیے کہ بھوک نفس میں خضوع پیدا کرتی ہے اور دنیا میں عجز و نیاز اس لیے کہ قوت نفسانی بھوک سے ٹٹتی ہے۔

حضور ﷺ نے فرمایا: أَجِيعُوا بَطُونَكُمْ وَأَظْمَأُوا أَكْبَادَكُمْ وَأَعْرُوا أَجْسَادَكُمْ

۱۔ سورۃ البقرہ: ۱۵۵

۲۔ اس روایت کے مذکورہ الفاظ تو نہیں ملے لیکن اس معنی و مفہوم کی کئی روایات ہیں۔ ان میں سے ایک وہ ہے جسے امام عراقی نے تخریج احادیث الاحیاء ۳/۳۷۱ میں، امام تاج الدین سبکی نے الطبقات الکبریٰ ۱۶۳/۴ میں ان الفاظ کے ساتھ ذکر کیا ہے: اَحْيَا قُلُوبَكُمْ بِقَلَّةِ الضَّحِكِ وَقَلَّةِ الشَّبَعِ وَ طَهْرٍ وَ هَا بِالْجُوعِ تَصْغُرُ وَ تَرُقُ. امام غزالیؒ نے احیاء علوم الدین ۳/۹۶ میں ان الفاظ کے ساتھ ذکر کیا ہے: الْفَضْلُ عِنْدَ اللَّهِ مَنْزِلَةٌ يَوْمَ الْقِيَامَةِ اطْوَلَكُمْ جُوعًا وَ تَفْكِيرًا فِي اللَّهِ سُبْحَانَهُ ، وَ ابْغَضَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ كُلُّ نَوْمٍ اَكُولٍ وَ شَرِيبٍ. اور امام عراقی نے تخریج الاحیاء ۳/۶۹ میں ذکر کیا ہے جبکہ اسے امام تاج الدین سبکی الطبقات الکبریٰ ۱۶۳/۴ میں ان الفاظ کے ساتھ بیان کیا ہے: الْفَضْلُ النَّاسِ مِنْ قَلِّ مَطْعَمِهِ وَ ضَحْكِهِ وَ يَرْضَى بِمَا يَسْتَرْبَهُ عَوْرَتَهُ، وَ الْبَسْوَا وَ اشْرَبُوا فِي الصَّافِ الْبَطُونِ فَانَّهُ جَزَاءٌ مِنَ النَّبْوَةِ وَ جَاهَدُوا النَّفْسَ بِالْجُوعِ وَ الْعَطَشِ ، فَانَّ الْاَجْرَ فِي ذَلِكَ كَمَا جَرَّ الْمَجَاهِدُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَ اِنَّهُ لَيْسَ مِنْ عَمَلٍ اَحَبَّ اِلَى اللَّهِ مِنْ جُوعٍ وَ عَطَشٍ وَ سَيِّدِ الْاَعْمَالِ الْجُوعُ وَ ذَلِ النَّفْسِ لِبَاسِ الصَّوْفِ .

لَعَلَّ قُلُوبَكُمْ تَرَوْنَ اللَّهَ عَيَانًا فِي الدُّنْيَا. (۱) ”اپنے شکم بھوکے رکھو اور جگر پیا سے اور بدن لاغر، شاید تم دنیا میں اللہ تعالیٰ کا جمال دل کی آنکھوں سے دیکھ لو۔“

اگرچہ بدن بھوک سے بلا میں مبتلا ہوتا ہے لیکن دل کو روشنی ہوتی ہے اور جان میں صفائی اور سر میں لقاء حق کا سودا حاصل ہوتا ہے۔ جب سر کو سودا حاصل ہو جائے اور جان میں صفائی آجائے اور دل میں روشنی آجائے تو تن اگر تنہا بلا میں پڑے تو کچھ نقصان نہیں۔ اور سیر ہو کر کھائے اگرچہ بڑا خطرہ نہیں۔ کیونکہ اگر خطرہ ہوتا تو بیل سیر ہو کر نہ کھاتے۔ اس لیے کہ بیل گائے کا کام سیر ہو کر کھانا ہے اور بھوکا رہنا پیاروں کا علاج ہے اور یہ بھی ہے کہ بھوکا رہنے سے باطن آباد ہوتا ہے اور سیر ہو کر کھانے سے جوف شکم کی آبادی ہے۔

ایک شخص عمارتِ باطن میں عمر بسر کرتا ہے تاکہ خالص اللہ کا ہو جائے اور علاقہ جات سے علیحدہ رہے تو وہ کب برابر ہو سکتا ہے اس شخص کے، جو عمارتِ بدن اور خواہشِ نفسانی میں عمر بسر کرے۔ ایک کو دنیا کھانے کے واسطے چاہئے۔ ایک کو کھانا عبادت کے واسطے۔ ان میں بڑا فرق ہے۔ كَانَ الْمُتَّقِدْمُونَ يَأْكُلُونَ لِيَعِيشُوا وَأَنْتُمْ تَعِيشُونَ لِيَأْكُلُوا. ”متقدمین اس لیے کھاتے تھے تاکہ وہ زندہ رہیں اور تم اس لیے جیتے ہو کہ کھاؤ۔“ الْجُوعُ طَعَامُ الصِّدِّيقِينَ وَمَسَلِكُ الْمُرِيدِينَ وَقَيْدُ الشَّيَاطِينِ. بھوک صدیقوں کا طعام ہے اور مریدوں کا راستہ اور شیطان کے قید کرنے کا ذریعہ۔“ اور حضرت آدم علیہ السلام کا جنت سے باہر تشریف لانا اور قرب حق سے دور ہونا اگرچہ حکمِ قضا و قدر تھا لیکن بظاہر ایک لقمہ کے لیے ہی تھا۔

اور حقیقت یہ ہے کہ بھوک سے جو بے قرار ہو، وہ بھوکا نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ کھانے کا طالب باخوراک ہوتا ہے اور جسے بھوک کا درجہ ملتا ہے وہ تارکِ طعام ہوتا ہے۔ وہ کھانے سے رکا ہوا نہیں ہوتا۔ جو کھانا موجود ہوتے ہوئے ترک کرے اور بھوک برداشت کرے وہ بھوکا نہیں اور یہ ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ شیطان کا بند کرنا اور خواہشاتِ نفسانی کا روکنا بغیر بھوکے رہنے کے ممکن نہیں۔ اور کتابی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

مِنْ حُكْمِ الْمُرِيدِ أَنْ يُكُونَ فِيهِ ثَلَاثَةٌ أَشْيَاءَ نَوْمُهُ غَلْبَةٌ وَكَلَامُهُ
ضُرُورَةٌ وَأَكْلُهُ فَاقَةٌ.

۱۔ اس حدیث پاک کو مرتضیٰ زبیدی نے اپنی تالیف اتحاف السادة المتقين بشرح احياء علوم الدين کی جلد نمبر ۷ اور ص ۳۷۷ پر نقل کیا ہے۔

۲۔ خوردن برائے زیستن و ذکر کردن است
تو معتقد کہ زیستن از بہر خوردن است
(از مترجم)

”مرید کے لیے تین حکم ضروری ہیں۔ وہ غلبہ کے وقت سوئے، ضرورت سے

زیادہ کلام نہ کرے، کھانا فاقہ بغیر نہ کھائے۔“

اب فاقہ کی مقدار بعض کے نزدیک اڑتالیس گھنٹہ اور بعض کے نزدیک بہتر گھنٹے اور بعض ایک ہفتہ کہتے ہیں۔ اور بعض چالیس دن بناتے ہیں اور محققین کہتے ہیں کہ صحیح فاقہ چالیس رات دن میں ہوتا ہے اور اس مدت میں وہ اتنا بلند حوصلہ رہے کہ درمیانی مدت میں جو کچھ اضطراب و اضطراب اور قلق پیدا ہو، اسے برداشت کرے۔

اور اللہ تجھے معاف فرمائے! یہ اچھی طرح جان لے کہ اہل معرفت کی رگیں سب اسرارِ الہی کی دلیل ہیں اور ان کے دل اس بلند مقام پر ہوتے ہیں جہاں سے آگے بلندی نہیں۔ ان کے سینوں میں دروازے کھلے ہیں اور عقل اور خواہشِ نفسانی ان کے محلوں میں بیٹھے ہوتے ہیں۔ روح تو عقل کی مدد کرتی ہے اور نفس خواہشات کی اعانت میں ہوتا ہے۔

جتنی کہ غذاؤں سے طبیعت کی پرورش ہوتی ہے، نفس کو قوت ملتی ہے اور حرص و خواہشات بڑھ جاتی ہیں اور اعضاء میں اس کا قبلہ عام ہو جاتا ہے۔ پھر ہر گ میں اس کا اثر پھیل کر ایک پردہ بن جاتا ہے اور جب غذاؤں کی طلب کم کر دی جائے تو خواہشات ضعیف ہو جاتی ہیں، عقل کی قوت بڑھ جاتی ہے، نفس کا تصرف ٹوٹ جاتا ہے۔ اس وقت اس کے اسرار و دلائل ظاہر ہوتے ہیں اور جب نفس اپنی حرکات سے عاجز ہو جاتا ہے اور خواہشات وجود سے فنا ہونے لگتی ہیں تو ہر باطل مٹ جاتا ہے اور اظہارِ حق میں محو ہو جاتا ہے اور مرید کی تمام مراد حاصل ہوتی ہے۔

حضرت ابو العباس قصاب رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ ہے کہ آپ نے فرمایا: اطاعت و معصیت میرے دو گروہ ہیں۔ جب میں کھاتا پیتا ہوں، اپنے وجود میں گناہ ہی گناہ پاتا ہوں۔ اور جب کھانا چھوڑ دیتا ہوں تو تمام وجود میں اطاعت و عبادت کی اصل دیکھتا ہوں۔ بھوک کا پھل مشاہدہ ہے اور اس کے لیے مجاہدہ لازمی ہے۔ جب شکم سیری میں مجاہدہ ہو تو وہ با مجاہدہ بھوکا رہنے سے بہتر ہے اس لیے کہ میدانِ جنگ اور مشاہدہ برابر ہے اور مجاہدہ بچوں کا کھیل ہے۔

فَا لَشْبَعُ بِشَاهِدِ الْحَقِّ خَيْرٌ مِّنَ الْجُوعِ بِشَاهِدِ الْخَلْقِ .

”یعنی شکم سیری میں مشاہدہ حق بھوکا رہنے کے مشاہدہ سے افضل ہے، جس

سے مشاہدہ خلق ہو۔“

اور اس میں بہت سی حکایتیں ہیں لیکن میں اسی پر اختصار کرتا ہوں تاکہ کتاب طویل نہ

ہو جائے۔ وَ بِاللّٰهِ التَّوْفِیْقُ .

کشف حجاب ہشتم: حج

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ۝ (۱)﴾

”لوگوں پر اللہ کے لیے حج کرنا لازم ہے جس کے لیے راستہ میں آنے جانے کی طاقت ہو اور کوئی روک نہ ہو۔“

فرض عین میں سے ایک فرض حج ہے جو صحت عقل اور بلوغ اور اسلام اور استطاعت علی السبیل کی صورت میں بندہ پر فرض ہے۔

اور وہ میقات میں احرام باندھنا، عرفات کے میدان میں نویں ذوالحجہ کو پہنچنا ہے اور خانہ کعبہ کا طواف، زیارت کرنا بالاتفاق وبالاختلاف اور سعی صفا و مروہ لیکن حرم میں بدون احرام جانا ممنوع ہے۔ حرم کو حرم اس سبب سے کہتے ہیں کہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مقام اور جائے امن ہے۔ حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کے لیے دو مقام ہیں۔ ایک جسم کے لیے، دوسرا دل کے لیے۔ مقام جسم مکہ معظمہ ہے۔ مقام دل خلت ہے، جو ان کے مقام جسمانی کا ارادہ کرے اسے تمام لذات و شہوات سے منہ موڑنا لازمی ہے اور احرام باندھنا بھی ضروری ہے۔ حلال شکار ترک کرنا بھی لازمی ہے اور تمام حواس کا روکنا بھی لازم ہے۔

عرفات میں نویں ذوالحجہ کو حاضر ہونا، وہاں سے مزدلفہ جا کر کنکر چننا، مکہ معظمہ میں کعبہ کا طواف، منیٰ میں آ کر تین روز رہنا۔ رمی جمار کرنا۔ خلع یا قصر کرنا، قربانی کرنا۔

پھر جب ابراہیم علیہ السلام کے مقام دل کا ارادہ کرے تو مرغوب چیزوں کا ترک کرنا، لذات و راحت کا چھوڑنا۔ اغیار سے ان کے ذکر سے منہ موڑے، اس لیے کہ دنیا کی طرف متوجہ ہونا ایسے راہ میں زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ پھر معرفت کے عرفات میں کھڑا ہو اور مزدلفہ الفت کا قصد کرے۔ پھر سرتزویہ حق کے طواف میں لے جائے اور خواہشات و خیالات فاسدہ کو امن کے منیٰ میں اتارے اور نفس کو مجاہدہ قربان گاہ میں قربان کرے تاکہ مقام خلت پر پہنچ جائے۔ تو تن کے مقام میں داخل ہونے کے بعد دشمن اور اس کی تلوار سے امن لینا ہے اور دل کے مقام میں داخل ہونے سے قطع ہونے سے امن ملتا ہے۔

☆ جیسا خسر و علیہ الرحمۃ نے فرمایا:

ہر رگ من تار گشتہ حاجت زنا ز نیست

حضور ﷺ نے فرمایا:

الْحَاجُّ وَفَدَّ اللَّهُ يُعْطِيهِمْ مَا سَأَلُوا وَ يَسْتَجِيبُ لَهُمْ مَا دَعَوْا. (۱)
 ”حاجی خدائی وفود ہیں جو چاہتے ہیں ان کو ملتا ہے اور جو دعا کریں مستجاب ہوتی ہے۔“

ایک گروہ پناہ چاہتا ہے نہ دعا مانگتا ہے بلکہ اپنے کو حق تعالیٰ کی مشیت کے حوالے کر دیتا ہے۔ جیسے ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ ہے:

﴿إِذْ قَالَ لَهُ رَبُّهُ أَسْلِمُ﴾ قَالَ أَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿۲﴾
 ”جب ابراہیم کو اس کے رب نے فرمایا کہ فرمانبردار ہو تو عرض کیا میں فرمانبردار ہوں رب العالمین کا۔“

اور جب ابراہیم علیہ السلام مقامِ خلت پر پہنچے تو تعلقات چھوڑ دیئے اور غیر اللہ سے انقطاع فرمایا تو اللہ تعالیٰ نے ان کا مقام خلت پر جلوہ نما ہونا چاہا۔ نمرود کو مقرر کر دیا تا کہ انہیں ماں باپ سے جدا کر دے۔ آگ دہکائی۔ شیطان آیا، اس کے کہنے پر انہیں گائے کے چمڑے میں باندھا اور منجیق یعنی ڈھینکلی کے ذریعے آگ میں پھینکوا یا۔ روح الامین حاضر ہوئے اور کہنے لگے:

يَا اِبْرَاهِيمُ هَلْ لَكَ اِلٰى مِنْ حَاجَةٍ.
 یعنی اے ابراہیم! آپ کو مجھ سے کسی مدد کی ضرورت ہے؟

ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: اَمَّا اِلَيْكَ فَلَا. ”میری حاجت تجھ سے کچھ نہیں۔“ جبریل علیہ السلام نے عرض کی مجھ سے نہیں تو اپنے رب سے کچھ ترش کر لیجیے۔ آپ نے فرمایا: حَسْبِيَ مِنْ سُوَالِي عِلْمُهُ بِحَالِي. ”میرے سوال سے پہلے وہ مجھے کافی ہے۔ اُسے میرے حال کا علم ہے۔“ وہ جانتا ہے کہ مجھے آگ میں کس لیے ڈالا جا رہا ہے۔ اس کی مشیت کے مقابل مجھے سوال کرنا ممنوع ہے۔

محمد بن فضل فرماتے ہیں کہ مجھے اس شخص پر تعجب ہے جو دنیا میں اس کا گھر ڈھونڈتا ہے۔

۱۔ یہ الفاظ تو نہیں ملے جبکہ امام احمد بن حنبل نے اپنی مسند میں حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے: اِذَا رَجَعُ... يَعْنِي الْحَجَّاجُ... مِنَ الْحَجِّ الْمَبْرُورِ رَجَعُ وَذَلِ بِهِ مَغْفُورٌ وَدَعَاؤُهُ مُسْتَجَابٌ. امام حاکم نے اپنی مستدرک اور امام بیہقی نے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے: اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِلْحَجَّاجِ وَلِمَنْ اسْتَغْفَرُ لَهُ الْحَجَّاجُ. امام حاکم نے کہا ہے کہ یہ روایت امام مسلم کی شرائط کے مطابق ہے۔

۲۔ سورۃ البقرۃ: ۱۳۱۔

وہ دل میں اس کا مشاہدہ کیوں نہیں چاہتا۔ کیونکہ بسا اوقات گھر نہیں ملتا اور کبھی مل جاتا ہے اور مشاہدہ ہر وقت رہتا ہے۔ جب وہ پتھر جس کی زیارت فریضہ میں داخل ہے جس پر ایک نظر فرمائی گئی (حجر اسود)۔ تو دل جس پر دن رات تین سو ساٹھ بار نظر فرمائی جائے، وہ کیوں اس سے اولیٰ و افضل نہ ہو۔

چنانچہ اہل تحقیق راہ مکہ معظمہ میں ہر قدم پر ایک نشان بتاتے ہیں اور جب حرم میں پہنچتے ہیں اس ہر قدم کے بدلے ایک خلعت حاصل کرتے ہیں۔

ابو یزید رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جو عبادتوں کا بدلہ اور نیکیوں کا ثواب کل پر چھوڑ دے وہ آج یہاں عبادت کیوں نہ کرے۔ جس میں ہر دم کا ثواب اور اجر مجاہدہ اسی وقت حاصل ہے اور جس نے وہی کہنا ہے کہ میں نے پہلے حج میں سوائے گھر کے اور کچھ نہیں دیکھا۔ دوسری مرتبہ (جب اس نظر و عقیدہ سے حاضر ہوگا تو کہے گا) میں نے بیت اور صاحب البیت کو دیکھا۔ اور جب (اس سے بھی زیادہ شہود حاصل ہوگا تو) تیسری بار کہے گا میں نے صرف صاحب البیت کو دیکھا۔ غرضیکہ جتنا مجاہدہ ہوتا ہے اتنا عزم نہیں ہوتا۔

بلکہ یہ مقام اسے ملتا ہے جس کے دل میں مشاہدہ تعظیم ہو اور جسے تمام جہان چاہے میعاد قرب اور خلوت خانہ انس نہ ہو اسے دوستی سے ابھی کچھ خبر نہیں ہوتی اور جب بندہ مکاشفہ کی حالت میں ہو تو سب جہان اس کے لیے حرم ہوتا ہے اور جب حجاب کی حالت میں ہو تو خود حرم بھی اس کے لیے ظلم کا جہان ہوتا ہے۔ أَظْلَمُ الْأَشْيَاءِ دَارُ الْحَبِيبِ بِالْحَبِيبِ. ”سب سے زیادہ اندھیرا حبیب کے گھر میں ہوتا ہے جب اس گھر میں حبیب نہ ہو“۔ تو مقام خلعت میں مشاہدے اور فنا کی قدر و قیمت ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ان معنی میں کعبہ معظمہ کا دیدار لازم فرمایا ہے۔ باقی کعبہ کی قدر یا قیمت نہیں مگر مسبب کو ہر سبب سے تعلق لازمی ہے تاکہ اللہ تعالیٰ کی عنایت نامعلوم کس پہلو سے جلوہ دکھائے اور کہاں سے ظہور فرمائے۔

طالب کی مراد تو صرف مطلوب ہوتا ہے مگر اس کی جلوہ گری نامعلوم کس سمت سے ہو۔ اسی وجہ سے جنگل اور صحرا میں صحرا نوردی مجاہدوں کی ہوتی ہے تاکہ کسی طرح ان کی مراد پوری ہو۔ صرف حرم کا دیکھنا مقصود نہیں ہوتا بلکہ دوست کا گھر دیکھنا تو حرام ہوتا ہے۔ یہ تو درحقیقت ایک قسم کا مجاہدہ ہے جو شوق دیدار یا بیقرار ہو کر کراتا ہے اور گدازِ محبت ہے جو دائمی ظہور پر بے چین کرتا ہے۔ ایک شخص حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے اس سے پوچھا تم

کہاں سے آئے ہو۔ اس نے کہا حضور حج کر کے آیا ہوں۔ جنید نے فرمایا۔ تم حج کر کے آئے ہو؟
اس نے عرض کیا۔ جی ہاں! اس کے بعد آپ نے مندرجہ ذیل سوالات کیے:

جنید۔ جب توبہ نیت حج گھر سے نکلا اور اپنے وطن سے کوچ کیا تو اس وقت سب گناہوں سے
بھی کوچ کیا تھا یا نہیں؟

حاجی۔ حضور! یہ تو نہیں کیا۔

جنید۔ تو پھر گھر سے چلا ہی نہیں۔

اچھا جب تو گھر سے چلا اور منزل پر قیام کیا تو راہِ حق یعنی طریقت کا مقام بھی طے کیا یا
نہیں؟

حاجی۔ حضور! اس کی تو مجھے خبر ہی نہ تھی۔

جنید۔ تو پھر تو نے منزلیں بھی طے نہ کیں۔

اچھا جب تو نے احرام باندھا تھا تو میقات میں صفاتِ بشریت سے علیحدگی کی جس طرح
کپڑے اور عادات سے علیحدگی کرتے ہیں؟

حاجی۔ حضور! یہ بھی نہیں ہوا۔

جنید۔ تو اس کے معنی یہ ہیں کہ تم نے احرام بھی نہیں باندھا۔

اچھا جب تو عرفات میں کھڑا ہوا تو تجھے کشف و مشاہدہ کا فرق واضح ہوا؟

حاجی۔ حضور! یہ بھی نہیں۔

جنید۔ تو گویا تو عرفات میں بھی کھڑا نہیں ہوا۔

اچھا تو مزدلفہ پہنچا تو تو نے نفسانی مرادیں ترک کیں؟

حاجی۔ حضور! نہیں۔

جنید۔ تو گویا تو مزدلفہ بھی نہیں گیا۔ اچھا جب تو نے طواف بیت اللہ کیا تو بہ چشمِ سر تنزیہ کے
مقام میں لطائفِ جمالِ حق دیکھے۔

حاجی۔ حضور! نہیں دیکھے؟

جنید۔ اچھا تو گویا تو نے طواف بھی نہیں کیا۔

اچھا تو یہ بتا جب تو نے صفا و مروہ کی سعی کی تو تجھے صفا کا مقام اور راہِ حق پر گزرنے کا درجہ
معلوم ہوا؟

حاجی۔ حضور! مجھے اس کی تمیز ہی نہیں تھی۔

جنید۔ اچھا! تو ابھی تو نے سعی صفا و مروہ بھی نہیں کی۔

اچھا! جب تو منیٰ میں پہنچا تو تیری ہستی تجھ سے ساقط ہوئی؟

حاجی۔ نہیں!

جنید۔ تو گویا تو منیٰ بھی نہیں گیا۔

اچھا! جب تو قربان گاہ میں پہنچا تو اور قربانی کی، تو تُو نے خواہشاتِ نفسانیہ کو قربان کیا؟

حاجی۔ حضور! ایسا نہیں کیا۔

جنید۔ تو گویا تو نے قربانی بھی نہ کی۔

اچھا! جب توری جمار کر رہا تھا تو اس وقت تو نے اپنی خواہشات جو تجھ میں تھیں، وہ بھی

پھینکیں؟

حاجی۔ نہیں۔

جنید۔ تو گویا تو نے رمی بھی نہیں کی اور تو نے حج ہی نہ کیا۔ واپس جا اور ایسا حج کر جو ہم نے تجھے

بتایا ہے۔ تو اس کے بعد تو مقامِ ابراہیم پر پہنچے گا۔

میں نے سنا ہے کہ ایک بزرگ کعبۃ اللہ کے سامنے بیٹھا رو رہا تھا اور یہ شعر پڑھ رہا تھا:

وَأَصْبَحْتُ يَوْمَ النُّحْرِ وَالْعَيْسُ تَرَحَّلُ

وَكَانَ حُدَى الْحَادِي بِنَا وَهُوَ مُعْجَلُ

أَسْأَلُ عَنْ سَلْمَى فَهَلْ مِنْ مُخْبِرٍ

بِأَنَّ لَهُ عِلْمًا بِهَا أَيْنَ نَزَلُ

”قربانی کے دن میں نے صبح کی جس حال میں سپید اونٹ کوچ کر رہے تھے

اور حدی کر نیوالے کی حدی تھی اور وہ جلدی کر رہا تھا۔ میں سلمیٰ سے سائل

ہوں، کیا کوئی خبر دینے والا ہے۔ جس کو علم ہو اس کی منزل گاہ کہاں ہے۔“

لَقَدْ أَفْسَدْتُ حَجِّي وَنُسَكِي وَعُمْرَتِي

وَلِي الْبَيْنَ لِي شُغْلٌ عَنِ الْحَجِّ مُشْغَلُ

سَأَرْجِعُ مِنْ عَامٍ لِحَجَّةِ قَابِلِ

فَإِنَّ أَلْدِي قَدْ كَانَ لَا يَتَقَبَّلُ

”بیشک میں نے اپنا حج اور عمرہ تباہ کیا اور مرے باطن میں حج کے ساتھ مشغلہ

رہا۔ عنقریب آئندہ سال لوٹ کر آؤں گا حج کے لیے، اس لیے کہ جو کر چکا

ہوں وہ قبول نہیں ہوا۔“

حضرت فضیل بن عیاض رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک جوان کو دیکھا کہ موقف میں خاموش کھڑا تھا اور سر جھکایا ہوا تھا۔ سب لوگ دعا کر رہے تھے اور وہ سر جھکائے ہوئے شرمندہ ہو رہا تھا۔ میں نے کہا، اے نوجوان تو بھی دعا کر۔ اس نے کہا مجھے اس امر کا ڈر لگ رہا ہے کہ جو وقت مجھے حاصل ہوا وہ جاتا رہا۔ اب کس منہ سے دعا کروں۔ میں نے کہا دعا کر! تاکہ اللہ تجھے اس جماعت کی برکت سے کامیاب کرے۔ فضیل فرماتے ہیں اس نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھانا چاہا کہ ایک نعرہ اس کے منہ سے نکلا اور جان نکل گئی۔

حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے منیٰ میں ایک جوان دیکھا کہ آرام سے بیٹھا ہوا ہے اور لوگ قربانیوں میں مشغول ہیں۔ میں اسے دیکھتا رہا کہ کیا کرتا ہے اور یہ کون ہے۔ اتنے میں وہ پکارا، خدایا! سب خلقت قربانیوں میں مشغول ہے۔ میں بھی تیرے حضور اپنے نفس کو قربان کرنا چاہتا ہوں، مجھے قبول فرما۔ یہ کہا اور انگشت سبابہ سے حلق کے درمیان اشارہ کیا اور گر پڑا تو جب میں نے دیکھا، اُسے مرا ہوا پایا۔

توجح دو طرح پر ہے: ایک بحالت غیبت۔ جو محض مکہ معظمہ آنا اور قرب میں غائب رہنا ہوتا ہے۔ وہ ایسا ہی ہے جیسے گھر میں رہ کر غیبت میں تھا۔ اس لیے کہ کوئی غیبت دوسری غیبت سے اچھی نہیں۔ اور جو حضور میں اپنے گھر حاضر ہو وہ ایسا ہے کہ گویا مکہ معظمہ حاضر ہے اس لیے کہ ایک حضوری دوسرے حضور سے زیادہ اچھی نہیں۔ توجح کشف مشاہدہ کے لیے ایک مجاہدہ ہے اور مشاہدہ، مجاہدہ کی علت نہیں ہوتا بلکہ سبب ہوتا ہے اور حقیقت معانی میں سب سے زیادہ تاثیر نہیں ہوتی۔ توجح سے بیت اللہ دیکھنا مراد نہیں بلکہ کشف مجاہدہ مقصود ہے۔ اب میں ان معانی میں ایک باب مشاہدہ کے بیان لاتا ہوں تاکہ تجھے قریب الحصول مقصود حاصل ہو۔ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ تَعَالٰی



مشاہدہ

حضور ﷺ نے فرمایا:

أَجْبِعُوا بُطُونَكُمْ دَعُوا الْحِرْصَ وَأَعْرُوا أَجْسَامَكُمْ قَصِرُوا الْأَمَلَ
وَأَظْمَأُوا أَكْبَادَكُمْ دَعُوا الدُّنْيَا لَعَلَّكُمْ تَرَوْنَ اللَّهَ بِقُلُوبِكُمْ. (۱)
”اپنے پیٹ بھوکے رکھو اور حرص چھوڑو، بدن تنگے کرو اور امیدیں کم کرو اور
اپنے جگر پیاسے رکھو۔ دنیا چھوڑ دو۔ تو قریب ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کو دل کی
آنکھوں سے دیکھ لو گے۔“

اور حضور ﷺ نے فرمایا: جب کہ جبرائیل علیہ السلام نے حضور سے احسان کی بابت
سوال کیا اَنْ تَعْبُدَ اللَّهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ فَإِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَإِنَّهُ يَرَاكَ. ”اللہ کی عبادت ایسے کر
گو یا تو اسے دیکھ رہا ہے اور اگر تو اتنا نہ ہو سکے کہ اسے دیکھے تو وہ تجھے دیکھ رہا ہے۔“
اور اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کی طرف وحی فرمائی: ﴿يَا دَاوُدُ أَتَدْرِي مَا
مَعْرِفَتِي قَالَ لَا قَالَ هِيَ حَيَوَةُ الْقَلْبِ فِي مَشَاهِدَتِي﴾ ”اے داؤد! تم جانتے ہو کہ میری معر
فت کیا ہے۔ اس نے جواب دیا۔ نہیں۔ (اللہ تعالیٰ نے) فرمایا وہ دل کا زندہ ہونا ہے میرے مشاہدہ
میں۔“ اور اس گروہ کی مراد مشاہدہ سے دیدار ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کو ہر حال میں غلا و ملا بے چون
بے چگون دیکھے۔

اور حضرت ابو العباس بن عطاء فرماتے ہیں اس فرمان الہی پر: ﴿إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا
رَبَّنَا اللَّهُ (بِالْمُجَاهِدَةِ) ثُمَّ اسْتَقَامُوا﴾ (۲) (عَلَى بَسَاطِ الْمَشَاهِدَةِ) ”وہ لوگ جو کہیں ہمارا
رب اللہ ہے (مجاہدہ کے ساتھ) پھر استقامت رکھیں (بساط مشاہدہ پر)۔ اور حقیقت مشاہدہ دو
طریق پر ہے۔ ایک صحبت یقین سے دوسرے غلبہ محبت سے۔ یعنی دوست غلبہ محبت میں اس درجہ
تک پہنچے کہ خود گم ہو جائے اور دوست ہی دوست رہ جائے اور سوائے دوست کے کسی غیر کو نہ
دیکھے۔ اور محمد بن واسع رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: مَا رَأَيْتُ شَيْئًا قَطُّ إِلَّا وَرَأَيْتُ اللَّهَ فِيهِ أَيْ

۱۔ اس حدیث شریف کا ذکر پہلے گزر چکا ہے۔

۲۔ سورۃ حم السجدہ: ۳۰

بَصِيحَةُ الْيَقِينِ. ”میں نے کسی شے کو کبھی نہیں دیکھا مگر اللہ تعالیٰ کو دیکھا اس میں صحت یقین کے ساتھ۔“

اور مشائخ کرام میں سے ایک فرماتے ہیں: مَا رَأَيْتُ شَيْئًا إِلَّا وَرَأَيْتُ اللَّهَ فِيهِ قَبْلَهُ ”نہیں دیکھا میں نے کسی شے کو مگر میں نے اللہ تعالیٰ کو اس میں دیکھا اس سے پہلے۔“ اور یہ دیکھنا حق سے خلق کا ہے۔

اور شبلی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: مَا رَأَيْتُ شَيْئًا قَطُّ إِلَّا اللَّهَ يَغْنِي بِغَلَبَاتِ الْمَحَبَّةِ وَغَلَبَانَ الْمُشَاهَدَةِ. ”میں نے کوئی چیز کبھی نہیں دیکھی مگر اللہ تعالیٰ کو محبت کے غلبہ اور جوش مشاہدہ میں دیکھا۔“

گویا ایک شخص فعل پشتم سر دیکھتا ہے اور پشتم حق بین سے فاعل حقیقی کو دیکھتا ہے۔ پھر محبت فاعل اس کے نظر سے غیر کی محبت محو کر دیتی ہے۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک متدل ہوتا ہے۔ تاکہ اثبات دلائل اس پر عیاں ہو جائیں اور ایک مجذوب ہوتا ہے جو ربودہ شوقِ حق ہوتا ہے۔ یعنی دلائل و حقائق اس کے لیے حجاب ہو جاتے ہیں۔

لَا مَنْ عَرَفَ شَيْئًا لَا يَخَافُ غَيْرَهُ وَمَنْ أَحَبَّ شَيْئًا لَا يُطَالِعُ وَلَا يُعَارِفُ غَيْرَهُ فَتَرَكَ الْمُنَازَعَةَ مَعَهُ وَالْإِعْتِرَاضَ عَلَيْهِ فِي أَحْكَامِهِ وَأَفْعَالِهِ.

”جو شخص کسی شے کو دیکھتا ہے وہ غیر سے خائف نہیں ہوتا اور جو کسی شے سے محبت کرتا ہے وہ غیر کو نہ دیکھتا ہے نہ جانتا ہے تو منازعت ترک ہو جاتی ہے اور اعتراض اس پر احکام و افعال میں ہوتا ہے۔“

اور اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کے حالات معراج کی ہمیں خبر دی اور فرمایا: ﴿مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغَى﴾ (۱) ﴿مِنْ سِلْسَةِ شَوْقِهِ إِلَى اللَّهِ تَعَالَى﴾۔ ”کسی چیز کی طرف آنکھ نہ کھولی اور نہ حد سے متجاوز ہوئے۔“ (اس لیے کہ آپ ﷺ کو شوق الی اللہ کا جوش تھا) جو کچھ مناسب تھا دل سے دیکھ لیا۔ جب دوست نے موجودات سے آنکھ بند کرانی چاہی تو دل سے موجد کو دیکھ لیا اور اللہ عزوجل نے فرمایا: ﴿لَقَدْ رَأَى مِنْ آيَاتِ رَبِّهِ الْكُبْرَى﴾ (۲) ”یقیناً دیکھ لیا محمد ﷺ نے ربّ علیٰ کو۔“ اور یہ بھی فرمایا: ﴿قُلْ لِلْمُؤْمِنِينَ يَغُضُّونَ أَبْصَارَهُمْ﴾ (۳) ”مومنوں کو فرما دیجئے

کہ اپنی آنکھیں بند رکھیں۔“ یعنی: اَمَى ابْصَارِ الْعُيُونِ مِنَ الشَّهَوَاتِ وَابْصَارِ الْقُلُوبِ عَنِ الْمَخْلُوقَاتِ. ”یعنی آنکھوں کی بینائی شہوتوں سے بند رکھیں اور دل کی آنکھیں مخلوقات سے۔“ تو جو مجاہدہ سے سر کی آنکھیں شہوتوں سے بند رکھے، وہ ضرور حق کو سر کی آنکھوں سے دیکھ لیتا ہے۔

فَمَنْ كَانَ اَخْلَصَ مُجَاهِدَةً كَانَ اَصْدَقَ مُشَاهِدَةً.

”جو مجاہدہ میں مخلص ہوتا ہے وہ مشاہدہ میں سچا ہوتا ہے۔“

سہیل بن عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: مَنْ غَضَّ بَصْرَهُ عَنِ اللّٰهِ طَرْفَةً عَيْنٍ لَا يَهْتَدِي طَوْلَ عُمْرِهِ. ”جو شخص اللہ تعالیٰ سے ایک پل آنکھ بند کرے وہ مادام العمر ہدایت نہیں پاتا۔“ اس لیے کہ غیر کی طرف مائل ہونا غیر کی طرف جانا ہے اور جو غیر کی طرف مائل ہو وہ ہلاک ہوا۔ چنانچہ اہل مشاہدہ حیات اسے کہتے ہیں جو مشاہدہ میں ہو اور جو مغائبہ میں ہو اسے زندگی نہیں سمجھتے بلکہ حقیقت حق کہتے ہیں۔

چنانچہ حضرت ابو یزید رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے پوچھا: آپ کی عمر کتنی ہے؟ فرمایا: چار سال لوگوں نے کہا: کس طرح؟ فرمایا: ستر سال میں دنیا کے حجاب میں رہا اور چار سال سے مشاہدہ میں ہوں، لہذا حجاب کے زمانہ کی عمر زندگی نہیں تھی۔

شبلی رحمۃ اللہ علیہ نے دعا کے اندر فرمایا۔ اَللّٰهُمَّ اَخْبِئْنَا الْجَنَّةَ وَالنَّارَ فِيْ خَبَايَا غَيْبِكَ حَتَّى تَعْبَدَ بِغَيْرِ وَاِسْطَةٍ. ”الہی! جنت و دوزخ کو اپنے غیب کے خزانوں میں پوشیدہ رکھ اور اس کی یاد مخلوق کے دل سے فراموش فرما، تاکہ تجھے اس کے لیے نہ پوجیں۔“ چونکہ بہشت میں طبیعت کو فائدہ ہے۔ اس لیے آج کے روز بے یقین، یقین کے حکم سے، عقلمند اس کی امید پر عبادت کرتا ہے اور جب دل کو محبت سے نصیب نہیں تو ضرور مشاہدہ سے محبوب ہوتا ہے اور حضور ﷺ نے حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا کو معراج سے خبر دی کہ میں نے نہیں دیکھا۔

اور ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے مجھے فرمایا کہ میں نے حق کو دیکھا ہے۔ تو مخلوق اسی اختلاف میں رہی۔ جنہوں نے غور اور تامل اختیار کیا وہ مطلب کو پہنچے۔ یعنی جو آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں نے اس کو نہیں دیکھا وہ سر کی آنکھوں سے مراد نہیں ہے اور جو آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں نے دیکھا ہے وہ پچشم سردیکھنا مراد ہے۔ اس لیے کہ ایک ان دونوں سے اہل ظاہر ہے اور ایک اہل باطن۔ ہر ایک سے اس کے حال کے موافق کلام فرمایا۔ تو جب حضور ﷺ نے پچشم سردیکھنا ظاہر فرمایا تو اگر آنکھ کا واسطہ نہ ہو تو نقصان ہے۔

حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اگر خداوند فرمائے کہ مجھے دیکھ، میں کبھی نہ دیکھوں۔

کیونکہ دوستی کے عالم میں آنکھ غیر اور بے گانہ ہوتی ہے اور غیر کی غیریت مجھے دیدار سے روکتی ہے، اس لیے کہ دنیا میں بلا واسطہ چشم دوست کو دیکھتا ہوں تو میں کسی واسطہ کا کیا کروں۔

وَإِنِّي لَأَحْسَدُ نَاطِرِي عَلَيْكَ وَأَغْضُ طَرْفِي إِذَا نَظَرْتُ إِلَيْكَ
 ”بے شک میں تیری طرف دیکھنے میں حسد کرتا ہوں۔ تو آنکھ بند کر لیتا ہوں
 جب تیری طرف نظر کرتا ہوں۔“ (۱)

حضرت جنیدؒ سے لوگوں نے پوچھا حضرت! آپ چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو دیکھیں؟ فرمایا: نہیں چاہتا۔ عرض کیا گیا۔ کیوں۔ فرمایا موسیٰ علیہ السلام نے چاہا تو نہ دیکھ سکے اور ہمارے حضور ﷺ نے نہ چاہا تو دیکھ لیا۔ اس لیے کہ ہماری خواہش ہی دیدار حق کے لیے حجاب اعظم ہے۔ اور جب دنیا میں ارادت کامل ہو جائے تو مشاہدہ حاصل ہو جاتا ہے اور جب مشاہدہ ہو جائے تو دنیا و عقبیٰ یکساں ہے۔

حضرت ابو یزید رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ اِنَّ لِلّٰهِ عِبَادًا لَوْ حُبُّوْا عَنِ اللّٰهِ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ لَا رَتْدُوْا. ”اللہ تعالیٰ کے ایسے بندے بھی ہیں کہ اگر ایک پل دنیا و عقبیٰ میں اس کے جمال سے محبوب ہوں تو وہ اپنے کو مرتد سمجھیں۔“ یعنی ان کی زندگی ہی مشاہدہ میں ہے اور محبت کی حیات ہی مشاہدہ سے ہے۔ اور جب اہل مکاشفہ حجاب میں آجائیں تو انہی کو مرتد فی الطريق سمجھتے ہیں۔

حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک روز میں مصر جا رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ لوگ ایک نوجوان کو پتھر مار رہے ہیں۔ میں نے پوچھا کیا وجہ ہے جو اسے پتھر مارے جا رہے ہیں۔ لوگوں نے کہا یہ دیوانہ ہے۔ میں نے کہا اس پر جنون کی علامت کیا ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ یہ کہتا ہے میں خدا کو دیکھتا ہوں۔

میں نے اس سے پوچھا کہ فی الواقع تو ایسا کہتا ہے یا تجھ پر لوگ اتہام رکھتے ہیں۔ اس نے کہا لوگ ٹھیک کہتے ہیں، میں خدا کو دیکھتا ہوں اور اگر میں ایک لحظہ جمال حق نہ دیکھوں تو محبوب ہو جاتا ہوں اور پھر طاعت بھی بیکار ہوتی ہے۔ لیکن اس شہر کے لوگ غلطی پر ہیں۔ وہ خیال کرتے ہیں کہ دلوں کا دیکھنا اور مشاہدہ میں رہنا ایک ہی صورت میں ہے۔ حالانکہ دل میں اس کا وہم یا ذکر یا فکر یہ محض تسبیہ ہے اور گمراہی اسی کو کہتے ہیں۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کسی اندازہ میں نہیں آسکتا اور اس

۱۔ غیرت از چشم برم غیر تو دیدن نہ دہم

گوش رانیز حدیث تو شنیدن نہ دہم (از مترجم)

کا وہم رکھنا بھی ایک اندازہ ہے اور وہ عقل اور وہم و گمان سے بالا ہے۔ اور جتنا وہ وہم میں آتا ہے یہ بھی وہم کی جنس ہے۔ اور اگر وہ معقول ہو تو عقل کی جنس سے ہے اور اللہ تعالیٰ جنسوں کا ہم جنس نہیں۔

”گویا ان آنکھوں سے دیکھنے میں دریغ اس لیے ہے کہ آنکھ بیگانہ ہوتی ہے۔“

اسی طرح لطیفے اور مکاشفے سب ایک دوسرے کی جنس ہیں اور ضد کی حالت میں بھی ایک دوسرے کی جنس ہوتے ہیں۔

اس لیے کہ توحید کی تحقیق میں جنس قدیم کے مقابلہ میں ضد جنس ہوتی ہے اور ضدین حادث نہیں اور حادث خود حادث تو اللہ تعالیٰ ازلی ابدی قدیم کو اس سے کیا واسطہ۔ تَعَالَى اللَّهُ عَنْ ذَلِكَ وَعَمَّا يَصِفُهُ الْمَلَاحِدَةُ عَلُوًّا كَبِيرًا. تو دنیا میں مشاہدہ عاقبت کے دیدار کی مانند ہے۔ اور جب باتفاق مشائخ عاقبت میں دیدار روا ہے تو دنیا میں مشاہدہ بھی روا ہے۔ تو جو دنیا میں مشاہدہ ہونے کی خبر دیتا ہے اور جو عاقبت میں دیدار کی خبر دیتا ہے۔ دونوں میں کیا فرق ہے۔ اگر ان دونوں معنوں میں جواز کی خبر دے اور کہے کہ دیدار اور مشاہدہ جائز ہے اور یہ نہ کہے کہ مجھے دیدار ہوا ہے، تو کیا خلاف ہے۔

اس لیے کہ مشاہدہ صفت سر ہے اور خبر دینا سر سے خود خبر ہے۔ اور وہ مشاہدہ نہیں بلکہ ایک دعویٰ ہوتا ہے۔ اس لیے کہ جس خبر کی حقیقت عقل میں نہ آئے، زبان اس کا بیان کیسے کر سکتی ہے۔ سوائے اس کے کہ معنی مجاز میں کہا جائے۔ لَآنَ الْمَشَاهِدَةَ قُصُورَ اللِّسَانِ بِحُضُورِ الْجَنَانِ. تو اس حال میں خاموش رہنا بولنے سے زیادہ بہتر ہے اور خاموش رہنا مشاہدہ کی علامت ہے اور گفتگو شہادت کا نشان اور ظاہر ہے کہ کسی چیز کی شہادت دینا اور اس چیز کا مشاہدہ کرنا اس میں بڑا فرق ہے۔ حضور ﷺ نے مقام اعلیٰ اور درجہ قرب میں حق تعالیٰ کے لیے فرمایا۔ وہ ”لَا أُخْصِي نَسَاءً عَلَيْكَ“ (۱) تھا یعنی میں تیری ثناء کا احصا نہیں کر سکتا۔ اس لیے وہ بحالت مشاہدہ تھی اور دوستی کے درجہ میں مشاہدہ کمال یگانگت ہے اور یگانگی میں بیان کرنا بیگانگی ہوتی ہے۔ چنانچہ فرمایا۔ اَنْتَ كَمَا اُنَيْتَ عَلَيَّ نَفْسِكَ. ”تو وہ ذات ہے جیسا تو نے اپنی شان میں فرمایا۔“ تو آپ کا کہنا میرا کہنا ہو گیا اور تیری ثناء میری طرف سے تیری ہی طرف سے ہے۔ اس لیے کہ میں اپنی زبان کو اس قابل نہیں سمجھتا کہ تیرے کمال کا بیان کرے۔ اور بیان کو اس لائق نہیں جانتا کہ تیرا بیان کرے۔ اس پر کسی شاعر نے خوب کہا ہے:

۱۔ اس حدیث پاک کا تفصیلی ذکر پیچھے گزر چکا ہے۔

تَمَنَيْتُ مَنْ أَهْوَى فَلَمَّا رَأَيْتَهُ بُهْتُ فَلَمْ أَمْلِكْ لِسَانًا وَلَا طَرْفًا

”آرزو کی میں نے اس کی جسے میں دوست رکھتا ہوں۔ تو جب میں نے

اسے دیکھا تو مبہوت ہو گیا اور زبان و اعضاء پر اپنے اختیار ہی نہ رہا۔“

یہ تمام مشاہدے کے احکام ہیں جو بطور اختصار بیان ہوئے۔

کشف حجاب نہم: صحبت اور اس کے آداب و احکام

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قُوا أَنْفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا﴾ (۱) (أَيُّ

أَدْبُوهُمْ) ”اے ایمان والو! اپنی جان اور اپنے گھر والوں کو آگ سے بچاؤ“ یعنی انہیں ادب

سکھاؤ۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: حُسْنُ الْأَدَبِ مِنَ الْإِيمَانِ (۲) ”ادب شائستہ ہونا ایمان

سے ہے“ اور فرمایا: أَدَبِي رَبِّي فَأَحْسَنَ تَأْدِيبِي. (۳) ”میرے رب نے مجھے ادب سکھایا اور

خوب تادیب فرمائی۔“

۱۔ سورۃ التحریم: ۶

۲۔ یہ الفاظ تو نہیں ملے مگر یہ الفاظ مذکور ہیں: ”حسن العهد من الايمان“ ”حسن الخلق من الايمان“

حوالہ کے لیے ملاحظہ فرمائیں: التاريخ الكبير للبخاري ۱/ ۵۱۳، كشف الخفا للعجلوني

۱/ ۴۳۱، ۴۳۱، كنز العمال لعلی المتقی (۱۰۹۳۷) مجمع الزوائد للهيثمي. ۲۴/۸.

۳۔ امام عسکری نے سدی کے طریق سے، جمہورۃ الامثال میں نقل کیا ہے اور سدی نے اسے ابوعمارۃ سے

، انہوں نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے اور اسی روایت میں ہے: فقال علی

رضی اللہ تعالیٰ عنہ: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! انک تکلم الوفود بکلام لا

نفہم اکثرہ فقال: ان اللہ ادبني فاحسن تاديبی، ونشات فی بنی سعد بن بكر. فقال له عمر:

یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! کلنا من العرب، فما بالک الفصحنا؟ فقال: اتانی

جبریل بلغة اسماعیل وغیرها من اللغات، فعلمنی ایها امام سیوطی الدرر المنتشرة میں فرماتے

ہیں: ابن عساکر نے محمد بن عبدالرحمن زہری کے واسطہ سے روایت کیا ہے۔ انہوں نے اپنے باپ سے،

انہوں نے اپنے دادا سے روایت کیا ہے کہ سیدنا ابو بکر صدیق نے عرض کی: یا رسول اللہ! لقد طفت فی

العرب وسمعت فصحاءہم، فما سمعت الفصح منک فمن ادبک قال: ادبني ربی،

ونشات فی بنی سعد. امام زرکشی التذکرة میں فرماتے ہیں کہ اس روایت کو امام ابو سعید سمعانی نے

ادب الاملاء میں صفوان بن مغلص حبلی بن محمد بن عبداللہ کے طریق سے روایت کیا ہے۔ انہوں نے

سفیان ثوری سے اور انہوں نے اعمش سے روایت کیا ہے۔ اعمش کہتے ہیں: قال رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وآلہ وسلم: ان اللہ ادبني فاحسن ادبی ثم امرنی بمکارم الاخلاق فقال: خذ العفو

وامر بالمعروف، الا یہ. امام زرکشی فرماتے ہیں: یہ روایت معنوی طور پر صحیح ہے لیکن صحیح سند کے ساتھ وارد

نہیں ہوئی، (بقیہ حواشی اگلے صفحہ پر۔۔۔۔۔)

یہ جاننا ضروری ہے کہ دین اور دنیا کے سب کاموں کی زیب و زینت ادب سے ہے اور مخلوقات کے ہر مقام پر ادب کی ضرورت ہے۔ اس اصول میں کافر، مسلمان، ملحد، سنی، بدعتی سب متفق ہیں اور تسلیم کرتے ہیں کہ کاروبار میں ادب کی خوبی ہی لازمی ہے اور دنیا میں کوئی رسم بغیر ادب مقبول نہیں۔ لوگوں میں ادب ہی حفظِ مراتب کا ضامن ہے اور دین میں حفظِ سنت اور عزت باہم دست بگریبان ہیں۔ اس لیے کہ جس میں مرؤت اور ادب نہیں اس میں متابعت سنت نہیں ہو سکتی اور جس میں متابعت سنت نہ ہوگی وہ رعایتِ عزت نہیں کر سکتا اور کاروبار میں حفظِ ادب اور تعظیم اسی کی بدولت ہوتا ہے۔ جب دل میں ادب قرار پذیر نہ ہو تو انسان ادب کی بہبود و سود سے محروم رہتا ہے اور تعظیم حق اور شفاء، اتقا سے ہوتی ہے۔ جو شخص بلا لحاظ تعظیم شواہد حقہ زبان پر لائے اسے طریقتِ صوفیاء میں سے کچھ حصہ نہیں ملتا اور سکر و غالبہ کسی حالت میں طالب کو حفظِ ادب سے منع نہیں کرتا۔ اس لیے کہ یہ لوگ عادت پذیر ادب ہوتے ہیں اور عادت طبیعت کا قرینہ ہوتی ہے اور امورِ طبعی کا ساقط ہونا کسی حیوان سے بھی کسی حال میں مقصود نہیں ہوتا، کیونکہ جب تک زندگی قائم ہے اس کا سقوط ہونا محال ہے اسی طرح جب تک شخصیت انسان قائم ہے۔ ہر حالت میں آداب متابعت اس پر جاری ہیں خواہ تکلف سے ہوں یا بلا تکلف۔ جب انسان پر صحو یعنی ہوش کی حالت ہوتی ہے تو وہ تکلف سے حفظِ ادب کرتا ہے اور جب سکر کی حالت ہوتی ہے تو منجانب اللہ ان میں ادب ملحوظ رہتا ہے اور تارک ادب کسی صورت میں ولی نہیں ہو سکتا۔ ”لَاِنَّ الْمَوْدَّةَ عِنْدَ الْاَدَابِ وَ

(بقیہ حواشی گزشتہ صفحہ سے)

امام ابن جوزی نے کتاب الاحادیث الواہیہ میں وفد بنی نہد کی حدیث کے ذیل میں اسے ذکر کیا ہے اور اسے ضعیف قرار دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ روایت صحیح نہیں، اس کی سند میں ضعیف اور مجہول الحال راوی ہیں، امام سخاوی المقاصد الحسنہ میں فرماتے ہیں کہ اس کی سند بہت زیادہ ضعیف ہے۔ اگرچہ ہمارے شیخ ابن حجر نے اپنے بعض فتاویٰ میں اس پر غرابت کا حکم لگایا ہے لیکن معنوی اعتبار سے یہ روایت صحیح ہے اور انتہائی خطبہ میں ابن اثیر نے اسے ذکر کر کے صحیح قرار دیا ہے۔ اس کے علاوہ ابو نعیم نے ”تاریخ اصفہان“ میں بطریق ابن عمر ضعیف سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔ امام ابن تیمیہ فرماتے ہیں۔ کہ اس کی پختہ سند نہیں ملی جبکہ امام سیوطی اسے ”الجامع الصغیر“ میں لائے ہیں اور اسے صحیح قرار دیا ہے اور اسے امام سمعانی کی طرف منسوب کیا ہے کہ انہوں نے ادب الاملاء میں اسے ابن مسعود کے طریق سے روایت کیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں: المقاصد الحسنہ (۳۵) تمیز الطیب من الخبیث (۵۰) کشف الخفاء (۱۶۳)، الجامع الصغیر (۳۱۰) الدرر المنشرة للسیوطی (۸) فیض القدیر للمناوی (۲۲۲/۱) اسنی المطالب (۸۶) الفوائد المجموعۃ للشوکانی (۳۲۷) التذکرۃ للزرکشی (۱۶۱) النہایۃ لابن الاثیر ۲/۱، سبل الہدی و الرشاد ۲/۱۲۹، الوفا، لابن الجوزی ۲/۲۵۶، شرح المواہب ۱۰۱/۳۔

حُسْنُ الْأَدَبِ صِفَةُ الْأَخْبَابِ. ” اس لیے کہ رابطہ مودت ادب کے ساتھ ہے اور حسن ادب محبوبوں کی صفت ہے۔“ جسے اللہ تعالیٰ کرامت عطا فرماتا ہے اس کی علامت یہی ہے کہ وہ آداب دین ملحوظ رکھتا ہے۔ جو محمد بن لعنہم اللہ علیہم اجمعین کے ساتھ ہے وہ بیشک اس کے خلاف ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جب بندہ محبت میں مغلوب ہوتا ہے تو متابعت کا حکم اس سے ساقط ہو جاتا ہے اور اس مسئلہ کو دوسری جگہ بیان کیا جائے گا۔ اِنْ شَاءَ اللَّهُ تَعَالَى

اب یہ یاد رکھنا چاہئے کہ آداب تین قسم کے ہوتے ہیں: ایک توحید میں جو جناب حق تعالیٰ سے ہے۔ وہ یہ ہے کہ ظاہر و باطن اپنے آپ کو بے ادبی سے محفوظ رکھے اور اس طرح رہے جیسے دربار شاہی میں رہا کرتے ہیں اور صحیح حدیث میں ہے کہ ایک روز حضور ﷺ چار زانو تشریف فرماتے کہ روح الامین حاضر ہوئے اور عرض کیا۔ يَا مُحَمَّدُ اجْلِسْ جِلْسَةَ الْعَبْدِ. ”حضور! نشست میں بندوں کی نشست پر تشریف رکھیں۔“

حضرت حارث محاسبی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق مروی ہے کہ آپ نے چالیس سال دیوار سے تکیہ نہ لگایا اور آپ ہمیشہ دوزانو بیٹھتے تھے۔ لوگوں نے آپ سے اس کی وجہ پوچھی۔ آپ نے فرمایا مجھے شرم آتی ہے کہ بحضور حق کے مشاہدہ میں بندوں کی طرح نہ بیٹھوں۔

اور میں علی بن عثمان جلابی ہوں۔ میں خراسان کے ایک قصبہ پہنچا جسے ”مکند“ کہتے ہیں۔ وہاں ایک بزرگ تھے جنہیں ادیب مکندی کہتے تھے۔ یہ وہاں کے مشہور بزرگ تھے۔ یہ بیس سال برابر قیام میں رہے۔ سوائے تشہد کے نماز میں کبھی نہ بیٹھے۔ ان سے میں نے اس کا سبب پوچھا۔ فرمایا: ابھی میرا وہ درجہ نہیں کہ حضور حق کا مشاہدہ بیٹھ کر کروں۔

اور حضرت ابو یزید رحمۃ اللہ علیہ سے لوگوں نے پوچھا: بِسْمِ وَجَدْتُ مَا وَجَدْتُ ”آپ نے جو کچھ پایا کس طرح پایا۔“ فرمایا: بِحُسْنِ الصُّحْبَةِ مَعَ اللَّهِ تَعَالَى عَزَّ وَجَلَّ ”حق تعالیٰ کی خدمت میں با ادب رہنے سے۔“ میں ظاہر باطن میں یکساں رہا۔ آدمی کو چاہیے کہ اپنے معبود کے حضور میں رہنے کا حسن ادب زینخا سے سیکھیں کہ جب وہ حضرت یوسف علیہ السلام کی خلوت میں جا کر اپنی آرزو کی خواستگار ہوئی تو پہلے اپنے بت کو پردہ سے چھپایا۔ یوسف علیہ السلام نے پوچھا کہ یہ پردہ کیوں ڈال رہی ہے۔ زینخا بولی: اپنے معبود سے اپنے کو چھپاتی ہوں تاکہ وہ مجھے تیرے ساتھ ایسی حالت میں نہ دیکھے کیونکہ اس کے آگے ایسا کام شرط ادب کے خلاف ہے۔

اور جب یوسف علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے یعقوب علیہ السلام سے ملایا اِلَّا اللہ تَعَالَى نے انہیں دولت و صل سے سرفراز فرمایا اور زینخا کو پھر شباب بخشا اور وہ مشرف باسلام ہوئی اور حضرت

یوسف علیہ السلام کے نکاح میں آئی تو یوسف علیہ السلام نے ان کی طرف ارادہ فرمایا تو زلیخا آپ سے بھاگتی تھی۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا: زلیخا! میں تیرا وہی محبوب ہوں، مجھ سے دور کیوں بھاگتی ہے، شاید میری دوستی تیرے دل میں نہیں رہی۔ زلیخا بولی: نہیں قسم بخدا! دوستی قائم ہے بلکہ پہلے سے زیادہ ہے لیکن مجھے اپنے معبود حقیقی کا پاس ادب ہے، جس دن میں نے آپ کی طرف خلوت چاہی تھی وہاں ایک بت معبود تھا جو تم نے نہیں دیکھا، اس لیے کہ اس کی دونوں آنکھیں اندھی تھیں۔ میں نے اس پر پردہ ڈالا تاکہ بے ادبی نہ ہو۔ اب جبکہ میرا معبود دانا و بینا ہے، بلا بصر بصیر ہے اور بلا آلہ سب کچھ جانتا ہے، میں جس حال میں بھی ہوں وہ مجھے دیکھتا ہے اس لیے میں تارک ادب ہونا نہیں چاہتی۔

اور جب رسول اکرم ﷺ کو معراج میں لے گئے تو انہوں نے اپنے پاس ادب سے دونوں جہاں کی طرف نگاہ نہ فرمائی۔ حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغَىٰ﴾ (۱) ”یعنی دنیا دیکھنے کے لیے آنکھ مائل نہ ہوئی اور نہ حد سے متجاوز ہوئے۔“

دوسری قسم ادب باہمی کاروبار میں ہے کہ سب حالات میں اپنے نفس سے مروت کی رعایت کرے تاکہ خلقت میں ہو یا حضورِ حق، بندہ قطعی بے ادب نہ ہو۔ اس کی تفصیل یوں ہے کہ سوا سچ کے نہ بولے۔ حتیٰ کہ جو کچھ اپنے حق میں خلاف جانے وہ زبان پر نہ لائے کیونکہ اس میں بے مروتی ہوتی ہے۔ دوسرے کم کھائے تاکہ قضا حاجت میں جانے کی ضرورت نہ ہو۔ تیسرے یہ کہ اپنے اس عضو کو نہ دیکھے جو غیر کو دیکھنا ناجائز ہو۔

کیونکہ امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ نے اپنی شرم گاہ کو کبھی نہ دیکھا۔ لوگوں نے اس کا سبب پوچھا۔ فرمایا اپنی اس چیز کو دیکھنے سے میں شرم کرتا ہوں جس کی جنس کا دیکھنا حرام ہو۔ دوسرا آدابِ صحبت و خلق میں یہ بہترین چیز ہے کہ سفر و حضر میں خلق کے ساتھ خوبی معاملہ میں سلوک کیا جائے اور ہر سہ اقسام ادب ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتیں۔

اب میں اپنے مقدور کے مطابق انہیں با ترتیب بیان کرتا ہوں تاکہ تم پر اور لوگوں پر

آسان ہو۔ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ



صحبت اور متعلقاتِ صحبت

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمَنُ وُدًّا ۝ (۱)
(أَيُّ بِحُسْنِ رِعَايَتِهِمُ الْإِخْوَانَ)﴾

”یعنی جو ایمان لائے اور عمل صالح کیے تو کر دیتا ہے ان کے لیے اللہ تعالیٰ ان کا چاہنے والا“ یعنی ان کے حسن رعایت کے صلہ میں لوگوں کو ان کا بھائی بنا دیتا ہے۔

اس لیے وہ دلوں کو خوش کرتے اور بھائیوں کے حق ادا کرتے ہیں اور انہیں اپنے اوپر فضیلت دیتے ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا:

ثَلَاثٌ يَصِفِينَ لَكَ وَدَّ أَخِيكَ أَنْ تُسَلِّمَ عَلَيْهِ إِنْ لَقَيْتَهُ وَتُوسِعَ لَهُ فِي الْمَجْلِسِ وَتَدْعُوهُ بِأَحَبِّ أَسْمَائِهِ.

”تین چیزیں تیرے دوست کی محبت کو تیرے لیے خالص بناتی ہیں، یہ کہ سلام کرے اس پر جب تجھے ملے۔ دوسرے یہ کہ مجلس میں اس کے لیے فراخی دے۔ تیسرے یہ کہ اسے ایسے نام سے پکارے جو اسے پسندیدہ ہو۔“

اور یہ بھی اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ فَأَصْلِحُوا بَيْنَ أَخَوَيْكُمْ ۝ (۲)﴾

”یعنی مومن تو مومنوں کے بھائی ہیں تو اپنے بھائیوں میں صلح رکھو اور دونوں آپس میں مہر و عنایت سے پیش آؤ“ تاکہ ایک دوسرے کا دل آرزو مند نہ ہو۔ اور حضور ﷺ نے فرمایا: اَكْثَرُوْا مِنْ الْإِخْوَانِ فَإِنَّ رَبَّكُمْ حَتَّىٰ كَرِيمٌ يَسْتَحِبُّ أَنْ يُعَذِّبَ عَبْدَهُ بَيْنَ إِخْوَتِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ (۳) ”بھائی زیادہ بناؤ اور حفظِ ادب اور معاملت سے اچھی طرح پیش آؤ کہ اللہ تعالیٰ حنیف و کریم ہے اور حیاءِ کرم سے اپنے بندہ کو اس کے

بھائی اور برادری میں بروز قیامت عذاب نہیں کرنا چاہتا۔“ لیکن ہمیں یہ چاہیے کہ محبت و صحبت اللہ تعالیٰ کے لیے ہو، نہ ہوا و نفس اور کسی دنیاوی غرض کے لیے، تاکہ بندہ اس کے حفظِ ادب سے مشکور ہو جائے۔ اور حضرت مالک بن دینار رضی اللہ عنہ نے اپنے داماد مغیرہ بن شعبہ کو کہا: يَا مُغِيرَةُ كُلُّ أَخٍ وَصَاحِبٍ لَّمْ تَسْتَفِذْ مِنْهُ فِي دِينِكَ خَيْرًا فَالْبُدُّ عَنْكَ صُحْبَتَهُ حَتَّى تَسْلِمَ. ”اے مغیرہ! جس بھائی اور یار سے تجھے اس کی صحبت میں فائدہ اخروی نہ ہو اس کے پاس نہ بیٹھ ایسے شخص کی صحبت تجھ پر حرام ہے۔“ اس کا یہ مطلب ہے کہ یا تو اپنے سے اچھے کے پاس بیٹھ یا اپنے سے ادنیٰ کے پاس۔ کیونکہ اگر تو اپنے سے اچھے کے پاس بیٹھے گا تو تجھے اس سے دین کا فائدہ ہوگا اور اگر اپنے سے ادنیٰ کے پاس بیٹھے گا تو اسے تجھ سے دین کا فائدہ ہوگا۔

کیونکہ جب وہ تجھ سے کچھ سیکھے گا تو دینی فائدہ ہوگا اور اگر تو اس سے کچھ سیکھے گا تو تجھے دینی فائدہ پہنچے گا۔ اس بناء پر حضور ﷺ نے فرمایا۔ اِنَّ مِنْ تَمَامِ التَّقْوَى تَعْلِيمٌ مَنْ لَمْ يَعْلَمْ: ”کمال پرہیزگاری یہ ہے کہ جو جاہل ہو اسے تعلیم دے۔“

اور یحییٰ بن معاذ رضی اللہ سے ہے کہ انہوں نے فرمایا:

بِئْسَ الصِّدِّيقُ صِدِّيقٌ تَحْتَاجُ اَنْ تَقُولَ لَهُ اذْكُرْنِي فِي دُعَائِكَ
وَبِئْسَ الصِّدِّيقُ صِدِّيقٌ تَحْتَاجُ اَنْ تَعِيشَ مَعَهُ بِالْمَدَارَاةِ وَبِئْسَ
الصِّدِّيقُ صِدِّيقٌ يُلْجِئُكَ اِلَى الْاِعْتِزَالِ فِي زَلَّةٍ كَانَتْ مِنْكَ۔

”وہ دوست بہت بُرا ہے جس کا دوست، دوست سے اس امر کی احتیاج کرے کہ اس سے کہا جائے کہ اپنی دعا میں مجھے یاد رکھنا اس لیے کہ ایک ساعت کا حق صحبت ہمیشہ یار کی دعا کا مقتضی ہے اور وہ دوست بہت برا دوست ہے جو زندگی میں ایسا رہے کہ اس کے ساتھ خوشامد ہو۔ اس لیے کہ صحبت کا سرمایہ خوشی ہے اور وہ دوست بہت برا ہے جس سے گناہ پر اعتذار کرنا پڑے اور اپنی ذلت اس کے آگے ظاہر ہو۔“ اس لیے کہ عذر بیگانگی میں ہوتا ہے اور صحبت میں بیگانگی بری ہوتی ہے۔

اور حضور ﷺ نے فرمایا:

الْمَرْءُ عَلَى دِينِ خَلِيلِهِ فَلْيَنْظُرْ اَحَدُكُمْ مَنْ يُخَالِلُ.

”یعنی انسان اپنے دوست کے دین پر ہوتا ہے تو دیکھنا چاہئے تمہیں کہ کون

کس سے محبت رکھتا ہے۔“ (۱)

اگر نیکوں سے اس کی محبت ہے تو وہ اگرچہ برا ہو مگر نیک ہے اس لیے کہ وہ صحبت اسے نیک کر دے گی اور اگر بروں کی صحبت میں رہتا ہے تو اگرچہ نیک ہو مگر برا ہے اس لیے کہ بری صحبت اُسے بُرا بنا دے گی۔

اور حکایتوں میں ہے کہ ایک مرد کعبہ کے طواف میں کہہ رہا تھا۔ اَللّٰهُمَّ اَصْلِحْ اِخْوَانِي فَقِيلَ لَهٗ لِمَ لَا تَدْعُ لَكَ فِي هٰذَا الْمَقَامِ. ”الہی! میرے بھائیوں کو صالح کر دے۔ اسے لوگوں نے کہا: اس مقام پر تو اپنے لیے دعا کیوں نہیں کرتا بلکہ بھائیوں کے لیے دعا کرتا ہے۔“ اس نے جواب دیا: اِنَّ لِيْ اِخْوَانًا اَرْجِعُ اِلَيْهِمْ فَاِنْ صَلَحُوْا صَلَحْتُ مَعَهُمْ وَاِنْ فَسَدُوْا فَسَدْتُ مَعَهُمْ. اے بھائی! جب ان میں جاؤں گا اگر وہ صالح ملے تو میں بھی ان کی صالحیت سے صالح ہوں گا اور اگر وہ فسادی رہے تو میں بھی ان کے فساد سے مفسد ہو جاؤں گا۔“ جب صحبت صالحاں میرا قاعدہ ہے تو میں بھی ان کی صحبت سے صلاحیت اختیار کر لوں گا۔ اس لیے اپنے بھائیوں کے لیے دعا کرتا ہوں تاکہ ان کے ذریعہ میرا مقصد حاصل ہو جائے اور اس کی اصل یہ ہے کہ نفس کو سکون یادوں سے حاصل ہوتا ہے اور انسان جس گروہ میں رہے گا، اس کی عادت و خصلت اختیار کرے گا۔ اس لیے کہ عمل و ارادہ صحبت سے پیدا ہوتا ہے جسے عمل والے کی صحبت ملے گی وہی عادت اس میں پرورش ہوگی اس لیے کہ صحبت کا اثر طبیعت پر خاص اثر رکھتا ہے۔ حتیٰ کہ صحبت عالم سے ایک جاہل عالم ہو جاتا ہے۔ طوطے کو دیکھو کہ آدمی کی صحبت اور تعلیم سے انسانوں کی زبان بولنے لگتا ہے۔

مشائخ صوفیاء رحمہم اللہ اسی وجہ میں پہلے صحبت و مصاحبت کرتے ہیں، پھر مرید کو تعلیم دیتے ہیں۔ اس پر مشائخ صوفیاء نے بحث صحبت میں بہت سی کتابیں تصنیف کی ہیں اور صحبت کی بحث کو واضح فرمایا ہے۔

حضرت جنید رضی اللہ عنہ نے ”تَصْحِيْحُ الْاِرَادَةِ“ کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے۔ احمد بن حنبل نے ”الرِّعَايَةُ بِحَقُوْقِ اللّٰهِ“ کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے۔ محمد بن علی ترمذی کی ایک کتاب ”آداب المریدین“ ہے۔

ابوالقاسم الحکیم اور ابو بکر وراق اور سہل بن عبداللہ اور ابو عبدالرحمن سلمیٰ اور استاذ ابوالقاسم قشیری رحمہم اللہ سب نے اس بحث میں کتابیں تصنیف کی ہیں اور یہ لوگ اس فن میں امام ہوئے ہیں۔ اس کتاب میں میرا مقصد یہ ہے کہ جس کے پاس یہ کتاب ہو اُسے دوسری کتابوں کی حاجت نہ رہے۔ جیسا کہ میں اس کتاب کے مقدمہ اور تیسرے سوال کے جواب میں کہہ چکا ہوں۔ بہر حال یہ کتاب طالب طریقت کو کافی ہے۔ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ الْعَزِيْزُ

آدابِ صحبت

جب تو نے یہ سمجھ لیا کہ مرید کے لیے سب سے بہترین چیز صحبت ہے تو لازمی طور پر آدابِ صحبت کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ اس لیے کہ بلا صحبت مرید کا تنہا رہنا اسے ہلاک کر دیتا ہے۔ پیغمبر اعظم سید اکرم ﷺ نے فرمایا: الشَّيْطَانُ مَعَ الْوَاحِدِ وَهُوَ مِنَ الْاِثْنَيْنِ اَبَعْدُ (۱) ”شیطان تنہا کے ساتھ ہوتا ہے اور دو آدمی جہاں ہوں، ان سے شیطان دور رہتا ہے۔“

اللہ تعالیٰ کا بھی ارشاد ہے:

﴿ مَا يَكُونُ مِنْ نَجْوَى ثَلَاثَةٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ ﴾ (۲)

”نہیں ہوتے تین رازدار مگر چوتھا ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ ہوتا ہے۔“

تو مرید کے لیے تنہا رہنے سے بڑی آفت کوئی نہیں۔

ایک حکایت ہے کہ جنید رحمۃ اللہ علیہ کے ایک مرید کو خیال آیا کہ میں مرتبہ کمال کو پہنچ گیا ہوں اور اب مجھے صحبت کی بہ نسبت تنہا رہنا اچھا ہے۔ چنانچہ وہ گوشہ نشین ہو گیا اور صحبت ترک کر دی۔ جب رات ہوئی تو کوئی جماعت آئی اور اونٹ لائی اور اس صوفی کو کہا: تجھے بہشت میں جانا

۱۔ یہ مسند امام احمد بن حنبل ۱/۱۸۱، ۲۶۰ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ بن خطاب سے روایت کردہ حدیث شریف کا ایک حصہ ہے اور مکمل روایت یوں ہے استوصوا باصحابی خیرا، ثم الذین یلونہم، ثم الذین یلونہم، ثم یفشوا لکذب حتی ان الرجل لیبتدیء بالمشاهدة قبل ان یسألها لمن اراد منکم بحبحة الجنة فلیلزم الجماعة، فان الشیطان مع الواحد وهو من الاثنین ابعده، لا یخلون احدکم بامرأة فان الشیطان ثالثهما، ومن سرته حسنته، وساءتہ سینتہ فهو مو من۔ اسے امام احمد بن حنبل نے عبداللہ بن عامر سے انہوں نے اپنے والد سے مندرجہ ذیل الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے جس کا آغاز اس طرح سے ہوتا ہے۔ من مات ولیست علیہ طاعة مات مية جاهلية اور اسی روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں: ان الشیطان مع الواحد وهو من الاثنین ابعده (مسند احمد ۳/۴۳۶) اور المستدرک للحاکم (۵۵۵/۳) میں حضرت عبداللہ بن مسعود سے ان الفاظ کے ساتھ مروی ہے: الزموا هذه الطاعة والجماعة... وان ما تکرهون فی الجماعة خیر مما تحبون فی الفرقة۔ اسے امام حاکم نے امام بخاری اور امام مسلم کی شرائط پر صحیح قرار دیا ہے۔

۲۔ سورة المجادلة: ۷

چاہیے۔ یہ اس بشارت پر فوراً اونٹ پر سوار ہو گیا۔ تھوڑی دیر میں یہ ایسے مقام پر پہنچا جہاں باغ و بہار تھا اور خوبصورت لوگوں کا گروہ تھا اور عمدہ عمدہ لذیذ و نفیس کھانے اور بہتی نہریں۔ شب بھر یہ وہاں رہا۔ صبح جو ہوئی تو اپنے آپ کو اسی عبادت خانہ میں پایا جہاں تھا۔ چند روز ایسا ہوتا رہا حتیٰ کہ اس میں رعونت بشری سرایت کر گئی اور غرور جوانی غالب آیا۔ آخرش اس نے لوگوں پر اپنی کیفیت ظاہر کرنی شروع کر دی اور دعویٰ ولایت کرنے لگا۔

یہ خبر لوگوں نے حضرت جنید رضی اللہ عنہ کو پہنچائی۔ آپ اس کے حجرہ عبادت پر تشریف لائے اور اس سے دریافت حال کیا۔ اس نے سب کیفیت عرض کی۔ آپ نے فرمایا آج رات جب تو یہ حال دیکھے تو لا حول و لا قوۃ الا باللہ العلیٰ العظیم تین بار پڑھ لینا۔ مختصر یہ کہ جب شام ہوئی اور اسے حسب معمول لے کر چلے تو اس کے دل میں حضرت جنید کی تعلیم سے بدگمانی ہوئی۔ تھوڑی دیر بعد تجربہ کے خیال سے اس نے تین بار لا حول پڑھا تو وہ گروہ شور کرتا ہوا غائب ہو گیا اور اس نے اپنے آپ کو مزبلہ پر پایا جہاں گندگی اور جھوٹی ہڈیوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ تو یہ اپنی غلطی سے واقف ہوا اور تنہا بیٹھنے سے تائب ہوا اور صحبت اولیاء میں حاضری دینے لگا۔

بہر حال یہ سمجھ لینا چاہیے کہ مرید کو تنہائی کی آفت سے زیادہ کوئی آفت نہیں اور صحبت مشائخ کی یہ بھی شرط ہے کہ جن کے پاس بیٹھے انھیں ان کے درجہ کے مطابق پہچانے۔ بوڑھوں سے یا ادب رہے اور ہم جنسوں سے عشرت میں زندگی بسر کرے۔ بچوں سے شفقت کے ساتھ پیش آئے بلکہ معمر لوگوں کو باپ کی جگہ اور ہم عمروں کو بھائی کے برابر، بچوں کو اولاد کی جگہ جانے۔ ہر گناہ سے اجتناب کرے، حسد سے بچتا رہے، عداوت سے روگردانی کرے اور نصیحت کرنے میں دریغ نہ کرے۔ مجلس میں دوسرے کی غیبت کرنا اور خیانت کرنا ایک دوسرے کی عقل اور فعل پر حرف زنی کرنا بھی آداب صحبت میں ممنوع ہے۔

اس لیے کہ جب ابتداء میں صحبت حق تعالیٰ کے لیے ہو تو کسی قسم کا قول و فعل نا ملائم کسی بندے کے ساتھ نہیں کرنا چاہیے اور مصنف کتاب رحمۃ اللہ علیہ کہتا ہے کہ شیخ المشائخ ابو القاسم گرگانی رحمۃ اللہ علیہ سے میں نے پوچھا کہ شرط صحبت کیا ہے؟ آپ نے جواب دیا کہ تجھے صحبت میں اپنی حفاظت کرنی چاہیے کیونکہ اس میں ہر قسم کی آفات موجود ہیں۔ اس لیے کہ ہر ایک اپنے مطلب کا خواہاں ہوتا ہے اور آسائش طلب کو صحبت سے تنہائی بہتر ہے۔ جب بندہ اپنا حظ ترک کرے گا تو اپنے مصائب کے حظ کی رعایت کرے گا اور اس صحبت سے فائدہ لے گا۔

ایک درویش فرماتے ہیں کہ ایک وقت میں نے کوفہ سے مکہ معظمہ جانے کا ارادہ کیا۔

راستہ میں حضرت ابراہیم خواص رحمۃ اللہ علیہ سے ملاقات ہو گئی۔ میں ان کی صحبت میں رہنے کا خواستگار ہوا۔ آپ نے فرمایا: صحبت کے لیے امیری اور فرمانبرداری چاہیے۔ تو کیا چاہتا ہے، میں امیر بنوں یا فرمانبردار۔ میں نے عرض کیا، آپ نہیں۔ آپ نے فرمایا: تو میرا فرمانبردار ہوگا، اگر ایسا ہے تو اب تو میرے حکم سے باہر نہ آ۔ میں نے تسلیم کر لیا۔

جب ہم اپنی منزل پر پہنچے تو انہوں نے مجھے حکم دیا بیٹھ جاؤ۔ میں بیٹھ گیا۔ انہوں نے کنویں سے پانی نکالا جو نہایت سرد تھا۔ آپ نے لکڑیاں جمع کیں پانی گرم کیا اور جب میں یہ ارادہ کرتا کہ یہ کام میں کروں تو حکم ملتا، بیٹھ جا۔ میں بیٹھ جاتا اور شرط حکم بجالاتا۔

شام ہوئی۔ اتفاق سے سخت بارش ہو گئی۔ آپ نے گدڑی مجھ پر ڈال دی اور صبح تک میرے سر پر کھڑے رہے۔ مجھے شرم آتی تھی مگر شرط صحبت کے ماتحت کچھ نہ کر سکتا تھا۔ جب صبح ہوئی میں نے عرض کیا اے شیخ! آج میں امیر بنتا ہوں۔ ابراہیم خواص نے فرمایا اچھا۔ جب ہم دوسری منزل پر پہنچے۔ حضرت نے وہی خدمات اپنے ذمہ لیں۔ میں نے عرض کیا حضرت اب میں امیر ہوں۔ میرا حکم مایہ۔ آپ نے فرمایا: وہ نافرمان ہوتا ہے جو امیر کو اپنی خدمت کا حکم دے۔

حتیٰ کہ اسی طرح مکہ معظمہ پہنچے۔ آخر شرم کی وجہ سے میں حضرت کے پاس سے بھاگ آیا۔ منیٰ میں حضرت نے مجھے دیکھ لیا۔ فرمایا: بیٹا! تجھے لازم ہے کہ درویشوں کے ساتھ ایسی مصاحبت کرے جیسے میں نے تیرے ساتھ کی، اسے یاد رکھ۔

انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

صَحِبْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَخَدَمْتُهُ عَشْرَ سِنِينَ
فَوَاللَّهِ مَا قَالَ أُمَّ قَطُّ وَمَا قَالَ لِي بِشَيْءٍ فَعَلْتُ لِمَ فَعَلْتُ كَذَا وَلَا
بِشَيْءٍ لَمْ أَعْلَمْ لِمَ لَا فَعَلْتُ كَذَا. (۱)

”حضور کی خدمت میں میں نے دس سال گزارے۔ خدا کی قسم! آپ نے کبھی اُمّ قَطُّ تک نہ فرمایا اور جو کام میں نے کیا کبھی مجھے نہ فرمایا کہ یہ کام تو نے کیوں کیا اور جو کام میں نے نہ کیا کبھی نہ فرمایا کہ فلاں کام تو نے کیوں نہ کیا۔“

۱۔ اسے امام مسلم نے اپنی صحیح ۷۵۱۷ (کتاب الفضائل: باب كان صلى الله عليه وآله وسلم احسن الناس خلقا) میں اور امام ترمذی نے اپنی جامع ۲۱۱۲ ابواب البر والصلة: باب ماجاء في خلق النبي صلى الله عليه وآله وسلم) میں اور الشرائع المحمدية (حدیث: ۲۳۰، باب تواضع رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم) میں ذکر کیا ہے۔

اور مقیم خدمتِ حق میں بیٹھتے ہیں۔ اس لیے کہ مسافروں میں طلب کا نشان ہوتا ہے اور مقیموں میں حصول کا اشارہ ہے۔ تو جس نے پالیا وہ بیٹھ کر مقیم ہو گیا۔ یہ اس سے افضل ہے جو ابھی طلب میں ہے اور مسافر ہے اور مقیم کو چاہیے کہ مسافر کو اپنے سے اچھا جانے۔ اس لیے کہ یہ صاحبِ تعلق ہیں اور مسافر تعلق سے مبرا اور مقیم ایک طرف قائم ہیں اور مسافر طلب میں ہیں۔ مقیم اپنے موقف میں ہیں، اس اعتبار سے انہیں چاہیے کہ بوڑھے جوانوں کو بہتر سمجھیں۔ اس لیے کہ یہ دنیا میں تھوڑی دیر رہنے والے ہیں اور ان کے گناہ کم ہیں اور جوانوں کو چاہیے کہ بوڑھوں کو افضل جانیں۔ اس لیے کہ یہ عبادت میں پیشرو ہیں اور خدمت میں مقدم۔ جب ہمارے بیان کے مطابق دونوں رہیں تو ایک دوسرے سے نجات پائیں گے ورنہ ہلاک ہو جائیں گے۔

فصل:

اصل آداب کی اجتماعِ خصائلِ خیر ہے اور اسی وجہ سے ادب دہندہ کو ”ادیب“ کہتے ہیں۔ اس لیے کہ اس سے جو کچھ صادر ہوتا ہے وہ بہتر ہوتا ہے: **فَالِدِي اجْتَمَعَ فِيهِ خِصَالُ الْخَيْرِ فَهُوَ اَدِيْبٌ**۔ ”ادیب“ تو وہ جس میں یہ اچھی خصلتیں جمع ہوں وہی ادیب ہے۔“ اور علمی رواج میں جو علم لغت اور نحو جانتا ہے اس کو ادیب کہتے ہیں۔ اور گروہِ صوفیاء کے نزدیک **الْاَدَبُ هُوَ الْوُقُوفُ مَعَ الْحَسَنَاتِ وَمَعْنَاهُ اَنْ تُعَامِلَ اللّٰهَ فِي الْاَدَبِ سِرًّا وَعَلَانِيَةً وَاِذَا كُنْتَ كَذَالِكَ كُنْتَ اَدِيْبًا وَاِنْ كُنْتَ اَعْجَمِيًّا وَاِنْ لَمْ تَكُنْ كَذَالِكَ تَكُوْنُ عَلٰى ضِدِّهِ**۔ ”ادب نیکوں پر قائم رہتا ہے اور اس کے یہ معنی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنے تمام عمل ادب سے کرے، خفیہ ہو یا علانیہ۔ تو جب تو ایسا ہو جائے تو تو ادیب ہے، اگرچہ تو عجمی ہو اور اگر تو ایسا نہیں تو پھر اس کی ضد تجھ میں ہے۔“ اس لیے کہ زبان کے معاملات میں کوئی قدر و قیمت نہیں اور ہر حال میں عالمِ عاقلوں سے زیادہ بزرگ ہیں۔

مشائخِ رحمہم اللہ میں سے ایک کو لوگوں نے پوچھا کہ شرطِ ادب کیا ہے۔ انہوں نے فرمایا ایک جملہ میں تیرا جواب کہتا ہوں۔ میں نے سنا ہے کہ ادب وہ ہے کہ جب تو بات کرے تو تیرا کلام صادق ہو، اگر معاملہ کرے تو معاملہ حق ہو اور کلام صادق، اگرچہ سخت ہو نمکین ہوتا ہے اور معاملہ نیک اگرچہ مشکل ہو خوب ہوتا ہے۔ تو جب تو بات کرے تو تیرا کلام سچ ہو اور جب خاموش رہے تو خاموشی حق پر ہو۔

ابونصر سراج، صاحبِ لمع اپنی کتاب ”بیان ادب“ میں بہت وضاحت سے فرماتے ہیں:

النَّاسُ فِي الْأَدَبِ عَلَى ثَلَاثِ طَبَقَاتٍ أَمَّا أَهْلُ الدُّنْيَا فَكَثُرَ آدَابُهُمْ
 فِي الْفَصَاحَةِ وَالْبَلَاغَةِ وَحِفْظِ الْعُلُومِ وَأَسْمَارِ الْمُلُوكِ وَأَشْعَارِ
 الْعَرَبِ وَ أَمَّا أَهْلُ الدِّينِ فَكَثُرَ آدَابُهُمْ فِي رِيَاضَةِ النَّفْسِ وَتَأْدِيبِ
 الْجَوَارِحِ وَحِفْظِ الْحُدُودِ وَتَرْكِ الشَّهَوَاتِ وَ أَمَّا أَهْلُ
 الْخُصُوصِيَّةِ فَكَثُرَ آدَابُهُمْ فِي طَهَارَةِ الْقَلْبِ وَمُرَاعَاةِ
 الْأَسْرَارِ وَالْوَفَاءِ بِالْعُهُودِ وَحِفْظِ الْوَقْتِ وَقِلَّةِ الْإِتِّفَاتِ إِلَى
 الْخَوَاطِرِ وَحُسْنِ الْأَدَبِ فِي مَوَاقِفِ الطَّلَبِ وَأَوْقَاتِ الْحُضُورِ
 وَمَقَامَاتِ الْقُرْبِ .

”لوگ ادب میں تین قسم پر ہیں:

ایک اہل دنیا کہ ان کے نزدیک ادب فصاحت و بلاغت اور حفظِ علوم اور اذکارِ ملوک اور
 اشعارِ عرب ہیں۔ دوسرے اہل دین کہ ان کے نزدیک ادب نفس کی ریاضت اور اعضاء کی تادیب
 اور حدود اللہ کی نگہداشت اور ترکِ شہوات۔ تیسرے اربابِ خصوصیت ان کے نزدیک ادب دل کا
 پاک رکھنا اور اسرار کی رعایت اور ایفاءِ عہد اور وقت کا محفوظ رکھنا پر اگندہ خیالات سے نظر روکنا اور
 طلب میں نیک کام اور موافقِ دل میں نیک اور مقامِ قرب میں مؤذّب رہنا اور حضوری کے موقعہ
 پر نیک عمل اور یہ جامع کلام ہے۔ اس کی تفصیل اس کتاب میں متفرق جگہ پر آئے گی۔

وَاللَّهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِينَ



آدابِ صحبتِ اقامت

جب درویشِ اقامت اختیار کرے، بدونِ سفر۔ اس کے آداب میں یہ ہے کہ جب کوئی مسافر اس کے پاس آئے تو نہایت خندہ پیشانی سے پیش آئے اور اسے باعزت بٹھائے اور یہ سمجھے کہ یہ ضیفِ ابراہیم علیہ السلام ہے اور یہ انہیں مکرمین سے ہے جو ابراہیم علیہ السلام کے پاس آئے تھے اور وہی تواضع کرے جو ابراہیم علیہ السلام اپنے مہمانوں کے ساتھ کرتے تھے۔ جو کچھ حاضر ہو بے تکلف انہیں پیش کرے۔ جیسا کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿فَجَاءَ بِعِجْلٍ سَمِينٍ﴾ (۱) اور یہ نہ پوچھے کہ کہاں سے آئے ہو یا کہاں جا رہے ہو یا کیا نام ہے۔ یہ آدابِ صحبت کے خلاف ہے بلکہ ان کا آنا حق کی طرف سے سمجھے اور ان کا جانا بھی حق کی جانب اور ان کا نام بندہ حق خیال کرے۔ پھر اندازہ کرے کہ وہ خلوت میں راضی ہے یا جلوت میں۔ اگر وہ تنہائی پسند ہو تو اس کے لیے جگہ خالی کر دے۔ اگر وہ جلوت پسند ہے تو ویسا انتظام کرے تاکہ اسے اُنس و عشرت حاصل ہو اور جب مسافر رات کو تکیہ پر سر رکھے اور لیٹ جائے تو مقیم کو چاہیے کہ اس کے قدم پر ہاتھ رکھے۔ اگر وہ منع کرے اور کہہ دے کہ مجھے عادت نہیں تو اس پر اصرار نہ کرے تاکہ اس پر گراں نہ ہو۔ دوسرے روز حمام میں لے جائے مگر حمام صاف ستھرا ہو۔ اس کے کپڑے حمام میں خراب نہ ہوں اور اس کی خدمت اجنبی خادموں سے نہ کرائے۔ اس کی خدمت میں ایسے خادم مقرر کرے جو اس کی خدمت دل سے کرنے والا ہو تاکہ اس کے پاک ہونے اور صاف ہونے میں تمام آفتوں سے پاک ہو۔ میزبان کو چاہیے کہ اپنے مہمان کی تواضع میں اس کی پشت ملے، اس کے گھٹنوں، پاؤں، تلوؤں اور ہاتھوں کو ملے اس سے زیادہ شرطِ ادب نہیں۔ اور اگر اس کے لیے نیا کپڑا پہنانے کی توفیق ہو تو دریغ نہ کرے اور اگر نہ ہو تو تکلف بھی نہ کرے اور وہی اس کے کپڑے پاک کر کے جب وہ حمام سے نکلے پہنا دے۔

وہ مہمان اگر دو تین روز ٹھہرے اور اس شہر کے کسی بزرگ یا امامِ اسلام سے ملنا چاہے تو اگر وہ صحیح ہو تو ملا دے اور اگر وہ ملنا نہ چاہے تو اس پر اصرار و اجبار نہ کرے۔

اس لیے کہ طالبانِ حق پر ایسا وقت بھی ہوتا ہے کہ اپنے دل سے اختیار میں نہیں رہتے۔ کیا تو نے دیکھا کہ ابراہیم خواص رحمۃ اللہ علیہ کو لوگوں نے پوچھا کہ اپنے سفر کے عجائبات سناؤ۔ آپ نے فرمایا خضر علیہ السلام نے مجھ سے مصاحبت چاہی۔ میں نے منظور نہ کی کیوں کہ میرا دل نہیں مانا۔ اس لیے کہ ماسوائے حق تعالیٰ کسی کی میرے دل میں قدر و عظمت ہو۔

لیکن یہ بھی نہ چاہے کہ مقیم آدمی مسافر کو کسی دنیا دار کے سلام کے لیے لے جائے یا ان کی مہمانی میں شریک کرے یا کسی دنیا دار کی بیمار پرسی کو لے جائے۔

جس مقیم کو مسافروں سے یہ طمع ہو کہ انھیں اپنی گدائی کا ذریعہ بنائے اور ایک گھر سے دوسرے گھر لے جائے، ایسے مقیم کو مسافروں کی خدمت نہ کرنی چاہیے۔ کیونکہ اس میں ان کی ذلت ہے۔ اور میں کہ علی بن عثمان جلابی ہوں مجھے اپنے سفروں میں مشقت اور رنج زیادہ سخت یہ نہیں کہ جاہل خادم، ناپاک مقیم کبھی مجھے خواجہ کے گھر کبھی کسی دہقان کے گھر لے جاتے اور میں باطن میں ان کے ساتھ کراہت سے جاتا اور بظاہر جو انمردی کرتا اور جو بے طریقہ مقیم میرے ساتھ ایسا کرتا میں دل میں عہد کرتا کہ جب میں مقیم ہوں گا تو اپنے مہمان کے ساتھ ایسا نہ کروں گا۔ اور بے ادبوں کی صحبت سے اس سے زیادہ فائدہ نہیں ہوتا جو اس سے زیادہ تجھے ناخوش معلوم ہو وہ نہ کرے۔

اور اگر کوئی درویش پاؤں پھیلانے تو چند روز اسے رکھ کر اس کی دنیاوی ضرورت فوراً رفع کر دے اور اگر یہ مسافر بے ہمت ہو تو مقیم کو نہ چاہیے کہ محالات ضروری میں بے ہمتی کرے اور اس کے تابع ہو جائے، کیونکہ یہ طریق آزادوں کا نہیں۔ جب ضرورت ہو تو بازار میں لین دین کو جانا چاہیے۔ یا بادشاہوں کے حضور میں سپہ گری کو۔ اس کو آزادوں کی صحبت سے کیا کام ہے۔

روایت ہے کہ جنید رحمۃ اللہ علیہ اپنے اصحاب کے ساتھ ریاضت کے لیے بیٹھے تھے۔ ایک مسافر آیا۔ اس کی مہمانداری میں انہوں نے تکلف کیا اور کھانا لائے۔ اس نے کہا مجھے علاوہ اس کے فلاں چیز درکار ہے۔ حضرت جنید نے فرمایا: تجھے بازار میں جانا چاہیے، تو بازاری آدمی ہے، صاحبِ مسجد و حجرہ نہیں۔

ایک دفعہ میں نے دمشق کے درویشوں کے ساتھ ابنِ المعلا کی زیارت کے لیے جانے کا قصد کیا۔ یہ رملہ کے ایک گاؤں میں رہتے تھے۔ راستہ میں ہم نے آپس میں باتیں کیں کہ کچھ دل میں سوچ کر چلو کہ تا کہ وہ حضرت ہمیں ہمارے باطن سے مطلع کریں اور ہماری مشکل حل ہو۔

میں نے دل میں سوچا کہ مناجاتِ ابنِ حسینؑ کے اشعار ان سے سنوں۔

دوسرے نے سوچا مجھے طحال کا مرض ہے، یہ اچھا ہو جائے۔

تیسرے نے کہا مجھے حلوہ صابونی ان سے لینا ہے۔

جب ہم ان کی خدمت میں پہنچے تو انہوں نے ایک جزو کاغذ جس میں اشعارِ مناجات ابن حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ لکھے تھے میرے آگے رکھ دیئے اور دوسرے کے طحال پر ہاتھ پھیرا وہ جاتی رہی۔ تیسرے کو کہا حلوہ صابونی سپاہیوں کی غذا ہے اور تو اولیاء کا لباس رکھتا ہے اور اولیاء کے لباس والے کو سپاہیوں کا مطالبہ درست نہیں۔ دو باتوں سے ایک بات اختیار کر۔

غرض کہ مقیم کو اس شخص کے حق کی رعایت ضرور چاہیے جو اپنے حق کی رعایت میں مشغول ہو اور حظ کا تارک ہو۔ جب کوئی حظ پر قائم ہو تو محال ہے کہ دوسرا شخص اس کے حظ حاصل ہونے میں اس سے متفق ہو۔ کیونکہ درویش ایک دوسرے کو راستہ دکھانے والا ہوتا ہے نہ کہ گمراہ کرنے والا۔ جب کوئی اپنے حظ پر قائم ہو تو دوسرے کو چاہئے کہ اس کے برخلاف ہو اور جب وہ اپنے حظ کو ترک کر دے تو اس کے حظ پر قائم ہونا چاہیے تاکہ دونوں حال میں راہ یاب ہو اور گمراہ نہ ہو۔

ایک خبر مشہور ہے کہ حضور ﷺ نے سلمان اور ابوذر غفاری رضی اللہ عنہما میں رشتہ داری کی تھی اور دونوں سرہنگان اہل صفہ تھے اور صاحبِ باطن۔ ایک روز سلمانؓ، ابوذرؓ کے گھر زیارت کو آئے۔ ابوذرؓ کے عیال نے سلمانؓ سے شکایت کی کہ تمہارے بھائی دن میں کچھ نہیں کھاتے اور رات میں سوتے نہیں۔ سلمانؓ نے کہا کچھ کھانے کی چیز لاؤ۔ چنانچہ لائی گئی۔ حضرت سلمانؓ نے ابوذرؓ کو کہا بھائی میں چاہتا ہوں کہ آپ میرے ساتھ کھائیں کیونکہ یہ روزہ آپ پر فرض نہیں۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے تعمیل ارشادِ سلمانؓ کی اور کھایا۔

جب رات ہوئی تو فرمایا: بھائی آپ کو اب بھی میرے ساتھ موافقت کرنی چاہیے اور سونا بھی اختیار فرمائیں۔ اس لیے کہ **إِنَّ لِي جَسَدِكَ عَلَيْكَ حَقًّا وَإِنْ لِي زَوْجِكَ عَلَيْكَ حَقًّا** **وَأَنَّ لِرَبِّكَ عَلَيْكَ حَقًّا**۔ ”تمہارے جسم کا بھی تم پر حق ہے اور تمہاری بیوی کا بھی تم پر حق ہے اور تمہارے رب کا بھی تم پر حق ہے۔“ جب دوسرا دن ہوا تو حضور ﷺ کی خدمت میں ابوذرؓ حاضر ہوئے تو حضور ﷺ نے فرمایا۔ میں بھی وہی کہتا ہوں جو کل تجھے سلمانؓ نے کہا:

إِنَّ لِي جَسَدِكَ عَلَيْكَ حَقًّا. (۱)

چونکہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ اپنے حصہ کو چھوڑے ہوئے تھے حضرت سلمان

۱۔ اسے امام بخاری نے اپنی صحیح ۴۰/۷ (باب: لزوجک علیک، حق) میں امام مسلم نے اپنی

صحیح ۸۱۲/۲ (باب: النهی عن صوم الدھر) میں اور امام احمد بن حنبل نے اپنی مسند

۱۹۸، ۱۹۳/۲ میں روایت کیا ہے۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کے حظ یعنی حصہ کو قائم فرما دیا۔ چنانچہ حضرت ابو ذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنا معمول چھوڑ دیا۔

اس اصل پر جو کچھ تو کرے وہ صحیح و محکم ہے۔ ایک وقت میں عراق میں دنیا کی طلب اور خرچ میں جسارت کر رہا تھا حتیٰ کہ مجھ پر قرض بہت ہو گیا۔ جس کسی کو ضرورت ہوتی وہ میری طرف آتا اور میں ان کی خواہشیں پوری کرتے کرتے تھک گیا۔ وقت کے ایک سردار نے مجھے لکھا اے بیٹا! دیکھ اپنا دل خدا تعالیٰ سے نہ ہٹا۔ اس دل کی فراغت کے سبب جو حوادثِ حرص میں مشغول ہو تو اگر کوئی اپنے دل سے اپنے کو عزیز پائے وہ جائز ہے۔ اس لیے کہ اس دل کے فارغ کرنے میں دل کو مشغول کرے اور یہ کام چھوڑ دے کہ اللہ تعالیٰ ہی بندوں کو کافی ہے۔

اب یہ مقیموں کے حکم ہیں جو مسافروں کی صحبت میں بیان ہوتے ہیں۔



آدابِ صحبتِ سفر

جب کوئی درویش سفر اختیار کرے اور اقامت ترک کرے تو اس کے لیے شرطِ ادب یہ ہے کہ اول وہ سفر خدا کے لیے کرے نہ کہ اتباعِ خواہش کے لیے۔ جیسے ظاہر میں سفر کرے اور باطن کو بھی خواہشِ نفسانی سے پاک کرے۔ ہمیشہ باطہارت رہے اور اپنے معمولات و اوراد کو ضائع نہ کرے۔ پھر یہ بھی ضروری ہے کہ اس سفر میں حج یا جہاد یا طلبِ علم یا زیارتِ شیخ یا قبرِ ولی مد نظر ہو ورنہ اس سفر میں خطا وار ہوگا۔

سفر کرتے وقت اپنے ساتھ کھلی، مصلیٰ، کوزہ اور جوتا، رسی، عصا ضرور رکھے تاکہ کھلی سے ستر عورت کر سکے۔ مصلیٰ پر نماز پڑھ سکے، کوزہ سے طہارت کے قابل پانی لے سکے۔ عصا کے ذریعے آفات سے محفوظ رہے۔ مسافر کے اس میں اور بھی مقصد ہوتے ہیں۔ جوتا اور پاتا بہ تو اس لیے کہ وضو کر کے مصلے تک آسکے۔ اور اگر اس سے زیادہ چیزیں اس نیت سے رکھے کہ سبتِ کامل ادا کر سکے جیسے کنگھی، ناخن گیر، سوئی دھاگہ، سرمہ دانی، مسواک تو بھی بہتر ہے۔

پھر اگر کوئی اس سے زیادہ چیزیں اپنی آرائش کے لیے رکھے تو بس دیکھنا چاہیے کہ یہ کس مقام میں ہے۔ اگر وہ ان اشیاء کی محبت رکھتا ہے تو ہر ایک چیز اس کے لیے گرفتاری کا موجب ہے اور یہ مثل بت اور دیوار اور حجاب کے لیے ہے اور اس سے رعونتِ نفس پیدا ہوگا اور اگر تمکین و استقامت کے مقام میں ہے تو اس کے لیے یہ اور اس کے علاوہ اور بھی درست ہے۔

میں نے شیخ ابوالفارس بن غالب فارسی رحمۃ اللہ علیہ سے سنا کہ ایک روز وہ شیخ ابوسعید ابوالخیر فضل اللہ بن محمد رضی اللہ عنہ کے پاس گئے تاکہ ان کی زیارت کریں۔ فرماتے ہیں: میں نے دیکھا کہ وہ ایک تخت پر چاروں طرف تکیہ لگائے اور پیروں کے نیچے علیحدہ تکیے رکھے آرام گزیں ہیں اور ردا مصری اوڑھے سو رہے ہیں اور میں ایک میلی کھلی مثل چرم گاؤچرک آلودہ کے اوڑھے پہنچا اور ریاضت و مجاہدہ سے رنگ زرد کیے ہوئے تھا۔ ان کا یہ مال منال، جاہ و جلال دیکھ کر اپنے دل میں بداعتقاد ہوا۔ میں نے اپنے جی میں کہا کہ میں بھی ایک درویش ہوں اور یہ بھی ایک درویش ہے کہ اس قدر آرام میں ہے اور میں اس قدر ریاضت میں ہوں۔

وہ اس وقت میرے باطن سے واقف ہوئے اور میرے غرور اور بددلی کو دیکھا۔ مجھ سے فرمایا: اے ابو مسلم! تو نے کس کتاب میں پڑھا ہے کہ مغرور آدمی درویش ہوتا ہے۔

جب میں نے تمام کائنات میں حق ہی حق دیکھا تو حق تعالیٰ نے مجھے تخت نشین کیا اور جب تو نے صرف اپنے آپ کو دیکھا اللہ تعالیٰ نے تجھے نیچے رکھا، ہمارے حصہ میں مشاہدہ آیا اور تیرے حصے میں مجاہدہ۔ اور یہ دونوں مقامات حق سے ہیں اور حق تعالیٰ اس سے پاک ہے اور درویش مقامات سے فانی اور حالات سے بچا ہوا ہوتا ہے۔

شیخ ابو مسلم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میرے ہوش جاتے رہے اور مجھ پر اندھیرا چھا گیا۔ جب ہوش آیا تو میں نے توبہ کی۔ انہوں نے توبہ منظور فرمائی پھر میں نے عرض کیا: اے شیخ! مجھے اجازت ہو کہ میں چلا جاؤں، اس لیے کہ مجھ میں آپ کی زیارت کی تاب نہیں۔ فرمایا: اے ابو مسلم! توجیح کہتا ہے۔ پھر بطور تمثیل یہ شعر پڑھا:

آنچه گو شدم نتواست شنیدن بخیر

ہمہ چشمم بعیان یکسرہ دید آن ببصر

”جس کی خبر میرے کان نہ سن سکیں وہ میری آنکھوں نے ظاہر اُدیکھ لیا۔“

تو مسافر کو چاہیے کہ ہمیشہ حافظ سنت رہے۔ جب کسی مقیم کے پاس جائے تو ادب سے اس کے پاس آئے اور سلام کہے۔ پہلے بائیں پاؤں دروازے سے نکالے کیونکہ حضور ﷺ نے ایسا ہی کیا ہے۔ جب جوتا پہنے تو پہلے دائیں پاؤں میں پہنے پھر بائیں میں اور جب پاؤں دھوئے تو پہلے داہنا پاؤں دھوئے پھر بائیں پاؤں۔ پھر دو رکعت تحیۃ الوضو پڑھے۔ پھر رعایت حقوق درویشاں میں مشغول ہو اور مقیموں کے حال پر اعتراض نہ کرے اور نہ کسی سے زیادتی کرے نہ اپنے سفر کی سختیاں بیان کرے اور لوگوں میں جب بات کرے، بزرگوں کی حکایتیں، روایتیں اور علم کی باتیں کرے اور چاہیے کہ جاہلوں سے تکلیف برداشت کرے اور بنام خداوندان کا بوجھ اٹھائے کیونکہ اس میں بہت سی برکتیں ہیں۔ اگر مقیم یعنی میزبان یا اس کے نوکر اس پر حکم کریں اور اس کو اہل کوچہ کے سلام یا کسی کی زیارت کے واسطے بلائیں تو اگر ہو سکے تو خلاف نہ کرے لیکن دل سے دنیا داروں کی رعایت سے منکر ہونا چاہئے۔

یہ بھی لازم ہے کہ اپنی غرض حاصل ہونے کے لیے میزبانوں کو تکلیف نہ دے اور ان کو اپنے آرام و خواہشات کے لیے امیروں اور ملازمان شاہی کے حضور میں نہ لے جائے۔

غرضیکہ مقیم اور مسافر کو صحبت میں رضاء الہی کا طالب رہنا چاہیے اور ایک دوسرے سے

حسنِ ظن رکھ کر آپس میں منافرت سے سے محترز رہیں اور غیبت نہ کریں۔ اس لیے کہ صاحبِ حق پر خلقت کی بات کرنا برا ہے۔ کیونکہ محقق جب دیکھتے ہیں تو فاعل کا فعل دیکھتے ہیں اور جب خلقت کو جس صفت پر دیکھا جائے تو خالقِ عالم کی صنعت سمجھے۔ کوئی عیب دار یا بے عیب یا اہل کشف ہو تو اس کے فعل پر جھگڑنا اس کے فاعل سے جھگڑنا ہے۔

اور جب بشریت کی آنکھ سے خلقت کی طرف نگاہ کی جائے تو سب کو ترک کرے اور جانے کہ سب خلقت مقہور و مغلوب ہے اور عاجز محض ہے۔ ہر ایک یہی کام کر سکتا ہے۔ اس کے سوا کچھ نہیں کر سکتا کیونکہ اس کی پیدائش ہی ایسی ہے اور خلقت کو اس کے ملک میں حق تصرف نہیں اور بدون اللہ تعالیٰ کسی کو اس کی حالت سے بدلنے کی طاقت نہیں۔ وباللہ التوفیق۔



کھانے کے آداب

یہ حقیقت ہے کہ انسان کو غذا کے بغیر چارہ نہیں اس لیے کہ قواءِ بدن اور ترکیبِ طبیعت طعام و شراب کے سوانا ممکن ہے۔ لیکن شرط مروت یہ ہے کہ اس میں زیادتی نہ کرے اور دن رات کھانے کی فکر میں ہی مشغول نہ ہو۔ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: مَنْ كَانَ هَمُّهُ مَا يَدْخُلُ فِي جَوْفِهِ كَانَ قِيَمَتُهُ مَا يَخْرُجُ مِنْهُ. ”جو اس بات کی ہمت کرے کہ جو کچھ ملے اسے پیٹ میں بھر لے۔ اس کی قیمت وہی ہے جو پیٹ سے نکلی ہوئی چیز کی ہوتی ہے۔“

اور مزید راہِ حق کے لیے کھانے سے زیادہ مصرفِ رساں کوئی چیز نہیں ہے۔ اور اس سے زیادہ اس کتاب کے ”باب الجوع“ میں اس کا بیان ہو چکا ہے۔ یہاں اسی قدر مناسب ہے اور حکایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں نے حضرت ابو یزید رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا کہ آپ بھوک کی زیادہ تعریف کیوں کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: اگر فرعون بھوکا رہتا تو ہرگز ﴿أَنَا رَبُّكُمْ الْأَعْلَى﴾ (۱) نہ کہتا اور اگر قارون بھوکا ہوتا تو نا فرمانی نہ کرتا اور ثعلبہ جب تک بھوکا رہا لوگ اس کی تعریف کرتے تھے۔ جب سیر ہوا تو اس نے نفاق ظاہر کیا۔ اللہ تعالیٰ کافروں کی صفت میں ﴿ذَرَّهُمْ يَأْكُلُو﴾ (۲) فرما رہا ہے کہ یعنی ”انہیں چھوڑ دو کھائیں اور چند دن متمتع ہو لیں تو عنقریب وہ جان لیں گے۔“ اور فرماتا ہے: ﴿وَالَّذِينَ كَفَرُوا يَتَمَتَّعُونَ وَيَأْكُلُونَ كَمَا تَأْكُلُ الْأَنْعَامُ وَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ﴾ (۳) ”جو کافر ہوئے اور دنیا سے تمتع حاصل کر کے کھاتے ہیں جیسے جانور کھاتے ہیں، ان کا ٹھکانا آگ ہے۔“

اور حضرت سہل بن عبد اللہ فرماتے ہیں کہ شراب سے پیٹ بھرنا حلال کھانے سے پیٹ بھرنے کی نسبت مجھے زیادہ پسند ہے۔ لوگوں نے پوچھا کہ یہ کیسے صحیح ہے؟ فرمایا: جب شراب سے پیٹ بھرتا ہے تو عقل آرام کرتی ہے اور شہوت کی تسکین ہوتی ہے اور خلقت اس کے ہاتھ اور زبان سے امن میں ہوتی ہے۔ لیکن جب حلال کھانے سے پیٹ پُر ہوتا ہے تو بیہودہ گوئی چاہتا ہے اور شہوت زور پکڑتی ہے اور نفس اپنے نصیب کی طلب میں سر اٹھاتا ہے۔ کیونکہ مشائخ نے ان کی

صفت میں کہا ہے: ”اَكْلُهُمْ كَأَكْلِ الْمَرْضِيِّ وَنَوْمُهُمْ كَنَوْمِ الْغَرَقِيِّ وَكَلَامُهُمْ كَلَامُ الشُّكْلِيِّ“۔ ”ان کا کھانا بیماروں کا سا کھانا ہے، ان کی نیند غرق ہونے والوں کی سی نیند، ان کا بولنا مرے ہوئے بچے کی ماں کا سا بولنا ہے۔“

تو کھانے کے آداب میں یہ بھی ہے کہ جب کھائے، تنہا نہ کھائے بلکہ اپنے کھانے میں سے ایثار کرے۔ جیسا کہ حضور ﷺ نے فرمایا: شَرُّ النَّاسِ مَنْ أَكَلَ وَحْدَهُ وَضَرَبَ عَبْدَهُ وَمَنَعَ رِفْدَهُ“ (۱) ”شریر ترین انسان وہ ہے جو تنہا کھائے اور غلام کو مارے اور بخشش و جود سے روکے۔“ اور جب دسترخوان پر بیٹھیں تو خاموش نہ بیٹھیں۔ کھانا شروع کریں تو بسم اللہ سے شروع کریں اور دسترخوان پر کوئی ایسی چیز نہ رکھیں اور نہ دکھائیں جس سے ساتھی کراہت کریں، اور شروع لقمہ نمکین سے ہونا چاہئے اور اپنے ساتھی کے ساتھ انصاف ملحوظ رکھیں۔

حضرت سہل بن عبداللہؒ سے لوگوں نے ﴿إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ﴾ (۲) کے معنی پوچھے۔ آپ نے فرمایا کہ عدل یہ ہے کہ اپنے رفیق کے لقمہ میں رفیق سے انصاف کرے اور احسان یہ ہے کہ رفیق کو لقمہ میں زیادہ حق دار سمجھے۔

اور میرے شیخ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں اس مدعی سے تعجب کرتا ہوں جو کہے کہ میں تارک الدنیا ہوں اور لقمہ کی فکر میں ہو اور کہا کہ اپنے ہاتھ سے کھائے اور دوسرے کے لقمے کی طرف نظر نہ ڈالے اور کھانے میں پانی کم پیوے مگر جب پیاس پوری لگ رہی ہو تو مضا لقمہ نہیں۔ اور جب کھائے تو کم کھائے تاکہ جگر تر ہو جائے اور لقمہ بڑا نہ اٹھائے اور اچھی طرح چبا کر کھائے۔ جلدی نہ کرے کیونکہ جلدی کھانے سے بد ہضمی کا خوف ہوتا ہے اور نت کے خلاف ہے۔ جب کھانے سے فارغ ہو تو اَلْحَمْدُ لِلّٰہ کہے اور ہاتھ دھوئے۔ اور جو لوگ ساتھیوں سے خفیہ دعوت میں جائیں اور کھائیں تو بعض مشائخ فرماتے ہیں یہ حرام ہے۔ اور یہ مجلس کے ساتھ خیانت ہے ﴿أُولَئِكَ مَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ إِلَّا النَّارَ﴾ (۳) ”یعنی یہ لوگ وہ ہیں کہ اپنے پیٹوں میں آگ کے سوا کچھ نہیں بھرتے۔“

ایک گروہ کہتا ہے کہ جب جماعت ایک دوسرے کے ساتھ متفق ہو تو تنہا دعوت پر جانا جائز ہے۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ اگر ایک ہو تو جائز ہے اور اگر چند مصاحب ہوں تو انصاف سے جو

۱۔ اسے ابن حبان نے کتاب المجروحین ۱/۳۹۱ میں، ابن جوزی نے العلل المتناہیة ۲/۲۸۱ میں

ذکر کیا ہے جبکہ امام ذہبی سے میزان الاعتدال ۱/۲۰۳ میں ابن وہب عن مانع ابن عمر کے طریق سے

ان الفاظ کے ساتھ لائے ہیں: شرار الناس من نزل وحده، و جلد عبده، و منع رفقده.

حقدار ہو اسے بھیجا جائے۔ اس لیے کہ تنہا پر سے حکم مجلس اٹھ جاتا ہے، اس سے مواخذہ نہیں ہوتا۔ اور سب سے بڑی بات مذہبِ صوفیاء میں یہ ہے کہ درویش کی دعوت رد نہ کرے اور دنیا دار کی دعوت قبول نہ کرے۔ ان کے گھر نہ جائے اور ان سے کچھ نہ مانگے۔ کیونکہ اہل طریقت کی اس میں توہین ہے اس لیے کہ دنیا دار درویش کے محرم نہیں۔

غرضیکہ مردانِ طریقت دنیا دار سے نفع میں نہ ہوں اور اس کی قلت سے درویش بنیں اور جو فقر کو غنا پر فاضل ہونے کا معترف ہو وہ دنیا دار نہیں ہوتا اگرچہ بادشاہ ہو اور جو فقر کا منکر ہو وہ دنیا دار ہے اگرچہ بھوکا ننگا ہو اور جب دعوت میں جائے تو کھانے میں تکلف نہ کرے، مطابق ضرورت اور وقت کے بسر کرے اور جب دعوت محرم ہو تو جائز ہے کہ قبیلے کو لے جائے اور اگر محرم نہ ہو تو اس کے گھر جانا جائز نہیں۔

سہل بن عبداللہ فرماتے ہیں:

الدَّلَّةُ ذِلَّةٌ.

”مہمانی کرنا ہی ذلت ہے۔“ وَبِاللَّهِ التَّوْفِيقُ



چلنے پھرنے کے آداب

اللہ عز و جل فرماتا ہے: ﴿وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلٰى الْاَرْضِ هَوْنًا﴾ (۱)
 ”اللہ تعالیٰ کے بندے زمیں پر با تمکین اور آہستہ چلتے ہیں۔“

بندے پر یہ لازم ہے کہ طالب حق ہو کر اپنی رفتار میں جو قدم رکھے وہ ایسے رکھے کہ اس میں یہ نہ جانے کہ یہ قدم کس چیز پر چلتا ہے اور وہ قدم اس پر ہے یا اس کا ہے۔ اگر اس پر ہے تو استغفار کرے اور اگر اس کا ہے تو کوشش کرے تاکہ زیادہ ہو جائے۔ حضرت داؤد طائی رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ ایک روز انہوں نے کچھ دوا کھائی تھی۔ لوگوں نے کہا کچھ دیر گھر کے صحن میں ٹہلیے تاکہ دوا کا فائدہ ظاہر ہو جائے۔ آپ نے فرمایا مجھے شرم آتی ہے کہ بروز قیامت اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ چند قدم اپنے نفس کی خواہش سے چلا۔ چنانچہ جبار جلیل فرماتا ہے: ﴿وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ﴾ (۲) ”اور گواہی دیں گے ان کے قدم جو کچھ وہ کرتے ہیں۔“

تو درویش کو چاہیے کہ ہوشیاری سے مراقبہ میں جائے اور سر جھکا کر بیٹھے اور کسی طرف نہ دیکھے اور راستہ میں اگر کوئی تنہا ہے تو اپنے آپ اس سے نہ کھچے اور کسی سے اپنے کپڑے کو مس نہ کرے کیونکہ مومن اور اس کا کپڑا پاک ہے اور یہ رعونت اور نودنمائی ہے اور اگر سامنے ملنے والا کافر ہے اور اس پر پلیدی ظاہر ہے تو اجتناب جائز ہے تاکہ اس سے اپنے کو بچائے اور جب جماعت کے ساتھ چلے تو آگے چلنے کی کوشش نہ کرے کیونکہ نمائش چاہنا تکبر کا کام ہے اور سب سے پیچھے چل کر تواضع کا ارادہ بھی نہ کرے اس لیے کہ اپنے اندر تواضع پیدا کرنا بھی عین تکبر ہوتا ہے۔ چلنے میں بحد امکان اپنا جوتا چیل پلیدی سے بچائے تاکہ اس کی برکت سے اللہ تعالیٰ شب میں اسے گندگی سے محفوظ رکھے اور جب جماعت یا ایک درویش راستہ میں اس کے ساتھ ہو تو کسی کے واسطے کھڑا نہ ہو اور اپنے ساتھیوں کو زحمت انتظار میں تکلیف نہ دے۔

جب چلے آہستہ چلے، تیز رفتاری نہ کرے کہ یہ حریموں کی رفتار ہے اور آہستہ خرامی میں سعی نہ کرے کہ یہ بھی متکبروں کی رفتار ہے اور قدم ثابت رکھے اور لازم ہے کہ طالب کی چال ایسی

صفت سے ہو کہ اگر کوئی اسے پوچھے کہ کہاں جا رہا ہے تو وہ کہہ سکے: اِنِّیْ ذٰہِبٌ اِلَیْ رَبِّیْ
 سَيِّدِیْنِ. ”میں اپنے رب کی طرف جا رہا ہوں، وہ مجھے ہدایت فرمائے گا۔“ اور اگر اس حال کے

سفر و حضر میں سونے کے آداب

مشائخ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کا سفر و اقامت میں سونے پر بہت اختلاف ہے۔ ایک جماعت کے نزدیک مرید کا سونا مُسَلَّم نہیں۔ مگر جب نیند غلبہ کرے تو مضائقہ نہیں کیونکہ نیند دفع نہیں ہو سکتی حضور ﷺ نے فرمایا: **النُّوْمُ آخُ الْمَوْتِ (۱)** ”نیند موت کا بھائی ہے۔“ اور زندگی نعمتِ خداوندی ہے اور موت بلا ہے اور ظاہر ہے کہ نعمت، بلا سے افضل ہے۔

شبلی علیہ الرحمۃ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: **اطَّلَعَ الْحَقُّ عَلَيَّ لَقَالَ مَنْ نَامَ غَفَلَ وَمَنْ غَفَلَ حُجِبَ**۔ ”مجھے اللہ تعالیٰ نے مطلع فرمایا کہ جو سویا وہ غافل ہو اور جو غافل ہو وہ مجھوب ہو۔“

ایک جماعت کہتی ہے: مرید کو بحالتِ اختیار سونا جائز ہے اور خواب میں تکلف نہ کرے۔ مگر جب کہ ہر امر کا حق بجالایا ہو۔ کیونکہ حضور ﷺ نے فرمایا: **رُفِعَ الْقَلَمُ عَنْ ثَلَاثٍ: عَنِ النَّائِمِ حَتَّى يَنْتَبَهَ وَعَنِ الصَّبِيِّ حَتَّى يَحْتَلِمَ وَعَنِ الْمَجْنُونِ حَتَّى يَفِيْقَ**۔ ”تین قسم کے آدمیوں سے قلم اٹھ جاتا ہے اور وہ مرفوع القلم ہو جاتا ہے یعنی اس سے مواخذہ نہیں ایک سویا ہوا جب تک بیدار نہ ہو۔ دوسرا بچہ جب تک بالغ نہ ہو۔ تیسرا دیوانہ جب تک ہوش میں نہ آجائے۔“ کیونکہ مخلوقات اس کی بدی سے امن میں رہتی ہے اور اس کا اختیار رکھا ہوا ہوتا ہے اور اس کا نفس مردوں سے بے خبر ہوتا ہے اور کرانا کاتبین اس کے اعمال لکھنے سے آرام میں رہتے ہیں اور اس کی

۱۔ اسے امام بزار، امام طبرانی نے اپنی اپنی کتب میں، امام بیہقی نے شعب الایمان میں، ابن جوزی نے العلل المتناہیة ۲/ ۳۳۹ میں، امام سیوطی نے الجامع الصغیر ۲/ ۱۸۸ اور البدور السافرة (ص: ۲۷۵) میں اور امام بیہقی نے مجمع الزوائد ۱۰/ ۳۱۵ میں بطریق حسین بن ولید، سفیان بن ثوری سے، انہوں نے محمد بن المنکدر سے، انہوں نے جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے: **قال رجل: يا رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم اينام اهل الجنة؟ قال: النوم اخو الموت ولا يموت اهل الجنة**۔ امام بیہقی کہتے ہیں: بزار کی روایت کے راوی صحیح کے راویوں کی طرح ہیں۔ اسے ابن عدی اور عقیلی نے عبد اللہ بن مغیرہ کے تعارف میں الضعفاء میں، ابن الاثیر نے النہایة ۲۸۰/۱۲ میں اور امام احمد بن حنبل نے بطریق وسیع عن سفیان عن ابن المنکدر بیان کیا ہے۔

زبان دعویٰ سے کوتاہ اور دروغ بانی اور غیبت سے محفوظ رہتی ہے اور اس کی عبادت تکبر و ریا سے جدا ہوتی ہے۔ لَا يَمْلِكُ لِنَفْسِهِ ضَرًّا وَلَا نَفْعًا وَلَا مَوْتًا وَلَا حَيٰوةً وَلَا نُشُوْرًا. ”وہ اپنے نفس کے نقصان اور نفع اور موت و حیات کا مالک نہ ہوگا اور نہ نثر کا مختار ہوگا۔“ لَا شَيْءَ اَشَدُّ عَلٰى اِبْلِيسَ مِنْ نَوْمِ الْعَاصِي فَاِذَا نَامَ الْعَاصِي يَقُوْلُ مَتٰى يَنْتَبِهُ وَيَقُوْمُ حَتٰى يَعْصِيَ اللّٰهَ. ”شیطان پر گنہگار کی نیند سے کوئی چیز زیادہ سخت نہیں، تو جب گنہگار سو جاتا ہے تو شیطان کہتا ہے کہ کب بیدار ہوگا تاکہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرے۔“

اس میں حضرت جنیدؒ اور حضرت علی بن سہل اصفہانیؒ ”خلاف ہیں اور اس کے متعلق حضرت علی بن سہلؒ نے حضرت جنیدؒ کو ایک لطیف خط لکھا ہے۔ حضرت علی بن سہلؒ نے حضرت جنیدؒ کو جو لکھا ہے وہ سننے میں نہیں آیا بلکہ اس سے مقصود یہ ہے کہ علی بن سہلؒ نے جنیدؒ کو فرمایا اور اس نامہ میں یہ لکھا کہ خواب غفلت ہے اور عوارضات کا قرار، اور محبت کو لازم ہے کہ غفلت و قرار سے اعراض کرے اور محبت کو چاہیے کہ روز و شب میں قرار نہ ہو اور اگر اسے غنودگی بھی ہوئی تو اس کا حال مقصد سے مفقود ہو گیا اور وہ اپنے حال سے بغافل ہو کر حق تعالیٰ کی طرف سے رہ گیا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کو وحی کی: يَا دَاوُدُ كَذَبَ مَنْ ادَّعٰى مَحَبَّتِيْ فَاِذَا جَنَّهُ اللَّيْلُ نَامَ. ”اے داؤد! وہ جھوٹا ہے جو دعویٰ کرے میری محبت کا اور جب رات ہو تو سو جائے اور میری محبت سے بے تعلق ہو جائے۔“

حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا جواب لکھا: ہمارا بیدار رہنا راہِ حق میں ہمارا عمل ہے اور ہمارا سونا فعلِ الہی ہے تو ہم سے جو راہِ حق میں بے اختیار ہو جائے وہ اس سے زیادہ کامل ہوتا ہے جو ہمارے اختیار سے حق کے ساتھ ہو۔ وَالنَّوْمُ مَوْهَبَةٌ مِّنَ اللّٰهِ تَعَالٰى عَلٰى الْمُحِبِّينَ ”اور نیند حق تعالیٰ کی طرف سے محبین پر عطا ہے۔“ اور اس مسئلہ کا تعلق صحو اور سکر سے ہے اور اس کا مفصل بیان ہو چکا ہے۔ لیکن یہ بیان عجیب ہے کہ جنید رضی اللہ عنہ صاحبِ صحو تھے اور یہاں انہوں نے سکر کی قوت دی اور وہ اس وقت مغلوب ہوئے ہیں اور ان کی زبان وقت پر ناطق ہو گئی۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اصلیت اس کے برخلاف ہو کیونکہ خواب خود عینِ صحو ہے اور بیداری عینِ سکر۔ اس لیے کہ خواب آدمی کی صفت ہے۔ جب تک آدمی اپنے اوصاف کے اندھیرے میں ہو، صحو ہے اور صحو سے ہی اسے منسوب کرتے ہیں اور نہ سونا حق کی صفت ہے اور جب آدمی اپنی صفت سے مراد ہو تو مغلوب ہوتا ہے۔

میں نے ایک جماعتِ مشائخ کو دیکھا کہ خواب کو بیداری سے افضل جانتی ہے۔ جیسے

حضرت جنیدؒ افضل جانتے تھے۔ اس لیے کہ نمائش بزرگوں، ولیوں اور اکثر پیغمبروں کے خواب سے تعلق رکھتی ہے۔ یعنی خواب دیکھتے ہیں اور اپنا مقصد پاتے ہیں۔ حضور ﷺ نے بھی فرمایا:

إِنَّ اللَّهَ يُبَاهِي بِالْعَبْدِ الَّذِي نَامَ فِي سُجُودِهِ وَيَقُولُ اللَّهُ انْظُرْ وَايَمًا
تُكْتَبُ إِلَيَّ عَبْدِي رُوحَهُ فِي مَحَلِّ النُّجُوى وَبَدَنُهُ عَلَى بَسَاطِ
الْعِبَادَةِ.

”اللہ تعالیٰ خوش ہوتا ہے جب بندہ کو سجدہ میں سویا ہوا پائے۔ فرماتا ہے: اے میرے فرشتو! اس بندہ مومن کو دیکھو کہ اس کی جان رازگوئی میں ہے اور اس کا بدن بساط عبادت پر ہے۔“

اور حضور ﷺ نے فرمایا:

مَنْ نَامَ عَلَى طَهَارَةٍ يُؤَدِّنُ لِرُوحِهِ أَنْ يَطُوفَ بِالْعَرْشِ وَيَسْجُدَ لِلَّهِ
تَعَالَى.

جو باطہارت سو جائے اس کی روح کو اجازت ہے کہ عرش کا طواف کرے اور اللہ تعالیٰ کو سجدہ۔“

اور میں نے حکایتوں میں معلوم کیا ہے کہ شاہ شجاع کرمانی رحمۃ اللہ علیہ چالیس سال بیدار رہے۔ جب ایک رات سو گئے تو لقاء ربانی نصیب ہوا۔ پھر ہمیشہ لقاء کی امید میں سو جاتے۔

ایک جماعت کو میں نے دیکھا کہ وہ بیداری کو سونے سے افضل جانتی ہے۔ جیسے علی بن

سہل رضی اللہ عنہ۔ اس لیے کہ وحی کا رسولوں پر آنا اور اولیاء کی کراماتیں بیداری میں ہوتی ہیں۔

ایک شیخ فرماتے ہیں: لَوْ كَانَ فِي النَّوْمِ خَيْرًا لَكَانَ فِي الْجَنَّةِ. ”اگر نیند میں بہتری

ہوتی تو وہ جنت میں بھی ہوتی۔“ کیونکہ جنت مقام قرب کا نام ہے اور قرب میں نیند ہوتی اور نیند

چونکہ حجاب ہے تو معلوم ہوا کہ حجاب جنت میں نہیں۔ اور ارباب لطائف فرماتے ہیں کہ جب آدم

صغی اللہ بہشت میں سو گئے تو ان کے بائیں پہلو سے حضرت حوا علیہا السلام پیدا ہوئیں اور سب

بلائیں جو آپ پر وارد ہوئیں حضرت حوا کے باعث ہوئیں۔ اور یہ بھی کہتے ہیں کہ ابراہیم علیہ السلام

نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو فرمایا: ﴿لِيُنْتَبِئَ إِلَيَّ فِي الْمَنَامِ أَيُّ آذَانِكَ﴾ (۱) ”بیٹا میں

نے خواب میں دیکھا کہ تجھے ذبح کر رہا ہوں۔“ تو اسماعیل علیہ السلام نے جواب دیا: هَذَا جَزَاءُ

مَنْ نَامَ عَنْ حَبِيبِهِ لَوْلَمْ تَنَمْ لَمَّا أَمِرْتُ بِدَبْحِ الْوَالِدِ. ”یہ جزا ہے اس کی جو اپنے حبیب سے

غافل ہو کر سو جائے۔ اگر آپ نہ سوتے تو بیٹا ذبح کرنے کا حکم نہ ہوتا۔“ تو آپ کے خواب نے آپ کو بے پسر کیا اور مجھے بے جان۔ لیکن میرا درد تو ایک ساعت ہو گا مگر آپ کا درد دوامی ہے۔ (۱)

حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ ہر رات آپ نمک کا پانی سکورے میں بھر کر اپنے سامنے رکھتے اور ایک سلائی۔ جب غلبہ خواب ہوتا تو سلائی بھر کر آنکھ میں ڈالتے۔

اور میں علی بن عثمان جلابی (رحمۃ اللہ علیہ) نے ایک پیر مرد کو دیکھا کہ جب ادائے فرض سے فارغ ہوتا، سو جاتا۔ اور شیخ احمد سمرقندی ”کو دیکھا کہ آپ بخارا میں تھے کہ چالیس رات خواب نہ فرماتے اور دن میں تھوڑی دیر سوتے۔ یہ مسئلہ اس طرف راجع ہے کہ جب کسی کے خیال میں موت زندگی سے بہتر ہو تو اسے چاہیے کہ زیادہ سوئے اور جس کے نزدیک زندگی موت سے محبوب ہو اسے چاہیے کہ جاگے۔ تو قدر و قیمت اسے بیداری کی نہیں ہو سکتی جو تکلف سے بیدار رہا بلکہ بیداری کی قدر اسے ہے جسے بیدار رکھنے والا بیدار رکھے۔

جیسا کہ حضور ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے برگزیدہ فرما کر درجہ عالی پر پہنچایا۔ آپ ﷺ نے خواب میں تکلف فرماتے نہ بیداری میں۔ پھر جب فرمانِ حق آیا: ﴿قُمِ اللَّيْلَ إِلَّا قَلِيلًا﴾ نِصْفَةَ آوَانِقُصِّ مِنْهُ قَلِيلًا ﴿ (۲) ”شب میں بیدار رہو مگر تھوڑے، آدھی رات یا اس سے کم۔“ تو قدر و قیمت اسے کیا ہو جو بتکلف سوئے۔ قدر و قیمت اسے ہی ہو سکتی ہے جسے سلانے والا سلائے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے اصحابِ کہف کو برگزیدہ فرما کر اعلیٰ مقام بخشا اور لباسِ کفران کی گردن سے اتارا۔ وہ نہ سونے میں تکلف کرتے ہیں نہ بیداری میں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں خواب ہی میں رکھا اور وہ بے غیر اختیار حق تعالیٰ میں پرورش پارہے ہیں جیسا کہ فرمایا: ﴿وَحَسَبَهُمْ آيِقَاطًا وَهُمْ رُقُودًا ۚ وَنَقَلْنَاهُمُ ذَاتَ الْيَمِينِ وَذَاتَ الشِّمَالِ ۗ﴾ (۳) یہ دونوں بے اختیاری کے حال میں ہیں۔ اور جب بندہ کسی ایسے درجے پر پہنچ جائے کہ بے اختیار ہو اور سب سے بے تعلق ہو جائے اور اس کا رابطہ غیر سے منقطع ہو جائے تو اگر سو جائے یا بیدار رہے تو جس حال میں بھی ہو، عزیز حق ہوتا ہے۔ تو مرید کا سونا ایسا ہونا چاہیے کہ وہ اس سونے کو آخری سونا سمجھے اور گناہوں سے توبہ کرے اور دشمنوں کو خوش کرتا ہو اپا کیزہ لباس میں رُوبہ قبلہ ہو کر دنیاوی کاروبار سے دست بردار اور نعمتِ اسلام

۱۔ قیس بن عامر نے خوب کہا ہے:

وانی لا استعس ومالی لعینة لعل خیالاً منک یلقى خیالیا

(میں بیشک نیند چاہتا ہوں اور مجھے نیند نہیں، شاید کہ خواب میں تیرے خیالات میرے خیالات سے ملیں)

۳۔ سورة الکھف: ۱۸

۲۔ سورة المزمل: ۲-۳

پر شکر گزار ہو، اور یہ غم نہ کرے کہ اگر بیدار ہوگا تو پھر گناہ نہ کرے گا۔ تو جس نے بحالت بیداری اپنا کام تمام کیا ہو، اُسے نہ خواب کا خوف اور نہ موت کا خطرہ۔ مشہور حکایتوں میں ہے کہ ایک پیر اس امام کے پاس جایا کرتا تھا جو رتبہ، کلا پوشی اور رعونت میں رہ چکا تھا اور کہا کرتا تھا کہ غافلوں کو مرنا چاہیے۔ اس امام کو اس سے رنج پہنچتا کہ یہ مرد ہر وقت مجھے سے ایسی باتیں کرتا ہے۔ ایک روز اس نے امام سے کہا کہ آج میں تمام عیب ترک کر کے اطاعت شروع کروں گا۔

جب دوسرے دن وہ آیا تو امام نے کہا اے پیر اب مرنا چاہیے۔ اس نے مصلیٰ بچھایا اور سر رکھا اور لیٹ گیا اور کہا میں مر رہا ہوں اور جان دے دی۔ امام کو اس سے آگاہی ہوئی۔ اس نے کہا یہ پیر مجھے کہا کرتے تھے کہ موت کے لیے تیار رہ اور آج خود رخصت ہو گئے اور ان مریدوں کو حکم دیا کرتے تھے کہ جب تک نیند غالب نہ ہو سونا نہ چاہیے اور جب بیدار ہو تو اسے دوبارہ سونا حرام ہے۔ اس بحث میں بہت طویل کلام ہے۔ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ



بولنے اور چپ رہنے کے آداب

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿وَمَنْ أَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَا إِلَى اللَّهِ وَعَمِلَ صَالِحًا﴾ (۱) ”اور کون اچھا ہے بات میں جس نے اللہ تعالیٰ کی طرف بلایا اور نیک عمل کیے۔“ اور فرمایا: ﴿قُولُوا آمَنَّا﴾ (۲) ”اور کہو تم سب ہم ایمان لائے۔“ اور فرمایا: ﴿قَوْلٌ مَّعْرُوفٌ﴾ (۳) ”قول معروف۔“ واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ نے بندوں کو اچھے کام کرنے کا حکم فرمایا ہے۔ جیسے اس کی خداوندی کا اقرار اس کی ثناء اور مخلوق کو اس کی طرف آنے کی دعوت دینا اور بندہ کلام حق تعالیٰ کی روشنی میں میز اور منتخب کیا ہوا۔ جیسے فرمایا: ﴿وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ﴾ (۴) ”اور بیشک ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی۔“ ایک جماعت مفسرین اس معنی میں اعزاز بہ کلام حق مراد لیتی ہے اور اگرچہ کلام، حق بندہ ہونا بڑی زبردست نعمت ہے لیکن اس کی ذمہ داری کی آفت بھی بڑی ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: **أَخْوَفُ مَا أَخَافُ عَلَى أُمَّتِي أَلِّسَانُ** (۵) ”زیادہ جس سے میں اپنی امت پر خوف کرتا ہوں وہ زبان ہے۔“ اس لیے کہ کلام مثل شراب ہے کہ یہ عقل کو مست کرتی ہے۔ انسان جب اس کے پینے میں مبتلا ہوتا ہے، بچ نہیں سکتا۔

جب اہل طریقت پر یہ امر متکشف ہوا کہ کلام بھی ایک آفت ہے تو انہوں نے بلا ضرورت کلام ترک کر دیا اور اپنے ہر کلام کی ابتدا و انتہا پر خاص نگران رہے اور اگر وہ تمام کلام حق ہو تو کہہ دیتے ہیں ورنہ خاموش رہتے ہیں، اس لیے انھیں یقین ہے کہ اللہ راز دان ہے اور وہ بہت

۲۔ سورۃ البقرۃ: ۱۳۶

۱۔ سورۃ حم السجدہ: ۳۳

۳۔ سورۃ بنی اسرائیل: ۷۰

۳۔ سورۃ البقرۃ: ۲۶۳

۵۔ یہ اس حدیث پاک کا جز ہے جسے امام احمد بن حنبل نے سفیان بن عبد اللہ ثقفی سے ایک سے زیادہ الفاظ کے ساتھ روایت کیا اور وہ سب الفاظ ایک ہی منقحی کے حامل ہیں، مکمل حدیث اس طرح: **عَنْ سَفْيَانَ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ الثَّقَفِيِّ، قَالَ: قُلْتُ يَا رَسُولَ اللَّهِ، حَدِّثْنِي بِأَمْرٍ أَعْتَصِمُ بِهِ، قَالَ: قُلْ رَبِّي اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقِم، قَالَ: قُلْتُ يَا رَسُولَ اللَّهِ، مَا أَخْوَفُ مَا أَخَافُ عَلَيَّ؟ قَالَ: فَأَخِذْ بِلِسَانِ نَفْسِهِ ثُمَّ قَالَ: هَذَا** ملاحظہ کیجئے: مسند احمد بن حنبل ۳/۱۳۱، سنن ابن ماجہ ۲/۱۳۱، مشکاة المصابیح،

برے ہیں جو اللہ تعالیٰ کو راز دان نہیں جانتے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿أَمْ يَحْسَبُونَ أَنَّا لَا نَسْمَعُ سِرَّهُمْ وَنَجْوَاهُمْ طَبَلَىٰ وَرُسُلْنَا كَذِبُهُمْ يَكْتُبُونَ﴾ (۱) ”کیا وہ خیال کرتے ہیں کہ ہم ان کے راز ہائے نہاں نہیں جانتے، یہ غلط ہے بلکہ ہم بھی جانتے ہیں اور ہمارے بھیجے ہوئے فرشتے ان کے پاس رہ کر لکھتے ہیں۔“ اور ہم عالم الغیب ہیں۔ چنانچہ حضور ﷺ نے فرمایا: مَنْ صَمَتَ نَجَا. (۲) ”جو خاموش رہا وہ نجات پا گیا۔“ تو خاموشی میں جو فائدہ ہے وہ کلام کرنے میں نہیں اس لیے کہ بولنے میں بہت آفتیں ہیں۔

ایک جماعت مشائخ کرام رحمہم اللہ تو خاموشی کو بولنے پر فضیلت دیتی ہے اور ایک جماعت کلام کو خاموشی پر ترجیح دیتی ہے۔ ان میں سے حضرت جنیدؒ نے فرمایا کہ عبارتیں تمام دعوے ہیں اور جہاں معنی ثابت ہوں وہاں دعویٰ بے فائدہ ہوتا ہے اور ایک وقت ہوتا ہے کہ بحالت اختیار قول ساقط کرنے میں معذور ہوتا ہے اور جب حالت خوف ہو تو باوجود قوت کلام نہ کلام کرنے کا عذر ہوتا ہے لیکن معنی ساقط نہیں ہوتے اور اگر حقیقت معرفت کا انکار کرے تو جب معنی باقی ہوں تو بلا زبان کہنا موجود ہوتا ہے۔ اور کسی وقت بندہ بغیر معنی کے صرف دعوے سے معذور نہیں ہوتا۔ اس کا حکم منافق کا ہے اس لیے کہ بے معنی دعویٰ نفاق ہے اور بلا دعویٰ اور بے معنی اخلاص۔ لِأَنَّ مَنْ أَسَسَ بُنْيَانَهُ عَلَىٰ بَيَانٍ لَا يَسْتَفْنِي عَنِ اللِّسَانِ وَ مَنْ أَسَسَ بُنْيَانَهُ عَلَىٰ عَيَانٍ اسْتَفْنِي فِيمَا بَيْنَهُ وَبَيْنَ رَبِّهِ مِنَ اللِّسَانِ. ”اس لیے کہ جو بنیاد ڈالے اس پر کہ ایک راز جناب ربانی اس میں ظاہر ہے۔ اس کے عرض کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔“ یعنی جب بندہ پر راستہ کھلے تو وہ گفتگو کرنے سے بے پرواہ ہو جاتا ہے اور عبارت کے معنی بتانے کو غیر کی خبر دینا سمجھتا ہے اور اللہ تعالیٰ

۱۔ الزخرف: ۸۰

۲۔ امام ترمذی نے اسے بطریق قتیہ اپنی ”جامع“ (۲۶۱۸) میں روایت کیا ہے۔ امام سخاوی المقاصد الحسنہ میں کہتے ہیں: کہ اسے امام ترمذی نے روایت کیا ہے اور اسے غریب کہا ہے، انام داری، امام احمد اور دیگر محدثین نے اسے عبد اللہ بن عمرو بن العاص سے مرفوعاً روایت کیا ہے اور اس کا مدار ابن لہیعہ پر ہے جسے اس نے یزید بن عمرو سے اس نے ابو عبد الرحمن الحنبلی سے روایت کیا ہے لیکن اس کی شاہد روایات کثیر تعداد میں ہیں جن میں سے ایک امام طبرانی کے ہاں عمدہ سند کے ساتھ ہے۔

مزید حوالہ کے لئے: مسند الأحمد بن حنبل (۶۲۸۱، ۶۶۵۴)، سنن الدارمی (۲۷۱۶)، من طرق من ابن لہیعہ (۶۰۷)، الأمثال لأبی الشیخ (۶۰۷)، المعجم الكبير للطبرانی (۱۷)، ”الترغیب“ لابن شاہین ۱۰۷/۱، إحياء علوم الدين ۸۰/۳، الجامع الصغير ۲/۱۷۳، مسند الشهاب للقضاعی ۲۱۹/۱ المقاصد الحسنہ للسخاوی (ص:

تفسیر احوال سے بے نیاز ہے۔ اسے پرواہ نہیں کہ بیان غیر سے اس کی طرف مشغول ہو اور جنید رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول ”مَنْ عَرَفَ اللّٰهَ كَلَّ لِسَانَهُ“ اس کی تائید کرتا ہے۔ یعنی جس نے اللہ تعالیٰ کا عرفان دل سے کر لیا اس کی زبان بیان سے گونگی ہوتی ہے۔ اس لیے کہ عبارت کا بیان حجاب ہے۔ اور شبلی رحمۃ اللہ علیہ نے کھڑے ہو کر بہ آواز بلند فرمایا: ”یا مرادی“ اور اس میں اشارہ حق تعالیٰ کی طرف کیا۔ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: اے ابا بکر شبلی! اگر تیری مراد حق تعالیٰ سے ہے تو تُوٹنے یہ اشارہ کیوں کیا؟ کیونکہ وہ اس سے بے نیاز ہے اور اگر تیری مراد یہ نہیں تو تُوٹنے کیوں کہا، حق تعالیٰ تیرے کہنے پر آگاہ ہے؟ تو حضرت شبلی نے اپنے کہنے پر استغفار کی۔

اور جس جماعت نے کلام کو چپ رہنے پر فضیلت دی وہ کہتے ہیں کہ اپنی حالت حق سے بیان کرنا لازم ہے کیونکہ دعویٰ بمعنی قائم ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر ہزار سال دل اور سر کا عارف ہو اور ضرورت مانع نہ ہو تو اس کا قرار معرفت سے متعلق نہ ہو اور اس کا حکم کافروں کا ہے۔

اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو شکر نعمت اور حمد و ثناء منعم کا حکم دیا ہے اور حضور ﷺ کو ﴿وَأَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ﴾ (۱) ”اپنے رب کی نعمتوں کا بیان کر“، فرمایا اور تحدیث و نعمت یہ کلام ہے اور ہماری طرف سے ثناء حمد یہ سبھی کلام ہے اور اللہ تعالیٰ نے ﴿ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ﴾ (۲) ”مجھ سے مانگو میں قبول کروں گا“، بھی فرمایا اور ﴿أَجِيبْ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَا﴾ (۳) ”میں پکارنے والوں کی دعائیں قبول کرتا ہوں جب وہ پکارتا ہے“ اور اس طرح کے اور بیان بھی ہیں۔

ایک شیخ فرماتے ہیں کہ جس کا حال اپنے وقت سے بیان نہ ہو اس کا وقت وقت نہیں۔ چونکہ تیرا وقت بیان کرنے والی تیری ذات ہے۔

لِسَانُ الْحَالِ أَفْصَحُ مِنْ لِسَانِ
وَصَمْتِي عَنْ سُؤَالِي تَرْجُمَانِ
”میری زبان حال میری زبان سے فصیح تر ہے اور میری خاموشی میرے سوال کا ترجمہ ہے۔“

میں نے حکایتوں میں دیکھا کہ ایک روز ابو بکر شبلی رحمۃ اللہ علیہ بغداد کے ایک محلہ میں جا رہے تھے کہ ایک مدعی کو دیکھا کہ کہہ رہا تھا: السُّكُوتُ خَيْرٌ مِنَ الْكَلَامِ فَقَالَ الشَّبْلِيُّ سُّكُوتُكَ خَيْرٌ مِنْ كَلَامِكَ وَكَلَامِي خَيْرٌ مِنْ سُّكُوتِي لِأَنَّ كَلَامَكَ لَغْوٌ وَسُّكُوتُكَ هَزْلٌ وَكَلَامِي خَيْرٌ مِنْ سُّكُوتِي لِأَنَّ سُّكُوتِي حِلْمٌ وَكَلَامِي عِلْمٌ. ”خاموش

رہنا بولنے سے اچھا ہے۔ حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تیرا خاموش رہنا تیرے بولنے سے اچھا ہے اور میرا بولنا خاموش رہنے سے بہتر ہے۔ اس لیے کہ تیرا بولنا لغو اور تیری خاموشی ہزل ہے اور میرا کلام مرے سکوت سے یوں بہتر ہے کہ میرا سکوت بھی حلم ہے اور میرا کلام علم ہے۔ ”اگر میں علم نہ کہوں تو حلم اس پر ہے اور کہوں تو علم ہے۔ اگر نہ کہوں تو حلیم ہوں اور کہوں تو علیم۔“

اور میں علی بن عثمان (رحمۃ اللہ علیہ) کہتا ہوں کہ کلام کی دو قسمیں ہیں اور سکوت بھی دو قسم کے ہیں۔ کلام ایک حق ہے، ایک باطل، اور سکوت ایک حصول مقصود کے لیے، دوسرے غفلت میں۔ تو جسے بیان کرنا درپیش ہو تو اس کی گفتگو اور خاموشی میں دیکھا جائے گا۔ اس کا کہنا حق ہے۔ تو یہ بولنا چپ رہنے سے اچھا ہے اور اگر کلام باطل ہے تو بولنے سے چپ رہنا اچھا ہے اور اگر حجاب اور غفلت سے خاموش ہے تو بولنا چپ رہنے سے بہتر ہے۔ اور بہت لوگ اس پر حیران ہیں۔ ایک گروہ مدعیوں سے بیہودہ اور ہوس کا شکار ہے۔ وہ جو کہتا ہے کہ بولنا چپ رہنے سے افضل ہے، اور جاہلوں کا گروہ جو منارہ اور کنوئیں میں فرق نہیں کرتا وہ خاموشی کو بولنے سے اچھا کہتا ہے۔ یہ دونوں کسی کو بلائیں یا خاموش کرائیں، ایک سے ہیں۔ اَلَا مَنْ نَطَقَ اَصَابَ اَوْ غَلَطَ وَمَنْ اَنْطَقَ عَصِمَ مِنَ الشُّطَطِ ”جو کلام کرتا ہے یا خطا کرتا ہے یا صحیح بولتا ہے اور جو بگڑا رہا ہے وہ خطا و خلل سے بچا ہوا ہے۔“ جبکہ ابلیس لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَيْهِ نے کہا: ﴿ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ﴾ (۱) ”میں اس سے بہتر ہوں۔“ اور آدم علیہ السلام بولے: ﴿ رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا ﴾ (۲)۔ ”اے ہمارے رب ہم نے ظلم کیا اپنی جان پر۔“ یہ مدعیان طریقت اپنے کلام میں اجازت یافتہ ہو کر اضطرار میں ہوتے ہیں اور خاموشی میں شرم زدہ اور بیچارہ ہوتے ہیں: مَنْ كَانَ سُكُوْتُهُ حَيَاءً كَانَ كَلَامُهُ حَيَوَةً۔ ”جو حیاء کے باعث خاموش رہا، اس کا کلام دل کو زندہ کرتا ہے۔“ کیونکہ یہ دیکھ کر کلام کرتا ہے اور بغیر دیکھے کلام کرنا معیوب جانتا ہے اور نہ بولنا بولنے سے زیادہ پسند کرتا ہے، جب تک ہوش میں ہو اور جب بے خود ہو جاتا ہے تو لوگ اس کا بولنا جان پر لکھتے ہیں۔ اسی بناء پر پیر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: مَنْ كَانَ سُكُوْتُهُ ذَهَابًا كَانَ كَلَامُهُ لِغَيْرِهِ مُذْهِبًا۔ ”جس کا چپ رہنا بحالت بے خودی ہو اس کا کلام غیر کے لیے مذہب ہوتا ہے۔“ تو طالب ربانی کو چاہیے کہ عبودیت میں محو ہو کر چپ رہے تاکہ ربانی آدمی جس کا کلام ربوبیت سے ہو، کلام کرے اور اس کا کلام مریدوں کے دل شکار کرے اور کلام میں یہ ادب ہے کہ بدون امر کے نہ کہے اور امر سے باہر بھی نہ کہے اور چپ رہنے میں یہ ادب ہے کہ جاہل نہ ہو اور نہ جہالت پر راضی اور نہ غافل ہو۔

مرید کو لازم ہے کہ پیروں کی بات میں دخل اور تصرف نہ کرے اور عبارت عجیب اور
 پراگندہ نہ رہے جیسے زبان سے کلمہ شہادت کہا ہے اور اقرار توحید کیا ہے، اسی طرح جھوٹ اور غیبت
 نہ کرے اور مسلمانوں کو رنج نہ دے اور درویشوں کو صرف نام سے نہ بلائے اور درویش کے چپ
 رہنے کی شرط یہ ہے کہ حق کے سوا وہ کچھ نہ کہے اور اس کی بہت سناخیں ہیں اور بیشمار لطیفے۔ لیکن میں
 اسی پر اکتفاء کرتا ہوں تا کہ کتاب طویل نہ ہو جائے۔ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ



آدابِ سوال و ترکِ سوال

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿لَا يَسْأَلُونَ النَّاسَ إِلْحَافًا﴾ (۱) ”لجاجت کے ساتھ لوگوں سے سوال نہیں کرتے“۔ اور جب کوئی ان سے سوال کرے تو رڈ نہیں کرتے۔ جیسا کہ حضور ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَأَمَّا السَّائِلَ فَلَا تَنْهَرْهُ﴾ (۲) ”سوالی کو نہ جھڑک“۔ اور چاہیے تو یہ کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی سے سوال نہ کرے اور غیر کو محلِ سوال بھی نہ بنائے۔ اس لیے کہ غیر سے سوال جب ہی کیا جائے گا جب اللہ تعالیٰ سے منہ موڑ کر غیر خدا کی طرف متوجہ ہو۔ تو جب بندہ اللہ تعالیٰ سے روگرداں ہو تو وہ رڈ کر دیا جاتا ہے، یعنی پھر اللہ تعالیٰ اس کی طرف توجہ نہیں فرماتا۔

مجھے معلوم ہوا کہ ایک دنیا دار نے حضرت رابعہ عدویہ رحمۃ اللہ علیہا سے عرض کی: آپ مجھ سے کچھ مانگیں تاکہ میں آپ کو پیش کروں۔ آپ نے فرمایا: مجھے تو خالق دنیا سے مانگتے شرم آتی ہے، تو کیا مجھے اپنے جیسے سے سوال کرتے ہوئے شرم نہ آئے گی۔ کہتے ہیں ابو مسلم صاحبِ دعوت کے عہد میں ایک بے گناہ درویش پر چوری کی تہمت لگی۔ انہیں قید خانہ میں بند کر دیا گیا۔ جب رات ہوئی ابو مسلم نے حضور ﷺ کو خواب میں دیکھا کہ آپ فرما رہے ہیں، اے ابو مسلم! مجھے اللہ تعالیٰ نے تیرے پاس بھیجا ہے کہ میرے دوست کو بے گناہ قید میں بند کیا ہے۔ اٹھ اور اسے نکال۔

ابو مسلم خواب سے چونک پڑا، ننگے سر، ننگے پیر قید خانہ کے دروازہ پر آیا اور حکم دیا کہ دروازہ کھولو اور اس درویش کو باہر نکالو۔ جب آپ باہر تشریف لائے تو ابو مسلم نے معذرت کی اور عرض کیا: حضور! کسی چیز کی ضرورت ہو تو فرمائیں۔ آپ نے فرمایا: اے امیر! جس کا ایسا خداوند ہو کہ آدھی رات کے وقت ابو مسلم کو بستر سے اٹھا کر میری رہائی کے لیے بھیج دے اور اسے قید سے آزاد کرالے، اسے کیا یہ جائز ہے کہ اپنی ضرورت غیروں سے پوری کرائے۔ یہ سن کر ابو مسلم رو پڑا اور وہ درویش چلے گئے۔

پھر ایک جماعت کہتی ہے کہ درویش کو خلقت سے سوال کرنا جائز ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ ﴿لَا يَسْأَلُونَ النَّاسَ إِلْحَافًا﴾ (۳) فرماتا ہے۔ یعنی ”لجاجت کیے بغیر وہ لوگوں سے سوال کرتے

ہیں۔ اور حضور ﷺ نے بھی صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کی ضرورت کے وقت سوال فرمایا اور ہمیں بھی حکم دیا: اَطْلُبُوا الْحَوَائِجَ عِنْدَ حَسَنِ الْوُجُوهِ (۱) ”اچھی صورت والوں سے حاجتیں طلب کرو“۔

دوسرے مشائخ کرام نے سوال تین وجوہ سے جائز رکھا ہے۔ ایک فراغتِ دل کے لیے، جو ضروری ہو اور کہتے ہیں کہ ہم دونوں جہان کی وہ قیمت نہیں سمجھتے کہ دن رات اس کے انتظار میں گزاریں اور بحالتِ اضطراب اللہ تعالیٰ کے سوا حاجت نہیں ہوتی۔ اس لیے کہ کوئی مشغل کھانے کا ہو یا اس کے انتظار کا ہو، کچھ نہیں اور اسی قسم پر حضرت ابو یزید رحمۃ اللہ علیہ نے شفیق کے مرید کو فرمایا جب وہ آپ کی زیارت کے لیے آیا۔ اول آپ نے حضرت شفیق کا حال پوچھا۔ مرید نے عرض کیا وہ فارغ از خلقت ہو کر توکل میں بیٹھے ہیں۔

حضرت ابو یزید نے فرمایا: تو واپس جا اور شفیق سے کہہ کہ اللہ تعالیٰ کو دو روٹی پر نہ آزما۔ جب تجھے بھوک ہو تو دو روٹی ہم جنسوں سے مانگ لے اور تو گل چھوڑ، تاکہ شہر و ولایت تیرے عمل کی نحوست سے غرق نہ ہو اور دوسرے لوگوں نے ریاضتِ نفس کے لیے سوال اختیار کیا ہے

۱۔ امام طبرانی نے اسے المعجم الکبیر میں یزید بن حصیفہ کے طریق سے، انہوں نے اپنے والد سے، انہوں نے اپنے دادا سے مرفوعاً روایت کیا ہے اور ابن ابی الدنیا نے اسے قضاء الحوائج میں، ابوالشیخ نے امثال ابی شیخ میں، خطیب نے تاریخ میں، ابن جوزی نے الموضوعات میں اور ابن حبان نے کتاب المجروحین میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً روایت کیا ہے اور امام قضاعی نے مسند الشہاب میں ان الفاظ کے ساتھ اسے روایت کیا ہے: اَطْلُبُوا حَوَائِجَكُمْ عِنْدَ صَبَاحِ الْوُجُوهِ۔ امام سیوطی نے الجامع الصغیر میں اور ملا علی قاری نے الموضوعات میں اسے ذکر کیا ہے اور ملا علی قاری نے کہا ہے کہ اس حدیث پاک کا کم از کم مرتبہ حسن ہونا یا ضعیف ہونا ہے، اور اس کا موضوع ہونا تو ایسا ہرگز نہیں، امام سیوطی نے اللالی المصنوعة میں اسے ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ میرے خیال میں یہ حدیث درجہ حسن میں ہے مگر شیخ ناصر الدین البانی نے اسے موضوع قرار دیا ہے۔ حوالہ کے لیے دیکھیں: احیاء علوم الدین ۱۰۳/۲، الحاف السادة المتقين ۹۱/۹ تاریخ بغداد ۱۸۵/۳، ۱۱۱/۷، ۲۳/۱۱، التاريخ الصغير للبخاری ۱۷۶/۲، التاريخ الكبير ۵۱/۱، مجمع الزوائد للهيثمی ۱۹۲/۸، اللالی المصنوعة لسیوطی ۲۱/۲، کتاب المجروحین ۲۳۸/۱، المطالب العالی (۲۶۳۰)، المعجم الكبير للطبرانی (حدیث: ۱۱۱۰) المعجم الاوسط (۲۵۹)، ضعفاء العقيلي (۱۶۳) حلیة ابی نعیم ۱۵۶/۳، تاریخ اصبهان ۱۵۶/۶، مصنف ابن ابی شیبہ ۱۰/۹، المقاصد الحسنة للسخاوی (۱۶۱) مسند الشہاب للقضاعی ۳۸۲/۱ (حدیث: ۳۳۱) قضاء الحوائج لابن ابی الدنیا (۵۲)، امثال ابی الشیخ (۷۱)، موضوعات ابن جوزی ۱۶۳/۲ الفوائد المجموعة للشوکانی (ص: ۲۲۰)

تا کہ نفس کو ذلیل کریں اور اپنے دل کو رنجور کریں اور اپنی حیثیت سمجھیں کہ ہر ایک ان کی کتنی قدر کرتا ہے۔ پھر تکبر نہ کریں اور کسی کو رنج نہ دیں۔

کیا تو نے نہ دیکھا کہ جب شبلی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ کے پاس آئے۔ حضرت جنید نے فرمایا: اے ابو بکر شبلی! جب تک تیرے سر میں یہ غرور ہے کہ میں خلیفہ صاحب الحجاب کا بیٹا ہوں اور سامرہ کا امیر ہوں تو تجھ سے کچھ نہ ہو سکے گا۔ جب تک تو بازار میں ہر کس و ناکس سے سوال نہ کرے گا، تجھے اپنی قیمت معلوم نہ ہوگی۔

چنانچہ حضرت شبلی نے ہدایت کے موافق عمل کیا۔ ہر روز ان کی قدر و منزلت کم ہوتی گئی۔ چھ سال میں یہ حال ہو گیا کہ تمام بازار میں پھرے اور کسی نے انہیں کچھ نہ دیا۔ پھر حضرت جنید کی خدمت میں حاضر ہوئے اور حال سنایا۔ حضرت جنید نے فرمایا کہ اے ابو بکر! اب اپنی قدر جان لے کہ خلقت تجھے کس نظر سے دیکھتی ہے تو بھی ان سے دل نہ لگا اور ان کی قدر نہ کر۔ یہ معنی ریاضت کے لیے ہیں، کسب کے لیے نہیں۔

اور حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: میں ایک رفیق موافق رکھتا تھا، اسے موت آگئی اور وہ دنیا کی محبت سے عاقبت کی نعمت پر پہنچ گیا۔ میں نے اسے خواب میں دیکھا اور پوچھا کہ اللہ تعالیٰ نے تیرے ساتھ کیا معاملہ کیا؟ اس نے جواب دیا میں بخشا گیا۔ آپ نے پوچھا کہ کس خصلت کے سبب؟ اس نے عرض کیا: مجھے لاکھڑا کیا گیا اور مجھ سے کہا گیا اے میرے بندے! چونکہ تو بہت ذلیل رہا اور سفلہ لوگوں اور بخیلوں سے تو نے رنج اٹھایا اور ان کے آگے ہاتھ پھیلا یا اور صبر کیا، تجھے اس سبب سے بخشا گیا۔

تیسرے لوگوں نے ادب حق کے لیے خلقت سے سوال کیا اور دنیا کا سبب حال حق تعالیٰ کا سمجھا اور عامہ خلأق کو اس کا وکیل سمجھا اور جو چیز ان کے نفس کے نصیب میں آئی اس کی حق تعالیٰ سے درخواست نہ کی بلکہ اس کے وکیل سے طلب کی اور اپنی بات وکیل سے کہی اور شاہد کے روبرو اپنی ضرورت جو بندہ وکیل کے پیش کرتا ہے، وہ زیادہ ادب و اطاعت سے بہ نسبت اس کے کہ شاہد سے طلب کرے۔ پس اس کا غیر سے سوال کرنا جناب حق میں حضور اور توجہ کی اطاعت ہے۔ اس میں اغراض نہیں پائے جاتے۔

مجھے معلوم ہوا کہ یحییٰ بن معاذ کی ایک بیٹی تھی۔ ایک روز اس نے اپنی ماں سے کہا کہ مجھے فلاں چیز درکار ہے۔ اس کی ماں نے کہا: بیٹی خدا سے مانگ۔ لڑکی نے جواب دیا: اتنا مجھے شرم آتی ہے کہ نفسانی ضرورت اللہ تعالیٰ کے حضور پیش کروں اور جو کچھ تو دے گی وہ بھی اللہ تعالیٰ کی ہوگی اور

میری روزی مقرر ہوگی۔

تو آدابِ سوال یہ ہے کہ اگر تجھے مقصود مل جائے تو نہ ملنے کی نسبت زیادہ خوش نہ ہو اور خلقت کو ویران نہ دیکھے اور عورتوں اور بازار یوں سے سوال نہ کرے۔ اپنا راز صرف اس پر ظاہر کرے جس کا مال حلال ہونے پر اعتبار ہو اور جہاں تک ہو سکے اپنا نصیب سمجھ کر سوال نہ کرے اور اس سے شانِ خانہ داری مطلوب نہ ہو اور اس چیز کو اپنی ملک نہ سمجھے اور وقت چلانے کا ارادہ نہ کرے۔ کل کا خیال دل پر نہ لائے تاکہ ہمیشہ کی ہلاکت میں گرفتار نہ ہو اور اللہ کا نام اپنی گدائی کے پلہ میں نہ باندھے۔ یعنی خدا کے واسطے سے کچھ طلب نہ کرے اور اپنی پارسائی نہ جتائے تاکہ پارسائی کے خیال سے کچھ زیادہ دیں۔

میں نے معلوم کیا کہ صوفیان صاحبِ رتبہ میں سے ایک شخص جنگل سے بھوکا اور سفر کا رنج اٹھائے ہوئے کوفہ کے بازار میں آیا اور ایک چڑیا ہاتھ پر بٹھائے ہوئے کہتا تھا کہ اس چڑیا کے واسطے کچھ مجھے دو۔ لوگوں نے کہا تو کیا کہتا ہے؟ اس نے کہا یہ محال ہے کہ میں کہوں خدا کے واسطے مجھے دو۔ دنیا کے لیے حقیر چیز کے سوا سفارش کرنے والا نہ چاہیے۔ یہ بیان بہت ہے۔ بخوفِ طوالت مختصر کیا ہے۔

وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ.



آدابِ نکاح و تہجد

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿هُنَّ لِيَأْسَ لَكُمْ وَأَنْتُمْ لِيَأْسَ لِهِنَّ ط﴾ (۱) ”عورتیں تمہارا لباس ہیں اور تم ان کے لباس ہو“۔ اور حضور ﷺ نے فرمایا: تَنَاكُحُوا وَتَكَاتَرُوا فَإِنِّي أَبَاهِي بِكُمْ الْيَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَوْ سِقط. (۲) ”آپس میں نکاح کرو اور بڑھاؤ (اپنی نسلیں) میں تمہاری کثرت سے بروز قیامت امتوں پر فخر کروں گا، اگرچہ ساقط شدہ ہی بچہ ہو“۔ اور یہ بھی حضور ﷺ نے فرمایا: إِنَّ أَعْظَمَ النِّسَاءِ بَرَكَاتٍ أَقْلَهُنَّ مَوْنَةً وَأَحْسَنُهُنَّ وَجُوهًا وَأَرْخَصَهُنَّ مُهُورًا. (۳) ”برکت میں زیادہ وہ عورت ہے جس کی تکلیف کم ہو اور

۱۔ سورۃ البقرہ: ۱۸۷

۲۔ یہ الفاظ تو نہیں ملے لیکن اس کی ہم معنی روایت جماعت صحابہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہے۔ امام ابوداؤد، امام نسائی اور امام بیہقی اور دیگر محدثین کرام نے حضرت معقل بن یسار کے طریق سے ان الفاظ کے ساتھ مرفوعاً روایت کیا ہے: تزوجوا الولود الودود فانی مکاتر بکم الامم، جبکہ امام احمد، سعید بن منصور، امام طبرانی نے المعجم الاوسط میں، امام بیہقی اور دیگر محدثین کرام نے حضرت حفص بن عمر بن ابی انس کے طریق سے، انہوں نے اپنے چچا حضرت انس سے روایت کیا ہے کہ: کہان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا مر بالباءة وینہی عن التبطل نہیا شديدا وهو يقول: تزوجوا الودود الودود، فانی مکاتر بکم الامم يوم القيامة. اسے امام شاذلی المقاصد الحسنہ میں لائے ہیں اور امام ابن حبان نے اور حاکم نے اسے صحیح کہا ہے اور ابن ماجہ نے اسے عطاء بن ابی رباح سے، انہوں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے: الکحوا فانی مکاتر بکم. حوالہ کے لیے دیکھئے: مسند الامام احمد ۱۵۸/۳، ۲۲۵، صحیح ابن حبان (حدیث: ۱۲۲۸) سنن سعید بن منصور (۳۹۰)، المعجم الاوسط للطبرانی (۱۹۰) السنن الكبرى للبيهقي ۸۱/۷، المقاصد الحسنہ (ص: ۱۶۵)

۳۔ اسے امام احمد بن حنبل نے اپنی مسند ۱۳۵/۶ میں، امام نسائی نے اپنی سنن ۹۹/۱ کے باب عشرة النساء میں، امام حاکم نے المستدرک ۱۷۸/۲ میں، ابن ابی شیبہ نے ”مصنف“ ۱۸۹/۳ میں، ابو نعیم نے ”حلیۃ الاولیاء“، ۱۸۶/۲، ۲۵۷/۶ میں، امام بیہقی نے ”السنن الكبرى“ ۲۳۵/۷ میں اور ”شعب الایمان“ (ص: ۱۳۱) میں عیسیٰ بن سمعون سے، انہوں نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے جبکہ امام سخاوی ”المقاصد الحسنہ“ (ص: ۲۳۳) میں ان الفاظ کے ساتھ لائے ہیں۔ ان من یمن المرأة تیسیر خطبتھا وتیسیر صداقھا وتیسیر رحمھا.

خوبصورت ہو اور مہر کم ہو۔ اور یہ صحیح خبروں میں ہے کہ نکاح ہر مرد و عورت پر مباح ہے اور اس پر فرض ہے جو حرام سے بچ نہ سکے اور جو حق عیال داری پورا کر سکے اس کو سنت ہے۔ اس قصہ میں ایک جماعت کہتی ہے کہ نکاح دفع شہوت کے لیے اور فراغ دل کے لیے۔ ایک جماعت کہتی ہے کہ نکاح نسل بڑھانے کو کرنا چاہیے۔ اس لیے کہ جب فرزند ہو کر بچپن کی حالت میں فوت ہو جائے تو وہ شفیع ہوگا، اور اگر یہ فرزند ہونے سے پہلے مر جائے تو وہ بچہ اس کا دُعا گور ہے گا۔

اور حدیث میں ہے کہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے حضرت ام کلثوم بنت سیدہ زہرہ رضی اللہ عنہما سے نکاح کی درخواست ان کے والد حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے کی۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے جواب دیا کہ وہ صغیرہ ہے اور آپ معمر ہیں، اور میرا خیال ہے کہ میں اپنے بھتیجے عمر بن جعفر سے اس کا نکاح کروں۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آومی بھیجا اور کہلوا یا کہ ابوالحسن! دنیا میں بہت عورتیں ہیں، ام کلثوم سے میری نیت دفع شہوت نہیں بلکہ نسب ثابت کرنا مراد ہے۔ اس لیے کہ میں نے حضور ﷺ سے سنا ہے کہ آپ نے فرمایا: كُنْ نَسَبٌ وَحَسَبٌ يَنْقَطِعُ بِأَلْمَوْتِ إِلَّا نَسَبِي وَحَسَبِي (۱) ”موت سے تمام حسب و نسب منقطع ہو جائیں گے مگر میرا نسب و حسب“۔ اور ایک روایت میں ہے۔ كُلُّ سَبَبٍ وَنَسَبٍ يَنْقَطِعُ إِلَّا سَبَبِي وَنَسَبِي (۲) ”ہر نسب اور حسب قطع ہو جائیں گے مگر میرا سبب اور نسب“۔ اب مجھے سبب تو حاصل ہے، نسب آپ کے ذریعے حاصل کرنا چاہتا ہوں تاکہ آپ کی برکت سے میں محکم ہو جاؤں۔

۱۔ یہ اس طویل حدیث کا جزو ہے جسے امام شوکانی الفوائد المجموعہ (ص: ۳۲۱) میں لائے ہیں۔ مکمل حدیث یوں ہے:

”إن كل نسب وسبب ينقطع يوم القيامة إلا نسبي وسببي، فجاء رجل فقال: ما لسببک؟ فقال: العرب، قال: فما سببک؟ قال: الموالی، يحل لهم ما يحل لی، ويحرم عليهم ما يحرم علی، إن اللہ أوحی إلی أن لا أخرج فی سرية إلا ویمینی رجل من العرب، فان لم یکن لمن الموالی، فإن لم یکن فإنا لناس فنام لاخیر فیہم، یا سلیمان: لیس لک أن تنکح نساء ہم، ولا تأمرہم، إنما أنتم الوزراء، وهم الأئمة، ولو أن اللہ علم أن شجرة خیر من شجرتی لأخر جنی منها، وہی شجرة العرب“۔ امام شوکانی کہتے ہیں کہ اس کی اسناد میں خارجہ بن مصعب مفرد راوی ہے اور وہ ثقہ بھی نہیں، امام سیوطی نے اللالی المصنوعہ میں کہا ہے کہ اس کے لیے امام ترمذی نے اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے، ابن عدی الکامل میں کہتے ہیں کہ خارجہ بن مصعب ان راویوں میں سے ہیں جن کی حدیث کو لکھا جاتا ہے۔ حوالہ کے لیے دیکھئے: السنن الكبرى للبیہقی ۶/۷۱ (کتاب النکاح: باب الانساب کلہا منقطعہ، الانسبہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) علل الدارقطنی

چنانچہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اپنی صاحبزادی اُمّ کلثوم رضی اللہ عنہا آپ کے عقد میں دے دی۔ پھر آپ سے حضرت زید بن عمر رضی اللہ عنہ متولد ہوئے اور حضور ﷺ نے فرمایا ہے: **تُنكَحُ النِّسَاءُ عَلَى أَرْبَعَةِ عَلَى الْمَالِ وَالْحَسَبِ وَالْحُسْنِ وَالِدِينِ فَعَلَيْكُمْ بَدَاتِ الدِّينِ فَإِنَّهُ مَا اسْتَفَادَ امْرَأَةً بَعْدَ الْإِسْلَامِ خَيْرًا مِنْ زَوْجَةٍ مُؤْمِنَةٍ مُوَافِقَةٍ يَسُرُّ بِهَا إِذَا نَظَرَ إِلَيْهَا (۱)** ”عورتیں چار وجہ سے نکاح میں لائی جاتی ہیں: مال کی وجہ سے، حسب کی وجہ سے، حسن کی وجہ سے، دین کی وجہ سے۔ تو تم دین پر لازم پکڑنا کہ وہ تمہیں فائدہ دے گی اور اسلام کے بعد بہتر بیوی مومنہ ہے جو موافق ہوگی، جس کے دیکھنے سے دل خوش ہو جب اس کی طرف نظر ڈالو۔“ اس کی صحبت سے دین قوت پائے اور دنیا انس و محبت سے گزرے کیونکہ تنہائی میں وحشت ہے اور صحبت میں خوشی۔ اور حضور ﷺ نے فرمایا: **الشَّيْطَانُ مَعَ الْوَاحِدِ (۲)** مرد اور عورت جب تنہا ہوں تو ان کا مصاحب شیطان ہوتا ہے کہ، شہوت کو اس کے دل میں ابھارے اور کوئی صحبت امان اور حرمت کے حکم میں عورت اور خاوند سے زیادہ نہیں لیکن شرط یہ ہے کہ اتفاق اور موافقت ہو اور نا جنس عورت سے زیادہ عذاب اور کسی چیز کا نہیں۔

تو درویش کو لازم ہے کہ پہلے اپنے معاملہ میں غور کرے اور تجرد کی آفتوں اور نکاح کی ذمہ داریوں کا خیال کرے کہ ان میں سے کس کا دفع اس کے دل میں آسان ہے۔ جو آسان ہو اس کی پیروی کرے۔ غرضیکہ مجرد رہنے میں دو آفتیں ہیں۔ ایک ترک سنت، دوسرا شہوت کا دل میں پرورش پانا اور حرام کے خطرے میں پڑنا۔ اور نکاح میں دو آفتیں ہیں: ایک غیر کی طرف دل کا مشغول ہونا۔ دوسرے بدن کو حظِ نفس میں مشغول ہونا۔

۱۔ اسے امام بخاری نے اپنی صحیح میں امام مسلم، امام احمد، امام ابو داؤد، امام نسائی اور امام ابن ماجہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سند کے ساتھ ان الفاظ میں روایت کیا ہے: **تُنكَحُ الْمَرْأَةَ لِأَرْبَعٍ: لِمَالِهَا: وَحَسَبِهَا وَدِينِهَا، فَظَفَرِ بَدَاتِ الدِّينِ تَرِبَتِ يَدَاكَ.** امام احمد، امام ابو یعلیٰ، امام بزار اور امام ابن حبان نے حضرت ابوسعید کی سند کے ساتھ ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے: **بَدَاتِ الدِّينِ وَالْخَلْقِ، تَرِبَتِ يَمِينِكَ** اور امام احمد، اور امام مسلم نے اسے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے طریق سے ان الفاظ میں روایت کیا ہے: **فَعَلَيْكَ بَدَاتِ الدِّينِ تَرِبَتِ يَدَاكَ.** حوالہ کے لیے ملاحظہ فرمائیں: صحیح بخاری (۵۰۹۰) فتح الباری ۱۳۲/۹ صحیح مسلم (۱۲۶۶) سنن ابی داؤد (۲۰۳۲) سنن نسائی ۲۸/۲، سنن ابن ماجہ (۱۸۵۸)، مسند الامام احمد ۲۲۸/۲، ۳۰۲، ۸۰/۳، ۱۵۲/۶، مسند البزار (صحیح ابن حبان) (۱۲۳۱) المقاصد الحسنیة (ص: ۱۶۵)۔

اس مسئلہ کی اصل، گوشہ نشینی اور مجلس گزینی کی طرف رجوع کرتی ہے اور جو خلقت میں صحبت اختیار کرے اس کے لیے نکاح ضروری ہے اور خلقت سے گوشہ نشینی چاہے، اسے مجرد رہنا موزوں ہے۔

حضور ﷺ نے فرمایا: سِيرُوا فَقَدْ سَبَقَ الْمُفْرَدُونَ (۱) ”سفر کرو مجرد لوگ تم سے آگے بڑھے ہیں۔“ اور حسن بن حسین بصریؒ فرماتے ہیں: نَجَا الْمُخْفِقُونَ وَهَلَكَ الْمُثْقَلُونَ. ”ہلکے بوجھ والے نجات پا گئے اور بھاری بوجھ والے ہلاک ہوئے۔“

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: میں ایک گاؤں میں ایک بزرگ کی زیارت کو گیا۔ جب میں وہاں پہنچا اور اس کا گھر دیکھا تو اولیاء اللہ کے گھروں کی طرح ستھرا تھا۔ اس میں دو محراب بنے ہوئے تھے۔ ایک محراب میں وہ بزرگ بیٹھے ہوئے تھے۔ دوسری محراب میں ایک بڑھیا پاکیزہ اور منور چہرہ لیے ہوئے بیٹھی ہوئی تھیں۔ دونوں ریاضت کی وجہ سے ضعیف ہو چکے تھے۔ میری حاضری سے بہت خوش ہوئے۔ تین روز میں وہاں رہا۔ جب میں نے واپسی کا ارادہ کیا تو چلتے ہوئے میں نے پوچھا کہ یہ پاک دامن آپ سے کیا تعلق رکھتی ہیں۔ آپ نے جواب دیا کہ یہ ایک جہت سے تو چچا کی بیٹی ہیں اور ایک جہت سے میری بیوی ہیں۔

میں نے کہا تین دن میں نے تمہیں آپس میں بہت بیگانہ دیکھا۔ انہوں نے جواب دیا کہ ہاں پینسٹھ (۶۵) سال سے ہم دونوں اس حال میں ہیں۔ میں نے اس کی وجہ دریافت کی۔ فرمایا ہم بچپن میں باہمی عاشق تھے۔ ان کے والد مجھ سے اس کا نکاح نہیں کرنا چاہتے تھے اور انہیں ہماری محبت معلوم ہو چکی تھی۔ ایک مدت تک میں رنجیدہ رہا۔ حتیٰ کہ ان کے والد انتقال کر گئے، آخر میں میرے والد نے اس کے ساتھ میرا عقد کر دیا۔ جب پہلی رات ہم یکجا ہوئے تو اس نے مجھ سے کہا: تمہیں معلوم ہے اللہ تعالیٰ نے ہم پر کتنا انعام فرمایا کہ ہمیں ملا دیا اور ہمارے دلوں کو خوف و غم سے صاف کیا۔ میں نے کہا کہ بیشک! ہم پر یہ بڑا فضل ہوا ہے۔

تو بیوی نے کہا اب ہمیں چاہیے کہ اپنے کو خواہش نفسانی سے روکیں اور آج رات میں سب سے پہلے اپنے نفس کو روک کر اپنی خواہش کو زیر پا روندتی ہوں اور اس نعمت کے شکر میں عبادت کرتی ہوں۔

۱۔ مذکورۃ الفاظ تو نہیں ملے لیکن امام سخاوی نے المقاصد الحسنیۃ (ص: ۲۴۷) میں عثمان بن ابی العاص کے طریق سے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے: سیروا علی سیر اضعفکم اور کہا ہے کہ ان الفاظ کے ساتھ اسے میں نہیں جانتا بلکہ امام ترمذی نے اسے حسن کہا ہے اور ابن ماجہ، ابن خزیمہ اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔

میں نے کہا بہت اچھا۔ دوسری رات جب آئی تو اس نے وہی کہا اور ویسے ہی رات عبادت میں گزار دی۔ تیسری شب میں نے کہا کہ دو رات تو تمہاری خاطر سے گزریں، آج کی رات میری خاطر شب بیداری ہونی چاہیے۔ آج پینسٹھ سال گزر گئے ہیں کہ ہم نے ایک دوسرے کو دیکھا بھی نہیں اور لمس بھی نہیں کیا اور تمام عمر اس نعمت کے شکر میں گزار رہے ہیں۔

تو درویش جب نکاح کرے تو چاہیے کہ اس پردہ نشین کی خوراک حلال سے کمائے اور اس کا مہر مال حلال سے ادا کرے اور جب تک حقوق الہی اور اتباع امر سے اس کے ذمہ باقی رہے، حظ نفس کی طرف مشغول نہ ہو۔ پھر جب اپنے اور دو معمولات سے فارغ ہو جائے اور اس سے ہمبستری کا ارادہ کرے تو بارگاہ حق میں مناجات کرے۔ الہی! تو نے مشیتِ خاکِ انسان میں شہوت پیدا کی ہے تاکہ دنیا آباد ہو اور تو نے اپنے علم میں ارادہ فرمایا کہ مجھے یہ صحبت ملی۔ یارب! میری اس صحبت سے دو چیزیں بدل دے: ایک حرام حرص کو حلال سے، دوسرے فرزند ولی پسندیدہ مجھے عطا ہو، نہ ایسا فرزند کہ میرے دل سے تیری یاد فراموش کرے۔

حضرت سہل بن عبداللہ تستری رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ آپ کے یہاں فرزند متولد ہوا۔ بچپن میں وہ جب اپنی والدہ سے کھانا مانگتا تو والدہ کہتی کہ بیٹا اپنے رب سے مانگ۔ وہ بچہ محراب میں جاتا اور سجدہ کرتا۔ آپ کی والدہ خفیہ طور سے اس کی مطلوبہ چیز دے دیتیں اور صاحبزادے پر ظاہر نہ ہونے دیتیں کہ والدہ نے دیا ہے۔ حتیٰ کہ انہیں اپنے رب سے مانگنے کی عادت پڑ گئی۔ ایک روز جب وہ مکتب سے آئے، دیکھا کہ اماں موجود نہیں ہیں۔ انہوں نے حسب معمول سجدہ کیا اور کھانا مانگا۔ اللہ تعالیٰ نے عطا فرمادیا۔ جب آپ کی والدہ آئیں تو دیکھا صاحبزادے کھانا کھا رہے ہیں، فرمایا: بیٹا! یہ کھانا کہاں سے آیا؟ فرمایا جہاں سے ہمیشہ آتا تھا۔

جب حضرت زکریا علیہ السلام، حضرت مریم علیہا السلام کے پاس آتے تو موسم گرما میں سرما کے پھل اور موسم سرما میں گرما کے پھل دیکھتے تو متعجب ہو کر پوچھتے ﴿أَتَىٰ لَكَ هَذَا﴾ (۱) ”یہ تمہیں کس جگہ سے ملے۔“ وہ فرماتیں: ﴿مِنْ عِنْدِ اللَّهِ﴾ (۲) ”اللہ کے پاس سے۔“

تو درویش پر لازم ہے کہ کسی سنت کا استعمال دنیا اور حرام مشغلہ ذلیل میں نہ کرے کیونکہ درویش کی ہلاکت اس کے دل کی خرابی میں ہوتی ہے۔ جس طرح مالدار کی خرابی خانماں اور گھر کی خرابیوں سے ہوتی ہے۔ مگر جو کچھ مالدار کا نقصان ہو تو اس کی تلافی ہو سکتی ہے، لیکن جو درویش پر آفت آتی ہے اس کی تلافی نہیں ہوتی۔ ہم اپنے زمانہ میں دیکھتے ہیں کہ عورت کتنی ہی موافق ہو مگر

لازمی طور پر وہ بلا ضرورت زیادہ اور فضول اشیاء کی طالب ہوتی ہے۔

اس سبب سے ایک گروہ کہتا ہے کہ مجرد رہنے میں ہلکا رہا جاتا ہے اور انہوں نے مجرد ہی اختیار کیا ہے اور اس رعایت پر وہ عامل ہیں جو حضور ﷺ نے فرمایا: خَيْرُ النَّاسِ فِيْ اٰخِرِ الزَّمَانِ خَفِيْفُ الْحَاذِ قَيْلَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ مَا خَفِيْفُ الْحَاذِ؟ قَالَ الَّذِيْ لَا اَهْلَ لَهٗ وَلَا وَلَدَ لَهٗ (۱) ”آخر زمانہ میں بہترین آدمی وہ ہوگا جو خفیف الحاذ ہو۔ عرض کیا گیا، حضور! خفیف الحاذ کیا ہے؟ فرمایا وہ لوگ جن کے بیوی بچے نہ ہوں۔“

۱۔ اسے امام ابو یعلیٰ نے رواد بن جراح سے، انہوں نے سفیان سے، انہوں نے منصور سے، انہوں نے ربیع سے انہوں نے حذیقہ بن الیمان سے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے: خَيْرُكُمْ فِي الْمَاتِنِ كُلِّ خَفِيْفِ الْحَاذِ، قَالُوا: مَا الْحَاذِ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ وَسَلَّمَ اِقَالَ مِنْ لَا اَهْلَ لَهٗ وَلَا وَلَدَ لَهٗ۔ امام بیہقی نے اسے شعب الایمان میں ذکر کیا ہے اور کہا ہے اسے رواد سفیان سے روایت کرنے میں منفرد ہے۔ امام ابن جوزی نے امام دارقطنی کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ دارقطنی نے کہا ہے کہ اس روایت میں رواد منفرد ہیں اور ضعیف ہیں۔ امام بخاری نے اسے ضعیف راویوں میں شمار کیا ہے اور کہا ہے کہ ان کا حافظہ اختلاط کا شکار ہو گیا ہے اور ان کی روایت کردہ حدیث پختہ نہیں ہوگی۔ امام احمد فرماتے ہیں: اس کی حدیث مناکیر میں شمار کی جاتی ہے۔ امام غزالی کہتے ہیں کہ رواد کو حفاظ نے ضعیف قرار دیا ہے اور اسے غلط کہا ہے اور اس معنی میں اس کی ساری روایات کمزور ہونگی۔ امام ذہبی نے ”میزان الاعتدال“ میں ”رواد“ کو امام دارقطنی کے حوالے سے ضعیف کہا ہے جبکہ ابن معین نے اس کو ثقہ کہا ہے اور کہا ہے: کہ اسکی سفیان سے روایت کردہ یہ حدیث منکر ہے، خیرکم فی الماتین کل خفیف الحاذ۔ امام ابو حاتم کہتے ہیں کہ یہ منکر ہے۔ اس کی روایت کردہ حدیث ثقہ راویوں جیسی نہیں اور کہتے ہیں کہ مجھے یہ بات بھی پہنچی ہے کہ ایک مرتبہ ایک آدمی رواد کے پاس آیا تو رواد نے اس کے سامنے یہ حدیث بیان کی اور اس نے اسے حسن قرار دیا اور لکھ دیا: ابن عدی نے رواد کے بارے کہا ہے کہ اکثر اوقات جس روایت کا راوی رواد ہو لوگ اس کی متابعت نہیں کرتے۔ امام عراقی نے اس کے تمام طرق و اسانید کو ضعیف کہا ہے۔ معروف روایت وہی ہے جسے امام ترمذی نے ابو امامہ سے روایت کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے: ان اغبط اولیائنی عندی لمومن خفیف الحاذ، ذو حظ من الصلاة احسن عبادة ربه، واطاعه فی السر والعلانية وکان غامضاً فی الناس، لا یشار الیه بالا صابع وکان رزقه کفالا، فصبر علی ذلک، ثم نفض بیده فقال: عجلت منیتہ قلت بواکیہ، قل ترالہ۔ اسی طرح اسے امام احمد نے اور امام بیہقی نے کتاب الزهد میں اور حاکم نے المستدرک (باب الأطمعة) میں روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ شامیوں کی یہ روایت ان کے نزدیک صحیح ہے۔ لیکن امام بخاری اور امام مسلم نے اسے روایت نہیں کیا۔ امام ابن ماجہ نے اسے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے: اغبط الناس عندی مومن خفیف الحاذ، اور اس حدیث کی شاہد روایت وہ ہے جسے خطیب وغیرہ نے ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے: إذا احب اللہ العبد اقتناه لنفسه ولم (بقیہ حواشی اگلے صفحہ پر۔۔۔)

اور یہ بھی فرمایا: سَبَرُوا فَقَدْ سَبَقَ الْمُفْرَدُونَ (۱) ”سیر کرو بیشک مجرد لوگ سبقت لے گئے ہیں۔“ اور اس طریقت کے مشائخ اس امر پر متفق ہیں کہ اس طریقت میں بہت اچھے اور فاضل مجرد لوگ ہیں کہ ان کا دل آفات سے خالی ہے اور ان کی طبیعت معصیت کے ارادے اور شہوت سے روگرواں ہے۔

عام لوگ شہوت پرستی کے لیے اس حدیث کو دلیل لاتے ہیں جو حضور ﷺ سے مروی ہے: حُبِّبَ إِلَيَّ مِنْ دُنْيَاكُمْ ثَلَاثُ الْطَيْبِ وَالنِّسَاءِ وَجُعِلَتْ قُرَّةُ عَيْنِي فِي الصَّلَاةِ. ”مجھے تمہاری دنیا سے تین چیزیں پسند کر دی گئیں: خوشبو، عورتیں اور نماز میں آنکھوں کی ٹھنڈک رکھی گئی۔“ اور کہتے ہیں کہ جب عورتیں حضور ﷺ کو پیاری ہوئی تو نکاح کرنا تجرد سے افضل ہوا۔ میں کہتا ہوں کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

(بقیہ حاشیہ گذشتہ صفحہ سے)

یشغفه بزوجه ولا ولده . امام دیلمی نے اسے زکریا بن یحییٰ صوفی سے، انہوں نے ابن حذیفہ الیمان سے، انہوں نے اپنے باپ سے، انہوں نے اپنے دادا حذیفہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے۔ خیر نسانکم بعد سنین ومئة العواقر، وخیر اولادکم بعد اربع وخمسين البنات . امام دیلمی نے اسے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے بھی مرفوعاً روایت کیا ہے: یاتی علی الناس زمان لان یربی احدکم جرو کلب خیر له من ان یربی ولدا من صلبه . اس حدیث کو امام سیوطی نے الجامع الصغیر میں روایت کیا ہے اور اسے امام ابویعلیٰ عن حذیفہ کی طرف منسوب کیا ہے اور اسے صحیح قرار دیا ہے اور الجامع الکبیر میں اسے امام ابویعلیٰ، ابن حبان خطیب اور ابن عساکر کی طرف منسوب کیا ہے۔ حاذ کالغوی معنی ”حال“ ہے یا اس کی اصل گھوڑے کی پیٹھ کا وہ حصہ ہے جس پر زین ڈالی جاتی ہے اور حاذ اور حال ایک ہی ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بندہ کے مال اور اہل و عیال کے کم ہونے کی وجہ سے بطور مثال بیان کیا ہے۔ حوالہ کے لیے دیکھیں: کشف الخفاء للعجلونی (۱۲۳۵)، المقاصد الحسنیة للسخاوی (۳۵۲)، تاریخ بغداد للخطیب ۱۹۸/۶، ۲۲۵/۱۱، الجامع الصغیر (۴۱۰۷) میزان الاعتدال للذہبی ۵۵/۲، مسند الامام احمد ۲۵۲/۵، سنن الترمذی ۲۶۹/۳، سنن ابن ماجہ (۳۱۳)، فیض القدیر للمناوی ۳۹۷/۳، العلل المتناہیة لابن الجوزی ۳۶/۲، العلل لابن ابی حاتم ۲۲۰/۲، اسنی المطالب (۶۰۹) تمیز الطیب من الخبیث (۵۸۳)، الغماز علی اللماز (۱۰۲) الجامع الکبیر (۱۳۸۹۳) الدر المنثور للسیوطی (۲۰۶)

۱۔ اس حدیث مبارکہ کا ذکر پہلے گزر چکا ہے۔

لِي حِرْفَتَانِ الْفَقْرُ وَالْجِهَادُ (۱)

”میرے لیے دو حرفے ہیں، فقر اور جہاد“۔

تو اسے بھی اختیار کرنا چاہیے اور اس پیشہ کے علاوہ تمام پیشے ترک کرنے چاہئیں۔ اگر عورت بموجب حدیث پسند ہے تو بموجب حدیث پیشے بھی یہی دو پسند ہونے چاہئیں۔ لیکن چونکہ عورت کی طرف میلان زیادہ ہوتا ہے تو اس پر حدیث سند میں لانا زیادہ آسان ہو گیا اور فقر چونکہ مشکل ہے۔ جہاد چونکہ تکلیف لایطاق ہے لہذا اس طرف میلان دشوار ہے۔ یاد رکھو کہ کوئی پچاس سال اتباع شہوت میں گزارے اور خیال کرے کہ میں سنت کا تابع ہوں وہ بڑی سخت غلطی پر ہے۔ غرضیکہ پہلے فساد کا فتنہ سر آدم علیہ السلام پر جو آیا اس کا سبب عورت تھی اور پہلا فساد جو دنیا میں ہوا اس کا سبب بھی عورت تھی۔ یعنی فتنہ ہاتیل و قاتیل، یہ بھی عورت کی وجہ سے ہوا۔ اور جب اللہ تعالیٰ نے دو فرشتوں کو عذاب کرنا چاہا تو اس کی بنا بھی عورت ہوئی اور ہماری اس دنیا میں آج تک دین و دنیا کے سب فسادوں کی باعث عورتیں ہی ہیں اور حضور ﷺ نے یہ بھی فرمایا:

مَا تَرَكَتُ بَعْدِي فِتْنَةً أَضْرَّ عَلَى الرَّجَالِ مِنَ النِّسَاءِ. (۲)

”میں نے اپنے بعد کوئی ایسا فتنہ نہیں چھوڑا جو مردوں کو زیادہ ضرر رساں ہو

عورتوں کے سوا۔“ تو جب ان کا فساد ظاہر میں اتنا ہے تو باطن میں کیسا ہوگا۔

اور میں علی بن عثمان جلابی کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے گیارہ سال آفت نکاح سے محفوظ رکھا۔

پھر اس کی تقدیر سے میں فساد میں مبتلا ہوا تو میرا ظاہر و باطن عیال داری کے باعث ایسے حال میں

۱۔ امام غزالی ”اسے احیاء علوم الدین ۵/۵۳ میں ان الفاظ کے ساتھ لائے ہیں: اِنَّ لِي حِرْفَتَيْنِ النِّتَيْنِ، فَمَنْ أَحْبَبَهُمَا فَقَدْ أَحْبَبَنِي، وَمَنْ أَبْغَضَهُمَا فَقَدْ أَبْغَضَنِي 'الفقر والجهد' امام حافظ عراقی نے ”المغنی عن حمل الأسفار فی تخریج الاحیاء ۳/۲۸۱ میں کہا ہے کہ اس روایت کی کوئی اصل مجھے نہیں ملی۔ شیخ البانی کہتے ہیں (۲/۴۰) کہ یہ روایت میرے نزدیک منکر ہے کیونکہ یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فقر سے پناہ مانگی ہے یہ کیسے باور کر لیا جائے کہ جس چیز سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود پناہ مانگیں اپنی امت کو اس کی محبت پر برا بیختہ کریں۔

۲۔ اسے امام بخاری اور امام مسلم نے حضرت اسامہ بن زید سے مرفوعاً روایت کیا ہے اور امام دیلمی نے حضرت علی

رضی اللہ عنہ سے بغیر سند کے ان الفاظ میں مرفوعاً روایت کیا ہے۔ ما اُخاف علی امتی فتنۃ اُخوف علیہا

من النساء والخمر، حوالہ کے لیے: المقاصد الحسنۃ للسخاوی. (حدیث: ۹۳۱ ص:

۳۶۳) صحیح بخاری ۵/۱۹۵۹ (کتاب النکاح باب: ما یقتضی من شوم المرأة) صحیح

مسلم (کتاب الذکر والذعاء والتوبۃ (الرفاق) باب: اکثر اهل الجنة الفقراء حدیث:

گرفتار ہوا جو میں نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے بھی دکھایا اور ایک سال میں اس میں مستغرق رہا، حتیٰ کہ میرا دین تباہ ہو جائے لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل کمال سے پاکدامنی کو مجھ بیچارے کی پیشوائی کے لیے بھیجا اور اپنی رحمت سے خلاصی عطا فرمائی۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی جَزِیْلِ نِعْمَاتِہِ۔

غرض یہ کہ اس طریقت کا قاعدہ مجرد پر رکھا گیا ہے۔ جب نکاح کا وقت آتا ہے، حال دگرگوں ہو جاتا ہے اور کوئی لشکر ایسا نہیں ہوتا جو عسا کر شہوت کا مقابلہ کر سکے۔ مگر آتشِ جہد و یقین سے ہی اسے بجھا سکتے ہیں۔ اس لیے کہ جو آفت ہو اس کے دفعہ کا آلہ بھی تیرے ساتھ ہوگا۔ غیر سے ہرگز تیری حالت نہیں بدل سکتی۔ شہوت دو چیز سے زائل ہوتی ہے، ایک تکلیف سے، دوسرے کسبِ مجاہدہ سے۔ لیکن تکلیف، وہ آدمی کے مقدر میں ہے جو بھوک ہے اور جو تکلف سے بالاتر ہے وہ خوفِ الہی اور بیقرار کر دینے والی سچی محبت ہے جو متفرق ہمتوں سے جمع ہوتی ہے، اور محبت اپنا غلبہ اجزاء بدنی پر کرتی ہے اور تمام حواس کو اپنے وصف سے معزول کر دیتی ہے اور بندہ کو سب سے جدا کر دیتی ہے اور واہیات کو اس سے فنا کر دیتی ہے۔

حضرت احمد حماد سرخسی رحمۃ اللہ علیہ جو ماوراء النہر میں میرے رفیق تھے اور صاحبِ شان مرد تھے۔ لوگوں نے انہیں مجبور کیا کہ آپ کو نکاح کی ضرورت ہے۔ آپ نے فرمایا نہیں۔ انہوں نے پوچھا کیوں؟ آپ نے فرمایا اس لیے کہ میں اپنے حال میں آپ سے غائب ہوتا ہوں یا حاضر۔ جب غائب ہوتا ہوں تو دو جہاں سے بے خبر ہوتا ہوں اور جب حاضر ہوتا ہوں تو میں اپنے نفس کو اتنا قابو میں رکھتا ہوں کہ جب اُسے دو روٹیاں ملتی ہیں تو وہ سمجھتا ہے کہ مجھے ہزار حوریں ملیں۔ تو دل کا شغل بڑا کام ہے، جس چیز سے ہو سکے بہتر ہے۔

دوسرے گروہ نے کہا کہ ہم بھی اپنا اختیار دونوں حال سے جدا کرتے ہیں تاکہ دیکھیں کہ پردہِ غیب سے حکمِ تقدیر کیا ہوتا ہے۔ اگر مجرد ہونا ہمارے نصیب میں ہو تو اس میں پاکدامنی کی کوشش کریں گے اور اگر نکاح کرنا نصیب میں ہو تو سنت کے تابع ہو جائیں گے اور فراغتِ دل کی کوشش کریں گے۔

جب اللہ تعالیٰ کی حفاظت قائم ہوتی ہے تو بندہ کا مجرد ہونا ایسا ہوتا ہے جیسے حضرت یوسف علیہ السلام کا زلیخا کی بلاء میں بچاؤ کی طاقت رکھتے ہوئے اپنی مراد سے روگردانی رہی اور خواہش کو مغلوب کرنے اور نفس کو عیب سے محفوظ رکھنے میں کامیاب ہوئے۔ جب زلیخا نے ان سے خلوت چاہی اور نکاح کی خواہش کی تو یہ نکاح مثل حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہوا، جو حق تعالیٰ کے بھروسہ پر تھا اور مشاغلِ خانگی کو مشاغل نہ سمجھا۔ حتیٰ کہ جب حضرت سارہ علیہا السلام کو رشک ہوا اور

غیرت بڑھی تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت ہاجرہ علیہا السلام کو ہمراہ لیا اور ایسے جنگل میں لے گئے جہاں کھیتی باڑی بھی نہ تھی۔ جسے ”ارض غیر ذی زرع“ فرمایا گیا اور حضرت ہاجرہ علیہا السلام کو حفاظت حق میں چھوڑ کر ان سے منہ موڑ لیا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی حفاظت میں رکھا جیسے چاہا۔ تو بندہ کا ہلاک ہونا نکاح کرنے اور مجرد رہنے میں نہیں بلکہ اس کی بلا اپنے اختیار اور اتباع خواہشات پر ہے اور ہر متاہل کی شرط ادب یہ ہے کہ اس رشد کے بعد کوئی ورد اس کے اوراد سے فوت نہ ہو۔

اور جس حال میں وہ تھا وہ ضائع نہ ہو، اور اس کا تباہ نہ ہو، اس کے ساتھ اپنے اہل کے ساتھ شفقت بھی رہے اور حلال نان و نفقہ کی رعایت بھی رکھے اور ظلم و جور بھی نہ کرے۔ حتیٰ کہ فرزند بھی اگر ہو تو انہیں شرائط ادب میں ہو۔

حکایت:

مشہور ہے کہ حضرت احمد بن حرب نیشاپوری رحمۃ اللہ علیہ ایک روز رؤساء و سادات نیشاپور سے ملے۔ وہ سلام کرنے حاضر ہوئے تھے۔ سب ایک جگہ بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک لڑکا شراب سے بدست گاتا ہوا آیا اور بلا خوف ان میں سے گزر گیا۔ تمام حضار مجلس کو ناگوار گزارا۔ شیخ احمد نے لوگوں سے کہا تمہیں کیا ہوا کہ یک لخت متغیر ہو گئے۔ سب نے عرض کیا کہ حضرت اس لڑکے کی بے حجابی سے صحبت پر اگندہ ہو گئی۔ شیخ احمد نے فرمایا وہ معذور ہے، اس لیے کہ ایک رات ہمارے ہمسایہ نے کچھ کھانا بھیجا اور اسے ہم نے کھایا اور اس رات ہم بستری ہوئی۔ اس کھانے سے لڑکے کا نطفہ قرار پایا۔ اس رات نیند بھی اس قدر آئی کہ شب کے اوراد بھی رہ گئے۔ ہم نے جستجو کی۔ ہمسایہ سے پوچھا کہ جو کھانا تو نے بھیجا تھا، وہ کہاں سے آیا تھا۔ اس نے بتایا کہ شاہی والے گھر سے۔ جب مزید تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ وہ کھانا بادشاہ کے یہاں سے آیا تھا۔

اور شرط ادب مجرد یہ ہے کہ آنکھ نامناسب جگہ نہ ڈالے اور جو نہ کہنے کی بات ہو، نہ کہے اور جو نہ سوچنے کی بات ہو نہ سوچے۔ شہوت کی آگ کو بھوک کے پانی سے بجھائے اور دل کو دنیا و حوادث کی مشغولیت سے نگاہ رکھے اور محض خواہشات نفسانی کو الہام اور علم نہ کہے اور شعبدات شیطانی کی تاویل نہ کرے تاکہ طریقت میں مقبول ہو۔ یہ آداب صحبت اور عمل کا مختصر بیان ہے۔

وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالصّٰوَابِ

کشف حجابِ وہم: اصطلاحاتِ صوفیاء

جان لے تو! اللہ تجھے سعید فرمائے کہ ہر اہلِ صنعت و معاملت نے باہمی کلام کرنے کو الفاظ و کلمات وضع کیے ہیں، جن سے عوام واقف نہیں ہوتے لیکن اہلِ فن سمجھ لیتے ہیں اور ان اصطلاحات و کلمات کے وضع کرنے سے دو چیزیں مراد ہوتی ہیں: ایک سمجھانے میں خوبیوں اور باریکیوں کا آسان ہوتا ہے تاکہ پوشیدہ راز آسان ہو جائیں۔ دوسرے فن والا فن والے سے سمجھ سکے اور نا اہل لوگ اس بھید سے محروم ہی رہیں۔

اس کے دلائل واضح ہیں، جیسے صرف والے فعل ماضی، مضارع، صحیح معتل، اجوف، لفیف، ناقص وغیرہ بولتے ہیں۔ نحوی لوگ رفع، ضمہ، نصب، فتح، خفض، کسر جزم، جر، منصرف، غیر منصرف وغیرہ بولتے ہیں۔ اہلِ عروض بولتے ہیں بحر، دواز، سبب و تد، فاصلہ، وغیرہ۔ اہلِ حساب اپنی مخصوص اصطلاحات میں فرد، زوج، ضرب، قسمت، کعب، جذر، اضافت، تضعیف و تنصیف، جمع، تفریق بولتے ہیں۔

فقہاء کی اصطلاحات مخصوص ہیں: جیسے علت، معلول، قیاس، اجتهاد، دفع، الزام، وغیرہ۔ محدثین بھی مخصوص اصطلاح میں مسند، مرسل، احاد، متواتر، جرح، تعدیل وغیرہ کہتے ہیں۔ متکلمین نے بھی اپنے لیے اصطلاحات وضع کر رکھی ہیں جیسے عرض، جوہر، کل، جزو، جسم، حدث، تحیز و توالی وغیرہ۔

اسی طرح اس طائفہ صوفیاء کی بھی اصطلاحات ہیں تاکہ اس راہ میں کوئی ناواقف تصرف نہ کر سکے اور اربابِ طریقت اپنا مقصد پورا ادا کر سکیں۔ چنانچہ ان کی اصطلاحات میں سے کچھ بیان کرتا ہوں تاکہ واضح ہو سکے کہ اس کی مراد اس بیان سے کیا ہوتی ہے اور اس کتاب کے پڑھنے والے فائدہ حاصل کر کے میرے حق میں دعا کریں۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اسی میں سے حال اور وقت اور دونوں کا فرق بیان کرتا ہوں۔

حال اور وقت:

طائفہ صوفیاء میں یہ لفظ بہت مشہور ہے اور مشائخِ کرام کے اس میں بہت اقوال ہیں۔ میری مراد اس سے اثباتِ تحقیق ہے نہ کہ طویل بیان۔ وقت اسے کہتے ہیں کہ بندہ اس کی وجہ سے ماضی و مستقبل سے فارغ ہوتا ہے۔ یعنی ایک کیفیت جو وارد ہوتی ہے، وہ حق کی طرف سے اس کے دل پر پہنچے اور اس کے سر کو اس سے جمع کرے جیسے کشف میں جمع ہوتی ہے تو اس حال میں اسے نہ تو

گذشتہ حال یاد آتا ہے اور نہ آئندہ۔ تو یہ تمام مخلوق کو حاصل نہیں ہوتا اور وہ نہیں جانتے کہ ہمارا سابقہ حال کیا ہوگا اور ہمارا انجام کیا ہوگا۔

لیکن خداوندانِ وقت کہتے ہیں کہ ہمارا علم اول آخر کو معلوم کر سکتا ہے۔ ہمیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسا اچھا وقت حاصل ہوتا ہے کہ ہم آئندہ کی طرف مشغول ہو جائیں یا اس کا اندیشہ دل پر لائیں۔ تو وقت سے محبوب ہو جائیں اور حجاب بڑی پریشانی ہوتی ہے۔ تو جو چیز حاصل نہ ہو سکے، اس کا اندیشہ محال ہے۔ جیسا کہ حضرت ابوسعید خرازی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اپنے وقت کو زیادہ عزیز چیزوں کے سوا مشغول نہ کر اور بندہ کی عزیز چیز ماضی اور مستقبل کا مشغول ہے۔ اور حضور ﷺ نے فرمایا: لِي مَعَ اللَّهِ وَقْتُ لَا يَسْعُنِي فِيهِ مَلِكٌ مُقَرَّبٌ وَلَا نَبِيٌّ مُرْسَلٌ. (۱) ”مجھے اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایک ایسا وقت ہے جس میں مقرب فرشتہ اور نبی مرسل کو گنجائش نہیں۔“ اس میں اٹھارہ ہزار عالم کا دل پر گزر نہیں ہوتا اور میری نظر میں اس کی کچھ قدر نہیں۔

اسی سبب سے جب شب معراج آسمان وزمین کی زینت حضور ﷺ پر آشکارا کی گئی تو آپ ﷺ نے کسی چیز کو نہ دیکھا۔ حتیٰ کہ جناب رب العزت نے فرمایا: ﴿مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغَى﴾ (۲) ”ہمارے حبیب کی نظر نہ پھری، نہ حد سے گزری۔“ اس لیے کہ حضور ﷺ عزیز تھے اور عزیز کو عزیز کے سوا مشغلہ نہیں ہوتا۔ تو موجد کے دو وقت ہوتے ہیں: ایک از خود رسی کی حالت میں، دوسرا وجد کی حالت میں۔ ایک وصال کے مقام میں ایک فراق کے محل میں، اور وہ دونوں وقت میں مقہور ہوتا ہے اس لیے کہ وصال میں اس کا وصال حق ہوتا ہے اور فضل میں اس کا فضل

۱۔ امام سخاوی المقاصد الحسنة (ص: ۳۵۶ حدیث: ۹۲۶) میں اسے لائے ہیں اور کہا ہے کہ صوفیاء اس کا اکثر حوالہ دیتے ہیں اور یہ رسالہ قشیریہ میں ان الفاظ کے ساتھ مرقوم ہے: لِي مَعَ اللَّهِ وَقْتُ لَا يَسْعُنِي فِيهِ غَيْرُ رَبِّي. اور یہ معنوی طور پر اس حدیث کے مشابہ ہے جسے امام ترمذی نے ”الشمائل المحمدية“ میں اور ابن راہویہ نے اپنی ”مسند“ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی طویل حدیث میں ذکر کیا ہے۔ کان رسول اللہ ﷺ اذا أتى منزله جزأ د خوله ثلاثة أجزاء جزء الله تعالى وجزأه بينه وبين الناس. ملا علی قاری ”الأسرار المرصوعة“ (۷۶۳) میں رقم طراز ہیں: مذکورہ روایت میں ملک مقرب سے مراد جبرائیل علیہ السلام اور نبی مرسل سے اپنی ذات بابرکات مراد ہے اور یہ مقام استغراق ہے جسے سکر، محو اور فناء سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

حوالہ کے لیے: رسالہ قشیریہ (۳۵). كشف الخفاء ومزيل الالباس عما اشتهر من الاحاديث على السنة الناس للعجلوني (حدیث: ۲۱۵۹) اللؤلؤ المرصوع (ص: ۶۶).

جتن ہوتا ہے اور اس میں اختیار و کسب نہیں ہوتا کہ اس کا وصف کیا جائے۔ جب بندہ کا اختیار اس کے وقت سے قطع ہو جائے تو وہ جو کچھ کرتا ہے وقت کو دیکھ کر نہیں کرتا۔

حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ آپؑ نے فرمایا کہ میں نے جنگل میں ایک درویش کو دیکھا۔ خار مغیلاں پر بیٹھا تھا اور وہ جگہ سخت تکلیف دہ تھی۔ میں نے اس سے دریافت کیا کہ بھائی! تو ایسی سخت جگہ ایسے آرام سے کیوں بیٹھا ہوا ہے۔ اس نے جواب دیا کہ میرا ایک وقت تھا جو یہاں ضائع ہوا ہے، اب یہاں بیٹھا ہوں اور غم کھاتا ہوں۔ میں نے کہا کہ یہاں تو کتنی مدت سے ہے؟ اس نے کہا بارہ سال سے، اب اگر شیخ مجھ پر توجہ کرے تو میں کامیاب ہو جاؤں اور اپنا وقت حاصل کروں۔

حضرت جنیدؒ فرماتے ہیں: میں چل دیا اور حج ادا کر کے اس کے لیے دعا کی۔ اللہ نے قبول فرمائی، وہ کامیاب ہو گیا۔ جب میں واپس آیا تو اسے وہیں بیٹھا دیکھا۔ میں نے کہا اے جوانمرد! اب تجھے وقت مل گیا، اب یہاں سے کیوں نہیں گیا۔ عرض کی، اے شیخ! میں نے قدامت اختیار کی ہے، جو جائے وحشت تھی اور میں نے جہاں سرمایہ کم کیا تھا، وہ مل گیا۔ تو کیا یہ اب جائز ہے کہ جہاں سے سرمایہ ملا اس جگہ کو چھوڑ دوں، یہ تو میرے انس کا مقام ہے۔ آپ تشریف لے جائیں کہ میں یہاں کی خاک اپنی خاک میں ملاؤں گا اور بروز قیامت اسی خاک سے سر اٹھاؤں گا کہ میرے انس کا سرمایہ اور سرور کا مقام یہی ہے۔

فَكُلُّ امْرِئٍ يُولِي الْعَجْمِيلَ مُحَبَّبٌ

وَ كُلُّ مَكَانٍ يُنْبِتُ الْعِزَّ طَيِّبٌ

”ہر انسان خوبصورت دوست کو قبول کرنے والا ہے اور جس مکان میں عزت

پیدا ہو وہ پسند آتا ہے۔“

تو جو چیز بلا کسب آدمی کو حاصل ہو یعنی تکلیف سے نہ ملے ایسی چیز بازار میں نہیں بیچی جاتی، گو اس کے عوض جان دے دی جائے اور بعض کو حاصل کرنے یا دور کرنے میں ارادہ نہیں ہوتا۔ اس کی رعایت میں دونوں پہلو برابر ہوتے ہیں اور اس کی تقدیر میں بندہ کا اختیار باطل ہے، اور مشائخ رحمۃ اللہ علیہم نے فرمایا ہے: **الْوَقْتُ سَيْفٌ قَاطِعٌ**. ”وقت کاٹنے والی تلوار ہے۔“

چونکہ تلوار کی صفت کاٹنا ہے اور وقت کی صفت بھی وقت کا کاٹنا یعنی ماضی و مستقبل کا مٹانا اور کل گذشتہ اور کل آئندہ کو دل سے محو کر دینا ہوتا ہے۔ تو معلوم ہوا کہ تلوار کی صحبت باخطر ہے۔ **إِمَّا هَلَكَ أَوْ إِمَّا مَلَكَ** ”یا ہلاک ہو یا مالک ہوا۔“ اگر کوئی ہزار سال تلوار کی خدمت کرے اور اپنے

عزیز کندھوں پر اٹھائے پھرے تو بھی کاٹنے کے وقت اپنے صاحب اور غیر میں فرق نہ کرے۔ اس لیے کہ اس کی صفت ہی قہر ہے اور مصاحبت اختیار کرنے سے صفت اس کی زائل نہیں ہو جاتی اور حال ایک وارد وقت ہوتا ہے، جو وقت کو ہی زیبا ہے، جیسے روح بدن کو زیبا ہے اور وقت لازماً محتاج حال ہوتا ہے۔ اس میں وقت کی صفائی حال کے ساتھ ہوتی ہے اور اس کا قیام اسی سے ہوتا ہے۔ تو خلاصہ یہ نکلا کہ صاحب وقت جب صاحب حال ہو جاتا ہے تو تغیر اس سے قطع ہو جاتا ہے اور وہ اپنے وقت میں قائم ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہ وقت بے حال محض زوال ہوتا ہے۔ جب حال اس سے ملا تو اس کا سب زمانہ حال ہوتا ہے۔ اس پر زوال روا نہیں ہوتا اور جب آمد و شد معلوم ہو تو وہ وارد ہونے والا ظہور ہوتا ہے، جیسا کہ اس سے پہلے صاحب وقت پر وارد تھا اور ممکن کو غفلت جائز ہے اور صاحب غفلت پر جب حال نازل ہو تو وہ ممکن وقت ہو جاتا ہے اور اس پر بوجہ صاحب حال ہونے کے، غفلت روا نہیں ہوتی اور کہتے ہیں: **الْحَالُ سُكُوتُ اللِّسَانِ فِي فُنُونِ الْبَيَانِ**۔ ”حال کیا ہے! زبان خاموش سے فنون بیان میں بولنا۔“

چنانچہ صاحب حال کی زبان بیان حال سے ساکت ہوتی ہے اور اس کی تمام کیفیت اور تحقیق حال کی گویا ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے پیر رضی اللہ عنہ سے فرمایا: **السُّوَالُ عَنِ الْحَالِ مُحَالٌ** ”یعنی حال سے سوال کرنا محال ہے۔“ اس لیے کہ حال کلام فنا کرنے کا ہی نام ہے اور استاد ابو علی دقاق رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: اگر دنیا یا عاقبت میں سرور ہے یا ہلاکت، وہ اس کے وقت کو نصیب ہے جس میں تو ہے۔ پھر حال ایسا نہیں ہوتا کیونکہ وہ بندہ پر حق تعالیٰ کی طرف سے وارد ہوتا ہے۔ تو جب وہ آتا ہے تو سب کے دل سے نفی کرتا ہے۔

جس طرح حضرت یعقوب علیہ السلام صاحب وقت تھے۔ کبھی فراق و فراق میں آنکھیں سفید کرتے تھے اور کبھی وصال در وصال سے آنکھیں روشن فرماتے تھے۔ کبھی گریہ فرماتے فرماتے بال کی طرح لاغر، کبھی نالہ کرتے کرتے ریشہ قلم کی طرح مضحل۔ کبھی خوشی سے مثل روح تازہ، کبھی خوشی سے مجسمہ سرور۔

اور حضرت ابراہیم علیہ السلام صاحب حال تھے۔ نہ تو فراق غم سے غم ناک، نہ وصال سے خوش حال۔ ستارہ، چاند، آفتاب سب کے سب حال کے معاون تھے اور وہ رویت میں سب سے فارغ۔ حتیٰ کہ جو دیکھتے، سب حق دیکھتے اور صاف فرماتے: ﴿لَا أُحِبُّ الْأَفْلِينَ﴾ (۱) میں غروب ہونے والوں کو پیار نہیں کرتا۔“ کبھی جہان صاحب وقت کے لیے جہنم ہوتا ہے کیونکہ مشاہدہ

غیبت میں ہوتا ہے اور حبیب کے اوجھل ہونے سے اس کا دل خانہ وحشت ہوتا ہے۔ اور کبھی خوشی سے اس کا دل بہشت بریں ہوتا ہے اور نعمتِ مشاہدہ سے ہر آن اسے حق کا تحفہ ملتا ہے۔ پھر صاحبِ حال کو حق سے بشارت رہتی ہے۔ اسی وجہ سے اس پر حجاب ہو یا کشفِ نعمت ہو یا بلا سب اس پر یکساں ہوتا ہے کیونکہ وہ ہمیشہ محلِ حال میں ہوتا ہے اور حال صفت مراد ہے اور وقت درجہ مرید۔ ایک شخص وقت میں خوش ہوتا ہے اور حال میں بھی خوش۔ کیونکہ وہ ہر حال ہے با حق ہوتا ہے اور ایک شخص وقت کی خوشی میں با خوف رہتا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

مقام اور تمکین:

مقام سے مراد ادائے حقوقِ مطلوب میں طالب کا قیام بہ شدت اجتہاد و صحتِ نیت ہے اور ہر ایک مرید ان حق سے اس کے لیے ایک مقام رکھتا ہے جو ابتداء طلب میں اس کے لیے وہ سبب ہوتا ہے۔ اگرچہ طالب ہر مقام سے فائدہ اٹھاتا ہے اور ہر ایک مقام پر گزرتا ہے لیکن ان میں سے ایک رہنے کے وقت تک قائم ہونا مقام ہے۔ اس لیے کہ اس مقام اور اس کا ارادہ سرشت اور اصل میں ہوتا ہے، عمل کی روش سے نہیں ہوتا۔ جیسا کہ قرآن پاک میں ارشاد ہے:

﴿وَمَا مِثْلًا إِلَّا لَهُ مَقَامٌ مَّعْلُومٌ﴾ (۱) ”ہم میں سے کوئی طالب نہیں مگر اس کے لیے مقام مقرر ہے۔“

چنانچہ آدم علیہ السلام کا مقام توبہ تھا اور نوح علیہ السلام کا مقام زہد۔ ابراہیم علیہ السلام کا مقام تسلیم تھا اور موسیٰ علیہ السلام کا مقام نابت بغیر عاجزی اور داؤد علیہ السلام کا مقام غم اور عیسیٰ علیہ السلام کا مقام رضا تھا۔ یحییٰ علیہ السلام کا مقام خوف تھا تو ہمارے حضور سید یوم النشور ﷺ کا مقام ذکر۔

اگرچہ ہر ایک محل و مقام ایک سر ہوتا ہے لیکن آخر کار رجوع اپنے اصل مقام کی طرف ہی ہوتا ہے اور مذہب محاسبیان میں جو مقام ہیں میں نے ان کا مختصر سا بیان کیا ہے اور بتایا ہے کہ حال اور مقام میں کیا فرق ہے۔ لیکن یہاں اس قدر ضروری ہے، وہ یہ ہے کہ اللہ عزوجل کی راہ تین اقسام پر ہے۔ اول مقام، دوسرے حال، تیسرے تمکین۔

اور اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام کو اپنا بیان فرمانے کے لیے مبعوث فرمایا ہے تاکہ وہ مقامات کے حکم بیان فرمائیں اور ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء تشریف لائے اور ان سب کے مقامات علیحدہ علیحدہ تھے۔

پھر ہمارے حضور ﷺ کے تشریف لانے سے ہر اہل مقام کے لیے حال ظاہر ہوا اور وہ وہاں تک پہنچا کہ مخلوق کا کسب وہاں سے آگے بند ہو۔ حتیٰ کہ مخلوقات کا دین کامل ہوا اور نعمت اپنی حد کو پہنچی۔ چنانچہ اللہ عزوجل نے فرمایا: ﴿الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي﴾ (۱) ”آج کے دن کامل کر دیا میں نے تمہارا دین اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی۔“ پھر مکان گیموں کا مکان ظاہر ہوا۔ اگر میں یہ سب حالات شمار کروں اور مقامات کی تشریح کرنے پر آؤں تو مقصد بیان سے رہ جاؤں گا۔ پس اتنا سمجھ لینا چاہیے کہ تمکین سے محل کمال اور تحقیق کا اعلیٰ مقام مراد ہے اور اس مقام کو مقامات سے گزرنا ممکن ہے مگر درجہ تمکین سے گزرنا محال ہوتا ہے۔ اس لیے کہ مقام مبتدی کا درجہ ہے اور تمکین منتہیوں کا ٹھکانہ ہے جو ابتداء سے چل کر یہاں تک پہنچتا ہے۔ مگر یہاں سے گزرنا صورت پذیر نہیں۔ اس لیے کہ مقامات منازل راہ ہیں اور تمکین حضور میں قرار لینا ہے۔

چنانچہ محبان حق کے راستہ میں مقام عارض ہوتے ہیں اور منزل میں مثل مسافر بیگانہ ہوتے ہیں۔ اس کا سر جناب حق میں ہوتا ہے اور حضور میں آلہ واکتساب آفت ہوتا ہے اور غیبت اور علت کا راز۔ اور زمانہ جہالت میں شاعر جیسے اپنے مدوحوں کی تعریف ان کی حرکات و سکنات سے کرتے ہیں۔ مگر جب تک کچھ عرصہ قیام نہ کریں مقام مقرر نہیں کر سکتے۔ مثلاً ایک شاعر اپنے مدوح کے حضور پہنچ کر تلوار سونت کر اپنے گھوڑے کی ٹانگ کاٹ دیتا ہے اور پھر تلوار بھی توڑ دیتا ہے۔ اس سے اس کا یہ مقصود ہوتا ہے کہ مجھے ایک ایسا گھوڑا چاہیے جو تیرے حضور کا راستہ طے کرے اور تلوار ایسی درکار تھی جو ان حاسدوں کا سر کاٹے جو تیری خدمت میں حاضر ہونے سے مانع ہیں۔ اب میں سب کو دور کرتا ہوں اس لیے کہ تیرے حضور آ پہنچا ہوں۔ اب آگے سفر میرے لیے بیکار ہے اس لیے میں نے گھوڑا لنگڑا کر دیا کیونکہ اب مجھے تیرے حضور سے جدا ہونا گوارا نہیں اور تلوار اس لیے توڑ دی کہ تیرے دے سے جانے کا مجھے خیال ہی نہیں۔ جب چند روز گزرتے ہیں تو پھر شعر پڑھتا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اسی طرح جب کہ وہ منزلیں قطع کر چکے اور مقامات سے گزر کر محل تمکین میں پہنچے تو حق تعالیٰ نے فرمایا: ﴿فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ﴾ (۲) ”اپنی جوتیاں اتار دو“ اور ﴿وَأَلْقِ عَصَاكَ﴾ (۳) ”اور عصا ڈال دو۔“ کیونکہ یہ سفر آلہ سے تھا اور مقام وصل میں آلہ باطل ہو جاتا ہے اور ابتدا دوستی میں طلب ہوتی ہے مگر انتہا میں قرار ہو جاتا ہے۔ پانی جب تک راستہ میں ہوتا ہے جاری رہتا ہے جب سمندر میں پہنچ جاتا ہے تو قرار پالیتا ہے اور جب قرار پکڑ لیتا ہے تو اس کا مزہ بھی بدل جاتا ہے۔ حتیٰ کہ جسے پانی کی ضرورت ہوتی ہے وہ بھی اس کی طرف مائل نہیں ہوتا۔

البتہ اس کی طرف وہ مائل ہوتا ہے جس کو جواہر اور موتی کی ضرورت ہو۔ وہ جان پر کھیل کر طلب کا بار پاؤں پر باندھتا ہے اور سر کے بل اس دریا میں کود پڑتا ہے۔ پھر یا تو جواہر موتی لاتا ہے یا جان عزیز فنا کر ڈالتا ہے۔

ایک مشائخ میں سے فرماتے ہیں: التَّمَكِينُ رَفْعُ التَّلْوِينِ. ”تمکین رفع تلوین کو کہتے ہیں۔“ یہ تلوین اس جماعت کے نزدیک ہے جو حال اور مقام کو ایک معنی میں مانتی ہے اور تلوین نام ہے ایک حال سے دوسرے حال میں بدلنے کا۔ مراد یہ ہے کہ متمکن متردد نہیں ہوتا اور حضور میں فائز ہو چکا ہوتا ہے اور غیر کا اندیشہ اپنے دل سے صاف کیے ہوئے ہوتا ہے اور نہ اس پر ایسا معاملہ آتا ہے کہ اس کے ظاہر کو بدل دے اور نہ ایسا حال ہوتا ہے کہ اس کے باطن کے حکم کو بدل دے۔ جیسے موسیٰ علیہ السلام تلون تھے۔ اللہ تعالیٰ کی ایک نظر طور پر متجلی ہونے سے بیہوش ہو گئے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَخَرَّ مُوسَىٰ صَعِقًا﴾ (۱) ”موسیٰ بیہوش ہو کر گر پڑے۔“ اور ہمارے حضور ﷺ متمکن تھے۔ مکہ معظمہ سے قاب قوسین تک عین تجلی میں رہے اور اپنی اصل حال نہ بدلی نہ متغیر ہوئے اور یہ درجہ اعلیٰ تھا۔ (۲) واللہ عالم

تو تمکین دو قسم پر ہے ایک یہ کہ شاہد کی وضاحت اپنی طرف ہو اور وہ محول بہ شاہد حق ہو کر فانی الصفت ہو اور فانی الصفت کو محو اور صحو و محن و فنا و بقاء و وجود و عدم کچھ بھی نہ طاری ہو اس لیے کہ ان اوصاف کی اقامت موصوف سے ہونی چاہیے۔ جب موصوف مستغرق ہو تو حکم اقامت و صف اس سے ساقط ہو اور اس معنی میں بہت باتیں ہیں۔ میں نے اس پر اختصار کیا: وَبِاللَّهِ التَّوْفِيقُ اور اس سے محاضرہ و مکاشفہ ہے۔ ان دونوں کا فرق یہ ہے۔

محاضرہ اور مکاشفہ اور ان کا فرق

اچھی طرح جان لے کہ محاضرہ حضور دل کے لیے بولا جاتا ہے، لطائف بیان میں اور مکاشفہ حضور سر پر ہوتا ہے جو خطرہ میں عیاں ہو۔ تو محاضرہ شواہد آیات پر ہوتا ہے اور مکاشفہ شواہد مشاہدات میں، اور محاضرہ کی علامت دوام فکر کرنا ہے، کنہ ذات میں جب تک فکر باقی رہے رویت آیت کے ساتھ اور مکاشفہ دوام تخیر میں ہوتا ہے جو کنہ ذات میں ہوتا ہے۔ دونوں میں فرق یہ ہے کہ افعال میں متفکر ہو اور جلال میں متخیر ہو۔ ان دو میں سے ایک خلت ہے۔ دوسرا قرین محبت۔

۱۔ سورۃ الاعراف: ۱۴۳

۲۔ موسیٰ زہوش رفت بیک پر توجہ جمال

تو عین ذات می نگری در تبسمی (مترجم)

کیا تو نے نہیں دیکھا کہ حضرت خلیل علیہ السلام نے ملکوتِ سماء میں نگاہ فرما کر اس کی حقیقت وجود میں تامل و تفکر کیا اور ان کا دل رویتِ فعلِ طالب کے ساتھ حاضر ہو کر فاعل ہوا، تاکہ اس کے حضورِ فعل میں دلیلِ فاعل ہو جائے۔ حتیٰ کہ کمالِ مرفعت میں فرمایا: ﴿إِنِّي وَجَّهْتُ وَجْهِيَ

لِلَّذِي فَطَرَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ حَنِيفًا﴾ (۱) ”یعنی میں متوجہ ہوتا ہوں اس جناب کی طرف جس نے آسمان و زمین کو بنایا۔ اور حبیبِ خاص کو جب ملکوت میں لے گئے تو ان کی نظر سب اشیاء موجود سے بلند ہو گئی اور فعل اور مخلوق کو نہ دیکھا اور نہ خود کو دیکھا تاکہ فاعل کا مکاشفہ ہو۔ تو کشف میں شوق پر شوق زیادہ ہو اور اس کی بیقراری پر بیقراری طلبِ رویت میں بڑھے۔ نہ منہ دیکھنا قریب کی قربت سے ممکن ہو، نہ امکانِ اقبال میں متحیر ہو۔ پس اس جگہ کہ خلوت ہو، وہاں حیرت کفر دکھاتی ہے اور اس جگہ کہ محبت ہو و وصلت شرک ہوتا ہے اور حیرت اس کا سرمایہ۔ اس لیے کہ خلقت کی ہستی میں حیرت تھی اور وہ شرک تھا اور محبت میں حیرت اس کی چگونی ہوتی ہے اور یہ توحید ہے۔

اس سے ملتا ہوا مقولہ حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: يَادِلِيلَ الْمُتَحَيِّرِينَ زِدْنِي تَحْيِيرًا. ”اے متھیروں کے راہنما! مجھے حیرت میں زیادہ کر۔“ اس لیے کہ تحیر کا زیادہ ہونا مشاہدہ کی زیادتی کا موجب ہوتا ہے۔

اور مشہور حکایتوں میں ہے کہ جب حضرت ابوسعید خزار اور سعد علوی رحمہما اللہ نے دریا کے کنارے اس دوستِ خدا کو دیکھا۔ پوچھا، خدا کی طرف راستہ کس طرف سے جاتا ہے۔ انہوں نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کی طرف دورا سے ہیں۔ ایک عام ایک خاص۔ انہوں نے فرمایا: اس کی شرح فرمائیں۔ انہوں نے فرمایا: عام راہ تو یہ ہے کہ جس پر تم ہو کہ ایک علت سے قبول کیے ہوئے ہو اور ایک علت سے رد کر رہے ہو اور خواص کا راستہ یہ ہے کہ جو نہ معللِ علت کو دیکھے اور نہ علت کو۔ اور اس حکایت کی شرح گزر چکی ہے اور مراد سوا اس کے نہیں ہے۔ وَبِاللَّهِ التَّوْفِيقُ

قبض اور بسط اور ان میں فرق

اور اس سے القبض والبسط ہے اور اس کا فرق جاننا چاہیے کہ قبض اور بسط دو حال ہیں اور یہ بندہ کی سعی سے بالا ہیں۔ اس کا آنا کسی نہیں اور جانا کوشش سے نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿وَاللَّهُ يَقْبِضُ وَيَبْسُطُ﴾ (۲) ”اللہ قبض کرتا ہے اور کھولتا ہے۔“ قبض کہتے ہیں حجاب کی حالت میں دل کا منقبض ہونا۔ اور بسط کہتے ہیں حالتِ کشف میں دل کا کشادہ ہونا۔ یہ دونوں حالتیں بلا تکلف و محنت بندہ پر عائد ہوتی ہیں من جانب اللہ۔ اور قبض عارفوں کے وقت میں ایسا ہے جیسے

مُریدوں کے وقت میں خوف اور یہ ایک گروہ ہے جو قبض و بسط کو اس معنی میں حمل کرتا ہے اور مشائخ سے ایک گروہ اس طرف ہے کہ قبض رتبہ میں بسط سے زیادہ بلند ہے اور اس کے وہ دو سبب کہتا ہے: ایک یہ اس کا ذکر کتاب میں مقدم ہے۔ دوسرے یہ کہ قبض میں گزارش اور قہر ہے اور بسط میں نوازش اور لطف ہے۔ اور لامحالہ گزارش بشریت اور قہر نفس فاضل تر ہے۔ پرورش اور لطف سے۔ اس لیے کہ وہ حجابِ اعظم ہے اور ایک گروہ اس طرف ہے کہ بسط قبض سے فائق ہے۔ اس لیے کہ کتاب میں قبض کا مقدم ہونا بسط کی فضیلت کی علامت ہے۔ اس لیے کہ عرب کا طریقہ ہے کہ موخر میں اوّل سے لاتے ہیں جو کم ہو۔

جیسے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿فِيْنَهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖۙ وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌۙ وَمِنْهُمْ سَابِقٌ بِالْخَيْرَاتِۙ يُأْذِنُ اللّٰهُۙ﴾ (۱) ”بعض ان میں سے اپنے نفس پر ظالم ہیں اور بعض ان میں سے میانہ رو اور بعض ان میں سے بھلائی میں مسابقت کرنے والے ہیں۔“ اور یہ فرمایا: ﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَۙ﴾ (۲) ”بے شک اللہ توبہ کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے اور پاک رہنے والوں کو دوست رکھتا ہے“ اور یہ بھی فرمایا: ﴿يٰۤرَبِّمَّ اَقْنِتِيْ لِرَبِّكَ وَاَسْجُدِيْ وَاَرْكَعِيْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَۙ﴾ (۳) ”اے مریم اپنے رب کے لیے عاجزی کر اور رکوع و سجود کرنے والوں کے ساتھ رکوع کر۔“

اور یہ بھی فرمایا کہ بسط میں سرور اور قبض میں ہلاکت ہے اور سرورِ عارفین سوا وصل و معرفت کے نہیں ہوتا اور ان کی ہلاکت فضل کے سوا مقصود نہیں، تو محل وصل بہ نسبت محل فراق بہتر ہے۔

اور میرے شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ قبض و بسط سے ایک ہی مراد ہے جو حق تعالیٰ سے بندہ کو ملتا ہے اور جب وہ معنی میرے دل کو پریشان کرتے یا اس کے سر سے سرور ہوتا ہوں تو اور نفس مقہور یا سر مقہور ہوتا ہے اور نفس سرور تو قبض میں سر ایک بسط نفس ہوتا ہے اور بسط میں دوسرا سر اس کا قبض نفس ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اس مسئلہ میں اور کچھ بتانا توضیح اوقات ہے۔

اسی سبب بایزید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: قَبْضُ الْقُلُوْبِ فِيْ بَسْطِ النُّفُوْسِ وَبَسْطُ الْقُلُوْبِ فِيْ قَبْضِ النُّفُوْسِ۔ ”دلوں کا تنگ ہونا نفوس کی کشادگی ہے اور دلوں کا کشادہ ہونا نفوس کی تنگی ہے۔“ تو نفس سے تنگ شدہ خلل سے محفوظ ہوتا ہے اور کشادہ ذلت سے ضبط میں۔ اس لیے کہ غیرت سے دوستی کرنے میں ندامت ہے اور قبض غیرت حق تعالیٰ کی علامت ہے اور دوست

کو دوست سے عتاب شرط ہے اور کشائش نشان عتاب ہے اور آثار میں مشہور ہے کہ جب تک یحییٰ علیہ السلام روتے رہے، جب تک عیسیٰ علیہ السلام ہنستے رہے۔ اس لیے کہ یحییٰ علیہ السلام قبض میں رہے اور عیسیٰ علیہ السلام بسط میں۔ اور جب ایک دوسرے سے ملتے تو یحییٰ علیہ السلام کہتے کہ اے عیسیٰ! تم جدائی سے بے غم ہوئے اور عیسیٰ علیہ السلام فرماتے یحییٰ! تم رحمت سے مایوس ہوئے تو تمہارا رونا حکمِ ازل کو نہیں مٹا سکتا، قضاء الہی کو نہیں روک سکتا۔ لَا قَبْضَ وَلَا بَسْطَ وَلَا طُمْسَ وَلَا اُنْسَ وَلَا مَحْوَ وَلَا صَحْوَ وَلَا سُكْرَ وَلَا عَجْزَ وَلَا جَهْلَ اِلَّا مِنْ اللّٰهِ. ”بتنگی، کشائش، مٹنا اور انس اور محو اور بیہوش اور عاجز ہونا، جاہل ہونا بدون حکمِ اللہ تعالیٰ کے نہیں۔ اور وہی ہوتا ہے جو وہ چاہتا ہے۔“

محبت اور ڈر اور ان میں فرق

اور اسی سے انس و ہیبت ہے۔ اور ان کا فرق یہ ہے، جان لینا چاہیے کہ ہیبت اور انس یہ دو حالتیں ہیں جو ہر وانِ طریقت کے اوپر آتی ہیں۔ اس میں سے یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ بندہ کے دل پر تجلی فرماتا ہے تو اگر وہ شہودِ جلال ہو تو ہیبت ہوتی ہے اور اگر مشہودِ جمال ہو تو بندہ پر انس ہوتا ہے۔ تو اہل ہیبت اس کی جلالت سے سختی میں ہوتے ہیں اور اہل انس اس کے جمال سے خوش ہوتے ہیں۔

تو جو ولی اس کی جلالتِ شان کی آگ میں جلتا ہو اور وہ جو اس کے مشاہدہٴ جمال کے نور سے روشن ہو، ان دونوں میں فرق ہے۔ ایک جماعت کہتی ہے کہ ہیبت عارفوں کا درجہ ہے۔ اس لیے کہ جسے حضورِ حق اور تنزیہ اوصاف میں ثابت قدم کرنا ہو، اس کے دل پر ہیبت کا غلبہ زیادہ ہوتا ہے اور انس سے اس کی طبیعت نفرت کرتی ہے۔ اس لیے کہ انس جنس کے ساتھ ہوتا ہے اور جب بندہ کا حق تعالیٰ سے ہم جنس ہونا محال ہے تو حق سے انس نہیں ہو سکتا اور حق سے مخلوق کا انس محال ہوتا ہے۔ البتہ اگر انس ممکن ہے تو ذکرِ حق سے ہے۔ اس لیے کہ اس کا ذکر اس سے غیر ہے کیونکہ وہ بندہ کی صفت ہے اور محبت میں کسی غیر کے ساتھ آرام کرنا محض دعویٰ اور غرور ہے۔ پھر ہیبت مشاہدہٴ عظمت سے ہوتی ہے اور عظمت صفتِ حق ہے تو اس بندہ میں کہ اس کا کام آپ ہی ہو اور اس بندہ میں کہ جس کا کام فناء سے بقاءِ حق پر ہو، بڑا فرق ہے۔

حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ کی حکایت ہے کہ آپ نے فرمایا مدتِ مدید تک خیال کرتا تھا کہ میں محبت میں خوش ہوں اور مشاہدہٴ حق سے انس رکھتا ہوں۔ لیکن اب مجھے معلوم ہوا کہ انسان، انسان کی جنس کے سوا نہیں۔

ایک گروہ کہتا ہے کہ ہیبت، فراق اور غذا سب قرینے ہیں اور انس وصلِ رحمت کے نیچے۔
 محبت کو چاہیے کہ ہیبت کی باتوں سے پرہیز کرے اور محفوظ رہے اور انس کے قریب ہو، اس لیے کہ
 انس ضرور محبت کا تضاضا کرتا ہے اور جسے محبت کو مجانست محال ہے، انس کو بھی محال ہے۔

اور میرے شیخؒ فرماتے ہیں کہ میں متعجب ہوں ان پر جو کہتے ہیں کہ حق تعالیٰ سے انس
 محال ہے۔ جبکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿إِنَّ عِبَادِي﴾ ”بے شک میرے بندے“ (۱) ﴿قُلْ
 لِعِبَادِي﴾ (۲) ”فرما دیجیے میرے بندوں سے۔“ اور ﴿إِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي﴾ (۳) ﴿لِيُعْبَادُوا
 خَوْفٌ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ وَلَا أَنْتُمْ تَحْزَنُونَ﴾ (۴) ”اے میرے بندو! آج کے دن نہ تم پر خوف ہے
 اور نہ تم غمگین ہو گے۔“

جب بندے اپنے رب کا ایسا فضل دیکھتے ہیں تو اسے دوست پکڑتے ہیں اور جب
 دوست پکڑتے ہیں تو لازمی انس اختیار کرتے ہیں۔ اس لیے کہ ہیبت دوست سے بیگانگی ہے اور
 انس مقتضی بیگانگی ہے اور آدمی کی صفت یہ ہے کہ نعمت دینے والے سے انس کرے۔ تو جب حق
 تعالیٰ ہمیں اس قدر نعمتوں سے نوازتا ہے اور ہم اسے منعم جانتے ہے تو پھر محال ہے کہ اس سے ہیبت
 محسوس کریں۔

اور میں علی بن عثمان جلابی (رحمۃ اللہ علیہ) کہتا ہوں کہ دونوں گروہ اختلاف کی وجہ سے
 مصیبت میں ہیں۔ اس لیے کہ غلبہ ہیبت نفس اور اس کی خواہش اور بشریت کے فنا کرنے سے ہے
 اور اس میں غلبہ سر ہے اور سر میں معرفت حاصل ہو جانے سے حق تعالیٰ شانہ کی جلالت اپنی تجلی سے
 محبت کے نفس کو فنا کر دیتی ہے اور جلوۂ جمال ان کے سر کو باقی کر دیتی ہے۔ تو جو اہل فنا ہیں وہ ہیبت
 کو مقدم کرتے ہیں اور جو اصحاب بقاء ہیں وہ امن کو فضیلت دیتے ہیں اور اس سے قبل فنا و بقاء کے
 باب میں بیان ہو چکا ہے۔

قہر اور لطف اور ان میں فرق

اس میں لطف اور قہر ہے۔ ان کا فرق یہ ہے کہ مشائخ کی جماعتیں یہ دونوں الفاظ اپنے
 زمانہ میں بیان کرتی ہیں۔ چنانچہ قہر سے ان کی مراد تائیدِ حق ہے جو مرادوں کو فنا کرنے اور نفس کی
 آرزو سے علیحدہ کرنے میں ہوتی ہے اور لطف وہ تائیدِ حق ہے جو بقاء، اسرار دوام مشاہدہ اور
 استقامت کے درجہ میں قرار حال سے ہوتی ہے حتیٰ کہ ایک گروہ کہتا ہے کہ کراماتِ حق تعالیٰ ہی
 حصول مراد ہے اور یہ گروہ اربابِ لطف سے ہے۔

۱۔ سورۃ الحجر: ۴۴۔ ۲۔ سورۃ بنی اسرائیل: ۵۳۔ ۳۔ سورۃ البقرۃ: ۱۸۶۔ ۴۔ الزخرف: ۶۸۔

ایک گروہ کہتا ہے کہ قہر وہ ہے جو حق تعالیٰ اپنی مرضی سے بندہ کو نامراد رکھے اور اس نامرادی میں مقہور فرمادے حتیٰ کہ وہ اگر پیاس کے سبب دریا میں جائے تو دریا خشک ہو جائے۔ (۱) روایت ہے کہ بغداد میں دو بڑے شاندار فقیر تھے۔ ایک صاحب قہر دوسرے صاحب لطف۔ یہ ہمیشہ ایک دوسرے کے خلاف رہتے اور ہر ایک اپنے زمانہ کو دوسرے کے زمانہ پر فضیلت دیتا۔ ایک کہتا حق تعالیٰ کا لطف بندہ پر تمام نعمتوں سے افضل و اشرف ہے۔ اس لیے ارشاد ہے:

﴿اللَّهُ لَطِيفٌ بِعِبَادِهِ﴾ (۲) ”اللہ تعالیٰ بندوں پر مہربان ہے۔“

دوسرا کہتا ہے کہ قہر حق بندہ کے لیے بڑی کامل نعمت ہے، اس لیے کہ اس نے فرمایا ہے:

﴿وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهِ﴾ (۳) ”اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر قہار ہے۔“ اور یہ اختلاف دونوں میں بہت طول پکڑ گیا۔ حتیٰ کہ ان میں سے ایک صاحب لطف نے مکہ معظمہ کا قصد کیا اور جنگلوں میں پھرتا پھرتا گم ہو گیا اور کسی کو پتہ نہ چلا۔ ایک شخص مکہ سے بغداد جا رہا تھا۔ اس نے انہیں راستہ میں دیکھا۔ انہوں نے اس سے کہا بھائی تم عراق پہنچو تو ہمارے ساتھی کو کہنا کہ اگر تم صحرا اور جنگل کو عجائبات کرخ اور بغداد کی صورت میں دیکھنا چاہتے ہو تو آؤ میرے لیے یہ جنگل، کرخ اور بغداد سے اچھا ہے۔

غرض یہ کہ جب یہ سیاح کرخ اور بغداد آئے تو انہوں نے ان کے رفیق کو پیغام دیا اور کہہ دیا جو انہوں نے کہا تھا۔ یہ سن کر فرمایا جب تم واپس جاؤ تو کہہ دینا اگر جنگل تیرے حق میں کرخ اور بغداد ہیں تو اس میں شرف نہیں، اس لیے کہ تو حضور سے دور ہے بلکہ شرف اس میں ہے کہ کرخ اور بغداد باوجود عجائبات کے، ایک کے حق میں جنگل بیابان ہو اور وہ اس میں خوش ہو۔ اور حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ انہوں نے اپنی مناجات میں فرمایا۔

”الہی! اگر میرے گلے میں آسمان کا طوق ڈالا جائے اور زمین کو زنجیر پا کر دیا جائے اور تمام جہان میرے خون کا پیاسا ہو جائے تو بھی میں تیرے جناب سے نہ ہٹوں گا۔“

اور میرے شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ایک سال اولیاء کا جنگل میں اجتماع تھا اور میرے شیخ حصری رحمۃ اللہ علیہ مجھے بھی وہاں لے گئے۔ میں نے دیکھا کہ ایک گروہ تخت کے نیچے ہوا پر جا رہا ہے اور ایک گروہ تخت کے اوپر علیحدہ اڑ رہا ہے اور ایک گروہ علیحدہ علیحدہ رتبہ میں تھا۔ حضرت حصری رحمۃ اللہ علیہ ان کی طرف توجہ نہ فرماتے۔ لیکن ایک جوان ٹوٹی جوتی، پھٹے لباس میں چلنے سے

۱۔ بقول شاعر: ڈوبنے جاؤں تو دریا ملے پایاب مجھے موت مانگوں تو رہے آرزوئے خواب مجھے (مترجم)

ناچار، سر سے ننگا، بدن جھلسا ہوا، تن لاغر ظاہر ہوئے تو حضرت حصری رحمۃ اللہ علیہ کو دے اور ان کے آگے پہنچے۔ انہیں بلند درجہ پر بٹھایا۔ میں متعجب ہوا اور عرض کی کہ حضور یہ کس پائے کے بزرگ ہیں۔ فرمایا، یہ اولیاء اللہ میں سے ایک ولی ہے کہ یہ طلبگار ولایت نہیں بلکہ ولایت اس کی طلبگار ہے۔ اس کا میلان کرامات کی طرف نہیں۔

اور جو کچھ ہم اپنے واسطے اختیار کرتے ہیں وہ ہماری بلا ہوتی ہے اور میں وہی چاہتا ہوں جو حق تعالیٰ میرے واسطے چاہتا ہے۔ اس صورت میں مجھے اس کی آفت سے بچا رکھتا ہے اور مجھے نفس کی شرارت سے رہائی دیتا ہے اور اگر قہر کرے تو میں لطف نہیں چاہتا اور اگر لطف فرمائے تو مجھے قہر کا ارادہ نہیں ہوتا کیونکہ ہمیں اس کے اختیار میں اختیار نہیں۔

نفی اور اثبات اور ان میں فرق

اور اس سے نفی و اثبات ہے۔ ان میں جو فرق ہے وہ یہ ہے کہ مشائخ طریقت رضوان اللہ علیہم اجمعین تائید حق تعالیٰ ثابت کرنے میں صفت آدمیت محو کرنے کو نفی و اثبات کہتے ہیں اور نفی صفت بشریت کی نفی کو کہتے ہیں اور اثبات اثبات غلبہ حقیقت کو اس لیے کہتے ہیں کہ محوکل ہو جاتا ہے اور نفی کل اثبات کے سوا نہیں۔ اس لیے کہ بقاء بشریت کی حالت میں نفی ذات نہیں ہو سکتی۔

تو لازم ہے کہ فضائل محمود کے قائم رکھنے سے بری صفات کی نفی ہو اور معنی ثابت ہونے سے دعویٰ محبت حق تعالیٰ کی نفی کرتا ہے۔ اس لیے کہ دعویٰ رعونت نفس سے ہوتا ہے اور یہ عادت جاری ہے کہ صفات سلطان حقیقت کی مقہور ہو جائیں اور کہتے ہیں کہ اثبات بقاء حق صفات بشریت کی نفی کرتا ہے اور اس مسئلہ کی تفصیل اس سے پہلے فقر اور صفوت، فنا و بقا کے باب میں ہو چکی ہے۔ یہاں میں نے اسی پر اختصار کیا۔ اور یہ بھی کہتے ہیں کہ اس سے اختیار حق سے اختیار بندہ کا ثبوت کرنا ہے اور اس سبب سے موفق نے کہا: اِخْتِيَارُ الْحَقِّ بِعَبْدِهِ مَعَ عِلْمِهِ بِعَبْدِهِ خَيْرٌ مِّنْ اِخْتِيَارِ عَبْدِهِ لِنَفْسِهِ مَعَ جَهْلِهِ بِرَبِّهِ. ”حق تعالیٰ بندہ کو جانتا ہے، وہ جو کچھ بندہ کے حق میں اختیار فرمائے اور اس سے نسبت بندہ با آنکہ اپنے رب سے بے خبر ہے، اپنے نفس کے لیے جو اختیار کرے بہتر ہے۔“ اس لیے کہ دوستی اس کا نام ہے جو اختیار محبوب کو ثابت کر کے محبت کے اختیار کی نفی کرے اور یہ سب کے نزدیک مقرر ہے۔

اور میں نے حکایتوں میں معلوم کیا کہ ایک درویش دریا میں غرق ہو رہے تھے کہ کسی نے ان سے پوچھا کیا آپ اس غرق سے رہائی چاہتے ہیں؟ انہوں نے فرمایا، نہیں۔ دریافت کیا کہ پھر ڈوبنا ہی پسند کرتے ہیں، انہوں نے فرمایا، نہیں۔ تو سائل نے کہا کہ عجیب بات ہے نہ آپ ڈوبنا

چاہتے ہیں نہ نجات پانا۔ درویش نے فرمایا کہ مجھے ہلاکت سے غرض نہ نجات سے، مطلب مجھے وہی منظور ہے جو اللہ تعالیٰ میرے لیے اختیار فرمادے۔ اس لیے کہ اختیار الہی ازلی ہے جس کی نفی ممکن نہیں اور بندہ کا اختیار عارضی ہے جس کی نفی جائز ہے۔ تو ہمیں لازم ہے کہ عارضی اختیار کو پامال کریں تاکہ اختیار ازلی ہی باقی رہے۔ جیسے موسیٰ علیہ السلام جب پہاڑ پر خوش ہوئے اور حق تعالیٰ کی رویت کی تمنا کی۔ گویا اپنا اختیار ثابت کرنے میں سعی کی اور جناب حق میں ﴿رَبِّ آرِنِي﴾ (۱) کہہ دیا تو ﴿لَنْ تَرَانِي﴾ (۲) حکم ہوا یعنی آپ نے عرض کی الہی! اپنا دیدار دے تو حق تعالیٰ نے فرمایا۔ ”ہرگز ہرگز تم نہیں دیکھ سکتے“ اور بتایا کہ دیدار حق ہے لیکن محبت میں اختیار باطل ہے۔ اور اس میں بہت کلام ہے لیکن میری مراد اس سے زیادہ نہ تھی تاکہ تجھے معلوم ہو جائے کہ اس طبقہ کی کیا مراد ہے۔ وباللہ التوفیق۔

اور اس کا بیان جمع اور تفرقہ، فنا اور بقا، غیب اور حضور، مذاہب صوفیہ گزر چکا ہے وہاں صحو اور سکر اس کی مانند ذکر ہو چکا ہے۔ وہاں دیکھیں جہاں جہاں اس بیان کا موقع تھا وہاں لکھا گیا اور ضرورت کے موافق یہاں بھی کچھ بیان کیا ہے۔ تاکہ ہر مذہب کا مشرح ہو سکے۔

وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ

مسامرہ اور محادثہ اور ان میں فرق

اور اس سے مراد مسامرہ اور محادثہ ہے۔ ان کا فرق یہ ہے کہ ان دو جملوں میں دو حال کا ملانِ طریقت کے بیان کرنے۔ مراد اور حقیقتِ محادثہ یہ ہے کہ وہ حدیث سر ہے جو سکوت زبان سے مقرون ہے۔ یعنی محادثہ زبان سے متعلق نہیں اور حقیقتِ مسامرہ سر کے چھپانے سے ہمیشہ خوش رہتا ہے۔ اس کے خلاصہ معنی یہ ہیں کہ بندہ کا شبِ تنہائی میں ایک وقت خاص ہوتا ہے، اور محادثہ دن میں ایک وقت ہوتا ہے۔ اس میں سوال جواب ظاہری و باطنی ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے شب کی مناجات کو مسامرہ کہتے ہیں اور دن کی دعاؤں کو محادثہ سے تعبیر کرتے ہیں اور مسامرہ کا تعلق حضور ﷺ کے حال سے ہے۔

جب اللہ تعالیٰ نے چاہا اور وقتِ خاص ہوا تو روح الامین کو معہ براق بھیجا تاکہ مکہ معظمہ سے قاب قوسین تک پہنچایا جائے اور اپنے رب سے راز کی گفتگو بلا صوت و حرف سنی۔ جب حد کو پہنچے تو کشف کی جلالت سے آپ کی زبان مبارک بند ہوئی اور دل کنہ عظمت میں حیران اور آپ کا علم اور اک رہ گیا اور زبان بیان سے بند ہوئی۔ چنانچہ عرض کیا: لَا أُخْصِي

ثَنَاءٌ عَلَیْكَ. (۱)

اور محادثہ کا تعلق حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حال سے ہے۔ جب آپ نے چاہا کہ اللہ تعالیٰ سے ایک وقت خاص حاصل کریں۔ چالیس روز کے انتظار اور وعدہ کے بعد دن میں کوہ طور پر آئے اور کلام الہی سنا اور فرط شوق میں دیدار کا سوال کر ڈالا، مگر کامیابی نہ ہوئی اور ساری سرستیں ختم ہو گئیں۔ پھر جب ہوش میں آئے تو عرض کیا: ﴿تَبَّتْ إِلَیْكَ﴾ (۲) تاکہ فرق ظاہر ہو جائے، اس ہستی کے مابین جنہیں لے جایا گیا اور ﴿سُبْحٰنَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا﴾ (۳) فرمایا گیا کہ ”پاک ہے وہ ذات جو اپنے بندہ کو لے گیا رات کے اقل قلیل حصہ میں۔“ اور کلیم اللہ کے لیے فرمایا: ﴿وَلَمَّا جَاءَ مُوسٰی لِبِیْقَاتِنَا﴾ (۴) ”جب موسیٰ ہماری میقات کے لیے آیا۔“ تو معلوم ہوا کہ رات خلوتِ محبت کا وقت ہے اور دن بندہ کی خدمت کا اور بندہ اپنی حد مقرر سے تجاوز کرے تو ﴿لَنْ تَرٰنٰی﴾ (۵) سے جواب مل جاتا ہے مگر محبوب خاص کے لیے کوئی حد نہیں ہوتی جس کے آگے گزرنے کی ممانعت ہو اس لیے کہ دوست جو کرتا ہے وہ دوست کو پسند ہوتا ہے۔

علم الیقین اور عین الیقین اور حق الیقین

اور ان کے درمیان فرق

اور اس سے علم الیقین اور حق الیقین اور عین الیقین میں ان کا فرق یہ ہے کہ علمِ اصولِ صوفیہ میں سب اپنے معلوم کو جاننے سے یہ الفاظ بیان ہوتے ہیں۔ چنانچہ صحبت کا علم ہو جانے پر یقین کے بغیر علم نہیں ہوتا۔ جب علم حاصل ہوتا ہے تو اس میں غیبِ عین کی مانند ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہ فروائے قیامت جو مومنین لقاءِ ربانی سے مشرف ہوں گے تو ان کے دیکھنے کی صفت وہی ہوگی جو آج جاننے میں ہے اور اس کے برخلاف دیکھیں گے تو یا تو فروائے قیامت کا دیدار صحیح نہیں ہوگا یا آج کا علم درست نہیں اور یہ دونوں صورت خلافِ توحید نہیں۔ اس لیے کہ اگر آج کے روز خلقت کا علم درست ہو اور کل رویت اس کی رویت درست ہوئی تو علم الیقین، عین الیقین ہو جاتا ہے اور حق الیقین کو علم الیقین جن لوگوں نے رویت میں کہا ہے وہ عین الیقین کو استغراق کے طور پر لائے ہیں، وہ محال ہے۔ اس لیے کہ رویت مثل سماع کے حصولِ عام کا آلہ ہے اور ایسے ہی جب استغراقِ علم کا

۱۔ لا اُحصى ثناء علیک۔ اس حدیث شریف کا تفصیلی ذکر پہلے گزر چکا ہے۔

۲۔ سورۃ الاعراف: ۱۴۳۔

۳۔ سورۃ الاسراء: ۱

۴۔ سورۃ الاعراف: ۱۴۳۔

۵۔ سورۃ الاعراف: ۱۴۳۔

سماع میں محال ہے تو ان لوگوں کا علم یقین سے علم معاملہ دنیا کے حکموں میں مراد ہے۔ اور علم عین الیقین سے علم بحالت نزع جب دنیا سے رخصت ہو۔ اور عین الیقین سے بہشت میں کشف رؤیت مراد ہے اور مکاشفہ سے کیفیت حالات۔ تو علم الیقین عالموں کا درجہ ہے، اس سبب سے کہ وہ احکام امور پر استقامت کرتے ہیں۔

اور عین الیقین عارفوں کا مقام ہے۔ اس حکم سے کہ وہ صورت کی استعداد رکھتے ہیں۔ اور حق الیقین محبوں کا مقام فنا ہے کیونکہ وہ کل موجودات سے روگرداں ہوتے ہیں۔ تو علم الیقین مجاہدہ سے ہوتا ہے اور عین الیقین انس سے اور حق الیقین مشاہدہ سے حاصل ہوتا ہے۔ یہ ایک عام ہے اور دوسرا خاص، تیسرا خاص الخاص۔ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ

علم اور معرفت اور ان میں فرق

اور اس سے علم و معرفت ہے۔ ان کا فرق یہ ہے کہ ارباب اصول نے علم اور معرفت میں فرق نہیں کیا۔ وہ دونوں کو ایک کہتے ہیں۔ صرف اتنا کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو عالم کہا جاتا ہے، عارف نہیں کہتے۔ اس سبب سے یہ دونوں مترادف نہیں۔

مشائخ صوفیاء رحمۃ اللہ علیہم نے اس کی تصریح یوں فرمائی کہ وہ علم جو حال کے نزدیک ہے اس کا علم اپنے حال سے جو بیان کرتا ہے، وہ معرفت ہے اور اس کے عالم کو عارف کہتے ہیں اور جو علم معنی سے جدا اور معاملات سے خالی ہو، اسے علم کہتے ہیں اور اس کے جاننے کو عالم۔ تو جو کسی چیز کے معنی اور حقیقت کا عالم ہو، اسے عارف کہا جائے۔

اور جو صرف عبادت اور اس کے حفظ میں مشغول ہو اور حفاظت معنی نہ جانتا ہو، اس کو عالم کہیں گے اور یہی سبب ہے کہ اس گروہ کو لوگ اپنے نزدیک بے قدر سمجھتے ہیں اور محض دانشمند کہتے ہیں اور عوام اسے برا جانتے ہیں اور اس سے مراد ان کی خفت ہے۔ کیونکہ اس میں ترکیب معاملات ہے۔ لَآنَ الْعَالِمَ قَائِمٌ بِنَفْسِهِ وَالْعَارِفَ قَائِمٌ بِرَبِّهِ۔ ”اس لیے کہ عالم بذات خود قائم ہے اور عارف قائم بر ب الارباب۔“ اس میں اور بہت سی باتیں ہیں جو کشف حجاب وقت میں ذکر ہو چکیں اور یہاں اسی قدر کافی ہے اور اسی سے شریعت و حقیقت ہے۔ اور ان کا فرق یہ ہے کہ دونوں لفظوں کا استعمال صوفیاء کے لیے ہے۔ ایک صحت حال سے ظاہر کرتے ہیں اور ایک اقامتِ حال باطن کے ساتھ اور دو گروہ اس کے معنی میں غلطی پر ہیں۔

ایک گروہ علماء ظاہر کا ہے جو کہتا ہے شریعت و حقیقت میں فرق نہیں۔ اس لیے کہ شریعت خود حقیقت ہے اور حقیقت، شریعت ہے۔ ایک گروہ ملاحدہ کا ہے جو کہتا ہے ان دونوں میں ہر ایک

دوسرے کے سوا قائم ہو سکتا ہے اور کہتے ہیں جب حقیقت کا حال کھل گیا تو شریعت جاتی رہی اور یہ خیال قرامطہ کا ہے اور شیعہ بھی انہیں میں سے ہیں اور موسویان بھی انہیں میں سے ہیں، اور وہ دلیل یہ دیتے ہیں کہ حکم میں شریعت، طریقت سے جدا ہے کیونکہ ایمان میں تصدیق قول سے جدا ہے اور اس امر کی دلیل کہ اصل میں جدا نہیں ایک ہی ہیں، یہ ہے کہ تصدیق بلا قول ایمان نہیں ہوتی اور قول بلا تصدیق موجب ایمان نہیں۔ تو قول اور تصدیق کا فرق ظاہر ہو گیا تو حقیقت کے معنی جو مراد ہیں ان کا منسوخ ہونا جائز نہیں۔ اور ابتداء آفرینش آدم سے جہاں فنا ہونے تک اس کا حکم مساوی ہے جیسا اللہ تعالیٰ کی معرفت اور خلوص نیت سے معاملہ کی نیت مساوی ہے۔

شریعت اور حقیقت اور ان میں فرق

اور شریعت نام ہے اس کا جس پر نسخ و تبدل روا ہو۔ جیسے احکام و اوامر۔ تو شریعت فعل بندہ کا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی محافظت کرے۔ تو معلوم ہوا کہ شریعت کا قیام بلا وجود حقیقت محال ہے اور بلا شریعت وجود حقیقت بھی محال ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک شخص زندہ جان سے ہوتا ہے۔ جب جان جاتی ہے تو وہ شخص مردہ ہوتا ہے اور جان اس کے ساتھ ایسے ہے کہ ان کی قدر و قیمت ایک دوسرے کے ساتھ ہے۔ اسی طرح شریعت بلا حقیقت ریاکاری ہے اور حقیقت بلا شریعت نفاق۔ اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا﴾ (۱) ”جو لوگ ہماری راہ میں کوشش کرتے ہیں ہم ضرور انہیں اپنا راستہ دکھاتے ہیں۔“ اور مجاہدہ شریعت میں ہے اور ہدایت حقیقت۔ یہ ایک بندے کو احکام ظاہری کا پابند رکھتی ہے اور دوسرے احوال باطنی میں بندہ پر قائم ہے۔ تو گویا شریعت مکاسب سے ہے اور حقیقت مواہب سے۔ یہ حدیث وہ حدیث کہ بطور استعارہ بولی جاتی ہیں اور اس کی تفصیل اور اس کے احکام کی تشریح بہت مشکل ہے۔ میں علی الاختصار اس نوع کا بیان کرتا ہوں۔ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ الْحَقُّ .

الحق: اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ اس لیے کہ اسماء الہی میں سے یہ ایک نام ہے۔

جیسے قرآن کریم میں ارشاد ہے: ﴿ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ﴾ (۲)

الحقیقت: اس سے بندہ کا محل وصل الہی میں قائم ہونا مراد ہے اور اس کے وقوف کا سر محل تنزیہ ہے۔

الخطرات: جو کچھ احکام تفریق سے دل پر گذرے۔

الوطنات: جو اسرار الہی سے اس میں متوطن ہو۔

العلمس: وہ نفی عین مراد ہے جس کا اثر نہ رہے۔

الرمس: جو دل سے نفی عین ہو اور اس کا اثر رہے۔

العلاق: وہ اسباب جن سے طالب تعلق کرتے ہیں اور مراد سے رہ جاتے ہیں۔

الوسائط: وہ اسباب جن سے طالب تعلق کرتے ہیں اور مراد کو پہنچتے ہیں۔

الزوائد: دل پر انوار زیادہ ہونا۔

الفوائد: اسرار ضروریہ کو ادراک کرنا۔

الملجأ: حصول مراد پر دل کا بھروسہ۔

المنجأ: محفل آفت سے دل کا خلاصی پانا۔

الكلية: اوصاف آدمیت کا کلیۃً مستغرق ہونا۔

اللوائح: مراد کا ثابت ہونا اور اس کی نفی کا ورد۔

اللوامع: نور کا دل پر اظہار اور اس کے فوائد کی بقا۔

الطوالع: انوار معرفت کا دل پر روشن ہونا۔

الطوارق: رات کی مناجات میں بشارت یا زجر کا وارد ہونا۔

الالصيفه: وقائق حال سے دل پر سری طور پر دوستی کا اشارہ۔

النجوى: اطلاع غیر سے آفات کا مخفی کرنا۔

الاشارات: بے الفاظ و زبان اخبار غیر دینا۔

الایماء: تعریف خطاب بے اشارت و عبارت۔

الوارد: دل میں معنی کا حلول۔

الانتباه: زوال غفلت دل سے۔

الاشتباه: حکم حق اور باطل میں اشتباہ پیدا ہونا۔

القرار: حقیقت حال زوال و تردد۔

الانزعاج: حال وحدانیت میں تحرک دل سے بعض مختصر الفاظ کا ورد۔

نوع اخر: یہ وہ عدد و الفاظ ہیں کہ توحید حق میں استعمال کرتے اور حقیقتوں میں ان کے اعتقاد کا

بیان اس میں استعارہ نہیں اور ان میں سے ایک۔

العالم: یہ مخلوق الہی ہے اور کہتے ہیں کہ یہ اٹھارہ ہزار ہیں، اور فلاسفہ پچاس ہزار عالم کہتے ہیں او

راس کے علاوہ ایک عالم سفلی اور ایک عالم علوی بھی ہے اور ارباب اصول کہتے ہیں کہ

عرش سے تحت العرش تک جو کچھ ہے، وہ عالم ہے۔ بہر حال عالم مختلف چیزوں کا جمع ہونا

ہے اور اہل طریقت کے نزدیک عالم ارواح اور عالم نفوس ہے اور ان کی اس سے یہ مراد نہیں ہے جو فلاسفہ کی ہے کیونکہ ان کے نزدیک ارواح اور نفوس کا جمع ہونا ہے۔

المحدث: یہ وہ ہے جو متاخر وجود میں ہو یعنی پہلے نہ ہو پھر ہو جائے۔

القديم: جو وجود میں سابق اور ہمیشہ ہو اور اس کی ہستی سب ہستیوں سے مقدم ہو، یہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں۔

الازل یا الاول: جس کی ابتداء نہ ہو۔

الابد: جس کے لیے انتہا نہ ہو۔

الذات: کسی شے کی ہستی اور اس کی حقیقت۔

الصفہ: جو نعمت میں ہو اور خود قائم نہ ہو۔

الاسم: مسمیٰ کا جو غیر ہو۔

التسمیہ: خبر مسمیٰ۔

النفی: جو عدم اور منفی کا مقتضی ہو۔

الاثبات: جو وجود مثبت کا مقتضی ہو۔

الشیئان: جب ایک کا وجود دوسرے پر وارد ہو۔

الضدان: یعنی ایک کا وجود دوسرے کی موجودگی میں ایک حال کے ساتھ روانہ ہو۔

الغیران: ایک کا وجود دوسرے کے فنا کے ساتھ روا ہو۔

الجوہر: وہ چیز جو قائم بالذات ہو۔

العرض: جو جوہر کے ساتھ قائم ہو۔

الجسم: جو جزاء متفرقہ سے مرکب ہو۔

السوال: طلب حقیقت۔

الجواب: سوال سائل پر خبر دینا۔

الحسن: جو موافق امر ہو۔

القبیح: جو مخالف امر ہو۔

السفہ: جو مخالف ترک امر ہو۔

الظلم: کسی شے کو غیر موقع رکھنا۔

العدل: کسی شے کو اس کے قابل جگہ رکھنا۔

الملک: جس کے لیے اعتراض نہ ہو سکے۔ یہ دو حدیں ہیں کہ طالب کو ان سے چارہ نہیں۔ یہ بطور اختصار بیان کر دی گئیں۔

نوعِ اخرو: یہ ایسی بات ہے جو شرح کی محتاج ہے اور صوفیائے کرام میں یہ متداول ہے اور اس سے ان کی مراد یہ ہے کہ اہل زبان کو معلوم ہو جائے اور ظاہر لفظ ہی سے مفہوم واضح کر دے۔
الخاطر: مرضی کے مطابق حصول معنی کا خواستگار ہونا کہ اس کو جلد زوال ہو اور دوسری خاطر آئے اور صاحبِ خاطر اس کے دل سے دفع کرنے پر قادر ہو اور اہل خاطر پہلے خاطر کے تابع ہوتے ہیں ان امور میں جو حق تعالیٰ میں بندہ پر بے وجہ آجائیں۔

اور کہتے ہیں کہ خیر النساج رحمۃ اللہ علیہ پر ایک خاطر رونما ہوئے کہ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ دروازہ پر ہیں۔ آپ نے اس خطرہ کو اپنے سے دور کرنا چاہا کہ دوسرا خطرہ خاطر مبارک میں آیا۔ آپ اس کے دفع میں مشغول ہوئے کہ پھر تیسری بار خطرہ ہوا کہ حضرت جنید دروازے پر تشریف فرما ہیں۔ جا کر دیکھا تو حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ کو دروازہ پر کھڑا پایا۔ حضرت جنید نے فرمایا! اے خیر نسا ج! اگر تو پہلے خطرہ کو خاطر میں لے آتا اور سیرتِ مشائخ پر عمل پیرا ہوتا تو میں اتنی دیر دروازہ پر کھڑا نہ رہتا۔

مشائخ فرماتے ہیں کہ اگر خطرہ خاطر خیر میں آیا تو اس میں حضرت جنید کو کیا تھا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جنید، شیخ خیر نسا ج تھے اور شیخ لامحالہ احوالِ مرید سے واقف ہوتا ہے۔ لہذا ان کا فرمانا صحیح تھا۔

الواقع: سے مراد یہ ہے کہ جو دل میں مرید کے ظاہر ہو اور باقی رہے، برخلاف خاطر کے کہ وہ باقی نہیں رہتا اور کسی حال میں طالب اس کے دفع کرنے پر قدرت نہیں رکھتا۔ جیسے کہتے ہیں خَطَرَ عَلٰی قَلْبِي ”میرے دل میں خطرہ گزرا“ ”وَوَقَعَ فِي قَلْبِي“ ”اور دل میں واقع ہوا ہے۔“ تو دل خاطر کا محل ہے۔ لیکن واقعات ولی ہی کے دل پر گزرتے ہیں غیر ولی پر نہیں۔ کیونکہ ولی کا دل وہ ہے جس میں تمام حدیثِ حق ہوتی ہیں۔ بدیں وجہ جب مرید کے دل میں راہِ حق کی طرف سے کوئی رکاوٹ پیدا ہوتی ہے تو اسے قید کہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ فلاں کو واقعہ ہوا ہے اور اہل زبان واقعہ میں مسائل اشکال بیان کرتے ہیں اور جب کوئی اس کا جواب دے اور شبہ اٹھائے تو کہتے ہیں یہ واقعہ حل ہوا۔ لیکن محققین اسی طرف ہیں کہ واقعہ وہ ہوتا ہے جس پر حل روانہ ہو اور جو حل ہو جائے وہ خاطر کا خطرہ ہوتا ہے، واقعہ نہیں۔ کیونکہ اہل تحقیق کا بندِ حقیر نہیں ہوتا کہ اس کا حکم بدل جاتا ہے اور حال

سے پھر جاتا ہے۔

الاختیار: یہ وہ ہے کہ حق کے اختیار کو اپنے اختیار پر اختیار کریں۔ یعنی جو کچھ حق تعالیٰ نے ان کے لیے اختیار کیا ہے خواہ خیر ہو یا شر، اسی کو پسندیدہ رکھیں۔

اور درحقیقت بندہ کا اختیار حق کو اختیار کرنا بھی اختیار حق سے ہوتا ہے اور اگر وہ بات نہ ہوتی اور اللہ تعالیٰ اسی کو اختیار کر دیتا تو وہ اپنا اختیار کبھی نہ چھوڑتا اور ابو یزید رحمۃ اللہ علیہ سے لوگوں نے پوچھا کہ امیر کسے کہتے ہیں۔ فرمایا کہ امیر وہ ہے جس کا اختیار نہ رہا ہو اور حق کے اختیار کو اس نے اختیار کر کے اپنا اختیار بنایا ہو۔

اور حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ آپ کو ایک وقت بخار آیا۔ عرض کی الہی! مجھے آرام عطا فرما۔ آپ کو ندا آئی کہ جنید! تو کون ہے جو میری ملکیت میں تصرف کرتا ہے اور اپنا اختیار ظاہر کرتا ہے؟ میں اپنی ملک میں تجھ سے زیادہ مدبر ہوں، تو میرے اختیار کو اختیار کر اور اپنا اختیار ظاہر نہ کر۔ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ.

الامتحان: اس لفظ سے امتحانِ دل اولیاء مراد ہے۔ اس لیے کہ ولی کے دل پر منجانب اللہ کئی طرح کی بلائیں آتی ہیں۔ جیسے خوف، غم، ہیبت، قبض اور مثل اس کے جیسا کہ قرآن پاک میں فرمایا:

﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ قُلُوْبُهُمْ لِلتَّقْوٰی ۝ لَّهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝﴾ (۱)

”یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں کو اللہ تعالیٰ امتحان میں ڈالتا ہے۔ تقویٰ کے لیے انہیں بخشش ہے اور بڑا اجر، اور یہ بہت بلند درجہ ہے۔“ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ

البلاء: بلاء سے مراد محبوں کے تن کا امتحان متعدد طرح سے نیتوں، بیماریوں اور رنج و محن سے کیا

جاتا ہے اور جس قدر بندہ پر بلا زیادہ قوی ہوتی جاتی ہے، اسے قرب حق زیادہ

ملتا ہے۔ اس لیے کہ بلا لباسِ اولیاء ہے اور برگزیدہ ہستیوں کا گہوارہ اور انبیاء کرام کی

غذا۔ کیا تو نے نہیں دیکھا کہ حضور ﷺ نے فرمایا: نَحْنُ مَعَاشِرُ الْاَنْبِيَاءِ اَشَدُّ

النَّاسِ بَلَاءً. ”ہم نبیوں کا گروہ ہیں، بلا کے لیے لوگوں سے زیادہ سخت ہیں۔“

پھر اولیاء، پھر مقرب لوگ، پھر ان کی مثل۔ غرضیکہ بلا رنج کا نام ہے جو بندہ مومن کے

دل اور تن پر آتی ہے اور دراصل یہ اس کے حق میں نعمت ہوتی ہے۔ اس لیے کہ اس کا راز بندہ پر

پوشیدہ ہوتا ہے اور اس کا درد اٹھانے کا ثواب ملتا ہے اور جو کفار پر بلا نازل ہوتی ہے وہ بلا بمعنی

استیلاء نہیں ہوتی بلکہ وہ ان کی کم بختی ہوتی ہے اور کافر کبھی شقاوت سے شفا نہیں پاتا۔

تو خلاصہ یہ ہے کہ بلا مرتبہ امتحان میں بڑا درجہ رکھتی ہے۔ اس لیے کہ بلا کا اثر تن پر ہوتا ہے اور دل بھی اس سے متاثر ہوتا ہے۔ اور امتحان کا اثر دل پر ہوتا ہے اور یہ بہت قوی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

التحلی: کسی قوم سے قول و فعل میں مساوی ہوتی ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا:

لَيْسَ الْإِيمَانُ بِالتَّحَلِّيِّ وَالتَّمَنِّيِّ وَلَكِنْ مَّا وَفَّرَ فِي الْقُلُوبِ وَصَدَقَهُ الْعَمَلُ. (۱)
ایمان ظاہر داری سے نہیں لیکن دل میں وفرا پیدا کرے اور عمل اسے سچا کرے تو یہ تجلی۔
ایک گروہ کے نزدیک بدون حقیقت معاملہ کے مشابہ ہونا تحمل کہلاتا ہے اور جو دکھاوے کے لیے ایسا کرے اور حقیقت میں نہ ہو محض ظاہر داری کرتا ہو، وہ جلدی سے خوار ہو جاتا ہے اور اس کا بھید کھل جاتا ہے۔

التجلی: یہ انوار حق کی تاثیر ہے جو مقبولان بارگاہ پر ہوتی ہے جس سے وہ اس درجہ پر پہنچتے ہیں کہ حق تعالیٰ کو دیکھتے ہیں۔ اسی وجہ میں رویت بالقلب اور رویت بالعين دو صورتوں میں رکھی گئی۔ تجلی اگر چاہے دیکھے، اگر نہ چاہے نہ دیکھے۔ (۲)

ایک صورت یہ ہے کہ کسی وقت دیکھ سکے اور کسی وقت نہ دیکھ سکے۔ (۳)
ایک وہ اہل نظر ہیں کہ اگر بہشت میں بھی دیکھنا نہ چاہیں، نہ دیکھیں کیونکہ ان کے لیے تجلی پر پردہ اختیار روا ہو جاتا ہے اور رویت پر پردہ جائز نہیں ہوتا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

التحلی: وہ بندہ کا ایسا مشغل ہے جو مانع ذکر حق ہو جائے۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ ہاتھ خالی کرنا چاہے دنیا سے۔ دوسرے یہ کہ عقبتی سے اپنا دل خالی کر دے۔ تیسرے یہ کہ خواہش نفسانی کی متابعت کو اس سے اپنا سر خالی کر دے۔ چوتھے خلقت کی صحبت سے اپنے کو خالی کرے اور اس کا اندیشہ بھی دل میں نہ آنے دے۔

الشروء: معنی شروء طلب خاص کے ہیں۔ یہ آفت و حجاب و بیقراری سے خلاصی پانے کے لیے حق کو طلب کرنا ہے۔ کیونکہ طلب پر تمام بلائیں حجاب سے آتی ہیں۔ تو اگر وہ طالب کا کشف حجاب ہے تو اس کے سفر اور تعلق کی ہر شے کو شروء کہتے ہیں۔ اس میں ابتدائے

۱۔ ابن عربی نے اسے "الکامل فی ضعفاء الرجال" ۶/۲۲۹۰ میں ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے۔

لیس الايمان بالتحلی ولا بالتمنی، ولكن ما وفر في القلب و صدقة الاعمال.

۲۔ جیسے کسی نے کہا: دل کے آئینے میں ہے تصویر یار جب ذرا گردن جھکائی، دیکھ لی (مترجم)

۳۔ بقول شاعر: گمہ بر تارم اعلیٰ نشیتم

گمہ بر پشت پائے خود نہ بینم (مترجم)

طلب میں بے قراری زیادہ ہوتی ہے اور انتہا میں وصل قائم ہو جاتا ہے۔
 القصور: یہ طلب مقصود کے لیے حقیقت ارادہ صحیح اس گروہ کا مقصود ہے۔ یہ حرکت و سکون سے متعلق نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ دوست اگرچہ دوستی میں ساکن ہوتا ہے یا قاصد، مگر یہ خلاف عادت ہے۔ اس لیے کہ قاصدوں کا مقصد یا ظاہر پر موثر ہوتا ہے یا ان کے باطن پر نشان دیتا ہے مگر جو دوست بے وجہ طلب کرتے ہیں اور بدون حرکات قاصد ہوتے ہیں ان کے سبب صفتیں خود مقصد ہوتی ہیں اور جو انتہا کا قصد کرتے ہیں تو جب دوستی حاصل ہو جاتی ہے تو سب قصد ہو جاتے ہیں۔

اصطناع: اس سے مراد یہ ہے کہ بندہ مہذب ہو جائے اور اس کی سب صفتیں فنا ہوں اور تمام خطوط نفسانی اوصاف نفس بدل جائیں تاکہ اوصاف ذاتی کے زوال اور اوصاف نفسانی کے تبدیل ہو جانے سے بخود ہو جائے اور اس درجہ خاص میں انبیاء کرام ہوتے ہیں۔ اولیاء اللہ کو یہ درجہ نہیں ملتا۔ ایک گروہ مشائخ سے انبیاء اور اولیاء میں بھی روارکھتا ہے۔ واللہ اعلم الا صطفاء: اصطفاء یہ ہے کہ حق تعالیٰ بندہ کے دل کو اپنی معرفت کے لیے فارغ فرمادے تاکہ

اس کی معرفت صفات اس کے دل میں جاگزیں ہو اور اس درجہ میں خاص و عام ہے، مومنین سب بلکہ عاصی، مطیع، ولی نبی سب پہنچ سکتے ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ثُمَّ أَوْرَثْنَا الْكِتَابَ الَّذِينَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِنَفْسِهِ وَمِنْهُمْ مُقْتَصِدٌ وَمِنْهُمْ سَابِقٌ بِالْخَيْرَاتِ﴾ (۱) ”کتاب کا وارث کیا ہم نے اپنے بندوں سے جن کو چن لیا تو ان میں ظالم ہیں اپنی جان میں اور ان میں میانہ رو ہیں اور ان میں سابق بالخیرات ہیں۔“ دوسری جگہ فرمایا: ﴿وَأَنَّهُمْ عِنْدَنَا لَئِنِ الْبُصْطَفَيْنِ الْآخِيَارِ﴾ (۲)

الاصطلام: اصطلام تجلیات حق ہیں کہ بندہ ان سے مقہور ہو جاتا ہے تاکہ امتحان لطف نفی میں اس کے ارادہ اور قلوب پر عائد ہو اور مصطم اور قلب ممتحن دونوں کے معنی ایک ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ الاصطلام زیادہ خاص ہے اور امتحان اس سے زیادہ رفیق ہے اور ارباب طریقت اصطلاح میں مروج ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

الرین: رین ایک حجاب ہے جو دل پر آتا ہے اور اس کا کشف ایمان کے بغیر نہیں اور وہ حجاب کفر اور گمراہی ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اور یہ کفار کی صفت ہے ﴿كَلَّا بَلْ رَانَ عَلَى قُلُوبِهِمْ مَا كَانُوا يَكْسِبُونَ﴾ (۳)

ایک گروہ کہتا ہے کہ یہ وہ حجاب ہے جس کا زوال خود ممکن نہیں خواہ کسی صفت سے ہو کیونکہ کافر کا دل اسلام پذیر نہیں ہوتا اور جو ان میں سے ایمان لاتے ہیں وہ خداوند تعالیٰ کے علم میں مومن ہوتے ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

الغین: یہ دل پر ایک پردہ ہوتا ہے جو استغفار سے اٹھ جاتا ہے اور یہ دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک خفیف، ایک غلیظ۔ غلیظ کافروں، غافلوں کے واسطے ہے اور خفیف اولیاء انبیاء سب پر آسکتا ہے۔ جیسے حضور ﷺ نے فرمایا: اِنَّهُ لَيُغَانُ عَلٰی قَلْبِيْ فَاِنِّيْ لَا سَتُغْفِرُ اللّٰهُ فِيْ كُلِّ يَوْمٍ مِّائَةً مَّرَّةً (۱) ”بے شک میرا دل پردہ کیا جاتا ہے اور روزانہ اپنے رب سے ستر بار استغفار کرتا ہوں۔“ اور خفیف کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع اور توبہ کے معنی گناہ سے اطاعت کی طرف جانا ہے اور رجوع کے معنی ہیں اپنے آپ سے خداوند تعالیٰ کی طرف لوٹنا۔ تو توبہ گناہ سے ہوتی ہے اور محبوں کا جرم اپنی ہستی کو دیکھنا بھی ہے۔ اگر کوئی خطا سے صواب کی طرف جائے تو کہتے ہیں کہ یہ قول راجع ہے۔ فلاں شخص راجع ہے، اور یہ تمام بحث میں نے توبہ کے باب میں کر دی ہے۔ واللہ اعلم

التلبیس: کسی چیز کا اس کی اصل کے خلاف دکھانے کو تلبیس کہتے ہیں۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَلَلْبَسْنَا عَلَيْهِمْ مَّا يَلِيْسُوْنَ ۝۱﴾ (۲) ”البتہ پہنایا ہم نے جو پہنتے ہیں۔“ یعنی پردہ ڈال دیا اور غیر اللہ تعالیٰ میں یہ صفت محال ہے۔ اس لیے کہ کافر کو نعمت سے وہی مومن کرتا ہے اور مومن کو اپنی نعمت سے کافر بناتا ہے تاکہ اس کے اظہار حکم اور حقیقت کا وقت ہر ایک میں آجائے اور جب اس گروہ سے ایک شخص نیک خصلتوں کو بری صفتوں میں چھپا دیتا ہے، کہتے ہیں یہ تلبیس کرتا ہے اور اس جگہ کے سوا اس عبادت کو استعمال نہیں کرتے اور نفاق اور ریا کو تلبیس نہیں کہتے۔ گو اصل میں وہ بھی تلبیس ہوتی ہے۔ اس لیے کہ اقامت فعل حق کے سوا تلبیس کا استعمال نہیں۔

الشرب: طاعت کی شیرینی کو اور کرامت کی لذت کو اور راحت انس کو یہ طائفہ شرب کہتا ہے اور کوئی شخص کوئی کام لذت شرب کے سوا نہیں کر سکتا جیسے تن کا سیراب ہونا، پانی سے ہوتا

۱۔ اس حدیث مبارکہ کا تفصیلی ذکر پہلے گزر چکا ہے

۲۔ سورۃ الانعام: ۹

ہے۔ ایسے ہی دل کا شرب راحت اور شیرینی طاعات سے ہے۔ اور میرے شیخ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مرید بے شرب اور عارف با شرب ہوتا ہے اور یہ ارادہ و معرفت سے خالی ہوتے ہیں۔ اس لیے مرید کو چاہیے کہ اپنے کام سے شرب ہو، تاکہ ارادتی حق طالب بجالائے لیکن غارت گر شرب نہ ہونا چاہیے۔ تاکہ بدون ارادہ حق شرب سے اس پر ایسی حالت ہو جائے کہ اگر اپنے نفس کی طرف رجوع کرے تو آرام نہ پائے۔ واللہ اعلم۔
 الذوق: یہ شرب کی مانند ہوتا ہے۔ لیکن شراب راحتوں کے سوا مستعمل نہیں اور ذوق رنج و راحت کو اچھا تحمل کرنا ہے۔ جیسا کہ کوئی کہے: ذُقْتُ الْحَلَاوَةَ وَذُقْتُ الْبَلَاءَ وَذُقْتُ الرَّاحَةَ.
 تو سب درست ہیں۔ پھر شرب کو بھی کہتے ہیں: شَرِبْتُ بِكَاسِ الْوَصْلِ أَوْ بِكَاسِ الْوُدِّ۔ اور ایسی ہی اور بھی مثالیں ہیں۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿كُلُوا وَاشْرَبُوا هَنِيئًا﴾ (۱) ”مزے سے کھاؤ پیو“ اور جب ذوق کا بیان فرمایا: ﴿ذُقْ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْكَرِيمُ﴾ (۲) دوسری جگہ فرمایا: ﴿ذُوقُوا مَسَّ سَقَرَ﴾ (۳) یہ حدود الفاظ کے حکم ہیں جو صوفیوں کے لیے ہم نے مروجہ اصطلاحات جمع کر دیں۔ اگر سب بیان کریں تو کتاب طویل ہو جائے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

کشف حجاب یازدہم: سماع

یاد رکھو! حصول علم کے پانچ اسباب ہوتے ہیں۔ اول سماع، دوم بصر، سوم ذوق، چہارم شمع، پنجم لمس۔ سماع سننے کا کام دیتا ہے۔ بصر دیکھنے کے ذریعے علم پہنچاتا ہے۔ ذوق چکھ کر حقیقت شے معلوم کی جاتی ہے۔ شمع سوگھنے سے پتہ لگانا۔ لمس چھو کر مس کے ذریعے معلوم کرنا۔
 یہ پانچ در ہیں جو دل کے لیے اللہ تعالیٰ نے رکھے ہیں اور ہر چیز کا علم انہیں پانچ دروں کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔ جیسے سماعت کے ذریعے آواز اور خبر کا علم ہوتا ہے۔ بصارت کے ذریعے رنگ اور شکلیں معلوم ہوتی ہیں۔ ذائقہ کے ذریعے شیریں، تلخ، میٹھا معلوم ہوتا ہے۔ شامہ کے ذریعے خوشبو و بدبو کا علم حاصل ہوتا ہے۔

ان پانچ حواس سے چار کے مقامات خاص ہیں اور ایک تمام بدن میں پھیلا ہوا ہے۔

سماعت کے لیے کان، بصارت کے لیے آنکھ، ذائقہ کے لیے زبان، شامہ کے لیے ناک ہے اور لمس کو تمام بدن میں جگہ ہے۔ اس لیے کہ آنکھ سوادیکھنے کے اور کام نہیں کرتی اور کان سننے کے سوا اور کام نہیں دیتا۔ ناک سونگھنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتی۔ زبان چکھنے کے سوا اور کسی کام کی نہیں۔ لیکن تمام بدن سے نرم، گرم، کھردرا، سرد وغیرہ معلوم کرنے والا لمس ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ ہر ایک حس تمام اعضاء میں مثل لمس کے پھیلا ہوا ہو۔ اور معتزلہ کے نزدیک ہر حس اپنے محل کے سوا اور جگہ روا نہیں مگر ان کا یہ قول باطل ہے۔ اس لیے کہ لمس کے سوا سب کے محل خاص ہیں اور لمس کا کوئی محل خاص نہیں ہے۔ اور جب ایک بھی ان پانچ سے محل خاص نہیں رکھتا سوائے ایک کے، تو اوروں کے واسطے بھی یہی صفت روا ہے۔ حالانکہ یہاں یہ مقصود نہیں ہے بلکہ اسی قدر بیان ضروری تھا تا کہ تحقیق معنی ہو سکے۔

تو چار حواس کا ذکر ہو چکا ہے۔ ان میں سے چار سننے، دیکھنے، سونگھنے، چکھنے کے ہیں اور ایک چھونا ہے۔ تو یہ امر جائز ہوا کہ حواس عجوبہ علم کو دیکھنا اور خوشبو سونگھنا ہے۔ نعمتوں کو چکھنا ہے اور ایک چھونا ہے۔ تو یہ رہنمائے عقل ہوئے اور یہی اللہ کی طرف رہنما ہو سکتے ہیں۔ اس لیے کہ ان کے ذریعہ انسان جانتا ہے کہ جہان محدث ہے اور محل تغیر اور جو حادث ہے وہ محدث سے خالی نہیں اس لیے کہ پیدا کرنے والا ہے اور خالق جنس مخلوق سے نہیں۔ اس لیے کہ وہ خالق ہے، یہ مخلوق ہے۔ یہ جسم پذیر ہے وہ پیدا کرنے والا اور جسم دینے والا۔ یہ محدث ہے اور وہ اس کا پیدا کرنے والا ہے۔ محدود ہے اور اس کا خالق غیر محدود اور سب اشیاء پر قادر ہے اور سب کچھ کر سکتا ہے۔ تمام معلومات کا علم اس کا تصرف ملک میں جاری ہے۔ جو چاہے کر سکتا ہے۔ اس نے برہان صادق کے ساتھ رسول بھیجے اور جب تک اس کی معرفت کا وجوب سماعت سے علم نہ ہو لوگوں کا اس پر ایمان لانا اور رسولوں کا حکم ماننا واجب نہیں ہوتا کیونکہ شرع کا وہی موجب ہے۔ اس سبب سے اہل سنت دنیا میں سماعت کو بصارت پر فضیلت دیتے ہیں اور اگر کوئی خطا کار کہے کہ کان محل خبر ہیں اور آنکھیں محل نظر اور ان سے ہی اللہ تعالیٰ کا دیدار ہوگا تو وہ سماعت سے زیادہ افضل ہے۔

میں کہتا ہوں ہم سمع سے جانتے ہیں کہ دیدار الہی مومنوں کو بہشت میں ہوگا کیونکہ دیدار کو عقل سے جائز ماننا اس کا حجاب کشف سے زیادہ اچھا نہیں اس لیے کہ ہم نے خبر سے معلوم کر لیا ہے کہ مومن کو کشف ہوگا اور اس کی نظر سے حجاب اٹھ جائے گا۔ اس وقت اللہ تعالیٰ کو دیکھیں تو سمع بصر

سے افضل ہو اور یہ بدیہہ ہے کہ تمام امور شریعت سماعت پر مبنی ہیں۔ اگر سماعت نہ ہوتی تو اس کا ثبوت ملنا محال ہوتا۔ اور انبیاء علیہم السلام بھی آئے، پہلے انہوں نے فرمایا اور اسے سننے والوں نے سنا تو ایمان لائے۔ پھر انہوں نے معجزات دکھائے اور معجزہ دیکھنے میں اس کی تاکید بھی کان سے تھی۔ تو وہ دلائل سے جو سماعت کا انکار کرے وہ درحقیقت منکر شریعت ہے اور اس نے اس کا حکم اپنے اوپر چھپایا۔ اب میں اس کا حکم جامع ظاہر کرتا ہوں۔ ان شاء اللہ .



سماع قرآن اور اس کے متعلقات

اعلیٰ ترین سننے والی چیز جو دل کو فائدہ دے، کلام الہی عزاسمہ ہے اور اس کلام پاک کے سننے پر تمام مومن اور کافر مکلف ہیں۔ خواہ آدمی ہوں یا جن پری۔ اور مجزہ قرآن ظاہر یہ ہے کہ اس کے پڑھنے اور سننے سے ملول نہیں ہوتا اور اس میں بڑی رقت ہے۔ حتیٰ کہ کفار شب میں پوشیدہ طور پر آئے۔ اور حضور ﷺ جب نماز میں ہوتے یہ چھپ کر سنتے اور پسند کرتے بلکہ جامعیت کلام پر اور تعجب ہوتا۔ جیسے نصر بن حارث جو بڑا فصیح اللسان تھا اور عتبہ بن ربیعہ کو بلاغت میں جا دو گر مانا جاتا تھا اور ابو جہل بن ہشام جو کلام و برہان میں شانِ ید بیضا دکھاتا تھا اور خطبات میں خاص شان دکھاتا اور مثل ان کے اور بلغاء و فصحاء عرب۔

حتیٰ کہ ایک رات حضور ﷺ تلاوت فرما رہے تھے کہ عتبہ سنتے سنتے بیہوش ہو گیا اور ابو جہل سے بعد میں کہنے لگا کہ مجھے معلوم ہوتا ہے یہ مخلوقات کا کلام نہیں ہے۔ اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے جنوں پر یوں کو فوج در فوج کر کے بھیجا تا کہ وہ حضور ﷺ سے کلام پاک سنیں۔ جیسا کہ قرآن کریم میں ہے: ﴿إِنَّا سَمِعْنَا قُرْآنًا عَجَبًا ۝﴾ (۱) ”ہم نے ایک کلام عجیب سنا ہے۔“ جس کے اثر سے مطلع کیا کہ قرآن بیمار دلوں کو صحت کی طرف لاتا ہے۔ ﴿يَهْدِي إِلَى الرُّشْدِ فَآمَنَّا بِهِ ۝﴾ وَلَنْ نُشْرِكَ بِرَبِّنَا أَحَدًا ۝﴾ (۲) ”تو ہم اس پر ایمان لائے اور ہم ہرگز اپنے رب کا کسی کو شریک نہیں بنائیں گے۔“

اس لیے کہ اس کلام کی نصیحت تمام نصیحتوں سے بہتر ہے اور اس کے الفاظ نہایت مختصر اور جامع ہیں۔ اس کا حکم تمام اوامر سے لطیف تر ہے۔ اس کی نہی تمام مناہی سے صاف ہے۔ اس کے مواعید سب وعدوں سے زیادہ دلربا ہیں اور اس کے عذاب کی شان تمام عذابوں سے دل گداز ہے۔ اس کے قصے تمام قصوں سے زیادہ سیر کرنے والے۔ اس کی مثالیں سب مثالوں سے زیادہ فصیح ہیں۔ اس کے سننے سے ہزاروں شکار ہوتے ہیں۔ اس کے لطیفے ہزار ہا جانوں کو بلا میں مبتلا کرتے ہیں۔ دنیا داروں کو ذلیل کرتا ہے اور تارک دنیا کو عزت دیتا ہے۔

جب حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سنا کہ ان کی بہن اور بہنوئی مسلمان ہو گئے ہیں، تلوار سونت کر ان کے قتل کو آمادہ ہوئے اور دل میں سے ان کی محبت نکالی۔ حق تعالیٰ نے اپنی مہربانی سے سورۃ طہ کا لشکر گوشوں پر ان کی تاک میں بٹھا دیا۔ جب وہ بہن کے دروازے پر آئے تو بہن پڑھ رہی تھیں: ﴿طَهَّ مَا أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْآنَ لِتَشْقَىٰ ۖ إِلَّا تَذَكَّرَ ۚ لِمَنْ يَخْشَىٰ ۖ﴾ (۱) ”اے ماہِ کامل! ہم نے تیری طرف قرآن اس لیے نازل کیا کہ تو مشقت میں پڑے، مگر ڈرنے والوں کے لیے نصیحت ہے۔“

یہ آیت سنتے ہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی جان اس کے دقائق کا شکار ہوئی اور ان کا دل اس کے لطائف کی زنجیروں میں قید ہو گیا اور صلح اختیار کی اور ارادہ قتل ترک کر کے مخالفت کی بجائے موافقت کی طرف آئے اور مشہور ہے کہ جب حضور ﷺ کے حضور یہ آیت پڑھی گئی:

﴿إِنَّ لَدَيْنَا أَنْكَالًا وَجَحِيمًا ۖ وَطَعَامًا ذَا غُصَّةٍ وَعَذَابًا أَلِيمًا ۖ﴾ (۲) ”بیشک ہمارے پاس بیڑیاں ہیں اور دوزخ ہے اور کھانا گلا گھونٹنے والا اور دردناک عذاب ہے۔“ یہ سنتے ہی حضور ﷺ پر غشی طاری ہو گئی۔

اور مروی ہے کہ ایک شخص نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے رو برو پڑھا: ﴿إِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ ۚ مَّا لَهُ مِنْ دَافِعٍ ۖ﴾ (۳) ”بیشک تیرے رب کا عذاب واقع ہونے والا ہے، کوئی اس کے دفع کرنے پر قادر نہیں۔“ تو آپ نے ایک نعرہ مارا اور بیہوش ہو گئے۔ آپ کو اٹھا کر گھر لے آئے۔ ایک ماہ تک آپ بیمار رہے، اس لیے آپ پر خوفِ خداوندی مسلط رہا۔

روایت ہے کہ ایک صحابی نے عبداللہ بن حنظلہ رضی اللہ عنہ کے سامنے یہ آیت پڑھی: ﴿لَهُمْ مِنْ جَهَنَّمَ مِهَادٌ وَمِنْ فَوْقِهِمْ غَوَاشٍ ۖ﴾ (۴) ”ان کے لیے جہنم کا جھولا ہے اور ان کے لیے اوپر پردہ ہے۔“ آپ نے یہ سنتے ہی رونا شروع کر دیا حتیٰ کہ راوی کہتا ہے کہ مجھے خیال ہوا کہ ان کی جان نکل گئی۔ پھر وہ اٹھ کھڑے ہوئے، لوگوں نے کہا بیٹھ جائیے۔ آپ نے کہا کہ اس آیت کی مصیبت مجھے بیٹھنے نہیں دیتی۔

روایت ہے کہ حضرت جنید رضی اللہ عنہ کے سامنے یہ آیت پڑھی گئی: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ ۚ﴾ (۵) ”اے ایمان والو کیوں کہتے ہو جو خود نہیں کرتے۔“ آپ نے کہا: اَللّٰهُمَّ اِنْ قُلْنَا قَوْلًا بِكَ وَاِنْ فَعَلْنَا فَعَلْنَا بِتَوْفِيقِكَ فَاِنَّ الْقَوْلَ

۳۔ سورۃ الطور: ۸، ۷

۲۔ سورۃ المزمل: ۱۳، ۱۲

۱۔ سورۃ طہ: ۳۲، ۳۱

۴۔ سورۃ الاعراف: ۳۱۔ ۵۔ سورۃ القف: ۲

وَالْفِعْلُ. ”اے میرے رب! اگر ہم کہیں تو تیری ہی توفیق سے کہتے ہیں اور اگر کرتے ہیں تو تیری ہی توفیق سے کرتے ہیں تو کہاں ہے قول و فعل۔“ حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ کی روایت ہے کہ ان کے سامنے: ﴿وَإِذْ كُذِّبَتْكَ إِذَا نَسِيتَ﴾ (۱) یعنی ”یاد کرنا اپنے رب کو جب تو بھول جائے۔ پڑھی گئی تو آپ نے فرمایا کہ ذکر کی شرط نسیان میں ہے اور سب جہان اس کے ذکر میں ہے۔ پھر آپ نے نعرہ مارا اور بیہوش ہو گئے۔ جب ہوش آیا تو کہا مجھے تعجب ہے اس جان پر جو کلام الہی سے اور نہ نکلے۔ ایک بزرگ نے فرمایا: ایک وقت میں کلام اللہ سے پڑھتا تھا: ﴿وَاتَّقُوا يَوْمًا تُرْجَعُونَ فِيهِ إِلَى اللَّهِ﴾ (۲) ”ڈرو اس دن سے جب تم رجوع کرو گے اللہ کی طرف۔“ تو ہاتھ غیبی نے پکارا: آہستہ پڑھ کیونکہ چند پر یاں اس کی مصیبت سے مرگئیں۔

ایک درویش فرماتے ہیں کہ میں نے دس سال سے نماز میں قرآن پاک جواز سے زیادہ نہیں پڑھا اور نہ سنا۔ لوگوں نے سبب پوچھا۔ فرمایا: اس خوف سے کہ مجھ پر حجت ہو جائے گی۔ ایک روز میں شیخ ابوالعباس شقانی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انھیں میں نے یہ آیت پڑھتے ہوئے پایا: ﴿ضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا عَبْدًا مَمْلُوكًا لَا يَقْدِرُ عَلَىٰ شَيْءٍ﴾ (۳) ”مثال دیتا ہے اللہ اس بندہ مملوک کی جو کسی شے پر قادر نہیں۔“ اور رو رہے تھے کہ ایک نعرہ مار کر بیہوش ہو گئے۔ میں نے گمان کیا کہ شاید دنیا سے رحلت فرما گئے۔ میں نے عرض کیا حضور! یہ کیا حال ہے۔ فرمایا: گیارہ سال ہوئے کہ میں اس آیت تک آیا ہوں اب اس سے آگے جا نہیں سکتا۔

حضرت ابوالعباس عطا رحمۃ اللہ علیہ سے لوگوں نے پوچھا کہ حضور نے قرآن کریم کی روزانہ کتنی تلاوت مقرر کی ہے۔ جواب دیا: اس سے قبل آٹھ پہر میں دو ختم کرتا تھا۔ اب چودہ سال سے آج تک سورۃ انفال تک پہنچا ہوں: حضرت ابوالعباس نے قصاب قاری کو فرمایا: پڑھ، اس نے پڑھا: ﴿يَا أَيُّهَا الْعَزِيزُ مَسَّنَا وَأَهْلَنَا الضُّرُّ وَجِئْنَا بِبِضَاعَةٍ مُّزْجَاةٍ﴾ (۴) ”اے عزیز! ہم کو اور ہمارے اہل کو ضرر پہنچا اور ہم تھوڑا سا اسباب لائے ہیں۔“ آپ نے فرمایا پھر پڑھ: اس نے پڑھا: ﴿قَالُوا إِنْ يَسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ أَخْرَجَهُ مِنْ قَبْلُ﴾ (۵) ”بولے اگر اس نے چرایا ہے تو اس سے پہلے اس کا بھائی (بنیامین) چوری کر چکا ہے، آپ نے فرمایا اور پڑھ۔ اس نے پڑھا: ﴿لَا تَتْرِبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ يَغْفِرُ اللَّهُ لَكُمْ﴾ (۶) ”آج تم پر کوئی ملامت نہیں، اللہ تمہیں بخش دے گا۔“ آپ نے عرض، کی الہی! میں یوسف کے بھائیوں سے زیادہ ہوں اور تو کرم میں یوسف

۳۔ سورۃ النحل: ۷۵

۲۔ سورۃ البقرۃ: ۲۸۱

۱۔ سورۃ الکہف: ۲۴

۶۔ ایضاً: ۹۲

۵۔ ایضاً: ۷۷

۴۔ سورۃ یوسف: ۸۸

سے زیادہ ہے۔ میرے ساتھ ایسا کر جیسا یوسف نے اپنے بھائیوں سے کیا۔

اور بایں ہمہ ہم سب اس کلام پاک کے سننے پر مامور ہیں۔ تمام اہل اسلام خواہ وہ مطیع ہوں یا عاصی۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنْصِتُوا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ﴾ (۱) ”جب قرآن پڑھا جائے تو اسے سنو اور چپ رہو تا کہ تم پر رحم کیا جائے۔“ اس حکم میں سننا اور چپ رہنا خلقت پر حکم فرمایا۔ اس حال میں جب قرآن کریم پڑھا جائے اور یہ بھی فرمایا: ﴿فَبَشِّرْ عِبَادِ الَّذِينَ يَسْتَمِعُونَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُونَ أَحْسَنَهُ﴾ (۲) ”خوشخبری دے میرے ان بندوں کو جو سنتے ہیں کلام اور اچھی تابعداری کرتے ہیں۔“ یعنی اس کا حکم ماننے اور تعظیم سے سنتے ہیں اور یہ بھی فرمایا: ﴿الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَجِلَّتْ قُلُوبُهُمْ﴾ (۳) ”یعنی وہ لوگ جن کے سامنے اللہ کا ذکر کیا جائے تو لرز جاتا ہے ان کا دل۔“ اور یہ بھی فرمایا۔ ﴿الَّذِينَ آمَنُوا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوبُهُمْ بِذِكْرِ اللَّهِ أَلَا بِذِكْرِ اللَّهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ﴾ (۴) ”جو لوگ ایمان لائے ان کے دل اللہ تعالیٰ کے ذکر سے مطمئن ہوئے۔ خبردار رہو! اللہ کا ذکر دلوں کا چین ہے۔“ اور ایسی بہت سی آیتیں ہیں کہ اس حکم کی تائید کرتی ہیں۔

پھر اس کے برخلاف وہ گروہ بھی ہے جو کلام الہی کو سن کر کان سے دل کی طرف نہیں جانے دیتا اور اللہ تعالیٰ نے ان کے حق میں فرمایا: ﴿خَتَمَ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ وَعَلَىٰ سَمْعِهِمْ وَعَلَىٰ أَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ﴾ (۵) ”اللہ تعالیٰ نے مہر کر دی ان کے دلوں پر، ان کے کانوں پر اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے۔“ پردہ ڈالنے سے مراد گوشہ سماعت بند کرنا ہے۔ یہ بھی فرمایا کہ جہنمی قیامت کے روز کہیں گے ﴿لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ أَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِي أَصْحَابِ السَّعِيرِ﴾ (۶) ”اگر ہم ایسے ہوتے کہ سنتے اور سمجھتے تو ہم دوزخیوں میں نہ ہوتے۔“

اور فرمایا: ﴿وَمِنْهُمْ مَّنْ يَسْتَمِعُ إِلَيْكَ ۗ وَجَعَلْنَا عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ أَكِنَّةً أَنْ يَفْقَهُوهُ وَفِي آذَانِهِمْ وَقْرًا﴾ (۷) ”اور ایک گروہ ان میں سے وہ ہے جو آپ سے سنتا ہے اور ہم نے کر دیا ہے ان کے دلوں پر حجاب تا کہ نہ سمجھ سکیں اور ان کے کان بہرے ہیں تو گویا وہ ایسے ہیں جیسے سنا ہی نہیں۔“ اور فرمایا: ﴿وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ قَالُوا سَمِعْنَا وَهُمْ لَا يَسْمَعُونَ﴾ (۸) ”یہ ہی وجہ شکایت ہے یعنی تم ایسے نہ جاؤ کہ ہم نے سنا ہو حالانکہ انہوں نے نہیں سنا۔“ اور بہت سی آیتیں ہیں۔

- | | | |
|----------------------|-----------------------|--------------------|
| ۱۔ سورۃ الاعراف: ۲۰۳ | ۲۔ سورۃ الزمر: ۱۷، ۱۸ | ۳۔ سورۃ الانفال: ۲ |
| ۲۔ سورۃ الرعد: ۲۸ | ۵۔ سورۃ البقرۃ: ۷ | ۶۔ سورۃ الملک: ۱۰ |
| ۷۔ سورۃ الانعام: ۲۵ | ۸۔ سورۃ الانفال: ۲۱ | |

اور حضور ﷺ سے مروی ہے کہ آپ نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کو فرمایا: اَقْرَأْ عَلَيَّ فَقَالَ اَنَا اَقْرَأُ عَلَيْكَ وَعَلَيْكَ اَنْزَلَ فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنِّي اَحِبُّ اَنْ اَسْمَعَ عَنْ غَيْرِي. ”مجھ پر قرآن پڑھ۔ ابن مسعود نے عرض کیا حضور ﷺ پڑھوں، حالانکہ قرآن کریم حضور ﷺ پر اترتا تو حضور ﷺ نے فرمایا: میں چاہتا ہوں کہ اسے کسی سے سنوں۔“ اور یہ دلیل واضح ہے اس بات پر سننے والا قاری سے زیادہ کامل ہوتا ہے کیونکہ حضور نے فرمایا: میں غیر سے سننا زیادہ پسند کرتا ہوں۔

اس لیے کہ پڑھنے والا حال سے پڑھے یا غیر حال سے، مگر سننے والا بغیر حال کے نہیں سنتا کیونکہ کلام کرنے میں ایک نوع تکبر ہوتی ہے اور سننے میں تواضع۔ یہ بھی حضور ﷺ نے فرمایا: شَيْبَتُنِي سُورَةُ هُوْدٍ. (۱) ”مجھے سورت ہود نے بوڑھا کر دیا۔“ اور روایت ہے کہ یہ سورت ہود کی

۱۔ اسے امام بزار نے اپنی ”مسند“ میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ نے عرض کی اے جل شانہ کے رسول (علیہ الصلوٰۃ والسلام) ! میں آپ کو بوڑھا ہوتا دیکھ رہا ہوں آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا: شَيْبَتُنِي هُوْدٌ، وَالْوَاقِعَةُ، وَالْمُرْسَلَاتُ، وَعَمَّ يَتَسَاءَلُونَ. ابن مردویہ نے اپنی تفسیر میں محمد بن سیرین کے طریق سے انہوں نے عمران بن حصیب سے روایت کیا ہے راوی عرض کرتے ہیں کہ اے اللہ جل شانہ کے رسول (علیہ الصلوٰۃ والسلام) آپ پر بڑھاپا جلدی طاری ہو رہا ہے۔ فرمایا: شَيْبَتُنِي هُوْدٌ، وَالْوَاقِعَةُ، وَأَخْوَاتُهَا اسے امام ترمذی نے، ابو نعیم نے ”حلیۃ الاولیاء“ میں شیخان کے طریق سے انہوں نے اہل السبعی سے انہوں نے عکرمہ سے انہوں نے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ذکر کیا ہے۔ امام ترمذی نے اس کے بارے میں کہا ہے کہ یہ روایت حسن غریب ہے اور ہم صرف اسی سند کے ساتھ جانتے ہیں۔ ابن ابی شیبہ نے اپنی ”مصنف“ میں اور ابو یعلیٰ نے ابوالأحوص کے طریق سے اسے ذکر کیا ہے ابوالأحوص نے ابواسحاق سے، انہوں نے حضرت عکرمہ سے روایت کیا ہے۔ راوی کہتے ہیں کہ سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں عرض کی کہ آپ کا بڑھاپا کیا ہے؟ فرمایا: شَيْبَتُنِي هُوْدٌ، وَالْوَاقِعَةُ، وَالْمُرْسَلَاتُ، وَعَمَّ يَتَسَاءَلُونَ، وَإِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ. امام بیہقی نے ”دلائل النبوة“ میں عطیہ کے طریق سے، انہوں نے ابوسعید سے روایت کیا ہے کہ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے عرض کی اے اللہ کے رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام! آپ پر بڑھاپا جلدی طاری ہو گیا ہے؟ تو آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: شَيْبَتُنِي هُوْدٌ، وَأَخْوَاتُهَا، وَالْوَاقِعَةُ، وَعَمَّ يَتَسَاءَلُونَ، وَإِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ. ابن سعد نے اسے ”طبقات“ میں اور ابن عدی نے ”الکامل“ میں یزید الرقاشی کے طریق سے اور انہوں نے حضرت انس سے روایت کیا ہے اسی طرح امام طبرانی نے عقبہ بن عامر کے طریق سے روایت کیا ہے۔ حوالہ کے لیے ملاحظہ کیجئے۔ کشف الخفا“ للمعجلونی. (۱۵۷۲) ”المقاصد الحسنیة“ للسخاوی (۶۰۶) ”الجامع الكبير“ ۲/۲۶۶۷، ”أسنى المطالب“ (۷۹۷) ”حلیۃ الاولیاء“ لابن نعیم، ”تاریخ بغداد“ للحظیب ۳/۳۵، ”الذکر المنتشر للسیوطی (۲۵۶) سنن الترمذی، تفسیر (۵۶)

اس آخری آیت کے متعلق فرمایا: ﴿فَاسْتَقِمَّ كَمَا أَمَرْتَ﴾ (۱) ”اس پر قائم رہیں جس کا تمہیں حکم کیا گیا۔“

اور حقیقت ہے کہ انسان امور حقیقت میں حق پر قائم ہونے سے عاجز ہے۔ اس لیے بندہ بغیر توفیق حق کچھ نہیں کر سکتا تو جب ﴿فَاسْتَقِمَّ كَمَا أَمَرْتَ﴾ سنا تو حیران ہوئے کہ یہ کیونکر ممکن ہے کہ میں اس حکم پر قائم رہ سکوں۔ تو دل کے رنج سے قوت جاتی رہی اور رنج پر رنج اتنا بڑھا کہ ایک روز تشریف فرماتھے، جب اٹھنے لگے تو ہاتھ زمین پر رکھ کر قیام فرمایا۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے عرض کی: حضور کیا حال ہے۔ ابھی تو حضور ﷺ جو ان ہیں تو فرمایا سورۃ ہود نے مجھے بوڑھا کر دیا۔ یعنی اس حکم کے سننے سے میرے دل پر ایسی کیفیت ہو گئی کہ جیسے قوت ساقط ہو گئی ہو۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اصحاب سے ایک راوی ہیں کہ آپ نے فرمایا:

كُنْتُ فِي عَصَابَةٍ فِيهَا ضَعْفَاءُ الْمُهَاجِرِينَ، وَأَنَّ بَعْضَهُمْ يَسْتُرُ بَعْضًا مِنَ الْعُرِيِّ، وَقَارِيٌّ يَقْرَأُ عَلَيْنَا، وَنَحْنُ نَسْتَمِعُ لِقِرَاءَتِهِ، فَقَالَ: فَجَاءَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ وَسَلَّمَ حَتَّى قَامَ عَلَيْنَا، فَلَمَّا رَأَاهُ الْقَارِيُّ سَكَتَ، قَالَ: فَسَلَّمَ وَقَالَ: مَاذَا كُنْتُمْ تَصْنَعُونَ؟ قُلْنَا: يَا رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَكَانَ قَارِيٌّ يَقْرَأُ عَلَيْنَا، وَنَحْنُ نَسْتَمِعُ لِقِرَاءَتِهِ، فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي جَعَلَ فِي أُمَّتِي مَنْ أَمَرْتُ أَنْ أَصْبِرَ نَفْسِي مَعَهُمْ، قَالَ: ثُمَّ جَلَسَ وَسُطْنَا لِيَعْدِلَ نَفْسَهُ فِينَا، ثُمَّ قَالَ: بِيَدِهِ هَكَذَا، فَتَحَلَّقَ الْقَوْمُ، فَلَمْ يَعْرِفْ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْهُمْ أَحَدًا، قَالَ: وَكَانُوا ضَعْفَاءَ الْمُهَاجِرِينَ، فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: أَبَشِّرُوا صَعَالِيكَ الْمُهَاجِرِينَ بِالْفَوْزِ النَّامِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، تَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ قَبْلَ أَغْنِيَائِكُمْ بِنِصْفِ يَوْمٍ، كَانَ مِقْدَارُهُ خَمْسَ مِئَةِ عَامٍ. (۲)

۱۔ ہود: ۱۱۲۔

۲۔ اس روایت کو حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے۔ اسی مفہوم کی ایک حدیث امام دارمی نے اپنی ”سنن“ میں عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے: (بقیہ حواشی اگلے صفحہ پر۔۔)

”میں ایک ضعیف مہاجروں کی جماعت میں تھا کہ انہوں نے بعض بدن، بعض جسم سے عریانی کے سبب چھپا رکھا تھا اور ان میں ایک قاری پڑھ رہا تھا۔ ہم لوگ اس کی قرأت سن رہے تھے کہ حضور ﷺ تشریف لائے۔ جب قاری نے حضور ﷺ کی جلوہ آرائی دیکھی تو وہ خاموش ہو گیا۔ حضور ﷺ نے سلام علیک فرمایا اور پوچھا تم کیا کر رہے تھے۔ ہم نے عرض کی: حضور ﷺ ایک قاری ہمیں قرآن کریم سنارہا تھا، ہم سن رہے تھے۔ حضور ﷺ نے فرمایا اللہ کا شکر ہے جس نے میری امت میں ایسے آدمی پیدا فرمائے جن کے ساتھ میں صبر کرنے پر مامور ہوا۔ راوی کہتے ہیں پھر حضور ﷺ ہمارے درمیان تشریف فرما ہو گئے۔ پھر دست اقدس کے اشارہ سے ہمیں حلقہ کر کے بیٹھنے کا حکم فرمایا۔ ہم نے حلقہ باندھ لیا۔ حضور ﷺ کو ان ضعیف مہاجروں نے نہ پہچانا کہ سب مہاجر ضعیف تھے۔ پھر حضور ﷺ نے فرمایا بشارت دو مفلسوں مہاجرین کو کامل کامیابی کی، قیامت کے روز آدھے دن کے لیے جو پانچ سو برس کے برابر ہوگا، غنی لوگوں سے پہلے جنت میں داخل ہوں گے۔“

اور یہ بھی حدیث حضرت جنید رضی اللہ عنہ سے ہے لیکن بہ اختلاف الفاظ ہے، مگر معنی

سب کے ایک ہیں۔

فصل:

اور زرارہ ابن ابی اوفی کبار صحابہ سے تھے رضوان اللہ علیہم اجمعین۔ آپ صحابہ میں امامت فرماتے تھے۔ ایک روز ایک آیت پڑھی اور نعرہ مار کر جان دے دی۔ حضرت جہنی کبار تابعین میں سے تھے۔ صالح مری رحمۃ اللہ علیہ نے آپ پر ایک آیت پڑھی۔ بیہوش ہو گئے اور جاں بحق ہو گئے۔ ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ راوی ہیں کہ میں کوفہ کے ایک گاؤں میں سے گیا، ایک بڑھیا کو دیکھا نماز میں کھڑی تھیں۔ ان کے آثار نیک ظاہر تھے۔ جب نماز سے فارغ ہوئیں میں نے سلام

(بقیہ حواشی گزشتہ صفحہ سے)

قَالَ: بَيْنَمَا أَنَا قَاعِدٌ فِي الْمَسْجِدِ، وَحَلَقَةٌ مِنْ فُقَرَاءِ الْمُهَاجِرِينَ قَعُودٌ، إِذْ دَخَلَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ وَسَلَّمَ فَقَعَدَ إِلَيْهِمْ، فَقُمْتُ إِلَيْهِمْ، فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: لِيُبَشِّرَ فُقَرَاءَ الْمُهَاجِرِينَ بِمَا يَسُرُّ وَجُوهَهُمْ، فَإِنَّهُمْ يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ قَبْلَ الْأَغْنِيَاءِ بِأَرْبَعِينَ عَامًا، قَالَ: فَلَقَدْ رَأَيْتُ أَلْوَانَهُمْ أَسْفَرَتْ، قَالَ عَبْدُ اللَّهِ بْنُ عَمْرٍو: حَتَّى تَمْنَيْتُ أَنْ أَكُونَ مَعَهُمْ أَوْ مِنْهُمْ.

(مشکوٰۃ المصابیح ۳/۱۴۳، کتاب الرقاق : باب فضل الفقراء)

کیا۔ انہوں نے جواب سلام کے بعد پوچھا تو قرآن کریم جانتا ہے۔ میں نے عرض کیا، ہاں۔ فرمایا کوئی آیت پڑھ۔ میں نے پڑھی۔ انہوں نے آیت سن کر ایک آواز نکالی اور بیہوش ہو گئی اور جان استقبال رویتِ حق کے لیے بھیج دی۔

احمد بن ابی الحواری رحمۃ اللہ علیہ روایت کرتے ہیں کہ میں جنگل میں جا رہا تھا کہ ایک جوان کو دیکھا کہ گڈی کانٹے دار لیے کنویں پر کھڑا ہے۔ مجھے فرمایا: اے احمد! قرآن کریم کی کوئی آیت پڑھ کہ تو بروقت آیا ہے۔ مجھے سماعتِ کلام کی احتیاج ہے۔

فرماتے ہیں کہ مجھے اس حال میں الہام ہوا کہ یہ آیت پڑھ: ﴿إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا﴾ (۱) جوان بولا قسم بخدا کعبہ! تو نے وہی آیت پڑھی جو اس وقت فرشتے نے مجھے سنائی اور جان دی اور اگر ایسی ایسی روایتیں بیان کر دیں تو اصل مقصد رہ جائے گا۔

وَبِاللّٰهِ التَّوْفِیْقُ



سماع شعر اور اس کے متعلقات

شعر سننا مباح ہے اور حضور ﷺ نے سنا ہے اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم نے بھی کہا ہے اور سنا ہے اور حضور ﷺ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: **إِنَّ مِنَ الشِّعْرِ لِحِكْمَةٌ** (۱) اور فرمایا: **الْحِكْمَةُ ضَالَّةُ الْمُؤْمِنِ وَمَنْ وَجَدَهَا فَهُوَ أَحَقُّ بِهَا** ”کلمہ حکمت مومن کی گمشدہ چیز ہے، تو جو اسے پائے تو وہ زیادہ اس کا حقدار ہے۔“ اور شعر سے وہ شعر مراد ہے کہ جس میں حکمت ہو اور حکمت چونکہ مومن کی گمشدہ چیز ہے کہ اس سے غائب تھی تو جب اسے پایا تو وہ اس کا زیادہ حقدار ہے اور حضور ﷺ نے فرمایا: **أَصْدَقُ كَلِمَةٍ قَالَتْهَا الْعَرَبُ قَوْلُ لَبِيدٍ** ”یعنی سب سے سچا کلام جو عرب کے لوگوں میں کہا، وہ لبید کا کلام ہے۔“

أَلَا كُلُّ شَيْءٍ مَّا خَلَا اللَّهَ بَاطِلٌ وَكُلُّ نَعِيمٍ لَا مَحَالَةَ زَائِلٌ (۲)

”خبردار رہو! ہر شے اللہ تعالیٰ کے سوا باطل ہے اور ہر نعمت لامحالہ زائل ہونے

والی ہے۔“

عمر بن شریدا اپنے والد سے راوی ہیں کہ: **قَالَ اسْتَنْشَدَنِي رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هَلْ تَرَى مِنْ شِعْرِ أُمِّيَّةِ ابْنِ أَبِي الصَّلْتِ شَيْئًا فَاَنْشَدْتُهُ مِائَةَ قَافِيَةٍ كُلَّمَا**

۱۔ امام بخاری اسے اپنی ”صحیح“ ۹۰۸/۶ (کتاب الأدب) میں امام عسقلانی نے ”فتح الباری“ ۴۱۰/۱۰ میں عبدالرحمن بن الأسود بن عبد یغوث عن ابي بن كعب کی سند کے ساتھ روایت کیا ہے، امام ترمذی نے اسے اپنی ”جامع“ (حدیث: ۳۸۲۷) میں حضرت عاصم سے انہوں نے حضرت زرار سے، انہوں نے عبداللہ بن مسعود سے مرفوعاً روایت کیا ہے اور امام ابوداؤد نے سماک بن حرب کے طریق سے انہوں نے عکرمہ سے انہوں نے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ان الفاظ کے ساتھ مرفوعاً روایت کیا ہے۔ ”ان من الشعر حکما“

۲۔ اصدق کلمة قالتها العرب قول لبید۔ ألا كل شيء ما خلا الله باطل. وکل نعیم لامحالہ زائل۔ اسے امام مسلم نے اپنی ”صحیح“ کے کتاب الشعر ۴۹/۷ میں امام بخاری نے اپنی ”صحیح“ ۵۳/۵ ۴۳/۷ میں امام ترمذی نے ”الشمائل المحمدية“ (۲۲۳) میں ابن ماجہ نے اپنی ”سنن“ (۳۷۵۷) میں نقل کیا ہے شعر کے حوالہ کے لیے دیکھئے: دیوان طرفہ بن العبد (ص: ۲۸)۔

مَرَرْتُ عَلَى بَيْتِ قَالَ هِيَ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَأَدَّ أَنْ يُسَلِّمَ فِي شِعْرِهِ. (۱) ”مجھے حضور ﷺ نے شعر سنانے کا حکم دیا اور فرمایا: امیہ بن ابی الصلت کے شعر تجھے یاد ہیں؟ تو میں نے سو قافیہ حضور صلی علیہ وسلم کو سنائے۔ تو جب میں ایک بیت سے گزرتا تو فرماتے اور سنا۔ پھر حضور ﷺ نے فرمایا قریب تھا کہ وہ اپنے شعروں میں اسلام لے آتا۔“ اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے بہت سی روایتیں ہیں۔

اور عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ لوگ اس مسئلہ میں مغالطہ پر ہیں۔ چنانچہ ایک گروہ تو تمام اشعار کا سننا حرام کہتا ہے اور شب و روز غیبت مسلمانوں کی کرتا ہے اور ایک گروہ سب قسم کے اشعار حلال کہتا ہے اور شب و روز چہرے، زلف، خدو خال اور معشوق کی صفت غزل میں سنتا ہے اور ہر ایک اس بحث میں ایک دوسرے پر دلائل لاتا ہے اور میری مراد ان کے کہنے سننے سے اثبات نفی ہے۔

مشائخ صوفیاء رضی اللہ عنہم کا اس بارہ میں یہ طریقہ ہے کہ حضور ﷺ سے شعر کے بارے میں سوال ہوا تو حضور ﷺ نے فرمایا: كَلَامٌ حَسَنٌ وَ قُبْحُهُ قَبِيحٌ (۲) ”یہ کلام ہے حسن کلام حسن ہے اور قبیح قبیح ہے۔“ جس کا سننا حرام ہے، جیسے غیبت، بہتان، فواحشات، کسی کی مذمت یا کلمہ کفر، خواہ وہ نظم میں ہو یا نثر میں، سب حرام ہے۔

اور جس کلام کا نثر میں سننا حلال ہے جیسے عقلی باتیں اور نصیحت، اللہ تعالیٰ کی قدرت پر دلائل مشاہدات حق میں نظر کرنا، یہ نظم میں بھی جائز ہے۔

غرضیکہ جیسے حسن کا دیکھنا جو محل خطر ہو، ممنوع ہے، اس کا چھونا حرام ہے۔ ایسے ہی نظم و نثر

۱۔ حوالہ کے لیے. الشمائل المحمدية للامام الترمذی (حدیث: ۲۳۰) صحیح مسلم ۷/ ۲۸

(کتاب الشعر)، الادب المفرد للبخاری (حدیث: ۸۶۹) سنن ابن ماجہ (۲۶۶)۔

۲۔ کلام حسنہ حسن و قبحہ قبیح. ابن جوزی نے اسے ”العلل المتناہیة“ ۱/ ۱۲۹ میں عروہ کے طریق

سے انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ان الفاظ کے ساتھ مرفوعاً روایت کیا ہے: سئل النبی صلی اللہ

علیہ وآلہ وسلم عن الشعر: فقال: کلام حسنہ حسن و قبیحہ قبیح. امام شافعی نے مروہ سے

اسے مرسل روایت کیا ہے، جیسا کہ ”مشکوٰۃ المصابیح“ (ص: ۴۱۱) میں ہے، امام بیہقی نے

”مجمع الزوائد“ ۸/ ۱۲۲ میں کہا ہے کہ اسے امام ابو یعلیٰ نے نقل کیا ہے اور اس میں عبدالرحمن بن ثابت

بن ثوبان ہیں جن کی ایک جماعت نے توثیق کی ہے (ثقة کہا ہے) لیکن ابن معین نے اسے ضعیف قرار دیا

ہے جبکہ اس کے بقیہ راوی صحیح راویوں کی طرح ہیں امام نووی ”الذکار“ میں کہتے ہیں ”مسند ابو یعلیٰ“

میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے اسناد حسن کے ساتھ مروی ہے اور امام بیہقی نے ”السنن الکبریٰ“

۱۰/ ۲۳۹ میں ابو یعلیٰ کے طریق سے روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ ایک جماعت نے اسے مقبول قرار دیا ہے

اور صحیح یہ ہے کہ حدیث نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مرسل مروی ہے۔

جو محرکِ شہوات ہوں وہ محلِ خطر ہیں، ایسا سننا حرام ہے۔ اور جو لوگ ایسے فحش مضمون کو حلال کہتے ہیں ان کو دیکھنا اور چھونا بھی حلال کہنا چاہیے اور ایسی صورت میں یہ بے دینی کفر ہے۔

اور جو کہتا ہے کہ میں آنکھ، رخسار اور زلف کے بیان میں جلوہ حق دیکھتا ہوں اور حق کو ڈھونڈتا ہوں، وہ درحقیقت واجب کرتا ہے کہ اور چیز کی طرف بھی دھیان کرے اور رخسار خال بھی اور کہے کہ میں اس جلوہ میں حق ڈھونڈتا ہوں۔

اس لیے کہ آنکھ اور کان جائے عبرت اور منبع علم ہیں، اس لیے واجب ہے۔ تاکہ دوسرا کہے کہ میں چھوتا ہوں اس شخص کو جس کی صفت سننا جائز ہے اور دوسرا اس کا دیکھنا روارکھے اور کہے میں اس میں حق دیکھتا ہوں اور ایک خواہش دوسری خواہش سے زیادہ اچھی نہیں ہوتی جس سے معنی معلوم ہو سکیں۔“ ایسی صورت میں شریعت بالکل باطل ہوتی ہے۔

اور حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: **الْعَيْنَانِ تَزْنِيَانِ (۱)** ”دونوں آنکھیں زنا کرتی ہیں۔“ تو ان سے نظر بندی کے ماتحت یہ حکم اٹھ جاتا ہے اور نامحرموں کے چھونے کی ملامت قطع ہو جاتی ہے اور حدود و شرع بھی ساقط ہو جاتی ہے اور یہ واضح گمراہی ہے۔

اسی وجہ سے جب جاہل صوفیوں نے دیکھا کہ استغراق میں سماع والے شریک ہوتے ہیں، اس حال سے خیال کیا کہ یہ سب نفس کی پیروی میں کرتے ہیں تو یہ حلال ہے۔ اگر حلال نہ ہوتا تو یہ نہ کرتے۔ ان کی تقلید میں انہوں نے باطن ترک کر کے ظاہر کیا اور خود ہلاک ہو کر قوم کو بھی ہلاک کیا اور یہ آفتِ زمانہ سے ایک آفت ہے۔ اس کا بیان اپنے موقع پر کیا جائے گا۔ **إِنْ شَاءَ اللَّهُ**

۱۔ یہ الفاظ تو نہیں ملے لیکن ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ان الفاظ کے ساتھ مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: **زنا العيون النظر، وزنا اللسان النطق، وزنى اليد البطش وزنا الرجل المشي، وانما يصدق ذلك اويكذب عنه الفرج.** اس حدیث شریف کو امام احمد نے اپنی ”مسند“ ۶/۲ میں، امام بخاری نے اپنی ”صحیح“ (حدیث: ۶۲۳۳، ۶۶۱۶) میں، امام مسلم نے اپنی ”صحیح“ (حدیث: ۲۶۵۷) میں، ابو داؤد نے اپنی ”سنن“ (حدیث: ۱۲۳۸) میں، امام طبرانی نے ”معجم الکبیر“ (حدیث: ۱۰۳۰۳) میں، امام ابویعلیٰ نے اپنی ”مسند“ ۲/۲۳۹ میں اور ابو نعیم نے حلیۃ الاولیاء ۲/۹۸ میں ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے طریق سے نقل کیا ہے جبکہ امام ترمذی نے اپنی ”سنن“ (حدیث: ۲۹۳۷) میں ابو موسیٰ کے طریق سے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے: **كل عين زانية اسی طرح امام دارمی نے اپنی ”سنن“ (حدیث: ۲۶۳۹) میں روایت کیا ہے۔**

سماع لحن و نغمہ

حضور اکرم ﷺ فرمایا کرتے: زَيِّنُوا أَصْوَاتَكُمْ بِالْقُرْآنِ (۱) ”اپنی آواز قرآن کریم پڑھنے میں مزین کیا کرو۔“ اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿يَزِيدُ فِي الْخَلْقِ مَا يَشَاءُ﴾ (۲) بڑھاتا ہے مخلوق میں جتنا چاہے۔“ مفسرین نے کہا یہ آواز حسن کے متعلق ہے اور حضور ﷺ نے فرمایا: مَنْ أَرَادَ أَنْ يَسْمَعَ صَوْتِ دَاوُدَ فَلْيَسْتَمِعْ صَوْتِ أَبِي مُوسَى الْأَشْعَرِيِّ (۳) ”جو چاہے

۱۔ مذکورہ الفاظ تو نہیں ملے لیکن عبد الرزاق نے اسے روایت کیا ہے اور انہی کے طریق سے امام حاکم نے ”المستدرک“ میں معمر سے اس نے اعمش سے انہوں نے طلحہ بن مصرف سے انہوں نے عبد الرحمن بن عو جبہ سے انہوں نے حضرت براء سے مندرجہ ذیل الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے۔ ”زَيِّنُوا الْقُرْآنَ بِأَصْوَاتِكُمْ“ انہی الفاظ کے ساتھ امام طبرانی نے سند حسن کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے اور امام حاکم نے حضرت براء والی روایت مختلف اسناد لانے میں توسع کیا ہے۔ اور ”زَيِّنُوا الْقُرْآنَ بِأَصْوَاتِكُمْ“ کے الفاظ پر اتفاق ہوا ہے۔ امام دارمی نے اسے اپنی ”سنن“ میں ابو نعیم نے ”حلیۃ الاولیاء“ میں حضرت علقمہ رضی اللہ عنہ کے طریق سے روایت کیا ہے اور امام بخاری نے ”الترجمہ“ کے الفاظ کے ساتھ اپنی ”صحیح“ کے اواخر میں اعتماد و یقین کے ساتھ تعلق کی ہے لیکن اسے باب ”خلق أفعال العباد“ میں کئی سندوں سے ذکر کیا ہے اسی طرح اسے امام ابو داؤد، امام نسائی اور امام بن حبان نے اپنی، ”صحیح“ میں بیان کیا ہے۔

حوالہ کے لیے دیکھیے: المستدرک للحاکم ۱/۱ ۵۷۱، سنن الدارمی ۲/۳۳۰ (باب فضائل القرآن) سنن ابی داؤد ۱/۵۴۷ (کتاب الصلاة)، سنن نسائی ۱/۱۵۷، (باب تزئین القرآن بالصوت)، مسند الإمام احمد ۲/۲۸۳، ۲۸۵، ۳۰۴، سنن ابن ماجہ (ص: ۹۰، ابواب قیام شهر رمضان) احياء علوم الدين ۱/۳۷۰. (یا) زینوا اصواتکم بالقرآن. امام حاکم نے اسے ”المستدرک“ ۱/۱ ۵۷۱ (فی فضائل القرآن) میں امام عبد الرزاق نے ”المصنف“ ۲/۳۸۵ (الصلاة: باب حسن الصوت) میں ذکر کیا ہے جبکہ امام طبرانی نے ”المعجم“ میں ان الفاظ کے ساتھ ذکر کیا ہے: أحسنوا أصواتکم بالقرآن“

۲۔ سورة الفاطر:

۳۔ اسے امام بخاری نے اپنی ”صحیح“ (۲/۷۵۵، کتاب: فضائل القرآن، باب حسن الصوت بالقرآنة) میں ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے کہ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو قرأت (قرآن) کرتے ہوئے سنا تو فرمایا: لقد اوتی هذا مزاراً من مزامیر آل داؤد مزید حوالہ کے لیے: صحیح مسلم (۲/۱۹۳)، فی صلاة المسافرين، باب: استحباب تحسین الصوت بالقرآن، سنن الدارمی (۲/۳۳۹)، فی فضائل القرآن، باب: تغنی بالقرآن

کہ داؤد علیہ السلام کی آواز سنے، وہ ابوموسیٰ اشعری کی آواز سنے۔“

احادیث میں ہے کہ بہشتیوں کے لیے بھی سماع ہوگا اور وہ ایسا ہوگا کہ ایک درخت سے آوازیں مختلف سروں میں آئیں گی۔ جب وہ مختلف آوازیں ملائی جائیں گی تو اس سے طبیعتوں کو بڑی لذت حاصل ہوگی۔ اس قسم کی آواز عام مخلوق میں عام ہوتی ہے، خواہ وہ آدمیوں میں ہو یا جانوروں میں۔ اس لذت کا باعث یہ ہے کہ روح لطیف ہے اور اس قسم کی آوازیں میں بھی لطافت ہے تو جب روح ایسی آوازیں سنتی ہے تو جنس جنس کی طرف مائل ہوتی ہے اور یہ اس گروہ کا قول ہے جس کا ذکر ہو چکا اور محققین اہل خبر اس میں بہت کلام کرتے ہیں بلکہ سروں کے ملانے، زیروبم کی تحقیق میں انہوں نے کتابیں لکھی ہیں اور فن کو بڑی اہمیت دی ہے اور موجودہ زمانہ میں ان کی صنعت کے آثار مزامیر ہیں، جو انہوں نے ایجاد کیے ہیں۔ ان کے ذریعے خواہش نفسانی، لہو و لعب، کھیل تماشے کی زینت کے لیے انہوں نے شیطان سے اتفاق کیا ہے۔ بلکہ اس حد تک بڑھے کہ روایات بنا کر سناتے ہیں کہ حضرت اسحق ایک باغ میں سرود کر رہے تھے اور ایک بلبل بول رہی تھی۔ وہ آواز سن کر خاموش ہو گئی اور سنتی رہی حتیٰ کہ وہ درخت سے گر کر مر گئی۔

میں نے اس قسم کی بہت سی حکایتیں سنی ہیں۔ اس سے میری مراد یہ نہیں کہ یہ جو کہتے ہیں سب راحتیں اور تالیف طبع کے لیے اور الحان دلوں کے لیے ہیں۔

حضرت ابراہیم خواص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک وقت میں عرب کے ایک قبیلہ میں گیا اور ایک امیر کے مہمان خانے میں اُترا۔ میں نے وہاں ایک حبشی دیکھا جو زنجیروں میں جکڑا ہوا دھوپ میں پڑا تھا۔ اس پر خیمہ لگا ہوا تھا۔ مجھے اس پر رحم آیا، میں نے اس کی سفارش کے لیے خیال کیا۔ پھر جب کھانا لایا گیا تو امیر بھی خود مہمانوں کی تعظیم کے لیے آیا تا کہ اپنے سامنے سب کو کھانا کھلائے۔ جب میرے سامنے کھانا آیا تو میں نے کھانا کھانے سے انکار کر دیا۔ عرب میں اس سے معیوب بات کوئی نہیں سمجھی جاتی کہ مہمان کھانا نہ کھائے۔ چنانچہ امیر خود میرے پاس آیا اور کھانا نہ کھانے کی وجہ دریافت کی۔ میں نے اُسے کہا کہ مجھے تیری مہربانی سے سب کچھ اُمید ہے۔ امیر نے کہا کہ آپ کو میری تمام ملک میں تصرف کا حق ہے لیکن کھانا کھالو۔ میں نے جواب دیا کہ مجھے تیری ملک کی ضرورت نہیں۔ میری صرف اتنی خواہش ہے کہ یہ غلام جو پاپہ جولاں ہے، یہ مجھے دے دیا جائے اور بس۔ اس نے کہا مجھے اس میں کوئی عذر نہیں لیکن اول اس کا قصور معلوم کر لیجئے پھر جیسے آپ چاہیں وہ کریں۔

میں نے پوچھا تو امیر نے کہا یہ میرا غلام ہے اور نہایت خوش الحان ہے۔ میں نے اسے

چند اونٹ دیئے تاکہ یہ کھیتوں میں جا کر دانہ وغیرہ لے آئے۔ اس نے ایک ایک اونٹ پر دو اونٹوں کا بار ڈالا اور راستہ میں گاتا ہوا آیا جس سے اونٹ مست ہو گئے اور دوڑتے ہوئے واپس آئے اور جتنا بوجھ لانا تھا اس سے دو چند بوجھ لے آئے۔ جب ان سے بوجھ اتارا گیا تو وہ اونٹ ایک ایک دو دو کر کے مر گئے۔

ابراہیم خواص فرماتے ہیں کہ مجھے یہ سن کر تعجب ہوا۔ میں نے کہا مجھے اس بات پر دلیل کی ضرورت ہے کہ اتنے میں چند اونٹ گھاٹ پر آئے کہ پانی پئیں۔ امیر نے ان اونٹوں کے آدمیوں سے پوچھا کہ یہ کتنے روز سے پیاسے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ تین چار روز سے پیاسے ہیں۔ امیر نے (غلام سے) کہا کہ اب تو گا کر ان اونٹوں کو مست کر۔ اس نے گانا شروع کیا اور اونٹ اس کی آواز سن کر پانی پینا بھول گئے۔ کسی نے پانی کی طرف رخ نہ کیا اور دیوانہ وار جنگل کی طرف بھاگے اور پراگندہ ہو گئے۔ اس کے بعد امیر نے غلام کو آزاد کر کے مجھے بخش دیا۔

اور اس قسم کے مشاہدے مجھے بلوچوں میں بھی ہوئے کہ وہ گدھے اور اونٹ لے کر چلتے ہیں اور راستہ میں انہیں اپنے گانے سے مست کرتے ہیں اور خراسان و عراق میں شکاری رات کو تھال بجاتے ہیں جس سے جنگل کے ہرن کھڑے ہو جاتے ہیں۔ وہ شکاری انہیں پکڑ لیتے ہیں۔

اور مشہور ہے کہ ہندوستان میں ایک گروہ جنگل میں جا کر سرود کرتا ہے اور انواع و اقسام کے راگ گاتا ہے جس سے ہرن اس آواز کی طرف آتے ہیں یہ ان کے گرد پھر کر سرود کرتے رہتے ہیں حتیٰ کہ وہ ہرن مست ہو کر آنکھیں بند کرتے ہیں اور سو جاتے ہیں، وہ لوگ انہیں پکڑ لیتے ہیں۔ اور شیر خوار بچوں میں یہ دستور ہے کہ جب وہ پالنے میں روتے ہیں تو ان کے پاس ان کی ماں یا کوئی انواع اقسام کی آواز کرتا ہے، وہ چپ ہو جاتے ہیں اور اس آواز کے سننے میں محو ہو جاتے ہیں اور جو بچہ ایسی آواز پر روتا ہو چپ ہو جائے اطباء اس بچے کو زیرک کہتے ہیں۔

اور اس کا تجربہ اس طرح حاصل ہوا کہ ایک عجمی بادشاہ مر گیا۔ اس کا دو سالہ بچہ تھا۔ وزیروں نے اسے تخت نشین کرنا چاہا۔ بزرجمہر نے کہا کہ اسے تخت نشینی سے پہلے امتحان کرنا ضروری ہے کہ اس کے حواس درست ہیں یا نہیں تاکہ نظام مملکت کی اس سے امید ہو سکے۔ لوگوں نے پوچھا وہ امتحان کیسے لیا جائے۔ اس نے گانا گانے والے بلائے اور اس بچہ کے آگے وہ گانے لگے، بچہ خوشی میں آیا اور ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔ بزرجمہر نے کہا کہ یہ بچہ زیرک ہے اس سے نظام مملکت کی امید ہے۔

اور عقلاء کے نزدیک جس پر آواز کی تاثیر نہ ہو وہ بے حس ہے یا جھوٹا ہے یا نفاق کرتا ہے

یا آدمی اور جانوروں کے طبقہ سے خارج ہے۔

اور ایک جماعت راگ سننے کی اس وجہ میں ممانعت کرتی ہے کہ اس میں امرحق کی پیروی نہیں ہے اور فقہاء کا اتفاق ہے کہ گانا سننا اس وقت جائز ہے جب راگ و رنگ کا سامان موجود نہ ہو اور آواز سننے سے بُری نیت ظاہر نہ ہو اور اس پر وہ دلائل میں بہت سے اخبار و احادیث لاتے ہیں جیسے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

قَالَتْ كَانَتْ عِنْدِي جَارِيَةٌ تُغَنِّي فَأَسْتَأْذِنُ عُمَرَ فَلَمَّا أَحْسَهُ
وَسَمِعَتْ حِسَّهُ فَرَّتْ فَلَمَّا دَخَلَ عُمَرُ تَبَسَّمَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ
عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ لَهُ عُمَرُ مَا أَضْحَكَكَ يَا رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ
وَسَلَّمَ قَالَ كَانَتْ عِنْدَنَا جَارِيَةٌ تُغَنِّي فَلَمَّا سَمِعْتُ حِسَّكَ فَرَّتْ
فَقَالَ عُمَرُ لَا أَبْرُحُ حَتَّى أَسْمَعَ مَا كَانَ سَمِعَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ
عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَدَعَا رَسُولُ اللَّهِ تِلْكَ الْجَارِيَةَ فَأَخَذَتْ تُغَنِّي وَ
رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَسْمَعُ.

”حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میرے پاس ایک گانے والی لونڈی گارہی تھی۔ اتنے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اندر آنے کی اجازت طلب کی۔ جب اس لونڈی نے معلوم کیا اور حضرت عمرؓ کی آواز سنی تو وہ بھاگ گئی۔ جب حضرت عمرؓ داخل ہوئے تو حضور ﷺ تبسم فرما رہے تھے۔ حضرت عمرؓ نے عرض کی: حضور ﷺ کو کس چیز نے ہنسایا۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ہمارے پاس ایک لونڈی گارہی تھی جب اس نے تمہاری آواز سنی تو بھاگ گئی، حضرت عمرؓ نے عرض کیا: میں ضرور سنوں گا جو میرے حضور ﷺ نے سنا ہے۔ تو حضور ﷺ نے اُسے بلایا۔ وہ آکر گانے لگی اور حضور ﷺ سن رہے تھے۔“

اور اکثر صحابہ کرام نے ایسی روایات بیان کی ہیں۔ شیخ عبدالرحمان سلمی رحمۃ اللہ علیہ ان سب روایات کو اپنی کتاب ”السماع“ میں جمع کیا ہے اور اس کی اباحت کا فیصلہ کیا ہے۔ لیکن مشائخ صوفیاء نے اسے مباح کہنا عوام کا کام بتایا ہے اس لیے اعمالِ مشائخ میں وہی کام رائج ہے جس سے ثواب اور فائدہ حاصل ہو۔ مباح کاموں میں پڑنا عوام کا ہی کام ہے یا جو پایوں کا۔ بالغ بندوں کو چاہیے کہ ایسا کام کریں کہ جس سے فائدہ حاصل ہو۔ ایک وقت میں

مقام مرو میں تھا۔ ایک محدث نے جو ائمہ حدیث میں مشہور تھے، مجھ سے کہا کہ میں نے اباحتِ سماع میں کتاب لکھی ہے۔ میں نے کہا کہ یہ دین میں بڑی مصیبت کی بات ہے کہ ایک امامِ فن ایسی لہو و لعب کو جو سب جہالتوں کی جڑ ہو، حلال کرے۔ پھر انہوں نے مجھ سے فرمایا کہ آپ حلال نہیں جانتے تو سماع کیوں کرتے ہیں۔ میں نے کہا کہ اس کا حکم چند صورتوں پر ہے، ایک حال پر منحصر نہیں۔ اگر دل میں حلال تاثیر ہو تو حلال ہے اور اگر حرام کی تاثیر ہو تو حرام ہے، اور اگر مباح کی تاثیر ہو تو مباح ہے اور جس کا ظاہر حکم گناہ ہے، اس کے باطنی حال میں کئی وجوہ پر اس کا حکم ہے۔ ایک چیز پر مطلق حکم کرنا محال ہے۔



احکامِ سماع

اچھی طرح سمجھ لو کہ سماع کے متعلق اختلاف طبائع کے ساتھ علیحدہ علیحدہ حکم ہیں۔ جیسے ارادت کے دلوں پر مختلف حکم ہیں اور یہ ظلم ہے کہ کوئی شخص اس سے یکساں سمجھے۔ غرض کہ سننے والے دو گروہ ہیں، ایک معنی سننے والے، دوسرے آواز سننے والے، اور ان دونوں میں فائدے بھی ہیں اور آفات بھی۔ اس لیے کہ خوش آواز سننے سے جو معنی آدمیوں میں مرکب ہوتے ہیں اور وہ جوش میں آتے ہیں، اس کے دو نتیجے ہیں۔ اگر طبیعت میں حق ہو تو حق جوش دیتا ہے اور اگر باطل ہو تو باطل جوش مارتا ہے۔ جس کی طبیعت میں مادہ فساد ہو تو وہ جب سماع کرے گا فساد ہی پیدا ہوگا۔ اور یہ دونوں باتیں حضرت داؤد علیہ السلام کی حکایتوں سے ظاہر ہیں۔

جب اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنا خلیفہ بنایا تو آپ کو لحن عطا فرما کر گویا آپ کے گلے کو ساز بنا دیا۔ حتیٰ کہ پہاڑ بھی نرم ہوئے اور وحوش و طیور بھی سماعتِ داؤد علیہ السلام سے باہر آجاتے اور پانی چلتا ہوا ٹھہر جاتا اور پرندے ہوا پر سے گر جاتے۔

روایات میں ہے کہ آپ علیہ السلام کی آواز سن کر پرندے ایک ایک ماہ تک مدہوش ہوتے کہ کچھ نہ کھاتے۔ بچے نہ روتے، نہ دودھ مانگتے اور جب خلقت وہاں سے واپس آجاتی تو بہت سے آدمی آپ علیہ السلام کے خوبصورت کلام سے متاثر ہو کر مر جاتے۔ حتیٰ کہ ایک بار تخمینہ لگایا تو سات سو خوبصورت لونڈیاں اور بارہ ہزار بوڑھے مر گئے تھے۔ پھر مشیتِ حق اس طرف ہوئی کہ حق اور حقیقت نیوش لوگوں کو متبعینِ حرص و آرزو سے جدا کیا جائے۔ چنانچہ شیطان کی بے قراری نے زور پکڑا اور اسے ان کے دلوں میں وسوساں الخناس ڈالنے کی اجازت ملی تا کہ وہ حیلہ سازی سے جو کچھ کر سکتا ہے کر لے۔ تو اس نے بنسری اور ظنبر کی ترکیب نکالی اور مجلسِ داؤد علیہ السلام کے مقابل ایک مجلس تیار کی۔

چنانچہ سامعینِ داؤد علیہ السلام کے دو گروہ ہو گئے۔ ایک اہل شقاوت جو مزامیر کی طرف مائل ہو گیا۔ دوسرا صرف لحنِ داؤد کا مشتاق رہا۔ اور جو اہل معنی تھے وہ لحنِ داؤد کے علاوہ کسی اور طرف مائل نہ ہوئے، اس لیے کہ وہ حق کو بھی دیکھتے تھے اور اگر شیطانی ساز سنتے تو اس میں منجانب

اللہ انہیں فتنہ نظر آتا اور جب لحنِ داؤد سنتے تو اس میں ہدایتِ حق دیکھتے۔ حتیٰ کہ سب سے رہ گئے اور متعلقات سے روگرداں ہو کر کما حقہ صواب کو صواب دیکھا اور خطا کو خطا۔ تو جس کا سماع ایسا ہے وہ جو کچھ سنتا ہے سب اس کو حلال ہے۔ اور ایک گروہ مدعیوں کا کہتا ہے کہ ہم پر سماع کا اثر برخلاف پڑتا ہے اور یہ محال ہے۔ اس لیے کہ کمالِ ولایت یہ ہے کہ ہر چیز کی اصلیت نظر آئے تاکہ اس کا دیکھنا صحیح ہو اور اگر اس کے برخلاف دیکھے تو وہ دیکھنا درست نہیں۔

کیا تو نے نہیں دیکھا کہ حضور ﷺ نے فرمایا: اَللّٰهُمَّ اَرِنَا حَقَائِقَ الْاَشْيَاءِ كَمَا هِيَ (۱) ”الہی ہمیں ہر چیز اپنی اصل اصلیت میں دکھا دے۔“ تو جب دیکھنا درست ہوا، یعنی چیزوں کے مطابق اصل۔ تو چاہیے کہ سماع میں درست ہو اور اسے ایسا سنے جیسا کہ وہ اپنی صفت اور حکم میں ہے اور جو لوگ ساز اور باجے میں مبتلا ہیں اور نفسانی خواہش اور شہوات میں ہیں وہ برخلاف اصلیت کے سنتے ہیں۔ اگر اس حکم کے مطابق اصل سماع کرتے تو سب آفات سے بچے رہتے۔

کیا تو نے نہیں دیکھا کہ گمراہوں نے کلامِ الہی سنا اور اس سے ان کی گمراہی زیادہ ہو گئی۔ جیسے نصر بن حارث نے کہا: ﴿اَسَاطِيرُ الْاَوَّلِيْنَ﴾ (۲) ”یہ پہلے قصے ہیں۔“ اور عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کاتب وحی تھا کہہ بیٹھا: ﴿سَآئِرٌ مِّثْلَ مَا نَزَلَ اللّٰهُ﴾ اور ایک گروہ ﴿لَا تُذِرُكَ الْاَبْصَارُ﴾ (۳) کو دلیل بنا بیٹھا کہ اس کا دیدار نہیں ہو گا اور ایک گروہ نے ﴿ثُمَّ اسْتَوٰى عَلٰى الْعَرْشِ﴾ (۴) کو مکان اور جہت کا ثبوت اور ایک گروہ نے ﴿وَجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا﴾ (۵) کو حجیت کی دلیل بنا لیا۔ جب ان کا دل گمراہی کا محل تھا، اسے کلامِ الہی سننے سے کچھ فائدہ نہ ہوا۔

ایسے ہی جب موحد نے شاعر کے شعر کی طرف نگاہ کی اور اس کی طبع پیدا کرنے والے کو دیکھا اور اپنے دلوں کو آراستہ کرنے والی چیز کا اس میں مطالعہ کیا اور فاعلِ فعل پر دلیل کی تو اس گروہ نے حق میں راستہ گم کیا اور باطل میں راستہ پایا اور ان معنی کا انکار ظاہر مکارہ ہے۔ اور مشائخِ رضی اللہ عنہم نے ان معنی میں لطیف کلمات بیان کیے ہیں جو اس کتاب میں نہیں رکھتے۔

۱۔ یہ الفاظ تو نہیں ملے لیکن ”اتحاف السادة المتقين“ میں یہ الفاظ آئے ہیں:

اللهم ارنى الدنيا كما تريها صالح عبادك.

۳۔ سورة الانعام: ۱۰۳.

۲۔ سورة الانعام: ۲۵.

۵۔ سورة الفجر: ۲۲.

۴۔ سورة الاعراف: ۵۴.

فصل:

میں اس فصل میں ثابت کرتا ہوں تاکہ کامل فائدہ ہو۔ حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: السَّمَاعُ وَارِدُ الْحَقِّ يُزْعِجُ الْقُلُوبَ إِلَى الْحَقِّ فَمَنْ أَصْغَى إِلَيْهِ بِحَقِّ تَحَقُّقٍ وَمَنْ أَصْغَى إِلَيْهِ بِنَفْسٍ تَزُنْدَقُ. ”سَمَاعٌ وَارِدٌ أَحَقُّ هُوَ أَوْلَى دُلُوبِ كَاللَّهِ فِي طَرَفِ مِيلَانِ هُوَ۔ جو اسے حق سے سنتا ہے وہ حق کی طرف راستہ پاتا ہے اور نفس سے سنتا ہے زندیق ہو جاتا ہے۔“ اس سے حضرت ذوالنون کی مراد یہ نہیں ہے کہ سماع علت وصل حق ہے بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ سننے والے کو معنی حق سننے چاہئیں نہ کہ آواز اور اس کا دل و رو و حق کا محل ہو۔ تو جب وہ معنی دل پر پہنچتے ہیں، دل کو ابھارتے ہیں۔

اور جو سماع تابع حق ہو وہ مکاشف حق ہوتا ہے اور جو نفس کے تابع ہو وہ محبوب ہوتا ہے، تاویل سے تعلق پیدا کرتا ہے۔ اس کا ثمرہ کشف ہوتا ہے اور اس سماع سے پردہ۔ لیکن زندیقہ ایک فارسی لفظ سے معرب کیا گیا ہے اور عجمی زبان میں زندیقہ، زند تاویل ہے اور اس سبب سے انہوں نے اپنی کتاب کی تفسیر کو ”زند پاژند“ کہا ہے اور جب اہل لغت چاہتے ہیں کہ ابناء مجوس کو کسی نام سے ظاہر کریں تو ”زندیق“ کہتے ہیں۔

اس بناء پر وہ کہا کرتے تھے کہ جو کچھ مسلمان کرے اس کے لیے تاویل ہے۔ اس لیے کہ اس کا ظاہر نقض ہے اور تنزیل دیانت دار قول ہے اور تاویل اس سے باہر ہے اور مشتبه فقر جو آج ان سے باقی ہیں یہی کہتے ہیں۔ اور یہ زندیقی نام ان کے لیے علم ہے۔ تو اس سے ذوالنون مصری کی مراد یہ ہے کہ اہل تحقیق سماع محقق ہوتے ہیں اور نفسانی لوگ تاویل کنندہ۔ تو جو اس کی تاویل حقیقت سے دور کرتے ہیں وہ سب سے گنہگار ہوتے ہیں۔

اور حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: السَّمَاعُ ظَاهِرَةٌ فَتْنَةٌ وَبَاطِنَةٌ عِبْرَةٌ فَمَنْ عَرَفَ الْإِشَارَةَ حَلَّ لَهُ اسْتِمَاعُ الْعِبْرَةِ وَالْإِلْفَقْدُ اسْتَدْعَى الْفِتْنَةَ وَتَعَرَّضَ لِلْبَلِيَّةِ. ”سَمَاعٌ بظاہر فتنہ ہے اور باطن عبرت۔ جو اس کے اشارات کا فہم حاصل کر لے اس کے لیے سماع عبرت حلال ہے ورنہ فتنہ اپنے لیے بلا رہا ہے اور بلاؤں کے لیے اپنے کو پیش کر رہا ہے۔“

یعنی جس کا دل بالکل حدیث حق میں مستغرق نہیں اس کے لیے سماع بلا ہے اور وہ مورد

آفات ہے۔

حضرت ابوعلی رود باری رحمۃ اللہ علیہ نے ایک سوال کے جواب میں فرمایا: جب کہ ایک شخص نے کہہ کر سماع سے متعلق پوچھا: لَيْتَنَا تَخَلَّصْنَا مِنْهُ رَأْسًا بِرَأْسٍ. ”کاش کہ ہم اس سماع

سے سر بسر چھوٹ جاتے۔“ اس لیے کہ آدمی سب چیزوں کے حق ادا کرنے میں عاجز ہے۔ جب کسی چیز کا حق فوت ہو جائے تو بندہ اس میں اپنا قصور دیکھتا ہے اور جب اپنا قصور دیکھتا ہے تو دعا کرتا ہے کہ کاش اس سے چھوٹ جائے۔

ایک شیخ فرماتے ہیں: السَّمَاعُ تَنْبِيْهُ الْأَسْرَارِ لِمَا فِيْهِ مِنَ الْمَغِيْبَاتِ. ”سمع بیدار کرتا ہے رازوں سے اور لازم کرتا ہے کہ اس سے ہمیشہ حق کی جانب حاضر ہو جائے۔“ اس لیے کہ رازوں کا غائب ہونا مدعیوں کے حق میں بُرا ہے اور یہ ان کی بُری صفتوں سے ہے۔ اس لیے کہ دوست دوست سے اگر غائب ہو تو بھی دل سے حاضر ہوتا ہے اور جب غیبت آئے تو دوستی جاتی رہے۔ یہی میرے شیخ نے فرمایا ہے: السَّمَاعُ زَادَ الْمُضْطَرِّينَ فَمَنْ وَصَلَ اسْتَفْنَى عَنِ السَّمَاعِ ”سمع تھکے ماندوں کا توشہ ہے، جب پہنچ گیا اسے سمع سے استغنا حاصل ہوتا ہے۔“ اس لیے کہ وصل کے محل میں سماعت معزول ہوتی ہے۔ کیونکہ سمع خبر ہے اور خبر غائب سے ہوتی ہے اور جب روبرو ہو گیا تو سننا جاتا رہا۔

حضرتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اَيُّ شَيْءٍ اَعْمَلُ بِالسَّمَاعِ يَنْقَطِعُ اِذَا انْقَطَعَ مِمَّنْ يَسْمَعُ مِنْهُ يَنْبَغِيْ اَنْ يَكُوْنَ سَمَاعَكَ مُتَّصِلًا غَيْرَ مُنْقَطِعٍ ”میں سمع کو کیا کروں، کیونکہ جب سنانا بند ہو جاتا ہے تو سمع بھی بند ہو جاتا ہے اور چاہیے کہ یہ تیرا سمع متصل ہو اور کبھی بند نہ ہو۔“

اور ہمت کا نشان اجتماع ہے، جب گلستانِ محبت میں جمع ہو۔ کیونکہ جب بندہ اس نتیجہ پر پہنچتا ہے تو سب جہاں حتیٰ کہ حجر و مدر سب اس کے لیے سمع ہو جاتے ہیں اور یہ بہت بڑا درجہ ہے۔
وَاللّٰهُ وَلِيُّ التَّوْفِيْقِ



اختلاف سماع

مشائخ و محققان کے اندر سماع میں اختلاف ہے۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ سماع آلہ غیب ہے اور دلیل یہ لاتے ہیں کہ بحالت مشاہدہ سماع محال ہے۔ کیونکہ دوست کے محل میں اور دوست کے دیکھنے کے وقت سماع سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہ سماع خبر کے واسطے سے ہے اور خبر دیدار کے وقت دوری اور حجاب مشغول ہوتی ہے، تو سماع مبتدیوں کا آلہ ہے۔ اس سے غفلت اور پراگندگی جمع ہو جاتی ہے اور جو جمع ہونا ضرور ہو اس سے پراگندہ ہو جاتا ہے۔

ایک گروہ کہتا ہے کہ سماع آلہ حضور ہے اس لیے کہ محبت میں کلیت درکار ہے تاکہ کل محبت کا کل محبوب میں مستغرق نہ ہو، وہ محبت میں ناقص ہے۔ تو جیسا کہ دل کو وصل کے محل میں محبت نصیب ہوتی ہے اور سر میں مشاہدہ اور روح کو وصل اور تن کو خدمت تو چاہیے کہ کان کا نصیب بھی ہو جائے جیسے آنکھوں کو دیکھنا نصیب ہوا ہے۔ کسی شاعر نے ہزل کے محل میں خوب کہا ہے جب کہ اس نے شراب کی دوستی کا دعویٰ کیا ہے:

أَلَا فَاسْقِنِي خَمْرًا وَقُلْ لِي هِيَ الْخَمْرُ

وَلَا تَسْقِنِي سِرًّا إِذَا أَمَكَّنَ الْجَهْرُ

”یعنی مجھے شراب دے تاکہ میری آنکھیں دیکھیں اور ہاتھ چھوئیں اور ذائقہ

چکھے اور ناک سونگھے۔“

ایک حاسدان میں سے بے نصیب رہ جاتا ہے اور وہ کان ہے تو اب کہے جا کہ یہ شراب ہے تاکہ کان بھی اپنا حصہ پائے تاکہ میرے تمام حواس اس میں ہوں اور اس سے لذت پائیں۔ کہتے ہیں کہ سماع آلہ حضور ہے اس لیے کہ غائب خود غائب ہے اور غائب خود منکر ہوتا ہے اور منکر اس لائق نہیں ہوتا۔

تو سماع دو طرح پر ہوتا ہے۔ ایک بالواسطہ دوسرا بلا واسطہ۔ جو سنانے والے سے سنا جائے وہ آلہ غیبت ہوتا ہے اور جو یار سے سنا جائے وہ حضور کا آلہ ہوتا ہے۔ اسی سبب سے کسی پیر نے کہا میں مخلوق کو اس درجہ نہیں جانتا کہ اس کی بات سنوں یا اس کا ذکر کروں مگر خاصان حق اس درجہ میں ہیں۔

وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِالصَّوَابِ

مقاماتِ سماع

جاننا چاہیے کہ ان میں سے ہر ایک کا اس سماع میں ایک رتبہ ہے اس لیے کہ مشرب اور ذوقِ سماع بمقدار مرتبہ ہوتا ہے۔ جیسے تائب جو کچھ سنتا ہے اس کو مسرت اور ندامت کا تذکار ہوتا ہے اور مشتاق کے لیے شوق اور رویت کا سرمایہ ہوتا ہے اور صاحبِ یقین کو یقین کا درجہ ہوتا ہے اور مرید کے لیے بیان کی تحقیق اور محبت کو قطع تعلقات کا باعث اور فقیر کے لیے کل سے ناامیدی اور اصلِ سماع مثلِ آفتاب ہے جو سب چیزوں پر روشن ہوتا ہے۔ لیکن ہر چیز اپنے مرتبہ کے مطابق اس سے مزہ پاتی ہے۔ ایک کو روشن کرتا ہے، ایک کو پگھلا دیتا ہے اور ایک کو منور کرتا ہے۔ یہ سب گروہ جو ہم نے بیان کیے تین مرتبہ میں ہیں۔ ایک ان میں مبتدی ہے، دوسرا متوسط ہے، تیسرا کامل۔ اور میں سماع میں ہر ایک کے حال میں تین فصل بیان کرتا ہوں تاکہ تیرے قریب الفہم ہو۔

فصل:

جاننا چاہیے کہ سماع واردِ حق ہے۔ اس کی ترکیب ہزل ولہو سے مرکب ہے اور مبتدی کی طبیعت کسی حال میں قابل ذکر نہیں اور ان ربانی معنی کے وارد ہونے سے طبع کو سوز اور قہر سے بلندی اور پستی ہوتی ہے۔ جیسے کہ ایک گروہ کے لوگ سماع میں بیہوش ہو جاتے ہیں اور ایک گروہ والے ہلاک ہو جاتے ہیں، کوئی ایسا نہیں جو اعتدال سے باہر نہ جائے اور اس کے لیے دلیل ظاہر ہے اور مشہور ہے کہ روم کے شفاخانہ میں ایک عجیب باجا بنایا گیا ہے جسے ”انگلیون“ کہتے ہیں اور جس چیز میں کوئی بڑی عجیب بات ہو اس کا نام روم والے انگلیون رکھتے ہیں جیسے کشادہ صحن کو انگلیون کہتے ہیں اور مانی کی نقاشی کو بھی انگلیون کہتے ہیں اور مثل اس کے مظاہر حکمت پر ایسے نام لاتے ہیں اور اس سے مراد نہ اظہارِ حکم ہے بلکہ وہ ایک ساز ہے کھال سے منڈھا ہوا۔ ہفتہ میں دو بار مریض کو اس کے پاس لے جاتے ہیں اور اسے بجاتے ہیں اور بیمار کے مرض کے اندازے تک اسے بجاتے ہیں پھر اسے وہاں سے لاتے ہیں۔ اور جب کسی کو مارنا چاہیں تو اسے زیادہ مدت تک وہاں رکھتے ہیں حتیٰ کہ وہ ہلاک ہو جاتا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ زندگی کی مدتیں مقرر نہیں لیکن موت کے اسباب ہوتے ہیں۔ چنانچہ طبیب ہمیشہ سنتے ہیں۔ ان میں اس کا اثر ہوتا ہے، نہ ہونا چاہیے۔

اس لیے کہ وہ طبیعت کے موافق ہو گیا ہوتا ہے اور مبتدیوں کی طبیعت کے خلاف ہوتا ہے۔ اور میں نے ہندوستان میں دیکھا کہ زہر قاتل میں ایک کیڑا پیدا ہوتا ہے۔ اس کی زندگی اس زہر سے ہے اس لیے کہ وہ تمام کا تمام زہر ہوتا ہے۔

میں نے ترکستان میں ایک شہر دیکھا جو سرحد اسلامی پر ہے۔ وہاں ایک پہاڑ آتش فشاں تھا جو آگ کے شعلے دے رہا تھا اور اس کے پتھروں سے نوشادر جوش مار کر ابل رہا تھا اور اس آگ میں چوہے تھے۔ جب انہیں آگ سے باہر لایا جائے تو وہ مر جاتے تھے۔ اس بیان سے مراد صرف یہ ہے کہ مبتدیوں کے لیے یہ سب اضطراب ہوتا ہے جب ان پر وارد حق کا حلول ہو جاتا ہے تو پھر سب برداشت ہوتا ہے۔ جب متواتر کسی پر کوئی معاملہ ہو تو وہ موجب سکون بن جاتا ہے۔

کیا تو نے نہیں دیکھا کہ روح الامین جب پہلی بار حضور ﷺ کی خدمت میں آئے تو حضور ﷺ اس کی تاب نہ لاسکے۔ جب بار بار جلوہ افروز ہوئے تو پھر جبرائیل علیہ السلام ایک ساعت نہ آتے تو حضور ﷺ تنگدل ہو جاتے۔ اس کے بہت سے شواہد ہیں اور یہ حالات بھی مبتدیوں کے اضطراب کی دلیل ہیں اور منتہیوں کے سماع میں سکون کی حجت۔

اور مشہور ہے کہ حضرت جنید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ایک مرید تھا کہ سماع میں بہت بیقرار ہوتا اور درویش اس کی طرف مشغول ہوتے۔ حتیٰ کہ شیخ سے اس کی شکایت کی۔ جنید نے اسے فرمایا کہ اگر اس کے بعد تو سماع میں بیقرار ہوا تو میں تجھے صحبت سے مشرف نہ کروں گا۔ ابو محمد حریری فرماتے ہیں کہ میں سماع میں حضرت جنید کی طرف دیکھتا تھا۔ لب بند اور خاموش تشریف فرما تھے اور آپ کے بدن پر ہر بال سے چشمہ کھلا ہوا ہے۔ آپ ایک روز کامل ویسے ہی بیہوش پڑے رہے۔ میں نہیں جانتا کہ وہ سماع میں زیادہ درست تھے یا پیر کی حرمت زیادہ تھی۔ کہتے ہیں کہ ایک مرد نے سماع میں نعرہ مارا۔ پیر نے فرمایا: چپ رہ۔ اس نے سر گھٹنے پر رکھا۔ جب دیکھا تو انتقال کر چکا تھا۔

اور ابو مسلم فارس بن غالب فارسی سے میں نے سنا کہ ایک درویش سماع میں اضطراب کر رہے تھے۔ ایک نے ان کے سر پر ہاتھ رکھا اور کہا کہ بیٹھ جا۔ وہ بیٹھتے ہی انتقال کر گئے۔

حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں میں نے ایک درویش کو دیکھا۔ اس نے سماع میں جان دے دی اور حضرت دق حضرت دواج سے راوی ہیں کہ میں ابن القرظی کے ساتھ دریائے دجلہ کے کنارے پر بصرہ اور ایلہ کے درمیان جا رہا تھا۔ ایک محل دیکھا اس کے دروازے پر ایک مرد بیٹھا ہوا تھا اور ایک لونڈی اس کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی جو سرود کر رہی تھی اور یہ بیت پڑھ رہی تھی۔

فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَذَكَرَ لَكَ آقْبَلُ
كُلَّ يَوْمٍ تَتْلُونَ غَيْرَ هَذَا بِكَ أَجْمَلُ

”بہت پہلے سے مجھے تیرے ساتھ اللہ کے لیے محبت ہے، تو ہر روز رنگ بدلتا ہے تاہم تیرے لیے یہ زیادہ اجمل ہے۔“

اور ایک نوجوان کو دیکھا کہ محل کے نیچے کھڑا ہے۔ گڈری اس کے جسم پر ہے اور چھاگل ہاتھ میں اور پکار رہا ہے: اے کنیر! تجھے خدا کی قسم، یہ شعر ایک بار اور سنا دے۔ میری زندگی میں ایک سانس زیادہ نہیں ہے۔ شاید اس شعر کے سنتے ہی دم نکل جائے۔ کنیر نے وہ شعر پڑھا اور اس نوجوان نے نعرہ مارا اور جان دے دی۔ محل کے مالک نے کنیر کو آزاد کر دیا اور محل سے نیچے اتر اور اس نوجوان کی تجھیز و تکلفین کی اور بصرہ کے تمام رہنے والوں نے اس کی نماز جنازہ میں شرکت کی۔ پھر وہ پیر مرد صاحب محل نے کھڑے ہو کر کہا۔ اے بصرہ والو: میں فلاں بن فلاں ہوں۔ میں نے اپنی تمام ملکیت فی سبیل اللہ وقف کی اور سب غلام آزاد کیے، یہ کہا اور وہاں سے چل دیا۔ پھر اس کی خبر کسی کو نہ ملی۔

اس حکایت سے یہ بتانا مقصود ہے کہ مرید کو غلبہ سماع میں ایسا حال چاہیے تاکہ اس کے سماع سے گناہگار گناہوں سے نجات پائیں اور موجودہ زمانہ میں مجالس سماع یہ ہیں کہ گمراہوں کا گروہ، فاسقوں کا مجمع اس میں شریک ہوتا ہے اور کہتا ہے کہ حق طریق سے سماع کرتے ہیں۔ فاسق لوگ ان پیروں کو اپنے موافق پا کر گناہوں پر زیادہ حریص ہو جاتے ہیں اور آخر دونوں ہلاک ہو جاتے ہیں۔

لوگوں نے حضرت جنید رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ اگر ہم عبرت حاصل کرنے کی غرض سے کلیسا جائیں تو جائز ہے؟ یعنی اس ارادہ سے وہاں جائیں کہ ان کی ذلت اور کج فہمی دیکھ کر عبرت حاصل کریں اور اپنی نعمت اسلام پر شکر کریں تو پھر اس میں ہمارا مواخذہ تو نہ ہوگا۔ شیخ نے فرمایا! اگر تم ایسے ہو کہ وہاں جا کر واپس آتے ہوئے ان میں سے چند آدمی اپنے ساتھ لاسکو تو تمہارے جانے میں کوئی مضائقہ نہیں اور اگر تم اس قابل نہیں تو ہرگز نہ جاؤ اس لیے کہ اگر صاحب حجرہ شراب خانہ میں جاتا ہے تو خراباتی کہلاتا ہے اور خراباتی حجرہ میں آتا ہے تو صاحب حجرہ کہلانے لگتا ہے۔

ایک بزرگ شیخ نے فرمایا کہ میں بغداد جا رہا تھا اور ایک دریش میرے ساتھ تھا۔ میں نے ایک گویے کی آواز سنی جو یہ شعر گارہا تھا:

مَنْ نَى إِنْ تَكُنْ حَقًّا تَكُنْ أَحْسَنَ الْمُنَى
وَإِلَّا فَكُنْ عِشْنَا بِهَا زَمْنَا رَغْدًا

”جب سماعِ راسی سے ہو تو سب آرزوؤں سے بہتر ہے۔ ورنہ یقیناً ہم نے سماع میں زندگی ہی گزاری ہے۔“ اس درویش نے نعرہ مارا اور دنیا سے رخصت ہو گیا۔

ایسا ہی حضرت ابوعلیٰ رود باری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک درویش دیکھا کہ وہ گانے والے کی آواز میں محو تھا۔ میں نے بھی اس طرف کان لگائے تو وہ یہ شعر گارہا تھا۔

أَمْدُ كَفِي بِالْخُضُوعِ إِلَى الَّذِي جَادَ بِالصَّنِيعِ

”جس نے راگ سننے میں سخاوت کی اس کے پاس نزع بھی کافی ہے۔“ اس

درویش نے نعرہ مارا اور گر پڑا۔ جب میں اس کے پاس گیا تو اسے مردہ پایا۔

ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ میں حضرت ابراہیم خواص رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ راستہ میں

جا رہا تھا۔ ایک پہاڑ پر میرے دل میں طرب و خوشی محسوس ہوئی میں نے یہ شعر پڑھے۔

صَحَّ عِنْدَ النَّاسِ إِنِّي عَاشِقٌ غَيْرَ أَنْ لَمْ يَعْرِفُوا عِشْقِي لِمَنْ

مَا لَيْسَ فِي الْإِنْسَانِ شَيْءٌ حَسَنٌ إِلَّا وَاحْسَنُ مِنْهُ صَوْتُ حَسَنٌ

”لوگوں میں صحیح ہے کہ میں عاشق ہوں اور یہ نہیں جانتے کہ میں کس کا عاشق

ہوں۔ انسان میں کوئی شے اچھی نہیں۔ لیکن اس میں ایک آواز خوب ہے۔“

مجھے حضرت ابراہیم خواص نے فرمایا: یہ رباعی پھر پڑھ، میں نے پھر پڑھی۔ آپ نے چند

قدم وجد سے زمین پر مارے۔ میں نے جب دیکھا تو آپ کے قدم پتھر میں ایسے دھنسے ہوئے تھے

جیسے موم میں، پھر آپ بیہوش ہو کر گر پڑے۔ جب ہوش آیا تو فرمایا کہ میں بہشت میں تھا اور تو نے

مجھے نہ دیکھا۔ اس قسم کی حکایتیں کتاب کی گنجائش سے بہت زیادہ ہیں۔ میں نے اپنے سامنے ایک

درویش کو آذربائیجان کے پہاڑوں میں جاتا دیکھا اور وہ متفکر ہو کر یہ بیت پڑھ رہا تھا، اور زار زار

روتا تھا:

وَاللَّهِ مَا طَلَعَتْ شَمْسٌ وَلَا غَرَبَتْ

إِلَّا وَأَنْتَ مُنَى قَلْبِي وَوَسْوَاسِ

وَلَا جَلَسْتُ إِلَى قَوْمٍ أَحَدِيَّتُهُمْ

إِلَّا وَ أَنْتَ حَدِيثِي بَيْنَ جُلَّاسِ

وَلَا ذَكَرْتُكَ مَحْزُونًا وَلَا طَرَبًا

إِلَّا وَ حُبُّكَ مَقْرُونٌ بِأَنْفَاسِ

وَلَا هَمَمْتُ بِشُرْبِ الْمَاءِ مِنْ عَطَشٍ
إِلَّا رَأَيْتُ خِيَالًا مِنْكَ فِي الْكَأْسِ
فَلَوْ قَدَرْتُ عَلَى الْإِتْيَانِ لَزُرْتُكُمْ
سَحْبًا عَلَى الْوَجْهِ أَوْ مَشْيًا عَلَى الرَّأْسِ

”خدا کی قسم کوئی ایسا دن یا رات نہیں ہوئی مگر تیری دُھن مجھے لگی ہوئی ہے اور میں کسی قوم میں باتیں کرنے نہ بیٹھا مگر ہم نشینوں میں تیرا ہی ذکر کرتا ہوں اور میں نے غم یا خوشی میں تجھے یاد نہ کیا مگر تیری محبت میرے ہر سانس میں موجود رہی اور میں نے پیاس میں کبھی پانی پینے کا ارادہ نہ کیا مگر پیالہ میں تیری خالی تصویر تھی۔ اگر میں قادر ہوتا تیری ذات پر، تو سر کے بل حاضر ہوتا یا چہرہ رگڑتا ہوا پہنچتا۔“

یہ اشعار پڑھتے ہوئے اس کے چہرے پر تغیر ہوا۔ تھوڑی دیر وہ پتھر کے سہارے سے بیٹھا اور جان دے دی۔

فصل:

اور مشائخ کے ایک گروہ نے قصائد اور اشعار اور قرآن مجید کا بالحن سننا اور ایسے الحان میں پڑھنا مکروہ کہا ہے۔ جو اس کی حد سے نکل جائے اور اس طرح گانے سے مردوں کو ڈرایا ہے اور خود اجتناب کیا ہے اور ممانعت میں مبالغہ کیا ہے۔ اور یہ چند گروہ ہیں اور ہر گروہ کے لیے اس میں علت اور وجہ ہے۔ ایک گروہ وہ ہے کہ اس طرح گانے پر حرام کی روایتیں دی ہیں اور گذشتہ لوگوں کے اتباع میں ان کے مقلد ہوئے ہیں۔ جیسا کہ حضور ﷺ کا حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کی کنیز شیریں کو سرود کرنے پر منع فرمانا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک صحابی کو جو سرود کر رہا تھا ڈرے مارے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو گانے والی کنیزوں سے روکا۔ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کو حبشیہ مغنیہ کے دیکھنے سے منع کیا گیا اور فرمایا کہ وہ شیطان کی ہمنشیں ہے۔ اور مثل اس کے یہ بھی کہتے ہیں کہ ہماری بڑی غناء کی کراہت پر اجماع امت ہے۔ ہمارے زمانہ میں اور ہم سے پہلے لوگ اس امر پر متفق ہیں کہ غناء مکروہ ہے حتیٰ کہ ایک گروہ اسے حرام کہتا ہے۔

اور اس قسم کے اقوال حضرت ابوالحارث بنانی رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہیں۔ منجملہ ان کے یہ ایک قول ہے کہ فرماتے ہیں: میں سماع میں اس حد تک تھا کہ ایک رات کو ایک شخص میرے حجرے

کے دروازے پر آیا اور کہا کہ طالبانِ حضور حق کی جماعت جمع ہے اور ابو الحارث کی زیارت کی مشتاق ہے۔ میں نے کہا کہ چلو اور باہر آیا۔ میں ابھی کچھ دیر اس کے پیچھے چلا تھا کہ ایک جماعت کے پاس پہنچا جو حلقہ باندھے بیٹھی تھی۔ ان کے درمیان ایک ضعیف العمر تشریف فرما تھے۔ انہوں نے میری تعظیم کی اور مجھ سے اجازت مانگی کہ چند بیت پڑھیں۔ میں نے اجازت دے دی۔ وہ خوش اخلاقی سے بیت پڑھنے لگے۔ جس کا مضمون فراق کا شکوہ تھا۔ اتنے میں سب وجد کی حالت میں کھڑے ہو گئے اور نعرے مارنے لگے اور لطیف اشارے کر رہے تھے۔ میں ان کے حال پر تعجب کرتا تھا۔ حتیٰ کہ صبح ہو گئی۔ پھر اس ضعیف العمر نے مجھے کہا کہ آپ نے یہ نہیں پوچھا کہ میں کون ہوں اور یہ اہل حلقہ کون ہیں۔ میں نے کہا کہ تیرا اقبال مجھ سے سوال سے روکتا ہے۔

اس نے کہا میں عزازیل ہوں جسے ابلیس کہتے ہیں اور یہ سب میرے بچے ہیں اور اس طرح بیٹھنے اور غناء کرنے میں مجھے دو فائدے ہیں۔ ایک یہ کہ میں خود مصیبت فراق میں ہوں اور خوش نصیبی کا زمانہ یاد کرتا ہوں۔ دوسرے پارسا لوگوں کو اس طرح گمراہ کر لیتا ہوں اور انہیں غلطی کا شکار کر لیتا ہوں۔ حضرت ابو الحارث بنانی فرماتے ہیں اس وقت سے میرے دل سے سماع کا خیال جاتا رہا۔

اور میں علی بن عثمانی جلابی (رحمۃ اللہ علیہ) کہتا ہوں کہ میں نے شیخ امام ابو العباس اشقانی سے سنا کہ وہ فرماتے تھے کہ ایک دن میں ایک مجلس میں تھا۔ ایک گروہ سماع کر رہا تھا۔ میں نے ان کے مابین شیاطین دیکھے کہ ناچ رہے تھے اور اس جماعت کی طرف توجہ کرتے تھے۔ یہ حلقہ اس سے گرم ہوتا تھا دوسرا گروہ اس خوف سے کہ مرید بیہودگی اور بلا میں مبتلا نہ ہوں اور ان کی تقلید نہ کریں اور توبہ ترک کر کے گناہ کی طرف رجوع نہ کریں اور خواہشِ نفسانی ان میں قوی نہ ہو جائے اور ہوس کا ارادہ ان کی صلاحیت فتح نہ کر دے کیونکہ وہ محلِ بلا اور سرمایہ فساد ہے اور سماع میں مشغول نہ ہو جائیں، ان میں نہ بیٹھے۔

اور حضرت جنید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے اپنے مرید کو ابتداءً توبہ کے وقت کہا کہ اگر تو اپنا ایمان سلامت چاہتا ہے اور توبہ کی رعایت کرنا چاہتا ہے تو اس سماع سے جو صوفی کرتے ہیں، منکر ہو جا اور اپنے کو اہل سماع سے نہ سمجھ، جب تک تو جوان ہے اور جب بوڑھا ہو جائے تو اپنے گناہوں پر ملامت کر اور یہ بھی کہتے ہیں کہ اہل سماع کے دو گروہ ہیں۔

ایک لاہی۔۔۔۔ دوسرا الہی

لاہی تو عین فساد ہے اور اللہ تعالیٰ سے بے خوف ہے۔

اور الہی مجاہدات و ریاضیات کے انہماک میں مخلوق سے دل قطع کیے ہوئے اور موجودات سے روگردان اور فتنوں کو اپنی ذات سے دور رکھے ہوئے ہیں اور اس قسم کی جماعت سے بے غم ہیں وہی کامیاب ہیں۔ پھر ہم نے اس گروہ میں دیکھا تو ہمیں ان کی ترکیب اچھی نظر آئی اور اس چیز سے جو ہمارے وقت کے موافق ہے مشغول ہونا اچھا معلوم ہوا۔

ایک گروہ کہتا ہے کہ جب سماع میں عام فساد ہے اور ہمارے سننے سے عوام کا اعتقاد پراگندہ ہوتا ہے اور ہماری وجہ سے عوام اس سے حجاب میں ہیں اور ہمارے ہی سبب سے گناہگار ہوتے ہیں تو ہمارا فرض ہے کہ عوام پر شفقت کریں اور خواص کو نصیحت کریں تاکہ وہ اسے ترک کر دیں۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ اغیاء کو نصیحت ہو جائے گی اور اس فتنہ کو مٹانے کے لیے یہ طریق کافی ہے۔ ایک گروہ کہتا ہے حضور ﷺ نے فرمایا ہے۔ **مِنْ حُسْنِ إِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْكُ مَا لَا يَنْعِنِيهِ**۔ ”اسلام میں انسان کی خوبی یہ ہے کہ ان باتوں کو چھوڑ دے جن کا نتیجہ کچھ نہ ہو اور اسے اختیار کرے جو ضروری ہے۔“ اور بیہودہ باتوں میں مشغول ہونا تفسیح اوقات ہے اور دوستوں کے ساتھ کہ دوست کا وقت عزیز ہوتا ہے اسے ضائع نہیں کرنا چاہئے اور دوسرے خاص گروہ نے کہا ہے کہ سماع خبر ہے اور اس کی لذت مراد کا حاصل کرنا اور یہ بچوں کا کام ہے۔ ظاہر میں خبر کی کیا قدر ہے، تو مشاہدہ کا کام ہی رکھنا چاہیے۔ یہ ہیں احکام سماع کہ ہم نے مختصر بیان کیے۔ اب وجد اور وجود اور تواجد پر ایک باب مرتب کیا گیا ہے۔ **وَبِاللّٰهِ التَّوْفِیْقُ**



وجد، وجود، تواجد

جاننا چاہیے کہ وجد اور وجود مصدر ہیں۔ ایک کے معنی غم ہیں اور دوسرے کے معنی پانا ہیں۔ جب دونوں کا قائل ایک ہوتا ہے تو ان میں مصدر کے سوا فرق نہیں ہو سکتا۔ جیسے کہتے ہیں: وَجَدَ يَجِدُ وَجُودًا وَوَجَدَانًا. اس میں معنی ”پالینے“ کے ہیں اور وَجَدَ يَجِدُ وَوَجَدَانًا کہیں گے تو ”اندوہ گیس ہونے کے معنی ہوں گے اور جب وَجَدَ يَجِدُ وَوَجَدَانًا کہیں گے تو ”توانگر“ کے معنی لیے جائیں گے اور وَجَدَ يَجِدُ وَوَجَدَانًا ”جب غصہ میں ہونا ہو۔“

ان سب کا فرق مصدروں سے معلوم ہوتا ہے، فعلوں میں فرق نہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ فرق ان کا مصدر سے ہے نہ کہ افعال سے اور مراد اس گروہ کی وجد اور وجود سے اثبات وصال کا کرنا ہے جو بحالت سماع ان میں پیدا ہوتا ہے۔ کیونکہ ایک قرین غم ہوتا ہے اور دوسرا حصول مراد سے کامیاب ہوتا ہے اور اندوہ کی حقیقت محبوب کا غم ہو جانا اور مراد سے رک جانا ہے اور پانا حصول مراد ہے اور حزن اور وجد میں یہ فرق ہے کہ حزن اس غم کا نام ہے جو اپنے نصیب میں ہو اور وجد اس غم کو کہتے ہیں جو غیر کے نصیبِ محبت کی وجہ پر ہو اور یہ سب تغیرات طالب کی صفات ہیں: وَالْحَقُّ لَا يَتَغَيَّرُ ”اور حق نہیں بدلتا“ اور وجد کی کیفیت عبارت سے بیان نہیں ہو سکتی اس لیے کہ وہ ایک الم ہے اور دیکھنے کے بعد الم کو قلم سے بیان نہیں کیا جاسکتا۔ تو وجد طلب و مطلوب ہے۔ ایک راز ہوتا ہے جس کا بیان کشفِ غیب میں ہوتا ہے اور کیفیت سے وجود نشان ہے اور اشارہ کا اس میں دخل نہیں کیونکہ یہ بحالت مشاہدہ خوش ہے اور خوشی طلب سے نہیں ملتی اور وجود ایک فضیلت ہے جو محبوب سے محبت کو ملتی ہے اور اس میں اشارہ کو دخل نہیں۔

اور میرے نزدیک وجد المِ قلبی ہے خواہ وہ خوشی سے ہو یا غم سے یا تکلیف یا آرام سے اور وجود دل سے غم کا آلہ ہے اور اس سے سچی محبت اور مراد ہوتی ہے اور وجد کی صفت یہ ہے کہ بحالت حجاب جوش و ہوش کے سبب حرکت میں آئے۔ ایسے حال میں کہ اس پر کشف ہو۔ اِمَّا زَفِيرٌ وَاِمَّا نَفِيرٌ وَاِمَّا حَنِينٌ وَاِمَّا اِنِينٌ اِمَّا عَيْشٌ وَاِمَّا طَيْشٌ وَاِمَّا كَرْبٌ وَاِمَّا طَرْبٌ. ”ٹھنڈے سانس لینا یا چلانا رونا یا زاری غم میں کرنا خوشی یا غصہ، رنج یا فرحت کا اظہار کرنا۔“

اس میں مشائخ مختلف ہیں کہ وجد کامل ہے یا وجود۔ ایک جماعت کہتی ہے کہ وجود صفت مریدوں کی ہے اور وجد صفت عرفاء ہے۔ جب عارفوں کا درجہ مرید سے بلند ہے تو لازمی ہے کہ ان کا وصف ان سے کامل تر ہو۔ اس لیے کہ جو چیز دریافت کے تحت میں آئے، وہ سمجھی گئی اور وہ صفت جو جنس ہے وہ ادراک سے بالا۔ اور ظاہر ہے کہ ادراک حد کو چاہتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی ذات حد سے بالا و برتر ہے۔ تو بندہ نے جو کچھ پایا وہ مشرب ہے اور چونہ پایا اس کا طالب ہے اور یہاں طلب منقطع اور طالب عاجز ہے اور واعد کو اس حقیقت حق کا طالب کہا جاسکتا ہے۔ اور اگر کہیں کہ وجد مردوں کے سوز کا نام ہے اور وجود تحفہ مجبان ہے اور محبوبوں کا درجہ مریدوں سے بلند ہوتا ہے تاکہ تحفہ سے کامل آرام حاصل ہو اور سوز میں طلب کا درجہ کم ہے اور یہ معنی ایک حکایت کے بغیر واضح نہ ہوں گے اور وہ حکایت یہ ہے:

ایک روز حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ غلبہ حال میں حضرت جنیدؒ کی خدمت میں آئے اور آپ کو غمناک پایا۔ پوچھا اے شیخ! کیا بات ہے؟ جنید نے فرمایا: مَنْ طَلَبَ وَجَدَ ”جس نے ڈھونڈا پایا۔“ حضرت شبلی نے عرض کیا: مَنْ وَجَدَ طَلَبَ صحیح ہے ”جس نے پایا اس نے طلب کیا۔“ پھر مشائخ نے اس میں بیان کیا ہے کہ شبلی نے یہ اس لیے کہا کہ وجد سے ایک نشان دیا۔ دوسرے نے وجود کی طرف اشارہ کیا۔ میرے نزدیک حضرت جنیدؒ کا قول معتبر ہے۔ اس لیے کہ جب میں نے پہچانا کہ معبود ہماری جنس سے نہیں تو اُسے غم زیادہ ہوتا ہے اور اس کے متعلق اس کتاب میں ذکر ہو چکا اور مشائخ رضی اللہ عنہم کا اتفاق ہے کہ سلطان کا علم سلطان وجد سے زیادہ قوی ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ جب سلطان وجد قوی ہے تو درجہ محل خاطر میں ہوتا ہے اور جب سلطان علم قوی ہوتا ہے تو علم محال امن میں ہوتا ہے اور اس سبب سے یہ مراد ہے کہ ہر حال میں چاہیے کہ طالب علم اور تبع شرع ہو کیونکہ جب وجد میں مغلوب ہوتا ہے تو اس سے خطاب اُٹھ جاتا ہے اور جب خطاب اُٹھ گیا تو ثواب و عذاب بھی اُٹھ گیا اور جب ثواب و عذاب جاتا رہا، عزت اور اہانت بھی جاتی رہی۔ اس وقت اس کا حکم دیوانوں کا حکم ہوتا ہے۔ اولیاء و مقربین کا ان پر حکم نہیں ہوتا۔ جب علم کی سلطنت حال کی سلطنت پر غالب ہوئی تو بندہ امر و نہی کی پناہ میں آیا اور عزت کے خیمہ میں پردہ نشین اور ہمیشہ مشکور ہوتا ہے۔

پھر جب سلطان حال سلطان علم پر غالب ہوتا ہے تو بندہ حدوں سے باہر آ جاتا ہے اور اپنے محل نقص میں خطاب سے محروم رہتا ہے۔ اس حال میں معذور ہوتا ہے یا مغرور۔ بعینہ یہی حضرت جنیدؒ کا قول ہے جو انہوں نے فرمایا کہ راستے دو ہیں۔ ایک علم سے، ایک عمل سے۔ جو عمل

بے علم ہو اگرچہ اچھا ہو مگر جہالت اور نقص ہوتا ہے اور علم اگرچہ بے عمل ہو عزت اور شرف ہوتا ہے۔
اسی وجہ میں حضرت ابو یزید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: كُفْرُ أَهْلِ الْهَيْمَةِ أَشْرَفُ مِنْ إِسْلَامِ
أَهْلِ الْمُنْيَةِ۔ اہل ہمت کا کفر اشرف ہے کہ وہ کفر ان صورت پذیر نہیں ہوتا۔ لیکن اگر فرض کریں تو
اہل ہمت با کفر اہل نیت با ایمان سے بہتر ہے۔ اور جنید رحمۃ اللہ علیہ نے شبلی کو فرمایا: الشُّبْلِيُّ
سَكْرَانٌ وَلَوْ أَفَاقَ مِنْ سَكْرِهِ لَجَاءَ مِنْهُ مُنْذِرٌ مَا يَنْفَعُ بِهِ "شبلی مستی میں ہے اگر ہوش میں ہوتا تو
البتہ ایسا منذر ہوتا جس سے کوئی نفع نہ پاتا۔"

مشہور حکایتوں میں ہے کہ حضرت جنید اور محمد بن مسروق اور ابوالعباس بن عطار رحمہم اللہ
ایک جگہ جمع تھے اور ایک قوال بیت گارہا تھا۔ یہ تواجِد میں تھے، مگر حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ سکون میں
تشریف فرما تھے۔ انہوں نے کہا اے شیخ! آپ کو اس سماع سے کوئی حظ نہیں۔ آپ نے یہ آیت
کریمہ پڑھی۔ ﴿تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَهِيَ تَمْرٌ مَرَّ السَّحَابِ ط﴾ (۱) "تو اُسے بے حس خیال کرتا ہے
اور وہ بادلوں کی طرح چلتا ہے اور وجد کی حالت میں۔"

تواجِد عین تکلف ہے اور یہ انعام اور شواہد حق کا اس پر جوش ہے اور وصل کی فکر اور تمنا
مردوں کی چال ہے۔ ایک گروہ رسمی ہے جو حرکات ظاہری کی تقلید کرتا ہے اور رقص کی ترتیب کرتا
ہے۔ ان کے اشارات کو آرائش دیتا ہے اور یہ حرام ہے۔ ایک گروہ محقق ہے اس کی مراد حرکات
اور رسوم سے حالات اور درجہ کا طلب کرنا ہے۔
حضور ﷺ نے فرمایا: مَنْ تَشَبَهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ . (۲) "جس نے کسی قوم کی

۱۔ سورۃ النمل: ۸۸

۲۔ اسے امام ابوداؤد نے اپنی "سنن" میں، امام طبرانی نے "المعجم الکبیر" میں اور امام احمد بن حنبل نے اپنی
"مسند" میں بطریق ابی معین الجرجانی ابن عمر سے مرفوعاً روایت کیا ہے، امام عراقی نے اس کی سند کو صحیح کہا ہے،
امام سیوطی اسے "الجامع الصغیر" میں لائے ہیں اور اسے حسن قرار دیا ہے اور ابوداؤد نے ابن عمر رضی اللہ
عنہما کی طرف منسوب کیا ہے، امام طبرانی نے اسے بطریق حدیفہ "المعجم الاوسط" میں ذکر کیا ہے۔
امام مناوی کہتے ہیں کہ اس کی سند میں عبدالرحمن بن ثابت بن ثوبان ہے جو ضعیف راوی ہے جیسا کہ امام
مندری نے کہا ہے، امام سخاوی نے "المقاصد الحسنیہ" میں اس کی سند کو ضعیف کہا ہے لیکن اس کی شاہد
روایات موجود ہیں۔

امام ابن تیمیہ نے "اقتضاء الصراط المستقیم" میں اس کی سند کو جید کہا ہے، ابن حجر نے "فتح الباری"
میں اس کی سند کو "حسن" قرار دیا ہے، امام بیہقی "مجمع الزوائد" میں رقمطراز ہیں کہ: امام طبرانی نے
"المعجم الاوسط" میں اسے روایت کیا ہے اس کی سند میں علی بن غراب ہے جس کو کئی ایک نے ثقہ کہا
ہے اور ایک جماعت نے اسے ضعیف قرار دیا ہے (بقیہ حواشی اگلے صفحہ پر۔۔۔۔۔)

مشابہت کی وہ انہیں میں سے ہے۔“ اور یہ بھی فرمایا: إِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ فَابْتِغُوا فِيهِ مَبْرُورًا مِّنْهُ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ۔ اس خبر سے اباحت تو اجد ظاہر ہوتی ہے۔

اور اسی سبب سے اس پیر نے کہا ہزار فرسنگ جھوٹ پر چلتا ہوں، اس سے ایک قدم راستی پر آتا ہے اور اس باب میں بہت زیادہ بیان ہے۔ لیکن میں اس پر اختصار کرتا ہوں۔ واللہ اعلم۔



(بقیہ حواشی گزشتہ صفحہ سے)

اور اس کے باقی راوی ثقہ ہیں اور امام مناوی کہتے ہیں: اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ طبرانی کی سند ابوداؤد کے طریق سے زیادہ اہل ہے۔ حوالہ کے لیے:

مسند الامام احمد ۵۰/۲، سنن ابی داؤد (باب: فی لبس الصوف والشعر) (۴۰۳۱)،
المقاصد الحسنیة للسرخاوی (۱۱۰۱) تمییز الطیب من الخبیث (۱۳۶۹)، کشف
الخفا (۲۴۳۶) الدرر المنثرة للسيوطی (۳۸۵)، الجامع الصغیر للسيوطی (۸۵۹۳)
فیض القدیر للمناوی ۱۰۴/۶، الفوائد المجموعۃ للشوکالی (ص: ۲۵۴) مسند
الشہاب للقضاعی ۲۴۴/۱، مشکل الآثار للطحاوی ۸۸/۱، تاریخ ابن عساکر ۶۹/۱،
اقتضاء الصراط المستقیم (۳۹)، تخریج احادیث الاحیاء للعراقی ۳۴۱/۱۔

رقص اور متعلقاتِ رقص

جاننا چاہیے کہ شریعت اور طریقت میں رقص کی کچھ اصل نہیں، البتہ بطریق ہزل ہو تو لغو ہے۔ اس لیے کہ جب کوشش کر کے کیا جائے تو سب عقلاء اسے لہو کہتے ہیں۔ اور مشائخ سے کسی نے اسے اچھا نہیں جانا اور جو بطور پھرتی اور بناوٹ کے ہو اور وہ مشائخ میں ملے ہوئے ہیں اور بنا بنا کر اثر جماتے ہیں، وہ سب باطل ہے۔ اور جب وجدی حرکت اور عمل تو اجد کے مانند ہو اور اہل ہزل اس کی تقلید کریں اور اس میں غلو کر کے اس سے ایک مذہب بنالیں وہ بھی باطل ہے۔ میں نے عوام میں ایک گروہ دیکھا جن کا یہ خیال تھا کہ تصوف کے اندر یہ بھی ایک مذہب ہے۔ انہوں نے یہ اختیار کیا اور ایک گروہ اس کی اصل کا منکر ہے۔

غرضیکہ ناچنا شرعاً و عقلاً برا ہے۔ سب لوگوں نے اسے مومن سے محال مانا ہے اور کہا ہے کہ افضل لوگ ایسا کام نہیں کرتے۔ البتہ جب اس سے دل میں خفت حاصل ہو اور خفقان غالب آجائے۔ اور وقت زور دے اور حال اپنا اضطراب بیدار کرے اور ترتیب رسوم ظاہر ہو۔ اس سے جو اضطراب ہو وہ رقص ہے نہ کہ ناچنا کو دنا۔ اس میں طبع پروری نہیں ہوتی بلکہ جان کا گداز کرنا ہوتا ہے اور وہ شخص طریق صواب سے بعید ہے جو اس کی کیفیت کو رقص کہتا ہے اور ایسی حالت ہے کہ اس کی ترجمانی زبان سے نہیں ہو سکتی۔ مَنْ لَمْ يَذُقْ لَا يَذُرِي النَّظْرَ فِي الْأَخْدَابِ ”جس نے ذوق عرفان نہیں چکھا وہ جوانوں کی طرف نظر کرنا نہیں جانتا۔“ غرضیکہ جو انان عشق کی طرف دیکھنا، ان کی صحبت میں بیٹھنا خطرناک ہے اور اسے جائز کہنے والا کافر طریقت ہے اور جو اثر اس میں بیان کرتے ہیں وہ نادان اور واہیات ہیں۔ میں نے جاہلوں کا ایک گروہ دیکھا جو جوانوں کی تہمت سے اہل طریقت سے منکر تھا۔ میں نے دیکھا کہ انہوں نے ایک مذہب بنایا ہے۔

اور مشائخ رحمۃ اللہ علیہم ہر حال میں اسے آفت جانتے ہیں اور یہ حلویوں کا ایک نشان

اولیاء اللہ اور صوفیوں میں رہا ہے۔ وَاللَّهِ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ



جامہ درمی

جاننا چاہیے کہ کپڑے پھاڑنا گروہِ صوفیاء میں ایک جماعت میں رہا ہے اور بڑے بزرگوں کی مجلسوں میں یہ کام ہوا ہے۔ میں نے عالموں کا ایک گروہ دیکھا کہ وہ رقص کا منکر تھا اور کہتا تھا کہ کپڑے پھاڑنا درست نہیں بلکہ فساد ہے، اور یہ محال ہے کہ جس فساد سے ضلالت مراد ہو وہ بہتر بھی ہو اور اکثر لوگ سالم کپڑے پھاڑتے اور قطع کرتے ہیں، پھر سیتے ہیں۔ چنانچہ آستین، تنا اور جیب و داماں علیحدہ علیحدہ کر کے سیتے ہیں۔

تو اس میں کچھ فرق نہیں کہ کپڑے کے سوٹکڑے کریں اور ملا کر سیمیں اور پانچ ٹکڑے کریں اور سیمیں۔ اس لیے کہ کپڑے کا ٹکڑا سینے سے مومن کے دل میں راحت ہوتی ہے اور اس کی ضرورت عام ہوتی ہے۔ تو جو کپڑے گدڑی پر سیتے ہیں تو اس کی طریقت میں اصل نہیں۔

البتہ سماع میں بحالتِ صحت حواس پھاڑنا نہ چاہیے کہ وہ اسراف اور فضول خرچی ہے۔ لیکن اگر سننے والے کو غلبہ ہو جیسے حکم الہی ادا نہ ہو سکے اور بے خبر ہو تو معذور ہے۔ جب ایک کا یہ حال ہو اور ایک گروہ اس کی موافقت میں کپڑے پھاڑے تو روا ہے اور طریقت میں کپڑا پھاڑنے والے تین طرح کے ہوتے ہیں۔

ایک درویش جو خود حالتِ سماع میں مغلوب ہو کر خود کپڑے پھاڑے۔ دوسرا وہ کہ اپنے پیر اور پیشوا کے حکم سے کپڑے پھاڑے۔ وہ یا تو گناہ سے استغفار کرنے کی صورت میں یا سکر کی اور وجد کی حالت میں۔ اور ان سب سے کپڑے پھاڑنا مشکل ہوتا ہے، جو سماع سے ہو۔ یہ دو طرح پر ہوتا ہے: ایک مجروح کپڑا، دوسرا درست کپڑا۔

مجروح کپڑے کی دو شرطیں ہیں: یا تو پھاڑنے کے بعد سیمیں اور بعد میں پہن لیں یا پھاڑنے کے بعد درویشوں میں تبرکاً تقسیم کریں۔

لیکن جب درست ہو تو دیکھنا چاہیے کہ کپڑا پھاڑنے سے درویش کی کیا مراد ہے۔ اگر قوال کو دینے کا ارادہ ہو تو اُسے ہی دینا چاہیے اور اگر جماعت کو دینا منظور ہو تو اسی کو دینا چاہیے اور اگر اس نے یونہی ڈال دیا تو پیر کے حکم کا انتظار کرنا چاہیے اور اگر وہ جماعت کو تقسیم کرنے کا حکم دیں

تو وہ پھاڑ کر تقسیم کریں یا ایک درویش کو دینا چاہیں دے دیں یا قوال کے حوالے کر دیں۔ اگر قوال کو دینا ہو تو درویش کی مراد اور اتفاق شرط نہیں۔

اور جب اتفاق کے بعد دینا ہو تو درویش کا کپڑا قوال کو نہ دے کیونکہ یہ نالائق کو دینا ہے اور وہ کپڑا اگر درویش نے حالت اختیار میں دیا ہوگا یا حالت اضطرار میں، دوسروں کو اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔ اور اگر جماعت کے ارادہ پر کپڑا جدا کیا ہے یا اس کی مراد کے بغیر تو اس کی موافقت شرط ہے۔ جب کپڑا پھینکنے میں اتفاق کیا گیا ہو تو پھر پیر کو زیبا نہیں کہ وہ درویشوں کا کپڑا قوال کو دے۔ لیکن یہ جائز ہے کہ اس کا محبت جو چاہے کرے درویشوں کو دے یا سب پھاڑ کر تقسیم کرے۔ اور اگر کپڑا مغلوبیت کی حالت میں گر پڑا ہو تو اس میں مشائخ کا اختلاف ہے۔ اکثر کہتے ہیں کہ قوال کو دینا چاہیے کیونکہ اس میں حدیث ہے۔ مَنْ قَتَلَ قَتِيلًا فَلَهُ سَلْبُهُ (۱) ”جس نے عاشق کو قتل کیا اس کا لباس اسی کے لیے ہے۔“ اگر وہ قوال کو نہ دیں تو شرط طریقت سے باہر ہو جاتے ہیں۔

ایک اور گروہ کہتا ہے کہ اس میں پیر کو بھی اختیار ہے۔ جیسا کہ مذہب فقہ میں کہ بادشاہ کی اجازت کے بغیر مقتول کا کپڑا قاتل کو نہیں دیتے۔ یہاں بھی یہ کپڑا بدون حکم پیر کے، قوال کو نہ دینا چاہیے۔ لیکن اگر کسی پیر کو نہ دینا چاہے تو بھی کچھ مضائقہ نہیں۔ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ



۱. مَنْ قَتَلَ قَتِيلًا فَلَهُ سَلْبُهُ .

ترجمہ: ”جس نے (میدان جنگ میں) کسی کو قتل کیا تو مقتول سے چھینی گئی اشیاء قتل کرنے والے کے لیے ہوں گی۔“

حوالہ کے لیے:

سنن ابی داؤد (کتاب الجہاد، ۱۲۳، ۱۳۶) مسند الإمام احمد بن حنبل ۳/۱۱۳، ۱۲۳،

۱۹۰، ۲۷۹، ۱۲/۵، جامع ترمذی (کتاب السیر)

آدابِ سماع

جاننا چاہیے کہ شرطِ ادبِ سماع یہ ہے کہ جب تک ضرورت نہ ہو، سماع نہ کرے اور اسے عادت نہ بنائے اور دیر کے بعد کرے تاکہ اس کی عظمت دل سے نہ جائے۔ یہ بھی لازم ہے کہ جب سماع کرے تو شیخ وہاں حاضر ہو اور عوام سے وہ جگہ خالی ہو۔ یہ بھی ضروری ہے کہ قوال صاحبِ عزت ہو اور دل شغلوں سے خالی ہو اور طبیعت لہو و لعب سے متنفر ہو اور تکلف درمیان نہ ہو اور جب تک قوتِ سماع پیدا نہ ہو، یہ شرط نہیں کہ تو اس میں مبالغہ کرے۔

جب قوتِ سماع قوی ہو جائے تو اسے اپنے آپ سے ہٹانا شرط نہیں اور قوتِ سماع کا تابع ہو جائے یعنی جو اس کا مقتضاد ہو وہی کرے۔ اگر وہ قوت ہلائے تو ہلے، اگر ٹھہرائے تو ٹھہرا رہے اور قوتِ طبع اور سوز اور وجد میں فرق کرے اور چاہے کہ سننے والے کو اس قدر طاقت دیدار ہو کہ وارد حق قبول کر سکے اور اس کی داد دے سکے۔ اور جب اس کا غلبہ دل پر ظاہر ہو تو، تکلف سے اسے اپنے آپ سے دفع نہ کرے اور جب اس کی قوت ٹوٹ جائے تو تکلف سے جذب نہ کرے اور چاہئے کہ حرکت کی حالت میں کسی سے مدد کی امید نہ رکھے اور اگر کوئی مدد کرے تو منع نہ کرے اور اس کا اس کی نیت میں امتحان نہ کرے کیونکہ اس میں آزمانے والے کو بہت پریشانی اور بے برکتی ہوتی ہے اور کسی کے سماع میں دخل نہ دے تاکہ اس کا وقت پراگندہ نہ ہو اور اس کے روزگار میں تصرف نہ کرے۔

اور چاہیے کہ اگر قوال خوش گو ہو تو اسے یہ نہ کہے تو نے خوب کہا ہے اور اگر ناخوش کہے تو اسے بُرا نہ کہے۔ یا اگر شعر ناموزوں کہے جو طبع کو پریشان کرے تو یہ نہ کہے کہ اچھا کہو اور دل میں اس سے غصہ نہ کرے اور اسے درمیان نہ دیکھے بلکہ سب حوالہ حق کرے اور وہ درست سنے اور اگر کسی گروہ کو سماع میں دیکھے تو اس کو اس سے فائدہ نہ ہو تو یہ شرط نہیں کہ اپنی ہوشیاری میں اس کی مستی نہ دیکھے اور چاہیے کہ اپنے وقت میں با آرام ہو۔ اس سے اسے فائدہ ہوگا اور سلطانِ وقت کی عزت کرے تاکہ اس کی برکتیں اسے ملیں۔

اور میں علی بن عثمان جلابی (رحمۃ اللہ علیہ) کہتا ہوں کہ مجھے وہ پسند ہے کہ مبتدیوں کو سماع

میں نہ چھوڑیں تاکہ ان کی طبیعت پریشان نہ ہو کیونکہ اس میں بڑے خطرے ہیں اور آفت ہے۔ اس لیے کہ عورتیں چھت سے یا بلند مکان سے انہیں ان کی حالتِ سماع میں دیکھیں اور اس سبب سے سننے والے کو سخت حجاب پڑتے ہیں اور چاہیے کہ جوان بچوں کو بھی اس کے درمیان نہ بٹھائیں اور ایسا نہ ہو کہ اس کے بعد جاہل صوفیوں نے ان باتوں کو مذہب بنا رکھا ہو اور سچ کو درمیان سے دور کر دیا ہو اور میں اس جنس کی آفتوں سے جو مجھ پر گزریں استغفار کرتا ہوں اور خداوند تعالیٰ سے مدد چاہتا ہوں تاکہ میرے ظاہر و باطن کو آفات سے بچائے اور میں اس کتاب کے پڑھنے والوں کو وصیت کرتا ہوں کہ وہ اس کتاب کے حکموں کی رعایت رکھیں۔ **وَبِاللّٰهِ التَّوْفِیْقُ**

وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوَةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِهِ مُحَمَّدٍ
 وَاٰلِهِ وَاَصْحَابِهِ اَجْمَعِیْنَ وَسَلِّمْ تَسْلِیْمًا كَثِیْرًا كَثِیْرًا بِرَحْمَتِكَ
 يَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ ۝ اٰمِیْنُ ثُمَّ اٰمِیْنُ



عمدۃ الاصفیاء مخدوم الاولیاء حضرت علی بن عثمان بن علی
 ہجویری المعروف حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی
 تصنیف لطیف "کشف المحجوب" اپنی اصل زبان فارسی
 اور مختلف مترجمین کے تراجم کے ساتھ بارہا زیور طبع سے
 آراستہ ہو چکی ہے۔ کشف المحجوب کی طباعت کے حوالہ سے
 زیر نظر "معیاری نسخہ" کی اولین اشاعت محکمہ اوقاف و مذہبی
 امور پنجاب کے زیر اہتمام مرکز معارف اولیاء داتا دربار کپلیکس
 کی طرف سے منصف شہود پر آئی۔ جس کو علمی، دینی اور روحانی
 حلقوں میں خصوصی پذیرائی میسر آ رہی ہے۔

زیر نظر "معیاری نسخہ" کو متعدد وجوہ سے امتیازی مقام
 حاصل ہے۔ پہلی وجہ اس کا ترجمہ ایک مستند اور روحانی
 امانتوں کے امین عالم دین حضرت علامہ ابوالحسنات سید محمد
 احمد قادریؒ کی نوک قلم کا شاہکار ہے۔ دوسری وجہ اس کا
 دیباچہ ہے جو ماضی قریب کے عظیم محقق حکیم محمد موسیٰ امرتسریؒ
 کی تحقیق کا نہایت جامع ثمرہ ہے۔ اور تیسری اور اہم وجہ اس
 کتاب میں آیات و احادیث کی تخریج اور تدوین جدید کا
 اہتمام کیا گیا ہے، جس کا سہرا ممتاز مذہبی سکالر ڈاکٹر خالق
 داد ملک اور ڈاکٹر سید طاہر رضا بخاری (زید مجدہما) کے سر ہے۔
 حقیقت یہ ہے کہ کشف المحجوب کی یہ اشاعت
 عصر حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہے، کسی دور میں حوالہ
 جات یا تو سرے سے ہی نہیں ہوتے تھے یا ناقص ہوتے
 تھے۔ لیکن آج اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ حوالہ جات
 مکمل ہوں۔ کشف المحجوب کی یہ اشاعت ان خوبیوں کی بنیاد
 پر نہایت عمدہ ہے۔ اور اس سلسلے میں بالخصوص ڈاکٹر سید طاہر
 رضا بخاری کی کاوشیں لائق صد تحسین ہیں۔ جو ہر وقت بہتر
 سے بہترین کی تلاش میں رہتے ہیں۔ جس کی واضح دلیل
 کشف المحجوب کا یہ "معیاری نسخہ" ہے۔

مکتبہ شمس و قمر (بھائی چوک لاہور) کو مبارکباد پیش کرتا
 ہوں کہ انہوں نے اس خوبصورت کاوش کو عمدہ طباعت کے
 ساتھ پیش کرنے کی سعادت حاصل کی۔ اللہ تعالیٰ جملہ
 احباب کو اجر عظیم عطا فرمائے۔

مفتی محمد صدیق ہزاروی

ممبر اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان

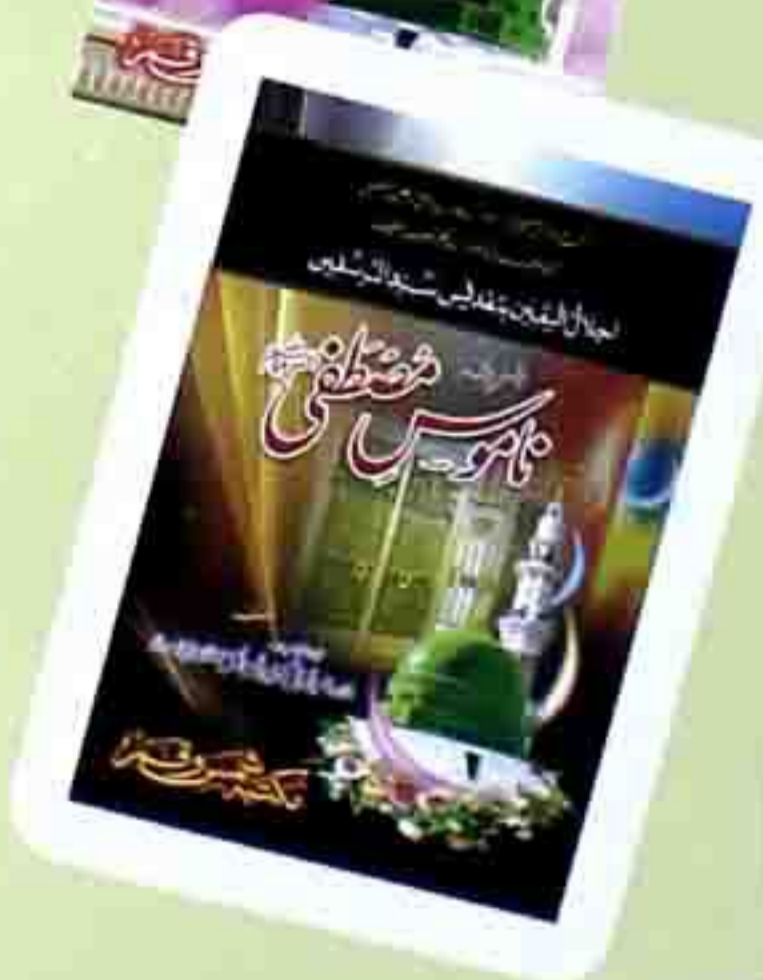
ڈیپارٹمنٹ جامعہ ہجویریہ مرکز معارف اولیاء داتا دربار لاہور

۲۴ ربیع الاول ۱۴۳۳ھ / 28 جنوری 2012ء

سید محمد رفیع مدظلہ العالی موت و پیرائے برہم

فاکھ نجیب دم از زندہ گشت صبح ما از گشت او تا بندہ گشت

مطبوعات
مکتبہ شمس و قمر



مکتبہ شمس و قمر

جامعہ صنفیہ غوثیہ، بھائی چوک لاہور

0345-4666768, 0322-4973954